شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، شاطبی نے اس مسئلہ میں خود اپنے استاذ مفتی ابن لب کی مخالفت کرتے ہوئے یہ استدلال کیا کہ عوامی فلاح وبہبود اگرچہ پوری قوم کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن اس ہنگامی وقت میں یہ ذمہ داری سرکاری خزانے کی طرف منتقل ہوگئی ہے، لہٰذا مصالح کا تقاضا ہے کہ اس مقصد کے لئے عوام حکومت سے اشتراک عمل اور مالی تعاون کریں۔

(۲) ایک عرصہ سے اندلس میں یہ رواج چلا آرہا تھا کہ جمعہ کے خطبہ میں سلطان یا خلیفۂ وقت کا نام ایک آئینی حکمراں کی حیثیت سے ضرور لیا جاتا تھا، الموحدون نے اس رواج میں ایک مزید اضافہ یہ کردیا کہ نماز جمعہ کے بعد اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بھی خلیفہ کا ذکر کرنا ضروری قرار پاگیا، شاطبی اور بعض دوسرے علماء نے پوری جرأت حق گوئی کے ساتھ اس رواج کے خلاف آواز بلند کی، ونشریسی نے المعیار المعرب میں قیاس ظاہر کیا ہے کہ اسی مخالفت کی پاداش میں شاطبی کو امامت سے معزول کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا، اس عہد کے کچھ علماء نے شاطبی کی رائے کی تردید بھی کی اور پورے اندلس وشمالی افریقہ میں عرصۂ دراز تک اس بحث کی گونج سنائی دیتی رہی، جن ممتاز علماء نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ان میں غرناطہ کے چیف جسٹس ابوالحسن النباحی، ابوسعید بن لب، محمد القشتلی (قاضی فاس) اور ابن عرفہ (قاضی تونس) کے نام خصوصیت سے لائق ذکر ہیں، شاطبی کے تلمیذ رشید ابوبکر بن عاصم (جو بعد میں النباحی کے جانشین ہوکر غرناطہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے) وہ واحد شخص ہیں، جنھوں نے شاطبی کے موقف کی حمایت وتائید میں سرگرم حصہ لیا۔

(۳) اس عہد میں سب سے زیادہ بحث واختلاف کا موضوع مراعات الخلاف کا مسئلہ تھا، جس کے باعث علامہ شاطبی نے اپنے "مقاصد الشریعۃ" کے اصولوں کی تشکیل کی، مراعات کے اصول نے نہ صرف مختلف مسائل میں فقہاء کے یہاں اختلاف آراء کے وجود کو تسلیم کیا بلکہ اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی کے غور وفکر کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا، بعض علماء نے تو یہاں تک خیال ظاہر کیا کہ کسی بھی

تعلق کے ساتھ ہندوستان کے عربی مراکز اور اسلامی اداروں سے بھی گہرا ربط رہا، اور مختلف علمی و ادبی انجمنوں کے رکن رہے، عالم اسلام میں اپنی خدمات کی بنا پر انھیں بڑی شہرت حاصل تھی۔ ۱۹۲۸ء سے دمشق کی مشہور علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" کے رکن منتخب ہوئے، اس کے ترجمان "المجلۃ العربی" میں آپ کے بہت سے مضامین شائع ہوئے، عربی کے سب سے اہم لغت لسان العرب کی اشاعت کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں بھی میمن صاحب کا نام شامل تھا، ان کی ان وسیع خدمات کے صلہ میں جامعۂ ازہر کی طرف سے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند دی گئی۔

آپ کی "متذکرۂ بالا کتابوں کے علاوہ دوسری قابل ذکر علمی و ادبی کتابیں" حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ابن رشیق، ۲۔ نسب عدنان وقحطان، ۳ نظرۃ علی دیوان نعمان بن بشیر الانصاری، ۴۔ ما اتفق لفظہ واختلف معناہ، ۵۔ النتف، ۶۔ الطرائف الادبیۃ، ۷۔ اکلیل الخزانۃ۔ ۸۔ عرام بن الاصبغ السلمی الاعرابی کی، اسماء جبال تہامہ، ۹۔ زیادات المتنبی۔ ۱۰۔ ثلاث رسائل، ۱۱۔ المداخل، ۱۲۔ فرائد القصائد ۱۳۔ دیوان الشنفری، ۱۴۔ دیوان ابراہیم الصولی، ۱۵۔ دیوان حمید بن ثور ۱۶۔ الفاضل للمبرد، ۱۷۔ حواشی اللسان، ۱۸۔ اغلاط معجم الادبا ریاقوت، ۱۹۔ خلاصۃ السیر۔ ۲۰۔ ابواب مختارہ، ۲۱۔ الفائت، ۲۲۔ اختیار الجرجانی، ۲۳۔ دیوان سحیم العبد، ۲۴ دیوان کعب، ۲۵۔ المقصور للفراء، ۲۶۔ التنبیہات وغیرہ وغیرہ،

"م، ن، ن"

معاملہ میں پہلے تمام اختلافی آراء کی جستجو لازمی ہے، اور پھر اس کے بعد ان نظریات پر اس طرح عمل کیا جانا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی رائے نظر انداز نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے اس اصول نے بعض مسائل میں تو بڑی سہولتیں پیدا ہوئیں، مگر اس کے باعث کچھ موقعوں پر دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

علامہ شاطبی نے اصول مراعات کے جواز کو چیلنج کیا اور مختلف علماء مثلاً ابن تباب قشتلی، ابن عرفہ اور شریف التلمسانی وغیرہ کو خطوط لکھے۔ ان علماء نے جواب میں جو وضاحتیں کیں، ان سے شاطبی کو شرح صدر نہ ہوسکا۔ دراصل شاطبی کا عقیدہ تھا کہ قوانین شریعت میں اختلاف آراء کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ شریعت کے تمام اصول ایک ہی منبع سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم عصر علماء کے شاطبی کے جو مباحثے اور اختلافات ہوئے ان کے باعث شاطبی نے قوانین شریعت کے منبع و مصدر کی وحدت سے متعلق مسائل کی تحقیق شروع کی اور انھوں نے مقاصد شریعت اور شارع کے اصل غرض و غایت پر بھی تحقیقات کیں، اسی غور و فکر اور تلاش و تحقیق کے نتیجہ میں شاطبی کے مشہور اجتہادی نظریہ "مقاصد الشریعہ" کے اصولوں نے جنم لیا، جن کی تشریحات ان کی تصنیف "الموافقات" میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

الموافقات میں شاطبی نے قوانین شریعت کے مروجہ نظریات اور وقت کی عام ہوا کے خلاف اپنے مخصوص و منفرد آراء کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باعث ان کو بدعت و الحاد تک کے الزامات کا نشانہ بننا پڑا۔ احمد بابا نے "نیل الابتہاج" میں شاطبی کے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں، جن سے ان قلبی جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے جو شاطبی کے دل میں علماء وقت کی مخالفتوں اور بدعت کے الزام سے پیدا ہوئے تھے، وہ کہتے ہیں:

بليت يا قوم والبلوى منوعة | بمن اداريه حتى كاد يرديني
دفع المضرة لاجلب لمصلحة | فحسبي الله في عقلي وفي ديني

مطبوعات جدیدہ

الاسلام: از جناب وحید الدین خاں صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۳۰۴ مجلد قیمت: ۱۵ روپیہ، پتہ: رسالہ بک ڈپو، ۲۶۳۰ کشن گنج، دہلی ۶

اس کتاب میں دین کے بعض پہلوؤں کی تشریح اور دعوت دین کے اصول اور طریقے بیان کئے گئے ہیں، دین کی حقیقت کے سلسلہ میں عبادت کا مطلب اس کے تقاضے، مظاہر نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کی روح اور صراط مستقیم کی اہمیت و حقیقت کا ذکر ہے، مصنف نے اسوۂ نبوی اور سیرت رسولؐ بیان کرکے اس کے آئینہ میں دعوت دین کے آداب بتائے ہیں، اور دکھایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز و اختتام کس طرح کیا اور اس سلسلہ میں پیش آنے والے مصائب و موانع میں کیا رویہ اور حکمت عملی اختیار فرمائی، دعوت الی اللہ کی اہمیت و فرضیت اور مضمونِ دعوت کی وضاحت بھی کی ہے، اور اس کے لئے موجودہ معیار کے مطابق ایک اہم دعوتی مرکز کی ضرورت بھی بیان کی ہے، ان کے خیال میں اس کا قیام موجودہ مسلم حکومتوں کے وسیع ذرائع اور مالی وسائل کی بنا پر بہت آسان ہے، ایک مضمون میں ملت کی تعمیر و تنظیم کے ضروری اور اہم خطوط کا ذکر ہے، ایک اور مضمون میں اس زمانہ کی اسلامی تحریکوں اور دینی دعوتوں کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور ان کے طریقہ دعوت کی خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، آخر میں مختلف مضامین دے کر ثابت کیا ہے، کہ اس دور میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی قبولیت اور اس کی جانب میلان کے گوناگوں امکانات پیدا ہو گئے ہیں بشرطیکہ ... مناسب ڈھنگ، جدید طرز استدلال اور موجودہ علمی معیار کے مطابق اس کو پیش کیا جائے اور

(اے میرے اہل قوم! میں نوع بنوع آلام و آزمائشوں میں مبتلا ہو گیا ہوں اور آزمائشیں جس کو گھیر لیتی ہیں، تقریباً فنا کر ڈالتی ہیں، آپ لوگ اس لئے میری مذمت کرتے ہیں کہ میں غلطیوں کا تدارک کر رہا ہوں اور مصلحت کے حصول کے لئے کوشاں ہوں، خدا میرے افکار و عقائد کو پائندہ رکھنے میں میری مدد فرمائے)

علاوہ ازیں خود شاطبی نے الاعتصام میں اپنے مصائب کی داستان بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے

"میں نے متعدد عوامی پیشوں مثلاً وعظ و تبلیغ اور امامت کو اختیار کیا، جب میں نے اپنی راہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی تو میں نے خود کو ہم عصر علماء کی جماعت میں منفرد پایا، ان کے یہاں کہنہ روایات اور بے بنیاد رسوم و رواج کا غلبہ تھا، میں ایک دوراہے پر اضطراب و کشمکش کے عالم میں کھڑا تھا، ایک راستہ تو میرے لئے یہ تھا کہ دوسرے علماء سے اختلاف رائے کرتے ہوئے میں اپنے نزدیک جادۂ صواب پر قائم رہوں، ایسی صورت میں ظاہر ہے مجھے ان نتائج کے لئے تیار رہنا تھا، جو اہل روایات اور رائج تصورات کے خلاف آواز بلند کرنے والے کو ہر زمانے میں پیش ہوتے آئے ہیں، خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ روایتی انداز فکر کے حامل لوگوں کو یہ ادعا ہو کہ ان ہی کے نظریات "سنت ثابتہ" پر مبنی ہیں۔

دوسری راہ میرے لئے یہ تھی کہ سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عام لوگوں کی اتباع کروں اور صراط مستقیم سے منحرف ہو جاؤں، میں نے فیصلہ کیا کہ اتباع سنت کی راہ میں اپنی حقیر جان قربان کر دوں گا، چنانچہ میں نے بہت سے مسائل میں اپنے اس فیصلہ پر عمل کیا، نتیجہ کے طور پر جلد ہی عتاب و مخالفت کا نشانہ بن گیا اور مجھ پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے، یہاں تک کہ مجھے بدعت بلکہ کفر کے اتہام میں بھی ملوث کیا گیا۔" (ج ۱ ص ۹ - ۱۰)

الاعتصام ہی میں شاطبی نے ان الزامات کی تفصیل بھی درج کی ہے جو ان کے خلاف

لگائے گئے تھے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں :

" (۱) کہا جاتا ہے کہ میں دعا کی عدم افادیت کا قائل ہوں، اس الزام کا سبب یہ ہے کہ مجھے نماز کے اختتام پر اجتماعی دعا کے عام رواج سے اتفاق نہ تھا۔

(۲) مجھ پر تشیع و رفض کے ساتھ یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ میں بعض خلفائے اسلام کے خلاف بغاوت کا حامی ہوں، اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں جمعہ کے خطبہ میں خلفائے راشدین کے نام ذکر کیے جانے کے رواج کا قائل نہیں تھا۔

(۳) مجھے اس الزام سے بھی متہم کیا گیا کہ میں دین میں جبر اور سختی کا بھی قائل ہوں، اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ فرائض و فتاویٰ کے سلسلہ میں صحیح روایات و احادیث کی پابندی میرا معمول تھا جب کہ میری مخالفت کرنے والے علماء اس چیز کو بسا اوقات نظر انداز کر دیتے اور مستفتی کی سہولت و پسند کے مطابق فتوے دے دیا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہائے وقت کے افکار و نظریات کی مخالفت کرنے کے باعث شاطبی پر محض بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے اتہامات عائد کئے گئے، اور تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، وقت کے رواں دواں دریا کے رخ کو موڑنے والی تمام عبقری شخصیتوں کے چہرے الزامات کی جراحتوں سے داغ دار ہیں، لیکن علم و فن کی بارگاہ میں ایسے افراد کو نمایاں ترین مقام عطا ہوتا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اندلس اور شمالی افریقہ کے ان ہی علماء نے شاطبی کی مخالفت کی جو منصب قضا یا دوسرے سرکاری عہدوں پر مامور تھے۔

شاطبی کے فیضان صحبت سے مستفید ہونے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے، احمد بابا نے ان کے تین نمایاں تلامذہ کا ذکر کیا ہے، جن میں ابوبکر محمد بن عاصم (المتوفی ۸۲۹ھ) خصوصیت کے ساتھ اپنے غیر معمولی فضل و کمال کے باعث شہرت کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر چمکے، غرناطہ کے

قاضی القضاۃ بھی مقرر ہوئے، ان کی منظوم کتاب تحفۃ الحکام فی نکت العقود والاحکام بہت مشہور ہے، جو عام طور پر عاصمیہ یا تحفۃ ابن عاصم کے نام سے معروف ہے، اس کتاب میں قاضیوں کے لئے فقہ مالکی کے اصول مرتب کئے گئے ہیں، یہ الجزائر اور فاس سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

شاطبی کی وفات | جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، شاطبی کا سال ولادت نامعلوم ہے، لیکن وفات کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ ۸ شعبان بروز چہارشنبہ سنہ ۷۹۰ھ میں ہوئی۔

تصنیفات | ابو اسحاق شاطبی نے مختلف فنون میں قابل قدر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) عنوان التعریف باسرار التکلیف: یہ عام طور پر الموافقات فی اصول الاحکام کے نام سے معروف و متداول ہے، چار جلدوں پر مشتمل اس شہرۂ آفاق تصنیف نے شاطبی کے نام کو حیات جاوید عطا کی ہے، اس کا موضوع اصول فقہ اور شریعت کے اسرار و حکم ہے، اب تک اس کے متعدد اڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔

پہلی بار سنہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں تونس سے شائع ہوئی، جسے صالح القایجی، علی الشنوفی اور احمد الورتانی نے مرتب کیا ہے، سنہ [illegible] میں موسیٰ جار اللہ کے ترکی زبان میں مقدمہ کے ساتھ اس کا پہلا حصہ قازان میں بھی چھپ چکا ہے، دوسرا مکمل اڈیشن مطبع سلفیہ قاہرہ سے سنہ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں طبع ہوا جسے شیخ الازہر محمد الخضر حسین نے مرتب کیا ہے، راقم سطور کے پیش نظر الموافقات کا یہی نسخہ ہے، تیسرا اڈیشن شیخ عبد اللہ دراز کے قیمتی حواشی و ترتیب کے ساتھ مطبع مصطفیٰ محمد میں طبع ہوا، چوتھا اڈیشن مطبع محمد علی قاہرہ میں چھپا، جسے محمد محی الدین عبد الحمید نے مرتب کیا ہے۔

(۲) الاعتصام: تین جلدوں پر مشتمل توحید کی کتاب ہے، اس میں دس ابواب میں بدعت کی

تعریف اور اس کے ماخذ و احکام وغیرہ پر مبسوط بحث کی گئی ہے، سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں اس کتاب کے کچھ اقتباسات علامہ رشید رضا نے اپنے مشہور رسالہ "المنار" قاہرہ میں شائع کئے تھے، پھر موصوف نے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے مکمل کتاب کی اشاعت کی جس کا متن کتب خانہ شنقیطی میں محفوظ الاعتصام کے ایک مستند نسخہ پر مبنی ہے، رشید رضا چونکہ خود بھی بدعت کے خلاف تیغ بے نیام تھے اس لئے انھوں نے الاعتصام پر اپنے مقدمہ میں شاطبی کے موحدانہ افکار و عقائد کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور ان کو رد بدعت کا ایک مجاہد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، علاوہ ازیں پروفیسر مارگولیتھ نے ۱۹۱۶ء میں رسالہ "دی جرنل ایشیاٹک سوسائٹی" میں الاعتصام پر ایک ناقدانہ تبصرہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ عمیق و دقیق افکار کے باعث یہ کتاب عسیر الفہم ہے۔

(۳) شرح علی الخلاصۃ فی النحو: چار ضخیم جلدوں میں الفیۂ امام مالک کی شرح ہے، اس کی افادیت و اہمیت کے بارے میں احمد بابا رقمطراز ہیں کہ

لم یؤلف مثلہ بحثا وتحقیقا	میرے علم و واقفیت کے مطابق بحث و تحقیق
کما اعلم	کے اعتبار سے اس کی بہتر کتاب نہیں لکھی گئی،

مکتبۃ الازہریہ میں اس کا ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے، جس کا آغاز اس طرح ہے:

"اللّٰھم انا نحمدك علی ما علمت ونشکرك علی ما انعمت"

اس قلمی نسخہ کے کاتب کا نام عمر بن عبداللہ المنظراوی ہے۔

(۴) کتاب المجالس: یہ صحیح بخاری کی کتاب البیوع کی نہایت فاضلانہ شرح ہے، احمد بابا نے اعتراف کیا ہے کہ

فیہ من الفوائد والتحقیقات	اس میں جو قیمتی باتیں اور تحقیقات پیش

جلد ۱۲۳

جلد ۱۲۳ ماه محرم الحرام و صفر المظفر ۱۳۹۹ھ مطابق ماه جنوری ۱۹۷۹ء عدد ۱

مضامین

مقالات

مسٹر کیلاٹ اس وقت موجود نہیں ہیں، ان کے انتقال کو ایک زمانہ ہو گیا لیکن ان کی یہ تقریر اب تک ذہن و دماغ میں محفوظ ہے اور آج جب کہ ملت درماندہ راہ تماشائے روزگار اور تصویر عبرت بنی ہوئی ہے ان کی یہ باتیں بے ساختہ یاد آرہی ہیں، سنتے ہیں کہ کبھی ہم پند بر دیوار سے بھی نصیحت اندوز ہوتے تھے، کیا اس مخلص اور مسلم دوست عیسائی کے الفاظ ہمیں متاثر نہ کریں گے، اس میں شک نہیں کہ حالات بے حد پریشان کن ہیں، راہ پر خار اور منزل دور دراز ہے، لیکن اگر عزم جواں اور ہمت بلند ہو تو یہ ہفت خواں چشم زدن میں طے ہو سکتا ہے؛

منزل عشق بسے دور دراز ست ولے   طے شود ایں جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

ہمارا خود ایک نصب العین اور ایک مسلک ہونا چاہئے، ماضی کے واقعات اور حال کے تجربات کی روشنی میں مستقبل کا اندازہ کیا جائے، اور ایسا منصوبہ بنایا جائے جس میں ہمارے قومی مزاج اور ملی روایات کا لحاظ بھی ہو، اور زمانہ کے حالات اور وقت کے مطالبات کی رعایت بھی، یہ نہ ہو کہ ہم ہر صاحب اقتدار کے نقیب بن جائیں اور جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ آجائے اس کی مدح و ثنا کو وظیفۂ حیات بنا لیں، اس طرز عمل سے ہمارا وقار بہت مجروح ہو رہا ہے، اور ہماری صداقت مشتبہ سمجھی جانے لگی ہے، ۱۹۴۷ء میں ایک ایسے ہی ناخواندہ سے سردار پٹیل نے کہا تھا کہ زیادہ نہ کہئے، آدمی ایک رات میں اس قدر بدل نہیں سکتا ہے، پچھلی حکومت کے زمانہ میں بھی تعریف و توصیف کے جواب میں ایک وزیر نے اسی قسم کا تبصرہ کیا تھا، چند جری اور صاف گو صحافیوں نے زبان سے اظہار کر دیا، ورنہ دل میں شاید سب کے یہی بات ہے، ان واقعات سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے، اور خوشامد و چاپلوسی کی پالیسی ترک کر کے وقار و خودداری کی روش اختیار کرنی چاہئے، اور الفاظ میں زور پیدا کرنے کے بجائے سیرت کی پختگی، اخلاق کی برتری، کردار کی بلندی، لیاقت کی فزونی اور صلاحیت کی بہتری سے اپنے وزن میں اضافہ کرنا چاہئے، تاکہ ہماری بات سنی جائے، اور ہماری اہمیت محسوس کی جائے۔

مقالات

اقبال کا فکری ارتقاء

از جناب مولانا عبدالسلام خان رامپوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور

(۳)

اقبال یورپ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک

یورپ کے سہ سالہ قیام میں اقبال کا تعلیمی اور ملکی گردوپیش
بالکل بدل گیا تھا، نہ یہاں فرقہ وارانہ نفرت تھی نہ سیاسی کشمکش
آزاد اور جمہوری فضا، خاص و عام میں ذمہ داری کا احساس، تعلیم عام، ہندوستان
کی بجھی بجھی اور جامد زندگی کے بجائے مشین کی طرح متحرک اور فعال زندگی، ہر شخص باکار
اور مصروف، اپنے کام سے کام، مادی انداز فکر اور افادی اخلاق معیار خوب و زشت یہاں
دولت اور سرمایہ کی طاقت تھی، زندگی پر کاروباری پن حاوی تھا، اور رسم و رواج کی
حکومت تھی، دیانت داری اور قانون و آئین کا احترام عام تھا، لوگ مہذب اور شائستہ تھے۔
اقبال کا یہ تعلیمی قیام ایک طرح سے مردوں اور ہرچیز تحصیل تھی، اساتذہ کے رسمی
خطبات تو تھے ہی لیکن تعلیم ان رسمی خطبوں میں محدود نہ تھی، درزشیں، تفریحیں، چائے
اور کھانے کی دعوتیں، نجی صحبتیں اور گھریلو ملاقاتیں، تعلیم کا ضروری حصہ تھیں، فلسفیانہ اور

علمی موضوعات پر بحث ونمیں، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی مسائل پر قومی اور بین الاقوامی
نقطۂ نظر سے گفتگوئیں اور پر لطف، مہذب فقرے بازیاں ان کی خصوصیت تھی، کیمبرج
میونخ اور ہائیڈل برگ تو علمی مرکز تھے، ان کا ماحول خاصا علمی تھا، اور تحصیل علم کی خاطر
ان میں اقبال کا وقتاً فوقتاً طویل قیام رہتا تھا، کیمبرج میں بین الاقوامی شہرت کے فلسفے
کے استاد میکٹیگرٹ، جان سورلے "پریچنگ آف اسلام" کے مشہور مصنف پروفیسر آرنلڈ
میونخ میں مسز ران اور ہائیڈل برگ میں مسز وے گے ناشٹ اور مس سے نے شل سے
اقبال نے درس لیا وہ بہت انہماک اور توجہ سے ان سے فائدہ اٹھاتے تھے،

مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن اور ان کے شاگرد نکلسن سے تعلقات عربی وفارسی کے ذوق
میں مزید اضافے کا باعث ہوئے، سید علی بلگرامی اور اسلام کی حمایت میں لکھنے والے مشہور
مصنف جسٹس امیر علی سے ملاقاتیں اور اسلامی اور ثقافتی مسائل پر گفتگوئیں بھی کم مفید
نہ تھیں، اس وقت کے ہندوستان کی نہایت صاحب ذوق، تعلیم یافتہ اور آزاد خیال
خاتون عطیہ بیگم سے اقبال کے گہرے روابط کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مختلف
اسلامی ممالک کے مشہور اکابر اور فضلا اور ملک ملک کے طلبہ سے وقتاً فوقتاً ملاقاتوں
اور باہم اظہار خیالات کے بھی موقعے ملتے رہتے ہوں گے، اور ان سب نے اقبال کی
شخصیت اور ان کے ذہنی رجحانات پر اثر ڈالا ہوگا اور ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا
کی ہوگی۔

مغربی فلسفہ تو ہندوستان سے ہی انکا مضمون تھا، یورپ میں اس کے عمیق
مطالعہ کا موقع ملا، اپنے ڈاکٹریٹ کے موضوع "فلسفۂ عجم" کی تقریب سے اسلام کے
بنیادی عقائد، مسلم فلاسفہ کے خیالات، مسلم تصوف اور اس کے ماخذ، ہندی فلسفہ

ور قبل از اسلام ایران کے عقائد اور فلسفیانہ افکار سے واقف ہونے اور ان کی تحقیق و تنقید نظر کے مواقع میسر آئے۔ ماہرین کے مشورے حاصل ہوئے، لندن میں انھوں نے بیرسٹری کے لیے قانون کا مطالعہ کیا، اس ضمن میں اسلامی قانون پر بھی فی الجملہ نظر ڈالنی ضروری تھی۔ [1]

غرض یہ کہ یورپ کے اس سفر سے اقبال نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا، ان کے آئندہ کے مابعد الطبیعیاتی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی خیالات میں ان کے اس تعلیمی سفر کو بہت زیادہ دخل ہے۔ بین الاسلامی رشتے اور وطنی، قومی تعلق میں فرق کا احساس انھیں اسی سفر میں ہوا، محدود وطنیت کے بجائے ملیت مغرب کے اسی سفر کی دین ہے۔ وہاں رہ کر انھیں یورپ کی متحرک زندگی کو اندر اور باہر سے دیکھنے سمجھنے، اسکے عوامل کو جاننے، مختلف پہلوؤں سے اسکو جانچنے اور اس کے قریب و بعید اثرات کو محسوس کرنے کی سہولتیں ملیں۔ اور انھوں نے ان کو پرکھا، مغربی ممالک کے قومی شعور اور بین الاقوامی احساس اور ان کے مظاہر اور محرکات کا مطالعہ کیا، اس کی مادی تہذیب، افادی اخلاق اور سرمایہ دارانہ اقتصاد کا جائزہ لیا، اس کے متوقعہ ثمرات اور نتائج پر غور کیا، وہاں کی رسمیت اور ظاہرداری پر نظر ڈالی، اسلام اور عیسائیت کا مع ان کے مظاہر کے مقابلہ کیا، کچھ کو سراہا، اور قبول کیا، کچھ کو ناپسند کیا اور مسترد کر دیا۔

عشق کی کائناتی اہمیت غالباً یہ فارسی کی صوفیانہ شاعری کا اثر تھا، کہ اقبال پر عشق کی کائناتی عظمت کا انکشاف ہوا، اور انھوں نے اس کو جنسیت سے نکال کر اس کے تقدس کو واضح کیا، حیوانی جذباتیت سے الگ کر کے اس کی تکوینی اہمیت آشکارا کی اور اس کو خلاقِ عالم کا کرم قرار دیا۔

---

[1] ان تینوں پیراگرافوں کا ماخذ عطیہ بیگم کا "اقبال" ہے ص ۱۵، ۹۰ ۲ سے مکتوب اقبال مطبوعہ انوار اقبال ص ۱۷۶

شانِ کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشائے کا　　دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے
صورتِ شمع، نور کی ملتی نہیں قبا اسے　　جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے
تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ　　چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

یہ آتشِ عشق اور تپشِ محبت ہے جو حرکت اور عمل کا حقیقی باعث ہے۔ اکسیرِ محبت چھڑکنے کے بعد کائنات کا نقشہ ؛-

ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا　　گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے　　چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

کھردری اور ناآہنگ حقیقتوں کی دنیا میں آہنگ پیدا کرنا اور ان کو حسن و جمال دینا عشق کی تخلیقی حرکت کا کرشمہ ہے،

انجام ہے اس خرام حسن　　آغاز ہے عشق، انتہا حسن

خوب سے برابر نا آسودگی اور مسلسل خوب تر کی جستجو، حسن و جمال کے ہر اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے سے انحراف اور اعلیٰ تر کی متواتر طلب اسی عہد کی تڑپ اور بے تابی ہے ؛-

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے　　مضطرب ہوں، دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں
گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر　　حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں
بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز　　سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش　　آہ! وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں
جستجو کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے　　حسن بے پایاں ہے، دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

اور اس پر دشواری یہ کہ

فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب　　تشنۂ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

چنانچہ طلب اور جستجو کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

در بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما　　　موج بحریم و شکست خویش بر دوشیم ما

ن اور حرکت | اس زمانے میں یورپ کی فعالیت، حرکت اور غیر معمولی قوتِ عمل سے اقبال
ص طور پر متاثر ہوئے۔ ان پر یہی اثر تھا کہ خود انھوں نے شعر و سخن کی بے عمل اور سکون طلب
صروفیت کو ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

یہ مجزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے　　　جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

لیکن احباب کی فہمائشوں پھر اپنے محبوب اُستاد مسٹر آرنلڈ کی فیصلے کے سامنے انھیں اپنے
س ارادے سے باز رہنا پڑا، لیکن حرکت و عمل اب انکی شاعری کے خاص موضوع بن گئے، انھوں
نے مختلف اسلوبوں سے حرکت، عمل، جد و جہد اور زندگی کے لیے تصادم اور پیکار کی ضرورت
پر زور دیا، پہلے ان کے یہاں حرکت و عمل شاعرانہ تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے،
لیکن اب وہ ان کا پیام اور دعوت تھے۔

بیتاب ہے اس جہان کی ہر شے　　　کہتے ہیں جسے سکون نہیں ہے،
جنبش سے ہے زندگی جہان کی　　　یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے　　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے

حرکت و عمل کے مقابلے میں ہر عظمت کمتر اور حقیر ہے، خواہ وہ زندگی ہی کیوں نہو،

آتی تھی کوہ سے صدا، رازِ حیات ہے سکون　　　کہتا تھا مورِ ناتوان لطفِ خرام اور ہے

اقبال ہندوستان میں بھی مادیت پسند نہ تھے، مظاہر پرستی ان کی تربیت
کے صوفیانہ پس منظر کے خلاف تھی، یورپ کا حرکت اور عمل میں انہماک اسکے مادی
زاویۂ نظر کا مرہون تھا، اس کے پیچھے اس کی کاروباری ذہنیت تھی، لیکن خود مسلم

تاریخ گواہ ہے کہ حرکت و عمل مادیت اور کاروباری انہماک پر موقوف نہیں یہ اقبال کی منطقی تحلیل تھی کہ انھوں نے حرکت و عمل کو گرہ میں باندھا اور اس کی مادیت پسندی اور کاروباری ذہنیت کو بربادی کا پیش خیمہ قرار دیا۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے،
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گیا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا وہ ناپائدار ہوگا

آرزوئے نو اور طلب | ہندوستان کی مبہم تمنا اور بے پردہ حقیقت کی جستجو نے اقبال کا یورپ تک پیچھا کیا۔

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

لیکن یہ اپریل سنہ ۱۹۰۸ء کی بات تھی، غالباً فلسفہ، تصوف اور مذہب کے عمیق مطالعہ نے اب ان کے دل میں نئی آرزوؤں اور نئی تمناؤں کو بیدار کر دیا، ان کی جستجو اب کسی گریزاں حقیقت کی نہ تھی، اسی عالم آب و گل سے اُن کی طلب متعلق تھی، آرزو اور طلب لازم و ملزوم تھے، آرزو خلاقِ مقاصد تھی اور طلب تحصیل مقاصد اب اقبال کے سامنے یثرب تھا، یہ نجد کے دشت و بیابان نہ تھے کہ لیلیٰ اپنے ناقے پر سوار قطع منازل کر رہی ہے، نئی لیلیٰ ہے، اگر تمنا بھی نئی ہو تو قیس اسکے پیچھے کیوں دوڑنے لگا۔

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار   قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

طلب اور جدوجہد کا متعین مقصد ہے، یہ مقصد شخصی، قومی اور وطنی نہیں، ملی یا

بین الملی ہی نہیں بلکہ کائناتی اور عالمی مقصد ہے۔ کائنات جس غرض کے لیے تمام
مال مسالہ تھی، اس غرض کو حاصل کرنا ہے۔ جہاں کو فریضہ ادا کرنا تھا، اب اسکی
قضا کا وقت ہے، یہ اس کی نماز ہے، جو ابتک برابر اس کے ذمے چلی آ رہی ہے
اپنے آپ کو سپرد کر کے اس کی ادائی کر دے۔

غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو ادا مثال نماز ہو جا

کامیابی اور ناکامی کسی کی قسمت نہیں۔ مال مسالہ موجود ہے اور صنعت کسی کی
اجارہ داری نہیں

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں، تو بھی آئینہ ساز ہو جا

کسی منزل پر طلب کو نہ ٹھیرنا چاہئے، حاصل سے مطلوب ہمیشہ آگے ہے اور کسی
حاصل پر ختم نہیں ہوتا۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں! اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں، تو اور دامن دراز ہو جا

اس لیے کہ طلب کا ہی دوسرا نام زندگی ہے، طلب ختم ہوئی اور زندگی گئی۔

موت ہے عیش جاوداں، ذوق طلب اگر نہ ہو	گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

ظہور اور نمود کا تقاضا | ظہور کا تقاضا اور نمود کی خواہش جو ذات حق تک محدود تھی اب
پوری کائنات پر حاوی ہو گئی ہے، کائنات کا ہر ذرہ اور عالم کی ہر اکائی ظہور کا تقاضا
رکھتی ہے، اور اپنے آپ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے، بحر ہستی کا ہر قطرہ ہستی کی لذت سے

آشنا ہے، اور اظہار چاہتا ہے،

لذت گیر وجود ہر شے　　سرمست مے نمود ہر شے

اقبال کی دعوتِ حرکت و عمل کی مابعد الطبیعیاتی بنیاد یہی وجود سے لذت گیری اور ظہور و نمود کی یہی اندرونی خواہش ہے، یہ [illegible] تقاضائے ظہور ان کے آئندہ فلسفے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

تغیر | شعوری یا غیر شعوری اقبال کے ذہن میں ان کی آیندہ فکر کا جو مسالہ خیالات و واردات کی صورت میں جمع ہو رہا تھا، اس میں شاعرانہ توجیہ کے ضمن میں ہی سہی تغیر کا اضافہ اسی عہد میں ہوا ہے، حقیقتِ حسن" میں حسن کو گلہ ہے کہ "جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا" جواب دیا گیا ہے۔

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی　　وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

نمود کے لیے بلکہ دوسرے لفظوں میں وجود کے لیے تغیر لازم ہے، جو چیز حرکت نہیں کر رہی ہے، اس کی کسی فعلیت کا اظہار نہیں ہو رہا ہے، محض امکانات اور استعدادیں ہیں، جو کسی حقیقت میں چھپی ہوئی ہیں، بشرطیکہ نمود و ظہور کے عقب میں کوئی جامد اور مخفی حقیقت ہو۔ ایسی حالت میں ظہور اور نمود کے کوئی معنی نہیں، ہر ظہور کوئی نہ کوئی تغیر ہے، کامل سکون اور مطلق جمود جس وجود نہیں، عقلی تجرید ہے، وجود استعداد کے عمل میں ظہور کا نام ہے، کسی ہستی کے لازوال ہونے کے معنی نیستی اور کامل خفا ہے، مسلسل بدلتے رہنے کا نام شعور ہے، ہر فعلیت اپنے اندر کوئی نہ کوئی استعداد رکھتی ہے، اس استعداد کا ظہور دوسری استعداد رکھتا ہے، اور یوں ہی تغیر جاری رہتا ہے، اس لئے نقطہ "ثبات تغیر کو ہے زمانے میں"

قومیت و وطنیت کے بجائے ملیت | وطن کے جذباتی ماحول سے علٰحدگی، مختلف مسلم ممالک کے

باشندوں سے میل جول آپس میں یگانگی کا احساس اور عام وحدتِ خیال، ایرانی مابعد الطبیعیات کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف عہدوں اور وطنوں کی شخصیتوں میں تسلسل و تواتر کے ساتھ وحدتِ خیال و عمل اور ساتھ ساتھ تنگ جذبۂ قومیت و وطنیت کے مظاہرات، انکے دور رس اور گہرے نتائج کا شعور، مسلم لیگ کا ہندوستان میں قیام اور انگلستان میں مقیم ہندوستانی مسلمانوں کی اس سے دلچسپی، پھر بین الملل وحدت اسلامی تحریک، ان سب کے ملے جلے اثرات نے اقبال کو ملت کی انفرادیت اور اس کی غیر منقطع وحدت سے آشنا کیا، ان کے جذبات بدل گئے، مقصد اور نصب العین کی صورت میں وطنیت سے انکا تعلق ختم ہوگیا، وہ ملتِ اسلامی کو معاشرتی وحدت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مستقل سیاسی وحدت بھی ماننے لگے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو انھوں نے وطنی اور قومی تقاضوں اور ضرورتوں سے جدا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ وطنی جذبے کی حیثیت محض بیرونی ہے مسلمان کا حقیقی اور باطنی جذبہ اس کی ملیت ہے،

مستور ہے درونِ جام، پر توِ مے برونِ جام   اس کا مقام اور ہے اسکا مقام اور ہے
یوں تو چلانے رہتے ہیں محفل کو ساقیانِ ہند   لیکن انھیں خبر نہیں یہ تشنہ کام اور ہے
جس بزم کی بساط ہو سرحدِ چین سو مصر تک   ساقی بھی اُسکا اور ہے مے اور جام اور ہے

اقبال کے تصورات میں یہ انقلاب نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا، یہ وہ موڑ ہے جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا، اگر وہ ملت کی انفرادیت اور اس کی مستقل وحدت کو مطمح نظر نہ بناتے تو شاید ان کی فکر کوئی الگ شاہراہ نہ بنا پاتی اور وہ دنیا کو سوچنے کے لیے نیا خیال نہ دے سکتے، ان کی شاعری بھی وہ اچھوتا انداز نہ حاصل کرتی جس نے ان کو صفِ شعراء میں قابلِ رشک انفرادیت کا حامل بنا دیا۔ انکی

شخصیت کی کشش اور مجبوبیت ملکت کے اندر اور باہر ان کے اسی فکری انقلاب کی مرہون ہے۔

وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا سمجھنے والا اقبال اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم قومیت خود ایک حقیقت ہے، جو کسی وطن اور کسی قوم سے مخصوص نہیں۔ یہ تاریخ کا انوکھا منظر ہو، جس کے تحفظ کے طریقے، اس کو موثر اور فعال بنانے کی تدبیریں اور معاشرے میں اس کو محسوس بنانے کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں۔

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اس نئے سماجی منظر کا اپنا کوئی وطن نہیں ہے، دنیا تو دنیا عقبیٰ بھی اس کا وطن اور نصب العین نہیں، وہ دونوں میں پھیلا ہوا ہے، اس میں دنیا اور آخرت کا کوئی امتیاز اور آپس میں کوئی حد فاصل نہیں ہے،

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیاز عقبیٰ

نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اس انوکھی قومیت کی بنیاد وہ اصول حیات ہیں، جن کا شعار اور علامت حرم کی صورت میں پوری ملت کے لیے جاذب ہے، اس کی زعامت اور سربراہی سرزمین و تیرب کے سونے والے کے ہاتھ میں ہے۔

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا　　اسکا مقام اور ہے اسکا نظام اور ہے

اے بزم دور آخری کس کی تلاش ہو تجھے　　تو سمجھ جاذب ہے تیرا امام اور ہے

محدود وطنیت اور ملک میں محصور قومیت، افتراق کے بت ہیں، جو ملت کی وحدت کو

پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان بتوں سے دامن بچانے کی یہی تدبیر ہے کہ سب ملی وحدت کے شعائر میں جذب ہو جائیں۔

یہ ہند کے فرقہ ساز، اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

"عبد القادر کے نام پیغام" میں اسلامی قومیت کے اصول کے بارے میں جو وطنیت اور قومیت کے شور و غوغا میں نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں کہتے ہیں اور اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو — تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اور اس غلط خیال کی جو ملت کے دل میں جما دیا گیا ہے کہ ملی تصورات خود مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہیں عملی تردید کا سامان کرتے ہیں،

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر — قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا — سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

بے خودی اور خودی | ممکن ہے فکری طور سے خودی کے اسرار اقبال پر پہلے منکشف ہوئے ہوں بے خودی، خودی کا ایسا ضمیمہ ہے جس سے خودی کے حدود کو مقرر کیا گیا ہے، اور اس کے تخریبی پہلوؤں کو تعمیر سے ہم آہنگ بنایا گیا ہے، تاہم بے خودی کے رموز کی جھلک جذباتی حیثیت سے مقدم ہے جب کہ خودی ابھی تک ان کی شخصی انانیت سے آگے نہیں بڑھی ہے اس زمانے میں ملت سے ان کا شغف، پھر جرمنی کا فلسفیانہ ہیگلی ماحول، کیمبرج میں ہیگلی فلسفے کے سب سے بڑے نمائندے میکٹیگرٹ کی شاگردی ان سب کے اثرات تھے کہ اقبال نے فرد کی مستقل وحدت اور اس کے تقاضوں سے صرفِ نظر کر لی اور فرد کو اسلامی ملت کے جز ہونے کی حیثیت سے دیکھا۔

اس زمانے میں ان کے نزدیک فرد کا اپنی انفرادی حیثیت میں متمتع ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کی اپنی الگ انفرادی ہستی نہیں، اس کی انفرادیت محض مجاز اور بے حقیقت ہے، وہ جو کچھ ہے ملت کا ایک جز ہے، اور یہی اس کا حقیقی وجود ہے، اس کے مفاد کے معنی ملت کا مفاد ہے، وہ ان ہی فوائد سے متمتع ہو سکتا ہے، جو ملت کے ضمن میں اسے پہنچ سکیں۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

وحدت وجود ا یورپ کے زمانہ قیام میں بھی اقبال کی شاعری پر وحدت وجود کا سایہ رہا، وجودی وحدت کے تصورات اب بھی بظاہر اردو فارسی کے عام شعرار کی تخیلی توحید سے آگے نہیں بڑھے۔

هستیم ما گدائے تو یا تو گدائے ماستی به نیاز سجدهٔ درس ما دو یده‌ٔ
انتی اگر بدست ما حلقهٔ بگرد تو کشیم هنگامه گرم کردهٔ خود از میان رمیدهٔ

یہ کثرت اصل حقیقت کی جلوہ گری ہے، ان مظاہر کے عقب میں ایک ہی وجود ہے، جو قائم و دائم ہے۔

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہ سحر میں وہ چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

ساتھ ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی نظر میں یہ اعتقاد قابل اعتراض ہے، چنانچہ ذوق و شوق یا حال سے معذرت کرتے ہیں۔

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں تارے میں
بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

اب بھی وہ ہستی کے راز کو توحید وجودی سے کھولنا چاہتے ہیں،

راز ہستی راز ہے، جبتک کوئی محرم نہ ہو کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

اس تصور میں کثرت کے فریبِ نظر ہونے کی ہندی فکر اب بھی شامل ہے۔

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا

یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

فریبِ نظر سے رہائی پا چکنے کے بعد وحدتِ حقیقی کی صورت میں سکون وطمانیت بھی

ہندی فلسفہ ہے۔

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الااللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

حسی وجود یا جسم کا تمناؤں اور خواہشوں کا پیکر محسوس ہونا ہندی تصور ہے۔

روح کی وحدت اور وحدتِ حقیقی میں اس کا حلول یا اسی کا ہر شے میں سرایت کئے ہوئے

ہونا ہندستانی وحدت وجود کے تصورات ہیں۔

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے

یقیں ہے مجھکو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

حرکت اور تڑپ آبرو نہیں ہے، بلکہ اس سے رہائی پاکر ابدی سکون آبرو ہے،

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھکو سامان آبرو کا

ابتدائے قیام یورپ کا وحدت وجود کا یہ تصور شاید برائے شعر گفتن خوب ست کی حد

تک تھا۔ اس کے پیچھے نہ فکر تھی نہ حال۔ اقبال کے لیے کائنات کی یہ توجیہہ عملی صداقت ایسی نہ تھی، اگر ہستی کی حقیقت نفی ہے، اس دھوکے اور فریبِ نظر سے رہائی پالینا کمال ہے اور فطرت سکون وجمود ہے تو پھر حرکت وعمل جس کی اس دور میں اقبال نے خاص طور سے دعوت دی ہے، اس صداقت سے کیسے ہم آہنگ ہوسکتی ہے، یہ حقیقت سے کھلی بغاوت اور فطرت سے معرکہ آرائی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ اقبال کا عارفانہ تضاد ہے، اور خود انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ "عاشق ہرجائی" میں اپنے اس تضاد کو تفصیل سے بیان کیا ہے،

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہو تنہا بھی ہو

اور ان کی یہ لے گویا ہمیں شغل مے میں سجدہ ریزی سے زیادہ نہیں۔

سین شغل مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی فکر | اثنائے تحصیل علم میں اقبال عشق کی کائناتی اہمیت اور حرکت وعمل سے اُس کا ربط دریافت کر چکے تھے، مقصدِ زندگی میں حرکت اور عمل کی اہمیت ان پر واضح ہوگئی تھی، کائنات میں ظہور اور نمود کا فطری تقاضا انھیں محسوس ہونے لگا تھا، وہ تغیر اور اس کی تکوینی خاصیت سے واقف تھے، سیاسی اور معاشرتی نصب العین کی صورت میں ان کا مرکزِ خیال اب ملت تھی، وہ جانتے تھے کہ ملت کو نصب العین بنا کر افراد کی قربانی دینا اور بے خودی کو اختیار کرنا ضروری ہے، ان کی فکر کی آیندہ تشکیل کے یہ سب تار و پود ہیں، گویا ان کی رسمی تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کی منظم فکر کے بہت سے نقوش کی داغ بیل پڑ گئی تھی، یہ نقوش کہیں گہرے تھے، کہیں اتھلے اور کچھ چیزیں دھندلا سی ملتی ہیں۔ حرکت اور عمل کے ساتھ اس زمانے میں توحیدی تصورات ان کی وقتی فلسفیانہ تخییل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

اقبال پھر اپنے وطن میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک

اس عہد کے خیالات زیادہ تر پرانے تصورات کا اعادہ ہیں مگر ان میں گہرائی، گیرائی اور وضاحت زیادہ ہے، وحدت وجود کے عامیانہ تصور کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، رجائیت سے بھرپور حرکت عمل کی دعوت ہے، اسلام سے گہرا تعلق اور بانیِ اسلامؐ سے والہانہ شغف ہے، جس کی حدیں کہیں کہیں تو غیر محتاط خوش اعتقادی سے مل جاتی ہیں، نعت کا مطلع ہے۔

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر　وہ بزم یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر[1]

مسلم کرداروں خصوصاً اہل سطوت اسلاف کی اور ان کے تاریخی ورثے اور آثار کی ثقافتی قدروں اور عظمتوں پر توجہ جامد مقاصد اور بالا تر تمناؤں کی تلقین، اقبال کے افکار کا یہی محور ہے۔

وحدتِ وجود

شاعرانہ وحدتِ وجود کے بجائے اب کائنات باری تعالیٰ کے صفات کی جلوہ گری ہے، اس کے اوصاف کا کرشمہ ہے، جو ہر شے سے نمایاں ہے، اس کی طلب اور جستجو میں کامیاب ہونے کی شرط اس کے آثار قدرت کا مشاہدہ ہے، اس کا روئے روشن انہی آئینوں میں عکس ریز ہے، چاند سے خطاب ہے۔

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں　پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں

استادہ سرو میں ہے، سبزے میں سو رہا ہے　بلبل میں نغمہ زن ہے خاموش ہے کلی میں

آ! میں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا　نہروں کے آئینے میں، شبنم کی آرسی میں

اب ، وحدت وجود ، کے مستند تصورات اقبال کے سامنے ہیں، توحید وجودی سے متعلق صوفیا کے شطحیات اور ان کے پس منظر پر ان کی نظر ہے۔ "وحدت" عین کثرت نہیں بلکہ کثرت کا

---

[1] باقیات اقبال ص ۱۰۷

نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، یہ حال ہے واقعیت نہیں اضطرار ہے، اختیاری عقیدہ نہیں، یہ اپنے مرکز خیال میں گویا ایک طرح کی محویت ہے، اور عشق کی غیر معمولی اور معمولاً وقتی حالت ہے۔

من کہ شمع عشق را در بزم دل افروختم ۔۔۔ سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم[1]

وطنیت اور قومیت | اقبال نے وطنیت کے سیاسی تصور پر اس زمانے میں سخت نکتہ چینی کی ہے، یہ مادی جدید تہذیب کا تراشیدہ بت ہے، جس سے انسان کی روحانی وحدت کی جڑ کٹ جاتی ہے،

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ۔۔۔ ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ۔۔۔ تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ۔۔۔ جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بین الاقوامی رقابتوں اور کمزور قوموں کو غلام بنانے کی کوششوں کی بنیاد قومیت اور وطنیت کا یہی محدود تصور ہے،

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔۔۔ تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو یہ تصور اس کی اخوت کے لیے سم قاتل ہے۔

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے ۔۔۔ قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

یوں تو مقامیت کا عام طور سے انجام تباہی ہے۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ۔۔۔ رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

لیکن مسلمانوں کی تو قومیت ہی اس کے مذہب سے وابستہ ہے جو نام ہے مخصوص عقائد،

---

[1] باقیات اقبال ص ۱۲۲

اعمال اور شعائر و مراسم کا جن سے اُن کی زمانی اور مکانی وحدت اور تسلسل و توا تر قائم ہے، اور اپنی جگہ ایک مستقل ثقافتی اکائی اور وحدت ہیں۔ یہ کسی رنگ، نسل اور مقام کا پابند نہیں۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں ۔۔۔ جذب باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

اس لیے ہر وطن مسلمان کا وطن ہے۔ مسلمان کہیں کا ہو اسکا وہی وطن ہے کیونکہ اس پر کسی وطن کا ٹھپا نہیں۔

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا ۔۔۔ تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

اگر قومیت کے تصور کو محسوس صورت دینی ضروری ہی ہو، اور اس کے بغیر یہ تصور فعال نہ بن سکے تو پھر اس کی بنیاد ہند و فارس یا شام و مصر نہیں بلکہ مدینۂ رسالت اس کا دیس ہے، وہ ملت اسلامی کا مبدا ہے، اور اس سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو دلی لگاؤ ہے۔

ہے اگر قومیت اسلام پابندِ مقام ۔۔۔ ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو ۔۔۔ نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں ۔۔۔ صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اور اس مسلسل بدلتے وطن کا وطن قومیت کا حقیقی قافلہ سالار نہ کسی مملکت کا سلطان ہے نہ کسی فسطائیت کا قائد یا جمہوریت کا صدرِ اعظم بلکہ میرِ حجاز اور رسولِ عربی ہے۔

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا ۔۔۔ اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کے نزدیک قومیت کے تصور کے فعال اور مؤثر ہونے کے لیے قومیت کا احساس جس کو بالفاظ دیگر قومی خودداری کہنا چاہیے، قومی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اور جن

لہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر

وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے، وہ بھی قومی حیات کی ضروریات میں سے ہیں[1]

اسلامی قومیت یا ملیت کے متعلق اقبال کا یہ واضح موقف آخر تک قائم رہا، آدمی اپنی جنم بھومی سے طبعی لگاؤ ہوتا ہے، اقبال کو اس سے انکار نہ تھا، اختلاف، وہ اس سیاسی نصب العین بنانے کے اور اس کو ہر طرح کی جد و جہد کا محور قرار دینے خلاف تھے اور برابر رہے۔

مادی تہذیب و ثقافت | یورپ کے زمانہ قیام میں ہی اقبال مغربی تہذیب کی پیشین گوئی کر چکے تھے، جس تہذیب کی بیخ و بنیاد مادی مفاد پرستی پر ہو، وہ کب تک قائم رہ سکتی ہے، مفادوں کو خاص حدوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا، افراد طبقات اور اقوام کے مفاد ٹکرائیں گے، اور اس کا انجام خود اس تہذیب کی تباہی ہے، جو ان کے توازن پر قائم ہے۔

اسلامی ثقافت | اسلامی ثقافت انسان کی روحانی وحدت اور اسلامی اخوت مبنی ہے، زمان و مقام کی قیدوں سے آزاد، شخصی، طبقاتی اور نسلی مفادوں سے ناوابستہ۔ اس کا اپنا خاص رہن سہن اور انداز نہیں، وہ ایک رخ ہے ایک شعار اور حقیقی فکر ہے، جس کی مسلمان کے شخصی اور جماعتی رہن سہن پر اس کے انداز فکر و اثر پر تاثیر ہونی چاہیے، وہ کوئی ہو، کہیں ہو اور کبھی ہو، اگر اس شعار اس رخ اور اس فکر کو چھوڑ دیا، اور مادی تہذیب کی جھوٹی جگمگا ہٹ سے آنکھیں چندھیا گئیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمانہ اس کو روند ڈالے گا۔

---

[1] انوار اقبال، تقریظ بر "ہندوستان کی اسلامی تاریخ" ص ۲۰۔ [2] مضامین اقبال ص ۱۶۲۔

فریب تہذیب نو میں اگر جنھوں نے اپنا شعار چھوڑا
جہان کی رہ گزر میں پامال صورت نقش پا ہوئے[1]

اگر تہذیب نو کے مرشدوں کے درغلانے میں آکر مسلمان نے اپنے شعار ترک کر دیئے تو یہ اس کے نصب العین کی شکست ہے،

غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے
مسافران حرم کو ظالم رہ کلیسا بتا رہے ہیں[2]

اس رخ شعار اور فکر کے تواتر اور استمرار کو چھوڑ کر یہ ثقافت اپنے حسی وجود میں جامد اور غیر متغیر نہیں، یہ برابر بدلتی رہی ہے اور بدلتی رہنی چاہئے۔ کوئی شے یکسان برقرار نہیں رہتی۔

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

قومی زندگی میں جمود و ثبات کے معنی موت ہیں، قومی حیات میں یہ امتیاز کرنا کہ کن عناصر کو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہیے، اور کن اجزا کا، قومی حیات کی بقا تواتر اور استمرار کے لیے باقی رہنا ضروری ہے، نہایت سخت مرحلہ ہے۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

مغربی تہذیب اور اسلامی ثقافت کے متعلق اقبال کا آخر تک یہی زاویہ نظر رہا، وہ مغرب کی مادی تہذیب اور اس کے افادی انداز کو مسلمانوں کے لیے برابر خطرناک سمجھتے رہے، اور مسلم ثقافت کے بنیادی اور استمراری رخوں کی قدر و قیمت کو انھوں نے

---

[1] رخت سفر ص ۱۸-۱۴ [2] ایضاً ص ۱۹

کبھی فراموش نہ کیا، اور ان کو مسلمانوں کا مقدس اثاثہ مان کر ہمیشہ ان کی حفاظت کی دعوت دی۔

تغیر | تغیر کے تصور میں وسعت زیادہ ہو گئی، اور عمق میں اضافہ ہوا، کائنات کی کوئی شے یکساں اور ایک حال پر نہیں رہتی اسکا کوئی رشتہ لوکوئی تعلق دیرپا نہیں ہوتا، ہر وصال فراق کی تمہید اور ہر جدائی قران کی بشارت ہے۔

ہے خواب ثبات آشنائی آئین جہان کا ہے جدائی

تغیر انقلاب اشخاص سے ہی خاص نہیں، اقوام وملل بھی بدلتی رہتی ہیں، ایک قوم فنا ہوتی ہے دوسری نشوونما پاکر پہلی کی جگہ لیتی ہے اور خلا بھر جاتا ہے،

اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار

قدامت آشنائی اور پیرپردری زمانے کی عادت نہیں، جدت پسندی اس کی فطرت ہے۔

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شئے کو قرار ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

ہے نگین دہر کی زینت ہمیشہ نام نو مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو

ظاہر فعلیت کا خفا اور مخفی صلاحیت کا ظہور اسی کا نام تغیر ہے، قدرت کا یہی کام ہے کہ ظاہر کو معدوم کرے اور مخفی کو وجود بخشے، نہ کوئی عدم فنائے کامل ہے نہ کوئی وجود بقائے محض ہے، ہر عدم وجود کا پیغام ہے، اور ہر وجود عدم کا مقدمہ کلی کی رخصت پھول کی آمد آمد ہے۔

وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل عدم، عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے!

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

شخصی بقا ہستی کا وجود نہیں، تغیرات کا تسلسل اور تواتر ہے، پہاڑ کی بلندیوں سے نہریں آتی ہیں، اور نشیبی وادیوں کی چٹانوں پر گر گر بوندوں میں بدل جاتی ہیں یہی بوندیں آگے بڑھ کر پھر ندیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے

انسان کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، زندگی کا انتشار جمعیت کی طرف بڑھ رہا ہے،

ایک اصلیت میں ہے نہر رواں زندگی گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی
پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

زندگی کی تالیف اور تالیف کا ضعف و استحکام، موت کے تصادم کی برداشت وغیرہ آئندہ کے افکار ہیں،

وجود کا تسلسل اور زندگی کی لہریں | مستقل فکر اور فلسفیانہ تصور کی صورت میں نہ سہی تاہم زندگی کی نہر رواں کی وحدت اور استمرار کی طرح خود ہستی اور وجود کے سمندر کا بے پایاں اور ناپیدا کنار ہونا اسی زمانے کا خیال ہے، اس بحر ہستی میں زندگی کی موجوں کا جہاں تک تعلق ہے یہ بے اعتبار اور ناپائدار ہیں، شرارے کی چمک یا شعلۂ خس سے زیادہ ان کی حیثیت نہیں، جذبات سے بھرپور "گورستان شاہی" میں کہتے ہیں۔

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحر ناپیدا کنار اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار یہ شرارے کا تبسم یہ خس آتش سوار

انسان کی کائناتی قدر و قیمت | باشعور ہونے اور عرفان ذات رکھنے کی وجہ سے انسان کا

مقصد آفرینش ہوتا۔ اقبال کا یورپ کے سفر سے پہلے کا تخیل ہے، لیکن اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کی فعالی نوعیت پھران کا سرگرم تقاضا ہونا اور اس کے برعکس کائنات کی دوسری چیزوں میں انفعالی استعداد اور انسانی عمل کے اثرات کو قبول کرنے پر آمادگی نیز انسان کے اندر اپنے حلقۂ تاثیر کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی مسلسل حرص اور اپنی حسب خواہش اپنی دانش، بینائی اور توانائی کے بل پر ساری کائنات کو بدل ڈالنے کی صلاحیت یہ اقبال کی نئی اور مستقل فکر ہے، جو ان کے فلسفۂ عمل اور ان کے پیغام سخت کوشی کی جان ہے۔

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے
اس ذرے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

انسان محروم عمل نہیں کہ کائنات جیسی ہے؛ اچھی یا بری، اس کو ہی دیکھے جائے وہ اپنے تماشے کے لئے نئی تراش خراش کرنا اور اس اپنی خواہش دید کے مطابق آراستہ کرنا جانتا ہے وہ نرگس کی طرح نہ مجبور ہے نہ صنوبر کی طرح جامد اور قائم، وہ فعال بھی ہے اور لذت آشنائے جد و جہد بھی۔

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا
محروم عمل نرگس، مجبور تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اسکو
فطرت ہی صنوبر کی محروم تمنا ہے

مسلمان یا انسان کامل | اقبال کی دعوت کا موضوع انسان کامل یا الہی قوتوں کا مظہر خاص ایسا اعلی انسانی پیکر ہے جو انسانی معاشرے کی پیچیدگیاں سلجھا دے انفرادی اور اجتماعی تضاد کو رفع کرکے بین الملی اور بین الانسانی اخلاق کی بنیادوں کو مستحکم کرے

اقبال کے نزدیک ایسے انسان کامل کا ظہور عملاً کسی ایسے معاشرے میں سے ہی ہو سکتا ہے، جو ایسا مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتا ہو جو انسانیت کے وسیع نصب العین کی سب سے بڑی رکاوٹ، رنگ نسل اور درجہ بندی کے دشمن ہوں، دینوی اور کاروباری معاملات میں انکار، دیدۂ ظرف نگاہی اور وسعت قلبی پر مبنی ہوا پنے حاملین میں بے نفسی اور ایثار کی پرورش کریں، اور اپنے عملی نمونوں اور ترغیب و دعوت سے اپنے حلقۂ اثر کو برابر بڑھاتے چلے جائیں۔ اس معاشرے میں اگر ایک طرف روشنی ہو تو دوسری طرف گرمی، اخلاقی طاقت کی حیثیت میں اسمیں تصادم اور مقابلے کی تاب و توان ہو تو دوسروں کے مصائب اور سختیوں کو محسوس کرنے کے لیے رحمت و رقت۔ اقبال اسلامی معاشرے کو ان خصوصیات کا حامل سمجھتے ہیں، اس لئے قدرتاً انکا مطمح نظر اسلامی معاشرہ ہوتا ہے۔ اسلام اپنی سیدگی سادی تعلیم کے لحاظ سے عقل سلیم کے مطابق بھی ہے اور اس کے باطن میں ایسے اوصاف پنہاں ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے نکل سکتا ہے اور کامیابی کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچ سکتا ہے[1]

اقبال کی عمر بھر کی دعوت کے مرکز انسان کامل کو باہر نکالنے کی کوشش اور اسلامی معاشرے کی برومندی اور زرخیزی کی تبلیغ اسی عہد سے شروع ہو جاتی ہے۔ نوید صبح ہی خواب کے ماتے مسلمان کو جگاتے ہیں۔

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو — وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو
وسعت عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب — دامن گردوں سے ناپید ہوں یہ داغ سحاب

---

[1] اقبال کے خط بنام ڈاکٹر نکلسن سے ماخوذ، مطبوعہ مضامین اقبال ص ۷۲-۷۷۔

کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز
پھر سکھا تاریکیِ باطل کو آدابِ گریز

تو سراپا نور ہے، خوشتر ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے

ہاں، نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

اسلام اور اس کے معاشرے کی ندرت اور اس کی پنہاں صلاحیتوں کو نمایاں کرتے ہوئے مسلمان کی غفلت اور بے خبری کو دور کرتے ہیں۔

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو، پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے

عالم کی زیب و زینت اور حسن و جمال مسلمان کی جدوجہد پر موقوف ہے،

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

بے خودی اور خودی | بے خودی کا تصور اب فکری حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ فرد محض مجاز اور بے حقیقت نہیں رہا بلکہ اب اپنی جگہ معنویت رکھنے لگا ہے، بے خودی اور معاشرہ ہی حقیقت نہیں ہے بلکہ اس نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس میں شخص اور اس کی انفرادیت کی گنجائش نکل آئی ہے۔

زندگی کے سمندر میں چھوٹی چھوٹی لہریں اپنا مقام اور مستقل دائرۂ عمل رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے غیر محسوس ربط رکھتی ہیں، اور سمندر سے ان کا تعلق کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں ہے، ان لہروں کی انفرادیت اور شخصیت ان کی ہستی، ان کا

ی عمل اور دائرہ عمل سب سمندر کی ہستی پر موقوف اور اس کے اندر محدود ہے۔
کے باہر نہ لہریں ہیں نہ ان کا عمل اور دائرہ عمل ؎ زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
ے پاس جو کچھ ہے سمندر کی دین ہے، اس کا مایہ سمندر ہے، چنانچہ فرد نے جو کچھ لیا ہے
اور جمعیت سے لیا ہے، جو سیکھا ہے، اس سے سیکھا ہے، اس کا صحیح عمل جو اس کی
ں کا تحفظ کر سکے اس کے اثر اور اس کے دائرہ اثر کو وسعت دے سکے ملت
ہم آہنگی پر موقوف ہے اگرچہ خود ملت کی بقا، اس کا عمل اور اس کا ارتقا بھی
د سے آزاد نہیں بلکہ افراد پر منحصر ہے۔

بانی تری ملت کی جمعیت سے تھی　　جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں، اور بیرون دریا کچھ نہیں

خودی کا تصور اگرچہ پیدا ہو گیا ہے، لیکن ابھی اس کے نقوش زیادہ گہرے اور
ں کی خصوصیات زیادہ واضح نہیں ہوئی ہیں، نہ اس کی فعالی کے حدود او اس کی ترقی
مکانات متعین اور مشخص ہوئے ہیں۔

ت اور دوزخ | اقبال نے اپنی خیالی "سیر فلک" میں جنت اور دوزخ کو بھی دیکھا ہے
زخ کو تار، نور سے تہی اور ہنگاموں سے خالی اور بالکل سرد پایا۔ ان کی نرالی تخییل
انھیں بتایا کہ درحقیقت بذاتِ خود دوزخ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ اس کا سامان تعذ
ہ ہے، مجرم خود اسے لپیٹ کر آتے ہیں اور اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھتے ہیں۔

دور جنت سے آنکھ نے دیکھا　　ایک تاریک خانہ سرد و خموش
طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ　　اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر　　کرۂ زمہریر ہو روپوش

میں نے پوچھی جو کیفیت اسکی | حیرت انگیز تھا جواب سروش
یہ مقام خنک جہنم ہے | نار سے نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اسکے | جس سے لرزاں ہیں مرد عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں | اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

جنت اپنی مستقل ہستی رکھتی ہے، اس کے قصر حوروں کے جلوں سے معمور ہے کے چھلکے، اور ساغروں کے کھنکنے کا شور، پینے والوں کی نوشانوش کی صدائیں، طوبیٰ کی شاخوں پر طیور کے نغمے غرض یہ کہ۔

کیا سناؤں تمھیں ارم کیا ہے | خاتم آرزوے دیدہ و گوش
شاخ طوبیٰ پہ نغمہ ریز طیور | بے حجابانہ حور جلوہ فروش
ساقیان جمیل جام بدست | پینے والوں میں شور نوشانوش

گویا عالم آخرت کی یہ اصلی حقیقت ہے، اب اگر کوئی اپنے بوجھوں سے اتنا بوجھل ہو چکا ہو کہ وہاں تک پہنچ ہی نہ پائے تو آخرت کی مسرت بخش فضاؤں کا کیا قصور، اقبال کی اس خیالی تصویر کو شاعرانہ وجدان کہکر نہ چھوڑا جائے تو ان کی جنت و دوزخ کے متعلق آئندہ فکر کے یہ بہت دھندلے اور دور کے نشان ہیں،

دوش و فردا یا ماضی و مستقبل | اقبال اپنی جگہ بہت زیادہ رجائیت پسند تھے، انھیں اپنے نفس گرم پر بھی بھروسا تھا، اور خاکستر ملت میں دبی ہوئی چنگاریوں پر بھی اعتماد تھا، ان کی چشم بصیرت ملت اسلامی کی تقدیر دیکھ رہی تھی، اور وہ دکھا رہے تھے،

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ | جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ
آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش | اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی		شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز

ملت اسلامی کی زبون حالی کے باوجود اس کے معتقدات اور اس کے خطوط عمل کے مٹے مٹے نشانون سے انھیں بڑی توقعات تھیں، وہ ان نشانون کو گذشتہ روشن فتوحات دکھا کر گہرا اور شورش انگیز بنانا چاہتے تھے، اس امت کا دوش یا ماضی دیکھکر اور دکھا کر اس کے فردا یا مستقبل کو روشن دیکھ رہے تھے۔ اور دکھا رہے تھے، ماضی اور مستقبل یا دوش و فردا کی اسوقت تک یہی اہمیت تھی،

میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے		یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے

سامنے رکھتا ہون اس دور نشاط افزا کو مین
دیکھتا ہون دوش کے آئینے میں فردا کو مین

زمانے کی خلاق فطرت اور اُس کی فعلیت کا استمرار اور تواتر جوان کے فلسفے کا اہم عنصر ہے، بعد کی فکر ہے۔ (باقی)

سلسلۂ دارالمصنفین

غالب مدح و قدح کی روشنی مین

حصۂ اول

اس میں خود مرزا غالب کی زندگی مین اور اون کی وفات کے بعد ۱۹۲۰ء تک انکی حمایت و مخالفت مین جو کچھ لکھا گیا ہے، اسکو اجمال کے ساتھ اکٹھا کر کے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، غالبیات کے ذخیرہ مین ایک بہت ہی پر از معلومات و مفید کتاب کا اضافہ۔ اسکا دوسرا حصہ جس مین ۱۹۲۰ء کے بعد اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اوس پر ناقدانہ تبصرہ ہوگا۔ زیر طبع ہے۔ قیمت ؎ ۱۵۰

رصدگاہ محمد شاہی دہلی

یا

جنتر منتر

از۔ جناب شبیر احمد خان صاحب غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

سوائی راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہ جو عوام میں "جنتر منتر" کے نام سے مشہور ہوئی اسلامی مشرق کی آخری اور ہندوستان کی غالباً سب سے پہلی رصدگاہ تھی، (اور آخری بھی) اس سے پہلے اس ملک میں کسی رصدگاہ کا پتہ نہیں چلتا، چنانچہ خود راجہ جے سنگھ "زیج محمد شاہی" کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"و مدت مدید شدہ کہ از راجہ ہائے ذوی الاقتدار کسے پیرامون آن نگردید و در فرق اسلام ہم از زمان شاہ شہید مغفور میرزا الغ بیگ تا این زمان کہ زیادہ از سہ صد سال گزشتہ ہیچ یکے از سلاطین ذی شان و صاحب ثمود تان بشد ہمکان بدین کار متوجہ نشدہ"[1]

بلکہ ایک اطالوی مورخ علم الہیئت جیو رجیو ابیتی کا تو یہ کہنا ہے کہ اس ملک میں کبھی کوئی اور رصدگاہ تعمیر ہی نہیں ہوئی، کیونکہ محکمہ آثار قدیمہ کی انتھک کوششوں کے باوجود (جنتر منتر کے سوا)، آج تک کسی رصدگاہ کے کھنڈر نہیں مل سکے،

---

[1] زیج محمد شاہی یونیورسٹی کلکشن مولانا آزاد لائبریری مخطوط ۳۔ زیج فارسیہ علوم ورق ۲ ظ

among the ruins of the cities of Hindustan no trace of observatories are found, as in Babylonia" (G. Abetti: The History of Astronomy. P. 21 ۱؎

ویسے اس ملک میں قدیم الایام سے نجوم و جوتش کا چرچا رہا ہے، قدیم ہندوستان میں تو جوتش ودیا یہاں کے مذہب کا جزو لاینفک تھی، قرون وسطیٰ میں بھی غزنویوں کے زمانے ۲؎ سے حکومت مغلیہ کے اختتام تک نہ صرف ہندوؤں، بلکہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات میں بھی نجوم اور جوتش کا رواج رہا ہے، (جس کی تفصیل ایک مستقل پیش کش کی متقضی ہے) علم الہیئت بھی یہاں اعلیٰ نصاب کی تعلیم میں داخل رہا ہے، بالخصوص مغل بادشاہ اکبر کے زمانہ سے جس کا حکم تھا،

"و حکم شد کہ اہلین از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نکنند (دبستان المذاہب ص ۳۲۸)

بایں ہمہ کوئی رصدگاہ قائم نہیں کی گئی، اگرچہ یہاں کے فضلا میں اس کی لیاقت و اہلیت بھی تھی، انھوں نے حکومت کے سامنے اس کے قیام کی تجاویز بھی رکھیں، بلکہ بعض حکمرانوں نے یہ کام شروع بھی کرایا، مگر یہ منصوبہ تکمیل تک نہ پہونچ سکا۔

قیام ازل نے یہ شرف صرف مغل تاجدار محمد شاہ کے دور حکومت کے لیے اور

۱؎ ہندوستان کے شہروں کے کھنڈروں میں بابل کی طرح کسی رصدگاہ کے نشان نہیں ملتے

۲؎ نجوم کے ساتھ اعتنا کا قدیم ترین حوالہ غزنوی عہد کے مشہور ہندی المولد شاعر مسعود سعد سلمان کے یہاں ملتا ہے، اگرچہ باور کرنے کی بھی وجوہ ہیں کہ غزنویوں سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان کے شمالی مغربی علاقہ (سندھ و ملتان) میں جہاں اسماعیلی تحریک زور پکڑ رہی تھی، نجوم کا رواج رہا ہوگا۔

اس سے زیادہ جے پور کے فاضل روزگار راجہ جے سنگھ سوائی کی علمی مساعی کیلئے مقدر کر رکھا تھا۔

مگر اس کی تفصیل سے پیشتر اس کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

رصدگاہ جے سنگھ کا پس منظر

راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہ، رصدگاہوں کے اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے جس کا آغاز عباسی خلیفہ مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ) نے کیا تھا۔ رصدگاہ مامونی سے پہلے کسی ایسی رصدگاہ کا پتہ نہیں چلتا جو حکمران وقت کی سرپرستی میں قائم کی گئی ہو۔

قاضی صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے کہ جب مامون خلیفہ ہوا تو اس نے اقتدار ملک سے علما ہیئت کو جمع کیا اور بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں قائم کرائیں ان ماہرین علم الہیئت نے آلات رصدیہ میں اصلاح کی اور ان کی مدد سے آفتاب کے میل کلی (obliquity of the ecliptic) خروج مرکز (Eccentricity) اور نقطہ اوج" (Apogee) کو متعین کیا۔[1] لیکن ان سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش تھی۔[2]

مامون کے بعد بھی رصدگاہیں قائم کی جاتی رہیں، چنانچہ ایک جرمن محقق نے عہد اسلام میں قائم شدہ صرف ان رصدگاہوں کی تعداد جو سنہ ۸۳۰ء اور سنہ ۱۱۵۰ء کے درمیان تعمیر ہوئیں۔ اور جن کی دریافتیں ہنوز قابل رسائی مخطوطوں میں محفوظ ہیں ایک سو چار[1150] بتائی ہے۔[3]

۱؎ قاضی صاعد اندلسی۔ طبقات الامم صفحہ ۵۰۔ ۲؎ قانون مسعودی۔ جلد ثانی صفحہ ۵۲۰

کتاب التفہیم شائع کردہ، ریمز رائٹ صفحہ ۱۱۰ کتاب التفہیم فارسی ص ۱۹۰-۱۹۲

Cambridge History of Iran vol. V P. 672 ۳؎

ان میں بڑی تعداد ان رصدگاہوں کی تھی، جو ماہرین علم الہیئت نے سرکاری سرپرستی سے آزاد رہ کر محض اپنے ذاتی شوق سے قائم کی تھیں جیسے الکندی، ابوحنیفہ الدینوری البتانی، ابوریحان البیرونی کی رصدگاہیں۔ مگر ان کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ ذیل میں صرف انھیں رصدگاہوں کا اجمالاً ذکر کیا جا رہا ہے، جو سرکاری سرپرستی میں یا حکمران طبقے کے ایما سے قائم کی گئیں۔

رصدگاہ مامونی کے بعد سب سے اہم اور قابل ذکر رصدگاہ جو سرکاری سرپرستی میں قائم ہوئی، بغداد کی رصدگاہ تھی، جسے عضد الدولہ کے بیٹے شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں کواکب ہفتگانہ کی سیر و گردش کا مشاہدہ کرنے کیلئے تعمیر کرایا تھا، اس رصدگاہ سے جن ہیئت دانوں کے نام وابستہ ہیں، ان میں خصوصیت کے ساتھ ابوسہیل ویجن بن رستم کوہی (جو اس رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ تھا) ابوحامد صغانی اور ابوالوفا قابل ذکر ہیں[۱۵]، یہ لوگ علم ہیئت میں تجر و تمر کے علاوہ آلات رصدیہ کی تیاری میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے،

اگلی قابل ذکر رصدگاہ ابن یونس کی ہے جو مصر کے اسماعیلی خلیفہ العزیز باللہ کے حکم سے تعمیر کی گئی، اور جہاں ابن یونس نے فلکی مشاہدات کئے تھے، ابن یونس کی ارصادی سرگرمیاں العزیز باللہ کے بیٹے الحاکم بامراللہ (۳۸۶ھ - ۴۱۱ھ) کے عہد میں ختم ہوئیں اس نے انھیں جس زیچ میں مدون کیا، اسے خلیفہ وقت کے نام پر "الزیج الکبیر الحاکمی" کے عنوان سے معنون کیا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد شیخ بو علی سینا نے والی اصفہان علاء الدولہ ابن کاکویہ کے حکم سے اصفہان میں ایک رصدگاہ قائم کی مگر کثرت اسفار کی وجہ سے رصدگاہ ایک جگہ نہ

۱۵۔ ابن القفطی تاریخ الحکماء ص ۳۵۳۔

دوسری جگہ منتقل ہوتی رہی۔ اس لیے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی،[۱]

اگلی صدی میں سلجوقی ترک اسلامی مشرق پر غالب آگئے، انھیں نجوم وہیئت دلچسپی نہ تھی۔ مگر خراج کی وصولی کے لیے تقویم (Calendar) کی اصلاح اور تعین کی اشد ضرورت تھی۔ لہٰذا سلجوقی سلطان ملک شاہ کے حکم سے اصفہان میں ملک شاہی[؟] قائم کرائی گئی،[۲] جس میں سلطنت کے مشاہیر ہیئت داں جیسے عمر خیام، اسفزادی، نجیب بن ماموت، ابو العباس لوکری وغیرہم جمع ہوئے۔ ان لوگوں نے ۴۶۷ھ میں نوروز کا دن ۱۰ رمضان المبارک قرار دیا گیا، اسی کی بنیاد پر اس دورِ حکومت میں خراجی سال متعین ہوا،

بین الاقوامی انداز پر سب سے پہلے رصادی سرگرمیاں مراغہ کی رصد گاہ ظہور پذیر ہوئیں، کیونکہ اس کے اندر نہ صرف عراق وخراسان ہی کے ہیئت دانوں حصہ لیا۔ بلکہ اندلس (اسپین) مغرب (شمالی افریقہ) اور جیسا کہ نیدھم (Needham) کا خیال ہے چینی ماہرین فلکیات نے بھی نمایاں کردار انجام دیا۔ اس رصد گاہ کو ۶۵۷ھ میں ہلاکو خاں نے محقق طوسی کی زیر نگرانی قائم کیا تھا، اس کام کے لیے فضلائے عصر و ماہرین علم الہیئت جیسے موید الدین عرضی، نجم الدین کاتبی، فخر الدین مراغی، فخر الدین اخلاطی، تقی الدین مغربی، قطب الدین شیرازی بلائے گئے، اور شہر مراغہ کے شمال ایک بلند ٹیلے پر مجوزہ رصد گاہ تعمیر کرائی گئی۔[۳] رصد گاہ مراغہ کی فلکیاتی دریافتیں "زیج ایلخانی" میں مدون کیا گیا، جو بعد کے ہیئتی حسابات کے لیے نمونہ بنی۔

---

[۱] ابن ابی اصیبعہ۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد ثانی ص، [۲] ابن الاثیر کامل ج ص ۳۲ [۳] حبیب السیر جلد سوم جزء اول ۵۹،

۱۴۲۰ء میں تیمور کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کرائی۔[1] تیموری خاندان میں ریاضی وہیئت میں مہارت تامہ کے لئے دو بادشاہ مشہور ہیں، ماوراءالنہر (وسط ایشیا) میں الغ بیگ اور ہندوستان میں ہمایوں، مورخین الغ بیگ کی ریاضیاتی و ہیئتی مہارت کے باب میں رطب اللسان ہیں، چنانچہ خواندمیر "حبیب السیر" میں اس کے علم وفضل کے متعلق لکھتا ہے :-

"مرزا الغ بیگ . . . . . دانش جالینوس با حشمت کیکاؤس جمع فرمودہ، ودر سایر فنون خصوصاً علم ریاضی بنجوم دراں زمان عدیل ونظیر نداشت۔"[2]

اُسے خود بھی ان علوم میں اپنی دستگاہ عالی کا احساس تھا، جیسا کہ "زیچ جدید سلطانی" کے دیباچہ میں لکھتا ہے،[3] اس پر مستزاد یہ کہ باپ دادا کے جمع کئے ہوئے خزانے اس کے دست تصرف میں تھے۔ لہٰذا اس نے رصدگاہ کی تعمیر اور آلات رصدیہ کی تیاری پر بیدریغ روپیہ خرچ کیا، چنانچہ گستاؤلی بان "تمدن عرب" میں لکھتا ہے :-

"الغ بیگ کو بھی جو سمرقند کا بادشاہ تھا، اور جس کا زمانہ پندرہویں صدی کا وسط ہے، علم ہیئت کا بے انتہا شوق تھا، اس نے ایسے کامل آلات رصد بنوائے جو اس وقت تک نہیں بنے تھے۔

کہتے ہیں کہ اس کا ربع دائرہ اتنا بڑا تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی سینٹ صوفیہ کی بلندی کے برابر تھا۔"[4]

رصدگاہ کا انتظام پہلے اس زمانہ کے ایک عظیم ماہر ریاضی وہیئت غیاث الدین

---

[1] رحمن التواریخ صفحہ ۱۰۳ [2] حبیب السیر جلد سوم جزء سوم صفحہ ۱۵۱

[3] زیچ الغ بیگ ورق ۲ ظ [4] لی بان۔ تمدن عرب ۴۴۳

جمشید کاشی کے سپرد کیا، ان کی وفات پر اپنے استاد قاضی زادہ رومی (شارح ملخص چغمنی) کو یہ انتظام تفویض کیا، مگر رصد کی تکمیل سے قبل ہی ان کا بھی انتقال ہو گیا لہٰذا بادشاہ الغ بیگ نے خود بنفس نفیس جہانبانی و حکمرانی کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی قوشجی کی مدد سے اس کام کو سرحد تکمیل تک پہونچایا[1] اور نئی دریافتوں کو ایک زیچ میں مدون کیا جو "زیچ جدید سلطانی" یا "زیچ الغ بیگ" کہلاتی ہے[2]۔

"زیچ الغ بیگ" "زیچ ایلخانی" ہی کے انداز پر تصنیف کی گئی۔ موخر الذکر میں چار مقالے ہیں، پہلا مقالہ تواریخ۔ (Calander) پر ہے، دوسرا کواکب کی سیر و گردش پر تیسرا مقالہ اوقات و مطالع پر، اور چوتھا نجومی اعمال (جوتش) پر۔ یہی انداز "زیچ الغ بیگ" میں ملحوظ رکھا گیا ہے، اس کا بھی پہلا مقالہ معرفت تواریخ میں ہے، دوسرا معرفت اوقات و مطالع میں، تیسرا ستاروں کی سیر و گردش کی معرفت میں، اور چوتھا نجوم (جوتش) پر۔

یہی نہیں بلکہ کارکنان رصد گاہ سمرقند نے "زیچ ایلخانی" کی فلکیاتی دریافتوں ہی کو اپنی بیتی سرگرمیوں کی بنیاد بنایا اور موخر الذکر کی بہت سی دریافتیں جوں کی توں لے لیں، البتہ کچھ میں اپنی طرف سے اصلاح کی، چنانچہ اس رصد گاہ کے پہلے منتظم غیاث الدین جمشید کاشی سے قاضی نور اللہ شوستری نے "مجالس المومنین" میں نقل کیا ہے کہ چاند گہنوں کو ہم نے خود رصد کیا ہے، اور انھیں اوصاف کی بنیاد پر قمر کے اوساط

[1] زیچ الغ بیگ ورق ۵۰ [2] British Museum: Catalogue of Persian Manuscript. P. 4-6 [3] قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین ص ۳۲۸

وتعدیلات کی تصحیح کی ہے، باقی کواکب کے باب میں ہم نے زیج ایلخانی پر اعتماد کیا ہے،

ہندوستان سے باہر رصدگاہ سمرقند اور زیج الغ بیگ پر عہد اسلام کی ہیئتی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔ اس کے بعد ریاضی وہیئت کے علما ضرور پیدا ہوئے، مگر نہ تو کوئی قابل ذکر رصدگاہ ہی تعمیر ہوئی، اور نہ کوئی صف اول کا ہیئت داں ہی پیدا ہوا، اس لیے یورپی فضلا، عہد اسلام کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ رصدگاہ سمرقند پر ختم کر دیتے ہیں[1]۔

مگر یہ قلت مطالعہ اور کوتاہی فکر و نظر کا نتیجہ ہے، ہیئت و فلکیات کی ترقی عجم میں بند ہو گئی تو کیا ہوا، ہندوستان میں اس کی سرگرمیاں بڑی آب و تاب سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک[2] جاری رہیں، اور ان کے اندر گل سرسبد اودھیراج راجہ جے سنگھ سوائی کا نام ہے، انھوں دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں رصدگاہیں تعمیر کیں، جو رصدگاہ سمرقند کے انداز پر قائم کی گئی تھیں، اور جن میں اسی قسم کے آلات رصدیہ استعمال کئے گئے تھے، اگرچہ بعد میں راجہ نے ان کے اندر کچھ اصلاحیں بھی کر دیں[3] اس طرح "زیج الغ بیگ" ہی کے انداز پر ایک نئی زیج مرتب کی جو اس نے اپنے بجائے اپنے آقائے ولی نعمت بادشاہ محمد شاہ کے نام معنون کی اور اس کا نام زیج محمد شاہی رکھا

رصدگاہ سوائی راجہ جے سنگھ

سوائی راجہ جے سنگھ نے یہ رصدگاہ مغل بادشاہ محمد شاہ (۱۱۳۱-۱۱۶۱ھ) کے ساتویں سال جلوس یعنی ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں تعمیر کی اس رصدگاہ کی دریافتوں کی صحت کی تصدیق کے لیے اسی قسم کی رصدگاہیں، جے پور، اجین، بنارس اور متھرا میں بھی بنوائیں، لیکن بدقسمتی سے بعد میں طوائف الملوکی اور

---

[1] ملاحظہ ہو Arnold, Legacy of Islam - P. 397 [2] اٹھارویں صدی کے ثلث اول میں مولوی غلام حسین جونپوری نے "جامع بہادر خانی" تصنیف کی (۱۸۳۵ء) [3] تفصیل آگے آرہی ہے۔

انحلال سلطنت کے نتیجے میں ملک کے اندر جو تباہی و بربادی پھیلی، اس کی وجہ سے یہ رصد گاہ بھی برباد ہو کر کھنڈروں کا ڈھیر رہ گئی۔

الغ بیگ کی رصدگاہ اور "زیج" کے برخلاف جو ایک خود پسند بادشاہ کے جذبہ خود نمائی کی آسودگی و تشفی کے لیے وجود میں آئی تھیں[۱]، راجہ جے سنگھ نے یہ رصدگاہ اور بعد میں "زیج محمد شاہی" خدمت خلق اور رفاہ عام کی غرض سے تعمیر اور تصنیف کیں، چنانچہ وہ خود اپنی "زیج" کے دیباچہ میں لکھتا ہے: "چونکہ جملہ مذہبی رسوم کی ادائیگی صحیح اوقات کے ساتھ مشروط ہے اور صحیح اوقات کا تعین مختلف مظاہر فلکی کے ظہور کے ساتھ وابستہ ہے، جس کی معرفت کے دو ہی طریقے ہیں۔ مروجہ زیجوں اور تقویموں کی مدد سے بذریعہ حساب ان کا تعین اور برای العین مشاہدہ سے اس کی دریافت ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مطلع اکثر غبار آلود رہتا ہے، موخر الذکر طریقہ ہیئت قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عرصہ دراز سے یہاں حساب کا طریقہ مروج ہے، مگر اس میں یا تو پرانے گرووں کا سہارا لینا پڑتا تھا، یا متداول زیجوں پر اعتماد کرنا پڑتا تھا، (مثلاً "عہد شاہجہانی سے پیشتر "زیج الغ بیگ" پر اور بعد میں زیج شاہجہانی پر) مگر ان زیجوں کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ امتداد زمانہ سے یہ قابل اعتماد نہیں رہی تھیں کیونکہ ان پر مبنی حساب کے ذریعہ مظاہر فلکی کے ظہور کا جو وقت مستخرج ہوتا تھا، برای العین

---

[۱] زیج الغ بیگ ورق ۲ تا

"چوں حضرت باری عز اسمہ . . . . این بندۂ فقیر الغ بیگ موہبتے عظمیٰ و مکرمتے کبریٰ شرف اختصاص و امتیاز بخشید، خواست تا مضمون شعر۔ ان آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار بر کتابہ غرائب روزگار نگاشتہ آید و درایت افتخار و اشتہار بر قمہ قبہ فلک دوار افراشتہ رصد ستارگان اختیار فرمودہ"

مشاہدہ (مرصود) سے اُس کی تصدیق نہیں ہوتی تھی۔

راجہ جے سنگھ نے اس مشکل کو بادشاہ محمد شاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ جو علوم ریاضیہ میں راجہ ادھیراج کے تبحر علمی اور ہیئت و فلکیات میں اُن کی دستگاہ عالی سے اچھی طرح واقف تھا، راجہ کو حکم دیا کہ وہ علم ہیئت کے ماہرین کو جمع کر کے رصدگاہ قائم کرے اور اُس کی دریافتوں کی مدد سے ایک نئی "زیچ" مرتب کرے، جس سے اس مشکل کا ازالہ ہو سکے، شاہی حکم کی تعمیل میں راجہ نے پہلے یہ رصدگاہ (جنتر منتر) قائم کی اور پھر اس کی فلکیاتی دریافتوں کی مدد سے ایک نئی زیچ "(زیچ محمد شاہی) مرتب کی۔

چنانچہ پہلے تو وہ اپنی ریاضیاتی حذاقت و مہارت کا ذکر کرتا ہے۔

" ایں خیر خواہ اصناف آفرینش و تماشا کار گاہ دانش بینش سوائی جے سنگھ از بدو فطرت بعنوان شعور بلفن ریاضی مشغوف و مالوف بود و ہموارہ عنان طبعش بکشف دقائق و غوامض مصروف، و بتائید کردگار از اصول و قوانین آن حظ وافر و نصیبے کامل حاصل کرد"[۵]

اس کے بعد اس مذہبی اشکال کا ذکر کرتا ہے جو تقویم زیجوں پر اعتماد کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

" استخراج تقادیم کواکب از زیجہائے متعارف ...... اغلب و اکثر اوقات دور از مرصود و عیاں می یابند خصوصاً رویت اہلہ کہ حساب آن با مشاہدہ کم موافقت می کند۔ و حال آنکہ کارہائے منشرکہ ارباب ملل ونحل و اصحاب دین و دول بآں منوط و مربوط است۔ و ہمیں طور در اوقات ظہور و خفائے کواکب سیارات و از منہ کسوفات و خسوفات اکثر اوقات تفاوت فاحش رو مے نماید"

---

۵ زیچ محمد شاہی ورق اب سے ایضاً

لہذا سوائی راجہ جے سنگھ نے بادشاہ سے اس کا ذکر کیا۔ اور اس نے (بادشاہ نے) اس کا حل یہی بتایا کہ خود راجہ ایک مستقل رصد گاہ قائم کرے اور اس کی فلکیاتی دریافتوں کی مدد سے ایک نئی زیج مرتب کرے۔

"این معنی را بجناب ...... بادشاہ غازی محمد شاہ ...... رسانید۔ فرمودند کہ چون آں دانائے اسرار را دریں امر مهارتے تمام است و هند سان وہیئت دانان فرقہ اسلام و برہمنان و دانایان فرنگ جمع نمودہ و آلات رصدی ساختہ بحقیقت کار رسیدہ، چناں سعی نماید کہ ایں اختلال کہ در زمان محسوب امور مزبورہ و وقت مرصود ہ ایشاں واقع می شود، مرتفع گردد۔"[1]

اس حکم کی تعمیل بغایت دشوار تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ تو ہندوستان میں رصد بندی کا چرچا رہا تھا۔ اور نہ مسلم ہندوستان میں۔ لیکن پھر بھی راجہ اس شاہی حکم کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"مرچند کہ این امر خطیر بود و مدت مدید شد و کہ از راجہائے ذوی الاقتدار کسے پیرامون آں نگردیدہ ... و در فرقہ اسلام هم از زمان شاہ شہید المغفور میرزا الغ بیگ تا این زمان کہ زیادہ از سہ صد سال گذشتہ ہیچ یکے از سلاطین ذوی تمکین و صاحب مرتبان بلند مکان، باین کار متوجہ نشدہ، از برائے بجا آوردن فرمودہ ارفع اعلیٰ سرانجام کار مامورہ را باتفاق ہمت بر کمر جان بستہ۔"[2]

رصد گاہ کی تیاری | حسب تصریح سرسید احمد خاں[3] سوائی راجہ جے سنگھ نے بادشاہ محمد شاہ

---

[1] زیج محمد شاہی ورق ۴ ب۔ [2] ایضاً ورق ۴ ب

[3] سرسید احمد خان آثار الصنادید ص ۳۰۹

کے ساتویں سال جلوس ۱۱۳۱ھ میں تعمیر کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم کام مناسب اور ضروری آلات رصدیہ کی فراہمی تھا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ کسی رصدگاہ کی کامیابی کا دار کلیتاً قابل اعتماد آلات ہی پر ہے، مگر مشکل یہ تھی کہ نہ تو رصدگاہ کے خصوصی معمار ہی تھے (اس ملک میں کبھی کوئی رصدگاہ تعمیر ہی نہیں ہوئی تھی) اور نہ جملہ آلات رصدیہ ہی ملتے تھے لے دے کے صرف ایک اصطرلاب ملتا تھا۔[۱] اس لیے ان کتابوں کی مدد سے جو آلات رصدیہ کی تیاری کے موضوع پر لکھی گئی تھیں، اس قسم کے آلات بنائے گئے جیسے سمرقند کی رصدگاہ میں استعمال ہوتے تھے، رصدگاہ سمرقند کے آلات بڑے نفیس تھے، اتنے نفیس کہ اس زمانہ (پندرہویں صدی مسیحی) میں یورپی رصدخانوں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گستاؤلی بان کی شہادت اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ ایک اور مورخ علم الہیئت ارتھر بیری، ان کی نفاست کے بارے میں رقمطراز ہے،

Nearly Two Centuries later Ullugh Beg............. Built about 1420 A.D. The observatory at Samarqand..... The instruments used were extremely gra…

بہرحال راجہ جے سنگھ نے پہلے کچھ دن تک رصدگاہ سمرقند کے آلات کے مانند آلات بنوا کر استعمال کئے۔ لکھتا ہے،

---

[۱] اور ہندوستانی ذہانت نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ سے لے کر ۱۱ویں صدی ہجری تک اپنی پوری توجہ اصطرلاب سازی ہی میں جدت و اتقان پر مرکوز رکھی۔ آخری زمانہ میں استاد الہداد لاہوری اور اس کا خاندان اصطرلاب سازی میں اپنی حذاقت کیلئے مشہور تھا اور یہ صنعت کوئی چار پشت تک انکے خاندان میں رہی ان لوگوں کے بنائے ہوئے اصطرلاب اب بھی ملتے ہیں۔

"چندے از آلات رصدی مانند آنکہ در سمرقند ساختہ بودند از روئے کتب اسلامیان در بنجا ہم ساخت، ذات الحلق برنجی بقطر سہ گز رایکہ این عصر کہ قریب ضعف ذراع اہل شرع است و ذات الشقیتین و ذات الشعبتین و سدس فخری و شاملہ"[1]

مگر راجہ کی دقت پسند طبیعت ان آلات کے استعمال سے مطمئن نہ ہو سکی، ان آلات میں دو نقص تھے،

۱۔ یہ چھوٹے تھے، (یا کم از کم اتنے بڑے نہ تھے کہ اجزار و دقائق میں نمایاں طور پر تقسیم کیے جا سکتے۔) ان کے دوائر کی تقسیم درجات سے زیادہ (مثلاً دقیقوں میں) نہیں کی جا سکتی تھی (ثانیوں وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا)

۲۔ یہ پیتل کے بنے ہوئے تھے، اس لئے کثرت استعمال سے ان کے جوڑ پیچ گھس جاتے تھے، اور مختلف دوائر کے قطب اور مراکز اپنی جگہ سے ہٹ جاتے تھے۔ اس لئے ان کے استعمال سے مختلف اجرام فلکی کی اوضاع کا تعین اور اُن کی سیر و گردش کی پیمائش حسب دلخواہ نہیں ہو سکتی تھی، راجہ نے لکھا ہے۔

"لیکن چوں آلہا ے برنجی را بسبب خوردی و عدم تقسیم بہ دقایق و لغزش خوردن و سودہ گشتن قطب ہا و بیجا شدن مراکز و دوائر و اختلال وضع مقرری مطلوب کما ینبغی مثمر مدعا نیافت"[2]

لیکن راجہ نے در پیش مشکلات کا حل یہ نکالا کہ

۱۔ پیتل کے بجائے پتھر اور چونے سے بڑے مضبوط آلات رصدیہ بنائے تاکہ ان کے گھمانے پھرانے سے ان کے جوڑ پیچوں کے گھسنے کا احتمال نہ رہے، اور اسی طرح

---

[1] زیج محمد شاہی ورق ۲ ب [2] ایضاً

دائرہ کے ہلنے اور ان کے اقطاب و مراکز کے اپنی جگہ سے ہٹنے کا اندیشہ جاتا رہا۔[1]

۲۔ آلات پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے بنائے گئے۔ مثلاً راجہ کے اپنے اختراع کئے ہوئے سمراٹ جنتر کا نصف قطر اٹھارہ گز تھا، اور اس کا ایک ایک دقیقہ (منٹ) ڈیڑھ جو کے برابر تھا۔[2]

۳۔ ان کی تیاری میں ہندسہ و ہیئت کے ضروری قواعد و قوانین کی باحسن وجوہ مراعات کی گئی، خط نصف النہار بڑی احتیاط سے کھینچا گیا، رصدگاہ کے عرض البلد کی تحقیق مزید کی گئی اور پیمائش میں غیر معمولی احتیاط برتی گئی۔[3]

۴۔ دارالسلطنۃ (شہر دہلی) کے علاوہ دوسرے بڑے شہروں سوائی جے پور، بنارس، متھرا اور اجین میں بھی رصدگاہیں تعمیر کر کے ان میں ایسے ہی آلات نصب کئے گئے تاکہ مختلف رصدگاہوں کے طول البلد کے فرق و تفاوت کا لحاظ کرنے کے بعد ایک سے دوسری رصدگاہ کی دریافتوں کی صحت کی تصدیق کی جا سکے۔[4]

---

[1] زیچ محمد شاہی، ورق ۲ ؂ "آنہائے اختراعی خود ...... از سنگ و آہک باستحکام تمام در زمانت مالاکلام ...... تیار کردہ تا بدین سبب خلل لرزش حلقہا و دوایر و سائیدن قطبہا و جا شدن مراکز و تفاوت دقایق بطرف گردیدہ و بنائے رصد طریق مستقیم پیدا گشت۔ [2] ایضاً "آنہائے اختراعی خود مثل ...... سمراٹ جنتر کہ نصف قطر آن ہژدہ در عہ است و دقیقہ آن یک نیم شعیرہ می شود۔" [3] ایضاً "آنہائے اختراعی خود ...... با رعایت قوانین ہندسی و تحقیق خط نصف النہار و عرض بلد و احتیاط در پیمائش ...... تیار کردہ۔" [5] ایضاً "و برائے استحکام و حقیقت مدعا ہمیں قسم آلہا در سوائی جے پور و متھرا و بنارس و اجین ہم بنا کردہ شد، چون رصد ہائے این امکنہ را بعد از ملاحظہ تفاوت اطوال بلاد مقابلہ کردہ مسوب با مرصود یکے آمد۔"

آلات رصدیہ کی اصلاح و اختراع

راجہ جے سنگھ کی اختراع پسند طبیعت عام آلات رصدیہ[۳]
جن کے استعمال کا سابق کی رصدگاہوں (بالخصوص رصدگاہ سمرقند) میں رواج تھا مطمئن نہ
ہو سکی، لہذا اس نے دہلی کے چابک دست کاریگروں اور معماروں سے اپنے اختراع کردہ
آلات رصدیہ تیار کرائے۔ ان میں سے تین آلوں کو، جسے خصوصیت سے نام لیا ہے جے پرکاش،
رام جنتر اور سمراٹ جنتر[۱]۔ قیام رصدگاہ کے کوئی ایک صدی بعد سر سید احمد خاں نے جب کہ وہ آثار
لکھ رہے تھے، اس رصدگاہ اور اس کے آلات کو دیکھا تھا، جو بالکل خراب ہو گئے تھے، انھوں نے
ان تین آلات کے خصوصی کھنڈروں کو بھی دیکھا تھا، اور ان کی حسب ذیل تفصیل قلمبند کی۔

> "یہ رصدخانہ اب (یعنی سنہ ۱۲۶۳ھ میں) بالکل خراب ہو گیا ہے، سب آلات ٹوٹ
> گئے ہیں، اور سب کی تقسیمیں مٹ گئی ہیں۔ کوئی آلہ اس قابل نہیں رہا کہ اس سے
> ایک بھی عمل ہو سکے۔"

تین آلے منجملہ آلات کے جو چونے اور پتھر سے بنائے تھے، اب بھی ٹوٹے پھوٹے موجود
اول جے پرکاش۔ یہ آلہ بہ حساب ظل کا ایک سطح مستوی پر عمود بطور مقیاس کے قائم کر کے
گرد اس کے دائرہ افق ترپن فٹ آٹھ انچ کے قطر کا کھینچ کر اس پر چار درجے کی گز
دیوار کوئیں کی کوٹھی کی طرح اٹھائی ہیں کہ ایک درجہ زمین میں دبا ہوا ہے، اور تین
نکلے ہوئے ہیں۔ اس کی ساٹھ پر تقسیم کی ہے، ایک خانہ کھلا بطور طاق کے اور ایک
بند، اندر کے رخ مقنطرات کھینچے ہیں، اور درجات کی تقسیم کی ہے، اور مقیاس اور
افق اور مقنطرات سب کے سب منقسم ہیں۔

دوم رام جنتر۔ یہ آلہ ایک چبوترہ ہے، سلامی، شمال کی طرف سے بقدر عرض بلد ا

---

[۱] زیک محمد شاہی، ورق ۲ الف۔ "آلتہائے اختراعی خود مثل جے پرکاش و رام جنتر و سمراٹ جنتر
تیار گردید"

راس پر چار قوسیں ہیں۔ اور ہر ایک قوس کے دونوں طرف سیڑھیاں بنا دی ہیں
ا سیڑھیوں پر چڑھ کر سائے کا حال دیکھیں۔ اس چبوترے کے نیچے سے دو قوسیں اور نکالی
ں، معدل النہار اور منطقۃ البروج کی، لیکن بقدر عرض بلد کے منحرف اور راس کی ہر ایک
س پر تقسیم تھی کہ وہ بالکل مٹ گئی۔ اور قوسیں بھی اکثر ٹوٹ گئی ہیں۔

سوم سمراٹ جنتر۔ یہ جنتر درحقیقت مقیاس ہے، ایک پاکھ بیچ میں بنا کر دائرہ معدل النہار
جس کا نصف قطر ... گز کا بٹ، منحرف بقدر عرض بلد ہونے اور پتھر سے نہایت مستحکم
بنایا تھا۔ اس پر ساری تقسیم ہے، پاکھے پر سیڑھیاں بنائی ہیں کہ اس پر سے پاکھ کے سر پر
چڑھ جاتے ہیں، اسی طرح دائرہ معدل النہار کے دونوں طرف سیڑھیاں بنائی ہیں کہ ان پر
سے سائے کو دیکھتے تھے۔

اس جنتر کی بھی تقسیم بالکل خراب ہو گئی ہے۔ اگرچہ ۱۸۵۲ عیسوی میں پاکھے کی
مرمت ماجب پورنے بموجب تحریک آرکیولاجیکل سوسائٹی مقام دہلی کے کی۔ الا پوری
مرمت نہیں ہوئی۔

یہ تینوں آلے خود سوائی جے سنگھ نے ایجاد کئے ہیں اور اسی سبب سے ان کے ہندی
نام رکھے ہیں۔

کرۂ مقعر۔ اسی جنتر کے نیچے دو کرہ مقعر آدھے آدھے بنائیں، اس طرح پر کہ مدار قطب
بروج کا ہر ایک میں ناقص ہے، اگر ایک کرہ کو اٹھا کر دوسرے کرہ پر رکھ دیں تو
سارا کرہ پورا ہو جائے، ان کرہ دن میں بارہ قوسین بنائی ہیں، تقسیم بروج کی کچھ خالی
اور کچھ بھری۔ اور ہر جگہ تقسیم کے خطوط تھے، اور شاید قطب کی جانب میں تھا کہ اب وہ بھی
ٹوٹ گیا، اور تقسیم بھی بالکل مٹ گئی۔ ہر خالی قوس میں زینے بنے ہوئے ہیں کہ ان پر سے

چڑھ کر سامنے کا حال دیکھتے تھے۔ تقطر ان دونوں کردوں کا چھبیس فٹ کا ہے، اور چونے اور اینٹ سے نہایت مستحکم بنے ہوئے ہیں۔[۵]

ان تین چار آلوں کے علاوہ راجہ نے اور بھی آلات اختراع کئے تھے، جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مصرا جنتر
۲۔ راشی والیہ جنتر
۳۔ کرانتی ورتی جنتر
۴۔ دکشینو وارتی جنتر
۵۔ شستا جنتر
۶۔ کپالا
۷۔ دگمسا جنتر
۸۔ تریو الیہ جنتر

ان آلات کے علاوہ رصد خانہ میں ذات الحلق اور اصطرلابات بھی تھے جنہیں راجہ نے اپنے جذبۂ احیائیت پسندی اور قومی تعصب کے تحت "چکرجنتر" اور "جنتر راج" کے غیرمانوس ناموں سے موسوم کیا تھا۔　　(باقی)

۵۔ سر سید احمد خان۔ آثار الصنادید صفحہ ۳۰۹-۳۲۱

حافظ سخاوی

از

منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کا زمانہ علوم و فنون کی گرم بازاری، منتخب روزگار فضلاء کی کثرت، ایجادات و اکتشافات کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا عہد زریں قرار دئے جانے کا مستحق ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں اسلامی علوم و فنون کی ہر شاخ جس طرح ثمربار ہوئی اس کی نظیر سابقہ صدیوں میں اگر مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ خصوصیت کے ساتھ تذکرہ نویسی کے فن کو ان صدیوں میں حیرت انگیز ارتقاء حاصل ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں اس عہد کے مشاہیر اہل علم میں باہمی مسابقت کی ایک لہر آگئی تھی، ابن قیم اور العقاد اور ابن تیمیہ، ابن بطوطہ، ابن حجر، عینی، ابن اثیر، سیوطی، مقریزی، اور سخاوی جیسے نادرۂ روزگار علماء نے اس عہد میں اپنی وسعت علم، بلندی فکر، مہارت فن، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کے لازوال نقوش قائم کئے ہیں، آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی اس غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر متعدد اہل قلم نے اس دور کے مشاہیر فضل و کمال کے حالات اور کارناموں پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن حجر نے اپنی مشہور تصنیف "الدرر الکامنہ" کی چار ضخیم جلدوں میں آٹھویں صدی کے ۵۲۰۴ اہل علم و فضل کے تراجم لکھے۔ علامہ شوکانی نے دو جلدوں میں

"البدر الطالع" تحریر کی جو ۹۰۰ تراجم پر مشتمل ہے، جلال الدین سیوطی نے اپنی مختصر مگر جامع تصنیف "نظم العقیان" میں دو سو ارباب کمال کی علمی سرگرمیوں سے بحث کی، بقاعی نے "عنوان الزمان فی تراجم الشیوخ والاقران" کے نام سے ایک مستقل کتاب تالیف کی، لیکن اس موضوع پر حافظ سخاوی کی "الضوء اللامع" سب سے اہم ہے، جو بارہ جلدوں میں نویں صدی ہجری کے گیارہ ہزار سے زاید علماء اور عالمات کے حالات و علمی کارناموں کا بڑا دلکش مرقع تیار کیا ہے، اس کے مطالعہ سے جہاں سخاوی کی غیر معمولی محنت، وسعت علم اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس عہد زریں میں مختلف اسلامی علوم و فنون کے ارتقاء کی ایک تابناک تصویر بھی نظر کے سامنے آجاتی ہے، ذیل کی سطور میں حافظ سخاوی کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

نام و نسب حافظ سخاوی کا نام محمد، کنیت ابو الخیر، اور لقب شمس الدین تھا، آبائی وطن سخا تھا، اس کی نسبت سے سخاوی کہلاتے ہیں،[1] سخا مصر کے مغربی جانب ایک چھوٹی سی بستی تھی، لیکن متعدد وجوہ سے اسے بڑی اہمیت حاصل ہوگئی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوئی۔[2] مصر کا یہ خطہ اپنی مردم خیزی میں بہت ممتاز تھا، چنانچہ تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں سخوی اور سخاوی کی نسبت متعدد ناموں کے ساتھ درج ہے،[3] لیکن حدیث و تاریخ میں جب مطلق سخاوی بولا جاتا ہے تو اس سے حافظ محمد بن عبد الرحمن بن محمد بن ابی بکر بن عثمان بن محمد سخاوی ہی مراد ہوتے ہیں، حافظ سخاوی کا خاندان بعد میں قاہرہ منتقل ہوگیا، اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

---

[1] الانساب ج ۷، ص ۱۰۰ جدید ایڈیشن حیدرآباد و معجم المطبوعات دوم ص ۱۰۰۱، [2] معجم البلدان جلد ۵ ص ۴۶ [3] الانساب ۱۰۱/۷ [4] کتاب الکنی والانساب ج ۲ ص ۳۴۲ بحوالہ الفوائد

ولادت و خاندان | حافظ سخاوی ربیع الاول ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں قاہرہ میں پیدا ہوئے[1] جب وہ چار سال کے ہوئے تو ان کے والد نے حافظ ابن حجر کے قریب ایک مکان خریدا اور وہاں منتقل ہوگئے۔

حافظ سخاوی کا خاندان علم و فضل اور زہد و اتقا کے اعتبار سے "سلسلۂ طلائے ناب" کی حیثیت رکھتا ہے، ان کے دادا اور والد دونوں اپنے فضل و کمال کی وجہ سے بہت مشہور تھے، دادا محمد بن ابوبکر ابن البارد کے لقب سے مشہور تھے[2] انھوں نے مصر کے نامور شیوخ سے حدیث و متعلقات حدیث میں مہارت کاملہ حاصل کی، سیرت نبوی سے خاص شغف تھا، اور سیر و مغازی میں صاحب نظر سمجھے جاتے تھے، علمی کمال کے ساتھ عبادت و ریاضت، تقوی و طہارت اور اخلاق و معاملات کا مثالی پیکر تھے، اہل و عیال کی کفالت کے لئے سوت کی تجارت کرتے تھے، اس سلسلہ میں ایک مرتبہ شام بھی تشریف لے گئے، لیکن اس سفر میں انھوں نے صرف سیم و زر ہی کی فکر نہیں کی بلکہ بیت المقدس وغیرہ کے مشاہیر اہل علم سے اکتساب فیض کی بھی کوشش کی، حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کے سوانح و کمالات پر بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ان کی بزرگی و تقوی کے بارے میں رقمطراز ہیں،

قال لي العلاء البلقيني	مجھ سے علاء بلقینی نے بیان کیا کہ ان
انه كان يمين بالا يشهد	(محمد سخاوی) کو جو شخص بھی دیکھتا
بولايته وصلاحه وما	ان کی بزرگی اور نیکی و تقوی کی
لقيت أحدا ممن يعرفه	شہادت دیئے بغیر نہیں رہتا تھا کہ

[1] الضوء اللامع ۸/۲ [2] الضوء اللامع ۸/۱۶۲

إلا واثنی علیه بالصلاح — شناسائوں میں معاصرین جن سے
والخیر[1] — بھی ملاقات ہوئی اسکو مودت کی نیکی
و پاکیزہ طینی کا ثنا خواں پایا۔

سخاوی کے والد امام عبدالرحمٰن بن محمد بھی بہت جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے، علامہ ابن حجر اور شیخ عزالدین بن جماعۃ وغیرہ جیسے اساطین علم کے زیر سایہ انھوں نے جملہ علوم و فنون میں ایسی دستگاہ حاصل کی کہ اکابر محدثین و رواۃ کی ایک جماعت نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، اپنے والد کی طرح یہ بھی سوت کی تجارت کرتے تھے، حافظ سخاوی نے الضوء اللامع کی چوتھی جلد میں اپنے والد کا تذکرہ بھی ایک سعادت مند فرزند کی طرح نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ تفصیل سے لکھا ہے، اس میں انکی جامع شخصیت کی اس طرح مرقع کشی کی ہے۔

" وہ نہایت عالم و فاضل، ذو دفہم، نیک و دیندار، راستباز، عہد کے پابند، ایماندار، زکوٰۃ دینے والے، نہایت خیر خواہ بے ضرر، متواضع رقیق القلب اور باوقار تھے، اعزہ و اقربار کے ساتھ بہت صلہ رحمی کرتے تھے، فجر اور عشار کی جماعت کے خصوصیت کے ساتھ پابند تھے، اور اس معمول میں تا عمر کبھی فرق نہیں آیا، علاوہ ازیں وہ بکثرت تلاوت کرتے، اپنی کوتاہی کا کھلے دل سے اعتراف کر لیتے اور بہت جلد آبدیدہ ہوجاتے تھے، ان کے قدیم ساتھیوں مثلاً زین الدین قاسم حنفی، سید الجمزہ انی نقیب، اور ابن المرحم وغیرہ میں سے جن سے بھی میری ملاقات ہوئی، سب نے ان کے بارے میں کلمۂ خیر ہی کہا[2]

[1] الضوء اللامع ۱۰۶/۷ [2] الضوء اللامع ۱۲۵/۴

بالآخر ۲۸ رمضان ۹۰۲ھ کو یہ آفتابِ علم غروب ہو گیا۔

تعلیم و تربیت | مذکورہ بالا خاندانی حالات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حافظ سخاوی نے علم و فضل کی دولت ورثہ میں پائی تھی، ابتدائی تعلیم ایک مقامی شیخ عیسیٰ بن احمد سے حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے پھوپھا حسین بن احمد الازھری کی خدمت میں چلے گئے، اور وہاں حفظ قرآن کیا، اس کے بعد اپنے عہد کے مختلف شیوخ و اساتذہ کی بارگاہ علم میں زانوئے تلمذ تہ کر کے تفسیر و تجوید، فقہ و حدیث، نحو و ادب، فرائض و حساب اور تاریخ و ہیئت میں کمال بہم پہنچایا۔ انھوں نے بہت سی درسی کتابیں، الفیہ عراقی، نخبۃ الفکر، شاطبی، عمدۃ الاحکام، التنبیہ، جامع مختصرات وغیرہ حفظ کر کے اساتذہ کو سنائیں، نحو و ادب میں وہ ابن ہشام حنبلی، اور امام نحو شہاب حناوی کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔[1]

طلب علم کے غیر معمولی شوق نے حافظ سخاوی کو دور دراز ملکوں کے سفر پر بھی آمادہ کیا، چنانچہ وہ اس سلسلہ میں دمشق، حلب، بیت المقدس، نابلس، حماۃ، دمیاط، اسکندریہ وغیرہ مصر و شام کے تمام مشہور علمی سرچشموں تک پہونچے اور سیراب ہوئے۔[2]

عیدروسی کہتے ہیں۔

وجاب البلاد وجال	انھوں نے بہت سے ملکوں کی سیاحت
والاماکن التی تحل فیہا من	کی اور ان مقامات کی تعداد جہاں کی
البلاد والقری علی الثمانین	انھوں نے خاک چھانی اسّی سے زائد ہے
بحیث أن الذی تمع عنہم	اور وہاں انھوں نے جن اساتذہ سے
یکونون قریب مأتہ نفریل	کسب فیض کیا ان کی تعداد سو بلکہ

---

[1] الضوء اللامع ج ۸ ... شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۸ ص ۱۵ اور البدر الطالع ۲/۱۸۴

زاد عدد من أخذ عنه[1] اس سے بھی زیادہ ہے۔

شیوخ و اساتذہ | کسی صاحب علم کے علوئے مرتبت اور جلالت شان کا اندازہ کرنے ایک معیار یہ بھی ہے کہ اسکو کتنے اور کس کس مرتبہ کے اساتذہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا اس بات میں سخاوی کو جو امتیاز حاصل ہے، اس کی نظیر ہم عصر علماء میں خال خال ہی نظر آتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کثیر التعداد اساطین فن اور یگانۂ عصر ائمہ کے خرمن سے خوشہ چینی کی تھی، طبقات و تراجم کی کتابوں اور خود الضوء اللامع میں ان کے اساتذہ کی طویل فہرست ملتی ہے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے صرف ان کے بخاری کے اساتذہ کی تعداد ایک سو بیس بتائی ہے[2] عیدروسی نے لکھا ہے کہ "سخاوی نے لاتعداد شیوخ سے تحصیل علم کی، یہاں تک کہ ان کے اساتذہ کی تعداد چار سو سے بھی متجاوز ہے"[3] اساتذہ کی پوری فہرست طوالت کے خوف سے نہیں دی جا رہی ہے، صرف چند نامور اصحاب کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

قاضی محب ابن شحنہ، علامہ عینی، کمال بن ہمام، تقی الدین ابن فہد، صالح بلقینی قاضی مصر بدر الدین، ابو الفتح اللفدی، حافظ ابن حجر وغیرہ،

کمال ابن ہمام معقول و منقول کے امام تھے، اور تفسیر و حدیث، فقہ و اصول فرائض و حساب نحو و بلاغت، منطق و مناظرہ میں ید طولی رکھتے تھے، سخاوی عرصہ تک ان سے استفادہ کرتے رہے انھوں نے "عالم دنیا اور محقق دوراں" کے القاب سے انکی قابلیت کا اعتراف کیا ہے[4]

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ صحیح بخاری کے دو فن مشہور شارح ابن حجر عسقلانی

---

[1] النور السافر ص ۱۷ [2] ابراز الغی ص ۲۱ [3] النور السافر ص ۱۷ [4] البدر الطالع ۲/۲۰۱

(صاحب فتح الباری) اور حافظ عینی (صاحب عمدۃ القاری) ان کے مایہ ناز استاذ تھے، حافظ عینی ابن حجر کے ہم پلہ تھے، انکی خدمت میں سخاوی حاضر ہوئے، اور ان کے فضل وکمال سے بہرۂ وافر حاصل کیا، وہ ان کی مہارت فن، جامعیت علوم اور مقام بلند کے بے حد معترف تھے[۱] انہیں تخریج احادیث اور ان کے معانی کی وضاحت میں کامل عبور حاصل تھا، وہ تمام علوم پر وسیع نظر رکھتے تھے[۲]

ابن حجر نے تفسیر، حدیث، فقہ اور تصنیف وتالیف میں غیر معمولی شہرت حاصل کی، اور زبان خلق سے حافظ العصر، خاتمۃ الحفاظ، امام الائمہ، فرید الوقت جیسے بلند خطابات پائے، یوں تو وہ جامع العلوم تھے، لیکن حدیث ورجال میں ان کی مہارت کا انکے شیوخ کو بھی اعتراف تھا، حافظ عراقی نے انھیں "اعلم اصحاب الحدیث"[۳] قرار دیا ہے، علامہ سیوطی نے کہا کہ "ان پر علم حدیث کا خاتمہ ہوگیا"[۴] ابن حجر سے سخاوی کو استفادہ کا بہت موقع ملا ان کی عالمانہ شفقت اور سخاوی کی طالب علمانہ سعادت نے انھیں امامت کے درجہ پر پہونچا دیا۔

ابن حجر سے خصوصی تلمذ سخاوی ابن حجر کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں استاذ وشاگرد کے باہم اتنے والہانہ اور گہرے تعلق کی مثالیں بہت نادر ہیں سخاوی ۸۳۸ھ میں اپنے والد کے ہمراہ پہلی بار ابن حجر کی بارگاہ فضل ودانش میں تحصیل حدیث کے لیے باریاب ہوئے تھے، پھر تاعمر حافظ العصر کے دامن سے وابستہ رہے قرب مکانی کے باعث ان کو استفادہ کا زیادہ سے زیادہ موقع بھی نصیب ہوا تھا

---

[۱] الضوء اللامع ۱۰/۱۳۳، [۲] الفوائد البہیہ ص ۲۰۸،
[۳] ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۸۱ [۴] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۳

ابن حجر کی بھی اپنے لائق اور سعادت مند شاگرد پر خصوصی نظر تھی، اور وہ ان کی ذ
و صلاحیت کے معترف تھے[1] تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ حافظ العصر کے تمام تلامذ
میں کوئی بھی تبحر علمی اور معارف ابن حجر پر عبور میں ان کا شریک و سہیم نہیں[2] خود ابن
اکثر کہا کرتے تھے۔ "لیس آلان فی جماعتی مثلہ"[3]

حافظ سخاوی نے ابن حجر کی طویل صحبت سے فائدہ اٹھا کر اسماء الرجال کی م
رواۃ کی شناخت، حفظ حدیث اور جرح و تعدیل میں اختصاص حاصل کر لیا تھا[4] سخا
نے اپنی تصنیف "التبر المسبوک" میں خود اعتراف کیا ہے کہ "میں عمر بھر ان سے وابستہ
یہاں تک کہ ان کا پورا پورا علم حاصل کر لیا، اور مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ میں
بہت سے علوم میں انفرادیت حاصل کر لی، میں ان کی فرد دگاہ سے قریب ہی سکونت
پذیر تھا، اس لئے ان کے درس کا کوئی درس مجھ سے ناغہ نہیں ہوتا تھا، حافظ صاحب
اکثر مجھے قرأت کے لیے بلوا بھیجتے تھے۔[5]

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ "کم سنی میں حافظ ابن حجر کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کا
جس سے ان کو خصوصی شغف پیدا ہو گیا، پھر تو وہ مستقل ان سے وابستہ ہو گئے، اور بکثرت
کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھیں"[6]

برہان باعونی کا بیان ہے کہ

قد حصل الاجتماع بخدمتہ ۔۔۔ وہ ابن حجر کی خدمت میں حاضر ہوئے
ابن حجر والفوز ببرکتہ ۔۔۔ اور ان سے خیر و برکت حاصل کر سکے

---

[1] ابراز النقی ص ۱۱ [2] الضوء اللامع ۲/۴ [3] الکواکب السائرۃ جلد اص ۵۳
[4] البدر الطالع ۲/۱۸۵ والنور السافر ص ۱۲ [5] فتح الباری ۱۳ اص ۸ [6] نظم العقیان فی اعیان ص ۲

والاقتباس من فوائد ہ	علاوہ شیخ کے علوم اور امتیازات
والاستمتاع بفرائدہ[1]	سے پورا پورا استفادہ کیا۔

سخاوی نے ابن حجر سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھی تھیں، ان میں سے کچھ کے نام النور السافر میں درج ہیں[2]

سخاوی کی اپنے شیخ سے غایت عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے "البرالمسبوک" میں انکا تذکرہ لکھا، فرید برآں الضوء اللامع میں نہایت جذباتی انداز میں اور فرط احترام کے ساتھ "قال شیخنا" کے الفاظ سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ایک جگہ انھوں نے صراحت سے لکھا ہے کہ

وکل ما اطلقت فیہ شیخنا	جہاں بھی میں مطلقاً شیخنا کہوں تو
فمرادی بہ ابن حجر استاذنا[3]	اس سے ہمارے استاذ ابن حجر مراد ہوں گے۔

امام شوکانی استاذ و شاگرد کے فرط تعلق کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

وقد غلبت علیہ محبۃ شیخہ	امام سخاوی پر اپنے استاد ابن حجر
الحافظ ابن حجر فصار لا یخرج	کی محبت غالب تھی چنانچہ وہ ان کے
عن غالب اقوالہ کما غلبت	اکثر اقوال کے دائرہ سے نہیں نکلتے
علی ابن قیم محبۃ شیخہ ابن تیمیۃ	تھے جیسا کہ ابن قیم پر اپنے استاد ابن تیمیہ
وعلی الھیثمی محبۃ شیخہ	اور ہیثمی پر اپنے شیخ عراقی کی
العراقی[4]	محبت کا غلبہ تھا۔

---

[1] الضوء اللامع ۲/۸، [2] النور السافر ص ۱۱، [3] الضوء اللامع جلد ص ۵، [4] البدر الطالع ۲/۲۸۹

محدث خواتین | آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں جب کہ عالم اسلام کا گوشہ گوشہ حدیث و روایت کے آوازہ سے معمور تھا، بہت سی خواتین بھی علم حدیث میں مہارت تام رکھتی تھیں، اور جا بجا ان کی بساط ہائے درس بھی آراستہ تھیں، دنیا کے گوشہ گوشہ سے تشنگان علم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے، سخاوی نے الضوء اللامع کی بارہویں جلد میں ایسی نامور خواتین کے حالات و خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، ان میں سے بہت سی ایسی تھیں جن سے انھیں سماع حدیث کا شرف اور سند و اجازت کے حصول کی سعادت حاصل ہوئی تھی، ان میں حافظ ابن حجر کی اہلیہ آنسہ بنت عبد الکریم[۱] حافظ عراقی کی صاحبزادی جویریہ[۲] خدیجہ بنت علی[۳]، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تبحر علمی | حافظ سخاوی کی ذات بڑی ہمہ گیر اور جامع کمالات تھی، لیکن حدیث اور اس کے متعلقات ان کے فکر و نظر کے اصل جولانگاہ تھے[۴]، غیر معمولی قوت حافظہ کی وجہ سے ہزاروں حدیثیں ان کے نہان خانۂ دماغ میں محفوظ تھیں، اسی باعث اپنے استاد ابن حجر کی طرح زبان خلق سے "حافظ" کا لقب حاصل کیا تھا، جو آج تک ان کے نام کا لازمی جزو ہے۔

علامہ شوکانی جیسے صاحب نظر عالم نے حفظ حدیث میں ان کی بلندی مرتبت کی شہادت دی ہے: "حفظ حدیث میں حافظ سخاوی اپنے ہمعصروں میں منفرد تھے"[۵]۔

ان کے تلمیذ رشید حافظ جار اللہ ابن فہد نے اپنے استاد کے دیرینہ تجربہ کے بعد تبحر علمی کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے۔

---

۱ الضوء اللامع ۱۲/۱۱ ۲ ایضاً ص۱۰، ۳ ایضاً ص۲۵ ۴ بدائع الزہور فی وقائع الدہور ۳/۲۱ ۵ البدر الطالع ۲/۱۸۶

ولا أعلم الآن من يعرف	مجھ کوئی ایسا شخص معلوم نہیں ہو
علوم الحديث مثله ولا	جو علوم حدیث کی معرفت اور
أكثر تصنيفا ولا أحسن	کثرت تصنیفات میں سخاوی کا
ولذلك أخذ عنه علماء	مثیل و نظیر ہو، اسی باعث چار
الآفاق من المشائخ والطلبة	دانگ عالم کے علماء، شیوخ اور
والرفاق، وله اليد الطولى	طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا،
في المعرفة بالعلل وأسماء	ان کو اسماء الرجال اور معرفت
الرجال واليه يشار في	علل پر کامل دستگاہ حاصل تھی
ذلك۔ ولقد مات	ان کے بعد علم حدیث کا خاتمہ
فن الحديث بعده[۱]	ہو گیا۔

کسی شاگرد کی لیاقت کی حد ہے اگر اس کے اساتذہ اس کی تعریف کریں ان کے اساتذہ میں عینی اور حافظ ابن حجر کا بیان پہلے گزر چکا ہے، تقی الدین ابن فہد اور دوسرے نامور استاد بھی علم حدیث میں ان کے کمال و رفعت کے قائل تھے[۲]

درس و افادہ جب تک ابن حجر حیات رہے، سخاوی ان کی خدمت سے جدا نہیں ہوئے لیکن استاد کی وفات کے بعد ان کے فیض کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اپنی مجلس درس قائم کی جلد ہی ان کی شہرت دور دور پہونچ گئی، اور کونے کونے سے تشنگان علم اس چشمہ صافی کے گرد جمع ہونے لگے، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی املاء حدیث کی مجلسوں سے بے شمار طلبہ مستفید ہوئے[۳] پہلے اپنے مکان ہی پر درس کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پھر دار الحدیث الکاملیہ

---

[۱] شذرات الذہب ۸/۱۷ و فتح المغیث خاتمہ [۲] الضوء اللامع ۸/۲ [۳] ایضاً ص ۱۸

مدرسہ ظاہریہ اور برقوقیہ وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دیں[1] ۸۸۶ھ میں حج سے مشرف ہوکر قاہرہ واپس آئے تو پچاس سے زائد مجالس املا میں طلبہ کو اپنے افادات سے مستفید کیا[1] ان حلقہائے درس میں عام طالب علم سے لیکر اکابر علما تک شریک ہوتے تھے[2] درس حدیث میں ان کے غیر معمولی انہماک کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حکومت کی طرف سے بڑے اصرار کے ساتھ ان کو منصب قضا پیش کیا گیا تو اس سے محض اس لئے انکار کر دیا کہ اس کے بعد تدریس کے لیے فراغ خاطر باقی نہ رہے گا[3]

زیارت حرمین سخاوی نے اپنے استاد ابن حجر کی زندگی بھر گھر سے باہر قدم نہیں نکالا، یہاں تک کہ دل کے شدید تقاضے کے باوجود حج بیت اللہ سے بھی مشرف نہیں ہوئے، ان کے انتقال کے بعد ۸۵۶ھ میں اپنے والدین کے ہمراہ عازم حرمین ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت کے ساتھ علماء حرمین کے فیوض علمی سے بھی بہرہ ور ہوئے[4] وہاں انھیں علامہ برہان زمزمی، تقی الدین ابن فہد ابوالفتح الاغر، اور ابن ظہیرہ جیسے فخر روزگار ائمہ علم سے استفادہ کا موقع ملا[5] حرمین میں ایک سال قیام کے بعد قاہرہ واپس آئے۔ اس کے بعد پھر ۸۷۰ھ ۸۸۵ھ اور ۸۹۲ھ میں ۳ بار حرم پاک اور آستانۂ نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کیا، ہر سفر میں برسوں وہاں قیام کرکے افادہ و استفادہ میں مشغول رہے، ان کے آخری لمحات اسی سرزمین مقدس پر قال اللہ و قال الرسول کے سرمدی نغمے بلند کرتے ہوئے گزرے، اور بالآخر اسی خاک کا پیوند ہوئے[6] (باقی)

---

[1] الضوء اللامع ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۴، [3] النور السافر ص ۲۱

[4] النور السافر ص ۱۸، [5] انوار الباری ص ۱۵۵ و فوائد جامعہ ص ۳۴۴

علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ
کی
بین الاقوامی کانگریس کا جشن

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دہلی بہت آرام سے پہونچا، اسٹیشن پر مکرمی ڈاکٹر عبدالحفیظ انصاری کے بڑے صاحبزادے محمد طارق سے ملاقات ہوگئی، ان کی وجہ سے بڑا آرام پہونچا، پاکستانی سفارت خانہ میں پریس کونسلر محمد عظیم صاحب بڑے اخلاق سے ملے، اور بتایا کہ اقبال کا صد سالہ جشن لاہور کے علاوہ کراچی اور اسلام آباد میں بھی منایا جائے گا، اس لئے کراچی اور اسلام آباد کا ویزا بھی بنا دیا گیا ہے، پاکستان انٹرنیشنل ایر ویز کے دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ لکھنؤ چلا گیا ہے، لیکن یہ ٹکٹ واپس منگایا جائے گا اس لئے سفر میں قدرے تاخیر ہوگی اور کہیں پہلی دسمبر کو روانگی ہو سکے گی، پہلی دسمبر کو پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں سے اور علی سردار جعفری بھی بمبئی سے دہلی آگئے، اور ہم سب چار بجکر بیس منٹ پر پالم سے روانہ ہوئے، اور سوا گھنٹے میں لاہور پہونچ گئے، ہوائی جہاز کے عملے نے بڑی پذیرائی کی، اور یادگار کے طور پر ہم لوگوں کی تصویر لینے کی خواہش کی، پروفیسر آل احمد سرور اس دن ساتھ نہ آسکے، وہ بعد میں پہونچے، لاہور ہوائی اڈے پر پہنچا تو جو

استقبال کیا گیا انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ہم لوگوں کے لیے کمرے پہلے ہی سے متعین کئے جا
چکے تھے۔ یہ دنیا کا بہترین ہوٹل سمجھا جاتا ہے، پاکستان میں بھی اس کی شاخیں قائم کی گئی ہیں
دوسرے سندھ دبین بھی یہیں ٹھہرائے گئے تھے، دوسرے دن صبح سے ملاقاتوں کا سلسلہ
شروع ہو گیا، جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کا ذکر برابر آتا رہا ہے
وہ دارالمصنفین کے عاشق بھی ہیں اور محسن بھی گزشتہ سال حکومت پاکستان سے
دارالمصنفین کی کتابوں کے حق طباعت کے سلسلہ میں جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں
ان کا نمایاں حصہ تھا، پاکستان کے جلیل القدر مصنف ہیں۔ ان کی شعرائے
کشمیر جو کئی جلدوں میں ہے بہت مقبول ہے، انگریزی، اردو اور سندھی میں
بکثرت کتابیں لکھی ہیں، میری نظر میں تو وہ پاکستان کے بیہقی Prince Scholar
ہیں، انتہائی محبت سے ملے، گلے لگایا، اور حالات پوچھتے رہے، ان کی صحت اور
گر رہی ہے، کئی آپریشن کرا چکے ہیں، میرے آنے کے تیسرے دن ان کو قلب کا دورہ
پڑ گیا، اسپتال میں داخل کر دئے گئے، اس سے میری خوشی افسردگی سے بدل گئی، حالی
دہلی غالب سے ملنے کے لئے آتے تھے، میں پاکستان آتا ہوں تو وہ پیش نظر ہوتے ہیں، وہ
مجھ کو اس طرح نوازتے ہیں، کہ میں کہتا ہوں کہ میرا اصلی پاکستان ان کا دولت کدہ
ہے، ان کے اسپتال جانے سے میں بے کیف ہو گیا، دیکھنے گیا، الحمد للہ اچھے تھے،
امید ہے کہ جلد مکمل صحت ہو جائے گی، ان کے لیے ہر جگہ دعا گو ہے چیف مارشل
ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق بھی ان کی عیادت کے لیے اسپتال تشریف لائے تھے،
ان کے ساتھ ہوٹل میں پروفیسر عبدالرشید بھی تھے، جنھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
میں تقریباً چالیس سال زندگی گزاری ہے، پروفیسر محمد حبیب کے بعد عرصہ تک

وہاں کے شعبۂ تاریخ کے صدر بھی رہ چکے ہیں، اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، مگر باتوں میں بالکل جوان ہیں، بہت ہی دلچسپ اور ظرافت آمیز گفتگو کرتے ہیں علی گڑھ کے عاشقوں میں سے ہیں، گھنٹوں علی گڑھ سے متعلق باتیں کرتے ہیں، وہاں کی جزوی باتوں سے بہت باخبر ہیں بعض چیزیں تو میرے لیے بھی نئی تھیں، میری تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں، علی گڑھ کے رشتہ سے بڑی محبت سے ملے، جناب راشدی صاحب ہی کے کمرے میں پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی سے ملاقات ہوئی، جن سے امیر خسرو کے جشن صد سالہ کے موقع پر برابر بے تکلفانہ انداز میں ملنے کا موقع ملا تھا، نسلاً کشمیری ہیں، ایم۔ اے کی ڈگری بنارس ہندو یونیورسٹی سے حاصل کی، سنسکرت اچھی طرح جانتے ہیں، لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی، مشرقی پاکستان میں آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ پھر ڈھاکہ میں شعبۂ تاریخ میں ریڈر رہ چکے ہیں، پشاور یونیورسٹی میں بھی رہے، آج کل اسلام آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، بڑے اچھے مقرر ہیں، مختلف موضوعات پر ۲۳ کتابیں لکھ چکے ہیں،

ان کتابوں میں پاکستان کے گندھارا آرٹ اور پاکستان کی مختصر تاریخ بھی شامل ہیں، حکومت پاکستان کی طرف سے ان علمی خدمات کی بنا پر ان کو ستارۂ امتیاز بھی ملا ہے، بارہ جلدوں میں ایک مفصل تاریخ پاکستان بھی پیش نظر ہے، اس سلسلہ میں کہتے تھے کہ پروفیسر شیخ عبدالرشید نے ان سے کہا کہ اب یہاں یہ رجحان ہو گیا ہے کہ پاکستان کی تاریخ ۱۹۳۰ء سے شروع کی جاتی ہے، لیکن قرون وسطیٰ کو نظرانداز کرنا مناسب نہیں ہے، اس عہد کے مسلمانوں کی تاریخ پر بھی زور دینا چاہئے، سیاسی اور جنگی تفصیلات سے قطع نظر اس دور میں جو تمدنی، معاشی اور معاشرتی حالات رہے ہیں ان کو پورے طور پر سامنے لانے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ

دارالمصنفین میں جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان کی تعریف کی، پروفیسر دانی نے میری لکھی ہوئی تاریخیں خود پڑھی ہیں، اور طلبہ سے بھی پڑھوائی ہیں، بزم صوفیہ میں میں نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے ساتھ ان کے معاصر مشہور شاعر شمس دبیر بھی دہلی سے بنگال گئے تھے، کچھ عرصہ کے بعد امیر خسرو دہلی واپس آگئے، مگر شمس دبیر وہیں رہ گئے،

دانی صاحب نے بتایا کہ یہ شمس دبیر آگے چل کر بنگال کے سلطان ہو گئے تھے، ان کی یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی میں نے کہا اس بارہ میں خاصی تحقیق کی ضرورت ہے،

سید حسام الدین راشدی صاحب کے کمرہ ہی میں بشیر احمد ڈار صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، وہ پہلے کراچی میں تھے، اب اپنے وطن لاہور چلے آئے ہیں، راشدی صاحب پروفیسر عبد الرشید اور ڈار صاحب ایک دوسرے کے فدائی اور شیدائی ہیں، کراچی جب بھی آنا ہوا تو ان تینوں حضرات کی مجلسوں میں شرکت کا موقع ملا بڑی دلچسپ علمی صحبت ہوتی تھی، بذلہ سنجیوں اور زمزمہ سنجیوں کی بڑی رنگین بہاریں دیکھنے میں آتی تھیں، ڈار صاحب بڑے مخلص مسلمان ہیں، خدا ترسی اور صداقت شعاری کے ساتھ ضدار بھی بے مثل ہیں، اور اقبالیات کے ماہر ہیں، اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں، اقبال بزم اقبال اور پاکستان فلوسفیکل جرنل کے اڈیٹر بھی تھے

اقبال پر ان کی حسب ذیل کتابیں ہیں، (۱) اقبال، (۲) اے اسٹڈی ان اقبال فلوسفی (۳) اقبال اینڈ پوسٹ کینٹین ولنٹرزم Iqbal and (Post Kantian voluntarism) اقبال کی گلشن راز جدید اور پس چہ باید کرد کا ترجمہ کر چکے ہیں، اور اب مسافر اور ضرب کلیم ارمغان کا ترجمہ کر رہے ہیں، اقبال کے خطوط اور مضامین بھی اڈیٹ کرکے شایع کیے ہیں، ان کے علاوہ انگریزی میں بکثرت

مضامین لکھے ہیں، لیکن اپنے علمی کارناموں کے باوجود بہت ہی منکسر مزاج اور قناعت پسند ہیں، کسی اعزاز کے خواہاں نہیں، نہ جویاں، ان سے ملتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہو کہ جیسے اپنے کسی قریبی شفیق بزرگ سے مل رہا ہوں، جب کبھی ملاقات ہو جاتی ہے، بہت ہی خلوص اور شفقت سے ملتے ہیں، دارالمصنفین کے بڑے قدرداں ہیں، جس بزرگانہ محبت سے وہ مجھکو راشدی صاحب کی عیادت کے لیے اپنے ساتھ اسپتال لے گئے اس کی یاد کی شمع میرے ذہن میں برابر روشن رہے گی۔

ہوٹل ہی میں جناب نبی احمد بلوچ سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا ہماری مطبوعات کے حق طباعت کے سلسلہ میں دارالمصنفین اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے درمیان معاہدہ کے بارہ میں غیر معمولی مدد کی تھی، وہ اخلاق و شرافت کا پیکر ہیں، ان کا دل دیکھا جائے تو شاید گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح رنگین اور حسین نظر آئے، پہلے سندھ یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے، پھر حکومت پاکستان کے ثقافتی امور کے سکریٹری ہو گئے، آج کل آثار قدیمہ، کلچر اور اسپورٹس ڈویزن کے افیسر اون اسپشل ڈیوٹی ہیں، اقبال کے صد سالہ جشن کی بہت سی ذمہ داریاں بھی ان کے سر تھیں، ہر وقت مہمانوں کی خاطر داری بلکہ مزاج داری میں لگے رہتے تھے، علی گڈھ میں تعلیم پائی ہے، اس لئے علی گڈھ والوں سے بڑی محبت سے ملتے ہیں، سندھی اور انگریزی میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

جناب قدرت اللہ شہاب سے بھی ملاقات ہوئی، جو دارالمصنفین کے بڑے عنایت فرما ہیں، ذمہ دارانہ مصروفیت کے باوجود مختلف کتابوں کے مصنف بھی ہیں بزرگان دین سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں، اخلاق و مروت کے پیکر ہیں گفتگو میں بڑی خیر پنی ہے، اور ہر وقت دلدہی و دلجوئی کا خیال رہتا ہے، کہیں سے یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے

کہ وہ پاکستان کی حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں

ڈاکٹر محمد اجمل صاحب سے بھی ملا، جو دارالمصنفین اور نیشنل بک فونڈیشن کے درمیان جب ہماری مطبوعات کے بارے میں معاہدہ ہوا تھا تو انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی مدد کی تھی، اس وقت وہ وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے، اب اسلام آباد میں قائد اعظم یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر ہیں، آج کل مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں مشغول ہیں،

ڈاکٹر اے۔ ڈبلو۔ ہالی پوتا صاحب سے ملاقات ہوئی تو بڑی گرم جوشی سے بغلگیر ہوئے، میں ۱۹۵۸ء میں پاکستان آیا تھا، تو اُس وقت اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے، اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی تمام مطبوعات دارالمصنفین کو نذر کی تھیں، جو اس وقت ہمارے کتب خانہ کی زینت ہیں، انھوں نے شاہ ولی اللہ پر اکسفورڈ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی، اس موضوع پر ان کی نظر بہت وسیع ہے، آج کل سندھ یونیورسٹی میں ہیں، دینداری ملنساری شرافت، مروت اور محبت کے پتلے ہیں، میں ان سے مل کر پہلی بار اتنا متاثر ہوا تھا کہ میں نے کراچی ریڈیو سے جو تقریر کی تھی، تو اس میں کہا تھا کہ ہالی پوتا صاحب جیسے سیرت اور کردار رکھنے والے لوگوں کی اکثریت پاکستان میں ہو جائے، تو یہ سرزمین سونے کی ہو جائے، ان ہی کے ساتھ ڈاکٹر محمد ابراہیم شیخ خلیل سے ملاقات ہوئی، جو تمام مجمع میں سب سے زیادہ متشرع نظر آئے، انکی لمبی اور منور داڑھی اقبال کے پورے جشن میں نمایاں رہی، ایک وقت تک وہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ میں پروفیسر تھے، اب ریٹائر ہو چکے ہیں، سندھی اور اردو کے شاعر ہیں،

سندھی میں اقبال پر بہت سے مضامین لکھے ہیں، کہنے لگے کہ وہ معارف کے بہت پرانے خریدار ہیں، معارف کا یہاں آنا بند ہو گیا تو شرق اوسط کے ذریعہ منگانے لگے، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، معارف سے اس تعلق کا حال معلوم کرکے دل میں ان کی بڑی قدر ہوئی،

پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد جالندھری تو از راہ کرم میرے کمرہ میں آکر ملے، کیمبرج یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، اسلام آباد کی پیپلز Peoples university میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں، حکومت پنجاب کی علماء اکیڈمی کے بانی اور ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں آج کل اسلام آباد میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں، بڑی محبت سے ملے میری کتاب بزم صوفیہ کے بڑے قدر دان ہیں، ان کا موضوع بھی تصوف ہے انگریزی کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں بعض کے نام یہ ہیں۔

Concept of God in Islam'Corfession of Ghozali; Quranic Exegesis anu classicaltafsir al Qushari

پچھلی گذشتہ مرتبہ پاکستان آیا، اور اسلام آباد میں رہا، تو بڑی خاطر کی، اس مرتبہ بھی ان کا اصرار تھا کہ میں لاہور سے اسلام آباد چلوں، اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں ایک تقریر کروں کہ دار المصنفین میں کام کس طرح ہوتا ہے، میں نے معذرت کی کہ پہلے مجھے کراچی جانا ہے، پھر اسلام آباد پہونچنے کا قصد ہے' ان ہی کے ساتھ جناب سید فضل احمد شمسی آئے ہوئے تھے، جو سے اسلام آباد میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں

برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی، وہ وہاں فلسفہ اور سائکلوجی یونٹ کے صدر ہیں، انھوں نے انگریزی میں ایک مقالہ البیرونی پر لکھا تھا، جو بہت پسند کیا گیا ہے، جناب عبدالرحمن سورتی سے بھی ملاقات رہی، ان کے ساتھی اعظم گڈھ میں ڈاکٹر محمد معظم ہیں ان کا سلام پہونچا تو بہت خوش ہوئے، یہ مولانا محمد سورتی مرحوم کے لائق فرزند ہیں، اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ اسلام آباد میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، گذشتہ سفر میں بڑی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے رہے، علمی بحث کرتے ہیں تو اپنے خیالات کو موثر انداز میں منوانے کی کوشش کرتے ہیں، قرآنی تعلیمات کو مسلمانوں کے لئے شمع راہ سمجھتے ہیں،

جناب قدرت اللہ فاطمی ڈائرکٹر آر۔ سی۔ ڈی اسلام آباد سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، گذشتہ سفر میں اسلام آباد میں جو قیام رہا، تو انھوں نے میری میزبانی، دل داری اور دل جوئی کی ہر قسم کی کوشش کی، ان کا اصرار ہوا کہ میں اسلام آباد پہونچوں تو ان ہی کے یہاں قیام کروں،

مولانا اعجاز الحق قدوسی مصنف شیخ عبدالقدوس گنگوہی، انتہائی محبت سے ملے، صوفیائے ہند و پاکستان پر جو کام انھوں نے کیا ہے، اس کی وجہ سے پاکستان میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، تزک جہانگیری کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے، ان کی تصنیف اقبال کے محبوب صوفیہ میری نظر میں بہت ہی مفید تصنیف ہے، جس سے اقبال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، اب وہ اقبال اور علمائے پاک و ہند مرتب کر رہے ہیں، انھوں نے تاریخ سندھ کی دو جلدیں بھی لکھی ہیں، انکے قلم میں بڑی روانی ہے، جس موضوع پر چاہتے ہیں قلیل عرصہ میں ایک کتاب

لکھ ڈالتے ہیں کہنے لگے کہ ان میں لکھنے کا سلیقہ دارالمصنفین کی مطبوعات کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہے، میرے ساتھ سایہ کی طرح ہے، جس کے لیے ان کا شکرگذار ہوں، ان کا مولد جالندھر اور سنہ پیدائش ۱۹۰۵ء ہے۔

ڈاکٹر شبنم ول پاکستانی ہیں، لیکن اس وقت سین ڈی ای گو (San Diego) ،ین الاقوامی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، وہ میری تصانیف کی وجہ سے مجھ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے ہر موقع پر بڑے مخلصانہ انداز میں ملتے رہے، کہنے لگے کہ مولانا انور شاہ، مولانا شبیر احمد اور مولانا سید سلیمان ندوی پر امریکہ میں کام کر رہے ہیں، میں نے حیات سلیمان اور معارف کے سلیمان نمبر کا ذکر کیا، تو بہت ہی اصرار کے ساتھ سوروڈ خواہش کی کہ یہ دونوں کتابیں جلد از جلد ان کے پاس بھیج دی جائیں، صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند ہیں، حج بھی کر چکے ہیں، دارالمصنفین کے ساتھ اتنا اخلاص رکھتے ہیں کہ عرفات میں بھی اسے یاد رکھا، اور اس کی فلاح و ترقی کے لیے دعا کی، بڑے اچھے مقرر ہیں، جرأت مندانہ تقریر کرتے ہیں، انھوں نے اپنا ایک انگریزی مضمون بھی دیا، میں نے وعدہ کیا ہے کہ اس کا ترجمہ معارف میں شائع ہو جائے گا، کہنے لگے کہ امریکہ سے وہ برابر مضامین معارف کے لیے بھیجا کریں گے، جس کے لیے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میاں محمد سعید ابھی کم سن ہیں، لیکن ان کی تحریروں میں بڑی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے، سیالکوٹ ان کا آبائی وطن ہے، لندن کے اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی، اس وقت امریکہ میں جارج میسن یونیورسٹی ٹیکس میں تاریخ کے پروفیسر ہیں، انھوں نے اپنی انگریزی تصنیف The Sharqi Sultanate of Jaunpur: A Political and Cultural History

بھی تھی، جس کو پڑھ کر میں بہت خوش ہوا تھا کہ ایک بڑی کمی پوری ہو گئی اور جو کام یو۔پی۔ میں ہونا چاہئے تھا، وہ لندن میں ایک پاکستانی اہل علم کے ذریعہ ہوا، ان کو جونپور کی تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے، انھوں نے تذکرۂ مشائخ شیراز ہند جونپور بھی مرتب کیا ہے، اس کے علاوہ صحائف الطریقہ اور The Arabs in India and Pakistan کے بھی مصنف ہیں، ابھی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن اس کمسنی میں اب تک ۵۰ ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں، میری تمام تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں، دار المصنفین کے بڑے قدردان ہیں، وہ میرے ساتھ جس محبت اور اخلاص سے پیش آئے، اس کی یاد برابر باقی رہے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عبد اللہ اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کی وجہ سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں اسی طرح مقبول ہیں، جس طرح پاکستان میں ہیں، ان کی علمی سرگرمی کی ابتدا تو سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء اور "فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ" سے ہوا، لیکن اس وقت تک ۳۰ کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، اقبال پر ان کی تصانیف مسائل اقبال اور مقاصد اقبال بہت مقبول ہیں، اردو میں جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یہاں تیار ہو رہی ہے، اس کے اس وقت چیف ایڈیٹر ہیں، اب تک اس کی پندرہ جلدیں تیار ہو چکی ہیں جن کی لکھائی چھپائی، اور جلد بندی بہت عمدہ ہے، اس سے نہ صرف ایک بڑی کمی پوری ہو رہی ہے بلکہ اردو زبان کے وزن اور وقار میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، وہ ملے تو کہنے لگے کہ میں تو مولانا سید سلیمان ندوی ہی کا پروردہ اور شاگرد ہوں، اور دار المصنفین ہی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں، ان کی زبان سے یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اپنے استاد مرحوم اور ادارہ پر فخر محسوس ہوا

جشن اقبال کی مشغولیتوں ہی کے درمیان ڈاکٹر صاحب نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے دفتر میں ایک تقریب منعقد کی جس میں ڈاکٹر اقبال کے ہم جلیس، شیدائی، اور فدائی جناب نذیر نیازی کو ایک سپاسنامہ پیش کر کے ان کی خدمت میں دس ہزار کا نذرانہ پیش کیا، ڈاکٹر سید عبداللہ اب ثقل سماعت میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور کان میں آلہ لگائے رہتے ہیں، لیکن تقریر بڑی دلچسپ اور فاضلانہ کرتے ہیں، یہ تقریب جسٹس افضل چیمہ کی صدارت میں ہوئی، اس کے خصوصی مہمان استانبول یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر عبدالقادر کاراہان تھے، جناب احمد ندیم قاسمی نے سپاسنامہ پڑھا، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے ازراہ کرم مجھکو اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بڑے اصرار کے ساتھ اس تقریب میں مدعو کیا، جشن کی ہما ہمی کے موقع پر ہم لوگوں کو اس تقریب میں بروقت پہونچنا بہت مشکل تھا، لیکن جناب یعقوب ہاشمی ممبر پبلک سروس کمیشن کی توجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد ڈاکٹر سید عبداللہ کے شاگرد رہ چکے ہیں، وہ ان کے والد جناب تلوک چند محروم کے بہت قدر داں ہیں، اس موقع پر انھوں نے ان کا ذکر جس عزت و عقیدت سے کیا وہ بجائے خود جگن ناتھ آزاد کی تعریف و توصیف جس انداز میں کی، اس سے بہت متاثر ہوئے، میں نے آزاد سے کہا کہ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا یہ حصہ ٹیپ کر لیتے، تو وقتاً فوقتاً اسے سن سکتے، اور ان پرمسرت لمحات کی یاد تازہ ہو جایا کرتی، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے میری علمی خدمات کا بھی ذکر کیا، اور کلمات تحسین سے نوازا، جناب نذیر نیازی صاحب نے بھی بڑی محبت کا اظہار کیا ان کی کتاب "اقبال کے حضور میں" کی ایک ضخیم جلد شائع ہو چکی ہے، جس میں نیازی صاحب نے اقبال کی جزئیات زندگی کو بڑی دیدہ وری

جمع کیا ہے، اس کی دو اور جلدیں تیار ہو چکی ہیں، خدا کرے وہ بھی جلد شائع ہو جائیں ان سے اقبال کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

• لکھنؤ کا دبستان شاعری کے مصنف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے بھی برابر ملاقاتیں رہیں، اب وہ کراچی یونیورسٹی کے ایمریٹس پروفیسر تاحیات ہیں، اور پاکستان کے ترقی اردو بورڈ کے اہم عہدیدار ہیں، اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، لندن نیویارک، اور بنکاک میں بھی دیکھے ہیں، ہوٹل ہی میں ان کے لڑکے اور بہو سے ملاقات ہوئی جو بہت صاف اردو بولتی تھیں، ان ہی سے معلوم ہوا کہ ان کی ساری اولاد بہت اچھے عہدوں پر مامور ہے، ڈاکٹر ابواللیث نے پاکستان آنے کے بعد بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں، آج کل ڈاکٹر محمد اجمل کے ساتھ "ملفوظات اقبال" اور "اقبال اور تصوف" لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی ہے۔

خواجہ عبدالوحید سے ملنے میں بڑی خوشی ہوئی، وہ [illegible] مولانا سید سلیمان ندوی کے دوستوں میں تھے، انھوں نے بتایا کہ سید صاحب لاہور آتے تو ان ہی کے ساتھ قیام کرتے تھے، اب سے کچھ سال پہلے انگریزی میں ایک ہفتہ وار اخبار اسلام نکالا کرتے تھے، اقبالیات کی ایک کتاب مرتب کی ہے، کہتے رہے کہ تبویب القرآن لکھی ہے، لیکن ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے، جناب مشفق خواجہ جو اس وقت پاکستان میں اردو ادب کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، انھیں کے لڑکے ہیں

معارف کے بہت ہی پرانے خریدار کرنل عبدالرشید کو جب معلوم ہوا کہ میں آیا ہوں تو وہ تلاش کرتے ہوئے میرے پاس آئے، وہی مجھ کو خواجہ عبدالوحید کے پاس لے گئے، دہلی سے چلنے لگا تھا تو مفتی عتیق الرحمن صاحب نے کہا تھا کہ ان سے ضرور ملنا،

اور میرا سلام پہونچا دیا، کرنل صاحب معارف میں مضمون بھی لکھا کرتے تھے، ایک زمانہ میں ہندوستان و پاکستان کے تمام اہم رسائل میں ان کے مضامین شایع ہوتے تھے، وہ دیر تک دار المصنفین اور معارف کے متعلق گفتگو کرتے رہے، کہنے لگے کہ اب بینائی کام نہیں دیتی ہے، اس لیے لکھنا پڑھنا بند ہو گیا ہے، مگر باتیں زیادہ تر علمی کرتے رہے،

پروفیسر محمد ایوب قادری کا ذکر معارف کے صفحات میں برابر آیا ہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، انھوں نے مآثر الامرا اور طبقات اکبری کے اردو ترجمے میں جو مہارت دکھائی ہے، اس سے میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، وہ ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ اپنے کسی قریبی عزیز سے مل رہا ہوں، ہر موقع پر ساتھ رہے، اور ہر قسم کی مدد کے لیے تیار رہتے۔

ڈاکٹر محمد ریاض کا مضمون اقبال پر ابھی معارف کی دو قسطوں میں شایع ہو چکا ہے، وہ بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے، طہران یونیورسٹی میں تھے، اب اسلام آباد کے فیڈرل گورنمنٹ کالج میں واپس آگئے ہیں، اقبالیات پر برابر مضامین لکھتے رہتے ہیں، ان پر کتابیات بھی تیار کی ہے،

ڈاکٹر صابر آفاقی مظفر آباد کے گورنمنٹ کالج میں اردو کے استاد ہیں انھوں نے راج ترنگنی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، جسے میں نے خاص طور سے ڈاکٹر علی اکبر جعفری ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان سے مانگ کر حاصل کیا تھا، اس لیے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، وہ برابر بڑی گرمجوشی اور حسن اخلاق سے ملتے رہے، اقبال اور کشمیر کے عنوان سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد میں فارسی کے

استاد ہیں، ابھی زیادہ عمر نہیں ہے۔ لیکن بہت سی کتابیں اردو اور فارسی میں لکھ لی ہیں، داتا گنج بخش، اردو زبان پر فارسی کے اثرات، فارسی ادب کی مختصر تاریخ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، دیوان عمیدی طہرانی بھی ایڈٹ کیا ہے، اقبالیات پر کتابیات بھی تیار کی ہے، علامہ محمد اقبال پر برابر مضامین لکھتے رہتے ہیں،

ڈاکٹر محمد باقر نواب ستاروں کو استاد ہیں، اسلامیہ کالج لاہور، پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر ہونے کے ساتھ اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں، لندن اور نیویارک کی یونیورسیٹیوں میں جاکر پڑھایا ہے، ان کی کتاب لاہور، میری میز کے سامنے الماری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، اس لیے ان سے بڑے شوق سے ملا، انھوں نے ساسانیوں پر بھی ایک اچھی کتاب انگریزی میں لکھی ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فارسی تذکرہ مخزن الغرائب کو ایڈٹ کر رہے ہیں، اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، یہ دونوں جلدیں ۔ دار المصنفین کو بطور ہدیہ دینے کا وعدہ کیا ہے،

ادارہ ثقافت اسلامی لاہور کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد سعید سے پاکستان کے گزشتہ سفر میں اسلام آباد میں برابر ملاقات ہوئی، تجدید ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، فلسفہ پر نصف درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، اقبال اور پاکستان فلوسفیکل جرنل کے اڈیٹر بھی رہے، پروفیسر محمد شریف نے ہسٹری آف مسلم فلوسفی جو دو جلدوں میں لکھی ہے، اس میں انھوں نے بھی بڑی مدد پہونچائی، انگریزی میں ان کی کتاب اسٹڈیز اقبالس تھاٹ اینڈ آرٹ ہے، بڑے خلیق، خاکسار اور دوست نواز ہیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ کی مطبوعات دار المصنفین کو نذر کرنے کا وعدہ کیا ہے،

مولانا محمد حنیف ندوی اب پاکستان کے نامور ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں ہمارے مولانا عبد السلام قدوائی اور رئیس احمد جعفری کے گہرے دوستوں میں ہیں، اپنی عربی دانی

اور خطابت میں شروع سے ہی ممتاز ہیں، ۱۹۲۶ء میں حکیم اجمل خان کی زیر صدارت ندوہ کے اجلاس کانپور میں ان کی عربی تقریر نے دھوم مچادی تھی، آج کل ثقافت اسلامیہ لاہور سے وابستہ ہیں، اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے وہ جشن اقبال میں نہیں آسکے تھے، میں خاص طور پر ادارہ ثقافت اسلامیہ ان کی مزاج پرسی کے لئے گیا، میرے اس فرط تعلق سے وہ بہت مسرور ہوئے،

پروفیسر شریف المجاہد سے ملاقات جناب حسام الدین راشدی صاحب کی وساطت سے بہت پرانی ہے اس موقع پر اس کی تجدید ہوئی، مدراس اسٹین فورڈ، میک گل اور بیرالکیوز یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے، بڑے وسیع النظر ہیں، کراچی یونیورسٹی میں جرنلزم کا شعبہ قائم کیا، اس کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں، امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں کے بھی پروفیسر رہ چکے ہیں، اس وقت کراچی میں قائد اعظم اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں، پاکستان کی طرف سے جو ہسٹری آف فریڈم موومنٹ لکھی گئی ہے، اس میں ان کے لکھے ہوئے کئی ابواب ہیں، بڑی اچھی علمی اور سیاسی گفتگو کرتے ہیں،

پروفیسر ابوالخیر کشفی سے بھی ملاقات رہی، اس وقت وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ ثاقب کانپوری کے صاحبزادے ہیں،

ڈاکٹر محمد جہانگیر خان ڈائرکٹر ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان پنجاب یونیورسٹی خود بڑھ کر جس محبت اور اخلاص سے ملے، اس کا نقش دل پر برابر قائم رہے گا، کیمبرج یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، ہسٹری کی بھی ڈگری ہے، پنجاب کے مختلف کالجوں کے پرنسپل رہے، مغربی پاکستان کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بھی تھے، جنرل ایوب کے

زمانہ میں مغربی پاکستان کی وزارت تعلیم کے مشیر اور جوائنٹ سکریٹری تھے، یورپ کے ممالک کی سیاحت بھی کی ہے، اپنے زمانہ میں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی بھی رہ چکے ہیں، ان تمام مراتب و اعزازات کے باوجود بڑے ملنسار ہیں، ان کی گفتگو میں بڑی سنجیدگی اور متانت تھی، اپنی ریسرچ سوسائٹی کی مطبوعات میرے لیے خاص طور پر بھیجیں مگر غلطی سے دوسرے صاحب کے پاس چلی گئیں، وعدہ کیا ہے کہ وہ پھر ان مطبوعات کو دارالمصنفین کی نذر کریں گے۔

ہندوستان سے اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر جو وفد گیا تھا، اس کے ارکان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان میں ڈاکٹر معزالدین اس وقت اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور کے ڈائرکٹر ہیں، وہ میرے استاد پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کے داماد ہیں، اس لئے بڑی بے تکلفی سے ملے، پاکستان کے گذشتہ سفر میں بھی انکی عنایتوں سے بہرہ مند ہوا تھا، پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے، لندن جاکر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی، اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بہت مقبول ہیں، اقبال اور یورپ، اقبال اور مسلم ورلڈ، اقبال اور قائد اعظم کے عنوانات سے کتابیں بھی لکھی ہیں،

ہندوستان جو وفد گیا تھا، اس کے ایک اور اہم رکن ڈاکٹر عبدالوحید قریشی تھے، جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں اسلامیات اور مشرقیات کے ڈین ہیں، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اسوقت تک ۲۰ کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں اور تین سو سے زیادہ مضامین لکھے ہیں، انکا سال پیدائش ۱۹۲۵ء ہے، ان کی نوازشیں برابر ممنون کرتی رہیں،

ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ہندوستان کا علمی اور ادبی حلقہ اچھی طرح واقف ہے، وہ بھی پاکستانی وفد کے ساتھ دہلی گئے تھے، اس وقت اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں، لندن اور امریکہ میں بھی وزیٹنگ پروفیسر رہ چکے ہیں، اردو شعر و ادب میں اپنی ناقدانہ نظر کی وجہ سے بڑی عزت اور مقبولیت رکھتے ہیں، بیس کتابوں کے مصنف ہیں، اور سو کتابیں ایڈٹ کی ہیں، بڑے تپاک سے ملے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ہوٹل میں میرے کمرے کے سامنے والے کمرہ ہی میں ٹھہرے تھے، ان کی مشہور شخصیت سے اس برصغیر میں کون واقف نہ ہوگا، عالمگیر شہرت کے مالک ہیں آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، تقسیم سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر اور وائس چانسلر رہ چکے ہیں، پاکستان میں پشاور سندھ اور اسلام آباد یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر ہوئے، پھر امریکہ میں کولمبیا اور کئی دوسری یونیورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر رہے، یونسکو میں بھی ان کو عہدے ملتے رہے، پاکستان کی اکیڈمی آف سائنس کی صدارت کے فرائض بھی بہت دنوں تک انجام دے چکے ہیں، پاکستان کے ہر حلقہ میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، باتوں میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہوتی ہے، اقبال کے بڑے عقیدت مند اور مداح ہیں، ان کے زمان و مکان کے فلسفہ کو اردو میں بہت اچھی طرح سے سمجھایا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو پہلی دفعہ ۱۹۳۳ء میں دیکھا تھا، ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کے ہفت صد سالہ جشن کے موقع پر ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اس مرتبہ تجدید ملاقات ہوئی، میری تصانیف کے قدرداں ہیں، اس لئے بہت محبت سے ملے، سید صاحب کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں، سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے

تعلقات پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے، ڈاکٹر اقبال کے ہم جلیس تھے، کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ان کو ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ شروع میں ایک اسکول کے ماسٹر رہے تھے، سید صاحب بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تعمیرات، مصوری اور فنون لطیفہ کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں مجھ سے گجرات کے سلاطین کے عہد کی تمدنی تاریخ کی فرمایش کی ہے، یہ دارالمصنفین کی مطبوعات میں سے ہے، میں نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے،

اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کا اس وقت برصغیر میں طوطی بولتا ہے، وہ جب کہیں ملتے بہت ہی شرافت وحسنِ اخلاق سے پیش آتے۔

پاکستان سے باہر کے نمایندوں میں ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی سے بھی ملاقات رہی، یہ دہلی کے اقبال کے بین الاقوامی سیمینار میں شریک ہوئے تھے، اور وہاں میرے مقالہ کو بہت پسند کیا تھا، وہ آذربائیجان کے رہنے والے ہیں، اس وقت ایڈنبرا یونیورسٹی میں فارسی کے استاد ہیں، بڑے جری مقرر ہیں، بڑی بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، اقبال کے شیدائی ہیں، مستشرقین کو پسند نہیں کرتے، کہنے لگے کہ یہ ریاکار اور جھوٹے ہوتے ہیں، اسلام پر کتابیں اور مقالے لکھ کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں لندن کے اسکول آف اورینٹل اور امریکن اسٹڈیز کے پروفیسر رالف رسل کی ملاقات کا بھی ذکر ہے، اردو بہت بے تکلفی سے بولتے ہیں، اس طرح گھل مل کر رہے جیسے پاکستان ہی کے ہیں، غالب پر ان کی کئی کتابیں ہیں، یہ جشن ایسا شاندار تھا کہ بلجیم کے نمایند نے کہا کہ ایسی شاندار کانگریس میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر خالد حمید شیخ، صدر باشی، اور ڈاکٹر ریاض الرحمٰن ڈائرکٹر انسٹیوٹ آف کیمسٹری کو مہمانوں کی میزبانی میں سرگرم پایا،

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

الانور - مرتبہ جناب عبدالرحمٰن صاحب کوندو تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۳۳۲، مجلد قیمت للعہ پتہ :- ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

یہ کتاب علماے دیوبند کے سرخیل مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کی سوانح عمری ہے جو کئی حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ شاہ صاحب کے عام حالات وسوانح پر مشتمل ہے، اس میں ان کی ولادت سے وفات تک کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور اولاد وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرا حصہ متعدد مضامین کا مجموعہ ہے، اکثر مضامین خود فاضل مرتب قلم سے ہیں، اور چند شاہ صاحب کے اعزہ اور ممتاز تلامذہ کے ہیں، جو بعض کتابوں اور رسالوں سے ماخوذ ہیں، ان میں ان کے فضل وکمال، خصوصیات درس، دینی خدمات اور ردِ قادیانیت وغیرہ کے علاوہ ان کے کئی نامور معاصرین سے روابط و تعلقات کا ذکر ہے، آخر میں تین تتمے ہیں، پہلے میں شاہ صاحب کے استاذ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور دوسرے میں ان کے مورث اعلیٰ شیخ بابا مسعود نروی اور چند مشہور اہل خاندان کا مختصر تذکرہ ہے، تیسرے تتمہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شاہ صاحب نسباً سید نہ تھے، شروع میں شاہ صاحب کے عہد اور اس سے پہلے اور بعد کے کشمیر کی مختصر تاریخ بیان ہوئی ہے، شاہ صاحب کے حالات وکمالات اردو اور عربی میں بعض

کتابیں پہلے شائع ہوچکی ہیں، اس نئی کتاب میں ان کے ذاتی حالات و سوانح کو زیادہ محنت و عرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے لیکن شاہ صاحب جیسی صاحب علم و کمال ہستی کی سوانح عمری کا حق انکی جودت و ابتکار، علمی افکار، فقہ و حدیث میں امتیازی کارناموں پر مبسوط تبصرہ کے بغیر پوری طرح ادا نہیں ہوسکتا، غالباً مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے، اس لئے جابجا حشو و زوائد اور تکرار، جملوں میں بے ترتیبی تعبیر و طرز ادا میں خامی اور زبان کی غلطیاں ہیں مثلاً "مولانا معظم شاہ کو انور شاہ کی آئندہ تعلیم کے بارے میں یہ فیصلہ لینے میں کوئی زیادہ وقت محسوس نہ ہوئی ..... چنانچہ ۱۳۰۳ھ میں بعمر (۱۳) سال "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کے اس عملی مصداق کو اپنے والد گرامی مولانا معظم صاحب نے ہزارہ روانہ کردیا" (ص۴۱) حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم کا مدرسہ امینیہ دہلی کو زندہ رکھنے اور اسکو ترقی دینے میں قوم پر انکا احسان عظیم ہے" (ص۱۱۰) ایسے لوگوں کو دیوبند کے طرز پہ مدرسہ قائم کرکے اس کو بیداری عامہ اور اس کے سایہ میں انقلاب حالات کی جد و جہد کا فلسفہ سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا، (ص۱۱۵) اس زمانہ میں زاد سفر حج کے طور سے بہت تھوڑی رقم کافی ہوجاتی تھی، (ص۱۱۹) بارہ مولہ کا مقام وادی کے دوسرے سب مقامات سے زیادہ موزوں مقام تھا (ص۱۲۱) کہیں کہیں محاورے میں بھی غلطی ہو جیسے کانوں میں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی (ص۱۳۳) ہوکیبعاں کا املا کئی جگہ بال، اور ملا اعلیٰ کو مؤنث لکھا ہے، وجوہات، لوازمات، اکابرین، عائدین اور سرحدات بے تکلف لکھ گئے ہیں، ایک جگہ مولانا عبد الماجد دریابادی کو مولانا تھانوی کا خلیفہ لکھا ہے، وہ مولانا مدنی سے بیعت تھے، مولانا احمد رضا خان بجنوری کے مضمون میں علامہ ابن حزمؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کا ذکر نامناسب انداز میں کیا گیا ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۸ء عدد ۲

مضامین

شذرات

کوئی تین برس ہوئے لکھنؤ سے تعمیر نامی ایک رسالہ نکلتا تھا، سنہ ۱۹۵۰ء میں اس نے اپنے سرورق پر ایک تصویر شائع کی تھی، "متلاطم خیز سمندر میں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی بہتی چلی جا رہی ہے، اور ملاح غائب ہے" اس تصویر میں مصنف نے اس وقت کے حالات کی عکاسی کی کوشش کی تھی، تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں پر سراسیمگی طاری تھی، جس قیادت پر انہیں اعتماد تھا، اور جس کے سہارے وہ جد وجہد کر رہے تھے، وہ رخصت ہو چکی تھی، اب وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور فضا کو ناسازگار سمجھ رہے تھے، تصویر میں اسی ذہنی کیفیت کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن درحقیقت حالات کی ناسازگاری ابھی اس حد تک نہیں پہونچی تھی، سمندر یقیناً متلاطم خیز تھا، کشتی بھی موجوں کی زد میں تھی، اور کسی قدر شکستہ بھی ہو چکی تھی، لیکن ملاح ابھی بالکل ناپید نہیں ہوئے تھے، چند تجربہ کار اور باہمت شناوروں نے چپو ہاتھ میں لے لیا تھا، اور کشتی ملت کو بلا خیز موجوں سے بچا کر ساحل تک لانے کی کوشش کر رہے تھے،

اس موقع پر بے ساختہ مولانا حفظ الرحمن یاد آ رہے ہیں، وہ بڑی ہمت و بے باکی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور طوفان حوادث کے سامنے سینہ سپر ہو گئے، ان کی بے پناہ جد وجہد نے ہوا کا رخ پھیر دیا، لیکن ان کی وفات کے بعد پھر کوئی ایسا سر پھرا ملاح نظر نہ آیا اور تعمیر کی تصویر بالکل حسب حال ہو گئی، طوفان کی ہولناکی اور سمندر کی وحشت انگیزی روز افزوں تھی، لیکن ناخدا ناپید تھے، کشتی کے تختے ٹوٹتے جا رہے تھے، اور دل لرز رہے تھے کہ ملت کا یہ تباہ حال سفینہ کہیں ڈوب نہ جائے،

ان حالات نے دردمندان ملت کو بے چین کر دیا، خطرہ کے شدید احساس نے منتشر افراد کو

اجتماع اور متفرق گروہوں کو اتحاد کا خیال دلایا، چھوٹی بڑی سب جماعتوں کے نمائندے لکھنؤ میں جمع ہوئے، اور غور و فکر کے بعد مجلس مشاورت کے نام سے مسلمانانِ ہند کی ایک مشترک جماعت بن گئی تاکہ سفینۂ ملت کو گرداب حوادث سے نکال کر سلامتی کے ساتھ ساحل مراد تک پہنچایا جائے اس مجلس کے قیام سے انتشار کی فضا بدلی، خوف و ہراس میں کمی ہوئی، اور لوگوں نے اطمینان کی سانس لی، اگر مختلف الخیال اشخاص اور گروہ اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ملت کی حفاظت و سلامتی، اور استحکام و ترقی کے لئے چند برس بھی جم کر جد و جہد کرتے رہتے، تو ملت کا ضعف دور ہو جاتا، اور ایک متحدہ طاقت اور قوم وجود میں آجاتی، لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انتشار کی قوتوں نے پھر سر اٹھایا، افتراق کی ہوائیں چلنے لگیں اور متحدہ محاذ آپس ہی میں ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

کئی برس حالات کا رنگ یہی رہا، اور ملک کا انتشار برابر بڑھتا رہا، اس انتشار نے قوم کو بے حد نقصان پہنچایا، چاروں طرف سے مصائب و آلام کا ہجوم تھا، مگر کسی کے اندر تاب مقاومت نہ تھی، بالآخر گذشتہ سال پھر اتحاد و اتفاق کا خیال آیا اور مختلف جماعتوں نے متحدہ محاذ بنانے کے لئے دہلی میں ایک جلسہ منعقد کیا، اس ملی کنونشن سے ملت نے بڑی امیدیں قائم کیں، اور مجلس مشاورت کا گذشتہ دور نگاہوں کے سامنے آگیا، لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" ابھی کنونشن کی روداد پورے طور پر اخباروں میں شائع بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جماعتی اختلافات اور گروہی عصبیت کی خبریں آنے لگیں، بلکہ بعض ذمہ دار اور باخبر اصحاب کا بیان تو یہ ہے کہ اجلاس کے دوران ہی جماعتی عصبیت اور گروہی سیاست کی کارفرمائی نمایاں نظر آنے لگی تھی، ان حالات میں کسی مضبوط اور متحدہ محاذ کے قیام کا کیا سوال تھا، بس

نشستند و گفتند و برخاستند

ملی کنونشن کے اس انجام کے بعد اب کیا سوچا اور کیا کیا جائے، طبیعتیں ایسی افسردہ اور حوصلے اتنے پست ہوگئے ہیں کہ امید کا کوئی چراغ جلائے نہیں جلتا، باد مخالف کے جھونکے تیز چل رہے ہیں، بلکہ روز بروز اُن کی شدت بڑھتی جارہی ہے، حال کو دیکھ کر مستقبل کا اندازہ دشوار نہیں ہے لیکن ہنوز تحزب کی گرم بازاری ہے، طفل شیر خوار بھی ہم رستم پہلوان کے نعرے لگا رہے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں عالمگیریت کی مدعی ہیں، زمانہ کی مسلسل ٹھوکریں بھی ان لوگوں کو ہوش میں نہیں لا سکیں، وہ نہ اپنی صلاحیت کا اندازہ کرتے ہیں نہ حالات کو سمجھتے ہیں بس تمناؤں میں الجھے ہوئے خوش آیند خواب دیکھ رہے ہیں، اے کاش اُن کی آنکھیں کھل جاتیں، اور وہ صورت حال کی سنگینی کو دیکھ کر اپنی صفوں کے اندر ربط و نظم پیدا کرتے،

دار المصنفین کے قیام کو ۶۰ سال گذر چکے ہیں، دو نسلیں اس کی خدمت کرکے رخصت ہو چکی ہیں اور تیسری بابرکات ہے، مولانا شبلیؒ نے اس کا جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا وہ سرمایہ اور وسائل کی قلت کے باوجود بڑی حد تک پورا ہو چکا ہے، اور اب دائرہ کار کو مزید وسعت دینے کا ارادہ ہے، عہد رسالت سے دولت عثمانیہ تک تاریخ اسلام کی چھ جلدیں شائع کی جا چکی ہیں، اس سلسلہ کو عصر حاضر تک پہنچانے کے لئے مزید دو جلدوں کی ضرورت ہے، تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن دو تین جلدوں میں ایک ایسی کتاب کی اشاعت بھی ضروری ہے جو صحت و جامعیت اور بے تعصبی و فراخدلی میں ممتاز ہو، عربی ادب کی جامع تاریخ کی تیاری بھی شروع ہے، ہمارے منصوبہ میں یہ امر بھی پروگرام میں شامل ہے، احباب کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کے انگریزی، ہندی اور عربی ترجمے بھی شائع کریں، اور عصری مسائل پر محققانہ کتابیں تیار کریں لیکن اس کیلئے ہمیں اپنی اشاعت میں بہت اضافہ کرنا پڑیگا، اور پریس کے انتظامات بھی وسیع کرنے ہوں گے، اگر دار المصنفین کے ہمدرد بہ احسن ساتھ تعاون کریں، اور ہماری مطبوعات اور معارف کی توسیع اشاعت کے لئے تھوڑی سی کوشش کریں تو یہ کار عظیم آسانی سے انجام پا سکتا ہے،

مقالات

اقبال کا فکری ارتقاء

از جناب مولانا عبد السلام خان رام پوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور

(۳)

سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک | غالباً سنہ ۱۹۱۲ء میں ہی خودی پر فلسفیانہ غور و فکر کا آغاز ہو چکا تھا، مسلمانوں کا عام انفرادی اور اجتماعی تنزل تو اقبال کے سامنے تھا ہی، اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے اُن پر یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی تھی کہ اسلام دنیوی ترقی کے خلاف نہیں، قرونِ اولیٰ کے مسلمان جو اسلام کے سچے نمائندہ تھے، دنیوی ترقی کے لیے جدوجہد کو شجرِ ممنوعہ نہیں جانتے تھے، ان کی مذہبیت مانع ہونے کے بجائے اس ترقی میں معاون ہی ہوتی تھی، چنانچہ مسلمانوں کا دنیوی زوال عموماً اور برصغیر کے مسلمانوں کا تنزل خصوصاً اقبال کی توجہ کا سب سے بڑا موضوع تھا، خدا سے "شکوہ" میں ان کا خاص گلہ یہی تھا،

یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور　　نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور　　اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں　　بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب　　تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب ۔ رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب

طعن اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے ۔ کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا ۔ رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا ۔ پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

جہاں تک مذہبیت کا تعلق تھا، مسلمان دوسروں سے کمتر نہ تھے پھر اس تنزل کی وجہ کیا ہے، اقبال نے محسوس کیا کہ اس تنزل کی اصل وجہ ان کی ذوقِ عمل سے محرومی ہے، وحدتِ وجود کا وہ عوامی تصور جو ایرانی شعرا کی منظومات کی بدولت مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے، اس محرومی کا بڑا سبب ہے۔[۱۶] اپنی ذات کو فنا کر کے باری تعالیٰ کی بقا میں اپنے آپ کو باقی یقین کرنا ہمارے روایتی تصوف کی غایت ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی سعادت کے اس تصور میں عالم آب و گل کے لیے جد و جہد کی بہت کم گنجایش ہے۔

یورپ میں ہندو اور نو فلاطونی تصوف کے ساتھ روایتی مسلم تصوف کا مغربی اساتذہ کی معیت میں گہرے مطالعے اور وہ بھی عروج و زوال کی مسلم تاریخ کو سامنے رکھ کر انھیں مسلم تصوف پر غیر اسلامی اثرات اور اس کے یک طرفہ اخروی میلانات سے واقف کرا دیا تھا، وہ یہ جان چکے تھے کہ انسانی جد و جہد کی اس غایت سے اسلام کو کوئی تعلق نہیں، اور نہ یہ تصور اسلامی ہے، انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک تصوف کے ان یک طرفہ میلانات پر اور اس انسانی غایت پر ضرب نہیں لگائی جائے گی مسلم معاشرے میں اسلام کی مثبت روح بیدار نہ ہو گی۔[۱۷]

انسانی ''انا'' یا شخصیت کی مستقل حقیقت پر جرمنی میں جو زور دیا گیا تھا، اور انگلستانی فلاسفہ نے اپنی فطری واقعیت پسندی کی بدولت اس پر اپنی جد و جہد کی بنیاد

---

۱۶ دیباچہ اسرارِ خودی طبع اول ۱۷ اقبال نامہ اول ص ۳۵-۴۴

رکھی تھی، اقبال کی نظروں میں تھی۔ وہ ان کی ان تھک جدوجہد اور لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی ترقی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔[1] چنانچہ اقبال کے خودی اور شخصیت پر زور دینے کی مثبت وجوہ تو تھیں ہی لیکن یہ ایک طرح سے روایتی تصوف کے خلاف احتجاج بھی تھا۔ شخصیت اور خودی کی نفی اور فنا کے بجائے اس کا اثبات اور اسکی بقا یہ اقبال کی فکر تھی جس کا آغاز غالباً ۱۹۱۲ء میں ہو چکا تھا اور وہ شخصیت کی ذاتی قدر و قیمت سے اور اس کے اس کردار سے جو وہ کسی جمعیت میں ہو کر ادا کرتی ہے، پوری طرح واقف تھے

خودی اور بے خودی یا شخصیت اور ملیت

جمعیت یا ملیت افراد اور شخصیتوں سے بنتی ہے، اگر افراد میں ترقی کا ولولہ، جدوجہد کی طرف میلان اور تعاون کا جذبہ نہ ہو ایک دوسرے کی مدد سے اپنی کمیوں کو پورا کرنے مزاحمتوں کو دور کرنے اور زندگی کی شاہراہ کو ہموار کرنے کی خواہش نہ ہو تو نہ افراد آگے بڑھ سکتے ہیں، اور نہ ملت وجود میں آسکتی ہے جب کہ ملت کا عروج، اقبال کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ ملت اور اس کے عروج پر فکر کا تقاضا تھا کہ وہ شخصیت اور فرد پر گہری نظر ڈالتے، اس کی حقیقت پر غور و خوض کرتے، اسکے اندرونی امکانات اور باطنی قوتوں کا جائزہ لیتے۔ شخصیت کے رخ سے کائنات کو دیکھتے، شخصیتوں کی کثرت محض اور ملت میں تفریق کرتے، ترکیبی روابط کی تفتیش کر کے ان کو وجود میں لانے اور مستحکم کرنے کے وسائل تلاش کرتے اور اس طرح اسرارِ خودی کو فاش اور رموزِ بے خودی کا انکشاف کرتے۔ اقبال کا اس عہد کا کلام خاص طور سے اسی غور و فکر کا منظوم نتیجہ ہے، خودی کی حقیقت، اس کی خصوصیات، زندگی سے اس کا تعلق اور اس کی بقا میں خودی کا کردار، خودی کے استحکام کے وسائل

---

[1] دیباچہ اسرار خودی صفحہ نہ

اور ضعف و اضمحلال کے اسباب، اس کے مختلف مراحل حیات پھر جماعت سے اسکا تعلق، اس کی اکائیوں کی کثرت سے اجتماعی وحدت کی تشکیل اور ملت کی تعمیر ملت کا نظم وضبط اور نظم وضبط کے اسباب اور دوسرے متعلقہ مسائل اس زمانے میں اقبال کی فکر کے خصوصی موضوعات ہیں۔

عشق:- عشق کی کائناتی اہمیت[1] سے اقبال پہلے سے واقف تھا لیکن معشوق اور محبوب متعین اور مشخص نہ تھا، اب ایسا معشوق جس کے عشق سے ہماری خودی میں زندگی، پایندگی، سوز زندگی اور تابندگی پیدا ہوتی ہے، متشخص ہو چکا ہے۔

ہست معشوقے نہان اندر دلت	چشم اگر داری بیا بنمایمت
عاشقانِ او ز خوبان خوب تر	از حسینانِ جہان محبوب تر
دل ز عشقِ او توانا مے شود	خاک ہمدوش ثریا مے شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد	آمد اندر وجد و بر افلاک شد

یہ محبوب جو مسلمان کے دل میں ہر وقت موجود رہتا ہے وہ آنحضرتؐ کی ذات گرامی ہے۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است	آبروے ما ز نام مصطفیٰ است

اب تک دین کا جو تصور تھا وہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور ممتاز تھا اس کا تقدس دنیوی آلودگیوں کو برداشت نہیں کرتا تھا، لیکن آنحضرتؐ کی ذات

---

[1] نقطۂ نوری کہ نام او خودی است — زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت مے شود پایندہ تر — زندہ تر سوزندہ تر، تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہرش — ارتقاے ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق — عالم افروزی بیاموزد ز عشق

گرامی نے اس یک طرفہ تصور کو بدل ڈالا اور دین کی نئی طرح ڈالی؛

در جہان آئین تو آغاز کرد مسند اقوام پیشین در نورد

آپ کے دین کا تقدس دنیا کو آغوش میں لیکر دنیا کو بھی مقدس بنا دیتا ہے وہ دنیا کو دین کی کنجی سے کھولتا ہے۔

از کلید دین در دنیا کشاد ہمچو او بطن ام گیتی نزاد

اقبال سعی و عمل اور جد و جہد کی بنیاد عشق پر رکھنی چاہتے ہیں، ہر موقع پر اسباب وعلل کا سہارا ڈھونڈنے کے وہ موافق نہیں، عشق کی بے باکی نے دنیائے عمل میں اکثر ایسے کرشمے دکھائے ہیں، کہ عقل حیران رہ گئی ہے،

گرچہ تو زندانی اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عشق میں مصلحت اندیشی عشق کے خام ہونے کی دلیل ہے جب کہ یہی مصلحت اندیشی عقل کی پختگی کی علامت ہے۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اسی مصلحت اندیشی کی وجہ سے اکثر عقل جھجک کر رہ جاتی ہے اور عشق عمل کے اکھاڑے میں کود پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

آغاز و انجام سے بے نیاز، موقع و محل کی نزاکتوں سے بے خبر اور زمانے کے نشیب و فراز سے بے پرواہ۔

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی تو ہے زناری بتخانۂ ایام ابھی

عقل سحر و شام گنتے رہتے ہیں وقت گذار دیتی ہے جب کہ زندگی سعی و عمل چاہتی ہے

سعی پیہم ہے ترازوے کم و کیف حیات ۔۔۔ تیری میزان ہے شمار سحر و شام ابھی

دین و مذہب | اب دین و مذہب خدا اور بندے کا نجی اور محض روحانی رشتہ نہیں رہا ہے بلکہ حیات انسانی میں اس کی انفرادی اور معاشرتی اہمیت ہے، مقصد اس کے حصول کی تمنا اور اس تمنا کو حقیقت بنانے کے لیے جد جہد، اقبال کا قدیم تاثر ہے اور چونکہ انسانی حیات کی بلندی اور عظمت میں اس کے مقاصد کی بلندیوں اور عظمتوں کو ہمیشہ سے بڑا دخل رہا ہے، ان عظمتوں اور بلندیوں کا پیمانہ اقبال کے نزدیک اب خالص مادی یا محض انسانی نہیں رہا ہے، اس میں ایک طرح کا تکوینی تقدس شامل ہے، اغراض سے پاک اور فیوض و فضائل کا حامل، اس کے ڈانڈے براہ راست دین و مذہب سے ملے ہوئے ہیں چنانچہ "فردوس میں ایک مکالمہ" کے زیر عنوان عہد حاضر کے نوجوانوں کی زمین گیری اور زمین تازی فطرت کا ماتم اور ان کے مادی انداز نظر کا شکوہ کرتے ہوئے حالی کی زبان سے کہتے ہیں،

دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی ۔۔۔ فطرت ہے جوانوں کی زمین گیر زمین تاز

شخصیتوں کے انبوہ کو ملت کی صورت میں منظم کرنے کا جہاں تک تعلق ہے افراد اور شخصیتوں کی ہم آہنگی پر موقوف ہے، اور مسلمانوں کی ہم آہنگی دین و مذہب کی مرہون رہی ہے، اور آج بھی مذہب پر ہی منحصر ہے، اسی نظم میں کہتے ہیں،

مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی ۔۔۔ دین زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز

بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی ۔۔۔ ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز

موت اور شخصی بقا | شخصی زندگی کی بقا جو پہلے محض شاعرانہ تخیل تھی اب مستقل فکر ہے،

انھیں اب یقین ہو گیا ہے کہ انسانی جوہر حیات نا آشنائے عدم ہے، شعلۂ حیات کی قسمت زدہ افسردگی نہیں،

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

موت، ایک بالکل نئی قسم کی زندگی گذارنے کے لیے خاص استعداد بہم پہنچانے کا وقفہ ہے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

گویا اسی سے اس نئی دوامی زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے،

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ہے یہ شام زندگی، صبح دوام زندگی

خودی کا ضعف و استحکام اور ان کے اسباب و آثار

تاریخ کے تجزیے سے اقبال اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ قومیں ہوں یا افراد، ان کا استحکام و اضمحلال یا عروج و زوال ان کی انفرادی یا اجتماعی شخصیت اور خودی کے استحکام و اضمحلال پر موقوف ہے۔ خودی مستقل طاقت ہے جو اپنے اظہار کے لیے بیتاب اور عمل کے لیے میدان کی جویا رہتی ہے، تصادم کے موقعے تلاش کر کے قوت کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے، چنانچہ افراد و اقوام کے عروج و زوال میں کشاکش اور ستیزہ کاری کی اہمیت کی یہی بنیاد ہے۔ یہ ایک نامی اور جذاب و پرکشش قوت ہے، غلبہ اور استیلاء اس کی خاصیت ہے، اس کی پایندگی اور زندگی میں عشق کو خصوصی دخل ہے، استحکام و پایندگی کے لحاظ سے اس کی منزلیں اور ان کی خصوصیتیں، اقبال کے اسی عہد کے تصورات ہیں، خودی کی قوت اور اس کے ضعف میں تاثیر کے لحاظ سے روایتی مسلم تصوف سے بیزاری اور اسپر نکتہ چینی اسی زمانے کی فکر ہے[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خودی کی خلاقی اور وحدت وجود | خودی کا انقسام ہو، اس کے نتیجے میں اس کی خلاقی، عقل و احساس کی آفرینش، عامل و معمول اور اسباب و علل کی صورت میں اسکے مختلف تشکلات، زمانے کا حقیقی اور خلاق تصور پھر خودی کا کائنات اور زمانے پر شامل ہونا، امواج بحر کی طرح کائنات کی بحر وجود سے معیت اور قدامت گویا وجودی وحدت کی نئی تعبیر اقبال کی خودی کے اسرار نہاں ہیں، جن کو انھوں نے "الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید" میں کھولا ہے۔[1]

فرد اور ملت | فرد اور جماعت کے رشتے نے اسی دور میں مربوط اور متعین شکل اختیار کی اور مستقل فکر کی حیثیت حاصل کی۔ ان کی خودی یا شخصیت کے تصور میں اور کسی اجتماع کے ذیل میں جو ناآہنگی تھی، اس کو رضاکارانہ ہم مقصدیت سے دور کرنے کی کوشش کی۔ فرد اور جماعت کے باہم فکر، افادے و استفادے کی نوعیت واضح کی۔ ملت اور اجتماع یا اجتماعی خودی کی تشکیل، اس کے استحکام اور کثرت کے وحدت میں تحویل ہونے اور وحدت کے کثرت میں پھیل جانے کی کیفیت، ملت کے ... نظم و ضبط کے لئے دستور و آئین کی پابندی یا شریعت پر عمل کی اہمیت پر زور دینا اسی زمانے کی فکر ہے۔[2]

حرکتِ زندگی اور فکر | حیات کی حرکت اور تغیر سے توجہ فکر اقبال کی اسی عہد کی پرواز ہے، گو حق وجود ہمیت پوری کائنات کی حرکت و تغیر میں تحویل اگرچہ واضح نہیں ہے، لیکن فکر کا رُخ اشاروں میں متعین ہونے لگا ہے، فکر کی گرانخیزی اور چیزوں کو جامد بنا کر دیکھنے کی فطرت پر بھی گذرتی سی روشنی ڈالدی ہے،

(حاشیہ ص ۹۱) [1] مثنوی اسرار خودی، بانگ درا، ارتقا، ص ۲۹۲ [2] اقبال نامہ مکتوب سوم بنام منشی سراج الدین، ایضاً مکتوب اول بنام سراج الدین پال ص ۳۳ - (حاشیہ ص ۹۲) [1] پیام مشرق، اسرار خودی، [2] مثنوی رموز بیخودی

گر نظر داری یکے بر خود نگر | جزم پیہم نیست اے بے خبر
تا نیاید تاب تا شہود خویش | شعلۂ او پردہ بندد از دود خویش
آتش او دم بخویش اندر کشید | لالہ گردید و ز شاخے بر دمید
فکر خام تو گران خیزست لنگ | تہمت گل بست بر پرواز رنگ
زندگی مرغ نشیمن ساز نیست | طائر رنگ است جز پرواز نیست

انسان کی خلاقی | اقبال نے انسان کے نایب خدا ہونے کے لحاظ سے اس کے خلاق ہونے پر بھی زور دیا ہے، فطرت کی ان گھڑ، مخلوق کی تزئین و تحسین اور اپنے مقاصد و مصالح کے مطابق ان کی تحویل اور ضروری تراش و خراش انسان کی ذمہ داری ہے۔

جہان او آفرید این خوب تر ساخت | مگر با ایزد انباز است آدم

حسن و قبح یا خوب و زشت | حسن و قبح یا اچھائی برائی کا کوئی ذاتی اور اندرونی حیثیت میں کوئی وجود نہیں، ذات جب مظہری حیثیت اختیار کرتی ہے، اور حیثی عالم میں اس کا ظہور ہوتا ہے، تو گل بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور خار بھی،

چہ گویم نکتہ زشت و نکو چیست | زبان لرزد کہ معنی پیچدار است
برون از شاخ بینی خار و گل را | درون او نہ گل پیدا نہ خارست

۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۶ء تک | فکری لحاظ سے یہ عہد خودی، کا عہد ہے، خودی کے عضوی اجزا یا خون کی تحلیل، ان کی تشریح، خصوصیات اور ان کا اندرونی یا باطنی اور بیرونی یا خارجی اطلاق اور اس کے اثرات اقبال کا موضوع فکر ہیں، حیات، شعور، اور عزم و ارادہ کی کرشمہ زائیاں، اعماق خودی کی پہنائیاں اور اس کی باطنی کیفیتیں، اسکی رسائی، اسکا جذب اور کشش، خودی میں استغراق یا وقتی التفات اور ان میں عشق کی

کارکردگی اور اس کے اثرات زمانے کی اندرونی حقیقت محض اور بیرونی تدریجی گذران خودی کے گوشے ہیں، جن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آفرینش کائنات کا مقصد خودی میں خدا کا جلوہ اور یقین کی اہمیت ساتھ ساتھ سیاسی اور اقتصادی تاثرات، ملوکیت، سرمایہ و مزدور، فقر و درویشی کی حقیقت اور زندگی کی جاودانی کا راز اسی عہد کے تصورات ہیں

اس دور میں فلسفۂ اقبال کے قریب قریب سب پہلو اجمالاً اور اشاروں اشاروں میں آگئے ہیں، گویا الہیات اسلامیہ کی تشکیل نو کے خطبے اسی اجمال کی تشریح اور ان ہی اشاروں کی تفصیل ہیں، اور پوری فلسفیانہ دقت اور ژرف نگاہی کے ساتھ،

شعور اور وجدان | فکر کے برخلاف جو چیزوں کو جامد بنا کر ٹکڑوں میں دیکھتی ہے، خودی اپنے باطنی شعور یا وجدان کے ذریعے سے دونوں جہان کا لمحاتی اور آنی ادراک کر لیتی ہے، جس کے لیے عشق مہمیز کا کام کرتا ہے۔

ے شعور پردۂ چشم پرے کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہان را بنگاہے گاہے

خودی کا باطنی شعور محض انفعالی نہیں ہوتا وہ اپنی اندرونی حیثیت میں فعلی اور تخلیقی ہے۔

این جہان چیست؟ صنم خانۂ پندار من است — جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے او را — حلقۂ ہست کہ از گردش پرکار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من — حلقۂ ہست کہ از گردش پرکار من است

جہان کا انقلاب خودی کے باطنی شعور کی نگہ التفات کا انقلاب ہے، شعور بدلا اور دنیا بدلی۔

بخود نگر گلہ ہائے جہان چہ مے گوئی — اگر نگاہ تو دیگر شود جہان دگر است

جہان کہنہ اگر موافق مزاج نہیں تو دوسرے جہان پیدا کر لینا خودی کے بس کو

باہر نہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ہر کہ در ورطۂ "لا" ماند بہ "الا" نرسید

خلق کا مقصد | خواہش ظہور کا نتیجہ خلق ہے، جس کا مقصد خود تماشائی کے سوا کچھ نہیں۔

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید از نقش این و آن بہ تماشاے خود رسید

تخلیقی زمانہ یا غیر تدریجی بقا و استمرار | زمانہ اپنی تمام تخلیقی خصوصیتوں کے ساتھ خودی سے باہر کی حقیقت نہیں یہ خودی کی گہرائیوں میں بغیر گزران اور تجدد و تدریج کے بقائے خالص اور دوام محض کی صورت میں محفوظ ہے۔ تدریج اور تجدد اس کے ظہور اور خروج سے تعلق رکھتے ہیں۔

در شیشۂ او جہان روزگار است ولے بر ما بتدریج آشکار است

خدا جوئی | مسلم صوفی اپنی خودی اور انانیت کو خدا میں فنا کر کے یزدان شکاری کرتے ہیں۔ اقبال خدا کی جستجو میں انانیت کو فنا کرنے کے قائل نہیں، وہ انانیت کو نشوونما دے کر اُسے اتنا قوی بنا لیتے ہیں کہ خودی خدا کو بھی سما لیتی ہے۔ ایسی انانیت میں استغراق درحقیقت یزدان شکاری ہے۔

اگر زیری ز خود گیری زبر شو خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

حیات | زندگی وقتی اور عارضی حقیقت نہیں کہ جلد یا بدیر لے لی جائے گی تو یا خود بخود افسردہ ہو کر ختم ہو جائے۔

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید مرگ است صیدے، تو در کمینی

ہر شے کو جذب کر لینا اور پوری کائنات کو اپنے اندر سما لینا زندگی کی خاصیت ہے۔

اگر یہ خاصیت نہ پیدا ہو تو زندگی ناپختہ ہے اور زوال کی علامت ہے،

حیات چیست جہان را اسیر جان کردن تو خود اسیر جہانی کجا توانی کرد

اس کو پختہ اور جاویدان بنانے کے لیے مسلسل حرکت، متواتر عمل اور نہ ختم ہونے والی پیش قدمیوں کی ضرورت ہے،

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی ہے یہی اے بیخبر راز دوام زندگی

یقین کی اہمیت | سعی و عمل اور اقدام کے لیے تو یقین کی اہمیت نئی بات نہیں، اقبال بھی اپنے انداز میں کہہ چکے ہیں کہ:-

عمل خواہی؟ یقین را پختہ تر کن یکے جو و یکے بیں و یکے باش

لیکن اقبال کے نزدیک زندگی کے دوام سے بھی اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے، یقین ہی زندگی کو مستحکم اور لازوال بناتا ہے

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی

فقر و درویشی | فقر و درویشی ذلت و مسکنت نہیں، یہ جوہر خودی ہے جو اپنے عیار میں کسی کا محتاج نہیں، اور خود سلطانی اور شہریاری ہے،

ز جوہرے کہ نہان است در طبیعت ما مپرس صیرفیان را کہ ما عیار خودیم

اس فقر و درویشی کے بوریا کے نیچے شہنشاہیاں پڑی رہتی ہیں،

چون بکمال مے رسد فقر دلیل خسرویست مسند کیقباد را در تہ بوریا طلب

جمہوریت اور سرمایہ و محنت | مغربی جمہوریت پر نکتہ چینی اور سرمایہ و محنت کی آویزش میں سرمایہ دار کے ہتھکنڈوں کو اجاگر کرنا، اس کے ظلم و ستم دکھا کر مزدور کو جنگ پر آمادہ کرنا، اور نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ کو سرمایہ

پرستی کو زاویۂ نظر سے دیکھنا۔ اسی عہد کا انداز نظر ہے،

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۲ء تک | فلسفۂ اقبال کی تفصیل اور تکمیل کا یہی زمانہ ہے اسی وقفے میں اقبال کی زندگی کے متعدد اور مختلف رخوں پر فلسفی اور متکلم ہونے کی چھاپ نمایاں ہوئی، اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ عظیم ملی شاعر ہیں یا عظیم مسلم فلسفی۔

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ اقبال کا ابتدائی گھریلو اور مکتبی ماحول مذہبی اور صوفیانہ تھا، مغربی فلسفہ ان کا تعلیمی مضمون اور فلسفۂ مشرق ان کا تحقیقی میدان تھا، مسلمانوں کا مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی تنزل اور مغرب کی حرکت اور جد و جہد اور اس کے ثمرات ان کے پیش نظر تھے، یورپ کی مادیت اور اسکے تحت اس کی ترقیوں نے افریشیائی قوموں کی نظریں خیرہ کر دی تھیں اقبال کے

میلانات، خیالات اور تصورات کی بڑی ایک خاص رو تھی جو متصوفانہ اور فلسفیانہ ہوتے ہوئے بھی دعوت عمل تھی، اور فی الواقع ایسی منظم اور مفصل مابعد الطبیعیات کی متقاضی تھی۔ جو اُس کا منبع اور بنیاد بن سکے اور یہ پارہ پارہ تصورات مستقل فکر کی صورت حاصل کر سکیں، اور ساتھ ساتھ جدید علوم و حکمت کے مقابلے میں نئے علم کلام کی بنا پڑ جائے۔

خطبات الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید سے متعلق خطبات ان کے تصورات کی اسی رو کی مابعد الطبیعیاتی بنیاد ہیں، جس کے بغیر نہ ان کے تصورات میں نظم پیدا ہوتا ہے نہ ان کی معنویت واضح ہوتی ہے، اس تشکیل جدید پر غور و فکر کی ابتدا تو پہلے سے ـــ ہو چکی تھی، اور اجتہاد یا اسلام کی تعمیر میں اصول حرکت، پر وہ اپنے خیالات کو ایک حد تک ترتیب بھی دے چکے تھے،[1] مگر آخری تکمیل ۱۹۲۸ء سے پہلے نہیں ہو سکی اور وہ بھی چھ خطبوں کی صورت میں، ساتواں خطبہ "کیا مذہب کا امکان ہے؟" جو آکسفورڈ کی ارسطا طالیسی مجلس کی دعوت پر لکھا گیا تھا ۱۹۳۲ء سے پہلے مکمل نہیں ہو سکتا تھا،[2]

یہ خطبے اگرچہ دیرینہ اور تدریجی غور و فکر کا نتیجہ ہیں، لیکن پھر بھی تشکیل جدید کے موضوع پر اگر ان کی تصنیف مستقل اور مرتب نظام فلسفہ کی صورت میں ہوتی تو یقیناً کہیں زیادہ مستحکم، مربوط، جامع اور زیادہ تحقیقی اور انتقادی ہوتی اور اسلامی علوم و فنون کے اصل منابع کا براہ راست اور زیادہ استیعاب سے مطالعہ، ان کی تحقیق، نقد اور

[1] اقبال نامہ، مکتوب بنام مولانا عبدالماجد کا ذیلی حاشیہ ص ۲۳۳ و ذیلی حاشیہ مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ص ۱۸۱ ص ۱۸۵ مکتوب بنام غلام بھیک، اقبال نامہ ص ۲۱۱ ص ۲۱۲ مکتوب بنام شجاع ضنعی، اقبال نامہ ص ۲۳۰

[2] اقبال نامہ کے متعدد خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر انھیں براہ راست اور بالاستیعاب مطالعہ کے مواقع حاصل نہ تھے۔

رائے قائم کرنے میں بھی زیادہ معاون ثابت ہوتا۔

ان خطبوں میں طبیعیات کی قدیم بنیادوں پر نقد ہے، اور نفسیاتی تجربوں اور مشاہدوں کی سند پر، روحانی قسم کی مابعدالطبیعیات کی تاسیس ہے؛ ایک روحانی اساس سے خلق اور خلاق اور ان کے عوارض وصفات کی توجیہ کی گئی ہے، مذہب کی ایمانی حقیقتوں کا استخراج کیا گیا ہے، مذہبی اعمال کی قدریں واضح کی گئی ہیں، اور اس طرح اسلام کی جدید الٰہیات کی تشکیل کی گئی ہے۔

ان خطبوں میں اسلام سے متعلق قریب قریب سب ہی اصولی اور بنیادی عقائد آگئے ہیں؛ ذات باری، وحی و رسالت، جبر و اختیار اور تقدیر، لوح محفوظ، حیات بعد الموت، جنت و جہنم اور نامۂ اعمال وغیرہ سب کی اپنے مابعدالطبیعیاتی موقف سے تشریحیں ہیں۔

اصل حقیقت کی نوعیت، شعور، ارادہ، زمان اور خودی کا عضوی تعلق، کائنات اور حسی مظاہر اور ان کی افعال فرد سے توجیہ، خلق و آفرینش کے معنیٰ، عالم خلق اور عالم امر کی حقیقت، روح و بدن کا فرق، باری تعالیٰ کی محدودیت، حدوث و قدم، موت، برزخی اور اخروی زندگی وغیرہ کے متعلق مجمل اور کہیں مفصل بیان ہے، ضمناً اخلاقی اور سیاسی مسائل پر بحثیں بھی آگئیں ہیں، اسلامی قانون کی نئی تعبیروں کا جواز اور اس کی حرکیت اور نامی ہونے پر مفصل بحث ہے، اسلامی مجالس قانون ساز کی حیثیت اور ان کے حدود قانون سازی کی توضیح بھی ہے، "خطبات اقبال" کی ضمنی اہمیت یہ ہے کہ یہ ان کے اشعار کی شرح ہیں، انکو سامنے رکھے بغیر اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ مبہم یا بے معنی معلوم ہوتا ہے، گویا اقبال کی انفرادی شاعرانہ

تخیل نے جو مبہم اور استعاروں کنایوں میں تھی واضح اور حقیقت کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور فلسفے کی صورت میں انفرادی کے بجائے اجتماعی تخیل ہو گئی ہے[1]

اشتراکیت اور اسلام | سر فرانسس ینگ ہسبینڈ کے نام ایک خط میں اقبال نے اسلام اور اشتراکیت کے فلسفۂ اقتصاد کی یکسانی پر زور دیا ہے، اور دونوں کے اساسی فرق کو واضح کیا ہے[2]

امومت زن | اسی زمانے میں عورت کے صنفی فریضے اور اس کی فطری خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے، اور مرد و زن کی خلقی وابستگی کو واضح کیا ہے،

مرد و زن وابستۂ یک دیگرند　　کائناتِ شوق را صورت گرند

مرد شعلۂ حیات کو تب و تاب دیتا ہے تو عورت اس کو قائم رکھتی ہے، اور اپنے جوہر کو اُس میں تپا کر اکسیر بنا لیتی ہے اور یہی اکسیر خاک کو انسانی جوہر میں بدل دیتی ہے،

زن نگہ دارندۂ نار حیات　　فطرت او لوح اسرار حیات
آتش ما را بجان خود زند　　جوہر او خاک را آدم کند

حسن و قبح کا شرعی ہونا | یہ پہلے گذر چکا ہے کہ حسن و قبح یا خوب و زشت چیزوں کی ذاتی صفتیں نہیں جہاں تک ان کے معیار کا تعلق ہے تو چونکہ عقل کے سامنے ذاتی بہبود ہوتی ہے، اور دوسروں کی نظر عام فلاح پر رہتی ہے،

---

[1] اقبال نے پہلے خط کے پہلے ہی صفحے میں بیان کیا ہے کہ اعلیٰ شاعری، فلسفہ اور مذہب تینوں کے سامنے ایک ہی قسم کے سوالات ہوتے ہیں، اعلیٰ شاعری ان سوالوں کا جواب استعاروں کنایوں میں دیتی ہے اور یہ مبہم اور انفرادی ہوتے ہیں [2] اقبال کی تقاریر و بیانات" مرتبہ شاملو صا۱۵۱

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر سود خود بیند، نہ بیند سود غیر

وحیِ حق بینندۂ سود ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

اس بندۂ حق کے لیے ان کا معیار وحیِ حق کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

زمین کا ملک عام ہونا | پہلے گزر چکا ہے کہ اقبال اشتراکی فلسفۂ اقتصاد اور اسلامی فلسفۂ اقتصاد کو اصولاً متحد جانتے تھے، یہ نظریاتی فرق تھا کہ اسلام کے فلسفۂ اقتصاد کی اساس ان کے نزدیک مثبت تھی، اور اس لیے زیادہ مستحکم تھی برخلاف اشتراکیت کے کہ وہ عارضی بنیادوں پر قائم ہے، چنانچہ اپنے اس نقطۂ نظر کے تحت وہ زمین کو عام ملک قرار دیتے تھے،

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو چیست شرح آیۂ لا تُفسِدوا

۱۹۳۰ء سے ۔۔۔۔ | اقبال کے فلسفے یا فلسفۂ خودی کی تکمیل "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" پر ہو گئی تھی اور قریب قریب اس کے اصولی اور بنیادی پہلو خواہ اجمالاً خواہ تفصیلاً اُسی دور کی فکر تھے، اس آخری عہد میں زیادہ تر گزشتہ افکار کا ہی مختلف انداز سے اعادہ ہے؛ بیان کے اسلوب جدا جدا ہیں، جزئیات بدلی ہوئی ہیں زاویۂ نظر الگ الگ ہیں لیکن اصل فکر میں وحدت ہے، نیا تصور بہت شاذ و نادر ہے، کبھی کبھی اور کہیں کہیں کوئی نیا خیال توجہ کو جذب کرتا ہے تو بیشتر اس کی نوعیت فروعی ہوتی ہے، چاہے اس کا تعلق الٰہیات سے ہو یا اخلاقیات و سیاسیات سے تہذیب و مدنیت سے ہو یا جمالیات سے۔

مظاہرِ قوت کی اہمیت | قوت کی نمایش اور شوکت کے اظہار کی انفرادی اور اجتماعی

زندگی میں جو قدر و قیمت ہے، اس کو طرح طرح سے واضح کیا ہے، طاقت ہوتے ہوئے کمزوری دکھانا حیف ہے۔

وائے آن شاہین کہ شاہینی نکرد　　مرغکے از چنگ او نا مرد برد

لیکن بے سوچے سمجھے اندھا دُھند طاقت کو جھونک دینا اگر سراسر جنون اور ابلہی ہے تو ایسی سوجھ بوجھ جس کی پشت پر طاقت نہو محض روبہی اور مکاری ہے

وائے بے قوت ہمہ مکر و فسون　　قوت بے رائے جہل است و جنون

انفرادی جرائم اور قومی جرائم کا فرق | افراد کے گناہ اگر اجتماع اور معاشرے میں سرایت نہ کریں تو وہ محدود ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ بچ بھی جاتا ہے، اور کم از کم معاشرہ محفوظ رہتا ہے اور تباہ یا کمزور نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی معاشرہ جرائم پیشگی اختیار کر لے تو پورا معاشرہ ذلت و نکبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور اپنے کیفرِ کردار سے نہیں بچتا۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے　　کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

مرد کا صنفی فریضہ | مرد و زن کا صنفی فرق پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ وہ شعلۂ حیات کو پیدا نہیں کرتی بلکہ اس کو قائم اور محفوظ رکھکر اپنے جوہر کی اکسیر سے خاک کو انسان بناتی ہے، اُس کا یہ جوہر اُس کی یہی معصوم نسوانیت ہے جو اُمومت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے اور اسی نمود میں خود مرد کو دخل ہے۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر　　غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

اس لیے اس جوہر کی حفاظت بھی مرد کا منصبی فرض ہے، تعلیم یا پردہ جیسے مصنوعی طریقے اس حفاظت سے قاصر ہیں۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی　　نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد

حسن وجمال کا معیار اور علوم وفنون وادیان کی قیمت

حسن وجمال ہو یا علوم و مذاہب غرض یہ کہ زندگی سے متعلق رکھنے والی ہر شے کی قدر وقیمت کا پیمانہ خود زندگی اور اس کی قوت ہے! اگر یہ حیات کے تحفظ، اس کی آفرینش اور جذب و استیلا میں مدد و معاون ہیں تو مفید اور قابل قدر ورنہ ناکارہ اور زندگی پر وبال اور بار دوش!

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر　　گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات　　نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی　　کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

مہدی کا تخیل

ابن خلدون کے انتقاد کی سند پر اقبال روایتی امام مہدی کی آمد کے قائل نہیں تھے لیکن ان کی رجائیت ان کو کسی ایسے مہدی، مجدد یا انسان کامل کے ظہور کا منتظر رکھتی تھی، جو اسلام کی قوت و شوکت کا باعث اور اس کی غیر اسلامی عناصر سے تطہیر میں مدد و معاون ہو، اس کو مہدی کہا جائے یا نہ کہا جائے[1] تاہم وہ اس تصور کو فعال اور قوت کی حیثیت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ نطشے کے تخیلی فوق البشر کی نمود کو جرمن قومیت کی قوت کی صورت میں دیکھ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ اسی طرح یہ تصور ہر مسلمان کو اپنی تمام طاقتوں کو اس کے ظہور کی راہ ہموار کرنے پر آمادہ کر دے! ملت اسلامیہ کے احیا اور اس کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ ہو جائے، چنانچہ وہ مسلمانوں کو اس تصور سے محروم کرنے کے حامی نہ تھے، مگر[2]

---

[1] مکتوب بنام ضیاء الدین برنی، انوار اقبال ص [illegible]

[2] اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار　　نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی — مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

تو پھر ملت اسلامیہ کو روایتی اور قدیم تصورات کی حیات بخشی سے انکار رفتہ کیوں ہو جبکہ پوری

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

بندۂ صحرا یا مرد کہستانی | اقبال کا خیال تھا کہ فرزند صحرا یا مرد کوہستانی اپنی فکر و ضمیر کے بے رنگ اور قوائے عمل کے تیز تر ہونے کی وجہ سے فطرت کے مقاصد و مصالح کا سب سے بڑا پاسبان ہے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی

عرفانِ خودی کی دیر ہے جہاں وہ اپنی عظمت سے واقف ہوا اور اس نے دنیا کی تقدیر بدلی، تاریخ کے اوراق سادہ اس کے اپنے قلم سے اس کی سرنوشت لکھنے کو بیتاب رہتے ہیں،

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ — خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

چنانچہ افغانی قبائل کو تاریخ کے اہم انقلابوں کو یاد دلا کر آمادہ کرنے کی یہی وجہ تھی،

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان — تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان — او غافل افغان!

افکار اقبال | افکار اقبال پر یکجائی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۰ء تک ان میں تغیر و تبدل برابر جاری ہے، لیکن اس کے بعد اضافے ہوتے رہے ہیں، اور پوری ہمواری کے ساتھ، کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی ہے، وحدت وجود کے تصور میں تو فرق آیا ہے لیکن وہ انکی فکر کا اہم گوشہ نہیں، خطبات کا عہد (۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء) انکی فکر کا عہد شباب ہے اور خودی سے متعلق بعض وقتی تصورات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ فکر بالعموم متوازن ہے ان کے بعد کا زمانہ فکر کے قیام اور اسکے مختلف پہلوؤں کو گوناگوں رنگوں میں اطلاق کا یا، جسکے تحت مختلف اعمال و افکار کے انعقاد کا عہد ہے،

رصدگاہ محمد شاہی دہلی
یا
جنتر منتر

از جناب شبیر احمد خان صاحب غوری ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

جدید یورپی علم الہیئت سے استفادہ | متاخر مغل بادشاہوں کے عہد حکومت میں شہر دہلی میں یورپی ممالک کے فضلا کی تجارتی نیز مذہبی تبلیغ کے سلسلے میں آمد و رفت تھی۔ ان لوگوں نے راجہ کے سامنے یورپ میں علم ہیئت کی ترقی کے قصے بڑھا چڑھا کر بیان کئے تھے، چنانچہ راجہ نے اپنے ہیئتی مطالعہ کے دوران جہاں الغ بیگ کی "زیچ جدید گورگانی" ملا چند منجم اکبر شاہی (یا ہمایونی) کی "تسہیلات"، ملا فرید منجم کی "زیچ شاہجہانی" وغیرہ اور ہندو جوتش ودیا کے معیاری شاہکار پڑھے تھے، یورپی ہیئت دانوں کی مرتبہ زیچیں بھی پڑھی تھیں؛ اور جب اس نے اپنی وقت کا بادشاہ کے سامنے اظہار کیا تھا تو موخر الذکر نے جہاں مسلمان ہندسین و منجمین اور برہمن جوتشیوں سے کاروبار رصد میں مدد لینے کا حکم دیا تھا، دانایان فرنگ سے بھی مشورہ لینے کے لیے کہا تھا لہذا راجہ نے بھی یورپی ماہرین علم الہیئت سے استفادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ان کی حذاقت سے زیادہ متاثر نہیں ہوا،

بہرحال راجہ سات سال تک اپنے طور پر ہیئتی سرگرمیاں جاری رکھنے کے بعد ایک علمی وفد پادری مینوئیل فگیوریڈو (Padre Man) کی قیادت میں[1]، یورپ [بقول کرنل ٹاڈ پرتگال کے بادشاہ عمانوئیل (Emanuel) کے دربار میں] بھیجا کیونکہ اس زمانہ میں راجہ کو بتایا گیا تھا،

"درنزدیک بایں زمان از فرنگ ہم آلات رصدی درست کردہ اند
اکابر آنجا و دانایان شان باین کار شگرف مشغول و متوجہ اند و کارخانہ
رصد در آنجا ہنوز جاری است و ہموارہ در تحقیق دقائق این علم اند"

یہ وفد اپنے ہمراہ (L'Hire) کی ہیئتی جداول جس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن اس وقت سے کوئی تیس سال قبل شائع ہوا تھا، نیز اس سے پہلے کی زیجیں لے کر آیا۔[2]

[کرنل ٹاڈ کا کہنا ہے، کہ بادشاہ عمانوئیل نے زیویر ڈی سلوا (xavied Silva) کو راجہ کے پاس روانہ کیا، اس نے راجہ کو "لیر" (Del Hire) کی زیجات سے متعارف کرایا مگر راجہ ان زیجوں سے مطمئن نہ ہو سکا کیوں کہ ان کے ذریعہ استخراج کی ہوئی قمر کی تقویم میں اور اس کی واقعی وضع میں جو براہ راست مشاہدہ سے حاصل ہوئی تھی،

---

[1] زیچ محمد شاہی، ورق ۲ ظ۔

"بنا برعلیہ از ینجا چند کس معتمد عالم و دانائے این فن را برفاقت مینوئیل پادری بان سمت فرستادہ"

(۲) زیچ محمد شاہی، ورق ۲ ظ و ب

"زیچ جدید آنجا کہ بنام لیر تسمیہ یافتہ و سی سال گزشتہ کہ بتازگی مرتب گشتہ با زیچہائے سابق آنجا بنظر یار طلب داشتہ ملاحظہ نمودہ"

(۳) (Tod : Annuls And Antiquities of Rajasthan
Vol II P. 99

۱/۲ درجہ کا فرق نکلا دوسرے سیاروں کی تقویم میں بھی غلطی پائی گئی، اور چاند گہن اور سورج گہن کے اوقات میں پندرہ پل [اور بقول کرنل ٹاڈ چھ منٹ] کا فرق نکلا

راجہ کا خیال ہے کہ اس فرق و تفاوت اور غلطی کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی رصد گاہوں کے آلات اتنے بڑے نہیں تھے جتنے خود راجہ کی اپنی رصد گاہوں کے تھے۔[1]

زیویرڈی سوا کے علاوہ راجہ جے سنگھ نے اور یورپی فضلاء سے بھی استفادہ کی کوشش کی چنانچہ (Tieffen Thaler) کی تصریح کے مطابق اس نے ۱۷۳۳ء میں (Father Boundiet) کو بنگال سے بلوایا تھا، نیز ۱۷۳۴ء میں جرمنی کے دو فاضلوں (Father Antony Gibelsperger) (Andrew Strobl) کو زاد راہ بھیج کر طلب کیا تھا۔[2]

سوال یہ ہے کہ کیا ان یورپی فضلاء نے راجہ کو متاثر کیا، اس باب میں دو رائیں سر سید احمد خان فرماتے ہیں :۔

" یہ رصد خانہ وہ ہے کہ جس میں پہلے پہل انگریزی ہیئت جدید کے اکثر قواعد تسلیم کئے گئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے یونانی ہیئت دانوں اور زیچ بنانے والوں نے ان قاعدوں میں سے ایک کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا اسی سبب سے یہ رصد خانہ اپنے ساتھیوں میں یکہ اور بہت نامی ہے ۱۴ سنہ جلوس محمد شاہ مطابق ۱۱۴۳ھ ہجری موافق ۱۷۳۱ء عیسوی کے راجہ

---

(۱) زیج محمد شاہی، ورق ۲ ب " چوں در فرنگ آلات رصدی با این بزرگی و انطباق بہ حسب خواہش دل نساختہ اند، حرکاتیکہ بتوسط آن دریافتہ اند پارۂ از تحقیق دور افتادہ "

Neuedge, Ma'Athir ul-Umara (English Translation) Vol I P. 736 Foot note

سوائی جے سنگھ نے کئی آدمی ریاضی داں پادری میڈویل کے ساتھ فرنگستان میں بھیجے اور وہاں سے آلات رصد وغیرہ منگوائیں، اور وہ لوگ خود بھی فرنگستان کا رصد خانہ دیکھ کر آئے، اور زیج جدید جس کا لیر نام تھا یہاں لائے، اور اس رصد خانے سے مطابقت کی، لیر کے حساب میں تقویم قمر میں آدھے درجہ کا اور کسوف و خسوف کے زمانہ میں چوتھائی دقیقہ یعنی پندرہ پل کا فرق نکلا، انھیں باتوں سے یقین ہوتا ہے کہ اس رصد خانے میں انگریز بھی شریک تھے، بلکہ انگریزی ہیئت جدید کے قواعد کا اس یونانی رصد خانے میں مان لینے کا بڑا سبب بھی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ یونانی ہیئت دانوں نے ان نئی باتوں کو مان لینے پر بہت تکرار کی تھی، اور یہ بات چاہیئے بھی تھی کہ ان باتوں کو عقلی دلیلوں سے ثابت کیا جائے، مگر چونکہ ان نئے قاعدوں سے جو بات کہ حساب کی راہ سے نکالی جاتی تھی، اور جو بات کہ رصد سے دیکھی جاتی تھی وہ دونوں ٹھیک نکلتی تھیں، اس واسطے یہی مطابقت اُن قاعدوں کی صحت کو کافی متصور ہو کر عقلی دلیلیں قائم کرنے پر یا تو توجہ نہیں کی اور یا درحقیقت قائم نہ ہو سکیں۔

اب اس مقام پر ایک مختصر فہرست ان باتوں کی لکھتے ہیں، جو برخلاف یونانی ہیئت کے اس رصد خانہ میں تسلیم کی گئی ہیں۔

(۱) مدار بر خلاف مرکز شمس کو یعنی تسلیم کیا،

(۲) چاند کی حرکتوں کو بیضی مدار پر مانا،

(۳) یہ بات تسلیم کی گئی کہ زہرہ اور عطارد بھی چاند کی طرح آفتاب سے روشن ہیں، اور بدر اور ہلال ہوتے ہیں،

(۴) یہ بات مانی گئی کہ زحل گول کروی شکل پر نہیں، بلکہ اہلیجی شکل پر ہے،

(۵) مشتری کے گرد چار روشن ستارے قبول کئے گئے جن کا اقمار مشتری نام ہے،

(۶) آفتاب کے نشان مختلف مانے گئے کہ وضعی حرکت سے ایک برس کے قریب دورہ پورا کرتے ہیں،

(۷) کواکب ثوابت درحقیقت ثوابت نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر سیارہ ہیں۔

اس رصد خانہ میں رویت ہلال کی اور طلوع و خفائے کواکب اور طلوع و غروب منازل قمر کے حساب کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی، کیونکہ دوربین کی مدد سے یہ سب چیزیں دن کو آنکھوں سے دیکھ لی جاتی تھیں۔"(۱)

اس کے برعکس نیڈھم بڑے موکد الفاظ میں صراحت کرتا ہے کہ راجہ جے سنگھ پورے طور پر عربی اسلامی علم الہیئت کا نمائندہ تھا، بلکہ اپنی ہیئتی سرگرمیوں کو بادشاہ الغ بیگ کی ساعی کا تسلسل سمجھتا تھا۔

"Though A Hindu Working with Hindu Assistants, He. Was. entirely in The Muslim- Arabic Tradition of Astro. nomy. And Considered Himself The continuation of The Work of Ulugh. Beg."

(Joseph Needham. Science And - Civilization in China, Vol.3. P. 300)

[اگرچہ راجہ جے سنگھ خود ہندو تھا، اور ہندو معاونین کی مدد سے ہندی

(۱) سید احمد خاں۔ آثار الصنادید۔ صفحہ ۳۰۹-۳۲۱

سرگرمیاں انجام دے رہا تھا، مگر وہ کلیتاً اسلامی عربی الہیت کی روایات کا پیرو تھا، اور اپنی مساعی کو الغ بیگ کی کوششوں کا تسلسل سمجھتا تھا۔]

دونوں ہی فاضل اپنے اپنے مقام پر خصوصی اہمیت کے مالک رہے ہیں۔

سرسید احمد علیہ الرحمہ اُسی دہلی میں پیدا ہوئے، جس میں کوئی ایک صدی قبل یہ عظیم رصدگاہ قائم ہوئی تھی، وہیں انھوں نے تعلیم پائی اور وہیں بیٹھ کر اپنی کتاب "آثار الصنادید" مرتب کی۔ انھوں نے بنفس نفیس اس رصدگاہ کے کھنڈروں کو دیکھا، اور ممکن ہے، ان لوگوں سے بھی معلومات فراہم کی ہوں جو اس رصدگاہ کے کارکنوں کے واقف کار رہے تھے، باین ہمہ وہ انگریزوں اور ان کی تہذیب و ثقافت بالخصوص انگریزی علوم سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مرعوب تھے۔

ادھر ڈاکٹر نیڈھم چین کی تہذیب و ثقافت بالخصوص چینی علوم کے ماہرین خصوصی میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے، اگرچہ وہ ایک غیر ملکی محقق ہے، جو شاید ہندوستان نہیں آیا، بلکہ اُس نے اس ملک (ہندوستان) کے علوم و فنون کے ملکی و غیر ملکی ماہرین کی تصانیف پر اعتماد کیا ہے، مثلاً اُس نے دہلی اور جے پور کی رصدگاہوں کے بارے میں کاے، (G.R. Kaye) کی بھی تصانیف پر اعتماد کیا ہے، جن کا خلاصہ اس نے سویڈن کے ایک فاضل کی کتاب میں پڑھا تھا، باین ہمہ وہ محض چینی علوم ہی کا ماہر خصوصی نہیں ہے، اُس نے اپنے محبوب ملک کی ثقافتی عظمت کے باب میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملائے بلکہ انتہائی ذمہ داری کے ساتھ عالمی ثقافتی تاریخ کے اندر چین کی علمی تاریخ اور اس کی فنی کاوشوں کا صحیح مقام متعین کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے، وہ چین کی ثقافتی عظمت کا محض باد فروش بھاٹ ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا

بے لاگ نقاد بھی ہے، اور اس حقیقت کی واشگافی میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوا کہ چین نے باقی دنیا کو کیا دیا، اور اس سے کیا لیا، اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اُس نے چینی علوم کے دوش بدوش غیر چینی علوم کا بھی بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس کے اندر وہ، انسان کی فطری کوتاہیوں اور نارسائیوں سے قطع نظر ایک قابل تعریف حد تک کامیاب بھی ہوا ہے، اور اس ضمن میں اس نے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی اسلامی ہیئت پر بھی بڑی مبصرانہ نظر ڈالی ہے،

غرض دونوں ہی فاضل ناقابل نظر انداز اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک (سرسید) اپنی قربت مکانی وزمانی اور ذمہ دارانہ سنجیدگی فکر کی بنا پر اور دوسرا (نیڈھم) اپنی وسعت مطالعہ اور عمیق تحقیق کی وجہ سے۔ اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے یا ایک کی رائے کے مقابلے میں دوسرے کی رائے سے صرف نظر کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا ان دو رایوں کے درمیان محاکمہ کا ایک ہی طریقہ رہجاتا ہے، اور وہ ہے، خود اس رصدگاہ کے کارکنوں کی شہادت اور اس باب میں خود جے سنگھ کی مرتب کردہ "زیج" سے زیادہ فیصلہ کن اور کون شہادت ہو سکتی ہے۔

"مگر زیج محمد شاہی" کے مطالعہ سے جہاں نیڈھم (اور کایے) کی رائے کی تائید ہوتی ہے، سرسید علیہ الرحمہ کی رائے کی بھی تردید نہیں ہوتی، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) نیڈھم کا ماخذ کایے (G.R.Kaye) ہے، جس نے اپنی مشہور تصنیف "راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں" میں لکھا ہے۔

" اس باب میں ذرا سے بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جس مخصوص عامل نے اس کی (جے سنگھ کی) ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا ، وہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کا اتباع تھا "[1]

اور کایئے کے اس دعوے کی " زیج محمد شاہی " کے مطالعہ سے حرفاً حرفاً تصدیق ہوتی ہے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کے دو پہلو ہیں ، نظری اور عملی ۔

۱۔ جہاں تک نظری پہلو کا تعلق ہے ، " زیج محمد شاہی " کو اگر " زیج الغ بیگ " کا سرقہ کنا سوء ادب ہو تو بھی ، اس کا چربہ ضرور کہا جا سکتا ہے ۔ نہ صرف دونوں میں ترتیب وتقسیم کا انداز ہی مماثل ہے ، ہیئتی مواد میں بھی غیر معمولی مماثلت ہے ، بالخصوص دوسرے مقالہ میں دونوں کی عبارتوں میں صیغوں اور ضمائر کے اختلاف کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں ۔

۲۔ جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے ، خود راجہ کو اعتراف ہے کہ اس نے اس باب میں الغ بیگ کی رصدگاہ سمرقند کی تقلید کی ہے ۔

" چندے از آلات رصدی مانند آنکہ در سمرقند ساختہ بودند ، از روئے کتب اسلامیاں ہم ساخت "[2]

بے شک اس نے کچھ نئے آلات بنوائے تھے ، جن کے ہندی نام رکھے تھے ، جیسے جے پرکاش ، رام جنتر ، سمراٹ جنتر ۔ مگر بقول جی ۔ آر ۔ کایے ۔

جے سنگھ کے تیار کردہ آلات رصدیہ الغ بیگ اور اس کے پیشروؤں یا جانشینوں کے استعمال کردہ آلات کی یا تو نقل تھے یا براہ راست اصلاح "[3]

---

(1) G.R. Kaye: Astronomical observatories

(2) G.R. Kaye: .R 9 ; 1 ; (۲) زیج محمد شاہی ورق ۲ — of Jai Singh, P. 64

جی۔ آر۔ کا یے کے اس قول کی مزید تصدیق ان آلات کی ساخت اور مسلمان ہئیت دانوں کے بنائے ہوئے آلات رصدیہ کے تقابلی مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اسلامی رصد خانوں میں استعمال ہونے والے آلات کے موضوع پر ہنوز کافی کتابیں ہندوستان و بیرون ہندوستان کی لائبریریوں میں موجود ہیں جیسے مویدالدین عرضی کا "رسالہ

فی کیفیۃ الارصاد و ما یحتاج الی علمہ و عملہ من الطرق

المؤدیۃ الی معرفۃ اوضاع الکواکب"

نیز مولانا عبدالعلی برجندی کا "رسالہ فی آلات الرصد" و "مختصر فی بیان الرصد" علامہ منعم عالی کی کتاب "تعلیم آلات الزیچ" ایک اور مصنف کا "رسالۃ الغازانیہ فی الآلات الرصدیہ" وغیرہ اس طرح نیڈھم (Needham) اور جی آر۔ کایے (G.R. Kaye) کا یہ کہنا صحیح ہے کہ راجہ جے سنگھ کی ہئیتی سرگرمیاں یونانی۔ عربی روایات بالخصوص الغ بیگ کی فلکیاتی کاوشوں کا تسلسل تھیں۔

(۲) ایسا معلوم ہوتا ہے سرسید نے "زیچ محمد شاہی" کا بالاستقصاء مطالعہ کیا تھا، اور اس کاوش میں رصد گاہ دہلی کا اور کوئی تذکرہ نگار (حتیٰ کہ جی۔ آر۔ کایے بھی) انکا شریک وسہیم نظر نہیں آتا۔ ان موخر الذکر حضرات کے پیش نظر صرف اس "زیچ" کے دیباچہ کا انگریزی ترجمہ تھا، مگر سرسید نے "زیچ محمد شاہی" کا امعان نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس میں جدید علم الہئیت کے جو اثرات پائے صرف انھیں کی نشاندہی کی ہے، غیر ذمہ دارانہ طور پر رصد گاہ دہلی اور "زیچ محمد شاہی" کو کلیتاً جدید علم الہئیت سے متاثر نہیں بتایا۔

جدید علم الہئیت (کوپرنیکی نظام ہئیت) کا اصل الاصول "شمس مرکزی نظریہ"

(Helio-Centric Theory) ہے جس کی رو سے زمین آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہے۔ سترھویں، اٹھارویں صدی کے ہندوستانی فضلائے ہیئت ان بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہیں تھے، چنانچہ غلام حسین جونپوری جنھوں نے رصدگاہ دہلی کے قیام کے صرف سو سال بعد ہی "جامع بہادر خانی" لکھی تھی، فرماتے ہیں،

"انتباہ:۔ حکمائے فرنگ ارض را بر مدار بیضی متحرک می دانند و شمس را بر قطر اطول بیضی ساکن می پندارند بنوعیکہ مرکز شمس بر یکے از دو نقطہ تقسیم منطبق است و مرکز منطقہ البروج مرکز شمس است۔" (جامع بہادر خانی ص ۱۰۰)

مگر راجہ جے سنگھ نے اس انقلابی دریافت کا کوئی اثر نہیں لیا، کیونکہ یہ بات پورے ہیئی نظام فکر میں انقلابی تبدیلی کی متقاضی تھی، اور راجہ کو جو اس وقت اپنے آقائے ولی نعمت محمد شاہ اور سلطنت مغلیہ کے استیصال کے لئے مرہٹوں کے ساتھ خفیہ طور پر سازش کر رہا تھا، اتنی فرصت کہاں تھی کہ نئے "شمس مرکزی نظریہ" کی اساس پر کیپلر اور نیوٹن وغیرہ کے اصول و قوانین کی مدد سے قدیم ہیئتی حسابات کے قواعد کے متبادل نئے قواعد کا استخراج کر سکے، اس لئے وہ اتنی جرأت تو نہ کر سکا۔ غالبًا اسی جانب جی۔آر۔ کائے نے اشارہ کیا ہے کہ جے سنگھ یورپی ہیئتی تحقیقات سے اس وقت[1] واقف ہوا جب کہ وہ اپنے ہیئتی منصوبہ کو تقریبًا مکمل کر چکا تھا۔

لیکن ثانوی اہمیت کے انکشافات میں، جن سے بعض کی تصدیق ٹیلسکوپ کی مدد سے برائی العین کر لی تھی، وہ جدید علم الہیئت کا ہمنوا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ راجہ جے سنگھ نے پادری مگیورینڈ و مینوئیل[2] کے ہمراہ جو وفد فرنگستان (پرتگال)

---

1. G.R. Kaye: p. 99 (2) Tod: Rajasthan vol. II P. 289

جیسا تھا، اس نے انگریز فرنگی دوربین (ٹیلیسکوپ) کی کارکردگی اور افادیت کے قصے سنائے
اس سے متاثر ہو کر راجہ نے بھی (غالباً ہندوستانی کاریگروں سے فرنگی ٹیلیسکوپ سے بھی
زیادہ) طاقتور دوربینیں تیار کرائیں، جن کی مدد سے روز روشن میں اجرام سماوی کا
مشاہدہ کر لیا جاتا تھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"چوں در سرکار ما دوربین ہا ساختہ اند کہ بواسطۂ آں کواکب ثابتہ روشن
را در قریب نصف النہار در وسط السماء می بینیم ....."[1]

سر سید نے جدید علم الہیئت کے اثرات کی فہرست میں آخری چیز یہ بتائی تھی کہ

"اس رصد خانے میں رویت ہلال کی اور ظہور و خفائے کواکب اور طلوع و
غروب منازل قمر کے حساب کرنے کی حاجت نہیں رہی کیونکہ دوربین کی مدد سے
یہ سب چیزیں دن کو آنکھوں سے دیکھ لی جاتی تھیں۔"[2]

راجہ بھی اپنی بنوائی ہوئی دوربینوں کے ذکر کے فوراً بعد کہتا ہے۔

"و در استمرار آنہا ہلال را پیش از آنکہ زمان خروج الشعاع مقرر کردہ اہل تنجیم شود
دیدہ می شود۔ و بعد از آنکہ در حد مقرری اختفا داخل شدہ باشد ہلال ہمچنیں مرئی
می باشد، و ہمیں حال است در ظہور و خفائے سیارہ خمسہ باقیہ و طلوع و غروب منازل"[3]

اس دوربین کی مدد سے بڑے اہم عجائبات فلکی کا انکشاف ہوا، جن کا قدما کی کتابوں میں
ذکر تک نہیں تھا جیسا کہ راجہ کہتا ہے:-

"و نیز ہیئت بعضے از کواکب سیارہ و صفات آنہا را مخالف مکتوبی معروف و مشہور
یافتیم چندیں چیز۔"[4]

---

(۱) زیج محمد شاہی۔ ورق ۱۰۵ الف (۲) آثار الصنادید۔ ص ۳۰۰ (۳) زیج محمد شاہی۔ ورق ۱۰۵ الف (۴) ایضاً

ان جو مخالف کتوبی معروف ومشہور پچندین چیز ہیں وہی چار عجائب ہیں جن کا مرتبہ بہ ہیں طور ذکر کیا ہے۔

(۳) یہ بات تسلیم کی گئی کہ زہرہ اور عطارد بھی چاند کی طرح آفتاب سے روشن ہیں اور بدر و ہلال ہوتے ہیں،

(۴) یہ بات مانی گئی کہ زحل گول کروی (spherical) شکل پر نہیں، بلکہ اہلیجی شکل پر ہے،

(۵) مشتری کے گرد چار روشن ستارے قبول کئے گئے، جن کا اقمار (Satellites) مشتری نام ہے،

(۶) آفتاب پر کے نشان مختلف مانے گئے کہ وضعی حرکت سے ایک برس کے قریب دورا پورا کرتے ہیں[1]

راجہ بھی "پچندین چیز" کی تفصیل یوں لکھتا ہے۔

اول آنکہ برائے العین مشاہدہ کردیم کہ زہرہ وعطارد ہم مانند قمر از آفتاب استفادہ نور می کنند، چہ آنہا را دیدیم بسبب قرب وبعد از آفتاب متناقص النور ومتزائد النور می گردند۔

دوم۔ آنکہ زحل را می بینم کہ شکل اہلیجی دارد یعنی از دو قطر متقاطع بر قوائم اولیکے خورد است و دومیں کلاں۔

سوم۔ آنکہ بر حول مشتری قریب بمسافت منطقہ اش چار کواکب روشن یافتہ ایم کہ بر حول مشتری می گردند۔

چہارم۔ آنکہ بر سطح جرم آفتاب چند نشان مختلف دیدیم کہ بحرکت وضعی شمس

---

[1] آثار الصنادید۔ ص ۳۲۰

در مکان خویش در قریب یکسال دورہ تمام می کنند"[1]

قدماء نے کواکب کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا۔ ثوابت (Fixed Stars) اور سیارات، (Planets) ثوابت کے متعلق خیال تھا کہ یہ اپنی وضع تبدیل نہیں کرتے، نیز ایک دوسرے کی نسبت سے حرکت بھی نہیں کرتے، مگر سرسید کا یہ قول کہ کواکب ثوابت درحقیقت ثوابت نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر سیارہ ہیں" راجہ جے سنگھ کے اس قول کا اعادہ ہے، جو اس نے "زیج محمد شاہی" کے "خاتمہ مقالہ سوم" کی ساتویں فصل میں لکھا ہے:-

"کواکبے کہ آنرا در عرف منجمین ثوابت گویند، اینہا درحقیقت ثابتہ نیستند، و آنکہ حرکت جمیع اینہا یک مقدار نیست، بلکہ اختلاف دارند"[2]

علم الہیئت کا ایک اہم مقصد اجرام سماوی کی سیر و گردش کا انضباط ہے۔ یونانی، اسلامی علم الہیئت نے اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا کہ زمین کو کائنات کا مرکز اور ساکن مانا جس کے گرد مختلف سیارے اپنے اپنے افلاک میں حرکت کرتے ہیں، مگر یہ حرکت کبھی سریع اور کبھی بطئی پائی گئی، نیز کبھی آگے (استقامت) اور کبھی پیچھے (رجعت)۔ اس اشکال کے رفع کرنے کے لئے ہر فلک کلی کو متعدد افلاک جزئیہ سے مرکب مانا گیا جن میں سے بعض کا مرکز زمین ہے (ممثل وغیرہ) اور بعض کا اس سے الگ کہیں (خوارج) پھر بعض سیارے ایک اور چھوٹے فلک (تدویر) میں مرکوز ہیں، جس کی گردش دوری سے وہ متحرک نظر آتا ہے، اور یہ تدویر کسی بڑے فلک جزئی میں واقع ہے، جو اپنے مرکز کے گرد حرکت کرتا ہے (حامل و مائل وغیرہ) اس طرح ان مختلف افلاک جزئیہ کی حرکات کے

---

[1] زیج محمد شاہی، ورق ۱۰ ظ [2] ایضاً ۲۰ ب

مجموعی نتیجہ سے جو حرکت پیدا ہوتی ہے، وہ اس سیارے کی حرکت مرئی ہے،

خوارج و تداویر پر مشتمل یہ پیچیدہ نظام، بطلیوسی نظام ہیئت کہلاتا تھا، جو یونانی قدیم کے علاوہ مسلمان ہیئت دانوں کا بھی معمول یہ تھا، مسلمانوں کی تقلید میں قرون وسطیٰ کے یورپی فضلائے ہیئت بھی کوپرنیکس کے زمانہ سے پہلے تک اسی بطلیوسی نظام ہیئت کے قائل و عامل رہے۔

کوپرنیکس نے اس نظام ہیئت کی بنیاد ڈالی جو اس کے نام پر کوپرنیکی نظام ہیئت کہلاتا ہے، اور جو شمس مرکزی نظریہ (Helio-Centric Theory) کی اساس پر قائم ہے، اس کا کہنا ہے کہ آفتاب یا خمسہ متحیرہ زمین کے گرد چکر نہیں لگاتے، بلکہ خود زمین اور یہ پانچوں سیارے (زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد) آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں،

بعد میں اس کوپرنیکی نظام کو کیپلر اور نیوٹن نے اپنے اپنے قوانین کی بنیاد پر استوار کیا، قدماء صرف "حرکت دائری" کے قائل تھے، یعنی اجرام سماوی کی گردش کا مدار دائرہ کا محیط ہوتا ہے، مگر کیپلر نے کہا کہ زمین اور اسی طرح دیگر سیارے آفتاب کے گرد جس مدار پر حرکت کرتے ہیں، وہ دائری (Circular) نہیں بلکہ بیضی (Elliptical) ہے۔ نیز سیارہ اس بیضی مدار پر متشابہ زاویائی حرکت (Uniform Angular velocity) کے ساتھ گردش نہیں کرتا بلکہ متشابہ رقبی حرکت (Uniform Areal velocity) کے ساتھ گردش کرتا ہے،

مگر جیسا کہ جی. آر. کائے کتاب[1] راجہ جے سنگھ اور رصدگاہ محمد شاہی کے

---

[1] G. R. Kaye P89

دیگر کارکن اس انکشاف سے اس وقت واقف ہوئے، جب وہ اپنے ہیئتی منصوبہ کو مکمل کر چکے تھے، اب نہ تو راجہ جے سنگھ کو اپنی سیاسی ریشہ دوانیوں اور خفیہ سازشوں سے اتنی فرصت تھی کہ رصدگاہ کی ہفت سالہ کاوشوں کو تقویم پارینہ بنا کر کوپرنیکس کے شمس مرکزی نظریہ اور کپلر کے اس قانون حرکت کی بنیاد پر ہیئتی جداول کو ازسرنو مرتب کرتا، اور نہ اس کے رفقائے کار بھی جن کے دل و دماغ میں ارسطا طالیسی طبیعیات اور اس کا ارض مرکزی نظریہ علوم متعارفہ بنکر راسخ ہو چکے تھے، کوپرنیکی نظام کے اس انقلاب آفرین نظریہ کو ماننے کے لئے تیار تھے، البتہ کپلر کا یہ قانون کہ ان اجرام سماوی کا مدار دائری کے بجائے بیضی ہوتا ہے، درخور اعتنا سمجھا گیا، اور اس پر جو تجربہ کیا گیا وہ اطمینان بخش بھی ثابت ہوا، چنانچہ مولوی غلام حسین جونپوری نے جامع بہادرخانی" میں لکھا ہے۔

"جمہور راصدان متقدمین و اکثر متاخرین مدار خارج المرکز را دائرہ قرار دادہ اند، باعتبار آں تعدیلات جزوی استخراج کردہ اند۔

و مرزا خیراللہ مہندس در شرح زیج محمد شاہی دعویٰ فرمودہ است کہ ما مدار خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بر شکل بیضوی یافتہ ایم بدلیلے کہ ہرگاہ تقویم شمسی و کواکب را مطابق تعدیل دائرہ محسوب می کنیم آں را موافق مرصودی یابیم بخلاف آنکہ تعدیلے کہ بمقتضائے بیضوی برمی آید وازاں محاسبۂ تقویم می کنیم، آں تقویم بیشتر مطابق مرصودی باشد۔

پس قاعدہ تو اکس دال است کہ مدار بیضوی باشد"[1]

---

[1] جامع بہادرخانی۔ ص ۵۹۸۔

غالباً مرزا خیر اللہ ہندسی ہی کی تلقین سے راجہ جے سنگھ بھی اس نئے تجربہ کا قائل ہو گیا چنانچہ کہتا ہے۔

این خواہان تحقیق خواست کہ آنچہ بتدقیق از روئے رصد یافتہ، مطابق آن شکلہا ہم درست کردہ شود اول باید دانست کہ مدار خارج المرکز آفتاب را صرف[۱] بشکل محیط سطح بیضی معلوم شدہ"[۲]

اور جدید علم الہیئت کے جن تصورات نے راجہ جے سنگھ اور اس کے رفقاء کار کو متاثر کیا، سرسید نے ان میں سر فہرست اسی اثر کو بیان کیا ہے۔

(۱) مدار خارج مرکز شمسی کو بیضی تسلیم کیا۔[۳]

سرسید نے دوسرا اثر یہ بتایا تھا کہ چاند بھی بیضی مدار پر حرکت کرتا ہے،

(۲) چاند کی حرکتوں کو بیضی مدار پر مانا۔[۴]

اس اثر کے باب میں سرسید کا ماخذ زیج محمد شاہی کی حسب ذیل عبارت ہے؛

مخفی نماند کہ برائے استخراج تعادیل اربعہ قمر از مرکز زمین فرض کنیم کہ بیضی حال مدم مدار مرکز جرم قمر است"[۵] (باقی)

---

[۱] زیج محمد شاہی، ورق ۲۶ ب [۲] ط [۳] سرسید احمد خان، آثار الصنادید ص ۳۰۰ [۴] ایضاً
[۵] زیج محمد شاہی۔ مقالہ سوم باب دوم فصل دوم، مخطوطہ ذخیرہ یونیورسٹی مولانا آزاد لائبریری نسخہ ورق ۲۵ ب

حافظ سخاوی

منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین

(۳)

تاہم عصر علما کی اختلافات معاصرین کے درمیان چشمک مشہور ہے ہر دور میں اسکی مثالیں ملتی ہیں
سبب کیا ہے اگر حافظ سخاوی کو اس سے دوچار ہونا پڑا، رائے کے اختلاف سے ناگواری کا
آغاز ہوتا ہے، حاشیہ نشین اسے ہوا دیتے ہیں، اور رفتہ رفتہ دلوں میں گرہیں پڑ جاتی ہیں یہی
حال علامہ سیوطی اور سخاوی کا ہوا، ان سے سخاوی کے تعلقات نہایت کشیدہ ہوگئے تھے، دونوں
ایک دوسرے کے خلاف سخت الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، حافظ سیوطی نے
الکاوی علی رأس السخاوی[1] حافظ سخاوی کے خلاف ایک سخت تنقیدی رسالہ لکھا،
اس فضا میں سخاوی بھی ضبط و تحمل نہ کر سکے اور الضوء اللامع میں سیوطی کا ذکر نا
مناسب الفاظ میں کیا لیکن سخاوی نے سیوطی کے رسالہ کا خود جواب نہیں دیا، بلکہ ان کی
حمایت میں مشہور ادیب اور شاعر ابن العلیف احمد بن الحسین المکی نے "الشہاب
الہاوی علی منشئ المکاوی، اور المنتقد اللوذعی علی المتجمد المدعی کے نام سے دو کتابیں لکھیں

---

[1] سخاوی کے رد میں سیوطی کے اس رسالہ کا نام فیض الباری (جلد ۴ ص ۲۶۶) میں "الکاوی علی رأس السخاوی" ہے، معجم المطبوعات (جلد ۱ ص ۱۰۱۳) میں "الکاوی فی تاریخ السخاوی" ہے، البدر الطالع (جلد ۱ ص ۳۳۲) پر "الکاوی فی الرد علی السخاوی" اور دوسری جگہ (ص ۲۲۹) پر "الکاوی لدماغ السخاوی" درج ہے، ذیل تذکرۃ الحفاظ (صفحہ ۸) پر "الکاوی فی الرد علی السخاوی" لکھا ہے

لیکن معاصرانہ اور قدح کے باوجود سخاوی اور سیوطی دونوں کی علمی اور اسلامی خدمات ناقابل فراموش ہیں بقول مورخ عیدروسی

" سخاوی اگر علل حدیث کی معرفت میں بے نظیر تھے تو سیوطی حفظ متون میں بے مثال ۱؎ "

سخاوی کا مسلک | مصر کے مشاہیر علماء اور ائمہ اکثر شافعی مسلک کے تھے، اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے، امام شافعی کی زندگی کا بڑا حصہ مصر ہی میں گزرا یہیں انھوں نے وفات پائی، اور یہیں ان کے نامور شاگردوں نے فقہ شافعی کی تدوین کی اور شافعی اساتذہ اور شیوخ کے حلقہ ہائے درس صدیوں اس سرزمین پر قائم رہے، اس بناء پر یہاں شافعی مسلک کا رواج زیادہ ہو گیا، اور کوئی دوسرا فقہی مذہب یہ حیثیت نہ حاصل کر سکا آج تک یہی حال ہے، ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثر سے سخاوی نے بھی شافعی مسلک اختیار کیا، حافظ ابن حجر کی صحبت نے ان کے علم و فضل میں اضافہ کیا، اور ان کی شخصیت اہل کمال کا مرجع بن گئی، شوافع کے علاوہ احناف بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں،

وفات | حافظ سخاوی کا آفتاب حیات دنیائے علم و عمل کو کامل ۷۱ برس تک منور رکھنے کے بعد بالآخر ۲۸ شعبان ۹۰۲ھ (۱۴۹۷ء) کو اتوار کے دن ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ۲؎، انتقال کے وقت ۷۱ سال کی عمر تھی ۳؎، نماز جنازہ دوسرے دن فجر کے بعد روضۂ نبوی کے قریب ادا کی گئی، اور جنت البقیع میں امام مالک کی قبر کے پہلو میں آغوش رحمت کے سپرد کئے گئے۔ عیدروسی آگے لکھتے ہیں۔

۱؎ النور السافر ص۱۸ ۲؎ النور السافر، و الضوء اللامع ۸/۳۱ ۳؎ النور السافر ص۱۹ ۴؎ ایضاً

وکانت جنازته حافلة — ان کے جنازہ میں بڑا اژدہام

ولم یخلفه بعده مثله — تھا، ان کے بعد کوئی ان کا جیسا

فی مجموع فنونه — جامع الفنون ان کا جانشین نہ ہوسکا[۱]

نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں سخاوی کا سن وفات ۹۰۶ھ[۱] تحریر کر دیا ہے، جو شاید سہو قلم ہے، کیونکہ موصوف نے اپنی دوسری کتاب "التاج المکلل" میں صحیح سن وفات ۹۰۲ھ درج کیا ہے،

جرجی زیدان نے نہ معلوم کس ماخذ کی بنیاد پر مقام وفات قاہرہ لکھ دیا ہے[۲] صحیح بات وہی ہے، جو صاحب النور السافر اور دیگر تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے۔

تلامذہ | حافظ سخاوی نے یگانۂ روزگار فضلاء سے کسب فیض کیا تھا، اور وہ خود فن حدیث کے علاوہ دوسرے علوم میں نہایت بلند درجہ پر فائز تھے، نیز ان کے علم و کمال اور درس حدیث کی دور دور شہرت تھی، قاہرہ ان کی علمی سرگرمیوں کا خاص مرکز تھا، اسکے علاوہ انھوں نے مدت مدید تک حرمین شریفین میں بھی مسند درس و تدریس آراستہ کی اس طرح ان کے چشمۂ فیض سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے، ذیل میں حافظ سخاوی کے چند نامور تلامذہ کا تذکرہ درج ہے۔

جاراللہ بن فہد | محمد نام، ابوالفضل کنیت، محب الدین لقب اور جاراللہ عرف ہے، پورا سلسلۂ نسب یہ ہے محمد بن عبدالعزیز عمر بن محمد بن فہد الہاشمی المکی الشافعی[۳] وہ اپنے اسلاف ہی کی طرح ابن فہد کے نام سے مشہور ہوئے[۴] ۲۰ رجب ۸۹۱ھ کو مکہ مکرمہ میں

۱ے اتحاف النبلاء ص ۴۰۴ ۲ے تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۳/۱۹۹ ۳ے ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۸۳ ۴ے النور السافر ص ۱۲۳

پیدا ہوئے، اور اپنے والدین سے ابتدائی تعلیم حاصل کی بچپن ہی میں قرآن حفظ کیا، ان کو نووی کی کتاب المنہاج اور کتاب الاربعین بھی زبانی یاد تھی[۱]۔ ابن فہد کو شیخ عبداللہ باکثیر شیخ شہاب الدین البسیری، شیخ زکریا انصاری، محب طبری، اور حافظ سخاوی وغیرہ سے حدیث کے سماع کا شرف حاصل ہے[۲]۔ حافظ سخاوی سے مجاورت مکہ کے زمانہ میں بڑا استفادہ کیا، وہ جب چوتھی دفعہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو ابن فہد نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سماع کیا[۳] پھر سخاوی کے دامن فیض سے ان کی زندگی بھر وابستہ رہے، ابن فہد کو حافظ سخاوی سے بڑا تعلق تھا، اور وہ ان کے کمالات اور علمی تبحر کے پوری طرح معترف تھے، ان کا بیان ہے کہ "خدائے بزرگ و برتر کی قسم میں نے متاخرین حفاظ حدیث میں ان کے جیسا صاحب کمال نہیں دیکھا[۴]۔ وہ بھی اپنے استاد ہی کی طرح عرصہ تک مکہ مکرمہ میں مسند حدیث آراستہ کئے رہے، ۹۵۴ھ میں ان کا انتقال ہوا[۵]۔

قسطلانی | یہ بلند پایہ محدث اور صحیح بخاری کے مشہور شارح، انھوں نے زکریا انصاری اور حافظ سخاوی سے استفادہ کیا، صاحب النور السافر کا بیان ہے کہ "حافظ سخاوی سے تعلق کے بعد ان کے جوہر کھل گئے، اور انھوں نے متعدد مفید کتابیں لکھیں، ان کی سب سے اہم کتاب بخاری کی شرح ارشاد الساری ہے، جو دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے[۶]، اس کا شمار صحیح بخاری کی عمدہ شرحوں میں ہے[۷]، اس کے علاوہ الاسعاد فی مختصر الارشاد، لطائف الاشارات فی عشرات القرأت، الروض الزاہر فی ترجمۃ عبدالقادر اور المواہب اللدنیہ وغیرہ بھی مشہور ہیں[۸]

---

[۱] شذرات الذہب ۸/۳۰۱ [۲] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۰۲ [۳] ایضاً ص ۳ [۴] النور السافر ص ۲۱۱، [۵] شذرات الذہب ۸/۳۰۱ [۶] النور السافر ص ۱۱۳ [۷] بستان المحدثین بحوالہ الفوائد البہیہ دوم ص ۱۲۱

المواہب کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:۔ "یہ بلند پایہ اور عمدہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر ہے"۔ صاحب النور السافر نے بھی اس کو بے نظیر اور بلند پایہ کتاب بتایا ہے۔[1] علامہ زرقانی (المتوفی ۱۱۲۲ھ) نے اس کی بہت ضخیم شرح لکھی تھی، جو شرح زرقانی کے نام سے آٹھ جلدوں میں ۱۳۲۵ھ میں مصر سے طبع ہو چکی ہے۔[2]

حافظ سیوطی جو ان کے ہم عصر تھے ان کا خیال ہے کہ قسطلانی ان کی کتابوں سے نقل و استفادہ کرکے اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں،، اس کے متعلق جب انھوں نے شیخ زکریا انصاری سے رجوع کیا تو انھوں نے مصالحت کرا دی، لیکن پھر بھی سیوطی کا دل ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا، وہ روضۃ المقیاس میں گوشہ نشین تھے، قسطلانی نے آکر ان کے مکان پر دستک دی، انھوں نے دریافت کیا کون؟ قسطلانی نے جواب دیا کہ میں قاہرہ سے برہنہ پا آیا ہوں، تاکہ آپ کا دل میری جانب سے صاف ہو جائے، سیوطی نے دروازہ کھولے اور ملاقات کئے بغیر ہی اندر سے جواب دیا کہ میرے دل میں تمھاری طرف سے کوئی میل نہیں ہے۔[3]

قسطلانی کو حدیث سے بڑا شغف تھا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ارشاد الساری ہے، یہ عمدۃ القاری اور فتح الباری کا نچوڑ و خلاصہ ہے، ۹۲۳ھ میں قاہرہ میں وفات پائی، اور جامعہ ازہر میں جمعہ کی نماز کے بعد ان کے جنازہ کی نماز ادا کی گئی، اور مدرسہ عینیہ کے متصل ان کو سپرد خاک کیا گیا۔[4]

ابن عبدالسلام | پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، احمد بن محمد بن عبدالسلام ابن موسیٰ

---

[1] النور السافر ص ۱۱۵ [2] بحوالہ فوائد جامعہ ص ۱۵۳ [3] النور السافر ص ۱۱۵ [4] کشف الظنون ۱۸۹۶/۲ [5] شذرات الذہب ۱۲۳/۸، النور السافر ص ۱۱۳-۱۱۴

الشہاب ابو الخیر بن العز المنوفی الاصل،[1] ابن عبد السلام کی عرفیت سے مشہور ہوئے، یہ منوف (قاہرہ کی ایک بستی) کے رہنے والے تھے، لیکن قاہرہ کو مستقل وطن بنالیا تھا منوف کے قاضی بھی رہے، حافظ سخاوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، سخاوی نے انکے حالات میں لکھا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول [illegible] کو بعد نماز جمعہ ولادت ہوئی، بچپن ہی میں قرآن پاک حفظ کیا، اور عمدۃ المنہاج اور الفیہ مالک کو حفظ کیا، مجھ سے حدیث کی بہت سی کتابیں پڑھیں، اور حدیث کا علم مجھ ہی سے حاصل کیا، مختصر ابی الشجاع لکھی اور اپنے شیخ بکری کے فتاوی مرتب کئے، اور نیل پر ایک کتاب لکھی، حج بھی کیا، اور مجاورت حرمین اختیار کی، برہان ابن ظہیرہ کے درس میں بھی حاضری دی اور انہی کے اشارہ پر ان کے فتاوی کو جمع کیا، نظم و نثر سے انکو خاص مناسبت تھی، انھوں نے بہت سے قصائد لکھے،[2] غالباً ابھی تک انکی کوئی کتاب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے، مگر "الفیض المدید فی اخبار النیل" کا فرانسیسی ترجمہ دلاپار جس نے کیا ہے، جو آسوی جریدہ (جورنال اسیاتیک) میں سنہ ۱۸۳۵ء و سنہ ۱۸۴۰ء و سنہ ۱۸۴۶ء میں چھپا، ان کا دوسرا بڑا کارنامہ البدر الطالع ہے، جو اپنے استاذ کی شہرہ آفاق کتاب الضوء اللامع کا اختصار ہے، یہ بھی ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے[3]

ان کا انتقال سنہ ۹۳۱ھ میں ہوا۔[4]

المواہبی | یہ مشہور صاحب دل بزرگ اور عالم تھے، ان کا نام برہان الدین ابوالطیب ابراہیم بن محمد بن احمد بن حسن الاقصرائی الشافعی المواہبی ہے، ان کو بھی سخاوی اور دوسرے ارباب کمال سے استفادہ کا موقع ملا، قاہرہ میں انکی خانقاہ مرجع خلائق

[1] الضوء اللامع ۲/ ۱۸۲ [2] ایضاً [3] الاعلام زرکلی ۱/ ۱۰۰، [4] کشف الظنون ۲/ ۵۸

تھی، اور متعدد اصحاب نے ان سے تصوف وسلوک کی تحصیل کی تصوف وسلوک کی تحصیل ابن المغربی سے کی تھی، اور ان کی اجازت سے مشہور عارف باللہ محمد ابی المواہب التونسی سے بھی کسب فیض کیا، سخاوی نے بھی ان کا مختصر تذکرہ لکھا ہے[۱]

جار اللہ بن فہد کا بیان ہے کہ " وہ ۹۰۰ھ میں مکہ آئے اور تین سال مسلسل قیام کیا، اور ابن عطاء اللہ کی الحکم کی شرح احکام الحکم لشرح الحکم کے نام سے لکھی، اور ایک شرح اصول مقدمات الاصول کے نام سے لکھی، رسالہ سنوسیہ فی اصول الدین کی بھی شرح لکھی نظم میں ایک دیوان اور متعدد رسائل ان کی یادگار ہیں،[۲]

سیوطی کا تلمذ | حافظ سخاوی عمر میں سیوطی سے بڑے تھے، یہ ان کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے، اس سے گمان ہوتا ہے، کہ انھوں نے سخاوی سے استفادہ بھی ضرور کیا ہوگا، یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے علم وفضل کے معترف بھی تھے،

علامہ سیوطی نے ان کے متعلق بعض قصیدے بھی لکھے تھے، سخاوی ان کے والد ابوبکر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

وھو والد الفاضل جلال الدین عبد الرحمن أحد من أكثر من التردد علی و مدحنی نظماً ونثراً نفع الله به[۳]	(یہ ابوبکر) فاضل جلال الدین عبد الرحمن کے والد ہیں، جلال الدین ان لوگوں میں سے ہیں، جنکی میرے پاس بہت آمد ورفت رہی، انھوں نے نظم ونثر میں میری

۱؎ النور السافر ص ۵۰ ۲؎ ایضاً ۳؎ الضوء اللامع ۲/۴۹ ۔

لیکن اس استفادہ کو تلمذ نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس کی حیثیت باہمی افادہ و استفادہ کی ہے اسی لئے کسی تذکرہ نگار نے سیوطی کو سخاوی کے تلامذہ میں شمار کیا ہے، اور نہ خود سیوطی نے بھی ان کو اپنے اساتذہ میں شامل کیا ہے،

سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں ایک جگہ ان کو "صاحبنا" ضرور لکھا ہے، اس کے متعلق صاحب فہرس الفہارس والاثبات سید عبدالحی کتانی لکھتے ہیں "نہ سیوطی نے سخاوی سے علوم کی تحصیل کی، اور نہ ان کو اپنے شیوخ میں شمار کیا اور نہ ان کے شاگردوں نے جن سے میں واقف ہوں، البتہ بغیۃ الوعاۃ میں ایک جگہ میں نے سیوطی کے قلم سے یہ لکھا ہوا دیکھا ہے، کہ میں نے ہمارے صاحب (شیخ) محدث سخاوی کے قلم سے (ایسا) لکھا ہوا دیکھا ہے۔ ملاحظہ ہو، کتاب مذکور کا صفحہ ۳۰۴ اس موقع پر سیوطی نے ان کو اپنے شیوخ میں شمار کیا ہے[1] مگر یہ قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ عربی زبان میں "صاحب" کا لفظ جس طرح استاد کے لیے، بولا جاتا ہے اسی طرح اس کا اطلاق شاگرد، ہم درس خادم طاش، اور رفیق وغیرہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اس بنا پر ان کو سخاوی کا شاگرد نہیں کہا جاسکتا ان دونوں میں معاصرت تھی، جو ان کی منافرت کا سبب ہے، سخاوی نے سیوطی کا تذکرہ مناسب انداز میں نہیں کیا ہے، اور سیوطی نے بھی ایک رسالہ لکھ کر ان پر طعن و تشنیع کا اظہار کیا ہے، ایسی صورت میں تلمذ کی روایت بالکل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

---

[1] فہرس الفہارس ۲/۳۵۵

سخاوی کا فیض ہندوستان میں | سخاوی کے عرب شاگردوں کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے ان کے چشمۂ فیض کے کچھ سوتے ہندوستان میں بھی پھوٹے اور اس سرزمین کو احادیث نبوی کے گل بوٹوں سے رشک مصر و شام کر دیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں،

"علم حدیث کے ہندوستان میں فروغ کا حقیقی زمانہ نویں صدی کا خاتمہ اور دسویں صدی کا آغاز ہے، یہ وہ عہد تھا جب مصر و شام و حجاز میں امام حدیث حافظ محمد بن عبد الرحمن سخاوی کے فضل و کمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور حافظ موصوف کے فیض و افادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ پر پڑ رہی تھیں مدینہ منورہ میں اگر ان کے کمال نے نورٌ علیٰ نور کا مرتبہ حاصل کیا، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا یعنی بحر عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں، اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں"[1]

مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اس کی تائید ان الفاظ میں کی ہے،

"حافظ ابن حجر کے خلیفۂ اکبر علامہ سخاوی کے ایک نہیں متعدد شاگردوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا، اور جیتے جی اس ملک میں حدیث کا درس دیتے رہے"[2]

چند ممتاز ہندوستانی شاگرد | ذیل میں حافظ سخاوی کے کچھ ممتاز ہندوستانی تلامذہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

راجح بن داؤد احمد آبادی | یہ حافظ سخاوی کے سب سے پہلے ہندوستانی شاگرد ہیں،

---

[1] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۱۰ [2] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت اول ص ۱۳۰

جنھوں نے حرمین میں ان سے کسب فیض کیا، پھر ہندوستان واپس آکر گجرات میں حدیث کی شمع روشن کی، ان کی علمی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود ان کے عظیم المرتبت استاذ نے الضوء اللامع میں انکا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا ہے،

"راجح ۸ صفر ۸۰۱ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہاں یتیمی کی حالت میں پروان چڑھے، اپنے وطن کے مشہور اساتذۂ فن سے علوم متداولہ کی تحصیل کی، معانی و بیان مخدوم ابن برہان سے اور ہئیت و کلام کا درس محمد بن تاج حنفی سے لیا علمی فضل و کمال کے ساتھ شعر و سخن کا بھی پاکیزہ ذوق تھا، مجھ سے ۸۹۰ھ میں ان کی ملاقات ہوئی، میں نے ان کو الفیۃ الحدیث کی شرح پڑھائی، اور سند اجازہ عطا کی[1]

تحصیل علم کے بعد وہ گجرات چلے آئے جہاں آخر عمر تک درس و افادہ میں مشغول رہے، ۹۰۴ھ میں وفات پائی مولانا عبدالحی نے بھی انکے کمال کا اعتراف کیا ہے[2]

سخاوی نے راجح کے والد داؤد کا بھی مختصر تذکرہ لکھا ہے، اس میں احمد آبادی کو سہو قلم سے محمد آبادی لکھ دیا ہے، راجح کے والد کی وفات ۸۴۲ھ میں ہوئی،[3]

سلیمان بن محمد احمد آبادی | یہ راجح کے چچا تھے، سن ولادت ۸۲۰ھ ہے، سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور لکھا ہے[4] مختلف علوم و فنون کے جامع تھے، انھوں نے ۸۹۴ھ میں شرح الفیہ کا ایک حصہ لکھنے میں میری مدد کی اور اسی دوران اس کو مجھ سے پڑھا بھی وہ مجھ سے کئی مرتبہ ملے،[5]

---

[1] الضوء اللامع ۳/۲۲۲، [2] نزہۃ الخواطر ۴/۱۱۱، [3] یاد ایام ص ۲۲

[4] الضوء اللامع ۳/۲۱۲ [5] ایضاً ۳/۲۰۵

شیخ محمد بن محمد المالکی المصری | یہ اصلاً عرب نژاد تھے، مصر میں پیدا ہوئے، اور وہیں، نشوونما پائی، لیکن تحصیل علم کے بعد ہندوستان آکر گجرات میں درس وافادہ کی مجلس گرم کی، غیر معمولی تبحر علم، مہارت حدیث، اور زہد واتقا کے باعث سلطان گجرات ان کا بڑا قدر دان تھا، اور اعتراف کمال کے طور پر ان کو ملک المحدثین کا خطاب عطا کیا،

صاحب النور السافر نے لکھا ہے کہ "شیخ محمد اپنے اسلاف کی طرح ابن صوبہ کی عرفیت سے مشہور تھے، ۱۹ شعبان ۸۵۶ھ کو پیدا ہوئے، والد کے زیر سایہ پروان چڑھے، مختلف علوم وفنون کی تحصیل کے ساتھ حفظ قرآن کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے، انھوں نے مکہ میں جہاں حافظ سخاوی کا فیضان جاری تھا، حاضر ہو کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، اور موطا، مسند شافعی، سنن ابن ماجہ، اور جامع ترمذی کے علاوہ بہت سی کتابیں ان سے پڑھیں، اور ایک طویل مدت ان کے دامن فیض سے وابستہ رہے"[1]

سخاوی نے اپنے اس لائق شاگرد کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں،

"شیخ محمد مصری نہایت ذہین شخص ہیں، علم کا غایت درجہ استحضار ہے"[2]

اسی طرح شیخ جار اللہ ابن فہد رقمطراز ہیں کہ "شیخ محمد نے ہندوستان میں ممتاز مقام حاصل کیا، اور وہاں کے حکمران محمد شاہ (گجراتی) نے ان کو ملک المحدثین کے لقب سے سرفراز کیا، اس لقب سے سرفراز ہونے والے وہ پہلے شخص ہیں، سلطان مذکور کی اس قدر دانی کے بعد ان کی مرجعیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، اکابر اہل علم

---

[1] النور السافر بحوالہ نزہۃ الخواطر ۴/ ۳۷۰ [2] الضوء اللامع نزہۃ الخواطر ۴/ ۳۱۴

ان کے تبحرِ علمی کا اعتراف کیا ہے، سلطان مذکور کی حیات تک شیخ کا حلقۂ درس اس شان مقبولیت کے ساتھ قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے گونجتا رہا لیکن اس کی وفات کے بعد جب سلطان مظفر شاہ تخت نشین ہوا تو بعض وزراء اور حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث ان کو آلام ومصائب کا سامنا کرنا پڑا، اور بالآخر سنہ ۹۳۰ھ میں حدیث کی یہ روشن شمع احمدآباد میں گل ہوگئی،[1]

<u>علامہ بحرق</u> | ان کا شمار بھی ان علماء میں ہوتا ہے جو ہندی الاصل تو نہ تھے لیکن خود کو اہلِ ہند کی علمی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا، اور گجرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، ان کا اصل نام شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک ہے، لیکن بحرق کے نام سے شہرت پائی،[2]

سنہ ۸۶۹ھ میں حضرموت میں پیدا ہوئے، مقامی اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کے مشاہیر سے بھی اکتسابِ فیض کیا، سنہ ۸۹۴ھ میں مکہ معظمہ میں حاضر ہو کر حافظ سخاوی سے حدیث کی تحصیل کی،[3] حدیث وتفسیر، نحو وصرف تصوف وادب اور حساب وطب وغیرہ میں کامل درک رکھتے تھے، نظم ونثر دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا، عیدروسی نے لکھا ہے کہ "میں نے علماء حضرموت میں ان سے زیادہ جامع اور بلاغت وفصاحت کا پیکر نہیں دیکھا، ان کی تصانیف سے ان کی دقتِ نظری اور تبحرِ علمی کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے"[4] وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، جس کے متعدد نمونے صاحب النور السافر نے نقل کئے ہیں، علامہ

---

[1] ظفر الوالہ اول ص ۱۱۰–۱۱۱ [2] النور السافر ص ۱۴۲ [3] ظفر الوالہ اول ص ۱۹۱

[4] النور السافر ص ۱۴۴

بحرق سلطان مظفر شاہ گجراتی کے عہد میں ہندوستان آئے، سلطان نے ان کی بڑی قدر افزائی کی، جب وہ ان کے علم و فضل سے واقف ہوا تو غایت درجہ عزت و تکریم سے پیش آیا، اور شیخ کو ان کے شایان شان منصب پر فائز کیا،[1]

مولانا سید عبد الحی صاحب نے لکھا ہے کہ خود مظفر شاہ حلیم نے بھی ان سے تلمذ کی سعادت حاصل کی تھی،[2]

علامہ بحرق نے بکثرت کتابیں تصنیف کی ہیں، عیدروسی نے النور السافر میں ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست درج کی ہے، جن میں قابل ذکر یہ ہیں،

تبصرۃ الحضرۃ الشاہیہ الاحمدیہ، الحسام المسلول علی منتقصی اصحاب الرسول، ترتیب السلوک الی ملک الملوک، متعۃ الاسماع باحکام السماع، مواہب القدس فی مناقب ابن العیدروس، شرح الملحۃ للحریری،[3]

محدث شیرازی یہ حافظ سخاوی کے ہندوستانی تلامذہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے نور کمال سے ایک عالم روشن ہوا، پورا نام سید رفیع الدین صفوی شیرازی ہے، مکہ جاکر حافظ سخاوی سے حدیث کا درس لیا، پھر گجرات میں وارد ہوئے، یہ زمانہ دہلی میں سکندر لودھی جیسے علم دوست بادشاہ کا تھا، اس نے محدث موصوف کی خبر پاکر دہلی بلا بھیجا، اور سلطان کی مرضی سے آگرہ میں سکونت اختیار کی، انکے حلقۂ درس میں دور دور سے تشنگان علم کھنچ کھنچ کر آتے تھے، اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق متاع خیر و برکت حاصل کرتے تھے،[4]

---

[1] النور السافر ص ۱۲۷ [2] یاد ایام ص ۲۰ [3] النور السافر ص ۱۲۸، ۱۳۰

[4] مقالات سلیمان دوم ص ۱۱،

حدیث و تفسیر وغیرہ دینی علوم کے ساتھ ان کو عقلی علوم میں بڑا مرتبہ حاصل تھا
صاحب تذکرہ علمائے ہند نے ان کی ذات کو مجمع البحرین قرار دیا ہے۔[1]

ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ

جزیرۂ عرب انواع علوم نقلی از شیخ سخاوی مصری قاہری تلمیذ شیخ ابن حجر عسقلانی برگرفت،[2]	جزیرۂ عرب میں مختلف علوم نقلیہ امام ابن حجر کے تلمیذ رشید شیخ سخاوی مصری سے حاصل کیے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں محدث شیرازی کو خصوصی اعتناء کا مستحق قرار دیتے ہوئے ان کے حالات و کمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے،[3]

سلاطین وقت ان کے غیر معمولی علمی کمالات اور حسن کردار کے باعث انکی بیحد تعظیم و تکریم کرتے تھے، اور امور سلطنت میں ان کے نیک مشوروں پر عمل کرتے انھوں نے سکندر، ابراہیم، بابر، ہمایوں، شیر شاہ، سلیم شاہ چھ حکمرانوں کا زمانہ پایا تھا، اس دوران مختلف قسم کے سیاسی انقلابات کی آندھیوں میں ثابت قدم رہے، مگر شیخ کے ساتھ سلاطین کی عقیدت میں کوئی تزلزل نہیں ہوا اور سبھی ان کی تعظیم و تکریم کرتے رہے، بابر کے ہندوستان فتح کرنے پر اکثر علاقوں کے حاکم ان کی سفارش سے ملازمت شاہی میں داخل ہوئے ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھا کر آگرہ آیا تو مشورہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا شیر شاہ کے عہد میں جب انھوں نے وطن واپسی کا ارادہ فرمایا تو اس نے نہایت الحاح و منت سے ان کو اس سے باز رکھا۔

---

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۷۵ [2] آئین اکبری ۳/ ۲۰۵ [3] اخبار الاخیار ص ۲۲۲،

ہزاروں علماء و فضلا دور دور از ملکوں سے آکر ان کی خانقاہ میں فروکش ہوتے، بلکہ بعض اوقات تو ان کی سخاوت و سیر چشمی کے باعث اس محلہ میں مستقل طور پر آباد ہو جاتے تھے، یہ خانقاہ مدتوں مرجع انام رہی، اور بندگان خدا علوم ظاہری و باطنی سے فیضیاب ہوتے رہے۔[1]

۹۵۲ھ میں آپ نے وفات پائی، اور خانقاہ ہی کے اندر مدفون ہوئے، آپ کے مزار پر ایک وسیع و خوشنا گنبد تھا، لیکن استداد زمانہ کی بنا پر وہ صورت اب باقی نہیں رہ گئی ہے، ۱۹۲۹ء میں سعید احمد مارہروی مصنف مرقع اکبرآباد نے جب اس قبرستان کا مشاہدہ کیا تو گنبد کی چھت گر چکی تھی، ستون کچھ باقی تھے، پورا قبرستان بڑی خستہ حالت میں تھا، پچاس برس بعد آج اس کی حالت اور خراب ہو چکی ہو گی، اور اب شناخت بھی آسانی سے ممکن نہ ہو گی۔

بوستان اخبار سے شاہ صاحب کے ایک صاحبزادے کا پتہ چلتا ہے، ان کا نام سید مرشد الدین تھا، انھوں نے جملہ علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل اپنے والد سے کی تھی، اور اوصاف کمالات میں اپنے والد کا نقش ثانی تھے، آپ بھی اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہیں،[2] لیکن اولاد و احفاد کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہا، شاہ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی (۱۰۵۲ھ) نے سید رفیع الدین کی وفات کے تقریباً پچاس برس بعد اخبار الاخیار لکھی تو اہل خاندان میں سے کوئی موجود نہ تھا، شاہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ آپ کی اولاد میں سے کوئی بھی ایسا شخص زندہ نہیں ہے جس کی آپ سے معمولی سی بھی رشتہ داری ہو آپ کے خاندان کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں رہا۔[3] (باقی)

---

[1] بوستان اخبار و مشاہیر اکبرآباد (ص ۱۱۹) [2] مرقع اکبرآباد ص ۱۰۸ [3] بوستان اخبار ص ۲۹
[4] اخبار الاخیار ص ۲۳۱

لاہور میں علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس کا جشن

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس میں جن پاکستانی مندوبین سے ملنے کا موقع ملا، ان کا ذکر گزشتہ اشاعت میں ہو چکا ہے، اس اجتماع میں اسٹریلیا، بلجیم، کناڈا، زیکوسلوکیا، مصر، فن لینڈ، فرانس، انڈونیشیا، ایران، عراق، جاپان، کویت، لبنان، ملیشیا، لیبیا، رومانیہ، سری لنکا، سوڈان، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، شام، تیونس، ترکی، انگلستان، اٹلی، امریکہ، مغربی جرمنی، اور آئرلینڈ وغیرہ کے نمائندے بھی تھے، زیکوسلوکیا کے ڈاکٹر جان مارک پراگ میں مشرقی علوم کے استاد ہیں، اردو بھی پڑھاتے ہیں، دہلی میں اقبال پر جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، وہ اس میں بھی شریک ہوئے تھے، اردو بہت اچھی بولتے ہیں، دہلی ہی میں ان سے بے تکلفی ہو گئی تھی، اس لئے لاہور میں ان کی ملاقاتوں میں بڑی گرمجوشی رہی، روم سے پروفیسر الاسنڈرو بوسانی آئے تھے، وہ وہاں اسلامیات کے پروفیسر ہیں، ترک ہیں، لیکن فارسی

اور اردو بھی بولتے ہیں، فارسی میں تو بڑی اچھی تقریر کرتے ہیں، عرب ممالک کے نمایندے اس کانگریس میں اس طرح نمایاں حصہ لیتے ہوئے نظر نہیں آئے، جس طرح بین الاقوامی سیرت کانگریس میں نظر آتے تھے۔

اس کانگریس کے لیے بکثرت مقالات آئے تھے، جن کی چار ضخیم جلدیں سائکلواسٹائل کر کے تمام مندوبین کو پہلے ہی دیدی گئی تھیں، دو اور جلدیں زیر ترتیب تھیں ہر نمایندہ کو ایک بریف کیس دے دیا گیا تھا، جس کے اندر پروگرام، نمایندوں کے تعارف اور دوسرے ضروری کاغذات کے ساتھ ایک سونے کا تمغہ بھی تھا، جس پر فرسٹ اقبال سنٹنری، اور یہ شعر کندہ تھا،

آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی

اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا کرسٹ بھی تھا، تاکہ شناخت کے لیے نمایندے اپنے لباس پر لگا سکیں، بریف کیس کے اندر حسب ذیل کتابیں بھی تھیں، (۱) پیام مشرق کا انگریزی ترجمہ جو جناب بشیر احمد ڈار کا کیا ہوا تھا، ان کے متعلق ذکر آچکا ہے کہ وہ اقبالیات کے بہت بڑے ماہروں میں ہیں، (۲) A message from the East۔ از محمد ہادی حسین، (۳) کتابیات اقبال از رفیع الدین ہاشمی، (۴) The Place of God, Man and Universe in the philosophical System of Iqbal از ڈاکٹر جمیلہ خاتون، (۵) ثقافت کا اقبال نمبر (۲) الفلاح کا اقبال نمبر، (۷) حصول پاکستان، از پروفیسر احمد سعید اور فارسی جریدہ ہنر و مردم کا اقبال نمبر، ان تحایف کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کی جناح کیپ بھی تھی۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۷ء کی صبح سے کانگریس کی کارروائی شروع ہوگئی، تمام نمایندے انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل ہی میں ٹھہرائے گئے تھے، اس لئے ناشتے اور کھانے میں ملاقات اور گفتگو کا موقع برابر ملتا رہتا تھا، اپنے یہاں دہلی میں اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی تھی اندرون ملک کے نمائندوں کے قیام کا انتظام وہاں نہیں تھا، یہ لوگ ذاتی طور پر جہاں موقع ملا ٹھہر گئے تھے، اس لئے ان کو ایک دوسرے سے بے تکلفانہ ملاقاتوں کا موقع نہیں ملتا تھا پاکستان میں یکجائی قیام سے تبادلۂ خیالات کا خوب موقع ملتا تھا، ناشتے اور کھانے میں تنوعات تو مسلمانوں کے دسترخوان کی خصوصیت ہے، لیکن پاکستان بہت امیر ملک نہیں، اس لئے اس کی دعوتوں میں عہد ماضی کی امیرانہ شان کے بجائے سادگی کا لحاظ رکھا جائے تو اچھا ہے،

کانگریس کی کارروائی کا آغاز علامہ محمد اقبال کے مزار پر حاضری سے کیا گیا جو بادشاہی مسجد کے پھاٹک کے بائیں جانب پر واقع ہے، اس کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے، فاتحہ خوانی کا منظر بڑا ہی پر کیف تھا، ٹیلی ویژن کا عملہ اور فوٹوگرافر ہر طرف دوڑ رہے تھے، نمایندے بادشاہی مسجد کے اندر بھی گئے، دہلی کی جامع مسجد میں جو حسن ہے، وہ تو اس میں نہیں ہے لیکن اب اس کی پوری مرمت کرکے اس کی ہر چیز میں خوش سلیقگی اور نفاست پیدا کر دی گئی ہے، پاکستان کو اب اس مسجد پر اسی طرح ناز ہو سکتا ہے، جس طرح کہ ہندوستان کو دہلی کی جامع مسجد پر ہے،

وہاں سے ہم لوگ جاوید منزل آئے، جو علامہ محمد اقبال کی آخری رہائش گاہ تھی ان کے لڑکے ڈاکٹر جاوید اقبال سے حکومت پاکستان نے اسے خرید لیا ہے، اب یہ ایک میوزیم بن گیا ہے، یہاں وہ ماڈل بھی دیکھے جو علامہ اقبال کو میٹرک بی۔ اے اور ایم۔ اے

کے امتحانات میں ملے تھے، وہ سرٹیفکیٹ بھی رکھے ہوئے تھے، جو کیمبرج اور میونخ یونیورسٹی
سے ان کی ڈگریوں کے سلسلہ میں ملے تھے، پنجاب، علی گڑھ اور الہ آباد یونیورسٹیوں
نے ان کو ڈی لٹ کی جو اعزازی ڈگریاں دی تھیں، ان کی سندیں بھی رکھی ہوئی تھیں،
ان کے استعمال میں جو فرنیچر تھے، وہ بھی محفوظ کر دیے گئے ہیں، ان میں ایک نیوار کی
کھاٹ، ایک ڈریسنگ ٹیبل، ایک صوفہ، تین آرام کرسیاں، دو چھوٹی چھوٹی میزیں،
چھ کھانے کی کرسیاں، ایک بیضاوی میز، ایک نعمت خانہ، ایک الماری کتاب
رکھنے کے لیے، ایک گھومنے والی الماری اور ایک تخت پوش، سب چیزیں سلیقہ سے
رکھی تھیں، کمروں میں وہ قالین بھی تھے، جو ان کو شاہ افغانستان نادر شاہ مرحوم اور شہنشاہ
ایران نے دیے تھے، نادر شاہ مرحوم کے دیے ہوئے قالین ویسے ہی تھے، جیسے استاذی
المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کو ملے تھے، علامہ اقبال کے ملبوسات میں کچھ سوٹ، کچھ اونی
پائجامے، قمیصیں، شلواریں اور تولیے بھی رکھے ہوئے تھے، ان میں ایک لنگی بھی تھی، پاس ہی
لوہے کے بکس اور چمڑے کے سوٹ کیس بھی رکھے ہوئے تھے، اس سامان میں پیتل کے
نیچے کا ایک حقہ بھی دکھائی دیا، جس چلمچی اور لوٹے کو وہ استعمال کرتے تھے وہ بھی محفوظ
کر دیے گئے ہیں، ان کا وہ قلمدان بھی رکھا تھا، جس میں دو شیشے کی دواتیں اور بیچ میں
ایک ہولڈر ہے، لکڑی کی ایک سرمہ دانی بھی دکھی، ان کے کچھ جوتے اور سلیپر بھی تھے،
علامہ محمد اقبال نے مولوی محمد دین فوق، مہاراجہ کشن پرشاد، مولانا گرامی، مولانا غلام
مرشد، مولانا احمد علی، مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، مولوی نور الحق، سید عبد القادر
مولانا میر حسن، غلام رسول مہر اور مولوی عبد الحق کو جو خطوط لکھے تھے، وہ بھی یہاں
محفوظ کر دیے گئے ہیں، کلام پاک کے جو نسخے انکی تلاوت میں رہتے تھے وہ بھی تھے، ان کے

مطالعہ میں جو کتابیں رہتی تھیں، وہ بھی محفوظ کر دی گئی ہیں، یورپین مصنفوں میں برگسان کی The Philosophy of change اور رگی کی Netzche in outline and Agnonism۔ نٹشے کی تین کتابیں The twilight of the idols, The Birth of Tragedy. The joyful wisdom, براؤن کی Mystery of Space' ٹیگور کی Religious spirit in the poets, The interpretation of ہال کی اخبار الحلاج، مورڈن کی history of Ideas, Man and Memories روتھنسٹائن کی Logic, The phi- کار کی کتاب القدس، مثنوی مولانا روم (چھ جلدیں) اور Translation of Philosophy of change افغاری کی Arabbery تھیں، اس مجموعہ میں قصیدہ البردہ اور ایک کتاب "مسلمانوں کے افلاس کا علاج" بھی تھیں۔

میں نے پروفیسر حکن ناتھ آزاد کے ساتھ بڑی دلچسپی اور انتہائی مسرت کے ساتھ علامہ اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے دیکھے، ان کی جن مثنویوں اور نظموں کے مسودے محفوظ تھے، وہ یہ ہیں (۱) اسرار خودی (۲) رموز بے خودی، شکوہ شمع و شاعر، پیام مشرق، مسافر، زبور عجم، جاوید نامہ، پیغام، مذہب، شبلی و حالی، بال جبریل، پس چہ باید کرد، پیام مشرق کے پہلے اڈیشن میں ان کے لکھے ہوئے کچھ اشعار بھی تھے، جن کا اضافہ وہ اس کے دوسرے اڈیشن میں کرنا چاہتے تھے ذہن میں یہ بات تھی کہ علامہ اقبال اپنے اشعار میں ترمیم نہیں کیا کرتے تھے، جو کچھ کہتے، ویسے ہی لکھ دیتے

مگر کہیں کہیں ترمیم و اضافہ بھی نظر آیا یہ مسودے اب بہت ہی قیمتی علمی اور ادبی سرمایہ ہیں، جو بہت ہی شوق سے دیکھے جائیں گے، جاوید منزل کو حکومت نے بہت اچھے حال میں رکھا ہے، آیندہ یہ بہت ہی تاریخی عمارت سمجھی جاتی رہے گی،

جمعہ کا روز تھا، اس لئے ہم لوگ نماز کے لئے ہوٹل واپس لائے گئے، ہوٹل کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد تھی اس سے ملحق ایک میدان تھا جس میں جانمازیں بچھی ہوئی تھیں، مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ اس عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کے ترجمان اور ملت کے حدی خوان کی تعلیمات اور پیغامات کو سننے کے لئے تو شاندار اجتماع تھا لیکن اس میں سے نماز جمعہ ادا کرنے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، قاری محمد ظریف صاحب نے نماز پڑھائی، وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے کتب خانہ کے لائبریرین ہیں، دیکھنے میں پنجابی معلوم ہوئے، لیکن گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضلع مونگیر (ریاست بہار) کے رہنے والے تھے، اب پاکستانی ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے رشتہ داروں میں ہیں، نماز میں اتنی اچھی قرأت کی کہ دل خوش ہو گیا۔

اسی سہ پہر کو کانگریس کا باضابطہ افتتاح پنجاب یونیورسٹی کے شاہ فیصل ہال میں تھا، ہم لوگ وہاں لے جائے گئے، باہر طلبہ علیحدہ علیحدہ ملکوں کے نام لئے کھڑے تھے، میں علی سردار جعفری صاحب اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ہندوستانی مندوبین کی نشست گاہ پر بیٹھ گیا، ڈائس کی آرائش قابل دید تھی، اس پر بیٹھنے والوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یورپ یا امریکہ کے کسی جلسہ کا منظر پیش نظر ہے، پاکستان کے صدر جناب فضل الٰہی چودھری صاحب اسٹیج پر تشریف لائے، تو قاری محمد ظریف نے تلاوت کلام پاک کی، ان کی قرأت کچھ ایسی سامعہ نواز تھی کہ دل پر ایک خاص کیفیت

طاری ہو گئی، اور ساری فضا متاثر نظر آئی"، پروفیسر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا نے انگریزی
میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا اس کے بعد جناب فضل الہی چودھری نے علامہ محمد اقبال کی ایک
قد آدم تصویر کی نقاب کشائی کی، اس تصویر میں علامہ محمد اقبال شلوار شیروانی اور ٹوپی
پہنے دکھائی دیے، ان کے پیچھے قرطبہ کا منظر تھا، اس کے بعد بیرونی مندوبین کا تعارف کرایا
گیا ہم ہندوستانی مندوبین کے نام لئے گئے، تو دیر تک حاضرین تالیاں بجاتے رہے پروفیسر
آل احمد سرور اس وقت تک نہیں پہونچ پائے تھے، دوسرے دن آئے، تعارف کے
بعد صدر پاکستان جناب فضل الہی چودھری نے افتتاحیہ خطبہ پڑھا، اس کے بعد
ایک پر تکلف چائے کا انتظام تھا، اس میں جناب صدر پاکستان سے خاص طور پر
ملاقات کا موقع ملا، میں نے ان کی خدمت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دو خاص
کتابیں Glory of [illegible] اور [illegible] civilization پیش کیں جن کو
انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول فرمایا، اس موقع پر ان کے سکریٹری اور اے ڈی سی اور
فوٹوگرافر انھیں گھیر کر کھڑے ہو گئے، اسی استقبالیہ دعوت میں اپنے سفیر جناب کے۔ ایس
باجپائی سے بھی ملاقات ہوئی، وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے، اپنے موٹر پر ہوٹل
واپس لائے، ان کے کمرے میں بڑی اچھی صحبت رہی، وہیں پاکستان کے مشہور شاعر فیض
احمد فیض صاحب بھی آگئے، جناب باجپائی اور ان کی اہلیہ نے ہم لوگوں کی بڑی خاطر کی،
اسی رات کو علامہ اقبال سے متعلق جتنی کتابیں اب تک لکھی جا چکی تھیں ان کی
بھی نمائش تھی، جو بڑے سلیقہ سے سجائی گئی تھی، اس جشن کی ایک تحریر میں بیان کیا گیا
ہے کہ علامہ اقبال پر اب تک دو ہزار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس لحاظ سے وہ شیکسپیر
دانتے اور رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، اس میں مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

ر اقبال کامل اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی گفتگو. بی آئی اقبال بھی تھیں، اس نمائش
کو کامیاب بنانے میں جناب رفیع الدین ہاشمی پروفیسر گورنمنٹ کالج سرگودھا نے بڑی
محنت کی تھی، ان کی کتابیات اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی ہے، انکے
ساتھ ڈاکٹر محمد بشیر حسین صدر شعبہ فارسی، اورینٹل کالج لاہور بھی بڑی سرگرمی سے شریک
رہے۔ نمائش کے بارہ میں اظہار خیال کے لئے ایک رجسٹر تھا، میں نے بھی
اپنے تاثرات اس میں درج کر دئے،

۳ دسمبر کو مقالات کے پڑھنے اور سننے کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے روز تمام مندوبین
ایک ساتھ جمع ہوئے، اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر فریدون زندفار سفیر ایران
نے کی، ان کے شریک صدر (کو چیرمین) ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب
یونیورسٹی تھے، سکریٹری کے فرائض خواجہ غلام صادق نے انجام دئیے سب پہلے ڈاکٹر
جسٹس جاوید اقبال نے اقبال اور تصوف کے موضوع پر ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ
اپنے خیالات پیش کئے کہ دل بہت خوش ہوا، اس موضوع پر میں جو کچھ سوچ
یا لکھ سکتا تھا، اس کی بہت ہی عمدہ عکاسی اور ترجمانی ان کی تقریر میں تھی، اجلاس
کے بعد ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ نے بزم صوفیہ کے مصنف کے دل کی باتیں
کہدیں۔ اسی اجلاس میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مقالہ "اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ" پڑھا،
انھوں نے بہت عمدہ اور موثر انداز میں اپنے مقالہ کا خلاصہ پیش کیا۔ وہ اس وقت
اس برصغیر میں اقبالیات کے بڑے ماہروں میں سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کا مقالہ
بہت غور سے سنا گیا، اور خوب داد دی گئی، اس کے علاوہ دوسرے مقالات کے عنوانات
اور مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی یہ تھے،

(۱) Medival Religiosity of Dante and The Modern Religion of Iqbal

از پروفیسر علی سنڈر روبسانی (روم یونیورسٹی، اٹلی)

(۲) Reflections on Iqbals mosque

از ڈاکٹر باربرا متکاف (پن سلوینیا یونیورسٹی، امریکہ)

(۳) Iqbal. His Message از سید عبدالحی (ڈھاکہ یونیورسٹی)

(۴) Iqbal: A universal leader از ڈاکٹر عبدالکریم سیٹو (جاپان) (۵) Iqbals Message از ڈاکٹر عبدالقادر کرہان (ترکی) (۶) پروفیسر جلال متینی (ایران) نے اپنے خیالات کا اظہار ایک تقریر کے ذریعہ سے فارسی زبان میں کیا۔

صبح کا یہ اجلاس ۹ بجے سے شروع ہو کر گیارہ بجے ختم ہو گیا، کافی اور چائے کے بعد دوسری نشست ہوئی، اس کی صدارت پروفیسر میر حسین شاہ (افغانستان) نے کی، شریک صدر ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال تھے، اور سکریٹری کے فرائض جناب محمد اسمٰعیل بھٹی نے ادا کئے، اس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے،

(۱) Iqbals linguistic situation از پروفیسر جوسی آدو (فن لینڈ)

(۲) Iqbal Seeing our time and speaking Prophetic از پروفیسر کارل ایلوف (سوئڈن) (۳) To day faith in Iqbal, Buber and Tillich از شیلا میکڈونوف (کناڈا)، (۴) اقبال فی مصر از ڈاکٹر محمد سعید جمال الدین (مصر)

(۵) Iqbal and Nationalism از. جناب جویل جلال الدین (فلپائن) (۶) Iqbal, Poet of the East از. جناب مبارک مغربی (سوڈان) (۷) Iqbal and the Third world. از. پروفیسر کارونارتنا (سری لنکا)

یہ اجلاس ایک بجے ختم ہوا، جس کے بعد ایک پرتکلف لنچ ہوا، شام کو لاہور میوزیم میں اقبال کو مصوری کے ذریعہ سے پیش کیا گیا، جہاں پاکستان کے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین، اسلم کمال اور عباسی عابدی نے اقبال کے بعض اشعار کو مصور کیا تھا، جن کی قدر وقیمت کا اندازہ مصوری کے ماہرین ہی کر سکتے تھے، اس کی رسم افتتاح پنجاب کے گورنر جسٹس اسلم ریاض نے کی، وہاں سے واپسی کے بعد انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں رات کا کھانا ہوا جو پہلے سے بھی زیادہ پرتکلف تھا،

۴؍ دسمبر کو پھر مقالہ خوانی کا اجلاس نو بجے صبح سے شروع ہوا، اس کی صدارت روس کے ڈاکٹر سوخا چیوف نے کی، اور ڈاکٹر جسٹس اس. اے. رحمان شریک صدر ہوئے سکریٹری ڈاکٹر خالد حمید شیخ تھے، ڈاکٹر جسٹس رحمان پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں، شاعر بھی ہیں، ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں بڑے خلیق اور ملنسار ہیں، راقم سطور سے دار المصنفین کے تعلق سے بڑی گرم جوشی سے ملے، اس اجلاس کا آغاز خود ان کے مقالہ سے ہوا جس کا عنوان تھا "اقبال اور اجتہاد" دوسرے مقالات حسب ذیل تھے،

(۱) The importance of Scientific Knowledge in Iqbal's Philosophical Thoughts-

یہ مقالہ نظریہ اضافیت کے مشہور ماہر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے لکھا تھا، (ڈاکٹر صاحب تقسیم سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں تھے، پھر پشاور، سندھ اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں) (۲) Iqbal and Kashmir از جسٹس محمد یوسف صراف (چیف جسٹس مظفر آباد ہائی کورٹ) (۳) The illustrious Ancestry of Iqbal از۔ ڈاکٹر محمد باقر (لاہور) (۴) Iqbal's atti-tude Towards Imperialism از۔ ڈاکٹر جان مارک (چیکوسلوواکیا) (۵) اقبال اور میراث اسلام۔ از۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (کراچی یونیورسٹی) (۶) اقبال اور تقدیر امم، از۔ ڈاکٹر محمد ریاض (اسلام آباد)، (۷) اقبال اور عارفانہ تجزیہ از۔ ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور)

مقالات کی کثرت کی وجہ سے ایک ہی وقت میں دو اجلاس کئے جانے لگے اس لئے ایک دوسرے کمرہ میں ۴ دسمبر کی صبح کا جو علیحدہ اجلاس ہوا، اس کے صدر جاپان کے ڈاکٹر عبدالکریم سیتو، ان کے شریک میاں امیر الدین (صدر مرکزی مجلس اقبال لاہور) ہوئے، سکریٹری پروفیسر ذوالفقار علی ملک تھے، اس کی ابتدا میاں امیر الدین کے مقالہ "علامہ اقبال، چند باتیں اور چند یادیں" سے ہوئی دوسرے مقالات یہ تھے۔

(۱) اقبال اور نثر اردو، از جناب فرمان فتح پوری صاحب (کراچی یونیورسٹی)

(۲) اقبال ایک متکلم کی حیثیت سے از ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل (حیدرآباد)

(۳) Iqbal's Views on Nation and Millat

از۔ پروفیسر احمد حسن دانی (اسلام آباد یونیورسٹی) (۴) Iqbal as member
of The Punjab Legislative Council
از۔ ڈاکٹر عبدالحمید (لاہور) (۵) اقبال اور پاکستان، از۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
(لاہور) اس اجلاس میں مولانا امتیاز علی خان عرشی کا مقالہ زمان و مکان کی بحث سے
متعلق علامہ اقبال کا ایک مقالہ اور ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر اینے میری شمبل کا
مضمون "اقبال کی شاعری میں ابلیس" بھی رکھا گیا تھا، اگر خود یہ دونوں لاہور نہ آسکے تھے
کافی اور چائے کے بعد سہ پہر دسمبر کو دو اجلاس پھر علیحدہ علیحدہ کمروں میں ہوئے
ایک کی صدارت پروفیسر جلال متینی (ایران) نے کی۔ ان کے شریک صدر پروفیسر
میاں عبدالشکور احسن تھے، جو پنجاب یونیورسٹی میں فارسی، اور علوم مشرقی و اسلامی
کے صدر رہ چکے ہیں، سکریٹری ڈاکٹر خواجہ غلام زکریا تھے، اس میں حسب ذیل مقالات
پڑھے گئے۔

(۱) Iqbals Philosophy of Prayer
از۔ ڈاکٹر عبدالرؤف (لاہوری) (۲) Iqbals Nature of the
Iqbal as a modern (۳) (ڈھاکہ) از مسز اختر امام self
Some (لاہور) از۔ جناب محمد سعید شیخ interpreter of Islam
remarks on the Nietzsche Conception
Is Iqbal (۵) (جرمنی) از ڈاکٹر برنڈ مینوئل وینشر of Iqbal
اقبال والقرآن (۶) (لاہور) از جناب بشیر احمد ڈار a pantheist
از ڈاکٹر حسین مجیب المصری (قاہرہ) (۷) In memory of Iqbal

از۔ ڈاکٹر عبدالرزاق محی الدین (بغدادی) (۵) علامہ اقبال اور ان کے قارئین از۔ مجتبیٰ حسین (کوئٹہ)

دوسرے کمرے کے اجلاس کی صدارت ترکی کے پروفیسر ڈاکٹر نزہت پال سن تار نے کی شریک صدر پروفیسر عبادت بریلوی تھے، سکریٹری، جناب علی عباس ہوتے، اس میں یہ مقالے پڑھے گئے۔

(۱) علامہ اقبال اور عظمت آدم از۔ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی (لاہور)

(۲) مکاتیب اقبال کا ادبی جائزہ، از۔ جناب آفاق صدیقی (میرپور خاص)

(۳) اقبال اور احترام آدمیت، از۔ ڈاکٹر آغا یمین خان (لاہور) (۴) The main spring of Iqbal's Lifework از۔ محمد ہادی حسین (کراچی) (۵) Rumi and Iqbal از۔ محمد اوندار (جرمنی) (۶) Iqbal and yeats از مسز برنڈ ایاسین۔

یہ دونوں اجلاس ختم ہوئے تو لنچ ہوا سہ پہر میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے شالیمار باغ میں عصرانہ تھا، گزشتہ اشاعت میں ذکر ہو چکا ہے، کہ اسی وقت ڈاکٹر سید عبداللہ نے جناب نذیر نیازی کو ان کی خدمات کے صلہ میں سپاسنامہ اور ایک تھیلی پیش کرنے کی تقریب رکھی تھی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور مجھ سے انھوں نے بہت اصرار کیا کہ ہم دونوں اس میں ضرور شریک ہوں، شالیمار باغ کی تقریب کی وجہ سے دشواری محسوس ہو رہی تھی مگر ہم دونوں کی جناب محمد یعقوب ہاشمی ممبر پبلک سروس کمیشن کی عنایت سے یہ مشکل آسان ہوگئی اور ہم لوگ آسانی سے دونوں تقریبوں میں شریک ہو سکے ہاشمی صاحب

بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کے اشعار ان کی نوک زبان پر ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ سے رخصت ہو کر ہم لوگ شالیمار پہونچے، اس باغ کے تزک و احتشام اور آرائش و زیبائش کو دیکھ کر تیموری بادشاہوں کی شان و شوکت اور زیب و زینت کی تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی اور میں عالم خیال میں، اپنی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس باغ نے مغل سلاطین کی سیر و تفریح کے کیسے شاندار منظر دیکھے ہوں گے، آج تیموریوں کا جاہ و جلال قصۂ پارینہ ہو چکا ہے، غنیمت ہے کہ پاکستانی حکمران ان کی یادگاروں کی حفاظت کر رہے ہیں، اور ان کی رعنائی و زیبائی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

شالیمار سے واپسی کے بعد علامہ اقبال کی لڑکی منیرہ صلاح الدین صاحبہ کے دولت کدہ پر ڈنر تھا، مندوبین کے علاوہ شہر کے دوسرے معززین بھی بڑی تعداد میں موجود تھے ہم لوگ پہونچے تو سارا مکان اور شامیانہ بقعۂ نور نظر آیا، نشست کا انتظام تبرین اور کھانے ایک سے ایک عمدہ تھے، اس ڈنر کے ساتھ ایک محفل سماع بھی تھی، جس میں اقبال کی غزلیں گائی جا رہی تھیں، پروفیسر آل احمد سرور اس دن آگئے تھے، اور ڈنر میں شریک ہوئے، منیرہ صاحبہ اپنے شوہر جناب صلاح الدین اور اپنے بھائی جاوید اقبال صاحب کے ساتھ مہمانوں کی پذیرائی بڑی خندہ پیشانی سے کر رہی تھیں، منیرہ صاحبہ اور جاوید اقبال صاحب دونوں پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے بڑے تپاک سے ملے، آزاد نے کہا کہ اقبال اور ان کی اولاد کا گھر تو میرا مرکز عقیدت اور کعبۂ مقصود ہے، جناب جاوید اقبال نے کہا میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں، منیرہ صاحبہ نے جاوید اقبال صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ جب آزاد صاحب آپ کے بھائی ہیں تو وہ میرے بھائی بھی ہوئے، پھر آزاد صاحب سے

کہا کہ ایک دن ہم تینوں بھائی بہن مل کر اس قسم کے ہنگامے سے الگ کھانا کھائیں، دوسرے دن آزاد ہمشیرہ صاحبہ کے مہمان خصوصی ہوئے۔ اور اُن کے اور جاوید اقبال صاحب کے ساتھ کھانا کھایا، یہ پروفیسر آزاد کا بہت بڑا اعزاز تھا

میں ہندوستان سے چلا تھا تو نزلہ اور کھانسی میں مبتلا تھا، سفر اور ان تقریبات کی مشغولیتوں سے اور خستہ ہو گیا، ۵ دسمبر کو مقالہ خوانی کا آغاز ہوا تو اطلاع ملی کہ ایک اجلاس کی صدارت مجھے بھی کرنی ہے، سردار محمد اقبال خاں شریک صدر (کو چیرمین) مقرر ہوئے جو پنجاب یونیورسٹی میں لا کالج کے پرنسپل ہیں، اور اپنی قابلیت کی وجہ سے بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، سکریٹری جناب عبدالخالق صاحب تھے جو پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے پروفیسر ہیں، اس اجلاس میں زیادہ تر بیرونی مندوبین کے مقالے پڑھے گئے، جو حسب ذیل تھے،

(۱) Image and symbol in Iqbal - Persian quatrains از مسٹر اسکال موسکی (بلجیم)

(۲) محمد اقبال، از ڈاکٹر عبدہ نودو شابی (مصر)

(۳) - Reflections on Khizr-i-Rah - ڈاکٹر محمد سولٹی (ٹیونس)

(۴) - Iqbal in the heart - از محمد رحیم الامام،

(۵) - Iqbal idea about the True nature of poetry - از جے۔سی۔ برجل (سوئزرلینڈ)

(۶) عبدالمعین الملوحی (دمشق) نے بھی اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، دو اور مقالے پڑھے نہ جا سکے،

جب یہ اجلاس ختم ہوا، تو مجھے صدر کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کرنے کے لئے کہا گیا میں نے عرض کیا کہ مجھکو یہ صدارت دے کر ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی طرف سے جذبۂ خیرسگالی

اظہار کیا گیا ہے، اور علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ادارہ دارالمصنفین کی قدر دانی کی گئی ہے جس کے لئے میں تہ دل سے شکر گذار ہوں، میں نے پھر کہا کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں پہلے اقبال پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا ممکن ہے، اس کانگریس کے برابر وہ شاندار و پرشکوہ اور دلآویز و دلنواز نہ ہو لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ پورے طور پر شاعر مشرق کی شان، رتبہ اور وقار کے مطابق تھا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے بڑے سلیقہ سے خوبصورتی کے ساتھ اس میں اس فلسفی شاعر کی زندگی کی نمائش تصویروں اور تحریروں کے ذریعہ سے کی تھی جو دیکھنے کے لائق تھی، یہاں سے جو پاکستانی وفد گیا تھا وہ بھی اس کو دیکھ کر محظوظ ہوا، پھر ہمارے وزیر مسٹر ایل۔ کے۔ اڈوانی نے اس موقع پر انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم لوگوں کو امید ہے اقبال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خیرسگالی کے جذبات پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوں گے، ہم لوگ اس پر آمین کہتے ہیں

شریک صدر سردار محمد اقبال خاں آخر میں بولنے کے لئے کھڑے ہوئے، تو مقالہ نگاروں کے مقالات پر مختصر طریقے پر پرمغز تبصرے کئے، پھر میری تقریر کا ذکر تحسین آمیز طریقہ سے کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی طرف سے خیرسگالی کے جذبہ میں پاکستان برابر کا شریک ہے، ان شاء اللہ اقبال نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ انسان اور انسان کے درمیان خیرسگالی کا جذبہ پیدا کرنے میں موثر ثابت ہوں گے،   (باقی)

اقبال کامل

از مولانا عبدالسلام ندویؒ

ضخامت: ۴۰۰ صفحے، قیمت: ۵۰-۱۲

ارادت خان واضح کی ایک تصنیف

کلمات

از پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالرحیم صدر شعبۂ عربی ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور

میر مبارک اللہ ارادت خان واضح (۱۰۵۸ھ - ۱۱۲۸ھ) اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے نامور شعراء اور ممتاز امراء میں ہے، واضح کی شعری ونثری دونوں ہی کاوشیں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، اس مضمون میں ان کی ایک تصنیف تاریخ ارادت خان کے نام کے متعلق بعض امور کی وضاحت اور ایک غلطی کا ازالہ مقصود ہے۔

عموماً یہ کتاب اسی نام سے موسوم ہے[1]

ریو اور ایتھے کے سامنے جو نسخے تھے، ان کے سرورق پر مفتتح السلاطین تحریر ہے[2] سالار جنگ میوزیم لائبریری کے مخطوطے پر کتاب بیاض ارادت خان واضح اور بانکی پور لائبریری کے نسخے پر تاریخ مبارکی[3] درج ہے۔

اس کتاب کے دو ترجمے چھپ چکے ہیں، ایک جوناتھن اسکاٹ کا انگریزی

---

[1] ملاحظہ ہو اسٹوری ص ۲۰۲، سالار جنگ میوزیم لائبریری کیٹلاگ ج ۱، ص ۳۵۴، مغل ببلیوگرافی ص ۱۵۰، ایلیٹ اینڈ ڈاسن ج ۷، ص ۵۳۴، اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کیٹلاگ ج ۷، ص ۸۸ [2] ریو ص ۹۳۸، ایتھے ص ۴۰۰، [3] مخطوطہ نمبر ۲۴۴ ص ۱۰

Memoirs of Eradat Khan ترجمہ
کے نام سے شایع ہوا۔[1] دوسرا اردو ترجمہ سوانح عمری ارادت خان واضح کے نام سے مولوی سید اشرف شمسی حیدرآبادی کے قلم سے ہے۔[2]

واضح کی اس تصنیف کا بغور مطالعہ کرنے سے تو یہ بات صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے، کہ اس کتاب کا نام خود واضح نے "کلمات" رکھا ہے، داخلی شواہد سے صراحت کے ساتھ یہی ظاہر ہوتا ہے، اس کے علاوہ سب نام اضافی اور الحاقی معلوم ہوتے ہیں

صوفیانہ مسائل اور اصطلاحات کی تشریح میں واضح کی "کلمات عالیات" کے نام سے ایک مبسوط تصنیف ہے، اس کے بعد اس نے "کلمات" لکھنے کا ارادہ کیا، اور اول الذکر ہی کی رعایت سے یہ نام رکھا، اس کی تائید میں چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ کتاب کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے۔

چون "کلمات عالیات" بانجام رسید چنانچہ	جب "کلمات عالیات" کی تصنیف کا کام
بعض کیفیات در خصائص آن	مکمل ہو گیا، جس کے آخر میں ان کیفیتوں
ثبت افتادہ مخطور گردید کہ در زمان	کا ذکر ہے تحریر کے وقت جو خیال میں
تحریر این حالاتے کہ بر خود گذشتہ بود تی	آئی تھیں، یہ حالات جو اپنے اوپر گزرے
اجمال قلم بند نمائیم چنانچہ در "کلمات"	اس کتاب "کلمات" اور دوسری کتابوں
و در تصانیف دیگر منظور افتادہ باشد[3]	میں اجمالاً قلمبند کئے گئے ہیں۔

اسی دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں،

۱؎ مطبوعہ لندن ۱۸۶۰ء، اس کی تلخیص ایچ ام ایلیٹ نے شائع کی لندن ۱۸۷۷ء ص ۵۶۳ - ۵۴۴۔
۲؎ مطبوعہ حیدرآباد، ۱۳۱۱ھ ۳؎ سالار جنگ میوزیم مخطوطہ ۲۴۲ ص ۱

از زمانے کہ این "کلمات" بہمان عبارتے کہ لایق آن مطالعہ تحریر آمد آنچہ درین روداد از احوال خود نقل نمودیم امید از مطالعہ کنندگان آن نیست کہ انصاف از دست ندہند۔[1]

جس زمانہ مین کہ یہ کلمات اس عبارت اور پیرایہ میں لکھی گئی، جو اس کے مطالعے کے لحاظ سے موزوں تھے، اپنے حالات کے سلسلہ میں اس میں جو کچھ نقل ہوا ہے اُنکے بارہ مین قارئین انصاف کی نظر سے مطالعہ کرین گے۔

کتاب کی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں

"ابتدای تحریر "کلمات" چون واقعۂ گڑھ اودنی واقع شدہ کہ سنہ یکہزار دیکصد دیازدہ بودہ از آن باز تا انجام تحریر "کلمات" کہ یکہزار دیکصد و بیست وچہار است ہمہ درین روداد وحالاتے کہ بر خود گذشتہ بتحریر درمی آید۔[2]

جب "کلمات" کا آغاز ۱۱۱۲ھ میں امتیاز گڑھ اودنی میں کیا گیا اسوقت سے ۱۱۲۴ھ میں اس کے اختتام کے وقت تک اپنے اوپر جو حالات وکیفیات طاری ہوئے ان کو اس کے اندر قلم بند کیا گیا ہے

آخری صفحہ پر تحریر ہے۔

"ابتدای تحریر "کلمات" عالیات چون در اودنی در سنہ یکہزار دیکصد دیازدہ بود از آن باز حتی الیوم کہ سنہ

"کلمات" عالیات کی تصنیف وتحریر جب اودنی میں ۱۱۱۱ھ میں کیگئی تھی اس کے بعد سے آج تک ۱۱۳۰ھ میں

---

[1] سالار جنگ میوزیم مخطوطہ ۴۴۳ ص ۲ [2] ایضاً

یکہزار و یکصد و بیست و شش است	جبکہ کلمات کی تالیف تکمیل کو پہنچ گئی
تحریر کلمات" با تمام رسید حالا تکہ	ہے، جو حالات اپنے کو پیش آئے ان کو
درین ہین برخود گذشتہ بطریق اجمال	بطور یادگار اختصار سے تحریر کردیا
برای یادگار تحریر آمد و چون اینہ در	گیا ہے، یہ بات اپنے مقام پر بالکل
محل خود در ہمین خاتمہ مذکور است	خاتمہ میں مذکور ہے اس کا مقصد تنہا
غرض تحریر بادشاہنامہ نیست کہ	نامہ نہیں ہے، جس میں امراء کے حالات
احوال امراء و قضایای سلطنت	اور امور سلطنت تحریر کیے جاتے ہیں،
باید نوشت[۱] دو کلمات" سرگذشت	دو کلمے صرف اپنی سرگذشت اور
حالات خود است بس الحمد للہ الذی	حالات میں لکھے ہیں سارا شکر اس اللہ
بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات[۲]	کے لیے ہے، جس کی بدولت نیک کام

"کلمات" میں واضح نے اورنگ زیب کے دور حکومت کے آخری ایام سے فرخ سیر کی تخت نشینی یعنی ۱۱۲۵ھ تک کے حالات درج کیے ہیں۔ اس مختصر سی مدت میں کئی مغل شہزادوں کے سر تن سے جدا کیے گئے، اس خونچکاں داستان کو "مقتل السلاطین" کے نام سے موسوم کیا جانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، اسی طرح واضح کے نام میر مبارک اللہ کی رعایت سے "تاریخ مبارکی" کے نام سے معنون کیا جانا بھی قرین قیاس ہے، اسی طرح مصنف کی تحریر "حالاتیکہ برخود گذشتہ" کے تحت اسکاٹ کا Memoirs لکھنا اور مولوی سید اشرف شمسی کا سوانح عمری ارادت خان تحریر کرنا سب ہی نام موزوں معلوم ہوتے ہیں لیکن چونکہ خود واضح کے قلم سے بار بار اس تصنیف کی وضاحت "کلمات" کے عنوان سے ملتی ہے اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ "کلمات" کے علاوہ تمام عنوانات کو اضافی نہ سمجھا جائے۔

۱۔ دو کلمہ" سے "کلمات" اور "کلمات عالیہ" مراد لئے جاسکتے ہیں مگر خواہ کتر تصنیف میں بھی واضح کی زندگی کے چند واقعات ملتے ہیں۔ ۲۔ مخطوطہ ۱۲۵

ادبیات

غزل

ازجناب بسمل شاہجہاں پوری

بسمل یہ دن گزار دیے شانِ خودی کے ساتھ
کم ظرف الجھ رہے ہیں تری بے کسی کے ساتھ

واعظ نہ چھیڑ کر مری بادہ کشی کے ساتھ
رحمت کو ربطِ خاص ہے تر دامنی کے ساتھ

اچھا نہیں دلوں میں جو باقی رہے غبار
ترکِ تعلقات بھی ہو تو خوشی کے ساتھ

میرا بھی ظرف دیکھ تعصب پرست دوست
صدیاں گزار دی ہیں تری کافری کے ساتھ

اے دوست ہر فریبِ مسلسل ترا قبول
لیکن یہ کس کے ساتھ مری سادگی کے ساتھ

دیکھو آج کل دوست ہیں اکثر زمانہ ساز
بسمل بس اب نہ دوستی کیجو کسی کے ساتھ

غزل

ازجناب مقیم الدین احسن دریابادی مرحوم

کرامت بندگی میں کیسی خلاقِ جہاں رکھ دی
ترا جلوہ نظر آیا جبیں میں نے جہاں رکھ دی

میں اُن کے سامنے حالِ دلِ ناکام کیا کہتا
فقط اک آہ نے دہرا کے ساری داستاں رکھ دی

وفا نا آشناؤں میں بھی چرچا جس کا رہتا ہے
وفا کی میں نے وہ بنیاد زیرِ آسماں رکھ دی

تمنا تھی کہ ظاہر ہو نہ اُن پر رازِ الفت کا
مگر اشکوں نے بہہ کر کے شرحِ داستاں رکھ دی

رہِ الفت میں مٹ جانا بھی تکمیلِ محبت ہے
کہ معیارِ محبت نے یہ قیدِ امتحاں رکھ دی

نمونہ بن گئی صناع کی قدرت کا اے احسن
سلیقہ سے یدِ خالق نے جو شے بھی جہاں رکھ دی

مطبوعاتِ جدیدہ

صیانۃ الحدیث ۔ مرتبہ، مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری تقطیع خورد کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی صفحات .. ۲ قیمت چھ روپیہ پتہ۔ از مصنف کیرآف خان کلاتھ ہاؤس، ڈاکخانہ رام دت گنج، ضلع بستی۔

تقریباً ستر اسی برس سے مستشرقین اور منکرین حدیث احادیث نبوی کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں، علماء اسلام نے انکے ایسے تشفی بخش جواب دیے ہیں کہ مخالفین لاجواب ہو گئے ہیں، اس سلسلہ میں علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شاہ معین الدین، مولانا عبدالسلام، ڈاکٹر زبیر صدیقی، ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی وغیرہ کے عالمانہ اور مدلل مضامین خاص طور سے قابل ذکر ہیں پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، مولانا عبدالرؤف صاحب نے اس میں احادیث کی نقل و روایت اور تحریر و کتابت میں محدثین کرام کی احتیاط محنت اور کد و کاوش کی تفصیل بیان کی ہے، اس سلسلہ میں تابعین و تبع تابعین کے عہد سے تیسری صدی ہجری تک کے مشہور محدثین کے حفظ و ضبط، عدالت و دیانت، تقدس و تقوی کے موثر واقعات اور چند اکابر محدثین کے مختصر سوانح حیات خدمات حدیث بھی قلمبند کیے گئے ہیں، مصنف نے امہات کتب حدیث کا بھی جائزہ لیا ہے، اور بتایا ہے کہ وہ اس قدر صحت و تحقیق سے مرتب کی گئی ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ہے اس لیے منکرین حدیث کے شبہات کی کوئی حقیقت نہیں ہے،

مفتی صدرالدین آزردہ۔ مرتبہ۔ مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۴۰ مجلد قیمت بارہ روپیہ۔ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔

مغلیہ سلطنت کے دور زوال میں جو فضلاء اور ارباب کمال گذرے ہیں، ان میں مفتی صدرالدین آزردہ کی شخصیت بعض حیثیتوں سے بڑی جامع تھی، لیکن ابھی تک ان پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، زیر نظر کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، جو تیرہ ابواب پر مشتمل ہے شروع کے چار ابواب میں مفتی صدرالدین آزردہ کے خاندانی حالات تعلیم و تربیت، درس و تدریس اور صدر الصدور کے منصب پر فائز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے فضل و کمال کے متعلق معاصرین کی شہادتیں نقل کی گئی ہیں، پھر چند ابواب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی کوششوں، قومی و مذہبی خدمات، مشہور تلامذہ اور تصنیفات کا ذکر ہے آخر کے ابواب میں آزردہ کی فارسی و عربی تحریروں کے اقتباسات اور اردو، فارسی اور عربی کلام کے نمونے درج کئے گئے ہیں، اور ان کے اردو و فارسی کلام کی اہم خصوصیات دکھائی گئی ہیں، لائق مصنف نے آزردہ کی بعض تصنیفات کے تعارف میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، اس ضمن میں ان کے بعض علمی خیالات اور فقہی آرا کی مدلل وضاحت بھی کی ہے، کتاب مصنف کی جستجو و محنت کا نتیجہ اور اردو کے سوانحی ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہے، مصنف نے عربی و فارسی عبارتوں کا ترجمہ کر دیا ہے، لیکن یہ کہیں کہیں چھوٹ بھی گیا ہے،

مراٹھی ادب کا مطالعہ۔ مرتبہ محمد یونس اگاسکر، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، .... مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپئے (۱) مکتبہ جامعہ پرنس بلڈنگ بمبئی

ڈاکٹر اقبال چوک بمبئی ۳ (۲) مکتبہ نقش کوکن، ۴۰ چیل روڈ، ایسٹ ماڈگری بمبئی ۹۔۔۔۰۰۰۴

مہاراشٹر کے نوجوان ادیب و صحافی جناب یونس اگاسکر کو اردو اور مراٹھی دونوں سے اچھی واقفیت ہے، انھوں نے مراٹھی زبان و ادب کے متعلق اردو میں معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں، اور مراٹھی نظموں، افسانوں اور ڈراموں کے اردو ترجمے بھی کئے ہیں، یہ کتاب ان کے اسی قسم کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے، جنھیں لائق مرتب نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ جمع کر دیا ہے، مضامین مفید دلچسپ اور پر از معلومات ہیں، اس میں مراٹھی نظم و نثر کے مختلف اصناف کا جائزہ لیکر ان کی قدر و قیمت واضح کی گئی ہے، اور مراٹھی کی مذہبی، اخلاقی، رزمیہ اور عشقیہ شاعری، ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ ان ترجموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو دوسری زبانوں سے مراٹھی میں کئے ہیں غالباً اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، اس سے اردو خوان طبقہ کو مراٹھی زبان کے ادب سے واقفیت ہو جائے گی،

تلاش و تاثر ۔ مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی تقطیع خورد متوسط کاغذ کتابت وطباعت بہتر

یہ کتاب اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے، شروع کے تین مضامین مرزا غالب مرحوم کے متعلق ہیں، ڈاکٹر اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق دو دو اور مولانا حسرت موہانی کے متعلق ایک مضمون ہے ایک مضمون میں اردو صحافت سے متعلق ایک پاکستانی کتاب پر ریویو کیا گیا ہے، آخر کے نو مضامین میں مصنف نے مختلف اشخاص کے بارہ میں اپنے دلچسپ تاثرات و مشاہدات قلمبند کئے ہیں ان میں سے تین نجیب اشرف ندوی، بشیر الحق دسنوی اور سعید رضا ان کے ہم وطن اور عزیز ہیں اور تین ملا سجاد حسین، محمد یوسف قیصر اور رام عرفان کا تعلق بھوپال سے ہے، جہاں مصنف اس وقت مقیم ہیں، آخری مضمون میں مالک رام اور علی جواد زیدی

اور سجادنا یہ مرحوم کے بھوپال میں چند روزہ قیام کی دلچسپ روداد تحریر کی گئی ہے، یہ سب مضامین مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں، اور بعض مصنف کی مطبوعہ کتابوں میں بھی شامل ہیں انکے [illegible] ہی کی اشاعت کی حیثیت قند مکرر کی ہے، غالباً کتابت کی غلطی سے ایک جگہ بلوغ المرام کو بلاغ المرام لکھ گیا ہے۔

اقبالیات۔ مرتبہ جناب عبدالقوی دسنوی تقطیع متوسط

یہ کتاب بھی دسنوی صاحب نے لکھی ہے، یہ اقبال کے متعلق اب تک کی ہندوستانی مطبوعات مضامین، تحریروں اور یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کا اشاریہ ہے، اس کے ساتھ اقبال پر پاکستانی اہل قلم نے ہندوستانی رسالوں میں اور ہندوستانی اہل قلم نے پاکستانی رسالوں میں جو مضامین لکھے ہیں، ان کی فہرست بھی آگئی ہے، امید ہے کہ اس مختصر کتاب سے اقبال پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد لے گی۔

احکام التعزیت۔ اس کتابچہ میں مسلمان کے آخری مراسم یعنی بیماری، موت، میت کے غسل، تجہیز تکفین، نماز جنازہ، قبر اور ایصال ثواب وغیرہ کے شرعی احکام بیان کئے گئے ہیں، اس کے مصنف مولوی حاجی عین الحق اعظمی دینی و ملی خدمت کا ولولہ رکھتے ہیں، اور اللہ نے ان کو فراغت بھی عطا کی ہے، یہ رسالہ مصنف کو نیو لائٹ ٹیزی جاج منڈ کانپور کے پتہ پر خط لکھ کر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے، مگر عربی عبارتوں میں اعراب کی غلطیاں بہت ہیں، "ض"

تعمیر حیات۔ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کی نگرانی و سرپرستی میں مہینہ میں دو بار نکلتا ہے۔ قیمت۔ سالانہ بارہ روپیہ

پتہ پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوہ لکھنؤ

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۸ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

پاکستان کے سفر میں جو علمی تحائف ملے اُن میں سب سے قیمتی اور کار آمد دائرۂ معارف اسلامیہ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کی پندرہ خوبصورت اور دیدہ زیب جلدیں ہیں جو ڈاکٹر سید عبد اللہ پروفیسر عبد القیوم اور خاص طور پر جناب شیخ نذیر حسین کے لطف و کرم کی بدولت حاصل ہوئیں، اب یہاں یہ ارباب ذوق کے لئے مرکز توجہ بنی ہوئی ہیں،

معلوم ہوا کہ اس کی بارہ جلدیں اور شائع ہوں گی، یہ سلسلہ مکمل ہو گیا تو نہ صرف اردو زبان کے شیدائیوں کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی، بلکہ اس زبان کے وزن اور وقار میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۱۰ء میں لکھا تھا کہ "اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہم علوم و فنون کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی زبان میں فراہم کریں جو علمی، ادبی، قومی، تجارتی، اخلاقی ہر قسم کے علوم و خیالات کی ادائے تعبیر کی کفالت کر سکے، ایسا مجموعہ جو ان گونا گوں علوم و خیالات کا کفیل ہو ایک اردو دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کے سوا کچھ اور نہیں" ان کی یہ آرزو ان کی زندگی میں پوری نہیں ہوئی، ان ہی کی طرح اور دوسرے ارباب علم کی طرف سے بھی ایک قاموس اسلام کیلئے برابر آواز اٹھتی، مگر یہ دیب کدۂ تمنا یہ شیر دلان پنجاب کیلئے مقدر تھا کہ وہ اردو بولنے والوں کی آرزوؤں کے ایک صحرا کو لالہ زار اور مرغزار بنا دیں،

قصۂ شیریں عجب افسانۂ ایست کوہکن خواب اندر ایں افسانہ کرد

دائرۂ معارف اسلامیہ کی ابتدا پروفیسر محمد شفیع مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی، انھوں نے اپنے علم کی گہرائی اور نظر کی وسعت سے اس عظیم علمی کام کا جو معیار قائم کیا تھا، وہ ان کی وفات کے بعد برقرار رہا، اس وقت اس کے ادارۂ تحریر کے رئیس اس برصغیر کے مشہور مصنف اور محقق ڈاکٹر سید عبد اللہ ہیں جن کی خوش ذوقی

خوش سلیقگی اور تحقیق و دیدہ وری سے اس کی مختلف جلدیں بڑی خوش اسلوبی سے تیار ہو رہی ہیں، ان کے رفقائے کار پروفیسر سید محمد امجد الطاف، پروفیسر علیم الدین سالک، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی اور شیخ نذیر حسین صاحبان ہیں جو اپنی پوری علمی بصیرت کے ساتھ ان کی امداد کر رہے ہیں،

استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تدوین کی تحریک کی تھی تو ان کا خیال تھا کہ اس کی تالیف، طبع اور اشاعت کے لئے ایک شاہی خزانہ، شہنشاہانہ عزم اور حوصلہ مندیوں کی ضرورت ہوگی، اس شہنشاہانہ عزم اور حوصلہ مندیوں کی تکمیل پنجاب یونیورسٹی لاہور کے خزانہ سے ہو رہی ہے، اس کی بنیاد تو انگریزی میں لکھی ہوئی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ہی پر ہے، مگر انگریزی اڈیشن کے لکھنے والوں نے اکابر اسلام، اسلامی علوم و فنون، اسلامی نظر و فکر سے متعلق جو زہر پھیلانے کی کوشش کی تھی، اس کا تریاق اس اردو اڈیشن میں موجود ہے، جن مشاہیر اور عنوانات پر انگریزی اڈیشن میں مقالات نہیں تھے، ان پر اچھے اور پر از معلومات مضامین لکھوا کر ان میں اضافہ کر دیا گیا ہے،

ان پندرہ جلدوں میں صرف ف تک کے مقالات شامل ہیں، یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ ان مقالات میں تحقیقات، تعبیرات، واقعات اور سنین کے اندراجات میں تسامحات نہ ہوں گی، کچھ نہ کچھ کا ہونا تو ناگزیر ہے، مثلاً دارالمصنفین سے متعلق اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو شوق سے یہاں پڑھا گیا، جلد نمبر ۲ کے ص ۹۰۲ پر اس کی مطبوعات گل رعنا اور شعر الہند کو مطبوعہ معارف پریس علی گڑھ بتایا گیا ہے، علی گڑھ کے بجائے اعظم گڑھ ہونا چاہیے تھا، جلد ۹ ص ۷۳۱ پر دارالمصنفین کی ایک کتاب دولت عثمانیہ کو عزیز مرزا کی تصنیف بتائی گئی ہے، حالانکہ اس کے مصنف کا نام محمد عزیر ہے، جلد ۹ ص ۳۱ پر لکھا گیا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کی پانچ جلدیں لکھیں، یہ صحیح نہیں، پہلی دوسری جلدیں مولانا شبلی کی ہیں، بقیہ چار جلدیں مولانا سید سلیمان ندوی کی لکھی ہوئی ہیں، اس قسم کی فروگذاشتیں دوسرے مضامین میں بھی ہو سکتی ہیں، ان سے قطع نظر ان میں ہر قسم کی جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کے ساتھ ماخذوں کی جو فہرست دی گئی ہے، اطناب بیجا سے جا بجا بچا کر رکھا گیا ہے، جا بجا جو مفید تصویریں منسلک ہیں، مضامین کے قلمبند کرنے میں جس سلیقہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ ہر طرح قابل مدح و ستائش ہے، لیکن ہر کاتب کے مضامین میں زبان، انداز بیان، روزمرہ، محاورہ، تذکیر و تانیث، اردو کے بجائے فارسی یا عربی جمع لکھنے وغیرہ میں کہیں کہیں خامیوں کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے، مگر مختلف رنگوں کے لکھے ہوئے ہزاروں لاکھوں صفحات میں اس قسم کی خامیاں

زیادہ قابل التفات نہیں،

جب یہ اہم باشان علمی کام پورا ہو جائیگا، تو اردو زبان صحیح سے اٹھکر چلی جانے کی دھمکی دینے کے بجائے اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں سے آنکھیں بھی طرح ملا سکے گی اب تک جتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان کی ظاہری شکلیں بھی دیدہ زیب ہیں جن سے ہر کتب خانہ کی زینت میں اضافہ ہو سکتا ہے ان کی پشت پر ان حروف کے بھی لکھدینے کا اہتمام ہونا چاہئے جن کے مضامین جلد کے اندر ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون سی جلدوں میں کون سے حروف کے مضامین ملیں گے، ان کی فروخت کا انتظام ہندوستان میں بھی ہونا چاہئے تاکہ یہاں بھی اس خزینۂ علم کا باب کھل سکے، اور یاران نکتہ داں کے لئے یہ صلائے عام بن کر رہیں،

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ۵ر ۶ر مارچ ۶۶ء کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا، اس میں اس کے اکابر اراکین شریک ہوئے ان کی تشریف آوری سے یہاں تین روز بڑی چہل پہل رہی بہت سی مفید تجویزیں منظور ہوئیں جن سے امید ہے کہ اس کی ترقی اور سربلندی کیلئے مزید راہیں نکل آئیں گی، ایک روز اس کی مسجد کے اندر ایک دینی اجتماع بھی ہوا جس میں مولانا عمران خاں ندوی کی بہت ہی دلچسپ پر کیف اور رقت آمیز تقریر ہوئی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قدیم طلبہ کے حلقہ میں جناب عبیدالرحمان خاں شروانی صاحب کی بڑی پذیرائی ہوئی انکے ایک اجتماع میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے مسائل سے ان کو مطلع کیا،

اسی زمانہ میں شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں اقبال پر ایک سیمینار ہوا، اس میں جناب عبیدالرحمان خاں شروانی صاحب کی صدارت میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر اس پر ہوئی، کہ اقبال شاعر تھے، اقبال شاعر نہ تھے، اقبال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شیفتگی اور وارفتگی تھی، اس کو مولانا محترم نے کچھ اس دلنشیں انداز میں پیش کیا کہ پورے مجمع پر بڑی کیفیت طاری ہو گئی، آخر میں انھوں نے فرمایا کہ اقبال کے اشعار سے دلچسپی لینا، مگر ان کے پیامات پر عمل نہ کرنا اپنی بے حسی اور زبوں حالی کی دلیل ہے، اس موقع پر جناب محمد نسیم قریشی استاد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی بھی مدعو تھے، انھوں نے اپنے خطیبانہ انداز میں اقبال پر جو تقریر کی اس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے،

مقالات

سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کا ایک باب

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ (۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ

"عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا ہے جو کچھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اس سفر میں گذر جائے اور آخر میں خوش نصیب سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے

منزل تمام گشت بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول کی، پانچویں کے بعد چھٹی جلد تیار کی، ساتویں کی تالیف میں مصروف تھے کہ بارگاہِ الٰہی میں حاضری کا حکم آگیا، ان کی بیگم صاحبہ نے ازراہِ کرم اس کا مسودہ دارالمصنفین کو عنایت کر دیا ہے، ذیل کی سطروں میں ہم اس کا ایک باب شائع کر رہے ہیں، اسی کے ساتھ سید صاحب کا وہ دیباچہ بھی شامل کر رہے ہیں جس میں انھوں نے ساتویں جلد کے موضوع کی اہمیت اور مشکلات بیان کی ہیں، تاکہ

ناظرین کو اندازہ ہو سکے کہ یہ کام کتنا دشوار ہے اور ہمت طلب ہے" ص ع"

معاملات

سیرت کی ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے، ہماری اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت، مال و دولت اور حکومت کے ضابطے اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے، کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق اُن تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زیادہ افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو، اور اُن کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو، ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں، معاشرات، اقتصادیات اور سیاسیات، اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اور انھیں تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشرات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہو گی، اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا، اور سیاسیات میں حکومت اور سلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے،

ان احکام کا اشکال یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے، جن میں یہ احکام مذکور ہیں، اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانہ میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو

سامنے رکھ کر سونچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہ سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نقشاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کرتے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی کے سیاسیات کے احکام وفرائض کا ماخذ خود ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس میں سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچمدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز کو ۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دئے، دو سال کے بعد ۲۹ ر رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا، اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ ر شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے۔ مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي۔

عہد نبوی میں نظام حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت کے قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں لیکن درحقیقت وحشت سے زیادہ یا کم از کم اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے نظام حکومت کا

دشمن تھا اور اس کی مخالفت دعوت سے زیادہ دیرپا تھی، چنانچہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد گرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردن جھکا دی، لیکن تمدن کا سر پرغرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور طرز جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ جو ۹ھ میں پیش آئے، اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی کا نتیجہ ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی پوری سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کی زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے مختلف قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام تھا وہ انھی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں باذان نام ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور

نظام تمدن کی نقالی اور تصویر ہوتی تھی، اور ان سے الگ ان سے بالاتر کسی نظام زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم ضرورت یہ تھی کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی حکومت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نہ صرف عربوں کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانون الٰہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانون الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و احکام میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظام حکومت کو بھی بتدریج ترقی ہوئی، چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے آئے تھے، مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی عہداً بعد عہد اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح (اے مسلمانو!) ہم نے
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	تم کو بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔	ہو اور رسول تمہارا بتانے والا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لئے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے بروئے کار لائی گئی ہے (تفصیل دوسری جگہ ہے)

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپؐ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور اسلام کی ۲۳ سالہ زندگی میں تقریباً سولہ سترہ سال انہیں قبائل کی اصلاح وہدایت کے نذر ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر ویمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لئے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپؐ کو قبیلۂ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرۃ بنایا اور وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے کہ سے زیادہ پرخطر تھا اور ابتدا میں صحابہ اور مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لئے اس کی آب وہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظام اسلام کی اشاعت ہوگئی اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی فتح مکہ کا راستہ صاف کر دیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا، اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو اور بھی وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصے میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے قرب وجوار کے سلاطین ورؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدم قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس کے جواب میں خود قیصر کا طی اگرچہ نور اسلام سے منور

ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسّانی سلطنت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوۂ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لئے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظامِ حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

اَلْیَوْمَ اسْتَدَارَ الزَّمَانُ کَہَیْئَتِہٖ	زمانہ پھر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر
یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰاتِ	وہ اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو
وَالْاَرْضَ۔	پیدا کیا۔

یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا، جس نے تمام خود ساختہ قوانین سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظام ہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشینگوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی: اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ وَاِذَا ھَلَکَ قَیْصَرُ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَہٗ، اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص خدا کے بعد ایک لحاظ سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں

حق تھی، یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگران و حاکم ہے،
شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا،
غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کا کہ کُلُّکُمْ
رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ ۔ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کی
زیرِ نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔ یہی مطلب ہے، اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا
ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کرکے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر، ہزاروں گھروں کو ویران کرکے، سب کو زیر کرکے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظامِ سلطنت کے جدوجہد میں اس میں سے کوئی چیز مطمحِ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندانِ قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا کی تاریخوں میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جس میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا

مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کے قانون رائج ہو اور جس میں فرماں روا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرز سلطنت، طریق حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو۔

اسی مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب ہوا، ظاہری تو اس لئے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لئے ویسی ہی درمیانہ ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی، اور معنویت یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لئے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ان ہی میں ازل سے ودیعت رکھی گئی تھی۔ عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ عربوں کے یہ اخلاقی عناصر، حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں اور ان اوصاف کی جلا، اخلاص، للہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاق روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لئے اولاً ان کو اس طرز حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار اور شاہانہ ہیبت کی فرضی شکل و صورت کے لئے قائم کر رکھا تھا، ان اخلاقی محاسن کا وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو و نما کی صورت ایک ہی تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ مامور من اللہ، ایک پاکباز رہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتو صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکام الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی

اور احترام پر خود مجبور کردے۔

اس اصول پر جو نظام سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

(۱) یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو (۲) یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساس اولین محض اخلاص قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظام سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا، اس نظام سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایرانی نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی سب ایک ہی سطح پر آکر کھڑے ہوگئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہل کار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی وہ عرب کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی، کیونکہ اہل عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہی حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کئے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا، ان میں سرداران قبائل کے لئے خاص ذاتی حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق تھے

جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور نقول کہتے ہیں اور اسلام نے انھیں کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے
عام مجالس میں لوگوں کو سرداران قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا،
چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا کہتا ہے:

ونکران شئنا علی الناس قولهم		ولاینکرون القول حین نقول

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں		اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے

سرداران قبائل اپنے لئے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے ان میں دوسرے لوگوں کو
قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
جو یہ فرمایا ہے:

لاحمی الاحمی اللہ ورسولہ		اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے
مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے.

اس کا مقصد اس رسم کا مٹانا تھا، سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور
ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ
ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تخت پر جلوس کرتے تھے. ان کے امراء علیٰ قدر مراتب سونے چاندی
کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم
ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، سونے چاندی کی نشست کے سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام
کئے گئے، سونا چاندی کے زیورات مردوں کے لئے ناجائز ٹھہرے، امام وقت اور اس کے حکام
کے لئے مسجد اور اس کی کھلی جگہ ایوان تھی، حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش و نقیب
رخصت کر دئے گئے، طلائی و نقرئی و زمردیں تخت اٹھوا دئے گئے. امام اور اس کے حاکم عام
مسلمانوں کے ساتھ بالکل ایک ہی حالت میں نشست کرتے تھے اور پستی و بلندی کی تفریق باقی

نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع و لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک صحابی ایک شاہی عبا لیکر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے لوگ آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمائیں، یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار کا دن ہے آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ و جلال پر گئی جو شاہان وقت میں رائج تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح صورت نشست میں آپ نے تفوق کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عامی آدمی میں اس خاص حیثیت سے کوئی فرق نہیں رہتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمدؐ کون ہیں، لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے، مگر اس کو بھی پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہانہ افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے، ایک بار مخزومی عورت فاطمہ بنت قیس نے چوری کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ کو یہ سخت گراں گذرا،

اور لوگوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی، آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی ہوتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا ۔ ۱؎

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا ، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کونچ دیا، جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو ، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا ۔ ۲؎

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے ۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے ، لیکن آپ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں ۳؎ ، ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا ، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا ، اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات و عشر و محاصل کے وجوب اور ادا میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا ۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں اور یہاں حضورؐ نے اپنے لئے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ

۱؎ یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان ۲؎ ابوداؤد ج ۲ ص ۵۰۸ کتاب الحدود ۳؎ ابوداؤد

آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اور عبدیت کاملہ ہی آپ کا کمال ٹھہرا، اعزاز کے وہ ذہنی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا، خدا کے نزدیک سب سے بڑا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کہے، ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا، یہ تو اللہ کیلئے ہے ان موقعوں پر یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیاء پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیم کا انتقال ہو چکا تھا، اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوجاتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا[1]

ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمد کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا[2] حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں میں پھانسی تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین مقصود ہوتی تھی۔

ایک بار آپ نماز پڑھا رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: "خداوندا! مجھ پر اور محمد پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر" آپ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی

[1] بخاری باب الکسوف ۔ [2] مسند ج ۳ ص ۴۳۵ مسند اسود بن السریع

بدو کو ٹوکا کہ "تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا"[1]۔ حالانکہ شاہانہ محاورہ میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس نے اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطین زمانہ اکرام وانعام کی بارش کر سکتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خانگی عیش وآرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف نہ تھا، اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے۔ لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لئے تھے۔ زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا، وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اس کو اپنا نہیں بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے۔ زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرمادی اور اس کو بحکم الٰہی عام غرباء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا، اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے، قَالَ مَا اُوتِیکُم من شیئٍ وما امنعکم ان انا الا خازن اضع حیث ما امرت۔ میں تم کو نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ روک سکتا، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں، دوسرے موقع پر فرمایا، انما انا قاسم واللہ یعطی، میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو خدا ہے[2]۔ غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے کے تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے اختیار کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور اپنے اہل بیت کے

---

[1] بخاری ج۲، ص ۸۸۹، کتاب الادب۔ [2] ابوداؤد، جلد ۲، ص ۱۵، کتاب الخراج والامارۃ۔

علاوہ اور جن نادار و محتاج مسلمانوں کو جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، دیا کرتے تھے، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا حضورؐ اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اس کی آمدنی بھی اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرمادیا کرتے تھے، اور صاف اعلان فرمادیا تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوں گے۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لئے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام بھی ضروری ہے، چنانچہ انھیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سادگی کے تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش اسی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں، اور یہ آپ کا خزانہ ہے جہاں جو سرمایہ ہے وہ میرے

سامنے ہے، ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں' اور حضور اللہ کے رسول ہیں، ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں، اور وہ دنیا، حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں بے شک یا رسول اللہ، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ دعا فرمائیے کہ خدا آپ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے، تاہم خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دئے ہیں، آپ دفعتہً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو، رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دئے گئے ہیں[۱]۔"

اس تقریرِ دلپذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ کملی گودڑی اور مرقع ہی پہن کر اور جو نپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انھوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپؐ نے فرمایا، ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں[۲]، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گذرتے تو تم سجدہ کرتے، عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہئے[۳]، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا، آپ نے حیرت سے فرمایا: معاذ

---

[۱] بخاری و مسلم کتاب النکاح۔ باب الایلاء و اعتزال النساء و تخییرہن (معارف) [۲] ابوداؤد کتاب النکاح

یہ کیا؟ عرض کی یا رسول اللہ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1]۔

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہ اور پیشوا کو قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے مناظر میں دیکھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کامل نمونہ سے اس کو کر کے دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ نے بھی اسی کی پیروی کی اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا کارنامہ قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولتمندوں کی دولتمندی اور فقراء کی فقر میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الٰہی کے تحت جو نظام اسلامی قائم فرمایا اس میں دولتمندی اور تقرب نہیں بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا۔ عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہ تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں نگینے بھرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہو

---

[1] ابن ماجہ کتاب النکاح۔

تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔[1]

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصنعات اور اظہار غلامی و عبودیت کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آسکتا تھا، اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت کی عقیدت مندی اگرچہ صحابہ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا اور حضور خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے تھے، اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا، آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ حضور کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو اس کی نسبت بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتے تھے اور حضور اس کو شفقت سے سنتے تھے، اور اپنے خلاف بھی رائے ہوتی تو قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے، اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں سفارش ہے، عرض کی، "تو قبول سے معذور ہوں"[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

---

[1] دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الخراج میں ہیں [2] صحیح بخاری باب نکاح المشرک تحت العبد و باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرۃ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے اور اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے۔ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ موقع مناسب نہیں ہے، بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا، اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم، تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو، اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لئے کرتے ہوں گے، اس لئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا تو دریافت فرمایا، انھوں نے حالت عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان امور میں جن کا علم وحی سے ہے میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہی ہوں [۱]

یہ حدیث ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کی تجربی باتوں سے ہے، بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت خداوندی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور کو بذریعہ وحی ہوتی، ان میں پھر کسی کا مشورہ بھی توجہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا جس میں بندہ کو دخل نہیں۔

---

[۱] صحیح مسلم، باب الفضائل۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لئے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: بے شبہ ہوں، انھوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہ ہیں، انھوں نے کہا، تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا، انھوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانۂ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا، ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انھوں نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے لیکن ان کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انھوں نے بھی وہی جواب دئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دئے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انھوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔[1] اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض معروض کی مگر حضورؐ نے اپنے فیصلہ کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادت ربانی سے کیا گیا تھا، اسی طرح اسی موقع پر واقعۂ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا تو چونکہ ان کے شدت ذوق و شوق زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لئے حزن و ملال کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضورؐ

---

[1] بخاری جلد اول ص ۳۸۰، کتاب الشروط۔

یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی ترمیم کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گذرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، ام المومنینؓ نے چہرۂ پاک پر آزردگی کا اثر پاکر سبب دریافت کیا، آپ نے واقعہ بیان فرمادیا، حضرت ام المومنین نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی کو کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، شمع نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضورؐ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس کے دقیق علم پر مبنی تھا، جس کا تعلق امورِ تجربیہ سے تھا، اس لئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا[۱]

بعض ایسے واقعات بھی ہیں جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے ان پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی

---

۱ اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہہ کرے کہ کیا علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حضرت ام سلمہ کو معلوم تھا، تو جواب یہ ہے کہ جس طرح شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی ان کو اس کا ذہول ہوجاتا ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل کو بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں، اس لئے ادھر توجہ انہوں نے نہیں کی اور شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کے علم میں خود اسی استاد کے فیض سے حاصل ہوئی تھی۔

صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، وہ انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو لینے نہ دیں، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا۔ قانون اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ جو زمین کوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دوسرے کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لیجائے لیکن آپ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ پہلے تم آب پاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو۔ یہ اخلاق کا ایک منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، تب آپ نے اخلاق کے بجائے قانون کا فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آب پاشی کر کے پانی کو روک لو، یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہونچ جائے[1]، یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسروں کے کھیتوں میں چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ انصاف فرمائیے، آپ نے فرمایا، اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اگر آپ اجازت دیجیے تو اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ نے ان کو روک دیا[2] اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے (یہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب الاقضیہ جلد ۲ ص ۱۷۶ [2] بخاری جلد اول ص ۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام

پیشینگوئی امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہونچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم وشفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل میں آئندہ بعد آنے والے خلفاء اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ واعزاز کے غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

سلسلہ سیرۃ النبی

جو معاملات پر بھی زیر تحریر تھی، اور اس کے کچھ ابواب لکھے جاچکے تھے کہ سید صاحب مرحوم پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا اور وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ، اور اس کی حسرت وہ اپنے ساتھ لے گئے، بقیہ چھ جلدیں جو ولادت، اور آپ کے اخلاق وشمائل، معجزات، منصب نبوت اور تعلیمات عبادات تھیں، وہ یہ ہیں:-

سیرۃ النبی کاسٹ

حصہ اول	ضخامت ۴۴۶ صفحے	قیمت	۲۰ - ۰
" دوم	" ۴۴۶ "		۱۴ - ۰
" سوم	" ۸۸۸ "		۲۸ - ۰
" چہارم	" ۹۰۶ "		۲۸ - ۰
" پنجم	" ۵۱۵ "		۱۵ - ۰
" ششم	" ۸۸۲ "		۲۸ - ۰

رصدگاہ محمد شاہی

یا

جنتر منتر

جناب شبیر احمد خان غوری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۳)

رصدگاہ کے کارکن نیڈھم کا یہ خیال کہ رصدگاہ دہلی کی ارصادی سرگرمیاں راجہ جے سنگھ[1] نے محض ہندو کارکنوں کی اعانت سے انجام دی تھیں، محل نظر ہے،

اس سلسلہ میں دو تین باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ اس وقت نہ صرف دار السلطنت دہلی، بلکہ اسلامی ہند کے قصبات تک میں مسلمان علماء کی ایک کثیر تعداد موجود تھی، جو منقولات (علوم دینیہ و ادبیہ) کے علاوہ معقولات میں بھی بشمول ریاضی و ہیئت کے ید طولیٰ رکھتے تھے مثلاً، دہلی میں احمد معمار کا خاندان تھا، جو معماری کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، ان میں سب سے بزرگ لطف اللہ تھے، جو سول انجینئرنگ میں اپنے تبحر اور ہندسہ و ہیئت سے غیر معمولی شغف کی بنا پر "لطف اللہ مہندس"[2] کہلاتے تھے، اور جنھوں نے شیخ بہاء اللہ عاملی کے خلاصۃ الحساب کی ایک مبسوط شرح کے علاوہ فنون ریاضیہ میں اور کئی کتابیں

---

[1] نیڈھم کی پوری عبارت اور اس کا ترجمہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے ملاحظہ ہو معارف فروری ۱۹۸۶ء رصدگاہ محمد شاہی دہلی ص ۱۰۹ [2] ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر الجزء السادس

لکھی تھیں، دوسرے فخر خاندان امام الدین تھے، جو ریاضی میں اپنی دستگاہ عالی کی بنا پر "ریاضی" تخلص کرتے تھے، وہ مختلف علوم اسلامیہ میں کوئی بائیس کتابوں کے مصنف تھے، جن میں کئی کتابیں فنون ریاضیہ پر تھیں، ان میں سب سے مشہور "تصریح" ہے جو شیخ بہاء الدین عاملی کے ہیئتی متن "تشریح الافلاک" کی شرح ہے، امام الدین ریاضی سے پہلے خلخالی نے ایران میں اور مولانا عصمت اللہ سہارنپوری نے ہندوستان میں اس کتاب کی شرح لکھی تھیں مگر قبول عام امام الدین ریاضی کی "التصریح" ہی کو نصیب ہوا جو آج کے دن تک مدارس عربیہ میں ہیئت کے نصاب میں داخل ہے یہی نہیں امام الدین ریاضی رصد گاہ کی تعمیر اور اس کے انتظام میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے شرح چغمنی پر حاشیہ لکھا تھا، اس میں رصد گاہ کی تعمیر و انتظام کی تفصیلی کیفیت قلمبند کی تھی، جس کا انھوں نے "التصریح" میں حوالہ دیا ہے، فرماتے ہیں:

"والرصد ...... هي بيه الموضع الذي يرصدون فيه ...... وإن افصحت بيان كيفية عمله في حاشيتي على شرح العلامة الرومي الملخص الجغمني على وجه التمام والكمال"[1]	رصد گاہ کا نام رصد گاہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں ہیئت دان ارصاد کا کام کرتے ہیں، یعنی مختلف ستاروں کو مختلف دوائر کے قطع کرنے یا متعین نقاط پر پہونچنے کا انتظار کرتے ہیں: میں نے اعمال رصدیہ کے طریق کار اور کیفیت کو پوری وضاحت کے ساتھ اپنے اس حاشیہ میں بیان کیا ہے جو میں نے شرح چغمنی پر لکھا ہے۔

---

[1] التصریح ص ۲۰۰-۲۰۲۔

مولانا امام الدین ریاضی نے ۱۱۴۴ھ میں وفات پائی، بالفاظ دیگر وہ راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہ کے قیام اور اس کی رصادی سرگرمیوں کے زمانہ میں بقید حیات تھے، اگرچہ بہت بوڑھے ہو چکے ہوں گے، کیونکہ انھوں نے ۱۱۳۰ھ میں التصریح کو تصنیف کیا تھا[18] لیکن اگر انھوں نے کاروبار رصد میں کوئی عملی حصہ نہ بھی لیا ہو تو کم از کم فنی اور ٹیکنیکل مشورے تو دے ہی سکتے ہوں گے۔

اس خاندان کے تیسرے رکن رکین مرزا خیر اللہ دہلوی تھے، ریاضی و ہیئت میں ان کی حذاقت و مہارت کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر فرماتے ہیں۔

الفاضل الكبير العلامة خير الله بن لطف الله المهندس الدهلوي احد العلماء المبرزين في الفنون الرياضية[19]

فاضل کبیر علامہ خیر اللہ بن لطف اللہ مہندس دہلوی، ریاضیاتی علوم کے ماہر متبحرین میں سے ایک تھے،

مرزا خیر اللہ کو ان علوم کے ساتھ اس درجہ شغف تھا کہ ان فنون کی کتابیں بغرض مطالعہ کے لیے انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں۔ ان میں سے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "المجسطی" رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے (فہرست قدیم، فن ہیئت نمبر)، انھوں نے ان فنون میں بہت سی کتابیں تصنیف کی تھیں،[20] جن میں سب سے اہم ہمارے پیش نظر موضوع کے نقطہ نظر سے، راجہ جے سنگھ کی مرتب کردہ "زیج محمد شاہی" کی شرح ہے [اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اس رصدگاہ کی سرگرمیوں میں شریک تھے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے]

خاندان مہندس کے ارکان کے علاوہ اٹھارویں صدی کی دہلی میں اسلامی ہیئت کے

[20] انھوں نے تقریب التحریر کے نام سے "تحریر المجسطی" کی ایک جامع شرح بھی لکھی تھی،

اور بھی ماہرین تھے، جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

ظاہر ہے تنگ نظر سے تنگ نظر متعصب بھی ایسے افاضل عہد وعباقرۂ روزگار کے اشتراک وعلمی تعاون سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

۲۔ یہ تو فطری امر ہے کہ غیر مذہب والوں کے مقابلے میں اپنے ہم مذہبوں کی طرف راجہ کا میلان خاطر زیادہ تھا، چنانچہ اس نے جوتش کے ایک ماہر کو بہت بڑی جاگیر دی تھی، جو بعد میں اس کے خاندان میں رہی اور ولیم ہنٹر صاحب جنھوں نے سب سے پہلے راجہ جے سنگھ کی ان ہیئتی مساعی کو یورپ میں متعارف کرایا، اس جوتشی کے پوتے سے ملے بھی تھے۔[۱] اور اس طرح اس رصدگاہ کے ہندو کارکنوں کو شہرت مل گئی جس سے مسلمان ہیئت دان محروم رہے، کیونکہ ہندو جوتشیوں کے خاندان کو تو ولیم ہنٹر صاحب نے ڈھونڈھ نکالا لیکن ہنٹر صاحب کو اہل اسلام کے ساتھ جو دلچسپی تھی وہ تاریخ کا ناقابل تردید علوم متعارفہ ہے، لہذا اگر ہم ان سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اس رصدگاہ کے مسلمان کارکنوں کے سلسلے میں بھی ایسی ہی زحمت فرمائیں گے تو یہ تکلیف مالا یطاق کا مصداق ہوگی۔

بہرحال ایک بات امر واقعہ ہے کہ بادشاہ وقت نے سوائی راجہ جے سنگھ کو حکم دیا تھا کہ وہ اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے فرقۂ اسلام کے ہندسین ومنجمین کو نیز جوتش کے ماہر پنڈتوں اور یورپی ہیئت کے واقف کار فرنگیوں کو جمع کرے اور ان سب معاونین کی مدد سے کاردبار رصد کو ختم کر کے نئی زیچ مرتب کرے، خود راجہ لکھتا ہے۔

"فرمودند کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندسان ومنجمان فرقۂ اسلام وبرہمنان ودانایان فرنگ جمع نمودہ وآلات رصدی ساختہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سعی نماید"[۲]

---

[۱] Tod, Rajasthan, Vol II P. 290 Foot note

[۲] زیچ محمد شاہی ورق ۲

بہرحال راجہ متعصب و تنگ نظر بھی تھا، تو کیا وہ اس حکم سلطانی کی بجا آوری میں کوئی تغافل و تساہل برت سکتا تھا؟

۳۔ ان قرائن سے قطع نظر تاریخ نے اس رصدگاہ کے دو مسلمان کارکنوں کا ذکر محفوظ رکھا ہے، ان کے نام ہیں، مرزا خیر اللہ اور مولانا محمد عابد دہلوی۔

چنانچہ صاحب "سیر المتاخرین" نے معصوم طور پر لکھا ہے کہ ہر چند یہ رصدگاہ راجہ جے سنگھ والی کی کوشش کے نتیجہ میں تعمیر ہوئی تھی، مگر اس کی رصدی سرگرمیاں ان دونوں فاضلوں (مرزا خیر اللہ اور مولانا محمد عابد) کے زیر اہتمام انجام پائی تھیں، وہ رجب ۱۱۵۵ھ (مطابق سن بست و پنجم جلوس محمد شاہی) کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"و درہمین ماہ و سال قران علویین در آخر برج اسد موافق زیچ جدید کہ بسعی راجہ جے سنگھ کچھواہہ و اہتمام مرزا خیر اللہ و شیخ محمد عابد بعضے در عہد محمد شاہ پیرایہ آغاز و انجام یافتہ، و در اول سنبلہ موافق زیچ الغ بیگی واقع شد"[1]

ان فاضلوں کا تفصیلی تذکرہ مولانا عبد الحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء نے "نزہۃ الخواطر" میں قلمبند ہے۔

اول الذکر کے بارے میں صاحب "نزہۃ الخواطر" فرماتے ہیں۔

مرزا خیر اللہ الدہلوی، الفاضل	مرزا خیر اللہ دہلوی، فاضل کبیر علامہ خیر اللہ
الکبیر العلامۃ خیر اللہ بن لطف	بن لطف اللہ المہندس دہلوی مخصوص
المہندس الدہلوی احد العلماء	ریاضیات کے علمائے مبرزین میں سے تھے

۱؎ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور جلد سوم صفحہ [illegible] ذکر سوانح سال پنجاہ و پنجم از مائۃ دوازدہم ہجری نبوی کہ سال بست و پنجم جلوس محمد شاہی است۔

المبرزین فی الفنون الریاضیة تولی الرصد بمدینة دهلی لسنة احدی وثلاثین ومائة والف فی ایام محمد شاه الدهلوی وصنف التصانیف النافعة فی الزیج والتقویم منها شرح زیج المحمد شاهی قد ابدع فیه واجاد وخالف القدماء فی بعض المسائل۔[1]

(نزهة الخواطر۔ ۶-۵۱)

بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۳۱ھ میں شہر دہلی کے اندر رصدگاہ میں مقرر ہوئے۔ انھوں نے زیج اور تقویم کے موضوع پر مفید تصانیف مرتب فرمائیں، انھیں میں سے شرح زیج محمد شاہی ہے، انھوں نے اس میں بہت سی نئی تحقیقات لکھی ہیں، اسے بڑے اچھے طریق پر تصنیف کیا ہے، اس کتاب کے اندر بعض اہم مسائل میں قدیم ہیئت دانوں سے اختلاف کیا۔

اس کے بعد انھوں نے ان منفردات میں سے ایک مسئلہ کا ذکر کیا ہے کہ قدیم ہیئت دانوں کا خیال تھا کہ آفتاب اور اسی طرح دوسرے سیارات کے مدار مدور ہیں، مگر مرزا خیراللہ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ نہیں یہ مدار "بیضی" (Ellipse) ہیں کیونکہ انھیں دائرہ مانکر جب سیاروں کی تقویم کا حساب لگایا جاتا ہے، تو وہ "مرصود" (مشاہدات) کے مطابق نہیں آتا، لیکن اگر مدارات کو بیضی مانیں تو محسوب اور مرصود ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں، اس کی تفصیل "تاریخ بہادر خانی" کے حوالے سے اوپر مذکور ہو چکی ہے۔[2]

دوسرے فاضل مولانا محمد عابد دہلوی کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

۱۱۹۔ مولانا محمد عابد الدهلوی۔ الشیخ الفاضل محمد عابد المهندس الدهلوی۔

۱۱۹۔ مولانا محمد عابد دہلوی، فاضل شیخ محمد عابد دہلوی جو (بہت بڑے) مہندس تھے،

۱۔ نزہۃ الخواطر۔ الجزء السادس ص ۱۵ ۲۔ تاریخ بہادر خانی ص ۹۰۹

احد العلماء المبرزين فی العلوم الحکمیة۔ ولاه محمد شاه على الرصد الذی بناه بدهلی. وله مصنفات عدیدة۔ منها رسالة فی استخراج الاوساط العلویة فی فن الهیئة[1]

علوم حکمیہ کے مشہور باکمال علماء میں سے ایک تھے، بادشاہ محمد شاہ نے انھیں اُس رصدگاہ میں مقرر کیا تھا، جسے اُس نے دہلی میں بنایا تھا، انھوں نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں، ان میں سے ایک ان کا رسالہ "فی استخراج اوساط العلویہ" ہے جو فن ہیئت میں ہے

ان تصریحات کے بعد جوزف نیڈہم کے اس قول پر کہ

"راجہ جے سنگھ ہندو تھا جس نے ہندو رفقائے کار کی مدد سے رصدگاہ کا کام انجام دیا"

کسی مزید تبصرہ حاجت نہیں رہتی۔

تعمیر رصدگاہ کے مصارف الغ بیگ کی رصدگاہ کی جودت ونفاست کا ایک سبب یہ تھا کہ اُس نے اس پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا تھا، بالخصوص آلات رصدیہ کی تیاری میں[2]، اور رصدگاہ دہلی کی عظمت بھی بادشاہ محمد شاہ کی فیاضی و فراغ دلی کی رہین منت ہے، اس رصدگاہ پر تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا، جو اس زمانہ کے لرزاں معاشی حالات کو دیکھتے ہوئے غیر معمولی طور پر کثیر رقم ہے، چنانچہ صاحب نزہۃ الخواطر بادشاہ محمد شاہ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"ومن مآثره انه جمع علماء عصره من اقطار مملکته وامرهم بان یصنعوا الآلات الرصدیة و

بادشاہ محمد شاہ کے مآثر میں سے ایک یہ واقعہ ہے کہ اُس نے اپنے زمانہ کے علماء کو مملکت کے مختلف حصوں سے طلب کرکے

[1] نزہۃ الخواطر۔ الجزء السادس صفحہ ۳۲ [2] گستاؤلی بان۔ تمدن عرب ص ۲۲۲

أن يقيسوا بها الكواكب ويتعرفوا أحوالها ففعلوا ذلك وتولى الرصد بمدينة دهلي وجيبور وبنارس تحت نظارة جي سنگھ صاحب جيبور۔ وبذل لذلك محمد شاه ثلاثين مائة ألف (ثلاثة ملايين) من النقود۔ فأدرك بعض ما لم يدركه القدماء من الراصدين وصنفوا الزيجات أشهرها الزيج المحمد شاهي۔[1]

جمع کیا اور انھیں حکم دیا کہ آلات رصدیہ تیار کر کے ان کی مدد سے کواکب کی سیر وگردش کی پیمائش کریں اور ان کے دیگر حالات دریافت کریں، بادشاہ نے دہلی، جے پور، بنارس (وغیرہ) میں جے پور کے راجہ جے سنگھ کے زیر انتظام رصد گاہیں تعمیر کرائیں اور ان پر تیس لاکھ (تین ملین) روپیہ خرچ کیا، یہاں کے کارکنوں نے بعض ایسی باتیں دریافت کیں جنھیں قدیم ہیئت دان دریافت نہیں کر سکے تھے، انھوں نے کئی زیجیں تصنیف کیں جن میں سب سے زیادہ مشہور زیج محمد شاہی ہے۔

تحقیق وتدقیق کا اہتمام | جے سنگھ ہوں یا الغ بیگ حاذق ہیئت دان تھے، عبقری روزگار فلکیات نہیں تھے، نظری علم الہیئت کی ترقی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، انھوں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا، ابتکار فکر کے اظہار کے بجائے انھوں نے عملی (پیمائشی) ہیئت ہی پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز رکھا، اور سیر وگردش کواکب کی پیمائش کی صحت ہی ان کا منتہائے نظر رہا۔ یہ مقصد آلات رصدیہ کے اتقان صنعت کا متقاضی تھا، اور ان کی مساعی جمیلہ (بلکہ اسلامی ہیئت کی پوری تاریخ ہی) آلات رصدیہ کی تیاری میں خوب سے خوب کی تلاش مسلسل کی داستان ہے، ان کوششوں کا کچھ ذکر دونوں کی رصد گاہوں کے ضمن میں آ چکا ہے۔

[1] نزہۃ الخواطر، الجزء السادس ص ۲۰۵

بہرحال رصدگاہ جے سنگھ کی تیاری اور کارکردگی پر انتہائی فراخدلی سے رقم کثیر صرف کی گئی، علم ہیئت کے ماہرین خصوصی نے اس کے اندر اپنی مہارت و دستگاہ عملی کا ثبوت دیا، اور اس کے سربراہ کا مقصد وحید از اول تا آخر سیر و گردش کواکب کی صحیح پیمائش کا التزام و اہتمام بہا ظاہر ہے، ایسی رصدگاہ کی دریافتیں کس درجہ اقرب الی الصحۃ ہوں گی۔

صحت پیمائش کے باب میں کارکنان رصدگاہ کی کاوشوں کی پوری تفصیل کی موجب تطویل ہوگی، اس سلسلہ میں "زیج محمد شاہی" کے قابل اعتماد نسخوں کی عدم دستیابی ہے، میرے پیش نظر مولانا آزاد لائبریری کے یونیورسٹی کلکشن کا نسخہ ہے، اس میں شہر اجین کا عرض بلد "لحـ ل" دیا ہے جو غالباً ۲۳-۳۰ دقیقہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے میرے پڑھنے میں اور نقل کرنے میں غلطی ہو رہی ہو، مگر کسی صورت سے بھی پہلا عدد "لح" (۲۳) اور دوسرا "ی" یا "ے" (۱۰) نہیں ہو سکتا۔ لیکن ٹاڈ نے لکھا ہے کہ راجہ نے شہر اجین کا عرض البلد ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقہ شمالی دریافت کیا تھا، جو ہنٹر کے دریافت کردہ ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقہ ۲۴ ثانیہ کے بقدر سہو تقریباً اختلاف رکھتا ہے، ظاہر ہے یہ بات یا تو ٹاڈ نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے مضمون سے جو اس نے ۱۷۹۹ء میں راجہ جے سنگھ کی رصدگاہوں کے متعلق لکھا تھا، یا اس کی یادداشتوں سے نقل کی ہے، یا خود بنفس نفیس "زیج محمد شاہی" کا کوئی قابل اعتماد نسخہ ان کے پیش نظر ہوگا، اور ہنٹر نے جے پور کا سفر کیا تھا، وہ ایک باوقار، صاحب اقتدار برطانوی آفیسر تھا، ریاستی کتب خانہ جس میں لکھی ہوئی "زیج محمد شاہی" کا اصل نسخہ بھی ہو، پوری طرح اس کی دسترس میں تھا، ان وجوہ کی بنا پر میں یونیورسٹی کلکشن کے نسخہ کی قرات کے مقابلہ میں ٹاڈ کی عبارت کو ترجیح دیتا ہوں۔

Tod: Rajasthan, Vol II P 290. ل

ہذا سطور ذیل میں ان کی چند پیمائشی مساعی جن کی دوسرے مصادر سے تصدیق ہو چکی ہے، کا ذکر کیا جا رہا ہے،

ان میں سب سے اہم میل کلی Obliquity of The Ecliptic ہے جو قدیم زمانے سے عہد حاضر تک پیمائشی علم الہیئت کا بڑا دلچسپ مشغلہ رہا ہے،

میل کلی نام ہے اس زاویہ کی مقدار کا جو معدل النہار Celestial Equator اور منطقۃ البروج (Ecliptic) کے تقاطع سے پیدا ہوتا ہے یا دائرہ مارہ بالاقطاب اربعہ کی اس قوس کا جو معدل النہار اور منطقۃ البروج یا ان کے ایک جانب کے قطبوں کے درمیان ہوتی ہو۔

قدیم ہند و ہیئت دانوں کے نزدیک یہ مقدار ۲۴ درجہ تھی اور یہی بطلیموس کے زمانے تک حکمائے یونان کا معمول بہ تھی، چنانچہ ابوریحان البیرونی "قانون مسعودی" (مقالہ رابعہ) میں کہتا ہے۔

الباب السابع في مقدار	باب چہارم: معدل النہار کے منطقۃ
زاوية تقاطع معدل النهار	البروج کے ساتھ تقاطع سے جو زاویہ
مع منطقة البروج وهو	بنتا ہے اس کی مقدار کے بارے میں
الميل الاعظم	اور وہی میل اعظم (میل کلی) ہے ...
فان مقدار هذا الميل	...... اس میل اعظم کی مقدار
الذي يقدره القدماء الحذاق	جو اس زاویہ کی پیمائش ہے جو معدل
من تقاطع معدل النهار	النہار اور منطقۃ البروج کے تقاطع
ومنطقة البروج، فاتفاق	سے پیدا ہوتا ہے تو دو حکماء ہند کے

فرق المهندس فيه على انه
اربع وعشرون جزءا
وكان هذا في القدماء
رايا شائعا[1]

زاویوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق ۲۴
درجہ ہے۔ اور یہی اسے قدیم حکمائے
یونان میں شائع و ذائع تھی (اقلیدس
کے زمانہ تک)

اور اسی وجہ سے اقلیدس نے اپنی "اصول الہندسہ والحساب" کے چوتھے مقالہ میں مخمس منتظم (پانچ برابر ضلعوں زاویوں والی شکل (Regular Pentagon) کے بنانے کا قاعدہ لکھا۔ البیرونی لکھتا ہے۔

فان ايرن الجاثليق يقول
في حل شكوك كتاب الاصول
ان اقليدس انما استخرج
في المقالة الرابعة ذا الخمسة
اضلاع في الدائرة ....
الى هذا مقدار الميل الاعظم[2]

کیونکہ ایرن جاثلیق (Heron - The Mechanics)
اپنی کتاب حل شکوک اقلیدس میں کہتا ہے
کہ اقلیدس نے کتاب الاصول کے چوتھے
مقالہ میں دائرہ کے اندر مخمس منتظم بنانے
کا قاعدہ لکھا ہے . . . . اور یہی میل
اعظم کی مقدار ہے۔

لیکن بعد میں جب ریاضیاتی و پیمائشی علم الہیئت نے ترقی کی تو اس مقدار (۲۴ درجہ) میں تدقیق کا سلسلہ شروع ہوا چنانچہ حسب تصریح البیرونی ابرخس، اراطیاس اور بطلموس کے نزدیک یہ مقدار ۲۳ درجہ ۵۱ دقیقہ تھی[3]۔

اس کے بعد مسلمانوں کا زمانہ آیا، خلیفہ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں کتاب المجسطی کا ترجمہ ہوا،

---

[1] قانون مسعودی جلد اول ص ۳۶۴ [2] ایضاً ص ۳۶۶ [3] ایضاً ص ۳۶۷

نیز عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ جندی سابور میں قائم ہوئی جس کے ارصادات "الزیج المشتمل" میں قلمبند ہوئے۔ مگر اس فارسی کی مدت کے علاوہ اس کے محتویات کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

البتہ جب خلیفہ مامون کے حکم سے ۲۱۳ھ (مطابق ۸۲۸ء) میں بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں قائم کی گئیں تو میل کی پیمائش بھی کی گئی۔ یحییٰ بن ابی منصور نے جو رصدگاہ مامونی کا سربراہ تھا، اور اس سے پہلے مرو کی ارصادی سرگرمیوں کا بھی نگران رہ چکا تھا، اس کی مقدار ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ بتائی۔

اس کے رفقائے کار میں خالد بن عبدالملک المروزی نے ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ ۵۲ ثانیہ اور سند بن علی نے ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ ۵۰ ثانیہ (یا ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ ۲۰ ثانیہ) دریافت کی۔[1]

(لیکن قاضی زادہ نے شرح چغمینی میں رصدگاہ مامونی کی دریافت ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ بتائی ہے[2]

مامونی رصدگاہ کے بعد اہم اور قابل ذکر رصادی سرگرمیاں بنوموسیٰ کی تھیں، انھوں نے دو رصدگاہیں قائم کی تھیں، ایک بغداد میں دوسری سامرا میں۔ رصدگاہ سامرا میں یہ مقدار ۲۳ درجہ ۳۴ ½ دقیقہ اور بغداد کی رصدگاہ میں ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ متعین کی۔[3] مگر متاخر ہیئت دانوں نے اسی دوسری مقدار کے ساتھ اعتنا کیا، چنانچہ قاضی زادہ رومی کہتے ہیں:۔

"وھی نہایۃ میل دائرۃ البروج عن معدل النہار، ومقدارها [illegible] -
اے ثلث وعشرون جزءاً وخمس وثلثون دقیقۃ علی ما وجدہ [illegible]
المامون وبعض بنی موسیٰ بعدھا"

---

[1] تا [3] قانون مسعودی جلد اول ص ۶۰۶ [4] شرح چغمینی ص ۵۵

(میل کلی دائرۃ البروج کے معدل النہار سے انتہائی فاصلہ کا نام ہے۔ اس کی مقدار
کم ہے یعنی ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ جو بغداد کی رصدگاہ اور اس کے بعد دوسری
رصدگاہوں کی دریافتوں کے مطابق)

اسی زمانہ میں خراسان کی طاہری حکومت کے زیر سرپرستی نیشاپور میں ایک نئی رصدگاہ قائم ہوئی جس کا سربراہ احمد بن علی کی تھا۔ اس نے اس رصدگاہ میں میل کلی کی مقدار ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ دریافت کی اور یہی مقدار طاہری امیرزادہ منصور بن طلحہ کی بھی دریافت تھی۔

تیسری صدی ہجری کی آخری چوتھائی میں سلیمان بن عصمہ بلخی کی رصدگاہ میں فلکی مشاہدات کرتا نظر آتا ہے۔ اس نے اختلاف منظر کے ذریعہ انقلاب صیفی اور انقلاب شتوی کے موقع پر ارتفاع آفتاب کی جو پیمائش کی وہ بغیر تعدیل کے ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ نکلی مگر جب تعدیل کی تو یہ مقدار ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ ۴۴ ثانیہ برآمد ہوئی۔

چوتھی صدی کے آغاز میں بویہی وزیر ابوالفضل بن العمید نے جو انتظام حکومت کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں بھی دستگاہ عالی رکھتا تھا، شہر رے میں میل کلی کی مقدار دریافت کی، مگر البیرونی لکھتا ہے کہ چونکہ اس کے آلات رصدیہ میں کچھ خرابی تھی، اس کی وجہ سے یہ مقدار غیر معمولی طور پر بڑھ گئی، یعنی ۲۳ درجہ ۴۰ دقیقہ نکلی۔

اس سے پہلے البتانی نے بھی اس کا تجربہ کیا تھا اور اسے ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ پایا۔ یہی مقدار بعد میں عبدالرحمن الصوفی نے شیراز میں اور ابوالوفا البوزجانی اور ابو حامد الصاغانی نے بغداد میں رصدگاہ شرف الدولہ کے اندر پائی۔ اسی زمانہ میں ابو محمود خجندی نے رے میں مشہور آلہ سدس فخری کا موجد ہے، رے کے اندر اس مقدار کو ۲۳ درجہ ۳۲ دقیقہ دریافت کیا۔

البیرونی لکھتا ہے کہ خجندی نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ ایک انقلاب (Solstice)

کے موقع پر آلۂ رصدی خراب ہو گیا تھا۔

اپنے پیشروؤں کے ارصادات کے بعد البیرونی اپنے ارصاد کا ذکر کرتا ہے، اس نے یہ تجربہ پہلے ۱۰۱۶ء میں خوارزم میں کیا تھا جب کہ وہ جوان تھا، یہ مقدار ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ نکلی اس کے بیس سال بعد اس نے یہ تجربہ جرجانیہ میں کیا۔[1]

رصدگاہ مراغہ میں جو محقق طوسی کی زیر نگرانی کام کر رہی تھی حسب تصریح مولانا عبد العلی برجندی یہ مقدار ۲۳ درجہ ۳۰ پائی گئی۔

عہد کی آخری رصدگاہ سمرقند میں الغ بیگ نے قائم کی۔ اس نے میل کلی ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ ۱۷ ثانیہ پایا چنانچہ اپنی زیج میں کہتا ہے،

"باب چہارم در معرفت میل اجزاء فلک البروج از معدل النہار . . . میل کلی برصد ما کہ ک ل یز است۔"[2]

یہی مقدار مولانا امام الدین ریاضی نے "تصریح" میں بتائی ہے،

واقصر قوس بینهما دبین	ان دونوں دائروں (معدل النہار
قطبیهما هو المیل الکلی	اور منطقۃ البروج) کے درمیان یا
وهو بالرصد الجدید الذی	ان کے ایک جانب کے قطبوں کے
تولاه افضل المهندسین	درمیان اقصر قوس ہی میل کلی (کی
میرزا الغ بیگ بسمرقند	مقدار) ہے اور از روئے رصد جدید
کج ل یز ای ثلثة عشرون	جس کا سر انجام افضل المہندسین
درجة وثلثون وسبع عشر	مرزا الغ بیگ نے سمرقند میں کیا تھا

---

۱ قانون مسعودی جلد اول ص ۳۶۴ و ما بعد ۲ زیج الغ بیگ ورق ۵۵ ۱

ثانیہ ہے[1] اس کی مقدار کل یہ ہے یعنی

۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ اور ۱۱ ثانیہ

پیش نظر تھا اس باب میں ہمارے زمین الذکر کی ارصادی سرگرمی کا۔ اس نے ۲۳ درجہ ۲۸ دقیقہ قرار دیا، چنانچہ "زیچ محمد شاہی" کے دوسرے مقالے کے تیسرے باب میں لکھتا ہے: "میل کلی برصد متقدمین کہ ل ید و فرنگیان کہ لح ما بعد لیکن تمام کہ یافتہ ایم"[2]

(زیچ محمد شاہی کے نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں از روے رصد فرنگیاں یہ مقدار کح لا یعنی ۲۳ درجہ ۳۱ دقیقہ بتائی ہے، ممکن ہے کح کہ ہو یعنی ۲۳ درجہ ۲۸ دقیقہ (باسقاط ثوانی) کیونکہ ٹاڈ لکھتا ہے کہ اگلے سال یورپی ہیئت دان نے میل کلی کی جو مقدار دریافت کی وہ جے سنگھ کی مقدار سے صرف ۲۰ ثانیہ کا تفاوت رکھتی تھی]

یہ عمل راجہ کی حذاقت فنی کا پہلا ثبوت تھا جس سے علمائے یورپ متاثر ہوئے۔

بعد میں جب ولیم ہنٹر نے ۱۷۹۳ء میں اجین کا عرض البلد دریافت کیا تو اسے بھی راجہ جے سنگھ کے دریافت کردہ عرض البلد سے بہت قریب پایا، صرف ۲۴ ثانیہ کا فرق نکلا اور اس کا بھی ہنٹر کو یقین نہیں ہے۔ راجہ کا دریافت کردہ عرض البلد ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقہ شمالی تھا، ڈاکٹر ہنٹر کے ارصاد کے مطابق یہ ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقہ ۲۴ ثانیہ شمالی تھا، مگر ہنٹر اپنی دریافت پر کلیتاً اعتماد نہیں کرتا، اس کے خیال میں اس کے اندر ۱۵ ثانیہ تک کی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔[3]

(آئین اکبری مرتبہ سرسید احمد خاں کی رو سے اجین کا عرض البلد ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ شمالی ہے۔[4])

---

[1] تفصیل کے لئے ۲۲ [2] زیچ محمد شاہی ورق ۵ [3] Tod: Rajasthan vol. II P. 258

[4] آئین اکبری جلد سوم ص ۳۰۶

زیج محمد شاہی نسخہ یونیورسٹی کلیکشن کی رو سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا یہ عجیب سی" جو یقیناً غلطی کتابت کا نتیجہ ہے۔

مولوی غلام حسین جونپوری نے "جامع بہادر خانی" میں کچھ اور تقابلی اعداد اس کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سال شمسی کی مدت[1]۔

ابرخس اور بطلیموس کے نزدیک شسہ یہ لہ ہے، (۳۶۵ دن ۱۴ گھڑی اور ۴۳ دقیقہ)

زیج الغ بیگ کی رو سے سہ یہ ند ل ہے (۳۶۵ دن ۱۴ گھڑی ۵۸ دقیقہ ۳۰ ثانیہ)

اور زیج محمد شاہی کے مطابق شسہ یہ لا لو ک (۳۶۵ دن ۱۴ گھڑی ۳۱ دقیقہ ۳۶ ثانیہ ۲۰ ثالثہ) اسی طرح آفتاب کی شبانہ روز میں حرکت وسطی[2]۔

ابرخس وبطلیموس کے نزدیک بانطباع زیج کا ببع لا ۵۹ دقیقہ ۸ ثانیہ ۱۷ ثالثہ ۱۳ رابعہ ۱۲ خامسہ ۳۱ سادسہ

زیج الغ کی رو سے بانطباع نط ما ذ ز ۵۹ دقیقہ ۸ ثانیہ ۱۰ ثالثہ ۴۹ رابعہ۔

اور زیج محمد شاہی کے مطابق بانطباع نط مول ۵۹ دقیقہ ۸ ثانیہ ۹ ثالثہ ۴۹ رابعہ ۲۰ خامسہ۔

تصنیف مصنف کی نظر میں | الغ بیگ اور ملافرید منجم زیج شاہجہانی کو اپنے پیش رو زیجوں پر تبصرہ کرنے کے لیے مبصر مل گئے مگر زیج محمد شاہی کو کوئی تبصرہ نگار نہیں ملا یا ہم تک کسی کا تبصرہ نہیں پہونچا۔

مثلاً۔ زیج الغ بیگ کے بارے میں دولت شاہ لکھتا ہے:

---

[1] جامع بہادر خانی [2] ایضاً

"و الیوم نزد حکماء آن زیج متداول و معتبر است و بعضے آن را بر زیج نصیری ایلخانی ترجیح می کنند"۔[1]

اسی طرح ملا فرید منجم کی "زیج شاہجہانی" کے بارے میں محمد صالح کنبوہ رقمطراز ہے:

"ملا فرید منجم کہ در تحصیل فن ریاضی . . . . ریاضت تمام کشیدہ بود . . . .
کتاب زیج شاہجہانی . . . . بہمراہی برادر خود ملا طیب و سایر ریاضی دانان روشن ہند و یونان باتمام رسانیدہ بود . . . . . اصول و ابواب این کتاب حسابی متضمن فوائد بے شمار و منافع بے حساب بود و ضوابط و قواعدے کہ باعث سہولت استخراج و آسانی عمل باشد در طے آن اندراج پذیرفتہ. چنانچہ بالفعل اہل این فن از زیجہائے دیگر مستغنی شدہ استخراج تقاویم ازین کرامت نامہ [illegible] می نمایند"۔[2]

مگر زیج محمد شاہی کے بارے میں ایسی کوئی تقریظ نہیں ملتی، صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے مآثر الامراء میں صرف اسی قدر لکھا ہے۔

"بیرون بلدۂ مذکور (جے نگر یا جے پور) و بلدۂ شاہجہان آباد و بر دو جا مبلغ کلی صرف نمودہ کارخانۂ رصد برپا ساخت، چون برائے اتمام کار رصد سی سال (کہ مدت تمام دورۂ زحل است) می باید و شمع زندگیش پیش از آن خاموش گردید عمل رصد ناتمام ماند"۔[3]

غالباً یہ "شرح [illegible]" جزو ہے۔

---

[1] دولت شاہ، تذکرۃ الشعراء ۲۴۲، [2] ملا محمد صالح کنبوہ عمل صالح ص ۳۶۱
[3] مآثر الامراء جلد دوم ص ۵۸۳

بہرحال راجہ اپنی کارگزاری سے خود مطمئن تھا، اور غالباً نازاں بھی، الغ بیگ اپنی زیچ کے آخر میں معذرت خواہ ہے اور حکمہ کوتاہیوں کا معترف اور

"ملتمس از محاسن شیم و بدائع کرم بزرگان صدر نشین و حکمائے خردہ بین آنکہ حون بر سہوے و خطائے کہ در انسان صیغۂ لازمی است، اطلاع یابند بقلم مشکبار و خامہ گوہر نگار آنچہ قابل اصلاح بود تصحیح فرمایند و آنچہ از حد تقدیم و تعدیل خارج باشد بذیل عفو ملبوس دستور دارند و عاذر باشند نہ عاذل و ساتر معائب نہ مظہر مثالب تا کسوت حال ایشان بطراز الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین هداهم اللہ واولئک هم اولوا الالباب معلم گردد۔ فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ"[۱]

لیکن راجہ کی خود اعتمادی اس رسمی معذرت کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی، وہ اعلان کرتا ہے:-

"زیچے بنام نامی حضرت ظل الٰہی مشتمل بر اصوب طرق و احسن وجوہ درست کردہ شد کہ بدان استخراج تقاویم و رویت اہلہ و کسوفات و خسوفات و قرانات نماینہ اقرب بتحقیق باشد، چنانچہ الیعنی بالفعل در رصد خانہ شاہجہاں آباد وہ بین فی شہود۔"[۲]

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

---

[۱] زیچ الغ بیگی۔ ورق ۲۰ الف ب۔ [۲] زیچ محمد شاہی ورق ۲ ب

حکمائے اسلام حصہ اول و دوم

حصہ اول ۵۰۲ صفحے قیمت ۱۵-۷۵ حصہ دوم ۴۵۱ صفحے ۱۰-۹۵

نعت قدسی اور اس کا مصنف سلہ

از ڈاکٹر سیمّ الدین احمد ریڈر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اپریل [illegible] کے معارف میں جناب کالی داس گپتا صاحب رضا (بمبئی) کا مقالہ بعنوان "غزل قدسی در نعت سرورؐ" جو میرے مضمون "نعت قدسی اور اس کی مقبولیت" (معارف دسمبر [illegible]) کے جواب میں شائع ہوا ہے، نظر سے گذرا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے ایک خالصۃً علمی اور ادبی بحث کو جس کے پیش کرنے میں میں نے بہت محتاط اور متوازن روش اختیار کی ہے، ایک قسم کے مناقشہ کا رنگ دے دیا ہے، میں نے موضوع اور نفس مسئلہ کو بالکل تحقیقی اور علمی نقطۂ نظر سے لکھا ہے، اور مضمون کے ابتدا ہی میں لکھ دیا ہے کہ:۔

"مندرجہ ذیل اسباب اور قرائن کی روشنی میں شاعر کے نام کے ساتھ اس نعت کا انتساب مشتبہ اور مشکوک ہے"

نیز مقالہ کے اختتامیہ جملے ملاحظہ ہوں:۔

"ہمیں امید ہے کہ ان سطور سے جو پیش کی گئیں، نعت قدسی کی تصنیف اور اسکے مصنف اصلی کے تعین میں کسی حد تک مدد مل سکے گی"

سلہ: یہ نظر مقالہ کئی ماہ پہلے مکمل و مرتب ہو چکا تھا، لیکن چند مجبوریوں اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اسوقت بغرض اشاعت ارسال نہ کیا جاسکا۔ تاخیر کے لیے راقم معذرت خواہ ہے۔

قدسی کی نعت یا غزل سے متعلق مختصراً میرے دو بنیادی معروضات ہیں :۔

(۱) اول تو یہ کہ قرائن اور شواہد کی روشنی میں یہ قدسی مشہدی کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی ،

(۲) دوسرا معروضہ یہ ہے کہ چونکہ گزشتہ صدی کے بالکل اواخر میں ایک مطبوعہ مجموعہ قصائد میں صراحت کے ساتھ اس کی نسبت ایک شاعر قدسی دہلوی سے قائم کی گئی ہے لہذا یہ امکانی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ اسی مؤخر شاعر کا نتیجۂ فکر ہو،

میرے پہلے معروضہ کی تردید میں اگرچہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ گپتا صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ یہ نعت قدسی مشہدی ہی کی ہے، لیکن ان کے چند اضافی بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کو اسی شاعر (قدسی مشہدی) کا نتیجۂ فکر سمجھتے ہیں، اس خیال کے تحت انھوں نے اپنے معروضات کے ثبوت میں حسب ذیل بیانات پیش کئے ہیں جن کا جائزہ میں سلسلہ وار دینا چاہتا ہوں :۔

۱۔ موصوف (ص ۵۰۳ پر) رقمطراز ہیں کہ :۔

" قدسی کے بعد دہلوی لکھنا غلطی سہو کاتب ہے "

یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ سہو کاتب سے گپتا صاحب کی کیا مراد ہے، سہو کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، یا تو کاتب نے لفظ " دہلوی " کا اضافہ اپنی جانب سے کر دیا، جدت تحریر اور رعقل رساجس کی عام طور سے اس سے توقع نہیں کی جاتی، دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مشہدی کے بجائے غلطی سے " دہلوی " معرض تحریر میں آگیا ہو، لیکن اس کا بظاہر امکان نہیں اس لئے کہ املا کے اعتبار سے مشہدی اور دہلوی میں بہت فرق ہے ۔

یہ تو سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ کاتب حضرات حروف اور الفاظ میں تحریفات اور تصحیفات کرتے رہتے ہیں، مثلاً جان کو خان لکھ دیا یا پشیمان، کو پشیبان، لیکن اپنی طرف سے الفاظ کا اضافہ کر دینا عام طور سے سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا، لہٰذا دہلوی کے لفظ کا یہ اضافہ سہو کاتب کیسے ہوسکتا ہے، بہرحال اگر پہلی صورت حال مراد ہے تو کاتب کا از خود دہلوی کی نسبت اس شاعر کے نام کے ساتھ جوڑ دینا جس کے بارے میں وہ گپتا صاحب کے خیال کے مطابق خود مولف صحیفۂ قدسی حاجی شمشیر علی کی واقفیت صفر کے برابر تھی، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے،

اسی نکتہ کے ذیل میں گپتا صاحب کے بیانات میں صریحی تضاد ملاحظہ ہو، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، ایک طرف تو وہ پورے وثوق کے ساتھ قدسی کے بعد دہلوی لکھنے کو قطعی سہو کاتب" لکھتے ہیں دوسری جانب یہ فرماتے ہیں کہ "بالفرض حاجی صاحب (یعنی حاجی شمشیر علی مرتب صحیفۂ قدسی) نے قدسی کو جان بوجھ کر دہلوی لکھا بھی ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہ خیال کارفرما ہوسکتا ہے کہ قدسی شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھا، اور اس دربار سے ملک الشعرا کا خطاب اول اس نے پایا تھا"

---

۱ گپتا صاحب نے لکھا ہے کہ اگر محمد جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو یہ انکی عدم واقفیت ہے چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے، اسی لئے انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ قدسی حاجی بھی تھے، لہٰذا انھوں نے احتراماً مولانا لکھدیا،

۲ یہ جان بوجھ کر کا فقرہ قارئین کی خصوصی توجہ کا طالب ہے،

۳ شاہجہاں کے دربار دہلی سے منسلک ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ مشہدی ہی کہلاتا آیا ہے نہ کہ دہلوی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دو بیانوں میں سے کسی کو قبول کیا جائے یا کسی کو بھی نہیں، اس سلسلہ میں خود گپتا صاحب کا ذہن صاف نہیں، ورنہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں،

مزید یہ کہ اس سلسلہ میں حاجی صاحب کے خیال کی کارفرمائی اور دہلوی کی تاویل جو گپتا صاحب نے کی ہے، دونوں غلط ہیں، شاید گپتا صاحب کو علم نہیں کہ قدسی مشہدی سرے سے دربار شاہجہانی کا ملک الشعرا ہوا ہی نہیں، نہ اول نہ آخر۔

معاصر مورخ محمد صالح کنبو لاہوری صاحب عمل صالح نے اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے، ابو طالب کلیم کی دربار شاہجہانی میں رسائی اور ملازمت اور ملک الشعرا کا عہدہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ۔

"و بعد از جلوس مبارک ملازم سرکار خاصہ شریفہ گشتہ، بہ تحریک بخت کاملش چوں گفتارش ہوش فریب و دل آویز و طبعش معنی رس و فیض آموز بود بہ خطاب ملک الشعرا امتیاز یافت اگرچہ استحقاق آں منصب جلیل القدر حاجی محمد جان قدسی داشت اما ازیں رو کہ پیش از رسیدن حاجی، او بہ این خطاب سرافرازی یافتہ بود، تا دم آخر بر و بحال ماند و تغیرے بداں راہ نیافت[1]۔

اس کے علاوہ بھی ایسے معاصر اور مستند مآخذ ملتے ہیں، جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قدسی مشہدی کبھی بھی ملک الشعرا نہیں ہوا، لیکن یہاں طول کلام کے خوف سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں، علاوہ بریں قدسی کو دہلوی کی نسبت سے یاد کرنا صحیح نہیں کیونکہ کسی

---

[1] عمل صالح ج ۳ ص ۴۰۴،

معاصر یا متاخر مورخ، تذکرہ نگار یا شاعر اور ادیب نے اس کو دہلوی نہیں لکھا، نیز اس کی مستقل سکونت بھی دہلی میں کم ہی رہی، اپنے قلیل مدت قیام میں اس نے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت بھی کی، مثلاً آگرہ، کشمیر، لاہور وغیرہ۔

شاہجہاں کے پانچویں سال جلوس یعنی ۱۰۴۲ھ سنہ ۱۶۳۲ء میں وہ ہندستان پہونچا، اور کم وبیش ۱۰ سال بعد یعنی ۱۰۵۲ھ میں انتقال کر گیا، اس کی وفات یا تدفین بھی دہلی میں نہیں ہوئی، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بنیاد پر حاجی شمشیر علی جیسے ناواقف اور ناقل محض شخص نے اس کو دہلوی لکھ دیا، اور وہ بھی بڑی علمی سوجھ بوجھ کے ساتھ اور عمداً!

ایک طرف تو گپتا صاحب کے بیان کی روشنی میں حاجی صاحب بالکل ناواقف تھے، دوسری طرف ان کو قدسی مشہدی کے بارے میں اتنی ساری معلومات بھی حاصل تھیں، عقل کام نہیں کرتی کہ اس تضاد کو کس چیز پر محمول کیا جائے۔

۲ - اس ضمن میں اسی صفحہ (۳۰۹) پر گپتا صاحب نے لکھا ہے کہ۔

"حاجی صاحب خود سرورق پر صحیفہ قدسی کو مجموعہ تضمین شعرائے ہندستان بر غزل مولانا محمد جان صاحب قدسیؒ لکھتے ہیں، اگر ان کے ذہن میں کوئی قدسی دہلوی ہوتے تو وہ ان تضمینوں کو مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان کیوں لکھتے، کیا دہلوی شاعر شعرائے ہندوستان سے الگ ہیں؟

جواب میں عرض ہے کہ اگر شعرائے ہندوستان نہ لکھتے تو کیا شعرائے ترکستان یا شعرائے افغانستان وغیرہ لکھتے؟ اس سے صرف یہ مراد ہے کہ سارے ہندوستان

کے مختلف حصوں اور گوشوں کے شعرا، اور یہ بات ان مجموعوں کے مطالعہ سے
ظرح واضح ہو جاتی ہے، کہ اس نعت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ملک کے ہر حصہ
شاعروں نے تضمین نگاری میں ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیا تھا، ایسا نہیں
صرف دہلی یا اس کے قرب و جوار کے شعرا نے ہی تضمینیں لکھ ڈالی ہوں شعرائے
کے فقرہ سے محض یہ بتانا مقصود ہے کہ اس وسیع پیمانہ پر اس نعت پر خمسے لکھے
کہ ملک کا شاید کوئی بھی گوشہ باقی نہ رہا تھا۔

۳۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحسین کی "خمسہائے غزل قدسی"
کے صفحہ ۹ پر عنایت اللہ قیس کے قطعہ تاریخ کا ذکر گپتا صاحب نے
اور پہلا شعر درج کرنے کے بعد تیسرا شعر نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

شاعروں نے جو لکھے ہند کے خمسے اس کے جن کے ہر بند پہ قربان ہو دل لیجا

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں۔

" اس شعر کے مصرعہ اول سے صاف ظاہر ہے کہ ہند کے
شاعروں نے خمسے اس شاعر کے کلام پر لکھے ہیں، جو خود ہندوستان
کا رہنے والا نہیں ہے"۔

جواب میں عرض ہے کہ پہلے مصرعہ میں "ہند کے" فقرہ سے ہندوستانی اور ایرانی شاعروں
امتیاز اور فرق کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں غالباً اس
کی صراحت مقصود ہے کہ صرف ایک محدود یا مخصوص حصہ ملک
پورے ہندوستان کے شاعروں نے خمسے لکھے بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ ذکر نام

سلہ اس موضوع کی وضاحت گزشتہ مضمون میں کی جا چکی ہے۔

اور مولف نعت ہذا کوئی ایرانی النسل شاعر ہی ہے تو بطور اطلاع عرض ہے کہ پندرہویں یا سولہویں صدی عیسوی سے لے کر عصر حاضر تک ایک دو نہیں، متعدد ایرانی شاعر اس تخلص کے گزرے ہیں، خود ہمارے ملک میں اسی صدی میں اکا دکا شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کا تخلص قدسی تھا، اور جن کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔[1]

میں اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اگرچہ قدسی مشہدی ایرانی نژاد تھا لیکن وہ ہندوستان ہی میں، لاہور میں فوت ہوا تھا، اور وہیں دفن بھی ہوا، ملک الشعراے دربار شاہجہاں ابو طالب کلیم نے جو قدسی کا قریبی اور مخلص دوست، ندیم خاص اور ہمکار بھی تھا، ایک بہت عمدہ اور پر اثر مرثیہ ایک طویل ترکیب بند کی صورت میں اس کی موت پر لکھا ہے جس کا ایک قابل توجہ شعر یہ ہے:۔

شد بہ لاہور گر آں گنج معانی در خاک | رفت تا طوس ولی غلغلۂ نوحہ گرش

۴۔ آگے چل کر اسی صفحہ پر گپتا صاحب نے مزید اپنے دعوی کے ثبوت میں تحسین ہی کے مجموعہ (ص ۳) کا حوالہ دیتے ہوئے حاجی محمد اسحاق کے خمسہ کا ذکر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ۔

تحسین ہی کے مجموعہ کے ص ۳ پر حاجی محمد اسحاق اسحاق کا خمسہ ہے، اس کا پہلا بند دیکھیے:۔[2]

ہے یہ اسحاق ترا ایک غلام عجمی | اس پہ ہو یک نگہ لطف رسول عربی

---

[1] اس موضوع کی تفصیل ان شاء اللہ ایک جداگانہ مضمون کی شکل میں معاصر کی کسی آئندہ اشاعت میں پیش کی جا سکے گی، [2] میرے سامنے جو حدیث قدسی کا نسخہ ہے اس میں یہ بند آخر میں درج ہے، یعنی پہلا بند نہیں بلکہ آخری بند ہے،

تیرے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی ....

اس غلام مجمی کا ذہن قدسی کے بارے میں قطعی صاف ہے، وہ اسے سعدی اور ظہیر فاریابی کے ساتھ رکھتا ہے، خسرو اور فیضی کے ساتھ نہیں،

اس اعتراض میں کئی قباحتیں ہیں، جن کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ حاجی محمد اسحاق کی حیثیت کسی مستند مورخ معتبر تذکرہ نویس یا کسی ذی علم شاعر کی نہیں ہے وہ ایک معمولی درجہ کا شاعر معلوم ہوتا ہے لہٰذا یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس ادنیٰ درجہ کے شاعر کا علمی معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا ہوگا،

دوسرے یہ کہ محض ذکر قدسی سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ شاعر کا اشارہ قدسی مشہدی کی طرف ہے، جب کہ یہ یقین ہے کہ قدسی مشہدی کے علاوہ متعدد دوسرے ایرانی اور ہندی النسل شاعر بھی اسی تخلص کے ہوئے ہیں، تیسری بات یہ کہ حاجی محمد اسحاق کی عدم واقفیت اور علمی کم مائیگی کے سلسلے میں صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ وہ نعت گو شعرا کی فہرست میں قدسی کے نام سے پہلے ظہیر کا نام لیتا ہے، اس جگہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ تضمین نگار نے صرف ظہیر لکھا ہے، البتہ گپتا صاحب نے اپنی جانب سے فاریابی کا لفظ غالباً اس بنا پر کہ وہ زیادہ مشہور رہے ہیں، محض اندازہ سے بڑھا دیا ہے، حالانکہ اس نام کے بھی کئی شاعر گذرے ہیں، مثلاً ظہیر دہلوی، ظہیر اصفہانی وغیرہ لہٰذا قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ ظہیر فاریابی مراد ہے یا کوئی اور ظہیر، ہماری حقیر رائے میں قطعیت کے ساتھ ظہیر فاریابی کا نام لکھتے وقت گپتا صاحب کو پہلے اس شاعر کی حیثیت بہ طور ایک ممتاز نعت گو سخن ور متعین کر لینی چاہئے تھی، اور اس بات کی

تصدیق کر لینی چاہئے تھی، کہ آیا وہ نعت گوئی میں نمایاں درجہ رکھتا بھی ہے یا نہیں محض اندازہ سے ظہیر فاریابی کہہ دینا مناسب نہ تھا، بہرحال اگر ظہیر فاریابی مراد ہے، جیسا کہ گپتا صاحب نے از خود اضافہ کر دیا ہے، تو یہ عرض ہے کہ ظہیر فاریابی کا شمار قطعاً نعت گو شعرا میں نہیں ہوتا، وہ ایک خالص مدح گو اور درباری شاعر تھا، اس کو نعت گوئی سے کیا سروکار، البتہ خاقانی، جامی، رومی، عطار، ابن حسام، نظامی، شاہ نعمت اللہ کرمانی وغیرہم جیسے شاعروں میں سے کسی کا نام لیا جاتا تو بات بن سکتی تھی، اب اس حقیقت کی روشنی میں یہ مصرعہ ع "تیرے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی" پڑھئے تو حاجی محمد اسحاق کے بیان کا کھوکھلا پن سب پر روشن ہو جائے گا۔ تلاش و تحقیق تو یہ کہتی ہے کہ ظہیر سرے سے نعت کا شاعر ہی نہیں اس لیے کہ اس کے کلام کا بہت بڑا حصہ قصائد اور مدحیہ نظموں پر مشتمل ہے۔

بہرحال جو شاعر علمی اعتبار سے اس درجہ کا ہو کہ ظہیر دہلوی نہیں ظہیر فاریابی یا کوئی اور ظہیر کو مداحان رسولؐ میں گردان دے، اس کے قول پر کیا بھروسہ کیا جائے، معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس نے محض وزن شعر پورا کرنے کے لیے سعدی اور ظہیر کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے ایک نئے معنی گپتا صاحب نے پہنا دیے ہیں، اس کے علاوہ حاجی محمد اسحاق اگر چاہتے بھی تو خسرو اور فیضی کے نام نہیں لا سکتے تھے، اس لیے کہ وہ خارج از وزن ہو جاتے اگر اتفاق سے قدسی سے پہلے ان دو شاعروں کے نام آ گئے، جو ایرانی تھے، تو نعت نگاری کا صرف ایرانی شاعروں اور تضمین نگاری کا صرف بشیر اور دوسرے ہندوستانی کے لئے ہی مخصوص ہو جانا ایک ایسا امر ہے جس کو عقل قبول کرنے سے قاصر ہے، (باقی)

لاہور میں علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس کا جشن

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا اس کی صدارت ترکی کے
عبدالقادر کرہانی نے کی، اُن کے ساتھ ڈاکٹر رفیق احمد صدر تھے، جو پنجاب یونیورسٹی کے پرو وائ
ہیں، سکریٹری جناب محمد وارث میر ہوئے، اس میں یہ مقالات پڑھے گئے،

(۱) me Reflections on Philosophical aspects
of Iqbal's philosophy - از پروفیسر ڈاکٹر سید النجیب العطاس (ملیشیا)

(۲) Allama M. Iqbal and Mehmet Akif
Ersoy - از پروفیسر ڈاکٹر ثبات کاک تو (روس)

(۳) fore runner of Pakistan Turkish
friendship - از ڈاکٹر فوات بازم اگلو (ترکی)

(۴) ole of Iqbal in the Creation of Pakistan

از نادام پری پان آری بوردن (ترکی)

(۵) *Iqbal as a believer in Islam.* از

ڈاکٹر لطفی ڈوجی (ترکی)

(۶) *Iqbal's relevance To-day* از جناب عنایت اللہ

صاحب (لاہور)

(۷) *Iqbal's Concept of Muslim Revival*

از ڈاکٹر محمد کلیم (بنگلہ دیش)

(۸) *Iqbal and Walt Whitman: East and-*

West Meet - از پروفیسر لیتھم فیفر (میکسیکو)

کافی اور چائے کے بعد پھر دو اجلاس ہوئے، ایک کی صدارت ملیشیا کے پروفیسر ڈاکٹر
سید النجیب العطاس نے کی، ان کے ساتھ ڈاکٹر منیر جغتائی شریک صدر تھے، جو پنجاب یونیورسٹی میں
پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں، سکریٹری ڈاکٹر امان اللہ ہوئے، اس میں یہ مقالات پڑھے
گئے (۱) *Research into Iqbal's life and works*
in The Soviet union - از ڈاکٹر سوخاچیو (روس)

(۲) *Iqbal: A Giant of our planet* از ڈاکٹر
گلیفورد (روس)

(۳) *The vision of Iqbal* از ڈاکٹر شام افتخار

(۴) *Individual and Society in Iqbal* -

- از ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی (ایڈنبرا)

(۵) Iqbal To be rediscovered از ناظر یوسف

(۶) علائق اقبال با افغانستان از میر حسین شاہ از افغانستان

(۷) Attribute To Iqbal از احمد حسین صاحب۔

ہر مقالہ خواں کے لئے دس منٹ مقرر تھے، میرا مقالہ پندرہ صفحے کا تھا، مگر میں نے اس کو دس منٹ کے لحاظ سے مختصر کر لیا تھا، اس میں پہلے تو یہ دکھایا تھا، کہ مولانا شبلیؒ نے اقبال کے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی کہ حالی اور آزاد کے بعد شاعری میں جو کرسیاں خالی ہوں گی، ان میں ایک اقبال سے پر ہوگی، یہ پیشین گوئی پورے طور پر صحیح ثابت ہوئی، پھر استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اقبال کی وفات پر جو کچھ لکھا تھا، اس کا اقتباس سنایا، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم اور جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی جو رائیں اقبال سے متعلق تھیں، ان کا ذکر کیا، مولانا ابو الحسن علی ندوی کی کتاب Glory of Iqbal کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال کے بارہ میں ان کی رائے بھی نقل کی، اس کے بعد یہ ظاہر کیا کہ اقبال کے مطالعہ میں دار المصنفین کا ایک خاص زاویۂ نظر ہے اسی بنا پر یہ راقم السطور اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا ہے، کہ اقبال محض یورپ کے فلسفیوں کی رتھ کو ہانکتے رہے بلکہ اُن کا مسلک قرآن مجید کی تعلیمات پر مبنی تھا، انھوں نے فلسفۂ خودی کو کلام پاک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور صحابہ کرام کے عشق رسولؐ سے اخذ کیا، پھر ان کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ انھوں نے افلاطون، ارسطو، کانٹ، میکڈانلڈ، فرائڈ، ولیم جیمس، برگسان میک ٹگاوٹ، فرزل، نطشے، اسپنگلر، جنگ، ٹالسٹائی، اور لاک وغیرہ سب ہی سے اختلاف کیا ہے، وہ ان کے نظری اور فکری خیالات کے بٹے ناقد رہے ہیں، ان کے بجائے وہ کلام پاک کے مطالعہ سے اسرار الٰہی کے محرم بنے، عشق رسول سے سرشار رہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت اویس قرنیؓ، حضرت بلالؓ کی زندگی سے اپنی شاعری

۔موضوع عشق کا درس لیا، پھر کلی سے اسلام میں مولانا روم کے علاوہ بو علی سینا، سنائی
ی، ابن خلدون، ابن حزم، فخر الدین رازی، ملا باقر، عراقی، ابن تیمیہ، ابو الدولہ سنجانی،
ی اللہ، جمال الدین افغانی، اور سرسید احمد خان سے بھی متاثر ہوئے، وہ بگڑے ہوئے
لے مزور ناقد تھے لیکن حقیقی تصوف کے ہمیشہ حامی رہے، اور صوفیائے کرام سے اپنی عقیدت
۔س طرح کیا ہے،

ل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی — نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
ن خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ انکو — ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
۔ نظارہ نار سا جس کے نظارے کو — وہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں

ضوع تصوف نہ تھا، لیکن اپنے خیالات کے اظہار میں وحدت الوجود کے منکر نہیں
کا وحدۃ الوجود اپنا تھا، بیسویں صدی کا تھا، وہ وحدت الوجود کے حامیوں
اپنے کو خدا میں جذب ہونے کے بجائے خدا کو اپنے میں جذب ہوتا دیکھنا پسند کرتے
تے ہیں:۔

ز دگم بہسر تحقیق خودی شو — انا الحق گوے وصدیق خودی شو

ضرب کلیم میں کہتے ہیں:۔

الیکن یہ روایت ہے کہ آخر — اک مرد قلندر نے کیا راز یہ خود فاش

نھوں نے اپنی شاعری میں عشق کے جو فلسفیانہ رموز و نکات بتائے ہیں، وہ کسی
، کسی جولیٹ، کسی لیلی، کسی عذرا اور کسی شیریں کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ خالصۃً عشق الٰہی
۔وحدۃ الوجود کا دوسرا نام ہے،

صوفیائے کرام میں وہ حضرت فضیل بن عیاضؒ، جنید بغدادیؒ، بایزید بسطامیؒ، داتا گنج بخشؒ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ خواجہ نظام الدین اولیاؒ، امیر خسروؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، اُن کی تعلیمات کا پرتو اُن کی شاعری پر ہے۔ شعراء میں مولانا رومی کے علاوہ فریدالدین عطار، خاقانی، بو علی قلندر پانی پتی، عرفی، طالب کلیم، صائب، فیضی، رضی دانش، عبدالقادر بیدل، غنی کشمیری، غالب اور داغ سے متاثر ہوئے، اسلامی تاریخ کی سیاسی شخصیتوں میں سے حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، طارق بن زیاد، عبدالرحمٰن اوّل اندلسی سلیم، سنجر، طغرل، محمود غزنوی، مراد، اورنگ زیب، اور ٹیپو سلطان کی سیرت و کردار کا اثر اُن کی شاعری میں نمایاں ہے، ان حقائق کے بعد یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے، کہ وہ فرنگی مفکروں کی گاڑی کے قلی بنے رہے، درحقیقت وہ اسرار الٰہی کے محرم رسول اللہ کے عاشق فلسفۂ اسلام کے ترجمان، اور کاروانِ ملت کے حدی خواں بن کر شاعری کرتے رہے، اسی حیثیت سے انھوں نے خودی، اجتماعی خودی، عظمت آدم، شرف انسانی اور تسخیر فطرت کا پیام دیا اور انسانیت کو سنوارنے کے لئے دیا، اسی لئے ان کی شاعری میں ابدیت کی لذت برابر ملتی رہے گی، ہم نے اگر اقبال کو اس جشن کے موقع پر صحیح معنوں میں پالیا، تو ہم اپنے کو بھی اسی حیثیت سے پالیں گے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر انسان کی خودی کا ایک نیا درس دیا، اسلام کے روحانی مذہبی اور ذہنی راز سربستہ کو کھول کر ایشیا کے رہنے والوں کے دل کے اندر نیا سوز، ساز اور درد عطا کیا ہے، فرنگی فکر کے نشہ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، انسان کو بلند کر کے کائنات کا حکمراں بننے کی دعوت اور انسانیت میں آفاقیت اور عالمگیریت پیدا کرنے کا پیام دیا ہے،

میرا یہ مضمون انگریزی میں تھا جس کا خلاصہ اوپر پیش کیا ہے، جب میں اپنا یہ مقالہ پڑھ رہا تھا، تو وہاں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال بیٹھے تھے۔ اون کو سامنے

ہ کر مقالہ پڑھنے میں بہت جی لگا، یہ خیال غالب رہا کہ ان کا سن لینا ہی میری محنت کا اصلی ہ ہو گا، جب میں نے مقالہ ختم کیا، تو وہ اٹھے اور بڑی گرم جوشی اور محبت سے ہاتھ ملایا، اور ی، پھر باہر نکل کر کہنے لگے کہ

"It was very gripping and interesting"

یہ اجلاس ختم ہوا تو پیرس کی ایک خاتون لپکتی ہوئی میرے پاس آئیں، اور مبارکباد پیش رتی ہوئی بولیں کہ میں اس مقالہ سے بہت محظوظ ہوئی، اور میں نے بہت کچھ سیکھا، آگے بڑھا پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا سے ایک صاحب کچھ باتیں کر رہے تھے، مجھکو دیکھتے ہی بولے "آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا ہے" میں نے کہا کہ کوئی شکایت تو نہیں پیدا ہو گئی، بولے نہیں، ہم لوگ کہہ رہے تھے کہ آپ کا مقالہ اس کانگریس کا بہترین مقالہ قرار دیئے جانے کے لائق ہے، سندھ کے ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل نے اس رائے کو سن کر کہا کہ میں بھی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کراچی کے جناب اعجاز الحق قدوسی مؤلف "اقبال کے محبوب صوفیائے کرام" اپنی محبت میں یہ کہہ گئے کہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ کانگریس کا بہترین مقالہ تھا، دوسرے دن جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کچھ بیرونی نمائندے ان سے کہہ رہے تھے کہ یہ مولانا کیسے اتنی اچھی انگریزی میں اتنا اچھا مقالہ لکھ سکے، میں یہ سن کر ہنسنے لگا، دل میں خوش تھا کہ اللہ نے دارالمصنفین کے معیار اور وقار کی لاج رکھ لی،

میں نے جس اجلاس میں اپنا مقالہ پڑھا تھا اسی کے ساتھ دوسرا اجلاس اسی وقت دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا جس کے صدر مصر کے ڈاکٹر حسین مجیب تھے، ان کے ساتھ ڈاکٹر مسز رفعت رشید صدر تھیں، جو پنجاب یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کی ڈین ہیں، سکریٹری ڈاکٹر خواجہ

غلام زکریا تھا، اس میں یہ مقالے پڑھے گئے،

(۱) Allama Muhammad Iqbal and the German-Philosophy - از ڈاکٹر اِل تردو رستو (جرمنی)

(۲) Iqbal and Renaissance of Islam از پروفیسر ڈاکٹر مطا (انڈونیشیا)

(۳) Iqbal. His portraits and handwriting از سلیمہ سلطانہ (پاکستان)

(۴) اقبال اور پان اسلام ازم از ڈاکٹر پروین شوکت (لاہور)

(۵) Iqbal and the material well being of the-Muslims - از جناب لطیف احمد صاحب شروانی

(۶) Metaphysical implication of Iqbal-Epistemic views از ڈاکٹر محمد معروف (لاہور)

(۷) Iqbal's concept of mental health از ڈاکٹر ایس-ایم-رحمان (پاکستان)

(۸) اقبال اور وحدت الوجود، از جناب میر حمزہ شنواری (پاکستان)

سہ پہر کو لاہور کے خانۂ فرہنگ ایران میں ایک استقبالیہ عصرانہ تھا، اس میں پہلے تقاریر ہوئی، اس کی صدارت ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے کی، اس موقع پر جناب بہاؤالدین اورنگ نے پہلے استقبالیہ خطبہ پڑھا، پھر تہران یونیورسٹی کے پروفیسر جعفر محجوب اور پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبد الشکور احسن نے اپنے اپنے مقالات پڑھے، اس کے

بصدر نے اپنا خطبہ پڑھا، پھر ایران کے قونصل جنرل نے وہاں کے ایک کتب خانہ کا افتتاح کیا جس کا نام علامہ محمد اقبال لائبریری رکھا گیا ہے، ایک بہت پرتکلف عصرانہ بھی رکھا گیا تھا ہم لوگ ہوٹل واپس آئے، تو حسب دستور بنگ کی طرف سے رات کا ڈنر بھی تھا جس میں حسب معمول انواع واقسام کے کھانے تھے،

۱۰ دسمبر کی صبح کو پھر دو علحدہ علحدہ کمروں میں مقالہ خوانی کے چار اجلاس ہوئے ایک اجلاس کی صدارت ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی نے کی، جو ڈاڈ ہزا یونیورسٹی کے استاذ ہیں، ان کے ساتھ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صدر ہوئے، اور سکریٹری ڈاکٹر خالد حمید شیخ تھے، اس میں یہ مقالے پیش ہوئے،

(۱) A Tribute to Iqbal از جناب محمد حسین پاکستان،

(۲) بانگ درا کی طویل نظموں کے پس منظر کا ایک مطالعہ، از جناب سیما بو الخیر کشفی (کراچی یونیورسٹی)

(۳) اقبال اور گورنمنٹ کالج، از جناب محمد حنیف شاہد، لاہور)

(۴) Therapeutic Aspects of Iqbal's thoughts - از جناب ڈاکٹر [illegible] (لاہور)

(۵) Iqbal and Syed Ali Hamadani از ڈاکٹر جیرارڈ باؤسنگ (مغربی جرمنی) (۶) محمد اقبال، امیر شعرا الاسلام، از عبد الودود شلبی (مصر)

(۷) Iqbal and high ideals of Islamic State از پروفیسر مولانا الٰہی بخش جار اللہ

(۸) Iqbal's advice to the young از جناب محمود ولی،

اسی وقت دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا، اس کی صدارت فرانس کی مسٰ
ایوامیورووتیچ کر رہی تھیں، ان کے ساتھ صدر جسٹس محمد یوسف صراف تھے، سکریٹری
محمد اسمٰعیل سیکلی ہوئے، اس میں یہ مقالے پڑھے گئے،

(۱) Iqbal . A poet of the East از جناب
علی سردار جعفری (ہندوستان)

(۲) Iqbal's Andulasian Themes از ڈاکٹر محمد یوسف
(پاکستان) (۳) اقبال کی دعائیں از پروفیسر شریف کنجاہی (پاکستان) (۴) آ
شاعر اور مفکر اقبال کا پیغام حیات از ڈاکٹر ابو سعید نور الدین (بنگلہ دیش) (۵)
کلام اقبال پر احادیث نبوی کا اثر از مریم سلطانہ صاحبہ (پاکستان) (۶) اقبا
اور ایران از ڈاکٹر نسیم (پٹنہ) (۷) علامہ اقبال پر کتابیات، از ڈاکٹر رفیع الد
ہاشمی (سرگودھا) (۸) Iqbal on observation of Nature
(۹) God, Knowled ge از جناب عبد الخالق صاحب (پاکستان)
چائے کے بعد دو علٰحدہ کمروں میں جو اجلاس ہوئے، ان میں سے ایک کی صدا
امریکہ کے لیتھم فیئرنے کی، ان کے ساتھ ڈاکٹر عبد الحمید (لاہور) صدر تھے، سکریٹری
ڈاکٹر اے شیخ ہوئے، اس میں یہ مقالے پیش ہوئے،

(۱) Dialogue in Iqbal - از ڈاکٹر محمد اجمل
(۲) اقبال اور ہمارے فکری رویے، از ڈاکٹر سلیم اختر (۳) اقبال کے نظریہ فنون
میں فن تعمیر، از ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی، (لاہور) (۴) اقبال کی ابتدائی فارسی شا
از ڈاکٹر صابر آفاقی (آزاد کشمیر) (۵) علامہ اقبال کا معاشی مقصد از ڈاکٹر معز

(ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی لاہور) (۶) صحیفۂ افکار و نظریات میں اقبال کے مجددانہ تصرفات

از مولانا نور احمد آفریدی (۷) اقبال کی اردو غزل از جناب رفیق خاور (لاہور)

(۸) Iqbal: The poet of Man از ڈاکٹر شمس الدین صدیقی (پشاور)

(۹) The Naturalism of Iqbal از

پروفیسر عبد القیوم (پشاور)

اسی اجلاس میں پروفیسر آل احمد سرور نے اردو میں ایک اچھی تقریر کی جس میں یہ ظاہر کیا کہ اقبال مغرب اور مشرق دونوں کی اعلیٰ قدروں سے متاثر ہوئے۔ اسی وقت دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا، اس کی صدارت انڈونیشیا کے ڈاکٹر حکانے کی، ان کے ساتھ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین صدر ہوئے، سکریٹری ڈاکٹر ظہور احمد اظہر تھے، اس میں یہ مقالے پیش ہوئے،

(۱) Iqbal's views of space and Time

از ڈاکٹر فاضل احمد شمسی (اسلام آباد)

(۲) Rumi and Iqbal از میاں سید رسول رسا (پشاور)

(۳) علامہ اقبال اور تحریک پاکستان از ڈاکٹر انعام الحق کوثر،

(۴) Introducing Iqbal to western Readers - از نیر محمد نیف (لاہور)

(۵) اقبال اور مغربی جمہوریت، بالشوزم اور اسلام از احسان اکبر (پاکستان)

(۶) علامہ اقبال خانقاہ کے صوفی، از جناب محمد ایوب قادری (کراچی)

اس کے بعد مقالہ خوانی کے اجلاس ختم ہو گئے، مقالات کی مذکورہ بالا فہرستوں سے

اندازہ ہوگا کہ اس کانگریس میں اقبالیات سے متعلق جتنے پہلو ذہن میں آسکتے تھے، ان سب پر مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور ہر مقالہ نگار کو اپنا مقالہ پڑھنے کا موقع دیا گیا، اس سے مقالہ نگاروں کو بظاہر تو تسکین ضرور ہو جاتی تھی، مگر بعض اوقات مقالے وقت کی تنگی کی وجہ سے ایسی عجلت میں پڑھے گئے کہ پڑھنے اور سننے دونوں میں کوئی لذت نہ ملتی تھی، بعض مقالہ نگاروں نے بڑی محنت اور کاوش سے مقالے لکھے، جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ غور سے پورے سنے جاتے اور اُن پر بحث و مباحثہ ہوتا لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا' کسی مقالہ پر کوئی بحث نہیں ہوئی، مگر اتنے مقالات پڑھے اور سنے گئے کہ میرا خیال ہے کہ ہر سننے والے نے اس کانگریس میں شرکت کرکے کچھ نہ کچھ نئی اور مفید چیزیں ضرور حاصل کیں،

اسی روز شام کو جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے استقبالیہ تھا، وہ اس وقت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے پاکستان میں بہت مقبول ہیں، اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، فوجی وردی میں ملبوس تھے، عام پاکستانیوں کی طرح اُن کی مونچھیں صاف نہیں بلکہ اُن کی مونچھوں سے اُن کی مردانگی اور سپہگری کا اظہار ہوتا تھا، ہنستا ہوا چہرہ تھا، بات بات پر ہنستے ہوئے دکھائی دئے، شامیانے میں داخل ہوئے تو میری شروانی کی جیب پر انڈیا لکھا ہوا تھا، میری طرف بڑھے، ہنس کر پوچھا کہ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے، میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں اُن کے لئے ہندوستان سے کچھ علمی تحفے لایا ہوں، پھر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور اپنی کچھ تصانیف اُن کی خدمت میں پیش کیں، انھوں نے ان کو قبول کیا، تو فوٹو گرافروں نے آگے بڑھ کر تصویریں لیں، میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ گذشتہ سال میرے ذریعہ سے پورا دارالمصنفین پاکستان کو نذر کر دیا گیا ہے، یہ سن کر ہنسنے لگے، میں نے عرض کیا کہ دارالمصنفین ہی کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں کچھ باتیں عرض کرنی ہیں، اس کے لئے

اسلام آباد آکر ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہوں گا، جواب دیا کہ اسلام آباد میں ضرور ملئے، ہندوستان کے اور دوسرے نمایندوں سے بھی بہت ہی حسن اخلاق سے ملے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد ..... سے دیر تک باتیں کرتے رہے، اس استقبالیہ میں بکثرت مدعوئین تھے، مغرب کا وقت ہوا تو جنرل صاحب نماز پڑھنے کے لئے اٹھ گئے، نماز با جماعت کا اہتمام کیا گیا تھا، مگر سیکڑوں مدعوئین میں سے صرف پندرہ بیس آدمی نماز میں شریک ہوئے، نماز کے بعد مصلیوں سے جنرل صاحب نے بے تکلفانہ گفتگو کی، میری طرف بھی بڑھے، میں نے اس وقت دار المصنفین اور حکومت پاکستان سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی کچھ اور تفصیل بتائی، اور اسلام آباد میں پھر شرف ملاقات کیلئے وقت کا طالب ہوا، انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس کانگریس کے بعد اسلام آباد میں سکو نگا، میں نے عرض کیا کہ ابھی تو کراچی جاؤں گا، وہاں سے اسلام آباد حاضر ہوں گا، یہ معلوم کرکے انھوں نے اپنے سکریٹری کو کراچی میں میرا پورا پتہ لکھ لینے کو کہا، سکریٹری صاحب نے میرا پتہ لکھ کر کہا کہ مجھ کو اسلام آباد آنے کی تکلیف دیجائے گی، یہ شام پر تکلف چائے، اور جنرل صاحب کی بے تکلفانہ ملاقات کی وجہ سے بڑی خوشگوار رہی،

رات کو پر تکلف کھانے کے بعد کچھ ماہرین موسیقی نے اقبال کی غزلوں کے ساتھ سندھی، پنجابی، اور بلوچی گیتوں سے بھی مندوبین کو محظوظ کیا،

۷ دسمبر کو الوداعی اجلاس تھا، مندوبین پھر پنجاب یونیورسٹی کے فیصل ہال میں جمع ہوئے، پنڈال افتتاحیہ جلاس کی طرح سجا ہوا تھا، اسٹیج پر بیٹھنے والے خصوصاً پاکستانی زیادہ تر انگریزی لباس میں ملبوس تھے، جنرل ضیاء الحق تالیوں کی گونج میں ڈائس پر تشریف لائے، کارروائی کلام پاک کی تلاوت سے شروع ہوئی، پھر جناب بشیر حسین ناظم نے اپنے پرکیف ترنم سے اقبال کی وہ نظم سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے ؛ ۔

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق — ہزار خوف ہو لیکن زباں ہے دل کی رفیق

جب یہ نظم ختم ہوئی تو جنرل ضیاء الحق اٹھ کر جناب بشیر حسین ناظم سے بغل گیر ہوئے اور اُن کے اندازِ ترنم کی تعریف کی۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے استقبالیہ خطبہ پڑھا۔ پھر مندوبین میں سے ایک ایک نمائندہ کو اپنے اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے ڈائس پر مدعو کیا گیا۔ افغانستان کے پروفیسر محمد ابراہیم الہام نے کہا افغان قوم حکیم الامت اقبال کے عظیم نظریات اور فلسفیانہ شاعری کے علاوہ انھوں نے انسانیت اور اتحادِ عالم کے لئے جو پیغامات دئے ہیں اُن سے بخوبی آشنا ہے۔ بنگلہ دیش کی بیگم اختر امام نے کہا کہ علامہ اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے ہی لئے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لئے ہے، اقبال سب کے ہیں۔ مصر کے ڈاکٹر محمد جمال الدین نے کہا کہ علامہ اقبال ملّتِ اسلامیہ کو ایک خاندان تصوّر کرتے تھے۔ فرانس کی میڈیم ایوا میورووچ نے اقبال کے پیغام کو دنیا بھر میں پھیلانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ہندوستان کی طرف سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد جب اور جب وہ مائک کے پاس آئے، تو پورا ہال تالیوں کی گونج سے بھر گیا۔ کارروائی انگریزی میں ہو رہی تھی، مگر انھوں نے بہت ہی فصیح و بلیغ اردو میں مجمع کو مخاطب کیا۔ اردو میں ان کا بولنا پاکستانی سامعین کو پسند آیا۔ انھوں نے اس ضرورت پر زور دیا کہ اقبالیات کے اسکالروں کا ایک بین الاقوامی فورم مستقل بنا دیا جائے، تاکہ علامہ اقبال پر پڑھنے والا کام ایک دوسرے کے تعاون سے بڑھے۔ اپنی تقریر کے درمیان یہ شعر پڑھا

عشق شور انگیز را جادہ در کوئے تو برد — بر تلاشِ خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

پھر ہندوستانی مندوبین کی جو پذیرائی ہوئی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا،

وہ دن ہیں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح — تیرے ہی اختیار میں ہیں عمر بھر سے ہم

تو پورا ہال متاثر ہو کر تالیاں بجا رہا تھا۔ ان کا اندازِ تخاطب کچھ ایسا تھا کہ جلسہ کے بعد

لوگوں کی زبان پر تھا کہ یہ بہترین تقریر تھی۔

امریکہ کی خاتون ڈاکٹر شاکات اربرا بھی اردو میں بولیں جس سے شایان پاکستانی حضرات نے ضرور سبق لیا ہوگا جو اپنے خیالات کا اظہار اردو کے بجائے انگریزی میں کر رہے تھے، وہ بولیں کہ کانگریس نے دور دراز کے لوگوں کو ایک ساتھ مل کر بیٹھنے کا موقع دیا، تاکہ وہ علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ سے آگاہ ہو سکیں، وہ خود بھی اس سے مستفید ہوئیں، اور لاہور سے یادوں کا خزینہ ساتھ لے کر جا رہی ہیں، فرانس کی مسز سعید یاسین ال رش نے لاہور اور شالیمار پر انگریزی میں دو نظمیں سنائیں، جو انھوں نے اس کانگریس کے موقع پر کہی تھی، سوڈان کے نمائندہ حبشی مبارک مغولی نے عربی میں علامہ اقبال کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا، ترکی کے فواد بہرام اوغلو نے اس توقع کا اظہار کیا کہ علامہ اقبال کی فکر کو سمجھنے کے لئے تبادلۂ خیال کا جو سلسلہ لاہور کانگریس میں شروع ہوا ہے، وہ جاری رکھا جائے گا، اٹلی کے پروفیسر بوسانی نے کہا کہ علامہ اقبال صرف سائنس کے مطالعہ اور تحقیق و جستجو کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ وہ انسانی کو عشق اور روحانیت کی طرف بھی بلاتے ہیں، بلجیم کے نمائندہ پروفیسر اسال موسکی نے کہا کہ ان کو بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے، لیکن یہاں کی ایسی شاندار اور کامیاب کانگریس کہیں اور نہیں دیکھی۔

اس کے بعد جناب جنرل ضیاء الحق مجمع کو مخاطب کرنے کے لئے اٹھے، علامہ اقبال پاکستانیوں کے ذہن و دل پر جس طرح چھائے ہوئے ہیں، اس کی پوری ترجمانی ان کی تقریر میں ہوئی، اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کا پیام آفاقی ہے، جو تمام لوگوں کی زبان پر ہر وقت اور ہر جگہ گونجتا رہے گا، کیونکہ اس شاعر مشرق کے یہاں انسان کی عظمت کا درس ہے، بیرونی دنیا میں ان کی شہرت ان کے عظیم پیام کی وجہ سے ہے، ان کی فکر سمندروں

کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں تک تھی، وہ تسخیرِ کائنات کا راز جانتے تھے، پھر وہ شخص کو اس کے آئیڈیل کو عملی شکل دینے اور رازہائے حیات کو با ہر لانے پر تیار کرتے ہیں، احساس کے لئے خدا کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیتے ہیں، انھوں نے اپنی تقریر میں پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ اقبالیات قائم کرنے کی بھی ہدایت دی تاکہ اقبالیات پر بامقصد اور موثر تحقیق ہو،

اس موقع پر یہ بھی بتایا گیا کہ اس بین الاقوامی کانگریس میں ۱۹۳ مندوبین نے شرکت کی جس میں ۷۰ بیرونی ممالک سے آئے، اس میں ۹۰ مقالات پیش کئے گئے، جن میں ۳۲ پچاسی انگریزی، دس عربی اور چنتالیس اردو زبان میں تھے، یہ تقریب ختم ہونے والی تھی کہ جناب جنرل ضیاء الحق نے ایک بار پھر جناب بشیر حسین ناظم سے علامہ اقبال کی کوئی نظم سنانے کی خواہش کی، وہ اسٹیج پر آئے تو اپنی بہت ہی مترنم اور نغمہ ریز آواز میں یہ نظم شروع کی،

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری ... مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اور جب وہ اس شعر پر پہونچے کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں ... کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

تو پورے مجمع پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، ان کے پڑھنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا،

اس تقریب کے بعد چائے اور کافی بھی تھی، پھر ہم لوگ ہوٹل واپس ہوئے، ایک بجے کھانا تھا، پھر ڈھائی بجے لاہور کی تاریخی عمارتوں کی سیر کا پروگرام تھا، پہلے ہم لوگ جہانگیر کے مقبرے لے جائے گئے، اس کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا، مگر اس بار دیکھ کر جہانگیر کی دلآویز اور دلکش شخصیت تزکِ جہانگیری میں اس کی نثر نگاری کی شگفتگی، حکمرانی میں اس کی رواداری اور فراخدلی، علم و فن کی اس کی قدردانی اور سرپرستی، نورجہاں سے اس کی شیفتگی، اور پھر نورجہاں کی وجہ سے ہندوستان کے تمدن میں انقلاب پذیری کی ساری تصویریں سامنے آگئیں، خیال آیا کہ دہلی اور آگرہ

کے یہ حکمران اپنے زمانہ میں دنیا میں مقدر ترین اور طاقت ور ترین حکومت کے والی سمجھے جاتے تھے، مگر اسی آگرہ اور دہلی کے مسلمان اب کیا سے کیا ہو کر رہ گئے ہیں! جذبات میں تلاطم پیدا ہو رہا تھا کہ ہم لوگوں سے کہا گیا کہ اب یہاں سے لاہور کے قلعے کو دیکھنے کے لئے جانا ہے، وہاں پہنچ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ جس اسپتال میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب دل کے مرض میں مبتلا ہو کر آ گئے ہیں، وہ قریب ہے، کانگریس کے آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر خواجہ غلام صادق نے ازراہِ کرم ایک موٹر دی، اور جناب بشیر احمد ڈار صاحب بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اسپتال لے گئے، جہاں جناب راشدی صاحب کو خوش اور مطمئن دیکھ کر بڑی راحت ہوئی، قلعہ کی تقریب میں شرکت کرنے سے زیادہ مسرت ان کے پاس بیٹھنے میں ہوئی،

مغرب کے بعد ہوٹل پہنچا تو لاہور کے ٹیلی ویژن اسٹیشن والے ہندوستانی وفد کو اپنے یہاں انٹرویو کے لئے لے گئے، یہ انٹرویو ایک گھنٹہ کا رہا، ناہید کشور صاحبہ نے ہندوستان کی علمی ادبی سرگرمیوں سے متعلق بہت سے سوالات کئے، جن سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ یہاں کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں، جناب علی سردار جعفری، اور پروفیسر آل احمد سرور ان کے سوالات کا تشفی بخش جوابات دیتے رہے، پھر انھوں نے علامہ محمد اقبال سے متعلق ہم لوگوں کے تاثرات فرداً فرداً پوچھے، میں نے اپنے تاثرات کے سلسلہ میں بیان کیا کہ ہندوستان میں علامہ محمد اقبال کو واپس لانے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نمایاں حصہ ہے، پھر ان کے متعلق اپنے اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ میں کسی حال میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ فرنگی مفکروں کی نگارشات کے قائل تھے، دارالمصنفین کے بارہ میں بھی مجھ سے سوال کیا گیا، میں نے اس ادارہ کو پاکستان کے منہ جس طرح کر دیا گیا ہے، اس کی مختصر تفصیل بتائی،

۱۰ دسمبر کو ہم لوگوں کا پروگرام سیالکوٹ جانے کا تھا، جہاں علامہ محمد اقبال پیدا ہوئے لاہور سے سیالکوٹ کا سفر بس سے تقریباً تین گھنٹے کا تھا، تین بسیں اور چند موٹر کاریں ساتھ چلیں، ایک اچھا خاصا جلوس ہو گیا، لاہور شہر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ باہر نکلے، پروفیسر میاں محمد سعید کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، وہ امریکہ میں جارج میسن یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، ہم دونوں ساتھ بیٹھے، وہ راستہ میں ہر علاقہ کی تاریخ بتاتے گئے، ہم لوگ وزیرآباد سے گذرے تو انھوں نے بتایا کہ یہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا وطن ہے، یکایک خیال آیا کہ وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ بھی تشریف لائے تھے، شہر میں ان کا جلوس نکالا گیا تھا، تو ان کو ایک فٹن پر بٹھا کر شہریوں نے خود گاڑی کھینچی تھی، وہ یاد آئے تو اُن کا اخبار زمیندار بھی یاد آیا، اور پھر شاعری میں ان کی قادر الکلامی اور پرگوئی ذہن پر چھا گئی، پورا علاقہ بہت شاداب اور زرخیز نظر آیا، میاں محمد سعید صاحب یہاں کی زرخیزی اور شادابی کا ذکر کرتے رہے، راستہ میں اس جلوس کو دیکھنے کے لئے سڑکوں کے دونوں کنارے پر جابجا لوگ کھڑے تھے، خوش ہو کر تالیاں بھی بجاتے جابجا پھاٹک اور کاغذ کی جھنڈیاں بھی لگا رکھی تھیں، ہم لوگ سیالکوٹ پہنچے تو بوائے اسکاؤٹ کی ایک لمبی قطار استقبال کے لئے کھڑی تھی، بینڈ باجے بھی بج رہے تھے، سیالکوٹ کو وہاں کے شہریوں نے خوب سجایا تھا، ایک بہت بڑے شامیانہ کے نیچے ہم لوگ بٹھائے گئے، جہاں کا اجتماع علامہ اقبال کی بین الاقوامی کانگریس کے ایک جلسہ میں تبدیل ہو گیا، اور اس کو ہونا بھی چاہئے تھا، کیونکہ علامہ اقبال کے مولد کا بھی حق پہنچتا تھا، اس کی صدارت زون اے کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کی، یہاں زیادہ تر زبانی تقریریں ہوئیں، سری لنکا کے پروفیسر کیرو تامستے نے علامہ اقبال پر ایک موثر تقریر کی، اور وہاں کی یونیورسٹی میں اقبالیات پر ایک شعبہ کھولنے کی تجویز پیش کی، بنگلہ دیش کی راج شاہی یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد کلیم نے اردو میں بڑی اچھی

تقریر کی، سینیٹر ڈی تاگو کے ڈاکٹر شبنم ول نے اس موقع پر اپنی بڑی جرأت مندانہ تقریر میں پاک ہی میں، جلد از جلد جمہوریت کی واپسی کے خواہاں ہوئے، پروفیسر میاں محمد سعید نے مجھے بھی تقریر کرنے کی فرمائش کی، مگر میں اس کے لئے تیار نہیں ہوا، اسٹیج پر پھر پروفیسر جگن ناتھ آزاد بلائے گئے، وہ تھوڑی دیر تک اردو میں بولے، پھر علامہ اقبال پر اپنی ایک نظم سنائی جو انھوں نے اس جشن سے متاثر ہوکر کہی تھی، اس کا پہلا بند یہ تھا،

چھلک رہا ہے نگہ سے دل کا پیمانہ   یہی نیاز ہے میری یہی ہے نذرانہ
جو تو سنے تو مرا ہر نفس حقیقت ہو   وگرنہ میرا سخن بھی فسون و افسانہ
تری نوا کہ زمانہ کا صدمہ ہے اس میں   یہی حرم ہے مرا اور یہی ہے بتخانہ
سلام روحِ عصرِ جدید تجھ پہ سلام   سلام محرمِ رازِ درونِ میخانہ
جدید دور میں تیرے سوا کوئی نہ نکلا
نظر ہو جس کی حکیمانہ بات رندانہ

آخری بند یہ تھا،

میں آ رہا ہوں دیارِ مزارِ غالب سے   ترے مزار پہ لایا ہوں دل کا نذرانہ
مری خموش نگاہی مری خموشیِ نطق   اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ
ضیائے طورِ معانی میں اک لطیف چھلک   کہ مضطرب ہے مرا جذبۂ جبیں سایانہ
اک ارمغاں تجھے نظروں میں پیش کرتا ہوں   گرچہ مرا ہنر آشوب ہے دیدہ و دانہ
اس ارمغانِ محبت کی ہو پذیرائی   کہ آج محفلِ احباب میں ہوں بیگانہ
چلا تھا گھر سے جو کل تیری آرزو لے کر
مقامِ شوق میں گم ہو گیا وہ فرزانہ

ظاہر ہے کہ اس نظم کی داد کیسے نہ ملتی، آزاد کی پذیرائی ہر جگہ ہو رہی تھی، اس نظم کے بعد وہ اور بھی مقبول ہوئے، اُن کے قدردانوں اور دوستوں کا جمگھٹا برابر اُن کے ارد گرد رہا، یہاں پروفیسر آل احمد سرور نہ آسکے تھے، کیونکہ اُن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، جناب علی سردار جعفری آئے تھے، جناب فیض احمد فیض صاحب سے اُن کے گہرے تعلقات ہیں، اس لئے وہ ہر جگہ اُن ہی کے ساتھ دکھائی دیتے،

اس جلسے کے بعد ہم لوگ جلوس کی شکل میں پاپیادہ اقبال منزل کی طرف چلے، اتفاق سے جلوس کے آگے آگے ہم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور سری لنکا کے نمائندے تھے، اقبال منزل پہنچنے کے لئے جن سڑکوں اور گلیوں سے ہم لوگ گذرے، وہ جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھیں، کوٹھوں اور چھتوں پر لوگ کھڑے جلوس کو دیکھ رہے تھے، اور بکثرت پھول نچھاور کر رہے تھے، ایک جگہ ایک راجہ صاحب تین قیمتی ہار لئے کھڑے تھے، ہم تین آدمی جو آگے آگے تھے، انھوں نے ہمارے ہی گلوں میں یہ تینوں ہار ڈال دئے، ہم سب اپنے اقبال منزل پہونچے، جو طرح صاف ستھری دکھائی دی، اس کے مختلف کمرے دکھائے گئے، اور اب وہاں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم کر دی گئی ہے، سیالکوٹ کے لوگوں نے جس مسرت، اخلاص اور بلند حوصلگی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا، اس سے تمام مندوبین متاثر تھے،

وہاں کی سروسز کلب میں ایک پرتکلف لنچ رکھا گیا تھا، جس میں حسب معمول طرح طرح کے کھانے اور پھل تھے، لنچ کے بعد علامہ اقبال کے استاد جناب مولوی سید میر حسن کی پوتی مس [illegible] کاظمی، پرنسپل زنانہ گورنمنٹ کالج سیالکوٹ نے تمام مندوبین کو یادگار کے طور پر اقبال کے شاہین کا ایک تحفہ پیش کیا، جو [illegible] کا بنا ہوا ہے، اس کے بعد اس بین الاقوامی کانگریس کی باضابطہ کارروائیاں ختم ہو گئیں، اور ہم لوگ لاہور اپنے ہوٹل میں واپس آگئے

(باقی)

ادبیات

صبحِ انسانیت

از جناب ماہر القادری صاحب (کراچی)

یہ جہانِ آب و گِل مدت سے تاریکی میں تھا تھی مسلط ہر طرف ظلم و جہالت کی گھٹا
کاروانِ زندگی، بہکا ہوا، بھٹکا ہوا سارا عالم ایک سکتہ، ساری دنیا اک خلا

اہلِ دانش بھی فریبِ جہل میں آئے ہوئے
بے یقینی کے اندھیرے ذہن پر چھائے ہوئے

خود تراشیدہ بتوں کے سامنے جھکتے تھے سر آدمی دنیا میں رہ کر اپنے رب سے بے خبر
لوگ اپنی خواہشوں پر صرف رکھتے تھے نظر رفتہ رفتہ مٹ گیا تھا امتیازِ خیر و شر

راہبر بھی راستوں کے پیچ و خم میں کھو گئے
دیکھتے ہی دیکھتے انسان، حیوان ہو گئے

ہر طرف برپا فساد و انتشار و اضطراب ایسے عالم میں ضروری تھا کہ آئے انقلاب
یک بیک ابھرا حرا کے غار سے اک آفتاب وہ محمد مصطفیٰ، اُمّی لقب، رحمت مآب

اُس کا آنا تھا کہ جنت کے دریچے کھل گئے
ابرِ رحمت اس قدر برسا کہ چہرے دُھل گئے

قائدِ لشکر بھی ہے، جو صاحبِ منبر بھی ہے شافعِ محشر بھی ہے اور ساقیِ کوثر بھی ہے
جس کی سیرت کا ورق طاقِ ابد پر نیّر بھی ہے جو نورِ حق بھی ہے، مُظہِر بھی ہے، مَنظر بھی ہے

جس کا احسان اور کرم انسانیت پر قرض ہے
وہ بشر، خیر البشرؐ جس کی اطاعت فرض ہے

جس نے انساں کو طریقے زیست کے سمجھا دیئے
دین و دنیا میں توازن کے لیے کیا چاہیے

جس نے بخشے زندگی کو حوصلے اور ولولے
وہ نظر صلِ علیٰ تو لے ہوئے دل جوڑ گئے

جس نے تہذیب و تمدن کو مؤدب کر دیا
وحشیوں، صحرا نشینوں کو مہذب کر دیا

ذوق کو پاکیزگی، وجدان کو تقدیس دی
ذہن کو تابندگی، فکر و نظر کو روشنی

خواجگی و سروری میں بھی وہ فقر و سادگی
جس کے آگے سر خمیدہ سطوتِ شاہنشہی

دل کے دھندلے آئینوں کو بھی مجلّا کر دیا
جھونپڑوں کو رشکِ قصرِ معلّیٰ کر دیا

صنفِ نازک کو بتائے شرم و غیرت کے حدود
عصمتِ زن کی حفاظت کو ضروری تھی قیود

زندگی دلکش بنا دی ان حدوں کے باوجود
احمدِ و حامدِ محمدؐ مصطفیٰؐ پر ہو درود

آپ کا قول و عمل تفسیر ہے قرآن کی
اتباعِ مصطفیٰؐ معراج ہے انسان کی

الصلوٰۃ والسلام اے رحمتہ للعٰلمینؐ
السلام اے النبیؐ والرسولؐ والامیںؐ

السلام اے پیشوا آئے اولین و آخرین
آپ ہی کا سب تصدق ہو وہ دنیا ہو کہ دیں

نعت گوئی میرا منصب ہو نہ میں حسّانؓ ہوں
میرے آنسو شعر بن جائیں تو پھر میں کیا کروں

فخرِ ہر پیدا و پنہاں رحمۃ للعالمین

(از پروفیسر شاہ سید معین الدین حسن، خادم حضرت خواجہ غریب نوازؒ، اجمیر شریف)

خلقِ تو، تفسیرِ قرآں، رحمۃ للعالمین ۔۔۔ روئے تو، تصویرِ ایماں رحمۃ للعالمین
ہر ادا، جنت بداماں ہر سخن فردوس گوش ۔۔۔ ہر نظر صبحِ بہاراں رحمۃ للعالمین
ہر نفس، سرگرمِ تبلیغِ فلاحِ روزگار ۔۔۔ ہر عمل رحمت بداماں رحمۃ للعالمین
نورِ اول، سیدِ کل، مقصدِ کون و مکاں ۔۔۔ فخرِ ہر پیدا و پنہاں رحمۃ للعالمین
کیمیا سازِ سعادت ہو گئی تیری ولا ۔۔۔ مل گئی اکسیرِ ایماں رحمۃ للعالمین
بادہ آشامِ محبت کے لیے تیرا جمال ۔۔۔ ہو گیا صہبائے عرفاں رحمۃ للعالمین
یوسفِ مصرِ محبت، شہریارِ رنگ و بو ۔۔۔ فیض بخشِ سائلِ ایماں رحمۃ للعالمین
خلق کہتی ہو نہیں "حضرت محمد مصطفیٰ" ۔۔۔ برملا کہتا ہے "رحماں" رحمۃ للعالمین
خوش نصیبی طالعِ حقہ کی میرے دیکھئے ۔۔۔ ہو گئے ہیں دل میں مہماں رحمۃ للعالمین
اے ضیا پاشِ محبت، اے نگارِ دین و دل ۔۔۔ میرا سب کچھ تجھ پہ قرباں رحمۃ للعالمین
افتخارِ فقر و شاہی، محسنِ دنیا و دین ۔۔۔ شاہکارِ دستِ یزداں رحمۃ للعالمین
اے نبی دستانِ محشر را شفیعِ کام گار ۔۔۔ اے مجسم خیر و احساں، رحمۃ للعالمین
گو ہر یکتائے دیں کے وصف سے عاجز حسنؔ ۔۔۔ کیوں نہ ہو سر در گریباں رحمۃ للعالمین
اے نگارِ ہر دو عالم تیری الفت میں حسنؔ ۔۔۔ نعت گو ہے مثلِ سحباں رحمۃ للعالمین

مطبوعات جدیدہ

ابوالکلام آزاد احوال و آثار | مرتبہ جناب مسعود الحسن عثمانی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۲۴، مجلد مع گرد پوش قیمت پندرہ روپئے، پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

سنہ ۷۶ء میں مولانا ابوالکلام کے افکار و نظریات کی اشاعت کے لئے لکھنؤ میں مولانا آزاد میموریل اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا، یہ کتاب اس کی پہلی پیشکش اور مولانا کی بوقلموں شخصیت کے متعلق بارہ مضامین کا خوشنما گلدستہ ہے، اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین، سید انصاری، قاضی عدیل عباسی، دار المصنفین کے ناظم سید صباح الدین عبد الرحمن، شریک ناظم مولانا عبد السلام قدوائی، اور ابوالکلامیات کے ماہر مالک رام جیسے نامور ارباب علم کے مضامین بھی ہیں، اور مولانا کے پرستاروں میں ابوسلمان شاہجہاں پوری، ریاض الرحمن شروانی، محمد شیب عمری یونس خالدی، اور مولانا کے سیاسی رفیق آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی نگارشات بھی ہیں ڈاکٹر سید عابد حسین کے مضمون میں مولانا کے ادبی مرتبہ کو واضح کیا گیا ہے، سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے الہلال کی گرج اور کڑک کا ذکر کر کے جنگ آزادی میں اس کا حصہ دکھایا ہے، قاضی عدیل عباسی صاحب نے مولانا کے بعض نامور معاصرین کے مقابلہ میں انکی عظمت و برتری دکھائی ہے، مرتب نے مولانا شبلی سے مولانا کے ذوق و طبیعت کی مناسبت، ذہنی ہم آہنگی اور فکری اتحاد کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان مضامین سے

مولانا کے فضل و کمال، ذہانت و عبقریت، فراست و تدبر، فکر و اجتہاد، علمی، ادبی، سیاسی اور دینی عظمت اور تنوع و ہمہ گیر شخصیت کے خط و خال اچھی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں، مولانا کے متعلق متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، یہ اس ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہے، اگر اس میں مولانا کے عام حالات و سوانح اور ۱۹۴۷ء کے بعد کی زندگی کے متعلق بھی جب وہ جمہوریہ ہند کے وزیر تعلیم تھے، ایک ایک مضمون شامل ہو جاتا تو اس کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی، مالک رام صاحب نے مولانا کی صحافت کے ذکر میں جملہ معترضہ کے طور پر بعض غیر متعلق باتیں تو لکھی ہیں، لیکن مولانا کی ادارت میں دوبارہ شائع ہونے والے الہلال کا ذکر نہیں کیا ہے، انھوں نے البلاغ کے سلسلہ میں مولانا کے بنگال سے اخراج کے ضمن میں لکھا ہے "چونکہ بیشتر دوسرے صوبوں کی حکومتیں اپنے ہاں ان کا داخلہ پہلے سے ممنوع قرار دے چکی تھیں، اب صرف بہار اور بمبئی ہی ایسے دو صوبے تھے جہاں وہ جا سکتے تھے" (ص ۴۱) لیکن بمبئی کے بارہ میں اس صراحت کی تردید خود مولانا نے انڈیا ونس فریڈم میں کی ہے، جسکو سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے "پنجاب، دہلی، یوپی، اور بمبئی کی حکومتوں نے مجھے اپنے حدود میں اندر داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی" (ص ۹۲) سعید انصاری صاحب نے لکھا ہے "۱۹۱۲ء سے لے کر ان کی وفات تک کوئی ۵۰ سال ہوتے ہیں" (ص ۹۹) حالانکہ ۴۶ سال ہی ہوتے ہیں، کیونکہ مولانا کی وفات ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی، مرتب نے تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کے متعلق مولانا شبلی کے خیالات کو خلط ملط کر دیا ہے، وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے مگر آزادی نسواں کے سلسلے میں بے پردگی کے حامی نہ تھے، خود مرتب بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکے ہیں، اسی طرح علم موسیقی سے مولانا شبلی کی واقفیت کو اس کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ وہ اس کو جائز بھی سمجھتے تھے، ایک جگہ انھوں نے ندوہ سے مولانا آزاد کے جانے کا ذکر اس طرح کیا ہے "اس کی بند فضا انھیں راس نہیں آ سکتی تھی" (ص ۱۱۲) لیکن دوسری جگہ اسکے برعکس یہ لکھا ہے "لکھنؤ کے اس قیام اور علامہ شبلی کی رفاقت کو مولانا آزاد کبھی بھول نہیں سکے"

(ص۳۲) اور اس کے ثبوت میں خود مولانا کی بھی ایک تحریر نقل کی ہے، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، جیسے حلب آزادی (ص۲۳) بجائے سلب ۔۔ اور متوسلین (ص۳۵) بجائے متوسلین، خالص معروضی مطالبہ (ص۸۰) بجائے مطالعہ، مالہ وما الیہ (ص۹۰) بجائے ماعلیہ، بالکل سیاست (ص۱۲۲) بجائے سیاحت اور حجۃ الاسلام امام محمد غزالی (ص۱۲۸) بجائے حجۃ الاسلام وغیرہ۔ "ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت:۔	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت،	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" " "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
ایڈیٹر	سید صباح الدین عبدالرحمن، عبدالسلام قدوائی ندوی
قومیت	ہندوستانی،
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" " " " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

سید اقبال احمد

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۸ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

پاکستان کے قیام میں ایک علمی مجلس میں وہاں کے ایک بہت ہی ممتاز اہل علم نے سوال کیا کہ ہندوستان میں اس وقت اردو کی علمی و ادبی سرگرمیاں کیا کیا ہیں؟ میرا ایک جواب یہ بھی تھا کہ ہمارے یہاں کے نقادوں نے قدیم و جدید دور کے نثر نگاروں، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں پر اتنے چھوٹے بڑے مقالات لکھے ہیں کہ ان کے مطبوعہ مجموعے کئی الماریوں میں رکھے جا سکتے ہیں،

انھوں نے اس جواب کو سن کر کہا کہ مقالہ نگاری کوئی ٹھوس کام نہیں، اس قسم کا لٹریچر تفنن طبع کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر اس سے علم و ادب میں وزن اور وقار پیدا نہیں ہوتا، ان سے کہا گیا کہ ان نقادوں کی وجہ سے علمی و ادبی ذہن و شعور میں بڑی بیداری اور احتیاط پیدا ہو گئی ہے، یہ سوال بھی اٹھا کہ اس وقت کے نقادوں نے آب حیات، مقدمۂ شعر و شاعری، اور شعر العجم جیسی کتابیں اردو ادب کو دی ہیں کہ نہیں، میرا جواب نفی میں تھا، اور وجہ یہ بتائی کہ آزاد، حالی، اور شبلی جیسے نابغان عصر ہر زمانہ میں نہیں پیدا ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ اس دور کی تنقید نگاری میں ادب کے کنوئیں کی گہرائی نہ سہی، مگر دریا کا پھیلاؤ ضرور پیدا ہو رہا ہے،

اس علمی مجلس کی گفتگو تو وقتی تھی، مگر سوچنے کی بات ہے کہ آخر ہمارے زیادہ تر نقاد مقالہ نگاری پر کیوں اکتفا کر رہے ہیں، پھیلی ہوئی بات کو سمیٹ کر لکھنا بڑا ہنر ضرور ہے، ادبی شعور اور ضمیر کو مختصر لیکن واضح اور دلنشین طریقہ پر ادا کرنا بھی بڑا وصف ہے، قوت اخذ و

غیر معمولی قدرتِ تحریر سے صفحوں کی باتیں چند سطروں میں لکھی جائیں، تو یہ ادب بھی قابلِ تعریف ہے۔ جس طرح مختصر افسانہ نویسی ایک عظیم فن ہے اسی طرح ایجاز کے ساتھ تنقید نگاری بھی کم عظیم فن نہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم اپنے اخبار ہمدرد میں بہت طویل اداریے لکھتے جو کئی قسطوں میں ختم ہوتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ وہ مختصر اداریے کیوں نہیں لکھتے جواب دیا کہ مختصر تحریر لکھنے کے لئے ان کے پاس کافی وقت نہیں ہوتا، ان کا مطلب یہ تھا کہ مختصر تحریر لکھنے میں غور و فکر محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے کافی وقت چاہئے، اگر ہمارے مقالہ نگار اپنے مختصر مقالات واقعی فکری کاوش و مشقت سے لکھتے ہیں، تو یہ مقالہ نگاری کا روشن پہلو ہے۔

گو بعض نقاد کی تنقید نگاری کے اختصار اور ایجاز میں غزل کی ایمائیت اور اشاریت پیدا ہو جاتی ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے ناظرین سے پوری توقع رکھتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کو وہ صحیح سمجھیں، ایسے نقاد اپنے دعوی کو دلائل سے ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ کچھ ایسے بھی ہیں، جن کو چونکا دینے والی بات لکھنے میں لذت ملتی ہے، وہ نئی یا انوکھی بات لکھنے میں یا تو سچی بات کو قربان کر دیتے یا پھر اپنی طرف سے کوئی آرڈیننس یا مارشل لا جاری کرنا پسند کرتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جن کے تحریری فن کے نیچے ان کا تنقیدی آرٹ دب کر رہ جاتا ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جن کے خیال بال اور بنیں ور فن کی آنکھ مچولی ہوتی ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے عقیدت مندانہ یا مبلغانہ جوش میں اپنے ذہنی رجحانات کے ہر دوس کو اپنی رنگین تحریروں کا خلعت پہنا کر ہر کو خوش کرنا چاہتا کر لیتے ہیں۔

اردو ادب میں ایسی تنقیدوں کی رنگا رنگی سے ادبی نشاط بھی پیدا ہو رہا ہے، مگر

اس کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کیا یہ مجموعوں میں باعث نشاط ہے، کیا یہ زیادہ تر تفریحی، جذباتی اور تاثراتی ہیں، یا واقعی تجزیاتی اور تحلیلی ہیں، ؟ کیا یہ تنقید نگاری کے اعلیٰ ادبی مقصد اصولوں کے مطابق ہیں، ؟ کیا اُن سے ادبی نکتہ رسی، تنقیدی دیدہ وری، اور علمی بالغ نظری میں اضافہ ہو رہا ہے، ؟ یا یہ چھوٹے چھوٹے تنقیدی مقالے محض سہل انگاری کی نشاندہی کرتے ہیں، کچھ ایسے قابلِ قدر نقاد بھی ہیں، جن کے مقالات کے توبہت سے مجموعے شائع ہوتے، مگر وہ کسی کتاب کے مصنف نہیں ہو سکے آخر کیوں ؟ اس کا جواب ذرا سنبھل کر دینے کی ضرورت ہے،

اس ماہ کے معارف میں ڈاکٹر ظفر الدین اور جناب اعجاز صدیقی کی وفات پر ماتمی تحریریں شائع ہو رہی ہیں، ڈاکٹر ظفر الدین علامہ شبلی کی نواسی کے شوہر تھے، ان کی وفات ان کے عزیزوں کے لئے بھی غمناک حادثہ ہے، جناب اعجاز صدیقی کی رحلت سے دار المصنفین اپنے ایک بڑے قدر دان سے محروم ہو گیا، یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں، کہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی وفات کی خبر ملی، انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی، نوّے سال کے تھے، وہ ایک جلیل القدر، مرنجاں مرنج، بامروت وضعدار شخصیت، پارلیمانی دستور کے بڑے ماہر، ہندو مسلمان کی ملی جلی تہذیب کے عمدہ نمونہ اردو زبان کے بڑے محسن کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائیں گے، وہ اپنی ترشی ہوئی بےلطافت کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست کی جذباتی ہم آہنگی کے قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے تھے، بشرطیکہ موجودہ قومی دھارے کے بنانے والے ان کو ایسا ہی سمجھیں،

دار المصنفین کے معارف پریس کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے ایک ایسے کارگذار اور تجربہ کار پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت ہے جو لیتھو مشین کے کل پرزوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے ساتھ عمدہ اور رنگین طباعت کرانے کا ماہر بھی ہو، اس کے لئے دار المصنفین کے ناظم سے خط و کتابت کی جا سکتی ہے،

مقالات

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت

کے

مظاہر اور خصائص

سیرۃ النبی جلد ہفتم کے ایک باب کے کچھ اور حصے

سلسلہ کے لئے دیکھئے معارف مارچ ۱۹۷۰ء

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

عمال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں، اس لئے اُن پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہدِ نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کا کسی دفعہ سے اُن کو خاموش کر دیا ہو یا حکام کی حمایت میں معترض پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال سے فرمایا، "ان مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کہ اُن کی دعا، اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی، اور اُن سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو"[1]

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۶۶ کتاب الزکاۃ باب ارضاء السعاۃ،

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معترض کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ اس کو عطا فرمایا،

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر پکڑلی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہوگئی آپ اس کی طرف پھرے، تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لادو گے، وہ نہ تمہارا مال ہوگا، اور نہ تمہارے باپ کا، حضور نے تین بار فرمایا نہیں، استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ نہیں استغفر اللہ، اس کے بعد فرمایا، میں اس وقت تک نہیں لادوں گا، جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے اونٹ پر جَو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں[۱]،

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا، اور کہا تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہم کلام ہے بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہئے کیونکہ اس کا حق ہے اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا[۲]،

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے

---

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب الحلم،

[۲] ابن ماجہ باب لصاحب الحق سلطان

میرے پاس نہیں ہیں، اُس نے وا ویلا مچائی کہ اے بدمعاملگی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں، اس کو چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ نے پھر فرمایا اس کو کہنے دو، اُس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوادیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم وعفو اور حسنِ معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمد! تم کو خدا جزاے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی، اور اچھی دی۔[1]

بہرحال یہ تو مسلمانوں کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں، جو یہودیوں کی بیجا ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلعم نے اُن سے کچھ قرض لیا، میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے، کہ تقاضے کو آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی، اور سخت وسست کہکر کہا کہ اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کرکے کہا، او خدا کے دشمن! تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا، عمر! مجھکو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کردوں۔ یہ فرماکر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد فرمایا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کرکے اس کو بیس صاع کھجوریں اور زیادہ

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۶۸

وہ یہودی حلم و عفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا،[1]

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا میں سمجھا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں، اور دام نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں،[2]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغمبری کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سخت اعتراض کیا، آپ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی، ذرا اسلام کے امیر کی اس حیثیت کو زمانہ کے سلاطین و امراء کے اس غرور و تبختر سے ملائیے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے تھے، اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا تھا، بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ اُن کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ پہلے بھی تھی، اور اب بھی ہے، کہ ذات شاہی ہر مواخذہ سے بری اور ہر ذمہ داری سے برتر ہے، اس سے بھلا برا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت کی حد سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم

---

[1] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، (شرح شفا، از شہاب خفاجی)، [2] جامع ترمذی کتاب البیوع،

اور ساتھ ہی درحقیقت قانون کی دارو گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں،

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک معصوم پیغمبر تھے، جس کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہوتا تھا، اور آپ کی خدمتِ اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصلِ جہنم کر سکتی تھی، با ایں ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حاکمانہ اقتدار کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا سوا اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ یہ امراء اسلام کی تعلیم کے لئے عملی اسباق پیش فرمائے جاتے تھے، اور اس کے لئے نہایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آئندہ امت کے لئے بعد کے آنے والے امرا اور حکام اس استفسار و اظہارِ رائے کے دروازے کو بند نہ کریں،

عہدِ نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذاتِ شاہانہ پر اس رودررو سوال و جواب اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روما میں کسی زمانہ میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں، اُن کا تعلق عوام سے نہ تھا، اور نہ اُن کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا، نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع، یہ خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا منظر نظر آیا، اور نہ آ سکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب، صداقت اور پاکیزگیٔ اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہونچے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا، اور وہ اس کے پجاری تھے، اور وہ اس دیوتا کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے، اور ان کا وطن حدود کی چہار دیواری میں محدود تھا جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز ناآشنا تھی، اس

حقیقت پر ایک اور وبلیوسے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال واستفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذاتِ اقدس سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشمِ ادب کی سرمہ تھی، اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ،

اس کے بعد سلطنت وامارت کے کاروبار میں اہلِ رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل ودانش اور علم وفہم میں سب سے اعلیٰ اور برتر تھے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل وفہم اور علم ودانش کے اس رتبہ پر ہو، اس کو اپنے سے کم لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن ایک تو اس لئے تاکہ مسلمانوں سے رائے لینے میں اُن کا دل بڑھے، اور دوسرے اس لئے کہ چونکہ آپ کے ہر فعل سے اسلام کی شریعت کا قانون بنتا ہے، اس لئے آپ کا یہ فعل پیچھے آنے والے خلفاء وامراے اسلام کے لئے مثال ونظیر کا کام دے، خود آپ کو یہ حکمِ الٰہی ہوا کہ :-

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ،	یعنی اے رسول! امورِ سلطنت وجنگ
(آل عمران ع۱۷)	صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے'

چنانچہ حضورؐ نے اس پر بنفسِ نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدح فرمائی اور انکی خصوصیت ظاہر کی کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ	یعنی ان مسلمانوں کے معاملات باہمی
(شوریٰ ع۴)	مشورہ سے انجام پاتے ہیں،

اور اگرچہ عہدِ نبوت میں سلطنت وحکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے، اور

نبوت کے عہدِ اقدس میں اس کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا ہے، اور ان کی رائے پر عمل کیا ہے، اور اس کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید فیصلہ تک پہونچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی،

مدینہ پہنچکر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک ساتھ مسجد میں جمع کیا جائے، چنانچہ اس کے متعلق ہنوز وحی نہیں آئی تھی، اس لئے آنحضرت صلعم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا یہود و نصاریٰ کے یہاں اس موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا بعض لوگوں نے نماز کے وقت علم بلند کرنے کی رائے دی لیکن آپ نے ان میں سے کسی کو پسند نہیں کیا، حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیجکر نماز کا اعلان کرایا جائے آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ الصلوٰۃ جامعۃ کہکر پکارا کریں اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی[1]، اور بغرض تائید سے بعض دوسرے صحابہ نے بھی اسی قسم کے خواب دیکھے[2] اور آکر بیان کیا، چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا

---

۱ مصنف عبدالرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسیل لابی داؤد، و فتح الباری ابن حجر و روض الانف سہیلی و زرقانی علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان نووی میں ہے، فشرع بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلک اما بوحی او باجتہاده صلی اللہ علیہ وسلم علی مذہب الجمہور فی جواز الاجتہاد له صلی اللہ علیہ وسلم ولیس هو عملا بمجرد المنام هذا ما لا یشک فیه بلا خلاف ۔ ۲ ابوداؤد و ترمذی باب بدء الاذان

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدانِ جنگ کے قریب پہونچ کر آپؐ نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ آیا دشمن کا مقابلہ کیا جائے، یا نہیں، باری باری سے ممتاز صحابہ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک انصاری رئیس نے اٹھکر کہا کہ یا رسول اللہ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہدیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑے، ہم تو یہیں رہیں گے، خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے، اس کے بعد جب آپؐ میدانِ جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا۔ ایک تجربہ کار صحابی نے آکر دیکھا کہ ابھی لیا گیا، عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ حسب فرمانِ الٰہی اس مقام پر اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں، یا صرف حضورؐ کی یہ اپنی رائے ہے، ارشاد ہوا کہ یہ رائے ہے، اس پر انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ہم کو بدر کے اس مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، حضرتؐ نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جا کر قیام فرمایا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کئے گئے، تو آپؐ نے تمام صحابہ سے مشورہ لیا کہ ان کے ساتھ کونسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا،[1]

اسی طرح احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے مشورہ چاہتا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں، یا شہر کے اندر رہ کر، عبداللہ بن ابی بن سلول منافق کا راسے دیا کہ شہر میں رہ کر گلی کوچوں میں مقابلہ کیا جائے۔ پھر پر جوش جان نثاروں کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہئے، اور حضور کا اپنی رائے کے خلاف ان کی رائے

---

[1] ترمذی ص ۵۰۳ کتاب التفسیر سورۂ انفال،

کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا سامنا کرنا اور حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوہ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا مال جو کچھ غنیمت میں آیا ہے، واپس کر دیا جائے، تو آپ نے فرمایا، کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپ نے بھی ان کی درخواست قبول کر لی، اگرچہ آنحضرت کے حکم سے کسی کو سرتابی کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی تاہم آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمھارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ میں اُن کے قیدیوں کو واپس کر دوں، تم میں جس شخص کے دل میں آئے، وہ میری رائے پر عمل کرے، اور جو لوگ راضی نہ ہوں وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں جب وقت پہلا مال غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دیدیا جائے گا، تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اُٹھے کہ یا رسول اللہ ہم اس پر راضی ہیں، آپ نے اُن کے اس مستعجلانہ اظہار کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہم کو شخصاً شخصاً یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ کون راضی ہے اور کون نہیں، اس لئے ہر شخص کو اپنا ایک ایک قائم مقام دریافت ہمارے پاس بھیجنا چاہئے، چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو اُن کی رضامندی کی اطلاع دی۔[۱]

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد مبارک میں انتظامی امور میں صحابہ سے مشورہ لیتے تھے، اور ان کے مشوروں پر اگر پسند فرماتے تو عمل بھی فرماتے تھے۔

قیام سلطنت اور آئین سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے

---

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد و صحیح بخاری کتاب المغازی۔

سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، وہ انسانی شعبۂ حیات جس کے اصول میں تمام تر درندگی بہیمیت مکر و فریب، دغل و سازش ظلم و ستم، اور جور و تعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اس کو اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرشِ الٰہی کا سایہ بن گئی، احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ

السُّلطان ظل اللہ فی الارض	یعنی صاحبِ حکومت زمین میں اللہ کے
یاوی الیہ کل مظلوم من عباد	اس کا سایہ ہے[1] جس کے دامن میں
اللہ ،	بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے،

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ السُّلطان العادل المتواضع ظل اللہ و رمحہ فی الارض عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے، خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا[2]"،

---

[1] و [2] یہ حدیث، اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیق ابن ابی شیبہ میں ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفا و مزیل الالتباس عجلونی لفظ سلطان، یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قدیم عربی میں السلطان بادشاہ کو نہیں، بلکہ قوت و قوت کو کہتے تھے، جو انگریزی لفظ پاور کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے، اس لئے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظامِ حکومت مخلوقاتِ الٰہی کے آرام و آسائش کے لئے گویا زمین میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندہ ہیں، سلطان کا اطلاق ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے، السُّلطان ولی من لا ولی لہ یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اسی

نظامِ حکومت

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں اسلام میں ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا، جس طرح دوسرے عبادات کا

انقلابات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت کی وسعت میں داخل ہو گئی، اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہو گیا، امیر معاویہ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لئے ہوئے تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے، فوراً ان کی اس چال پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے، جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہئے، یہ سن کر وہ ہٹ گئے، (صحیح بخاری باب فضل من ترک الفواحش)

ہر سلطنت کو ٹیکس، مالگزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انکاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا، تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے جائز فرض خیال کرے گا، اس میں شخصیت و جمہوریت کو کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ دونوں قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یہ سب آج ظاہری و نمائشی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) اس کا ہر جائز نائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی ہر ایک سلطان کہلائے گا، لیکن بادشاہ کے معنوں میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی ہجری میں سلطان محمود کے زمانہ سے بولا جانے لگا ہے۔

تمدن و تہذیب میں اس قدر ترقی کر گیا ہے، تعلیم تمام ملک میں عام ہو گئی ہے، ہر فرد ذہنیات سے واقف ہے، اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو چکا ہے لیکن بایں ہمہ اگر سلطنت ذرا سی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا، مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو کر اور کبھی عدالت کے مصارف میں ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کرکے جرم کے پاداش سے بچنے کے لئے پوری کوشش کرتے ہیں باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت دوسرے ممالک کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے، اور سزا اس لئے نہیں دیجاتی کہ وہ ایک انتقامانہ چیز ہے، بلکہ اس کو اخلاقی اصلاح کا ایک ذریعہ بنایا گیا ہے لیکن بایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور بزدلی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے، اور یہ بھی جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کی جاتی ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے، تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے اس قسم کے نظام سلطنت کا ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے، اس لئے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا، اور اسی بنا پر وہ اس نتیجہ کا بہترین مظہر ہے، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کے لئے مشکل تھی، چنانچہ کعب ابن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گرانباری کی بھی شکایت تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہد مبارک میں عمال مقرر کر دئے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر، سررشتہ،

اور باضابطہ نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کردی جاتی، تو اس کو صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظامِ سلطنت کا اخلاقی اثر تھا، کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتا تھا، اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے،

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ کی خدمت
اذا اتاہ قوم بصدقتھم	میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر
قال اللّٰھم صلّ علٰی اٰل فلان	حاضر ہوتی تھی، تو آپ فرماتے تھے
فاتاہ ابی بصدقتہ فقال	کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت
اللّٰھم صل علٰی اٰل ابی اوفٰی	نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی
(بخاری کتاب الزکوٰۃ)	صدقہ لے کر آئے، تو آپ نے فرمایا
	کہ خداوندا! ابی اوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج،

حضرت عدی ابن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے، اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھائی ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سردارانِ قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے، تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انھوں نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا،

ان اوّل صدقۃ بیضت وجہ	پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرتؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا
ووجوہ اصحابہ صدقۃ طئ قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر
جئت بہا، (مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل) آئے تھے،

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ نے فرمایا،
صدقات قومنا[۱]، یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے،

انفرادی اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی، حضرت عبد اللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جاکر بوجھ ڈھوتے تھے اور جو اس سے مزدوری ملتی تھی اس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے،[۲]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئی کہ یہ تو انقلاب فطرت ہے لیکن اس درجہ کم ہو گئی کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھی، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مجرم ہوتے تھے، جرم کا نشہ ٹوٹنے کے بعد خود ان کا نورِ ایمان چمک اٹھتا تھا، اور اس داغ کو دھونے کے لئے بیتاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہ نے بارگاہِ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے بعض جرائم کا اعتراف کیا ہے، اس کی مثال خود دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے، اعتراف جرائم کے متعلق اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہئے کہ اسلام میں حکمت کے ساتھ جرائم کی سزائیں نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں، چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں یا کوڑے لگائے جاتے ہیں، یا سنگسار کیا جاتا ہے لیکن باایں ہمہ یہ مجرم خود حاضر ہوتے، اور ان سنگین سزاؤں کو سننے کے باوجود از خود اعتراف کرتے، اور سزا جاری کرنے

---

[۱] مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل [۲] صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ و کتاب الاجارۃ باب من آجر نفسہ

کی درخواست کرتے۔

ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے، انھوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انھیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر از خود اس جرم کا اظہار کیا، اور عرض کی، یارسول اللہ مجھے پاک کیجئے، (دیکھو مسلم باب الرجم) یارسول اللہ مجھ پر حد جاری فرمائی جائے آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انھوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے، مجھ پر حد جاری فرمایئے، اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے رہے اور آپ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے، انھوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی، انھوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا، انھوں نے کہا ہاں، ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کو سنگسار کرنے کا حکم دیا، جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا، بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر مارا، اور وہ وہیں ٹھنڈے ہوگئے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتا، اور خدا اس کی توبہ کو قبول کر لیتا،[1] اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کے خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہے تو اس کے اس فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائیگی، اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا،

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا لیکن انھوں نے از خود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا، اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتوی پوچھو،

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۵ (دیکھو بخاری کتاب الحدود)

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضور نے اُن کے لئے ان کی شدتِ علالت کے سبب ایک معمولی سزا تجویز کی۔[۱]

کعب بن عمرؓ ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنھوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے اگر ہم بستر نہیں ہوا تو یہ گنہگار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے۔[۲]

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمتِ اقدس میں آئے، اور فیصلہ چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار، اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں، ایک نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑیا پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور نے دیت ہی پر زور دیا، یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا، کہ یا رسول اللہ مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، میری مغفرت کے لئے دعا فرمائیے۔[۳]

---

[۱] ابوداؤد باب فی اقامۃ الحد علی المریض [۲] ایضاً باب یصیب الرجل دون الجماع و صحیح بخاری حدود، [۳] ابوداؤد کتاب الدیات

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ

	ضخامت	صفحہ	قیمت
حصہ اول		۶۴۴	۲۰-۰۰
حصہ دوم	"	۴۴۶ "	۱۴-۰۰
حصہ سوم	"	۸۸۸ "	۲۸-۰۰
حصہ چہارم	"	۹۰۶ "	۲۸-۰۰
حصہ پنجم	"	۵۱۵ "	۱۵-۰۰
حصہ ششم	"	۸۸۲ "	۲۸-۰۰

"منیجر"

حدیث کا تنقیدی مطالعہ[1]

از، مولانا محمد تقی امینی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

تحقیق و تنقید کے لحاظ سے حدیث کے دو جزء ہیں، (۱) متن اور (۲) سند، متن اصل حدیث اور سند اس تک پہونچنے کے ذریعہ اور راستہ کو کہتے ہیں سند پر گفتگو کا تعلق خارجی نقد حدیث اور متن پر گفتگو کا تعلق داخلی نقد حدیث سے ہے، خارجی نقد میں راوی کے احوال کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و درجہ بندی ہوتی ہے، اور داخلی نقد میں الفاظ، معانی اور مفہوم کے لحاظ سے حدیث کی تحقیق و محل کی تعیین ہوتی ہے،

<u>حدیث کی صحیح معرفت کا طریقہ</u>، حدیث کی صحیح معرفت اسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ راوی (حدیث نقل کرنے والے) اور مروی (حدیث) دونوں سے متعلق پوری معلومات ہوں یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوا، اس کا حافظہ قوی تھا، یا کمزور نظر سطحی تھی یا گہری، فقیہ تھا یا غیر فقیہ، جاہل تھا یا عالم، اخلاق و کردار کیسے تھے، ذرائع معاش و مشاغل کیا تھے، روایت کرنے میں اس نے مقررہ شرطوں کا لحاظ کیا ہے یا نہیں؟

اسی طرح مروی کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے الفاظ و جملوں میں کسی قسم کی خامی و کمزوری یا مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے، معانی و مفہوم میں عقل، مشاہدہ، تجربہ اور تاریخ سے [illegible]، کسی مسلمہ اصول اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی ہے

---

[1] یہ مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سیمینار میں پڑھا گیا، جو [illegible] میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر منعقد کیا گیا تھا

جن سے کسی طرح بھی شان نبوت پر حرف آئے، یا فرمودات نبوی میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو،

خارجی نقد پر تو کام لوگوں کے سامنے آچکا ہے، لیکن داخلی نقد پر جو کچھ کام ہوا وہ زیادہ لوگوں کے سامنے نہ آسکا اس لئے حدیث کے تنقیدی مطالعہ میں سردست اسی کو اہمیت دی جارہی ہے۔

داخلی نقد حدیث کے اصول داخلی نقد حدیث کے اصول یہ ہیں۔

(۱) رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں کسی قسم کی لفظی و معنوی رکاکت (سطحیت) پائی جائے، رکاکت کی دو قسمیں ہیں، (۱) لفظی و (۲) معنوی، لفظی رکاکت یہ ہے کہ الفاظ و جملوں میں فصاحت و بلاغت کے معیار اور قواعد عربیہ کی خلاف ورزی ہو کہ جس کو دیکھ کر عربی زبان کا ماہر جان لے کہ اس قسم کا کلام کسی فصیح اللسان کا نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ رسول اللہ کا کلام ہو (جو افصح ترین تھے)

معنوی رکاکت یہ ہے کہ معنی و مفہوم میں نادانی و کم عقلی کی بات پائی جائے جو شان نبوت سے فروتر ہو اور کلام معیار نبوت سے گر جائے،

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیث میں خوبصورت چہرہ کی تعریف، ان کی طرف دیکھنے اور ان سے حاجت طلب کرنے کا حکم یا آگ کا عذاب ان کو نہ ہونے کی خبر ہو،

(۳) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں مختلف پیشوں اور ان کے اختیار کرنے والوں کی برائی بیان کی گئی ہو،

(۴) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں خاندان، قوم یا شہر کی برائی ہو،

(۵) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں بے ڈھنگی اور اوٹ پٹانگ باتیں پائی جائیں

جو رسول اللہؐ کی شان سے بعید ہوں،

(۶) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں لغویت تمسخر اور کم عقلی و بے وقوفی کی بات پائی جائے جس سے ذمہ دار لوگ پرہیز کرتے ہیں۔

(۷) آپؐ کی پیدائش کے واقعہ کی تشریح اس انداز سے ہو کہ نبوت پر حرف آئے اور معیار نبوت برقرار نہ رہے،

(۸) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں کلام انبیاء کے مشابہ نہ ہو چہ جائے کہ آپؐ کا کلام جس کو مختلف وجوہ سے فوقیت حاصل ہے،

(۹) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں ایسا کھلا بطلان ہو جو خود دلالت کرتا ہو کہ یہ اللہ کے رسول کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) آپؐ کی طرف منسوب حدیث محسوس عام مشاہدہ اور عادت کے خلاف ہو،

(۱۱) آپؐ کی طرف منسوب حدیث عقل عام کے خلاف ہو یعنی فرد واحد یا کسی طبقہ کی عقل کے خلاف نہیں بلکہ عام طور پر لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں

(۱۲) آپؐ کی طرف منسوب حدیث شہوت و فساد کی رغبت دلاتی ہو

(۱۳) آپؐ کی طرف منسوب حدیث حکمت و اخلاق کے عام اصول کے خلاف ہو،

(۱۴) آپؐ کی طرف منسوب حدیث قواعد طب (جس پر اتفاق کیا گیا ہو) کے خلاف ہو،

(۱۵) آپؐ کی طرف منسوب حدیث تاریخی حقائق کے خلاف ہو،

(۱۶) آپؐ کی طرف منسوب حدیث کے خلاف صحیح شواہد ایسے موجود ہوں جن سے اس کا باطل ہونا ظاہر ہوتا ہو۔

(۱۷) آپؐ کی طرف منسوب حدیث اللہ تعالٰی کی تنزیہ و کمال کے خلاف ہو۔

(۱۸) آپؐ کی طرف منسوب حدیث صداقت قرآن کے خلاف ہو۔

(۱۹) آپؐ کی طرف منسوب حدیث سنت صریحہ کو کھلم کھلا توڑنے والی ہو۔

(۲۰) آپؐ کی طرف منسوب حدیث ان تمام قواعد کے خلاف ہو جو قرآن و سنت سے مستنبط کئے گئے ہیں۔

(۲۱) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں آئندہ واقعات کی ایسی پیشین گوئی ہو جو مہینہ اور سال کے تعین کے ساتھ ہو۔

(۲۲) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں چھوٹے کام پر بھاری ثواب کی بشارت ہو۔

(۲۳) آپؐ کی طرف منسوب حدیث میں چھوٹی بات پر سخت وعید کا مبالغہ ہو۔

(۲۴) آپؐ کی حدیث روایت کرنے میں کوئی مفاد گروہی عصبیت دین و مسلک کے اختلاف کو دخل ہو ان اصولوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم نے حدیثوں کے جانچنے کے لیے کسقدر بلند معیار قائم کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی محدثین نے کچھ کلی قواعد ذکر کئے ہیں، جن میں ابواب کے تحت روایتوں کو موضوع قرار دیا گیا ہے،

طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔[۱]

---

[۱] ابوالحسن علی بن محمد کتانی، حوالجات اور مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعہ ابوحفص عمر بن بدر الموصلی المغنی عن الحفظ والکتاب مقدمہ، طاہر بن صالح بن احمد جزائری توجیہ النظر الی اصول الاثر ملا علی قاری، موضوعات کبیر فصل و نحن ننبہ علی امور کلیۃ، مولانا عبدالحی لکھنوی، ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی، الموضوع شاہ عبدالعزیز عجالہ نافعہ، خاتمہ، شمس الدین محمد سخاوی، فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث الموضوع، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی، علامات الوضع فی المتن ص ۲۳ ابن قیم المنار المنیف فصل ۲ ومن امارات الحدیث الموضوع طاہر پٹنی تذکرۃ الموضوعات باب المعقول و باب المجرب و صنوف الحیوان وغیرہا
(بقیہ حاشیہ صفحہ)

نقد کے اصول بھی داخلی میں شامل ہیں | داخلی نقد یعنی حدیث کو جانچنے کے ان مستقل اصول
ند کے علاوہ سند کو جانچنے (خارجی نقد) کے جو اصول مقرر ہیں ان کا تعلق بھی داخلی نقد سے
بعض اصول داخلی نقد حدیث کے لیے خاص ہیں۔ مثلاً

مرفوع : وہ حدیث جس کی سند کی انتہا رسول اللہؐ تک پہونچے،

موقوف : وہ حدیث جس کی سند کی انتہا صحابیؓ تک پہونچے۔

مقطوع : وہ حدیث جس کی سند کی انتہا تابعی تک پہونچے۔

مختلف الحدیث : وہ حدیث جس کی دوسری حدیث معارض ہو اور کسی دشواری
نیز دونوں کے مفہوم کو جمع کرنا ممکن ہو،

ناسخ ومنسوخ : . . . . وہ دو حدیثیں جن کو جمع کرنا
ہو ایسی صورت میں دونوں کی تاریخ کے لحاظ سے ایک مقدم اور دوسری موخر ہو
منسوخ اور دوسری ناسخ ہوگی، ایسی صورت میں دونوں کا موقع ومحل متعین
جائے گا۔

بعض اصول داخلی وخارجی نقد دونوں میں مشترک ہیں، مثلاً حدیث کی پہلی تقسیم
۔ وہ حدیث جو راستباز (عادل)، اور قوی حافظہ والے شخص سے روایت ہو اور

حاشیہ ص) ابوغدہ تعلیق المنار المنیف، العجلونی، کشف الخفاء، ج ۱ ص ۱۰۰، ابن جوزی
المتناہیۃ (مخطوطہ)، محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی المقاصد الحسنۃ، جلال الدین سیوطی، اللآلی المصنوعۃ فی
یث الموضوعۃ، محمد بن شوکانی الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ، محمد بن عبدالباقی الزرقانی شرح
اہب اللدنیہ، ابن تیمیہ، کتاب التوسل، عبدالحی لکھنوی، الآثار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ، ابن جوزی:
الموضوعات، ابن عراق الموضوعات (مخطوطہ)،

معلل و شاذ نہ ہو۔

حسن۔ وہ حدیث جس میں اگرچہ "صحیح" کی شرطیں پائی جائیں لیکن اس کے بلند معیار سے کسی درجہ فروتر ہوں،

ضعیف وہ حدیث جس میں صحیح کی کل یا بعض شرطیں نہ پائی جائیں۔

حدیث صحیح کی شرط یہ ہے کہ وہ شاذ اور معلل نہ ہو۔

شاذ۔ وہ حدیث ہے، جس کے الفاظ کی زیادتی یا کمی میں ثقہ راوی ثقہ جماعت کی مخالفت کرے، اور دونوں کے درمیان جمع ممکن نہ ہو۔ یہ مخالفت کبھی سند اور کبھی متن میں ہوتی ہے،

معلل۔ وہ حدیث جس میں کسی علت کی وجہ سے اس کی صحت مجروح ہو جائے حالانکہ ظاہر میں کوئی خرابی نہ معلوم ہو، علت سے مراد وہ خفی اور باریک اسباب ہیں جو حدیث کو دوسری میں شامل کر دیں، یا اس کے مثل جو بھی تبدیلی حدیث کی صحت کو مجروح کر دے وہ علت میں داخل ہوگی، علت سند اور متن دونوں میں پائی جاتی ہے۔

منکر۔ وہ حدیث جس کا راوی تنہا ہو، اور اس شخص کے علاوہ نہ اس طریق سے اور نہ دوسرے طریق سے حدیث کے متن کا پتہ چل سکے۔

مضطرب۔ وہ حدیث جس میں روایت کے الفاظ مختلف ہوں کوئی راوی کسی طرح روایت کرے اور کوئی اس کے مخالف طریقہ سے روایت کرے۔

مصحف۔ وہ حدیث جس میں لفظ یا معنی کو بدل دیا جائے سننے کی غلطی سے ہو یا دیکھنے کی غلطی سے ہو۔

مقلوب۔ وہ حدیث جس میں کسی راوی سے متن میں کوئی لفظ الٹ جائے یا سند میں کسی راوی کا نام الٹ جائے یعنی جس کو مقدم ہونا چاہئے وہ مؤخر ہو جائے اور جس کو

مؤخر ہونا چاہیئے، وہ مقدم ہو جائے یا کسی نام و لفظ کی جگہ کوئی دوسرا نام و لفظ رکھ دیا جائے،

مدرج ۔ وہ حدیث جس کے متن یا سند میں ایسی زیادتی کا پتہ چلے جو اس کا جز نہیں ہے[1]۔

درایت کی عام و خاص تعریف

خارجی نقد کے اور بھی بعض اصول ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں، جن کی بناء پر محدثین نے درایت کی ایسی تعریف بھی کی ہے جو دونوں پر صادق آتی ہے، مثلاً "درایت حدیث وہ علم ہے، جس سے راوی کی شرطیں، روایت کی قسمیں اور اس کے احکام کی معرفت ہوتی ہے، نیز مرویات کی قسمیں اور ان کے معانی کا استخراج ہوتا ہے، یہ درایت کی عام تعریف ہے خاص تعریف یہ ہے،

درایت حدیث وہ علم ہے، جس میں الفاظ حدیث سے سمجھے گئے مفہوم و مراد سے بحث ہوتی ہے کہ وہ عربی قواعد و شرعی ضوابط پر مبنی اور رسول اللہؐ کے احوال کے مطابق ہو یا نہ[2]۔

اکثر و بیشتر داخلی و خارجی نقد میں ٹکراؤ نہیں ہوتا،

خارجی و داخلی نقد کے اکثر و بیشتر اصولوں میں اشتراک کی وجہ سے بالعموم خارجی و داخلی نقد میں ٹکراؤ نہیں ہوتا، بلکہ خارجی نقد (سند) کے لحاظ سے جو حدیث صحیح ہوتی ہے وہ داخلی (متن) کے لحاظ سے بھی صحیح ہوتی ہے، اس کے باوجود سند و متن کی

---

[1] ابن حجر عسقلانی، نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر، ابن صلاح، مقدمہ ابن صلاح، شیخ عبدالعزیز خولی تاریخ فنون الحدیث، التقیید والایضاح بمعرفۃ المنکر، محمد بن علی فارسی جواہر الاصول، حسن محمد المشاط رفع الاستار، ڈاکٹر صبحی صالح، علوم الحدیث و مصطلحہ۔ [2] طاہر بن صالح، توجیہ النظر الی اصول الاثر، ارشاد المقاصد لہ مقدمہ تحفۃ الاحوذی (عبدالرحمٰن مبارکپوری) جلال الدین سیوطی، تدریب الراوی، نور الدین عتر المدخل، مقدمہ لابن الصلاح، زین الدین بن علی، شرح البدایہ فی علم الدرایہ مخطوطہ، طاش کبری زادہ مفتاح السعادۃ، حاجی خلیفہ، کشف الظنون، نواب صدیق حسن خان، ابجد العلوم۔

صحت کے درمیان تلازم نہیں ہے، یعنی جب ایک صحیح ہو تو لازمی طور سے دوسرا بھی صحیح ہو یا ایک حسن ضعیف ہو تو لازمی طور سے دوسرا بھی حسن و ضعیف ہو، چنانچہ محدثین جب سند کی صحت وغیرہ کا حکم لگاتے ہیں تو وہ متن کے لئے لازم نہیں ہوتا، اسی طرح جب متن کے بارے میں کوئی حکم لگاتے ہیں تو وہ سند کے لئے لازم نہیں ہوتا۔

داخلی و خارجی میں ٹکراؤ کی شکلیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خارجی نقد (سند) کے لحاظ سے حدیث صحیح ہوتی ہے، لیکن داخلی نقد کے لحاظ سے پایۂ اعتبار سے ساقط ہوتی ہے، اس کی عموماً دو شکلیں ہیں۔

(الف) بعض بددین اور جھوٹے راوی کسی موضوع حدیث کو ثقہ راویوں کی حدیث میں داخل کر دیتے ہیں، پھر یہ داخل شدہ حدیث ثقہ راوی کی حدیث سمجھ کر روایت کی جاتی ہے، مثلاً۔ ابن ابی العوجاء جو حماد بن سلمہ کا ربیب (سوتیلا لڑکا) تھا، وہ ثقہ راویوں کی حدیث میں یہ حرکت کیا کرتا تھا،

(ب) کوئی راوی جھوٹے اور ضعیف لوگوں سے حدیث سنتا جس کو یہ لوگ اپنے شیخ سے روایت کرتے تھے، لیکن روایت حدیث میں حرص کی وجہ سے یہ راوی درمیان سے جھوٹے اور ضعیف لوگوں کے نام نکال کر براہ راست شیخ سے روایت کرنے لگتا تھا، جس سے حدیث مقلوب ہو جاتی تھی مثلاً بقیہ بن ولید کے شاگرد ایسا کر کے اس کی حدیثیں بگاڑ دیتے تھے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ داخلی نقد کے لحاظ سے حدیث صحیح ہوتی ہے، لیکن خارجی کے لحاظ سے وہ اس درجہ کی نہیں ہوتی، اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ متن حدیث دوسرے طریق سے بھی مروی ہو، جس میں اس طریق والی خرابی نہ پائی جائے۔

داخلی و خارجی نقد کے ٹکراؤ کی دوسری صورت کا پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہے، البتہ

پہلی صورت کی پہچان زیادہ مشکل ہے، جس کے لیے فنی ذوق کے بغیر چارہ نہیں ہے، یہ فنی ذوق رسول اللہ کے الفاظ کی بکثرت ممارست سے پیدا ہوتا ہے یہ ایک خاص قسم کی نفسی کیفیت اور مضبوط ملکہ ہے جس کے ذریعہ نبوت کے الفاظ کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ کیا ہیں۔ اور کیا نہیں۔[1]

ٹکراؤ کے دفعیہ کے لیے کتب حدیث کی تقسیم۔	سہولت کے لیے خارجی و داخلی نقد حدیث کے ٹکراؤ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے،

۱۔ غیر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ۔

۲۔ مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ۔

اگر غیر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ ہے تو پہلے مستند کتب کی طرف رجوع کیا جائے گا، اور ان میں نظیر موجود ہے تو روایت کی حیثیت متعین کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی اور اگر کوئی نظیر نہیں ہے تو بالعموم خارجی نقد کے ذریعہ حدیث کی تحقیق ہو جائے گی،

اور اگر مستند کتب حدیث کی روایت میں ٹکراؤ ہے اور خارجی نقد کے لحاظ سے وہ صحیح ہے تو پہلے کلام نبوت کی حیثیت سے اس کا محل متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی، اگر اس سے ٹکراؤ دور نہ ہوا تو پھر داخلی نقد کی بنیاد بنا کر اس کے صحیح وغیر صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا،

شاہ ولی اللہ کے نزدیک محدثین کی معتمد علیہ اور ان کی توجہات کا مرکز حدیث کی

---

[1] حسن بن محمد صاغانی، رفع الاستار، ابن جوزی کتاب الموضوعات۔ ڈاکٹر صبحی الصالح علوم الحدیث و مصطلحہ، سخاوی، المقاصد الحسنہ، محمد جمال الدین قاسمی قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث، محمد صباغ مقدمہ الاسرار المرفوعہ (موضوعات کبیر کا اصل نام) امیر یمانی توضیح الافکار

یہ کتابیں ہیں۔

موطا، بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، مسند احمد و نسائی،

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحیح حدیثیں صرف ان ہی کتابوں میں ہیں ان کے علاوہ اور کہیں ان کا وجود نہیں ہے، امیر یمانی کی کتاب "توضیح الافکار لتنقیح الانظار فی اصول الحدیث" میں ایک مستقل باب "عدم انحصار الصحیح فی کتب الحدیث" کے نام سے ہے، جس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے، شاہ ولی اللہ نے بقیہ کتابوں کی حدیثوں کو غیر صحیح نہیں قرار دیا ہے، بلکہ ان کی تحقیق کا کام ماہرین حدیث کے سپرد کیا ہے،

نقد حدیث میں جس طرح خارجی کی اہمیت ہے اسی طرح داخلی کی بھی ہے، اس اہمیت کے باوجود ہر موقع پر صرف خارجی نقد کو بنیاد بنانا اور بات نباہنے کے لیے حدیث کی ناقابل قبول تاویل سے بھی دریغ نہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، "جواہرات" کے ڈھیر میں، اگرچند خزف ریزوں کی آمیزش ہو تو ڈھیر کی عظمت اس میں ہے کہ ان کو خزف ریزہ تسلیم کیا جائے نہ کہ دور از کار تاویل کے ذریعہ ان کو جواہرات ثابت کیا جائے۔ اس سے خزف ریزے تو جواہرات میں نہ تبدیل ہو سکیں گے البتہ ان کی وجہ سے جواہرات کی قدر و قیمت یقیناً گھٹ جائے گی۔[1]

داخلی نقد کے سلسلہ میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ حدیث کا ماخذ (سرچشمہ) شعور نبوت ہے، اس کو جو خصوصیات حاصل ہیں وہ کسی اور کے شعور کو حاصل نہیں ہیں؛

---

[1] شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ باب طبقات کتب الحدیث محمد بن وزیر یمانی الروض الباسم فی الذب عن سنۃ، قاضی حسن بن عبد الرحمٰن الرامہرمزی المحدث الفاصل بین الراوی والواعی

ابن جوزی کتاب الموضوعات،

لازمی طور سے شعور نبوت سے نکلی ہوئی بات (حدیث) عام لوگوں سے ممتاز اور اس کی نقد و تحقیق کا پیمانہ دوسروں کے پیمانہ سے مختلف ہوگا، ورنہ نبی اور غیر نبی کے کلام میں فرق و امتیاز نہ قائم رہ سکے گا۔[1]

افراط و تفریط کے دو گروہ | بدقسمتی سے حدیث کے نقد میں بھی افراط و تفریط کے دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں، جنھوں نے نبوت کی قدر و منزلت نہیں پہچانی۔

(۱) ایک گروہ نے کلام نبوت (حدیث) کو جانچنے کے لیے اسی پیمانہ سے کام لیا جو عام لوگوں کے کلام کو جانچنے کیلئے مقرر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہر ایسی حدیث سے انکار کر دیا، جس میں کوئی علمی حقیقت بیان ہوئی تھی، اور رسول اللہؐ کے زمانہ میں وہ مشہور نہ تھی، یا کوئی خوشخبری سے متعلق تھی، جس کا ابھی وقت نہ آیا تھا، یا قانونیہ و حکمت کا اصول بیان ہوا تھا، جو اس وقت کی ذہنی سطح سے بلند تھا، اگرچہ بعد میں اس کا رواج ہو گیا، حالانکہ رسول اللہؐ صاحب وحی تھے، اسرار غیب سے بھی ایک حد تک واقف تھے، علم و حکمت کی ترویج اور قانون و شریعت کا نفاذ آپ کا خاص مشن تھا، اس لیے آپ نے اگر کوئی بات وقت کی ذہنی سطح سے بلند کہی یا قانون و اصول اس انداز سے بیان کئے کہ بعد میں فلسفہ یا قانونی کلیہ سے مشابہ قرار پائے تو نہ شان نبوت پر حرف آتا ہے، اور نہ کسی منطقی و فلسفی سے متاثر ہونے کا سوال اٹھتا ہے۔

(۲) دوسرے گروہ نے رسول اللہؐ کی طرف منسوب جو بات بھی دیکھی، اسکو حدیث قرار دینے میں دین و مذہب کی سب سے بڑی خدمت سمجھ لیا، خواہ اس کی خاطر کتنی ہی

---

[1] القرآن، ابن تیمیہ، شرح العقیدۃ الاصفہانیہ، ابن خلدون مقدمہ ابن خلدون، غزالی، المنقذ من الضلال، القول فی خواص النبوۃ، الشیخ احمد سرہندی، مکتوبات مجدد۔ جلد سوم

دور دراز تاویل کرنی پڑے اور معیار نبوت گر کر کہیں سے کہیں پہونچ جائے،

عدل واعتدال کی راہ | عدل واعتدال کی راہ یہ ہے کہ مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیثوں کے پرکھنے کے اصول وضوابط پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے، اگر اس کے بعد بھی حدیث کی معرفت میں واقعی دشواری قائم رہے تو فقہ کی طرح حدیث کی معرفت میں بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ماہرین حدیث کو مزید اصول وضوابط وضع کرنے اور ان کے ذریعہ حدیث کی معرفت حاصل کرنے کا حق ہے،

ابتک اس سلسلہ کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی گئی، یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، مصر کے مشہور مصنف احمد امین نے چند اصول وضع کئے ہیں، جن کے بارے مین مصنف کا دعویٰ ہے کہ ماہرین حدیث نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی لیکن غور سے دیکھنے اور مذکورہ اصولوں سے مقابلہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ یہ محض "احمد امین" کا دعویٰ ہے، نئے اصول کے نام سے جو انھوں نے بیان کئے ہیں، وہ سب مذکورہ اصولوں میں داخل ہیں،

غرض مقام نبوت تسلیم کرنے کے بعد حدیث کی معرفت کے لیے جس نئے اصول کی بھی ضرورت ہو، اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہئے اسی طرح جن حدیثوں پر گفتگو ہو چکی ہے، ان پر اگر مزید گفتگو کی ضرورت سمجھی جائے تو اس سے انکار نہ ہونا چاہئے، اہل علم کی مساعی انتہائی قابل قدر ہونے کے باوجود نہ آخری ہیں، اور نہ بذریعہ وحی ان کی تصدیق ہوئی ہے، البتہ حدیث کی معرفت اور اس کے لئے نئے اصول وضع کرنے کا کام (بالفرض اگر ضرورت محسوس ہو) ماہرین کے سپرد ہونا چاہئے، جو حدیث کے نوک پلک سے واقف ہوں اور

اس سلسلہ میں غیر ماہر فن کی بات قابل اعتبار نہ ہو سکے گی، جیسا کہ اور علوم و فنون میں غیر ماہر فن کی بات قابل اعتبار نہیں ہوتی ہے۔[1]

درون خانۂ خود ہر گدا شہنشاہ است
قدم بروں منہ از حد خویش سلطان باش

---

[1] ابن جوزی، کتاب الموضوعات، ڈاکٹر صبحی صالح علوم الحدیث و مصطلحہ احمد امین، فجر الاسلام الفصل الثانی وضحی الاسلام الفصل الرابع۔

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

محدثین کرام کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف شروع ہی سے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر تھی، لیکن یہ کام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے دور نظامت میں انجام پایا۔ جس کے کئی حصے ہیں۔

حصہ اوّل میں امام مالک اور ائمہ صحاح کے علاوہ جن کی صحاح درس میں داخل اور تمام عربی مدارس میں متداول ہیں، دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح، فن حدیث سے متعلق ان کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں اور ماخذوں کے ذریعہ بہت ہی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے،

حصہ دوم۔ چوتھی صدی کے آخر سے آٹھویں صدی ہجری تک کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین اور اصحاب حدیث کے حالات، محدثین اور اصحاب حدیث کے حالات، حدیثی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

حصہ اوّل۔ قیمت ۱۲ــــ حصہ دوم قیمت ۔ ــــ ۱۲ مولفہ ضیاء الدین اصلاحی

"منیجر"

نعت قدسی اور اس کا مصنف

از ڈاکٹر سمیع الدین احمد ریڈر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۳)

میرے معروضات کی تردید میں گپتا صاحب کا اگلا بیان (ص ۳۰۱ پر) یہ ہے:

"تضمین کے خمسہاے غزل قدسی کے سرورق پر قطعہ تاریخ طبع سے پہلے

یہ الفاظ ہیں:-

"تاریخ طبع خمسہاے غزل قدسی فخر شعرا"

طباعت کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں فارسی کا شباب ابھی باقی تھا، غالب، مومن، صہبائی، آزردہ سب حیات تھے، کیا اسوقت یا اس سے تھوڑا پچاس سال پہلے کا کوئی ایسا عظیم دہلوی شاعر جس کا نام محمد جان تخلص قدسی تھا، اور جو اس لائق تھا کہ اسے فخر شعرا کہا جا سکے، اس وقت کے فارسی گویوں اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا؟"

جواب میں عرض ہے کہ اول تو قدسی کے ساتھ "فخر شعرا" کی شمولیت سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ وہ قدسی ہی کے لیے استعمال کئے گئے ہیں، محض قیاسی رائے زنی ہے، اس کو قطعیت کا درجہ بالکل نہیں دیا جا سکتا، یہ عام بات ہے کہ تذکرہ نویس

(نقاد اور محقق نہیں) مورخ، سیرت نگار، وغیرہ ان لوگوں کے لیے جن کا ذکر وہ کسی وجہ سے عقیدت مندی یا احترام کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، اور ان کے ذاتی صفات یا خصوصیات کو امتیازی حیثیت دینا چاہتے ہیں، ان کے نام کے اول یا آخر بڑے بڑے مبالغہ آمیز تعریفی اور توصیفی کلمات الفاظ اور فقرے جوڑ دیتے ہیں، اس قسم کی مدح سرائی فارسی اور اردو ادب کی نمایاں خصوصیت رہی ہے، اور اس سے ہر ذی علم بخوبی واقف ہے لہذا فخر شعرا کا کلمہ کسی امتیازی خصوصیت کا حامل نہیں، تذکرہ نویس ہوں یا مرتبین کلام جس سے خوش ہوئے یا جس کو خوش کرنا چاہا اور ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا مقصود ہوا تو کوئی نہ کوئی بہتم بالشان قسم کا لقب نام کے ساتھ شامل کر دیا، مبالغہ آمیز القاب کا استعمال تذکرہ نگاروں خاص طور سے متاخرین نے عام طور سے کیا ہے، اگر ان تذکروں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی،

اس بات کے ثبوت کے لیے میں اسی شخص کا بیان نیچے پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے فخر شعرا کا فقرہ استعمال کرکے ہم سب کو اور خصوصیت کے ساتھ فاضل مضمون نگار کو وہم میں ڈال دیا ہے، گپتا صاحب نے (صفحہ ۲۰۹ پر) لکھا ہے کہ کتاب (یعنی مخمسہ غزل قدسی یا چمن مدح نبی) کے آخری صفحات میں مخمسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکر شعراء" ہے، جس میں مرتب سمیت ایک سو ستر سات شعرا کا ذکر ہے، جن کے مخمسے زینت کتاب ہیں، یہ بات واضح ہے کہ چند بڑے سخنوروں کو چھوڑ کر جیسے غالب، مومن، ظفر، آزردہ، صہبائی . . . . . سب دوسرے معمولی درجہ کے شاعر ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ مخمسین (مرتب مجموعہ) نے ان سب کو

جو بہت بڑی اکثریت میں ہیں "اقلیم سخن کے سرور" کے بلند پایہ لقب سے یاد کیا ہے۔

ع ہیں یہ مشہور سب اقلیم سخن کے سرور

اور یہی نہیں بلکہ سخن رس، سخن سنج، بے مثل و عدیل (یہ سخن رس ہیں، سخن سنج ہیں، بے مثل و عدیل) بھی بتایا ہے، جب ان معمولی شاعروں کو اقلیم سخن کے سرور، سخن رس، سخن سنج اور بے مثل و عدیل کہا جا سکتا ہے تو کسی دوسرے شاعر کو فخر شعرا کہہ دینا کون سی حیرت کی بات ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو فخر شعرا اور اقلیم سخن کے سرور میں معنوی اعتبار سے سر مو فرق نہیں بلکہ فخر شعرا کے مقابلہ میں اقلیم سخن کے سرور میں زیادہ وزن اور جان ہے، آگے چل کر (ص ۲۹۹) گپتا صاحب رقمطراز ہیں۔

"(۱) قطعہ میں خود تحسین مجسم انکسار بنے دست بستہ کھڑے ہیں"۔

ان میں تحسین بھی داخل ہے گرچہ فقیر آگے شاہوں کے کھڑا ہو تو بحال ابتر

گویا ان اقلیم سخن کے سروروں کا مرتبہ اور بھی بڑھ گیا اور بمنزلہ شاہ ہو گئے۔

کیا فاضل مقالہ نگار مجھے بتا سکیں گے کہ ان چند گنتی کے بڑے شاعروں کو چھوڑ کر معمولی شعرا میں سے کون کون اقلیم سخن کے سرور کہلانے کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں؟ کیا واقعی اس وقت کے "نامی گرامی شعرائے ہند[1]" مثلاً میاں اوج، خیر الدین تخلص خیر ساکن پانی پت قوم شیخ، میاں ذائق، مرزا پیارے صاحب میاں رحمت صاحب، میاں احمد خان دہلوی شہرہ تخلص، مرزا حاجی صاحب تخلص شہرت، میاں خان صاحب دہلوی صفیر تخلص، سید حیدر علی صاحب جالیسری المتخلص بہ طیب حضرت مولانا مولوی محمد ظہور علی صاحب تھانہ دار ظہور تخلص، میاں عاجز صاحب سلمۂ اللہ تعالیٰ، منشی عزت سنگھ صاحب دہلوی تخلص عیش، حکیم آغا جان صاحب عیش

---

[1] نامی گرامی شعرائے ہند، کا فقرہ خصوصی توجہ کا طالب ہے۔

میاں عبدالغنی صاحب ساکن بریلی غنی تخلص، میاں فنا صاحب، مرزا منجھلے صاحب المتخلص بہ فسوں، کیفی صاحبہ از خاندان امیر تیمور، میاں مخیر صاحب، میاں دلدار علی صاحب مذاق تخلص، محمد اکبر متوطن سہراوہ (؟) تھانہ دار رہیم (؟) مخلص تخلص، سید محمد علی تکن پوری معز تخلص، میاں مہر صاحب، مرزا عجیبت شاہ صاحب ماہر تخلص، مرزا الٰہی صاحب نازنین تخلص، میاں نامی، سید احمد حسن تخلص صارم وغیرہم میں سے ایک بھی اس قابل ہے، کہ اسے "اقلیم سخن کا سرور" کہہ کر پکارا جائے یا" نامی گرامی شعرائے ہند" کے زمرہ میں شمار کیا جائے؟[1]

اگر سیرت نگاری کا یہی معیار ہو کہ مدحیہ القاب کو سامنے رکھ کر ہی کسی شاعر کا ذکر خواہ وہ کتنے ہی معمولی درجہ کا کیوں نہ ہو تذکروں میں درج کیا جاتا چاہیئے تو پھر ان سب معمولی حیثیت کے شعرا کے حالات جن میں سے ہر ایک کو تحسین نے 'سرور اقلیم سخن' کہا ہے ضرور اس عہد کے تذکروں اور تاریخوں کی زینت ہونے چاہیئے تھے،

اس بات کا کھلا ہوا ثبوت کہ جوش غلو میں تذکرہ نویس یا شاعر اپنے ممدوح کی ذات کو کس درجہ والا صفات اور عالی مقام بنا دیتے ہیں، تحسین کے اس توصیفی شعر سے ملتا ہے، جو اس نے کتاب کے آخر میں اپنے قطعہ "در ذکر شعرا" میں بہادر شاہ ظفر کے لیے لکھا ہے، گپتا صاحب کے بیان (ص۲۹۱) کے مطابق قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے، یعنی

معنی بیت دو عالم شہ ذیجاہ ظفر معنی لفظ سخاوت شہ با فتح و ظفر[2]

ظاہر ہے کہ معنی بیت دو عالم کہہ کر ظفر کا درجہ کس قدر بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے علی الرغم غالب جیسے عظیم شاعر اور صاحب فن کے لیے صرف "ماہر فن سخن" کا لقب کافی سمجھا گیا، یعنی :-

---

[1] ان نام نہاد نامی گرامی شعرائے ہند کی فہرست خاصی طویل ہے، میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے،
[2] (حاشیہ آگے صفحے پر ملاحظہ ہو)

ماہرِ فنِ سخن یعنی جناب غالبؔ کہ ہیں حُبِّ اسد اللہ کے بیشک مظہر

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیرت نگار یا شاعر حضرات کے بیانات کس درجہ ناقابلِ ا
اور بے بنیاد ہو سکتے ہیں اور ان کی تنقیدی بصیرت کس قدر قابلِ گرفت ہو سکتی ہے، ا
ایسے دعیہ القاب کو کسی تحقیقی نکتہ اور اصول کی بنیاد بنا لینا مناسب اور صحیح نہیں ہے،
.. یہ صحیح ہے کہ مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ سے وقت کی تعیین نہیں ہو سکتی لیکن عموماً کہ
شاعر کو جو فوت ہو چکا ہے خواہ وہ کتنا ہی عظیم اور ممتاز کیوں نہ ہو، مرحوم، اور رحمۃ اللہ
کے القاب کے ساتھ یاد نہیں کرتے،

گپتا صاحب لکھتے ہیں کہ "کوئی شخص کسی زمانہ میں فوت ہوا ہو اس کے لیے یہ الفا
بولے اور لکھے جاتے ہیں"۔ میری حقیر رائے میں موصوف کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، ا
تو یہ کہ یہاں معاملہ صرف ایک شخص کا نہیں بلکہ شاعر کا ہے، ادب اور شعر و شاعری
پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ ڈالیے کسی بھی ادیب و شاعر کو خواہ وہ امتیازی حیثیت کا ما
ہی کیوں نہ ہو، اور وفات پا چکا ہو، مرحوم کہہ کر نہیں پکارا جاتا، وہ صرف اپنی ذا
سے پہچانا جاتا ہے کسی نے سنا یا پڑھا نہ ہوگا کہ انگریزی کے کسی بڑے شاعر و ادیب مثلاً
شکسپیر، کولرج، ورڈس ورتھ، ٹینی سن وغیرہ کے لیے "Late" کا لفظ استعما
جاتا ہو، یا پھر فارسی ادب کی تاریخ میں کہیں بھی مرحوم فردوسی، رودکی رحمۃ اللہ علیہ، م
شیخ سعدی، افضل الدین خاقانی مرحوم و مغفور، مرحوم عبید زاکانی، خیام رحمۃ اللہ ع

(حاشیہ ص ماقبل) گپتا صاحب کے مضمون میں ص ۹۰ پر یہ مصرعہ یوں لکھا ہوا ہے ا۔ لفظ معنی سخا
فہ با فتح وظفر جو بظاہر صحیح نہیں ہے، یہ سہو یا تو تحسین کی غلطی سے غزل قدسی (چھپ رہا تھا) کے کاتب
گپتا صاحب اس کی تصحیح نہیں کر سکے، یہ بھی ممکن ہے کہ موصوف کو سہو ہو گیا ہو یا پھر ان کے اس مضمون کی کتاب
جو زیرِ نظر ہے،

مرزا حبیب قاآنی مرحوم، علامہ فقید محقق دوانی قدس اللہ سرہٗ یا سراج الدین علی خان آرزو مرحوم و مغفور وغیرہ کلمات لکھے ہوئے ملتے ہوں۔

متقدم اور متاخر تذکروں اور کتب تاریخ میں بھی عموماً متوفی شاعروں اور سخنوروں کے نام کے ساتھ یہ الفاظ منسلک نہیں ملتے۔ یہاں تک کہ قریب العہد شعرا کے لیے بھی عام طور سے یہ کلمات مستعمل نہیں، مثلاً کوئی بھی میر تقی میر کو مرحوم میر تقی میر، یا غالب کو مرزا اسد اللہ خان غالب رحمۃ اللہ علیہ یا مومن و داغ کو حکیم مومن خان مومن علیہ الرحمۃ اور نواب مرزا خان داغ مرحوم و مغفور نہ لکھتا ہے، اور نہ کہہ کر پکارتا ہے۔ کہیں کہیں یہ کلمات خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کے لیے ضرور استعمال ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں، جو اپنے تقدس ذات کے لیے مشہور رہیں لیکن ان کا شمار مستثنیات میں سے ہے،

۷۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حاجی شمشیر علی نے صحیفۂ قدسی کی ترتیب و تدوین سے تقریباً گیارہ سال پہلے یعنی ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں مجموعہ نعت کے دو حصے چھپوا کر شائع کر دیے تھے، اس بات سے اور خود اس کے اپنے قول سے کہ وہ ہمیشہ سے رسولؐ اکرم کی مدح خوانی کا شائق تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

نعت گوئی یعنی شاعروں کے موزوں کردہ نعتیہ کلام اور بالخصوص مدح خوانی رسولؐ اکرم سے اس کا تعلق ثابت ہو جاتا ہے، اور یقیناً اسی بنا پر (جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے) حدیث قدسی یا قدسی سے کسی قسم کی واقفیت سے پیشتر ہی شائقین نعت رسولؐ کے مطالبات کے پیش نظر وہ نعت رسولؐ کے دو مجموعے ترتیب دے چکا تھا لہٰذا حاجی شمشیر علی کو قدسی سے اس معنی میں خواہ رسمی اور سطحی ہی کیوں نہ ہو، ضرور تعلق خاطر تھا کہ چونکہ مدح و نعت رسولؐ اس کا مشغلۂ خاص تھا لہٰذا خصوصی طور پر

ایک ایسے شاعر سے بھی جس کی نعتیہ غزل شہرت عام کی حامل تھی، اور جس کے خمسوں اور تضامین کی جمع آوری اس کے فطری ذوق اور مادی ضروریات سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس کو ایک طرح کی مناسبت پیدا ہو گئی تھی، اور ایسی صورت حال میں ایک قسم کا معنوی رشتہ قائم ہو جانا بالکل فطری امر تھا، جس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی، اسی قسم کا تعلق خاطر اس کو امیر خسرو دہلوی سے بھی تھا، جس کی تفصیل میں نے آئندہ سطور میں پیش کی ہے، علاوہ بریں اگر یہ شوق حدیث قدسی یا کسی اور مجموعہ تضامین کے مطالعہ کے بعد وجود میں آتا تو اس شوق کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی، لیکن چونکہ یہ سلسلہ پہلے ہی سے موجود تھا لہذا حدیث قدسی کو دیکھتے ہی اس کے شوق میں اضافہ ہو گیا، اور وہ غزل قدسی کے خمسوں کی جمع آوری اور تدوین میں لگ گیا، صرف یہی نہیں بلکہ جیسا کہ اس نے صحیفہ قدسی کے آخر میں لکھا ہے، اس نے امیر خسرو کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے :-

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آزری ہر چند وصفت می کنم در حسن زان زیباتری

کی تضمینوں کی جمع آوری کا سلسلہ بھی شروع کیا،[1] اور باقاعدہ اس کام کے لیے اخباروں میں اشتہار بھی دینا شروع کئے تھے، وہ لکھتا ہے :-

"بندہ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کی غزل کے خمسے جمع کرنے شروع کئے ہیں، میرا ارادہ ہے کہ انشاء اللہ ان کو اسی طرح چھپوا دوں، اس لیے عرض ہے کہ جن صاحب کے پاس اس غزل کا خمسہ یا مثلث یا مسدس ہو یا اب طبع آزمائی فرمائیں اور مجھ کو مرحمت کریں تو میں بعد چھپنے کے ایک کتاب ان کو نذر کر دوں گا"[2]

---

[1] اس بات کا ذکر میں نے اپنے گزشتہ مقالہ میں کیا ہے [2] کیا خسرو کی غزل کے خمسوں کی ترتیب و جمع آوری کیلئے بھی اس نے کسی نسخہ صحیفہ قدسی یا جریدہ روزگار سے سرقہ اور نقل کا بندوبست کر لیا تھا؟

غزل یہ ہے :- ؎

ای چہرۂ زیبای ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

"گو گذشتہ مجموعہ ہائے نعت تو اس نے طالبین و شائقین مدح رسول اکرم کی خواہش اور تقاضوں کے جواب میں ترتیب دے تھے لیکن غالباً خسرو کی غزل کے خمسوں کی تدوین وجمع آوری کا خیال اور شوق اس کو از خود اپنے فطری ذوق وضرورت کی بنا پر پیدا ہوا تھا اگر اس کو اس شغل سے مناسبت نہ ہوتی تو وہ خود ہی بغیر کسی کے ایما وسفارش کے اس چیز کو اخباروں میں مشتہر کیوں کراتا، حدیث قدسی کے مطالعہ کے بعد شاعر متذکرہ کی غزل پر کہے ہوئے خمسوں کی جمع آوری کی خواہش کا ذکر وہ کچھ اس طرح پر کرتا ہے کہ گویا اس کے لیے شاعر کی شخصیت جانی بوجھی سی ہے ، وہ لکھتا ہے ،

"پھر میری نظر سے حدیث قدسی گذری جو کہ ۱۲۷۱ھ میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی، اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا کہ میں بھی قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں ۔"

"قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں" کا ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ غالباً مولف اس کی ذات سے اگر واقف نہیں تو نا آشنا بھی نہیں ، گپتا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ "یعنی حاجی شمشیر علی قدسی سے واقف نہ تھے" [1] اگر واقف نہیں تھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ناواقفیت کے عالم میں انھوں نے اس کا نام لیتے وقت شناسائی کا لہجہ کیوں استعمال کیا، اگر یہ سمجھا جائے کہ چونکہ قدسی مشہدی کی ذات متعارف خاص وعام تھی لہذا جب بھی کہیں کوئی شخص قدسی کا نام لیتا تو لازماً قدسی مشہدی محمد مراد لیتا تھا تو پھر قدسی کی دوسری خصوصیات کا علم بھی اس سے متوقع ہونا چاہیے

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۰

بہرحال ایک ایسے شخص کے لیے جس سے کسی قسم کی واقفیت نہ ہو، عام طور سے بے تکلفی اور آشنائی کا یہ انداز نہیں اختیار کیا جاتا، اور پھر گپتا صاحب یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حاجی شمشیر علی قدسی سے واقف نہ تھے جب کہ فاضل مقالہ نویس اس سے پہلے اپنے مضمون کے صفحہ ۳۰۶ پر لکھ آئے ہیں کہ حاجی سید شمشیر علی نے حاجی محمدؐ جان قدسی کو عمداً دہلوی لکھا ہے گویا مرتب صحیفۂ قدسی کو شاعر (قدسی) کے بارے میں کم وبیش ساری ضروری باتوں کا علم تھا یعنی نام، تخلص، جائے سکونت وغیرہ، نیز یہ بھی علم تھا کہ وہ انتقال کر چکا ہے تبھی تو مرحوم اور رحمۃ اللہ وغیرہ لکھا، اس کے تقدس ذات کی خصوصیت کا بھی بخوبی علم تھا، تب ہی تو حضرت اور مولانا کے القاب استعمال کئے اگر علم نہیں تھا تو بدقسمتی سے صرف اس بات کا کہ وہ حاجی بھی تھا، گویا ناواقفیت کی منزل صرف بجائے 'حاجی' مولانا کے لفظ کے لکھنے سے شروع ہوتی ہے، اور وہیں پر ختم ہو جاتی ہے، قیاس یہی کہتا ہے کہ جب دوسری باتوں کا علم تھا تو یہ بھی علم ہونا چاہیے تھا کہ قدسی حاجی بھی تھا، بہرحال فاضل مقالہ نگار کا ایک جگہ (ص ۳۰۶) حاجی شمشیر علی کو قدسی کا واقف حالات اور دوسری جگہ (ص ۳۰۸) ناواقف قرار دینا ان کے استدلال کو قطعی کمزور اور پھسپھسا بنا دیتا ہے، گپتا صاحب کا دوسرا بیان حسب ذیل ہے،

> "اگر محمدؐ جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو ان کی عدم واقفیت ہے چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے، اس لیے انھیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ قدسی حاجی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے قدسی کو احتراماً مولانا لکھ دیا۔"

اس طرح خود گپتا صاحب کے اس بیان سے حاجی شمشیر علی کے دل میں شاعر

کہ یہ جذبہ احترام کی موجودگی کا ثبوت مل جاتا ہے، لیکن تعظیم کا یہ احساس محض اتفاقیہ امر نہیں معلوم ہوتا، سرورق پر "حضرت مولانا محمد جان صاحبؒ قدسی" اور اصل متن میں مضمون کے آغاز سے پہلے عنوان میں بھی "حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی" لکھا ہوا ہے، اگر توجہ اور غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو 'حضرت' 'مولانا' 'صاحب' 'رحمۃ اللہ علیہ' کے کلمات سے قدسی کی شخصیت کے تعین میں مدد مل سکتی ہے، یہ فقرے یا الفاظ عام طور سے ایسے اصحاب کے لیے مستعمل ہوتے ہیں، جو لوگوں کی نظروں میں (غالباً) اپنی نیکی، ذاتی فضیلت یا درویش منشی اور تقدس ذات کی وجہ سے مستحق تعظیم اور مرجع احترام ہوتے ہیں، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ اس تعلق خاطر کا سرچشمہ وہی احساس عقیدت یا جذبہ احترام ہو جس کی جانب راقم الحروف نے اشارہ کیا ہے، جب ایسی صورت حال ہو تو حاجی شمشیر علی کا شاعر مذکور سے کسی قسم کی عقیدت قائم کر لینا نہ تو غیر فطری ہے اور نہ غیر ممکن یا محال،

امیر حسن نورانی صاحب نے بھی جنھوں نے کلیات غالب (فارسی) کی تدوین کی ہے، اس شاعر کے لیے جس کی نعت پر غالب نے اپنی تضمین لکھی ہے 'مولانا' اور 'قدس اللہ سرہٗ' کے تعظیمی کلمات استعمال کیے ہیں، اور تضمین ہذا کا مندرجہ ذیل عنوان قائم کیا ہے،

مخمس غالب بر غزل مولانا قدسی قدس اللہ سرہٗ

ان شہادتوں کی روشنی میں بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت بزرگ و محترم رہی ہوگی ورنہ وہ 'حضرت' 'مولانا' 'صاحب' 'رحمۃ اللہ علیہ' اور بالخصوص قدس اللہ سرہ کے القاب سے یاد نہ کیا جاتا، یہ بات سمجھ میں نہ آ سکی کہ نورانی صاحب کے لیے کون سا امر مانع تھا کہ وہ قدسی کے لیے مشہدی کی نسبت

کی تصریحیں بارہ ہے، جب کہ یقین ہے کہ اس کی شخصیت ادبی اور علمی دنیا میں خاصی مشہور اور متعارف ہے، خود غالب نے بھی اپنے ادبی خطوط میں چند علمی و ادبی مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں قدسی مشہدی کا ذکر کیا ہے، اور بیشتر حاجی محمد جان قدسی لکھا ہے۔[۱] فارسی کلیات غالب کے فاضل مولف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ

"کلیات غالب کا یہ اڈیشن غالب کی وفات کے سو سال بعد شایع ہو رہا ہے، اس کی ترتیب و تصحیح کی بنیاد انھیں دو مستند نسخوں پر ہے، جو غالب نے خود شایع کرائے تھے، ایک نسخہ مطبع دار السلام (۱۸۴۵ء) دوسرا مطبوعہ نولکشور (۱۸۶۳ء) متفرق کلام جو ان دونوں نسخوں کے علاوہ تھا، وہ ان مطبوعہ انتخابات اور کتابچوں سے لیا گیا ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل ماخذ ہی میں مخمسۂ غالب کا وہی عنوان ثبت ہوگا جو نورانی صاحب نے درج کیا ہے، اور اگر غالب کے پیش نظر تضمین قدسی مشہدی کی نعتیہ غزل رہی ہوتی تو غالب گمان یہی ہے کہ اس پر حاجی وغیرہ الفاظ کی تصریح بھی شامل ہوتی جیسا کہ خطوط غالب میں عموماً کیا گیا ہے۔ مثلاً :۔

(۱) محاورہ "آب در بنا رسیدن" اور "بنا بہ آب رساندن" کی بحث کے سلسلہ میں غالب نے شاعر کا پورا نام حاجی محمد جان قدسی لکھا ہے،[۲] اور اس کا مندرجہ ذیل بیت بطور تمثیل کیا ہے جو قدسی مشہدی کے دیوان میں ملتا ہے،

بگو عطائیش رساند این خطاب ... کہ بنیاد کان را رساند بآب[۳]

---

[۱] ملاحظہ ادبی خطوط غالب، مولفہ مرزا محمد عسکری۔ [۲] اگرچہ مشہدی کی صراحت نہیں لیکن دوسرے شواہد سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ قدسی مشہدی ہی ان معروضات کا مرجع ہو جیسا کہ میں نے متن میں اسی صفحہ پر عرض کیا ہے۔ [۳] ادبی خطوط غالب، تدوین عسکری، ص ۹

اہل زبان، رسالہ قواعد فارسی، لغت فرہنگ نویس اور رشید اسکردی اور قدسی مشہدی کے درمیان ادبی وشعری مناقشہ کی بحث کے ذیل میں بھی حاجی محمد جان اقدسی ہی لکھا ہوا ملتا ہے[1]

(۳) اسی موضوع وبحث کے تحت :-

"خلاصہ مضمون خط یہ کہ نہ تو صاحب زبان ہے نہ زبان داں ہے، یعنی مقلد اہل کاسہ لیس اہل ایران ہے۔ حاجی محمد جان کے کلام کو سند پکڑ، تجھے کس نے کہا ہے کہ اس سو فیصد پھر صرف قدسی لکھا ہوا ملتا ہے جیسا کہ اسی تالیف یعنی ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری میں صفحات ۸، ۹، ۱۰ وغیرہ پر درج ہے، بہرحال ان قرائن وشواہد کی بنیاد پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالباً حاجی محمد جان قدسی مشہدی اور مولانا قدسی دہلوی دو جداگانہ اور مختلف شخصیتیں ہیں، اور ان کو ایک سمجھنا قرین صواب نہیں۔

میرے سامنے جو حدیث قدسی کا نسخہ ہے اس میں (بطور عنوان) ص ۲ پر عبارت "خمسہ محمد شاہ میر صاحب دہلوی طراز تخلص" (یعنی بغیر تشدید رای مہملہ) درج ہے، مقطع میں بھی "طراز" بالکل صاف طور پر غیر مشدد لکھی ہوئی ہے، نیز اسی نسخہ میں غزل در ذکر شعرائے معصرہ میں بھی یہ لفظ بغیر تشدید مرقوم ہے، جس کو میں نے بجنسہ اپنے گذشتہ مضمون میں نقل کردیا ہے، لفظ طراز بھی ہوسکتا ہے اور طراز یعنی بغیر تشدید بھی۔ اگر کسی نسخہ میں تشدید کی نشاندہی نہ ہو تو مضمون نگار کے ذہن کا طراز سے "طرّاز" کی طرف منتقل نہ ہوپانا ایک ایسا فطری اور بشری سہو ہے کہ جس کی طرف اگر اشارہ نہ کیا جاتا تو زیادہ بہتر اور مستحسن ہوتا۔ اور پھر یہ کوئی ایسا معرکۃ الآرا قسم کا تحقیقی نکتہ

---

[1] ادبی خطوط غالب مدونہ عسکری ص ۱ [2] ایضاً ص ۱۰

یا کم از کم اس کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا ایک لازمی امر قرار پاتا۔ ویسے راقم الحروف نے جو بات لکھی ہے وہ فی نفسہٖ صحیح، غلط قطعی نہیں، اگر اس کے برعکس ضبط تحریر میں لائی جاتی تو البتہ فاضل مقالہ نگار کو حق حاصل ہوتا کہ وہ اس کی نشاندہی کر دیتے، چونکہ وہاں طرّاز (تشدید کے ساتھ) درست نہیں تھا، لہٰذا میں نے اس کی صراحت کر دی اور قیود ی نکالا جو گپتا صاحب نے لکھا ہے، یعنی لفظ (تخلص) طرّاز ہے نہ طراز۔

محترم گپتا صاحب نے میرے پیش کردہ تمام وجوہ کا نمبروار جائزہ لیا ہے، اور ان کا جواب بھی دیا ہے لیکن زیر بحث نعتیہ غزل اور حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے کلام کے درمیان اسالیب اور طرز ادا کا جو بیّن فرق نظر آتا ہے، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں تحریر فرمایا، اور دونوں کے طرز شاعری میں واضح اور نمایاں فرق کے نکتہ کے بارے میں جس کو میں نے خصوصیت کے ساتھ واضح کیا ہے، انھوں نے شاید اس وجہ سے کہ کلام قدسی مشہدی کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا ہے، اپنی کوئی رائے نہیں پیش کی، حالانکہ میرے نزدیک کسی شاعر کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس کے کلام کا اسلوب ایک نہایت اہم نکتہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی رہنمائی میں کبھی کبھی کسی پیچیدہ اور مشکل علمی یا ادبی مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے، یہ بات اب بھی بڑے وثوق اور پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نعت متداولہ کا مجموعی اسلوب حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے کلام کے عام طرز سے بالکل الگ ہے، اور دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، لہٰذا نعت قدسی کے مصنف اصلی کو سراغ اور تعیین کے وقت اس اہم نکتہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ میں گذشتہ مضمون میں عرض کر چکا ہوں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ غزل مذکور کا سبک کسی ہندوستانی شاعر کا ہے، اور قدسی مشہدی کے اسالیب اور طرز شاعری سے بہت مختلف ہے،

جیسا کہ میں نے اپنے گذشتہ مقالہ میں بھی عرض کیا ہو نعت یا غزل مذکور کو
جی محمد جان قدسی مشہدی کی تصنیف ماننے میں مجھے سب سے بڑا تامل اس بنا پر ہے کہ یہ
ں کے کسی بھی متقدم یا موخر مجموعہ کلام میں دستیاب نہیں، گپتا صاحب کا یہ بیان کسی
رتک صحیح ہے کہ "متداول نسخوں (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شاعر کے سارے کلام کا شامل
ناضروری نہیں" لیکن اس صورت میں محض قلم کی ذرا سی جنبش سے، یہ کہہ کر موصوف
نہ فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکے، بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کلیات یا دواوین (مطبوعہ یا
مطبوعہ) میں شامل نہ ہونے کے باوجود یہ نعت قدسی مشہدی ہی کی ملک ہے تو گپتا صاحب
ر اس کے اثبات کیلئے بڑے ٹھوس اور مستند دلائل پیش کرنے ہوں گے،

بجائے اس کے کہ وہ کسی طرح مثبت اور موثر دلائل اختیار کرتے اور مستند شہادتوں کی
وشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ نعت یا غزل متذکرہ حتماً حاجی محمد جان قدسی
ہی کی تصنیف ہے، انھوں نے ایک لحاظ سے بحث کا منفی پہلو اختیار کر لیا ہے، یعنی
عت قدسی کے مصنف اصلی پر بحث کرنے کے بجائے، غزل قدسی کے مخمسات کے اولین
دراصل مولف کے موضوع پر زیادہ روشنی ڈالی ہے، نیز اس بات کی کوشش کی ہے کہ
قاضی محمد عمر مرتب حدیث قدسی اور حاجی سید شمشیر علی مولف صحیفہ قدسی کو سارقین اعظم
اور انکی جمع کی ہوئی تضامین کو زبردست سرقہ ثابت کر دکھائیں، اور یہ فیصلہ قطعی بھی صادر
ر دیں کہ قدسی دہلوی کی شخصیت بالکل مفروضہ ہے، فاضل مقالہ نگار ان مرتبین کے بیان
ریر کو اس لیے قابل اعتنا نہیں سمجھتے کہ وہ "دونوں قطعی نامعتبر شخصیتیں ہیں" ظاہر ہے کہ وہ
ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ ان نامعتبر اور سارق قسم کے اصحاب کے اقوال و بیانات پہ
بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، لہذا غزل مذکور کی قدسی دہلوی کے ساتھ قائم کردہ نسبت بھی قابل

اعتبار نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سرقہ شدہ تضامین کے مجموعہ میں انتساب فرضی اور غلط ہے تو اس سے ماقبل کے قابلِ اعتبار یا ثقہ اور صحیح المضمون مجموعہ میں قدسی مشہدی کے نام کا واضح اور صریح حوالہ کیوں نہیں ملتا؟ حیرت کی بات ہے کہ دو سو سال سے زائد مدت[1] کی گمنامی کے بعد یہ غزل اچانک منصۂ شہود پر اس انداز سے ابھری کہ چار دانگ ملک میں غلغلہ مچ گیا، اور اس درجہ مشہور ہوئی، اور ہندوستانی شاعروں کو اس قدر بھائی کہ سنہ [illegible][2] (سنہ [illegible]) سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک رہا اس کے بعد بھی جب تک کہ اخبار جریدہ روزگار، مدراس سنہ [illegible] یا سنہ [illegible] تک جاری رہا، سیکڑوں کی تعداد میں خمسے نظم کر دیے گئے لیکن مرتبین یا مالکان اخبار میں سے کسی ایک نے بھی مصنف اصلی کا نام تک نہیں لیا، اور اس حقیقت کے تذکرے سے سب خاموش رہے۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اتنی مدت کے بعد تضمینوں کا یہ سلسلہ کیوں جاری ہوا یعنی اس سے پہلے خمسہ نگاری کے لیے کون سے امور مانع تھے؟ کیا اس سے پہلے یہ غزل مقبولیت اور شہرت کی حامل نہ تھی؟ اسی طرح یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ معاصر دور میں کسی بھی ذی علم اور [illegible] المشہور محقق[3] نے قدسی مشہدی کے حالات زندگی یا اس کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس نعت یا اس کی مقبولیت یا اس پر لکھی ہوئی تضامین کا حوالہ نہیں دیا۔

---

[1] قدسی مشہدی کا انتقال سنہ ۱۰۵۶ھ میں ہوا، اور محمد حسین خان تحسین کی کتاب سنہ ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی۔ [2] تاریخ اشاعت خمسہ ہائے غزل قدسی (چمن مدح نبی) مرتبہ محمد حسین خان تحسین؛

[3] جیسے (مرحوم) پروفیسر محمد شفیع، مولف تذکرہ میخانہ عبدالنبی فخر الزمانی (جس میں قدسی اور اس کے کلام کا ذکر ہے) وغیرہم، شاید جناب قاضی عبدالودود صاحب نے بھی اپنے کسی مقالہ میں قدسی مشہدی کی طرف اس غزل کے انتساب کی تردید کی ہے۔

یہ بات بھی سمجھ میں نہ آسکی کہ محض "مخمسہ ہائے غزل قدسی" یا "غزل قدسی لغز فسرا" یا "تضمین بر غزل قدسی" لکھنے یا کہنے سے قدسی مشہدی کی نسبت اور اس کی تاویل کی گنجائش کس طرح نکل سکتی ہے، اگر بالفرض حدیث قدسی کو خمسہ ہائے غزل قدسی (از محمد حسین خان تحسین)، کا سرقہ کہیں اور صحیفۂ قدسی کو حدیث قدسی نیز اخبار جریدہ روزگار (مدراس) میں چھپنے والی تضمینوں کی نقل تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ نعت مذکور بطور قطعی حاجی محمد جان قدسی مشہدی ہی کی فکر کا نتیجہ ہے۔ بلا شبہ تحسین کا مجموعہ خمسہ ہائے غزل قدسی، (جس میں مدح نبی) متقدم (یا گپتا صاحب کے قول کے مطابق پہلا) مجموعہ تضامین قرار پاتا ہے، جس میں مخمسات غزل قدسی جمع کئے گئے ہیں[1] لیکن اس نسخہ کے متقدم یا اولین ہونے سے بھی مسئلہ کا کوئی حل ہمارے سامنے نہیں آتا، بات تو اس وقت بنتی جب کہ مجموعہ بالا میں صراحت ہوتی کہ خمسے جو جمع کیے گئے ہیں، وہ حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی نعتیہ غزل پر بطور تضمین نظم کئے گئے ہیں، بہرحال تحسین جیسے باکمال اور واقف کار شاعر اور مولف کے قلم سے شاعر اصلی کے نام اور نسبت کی عدم وضاحت کے باوجود یہ نتیجہ محض قیاساً اخذ کر لینا کہ مصنف اصلی قدسی مشہدی ہوا اسلیے کہ وہ زیادہ مشہور ہے، ہو سکتا ہے، قطعی قرین صواب نہیں،

گپتا صاحب رقمطراز ہیں کہ خمسہ ہائے غزل قدسی، مرتبہ محمد حسین خان تحسین ۱۲۰۸ھ (مطابق ۱۷۹۳ء) میں شائع ہوئی، اور حدیث قدسی مرتبہ قاضی محمد عمر ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) یا ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۸۶۳ء) میں چھپ کر منظر عام پر آئی، گویا

---

[1] میں نے خود بھی حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ حدیث قدسی، تضامین کا پہلا اور اولین مجموعہ ہوگا [illegible]
بارے میں [illegible] (معارف [illegible])

لاہور کے علمی تحائف

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

لاہور میں علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کی جو بین الاقوامی کانگریس ہوئی، اس کا ذکر معارف کی گذشتہ تین اشاعتوں میں ہو چکا ہے، وہاں ایک ہفتہ کے قیام میں جو علمی تحائف ملے، ان کا ذکر بھی ضروری اس لئے ہے کہ جس محبت اور گرمجوشی سے یہ پیش کئے گئے اس سے خود مجھ کو دار المصنفین سے اپنی وابستگی پر فخر ہوا، پھر ان کا ذکر اس لئے بھی آنا لازمی ہے کہ اس سے وہاں کی علمی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا حال بھی معلوم ہو سکے گا۔

ایک رات اپنے کمرہ میں واپس آیا تو علامہ محمد اقبال کے اشعار کو عبد الرحمن چغتائی نے جو مصور کیا ہے اس کا ایک نسخہ رکھا پایا۔ اس کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، یہ غالباً جشن ہی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا، مگر کوئی ایسی تحریر لکھی ہوئی نہیں پائی، ارباب جشن کے علاوہ کسی اور سے ایسی فیاضی کا اظہار ممکن نہ تھا کیونکہ اس کی قیمت پندرہ سو روپئے ہے، اس کے بائیں جانب شروع میں جسٹس ایس، اے، رحمن کا انگریزی میں مقدمہ ہے، جس کے آخر میں ۱۲؍دسمبر ۱۹۶۸ء کی تاریخ مرقوم ہے اس میں علامہ محمد اقبال کے مختصر حالات کے ساتھ ان کی شاعری پر بہت ہی عمدہ تبصرہ ہے، اس کے بعد انگریزی ہی میں "چغتائی دی آرٹسٹ" کے عنوان سے ایک تحریر ہے، پھر اقبال کے اشعار اور کئی نظموں کے انگریزی ترجمے ہیں، یہ اشعار اسرار خودی، بال جبریل، ضرب کلیم، پیام مشرق اور جاوید نامہ اور زبور عجم سے لئے گئے ہیں۔ داہنی طرف شروع میں عبد الرحمن چغتائی کی تحریر اردو میں یہ ہے:

۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کی تاریخیں لکھی ہوئی ہیں، انھوں نے "قدر و قیمت" کے عنوان میں جناب ایس اے رحمٰن کا شکریہ ادا کیا ہے، جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں، وہ اس مصور ایڈیشن کی تیاری میں ان کے دکھ سکھ میں برابر ساتھ دیتے رہے، پھر وہ پروفیسر سید وقار عظیم کے بھی ممنون ہوئے ہیں، جنھوں نے اس کے اردو مسودہ جات پڑھے معلوم ہوتا ہے کہ اس مصور ایڈیشن کی تیاری میں ان کو بعض حلقوں سے تکلیفیں بھی پہونچیں، جیسا کہ ان کی حسب ذیل تحریر کے تلخ لہجہ سے ظاہر ہوگا:

"علامہ اقبال کے اس مصور ایڈیشن کی تکمیل کے دوران مشکلات کے زیر اثر کچھ یوں محسوس ہوتا رہا کہ ابھی ہمارے یہاں ذوق نظری میں وہ وسعت پیدا نہیں ہوئی کہ کوئی احساس منفرد ذات دیکھسوئی کے ساتھ معاشرے کی علمی و ادبی خدمت انجام دے سکے بعض کم نظر انسروں نے اپنی کم ظرفی کو بلند نگاہی پر ترجیح دی، شناساؤں نے صدمے پہ صدمے پہونچائے مگر اپنے اعتماد نے انا کو ٹھیس نہ لگنے دی، اس خیال سے بھی کہ منزل تک پہونچنے کے راستے میں طوفانوں اور چٹانوں کا حائل ہونا فطرت کا تقاضا ہے۔"

انھوں نے فرد اور جماعت کے عنوان سے وہ ساری مشکلات بیان کر دی ہیں جو ان کو اس مصور ایڈیشن کی تیاری میں پیش آئیں مگر وہ بددل نہیں ہوئے۔ ان کو اقبال سے والہانہ عقیدت تھی، اسی لئے انھوں نے ان کی فلسفیانہ اور شاعرانہ تخیل خیزیوں کو رنگوں اور خطوں میں ڈھال کر جلی اور جلالی صورت کے ایکسپریشن کی صورت میں پیش کیا، پھر دیدن دگر آموز کے عنوان سے مصوری کے آرٹ اور اقبال کی شاعری پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھنے میں ان کے ناظرین کو وہی حظ و لطف ملے گا جو ان کی مصوری کو دیکھنے میں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بھی مصورانہ رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے، ان کی تحریر کے حسب ذیل اقتباس کو ذرا غور سے پڑھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے

اور اگر صحیح ہے تو تاریخ کے اس تجزیے سے کیا سبق لیا جا سکتا ہے :

" علامہ اقبال نے ایک موقع پر سوال کیا تھا کہ عرب اور عجم کے فن میں تمہیں کیا نمایاں فرق نظر آتا ہے ، یہ سوال کیا اور وہ کمر کو سیدھا کر کے یوں بیٹھ گئے جیسے اسی کے فن کا کوئی بہت بڑا مبصر ہو ، وہ الفاظ جن میں اپنی بات میں اس وقت ادا کر سکا ان کا لب لباب یہ تھا کہ وہ تلوار جو عرب میں بالکل سیدھی تھی ، عجم تک پہنچتے پہنچتے اس میں خم آ گیا تھا ، اس میں لوچ لچک بھی تھی ، وہ مرصع بھی تھی اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ تلوار جو زندگی کی بلندیوں اور وسعتوں کی رشتہ دار تھی ، تنزلیت اور رہبانیت میں مدغم ہو کر میانوں کی زینت بن گئی ۔"

پھر اس ایڈیشن کی تصویروں پر یہ تبصرہ بھی ہے کہ یہ نہ محض ہنگامی ہیں اور نہ محض جذباتی ہیں ، یہ خون جگر اور جوئے شیر کا کرشمہ ہیں ۔ ان کے خدو خال ، بلند نگاہی سے حاصل کئے گئے ہیں ، ان میں جلال و جمال کی نمود بھی ہے ، حسن و عشق کی جولانیاں بھی اور بصیرت اور خود نمائی کے جوہر بھی ، اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس میں انہیں شعروں کو مصور کیا گیا جو رنگوں اور خطوں کے سانچے میں ڈھل سکتے تھے ، اس کے بعد مصوری کے نمونے شروع ہو گئے ہیں ۔ جو شعر مصور کیا گیا ہے اس کا عنوان فاضل آرٹسٹ نے خود انتخاب کیا ہے ، مثلاً اقبال کا شعر ہے ؎

یک نظر آں گوہر نابے نگر تاج را در زیر مہتابے نگر

اس کا عنوان " داستان گو " رکھا ، پھر اس کی تصریح ایک با وقار نثری تحریر میں کی گئی ہے جس کا خلاصہ انگریزی میں بھی مختصر طریقہ سے بیان کیا گیا ہے ، اسی طرح اقبال کے اس شعر کا عنوان " رنگ و بو " رکھا گیا ہے :

بیا من بستہ کے قدسے سے ہے جنت کا جلوہ پیدا حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیمان ہے رنگ و بو کا

اس کی تصریح بھی اردو اور انگریزی کی نثری تحریروں سے کی گئی ہے۔ اسی طرح غلام رسول کی مذہل بغداد، سیب کا درخت، اختر صبح، جلال و جمال، ناقۂ لیلیٰ، چشمۂ ارتقاء، دانائے راز، جہانگیر اور نورجہاں، برق نگاہ، سوز دروں، مرد حر، زبیدہ خاتون، خرقہ پوش، اقبال و رومی، معمار حرم، شریف النساء وغیرہ کے عنوانات قائم کر کے ان سے متعلق اشعار کی جو مصوری کی گئی ہے، ان کی تشریح بھی اردو اور انگریزی نثر میں کی ہے، اقبال اور رومی، منصور حلاج، اورنگ زیب، بابر اور ہمایوں، سلطان شہید وغیرہ کی مصوری کے جو نمونے ہیں وہ تو بہت اچھے معلوم ہوئے، مگر مرد شاہین، مرد مومن، صورت سیرت اور ہفت کشور کی جو مصوری ہے، اقبال زندہ ہوتے تو معلوم نہیں ان تصویروں کی داد دیتے کہ نہیں، اس ایڈیشن میں مصوری کے نمونے کے پیش کرنے کا وہی انداز ہے جو غالب کے مصور دیوان میں ہے، مگر دونوں کے مصور ایڈیشنوں میں وہی فرق ہونا چاہیے تھا جو دونوں کی شاعری میں ہے، غالب بنیادی حیثیت سے ایک غزل گو شاعر تھے، اقبال ایک ایسے شاعر تھے جو خود فاضل مصور کی رائے کے مطابق کسی بڑی دانش کی جستجو میں رہے، جو ایسے نگستان کے خواہاں رہے جو کائنات کا مظہر ہو، ان کو ماضی کے آئینے میں سب کچھ نظر آتا تھا، ان کی نظر کے سامنے مرد کامل کا نکھرا ہوا پرنور چہرہ تھا، مرد مومن کے وہ دلدادہ تھے اور ان مجاہدوں کا خون جنھوں نے انسانی قدروں کو دنیا میں عام کرنے کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دیں، وہ جانتے تھے کہ وہ قوت عمل رائگاں نہ جائے جس سے انسان کی ترقی کی بڑی بڑی منزلیں سر کی گئی تھیں، ان ہی کی روشنی میں اقبال کے اشعار کی مصوری میں جمالی کے بجائے جلالی نظارہ کو دیکھنے کی خواہش فطری طور پر ہوتی ہے، اسی لئے ان کے کلام کے مصور ایڈیشن کو غالب کے مصور ایڈیشن سے بہت ہی مختلف ہونا چاہیے تھا، مگر آرٹ کی باتیں تو آرٹ کے ماہرین ہی جان سکتے ہیں۔ ایک عامی کی اندرونی خواہش کا اس میں دخل انداز ہونا مناسب نہیں، چنانچہ ان کی مصوری پر جو نثری تبصرے ہیں، ان میں ان کے آرٹ کی داد خوب

دی گئی ہے، جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

چغتائی اگر ہندوستان میں جدید ہندوستانی آرٹ کا نمائندہ تھا تو پاکستان میں وہ پورے مشرق کا نمائندہ ہے ..... چغتائی ان فن کاروں کے گروہ سے ہے جنھوں نے ساحل سے بے نیاز ہوکر گرداب کی متلاطم موجوں سے کھیل کر ساحل کا لطف اٹھایا ہے .... چغتائی محض جدید نگارش کا ہی علم بردار نہیں، وہ نئی تکنیک کے تجربوں کا فنکار ہے، اس نے دورِ احیاء کے عظیم فن کاروں، مغل اور ایرانی استادوں سے بھی استفادہ کیا ہے، اس نے مجرد اور تجریدی آرٹ کا بھی مطالعہ جی بھر کر کیا ہے، اس نے اجتماعی انفرادیت کو خوب سمجھا ہے، اس کے شاہکاروں میں مشرقی مصوری کے ہر دور کی جھلک نظر آتی ہے، اس کی اقدار اور بیداری میں زندگی کا وہ سوز و ساز موجود ہے جس سے اس کے معاشرے کی نگہداشت ہوتی ہے۔"

اس قسم کی اور بھی مدح و ستائش ہے، ان نثری تحریروں کے لکھنے والے کا نام درج نہیں، اس لئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ خراج عقیدت کس کی طرف سے پیش کیا جارہا ہے؟

یہ کتاب جس عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئی، اس پر اردو کی کتابت و طباعت کو ناز ہوسکتا ہے، جس کتب خانہ میں یہ کتاب نہ ہوگی اس میں بڑی کمی محسوس کی جائے گی۔

ادارۂ تحقیقات پاکستان۔ دانش گاہ پنجاب لاہور کے ہم بے حد ممنون ہیں کہ اس کی طرف سے اس کی گراں قدر مطبوعات کا ایک سٹ ملا جس سے دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بڑا مفید اضافہ ہوگیا ہے، یہ مطبوعات حسب ذیل ہیں:

(۱) **کلیات فیضی**: اس کو اے، ڈی ارشد ایم، اے، پی، ایچ، ڈی نے ایڈٹ کیا ہے، ارشد صاحب کے نام کے ساتھ اے، ڈی، سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں انگریزی زبان سے مرعوبیت اب بھی باقی ہے جو ذوق سلیم کی دلیل نہیں، اس کتاب پر جناب سید نذیر الحسن عابدی نے

نظر ثانی کی ہے جو اس وقت پاکستان میں فارسی شعر و ادب پر بڑی اچھی نظر رکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک مختصر سا پیش لفظ جناب ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کا ہے جو اس وقت ادارۂ تحقیقات پاکستان کی مجلس انتظامیہ کے صدر تھے، پھر ایک مقدمہ اے، ڈی، ارشد صاحب کا ہے، جس سے کلیات فیضی کے ان قلمی مخطوطات سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں جو مرتب کو اس برصغیر کے مختلف کتب خانوں میں حاصل ہوئے، انھیں کو سامنے رکھ کر انھوں نے یہ کلیات مرتب کیا ہے، جس میں فیضی کے قصائد، ترکیب بند اور غزلیات وغیرہ کے اشعار کی تعداد بارہ ہزار تک پہونچ گئی ہے، فیضی ہندوستان کے ان فارسی شعراء میں ہے جو امیر خسرو کے بعد صاحب فطرت، صاحب عبارت اور جمیع علوم و اقسام سخن کا بے مثال شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ جوش بیان کا موجد اور خاتم سمجھا جاتا ہے، شاعری اس کے قلم کو سجدہ کرتی رہی، مگر افسوس اس کا تھا کہ اس کے کلام کا کوئی مجموعہ طبع نہیں ہوا، اس کی تلافی ۱۹۶۷ء میں زیر نظر کلیات کی طباعت سے ہوئی، جس کے لئے ارباب ذوق جناب اے ڈی ارشد اور پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تحقیقات پاکستان دونوں کے ممنون ہیں، اس کی اشاعت سے فیضی کے کلام کو سمجھنے اور پڑھنے میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے، اس میں جناب اے، ڈی، ارشد کے مقدمہ سے بعض مفید باتیں تو ضرور معلوم ہوتی ہیں لیکن فیضی جیسے شاعر کے کلام پر اس میں وہ سیر حاصل تبصرہ نہیں جس کا وہ مستحق ہے، فیضی کے ناقد معاصر ملا عبد القادر بدایونی نے اس کے متعلق جو سخت رائے ظاہر کی ہے وہ ان کے مقدمہ کا دلچسپ موضوع ہو سکتا تھا، اس کو انھوں نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے، شعر و ادب میں اس کا جو مقام ہے اس کی بھی صحیح تصویر اس مقدمہ سے سامنے نہیں آتی ہے۔

(۲) رقعات حکیم ابوالفتح گیلانی: حکیم ابوالفتح گیلانی اکبری دربار کی ان اہم شخصیتوں میں تھا جنھوں نے اکبر کے مزاج میں بڑا دخل حاصل کر لیا تھا، اس کی زندگی میں سیاسی اور عسکری

ہنگامہ آرائیاں تو نہیں رہیں لیکن وہ اپنے علمی اور ادبی ذوق کی وجہ سے بہت ممتاز رہا، اس نے اپنے یہاں علم و فن کی بزم شاہانہ انداز میں گرم رکھی تھی جو بقول مولانا شبلی اس زمانہ کی بہت بڑی ضرورت تھی، اسی میں خواجہ حسین ثنائی، مرزا قلی میلی، عرفی، شیرازی اور حیاتی گیلانی وغیرہ نے تربیت پائی، مآثر رحیمی کے مصنف کا بیان ہے کہ اس نے اکبر کے مزاج میں اتنا دخل حاصل کر لیا تھا کہ جعفر برمکی کو بھی ہارون رشید کے مزاج میں اتنا دخل نہ ہوا ہوگا، ابوالفضل اور فیضی دونوں اس کی خوبیوں کے معترف رہے، ابوالفضل نے اس کی وفات پر لکھا تھا کہ اخلاص، مزاج شناسی، خیر اندیشی عام، فصاحت زبان، حسن منظر، اماتت، فطری تمکنت، ذاتی گرم جوشی اور عقل و دانش ایک شخص میں کم جمع ہوئی ہوگی، عرفی جیسا خود دار، خود شناس اور خود بیں شاعر بھی اس کا مداح رہا، اور بقول مولانا شبلی اس نے جس زور کے قصیدے اس کی شان میں لکھے، اکبر اور عبدالرحیم خانخاناں کی مدح میں نہیں لکھے، اسی یگانۂ روزگار کے مکتوبات کے مجموعہ کو پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کر کے ایک بڑی علمی خدمت انجام دی ہے، اس کو ایڈٹ ڈاکٹر بشیر حسین نے کیا، جنھوں نے شروع میں ایک پر مغز مقدمہ لکھ کر حکیم ابوالفتح گیلانی کے حالات، علم و فضل، تصانیف اور اولاد وغیرہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی ہیں اس سے عہد مغلیہ کی ایک اہم شخصیت کی ایک اچھی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، ملا عبدالقادر بدایونی اس کے معاصر تھے، وہ اس سے اس لئے خوش نہ تھے کہ اس نے فیضی اور ابوالفضل کی طرح اکبر کے مذہبی خیالات کا ساتھ دیا، وہ لکھتے ہیں کہ وہ ایسی بے دینی اور تمام اخلاق ذمیمہ میں ضرب المثل تھا، ڈاکٹر محمد بشیر حسین کو ملا عبدالقادر بدایونی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے، اس لئے انھوں نے حکیم ابوالفتح کے رقعات سے اس کی انسان دوستی، غریبوں سے محبت، آداب مجلس سے آگاہی، وفاداری، وفا شعاری، نیک طینتی، خدا کے خالق و رازق ہونے پر ایمان، احادیث نبوی پر اعتقاد، زندگی کے آخری حصہ میں رقیق القلبی سے متعلق بہت کچھ مواد جمع کر کے ملا بدایونی کے الزامات کی تردید کی ہے،

ملا بدایونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انوری کو انوریک مداح کہہ کر اس کی تضحیک کیا کرتا تھا، اس کی بھی انھوں نے تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ انوری کا قدر دان اور معترف تھا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے ابوالفضل کی طرح اکبر کی بے دینی کا ساتھ دیا، اس کے بغیر وہ اپنے شاہی آقا کے مزاج میں دخیل نہیں ہو سکتا تھا، یہ اور بات ہے کہ وہ ابوالفضل ہی کی طرح خلوت میں آکر کچھ اور ہو جاتا ہو، حکیم ابوالفتح گیلانی کے مذہب کے ذکر میں اس زمانہ کے سرکاری مذہب دین الٰہی کا ذکر آنا چاہئے تھا، مگر لائق مصحح نے اس زمانہ کی اس مذہبی فضا کو بالکل نظر انداز کر دیا، شاید اس لئے کہ اس بحث میں پڑ جاتے تو حکیم ابوالفتح گیلانی کو مجروح ہونے سے بچا نہیں سکتے تھے، اس سے قطع نظر حکیم ابوالفتح گیلانی کے رقعات کے مجموعہ کی طباعت سے نہ صرف اس کے حالات و کردار سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوں گے، بلکہ یہ اس زمانہ کے بہت کچھ تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی باتوں کا مستند ماخذ بن جائے گا، محمد حسین آزاد نے اس کے رقعات کے مجموعہ چہار باغ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی انشاء پردازی دیکھنی چاہو تو چہار باغ دیکھو، خیالات شاعرانہ میں فلسفہ و حکمت کے پھول برس رہے ہیں اور یہ گل افشانی جمع خرچ زبانی نہیں، اس کی انشا پردازی، فلسفہ و حکمت اور گل افشانی کی لذت اٹھانے کا موقع اس کی اشاعت و طباعت سے ملے گا، کاش حکیم ابوالفتح گیلانی کی اور تصانیف بھی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہو جاتیں، کیونکہ اس کی تصنیف فتاحی کے متعلق محمد حسین آزاد نے لکھا ہے، فتاحی دیکھو شیخ بو علی سینا کی روح کو آب حیات پلایا ہے، اس کی دوسری تصنیف قیاسیہ کو دیکھو حکمت و شریعت کا یہ عالم ہے کہ شربت و شیر کی دو نہریں بہی جاتی ہیں، قیاسیہ کی اشاعت سے اس کے مذہبی خیالات کو شاید صحیح طور سے جانچنے کا موقع مل جائے۔

مکتوبات سعد اللہ خاں، علامی سعد اللہ نے شاہجہاں کے دور میں بڑا عروج حاصل کیا،

ترقی کرکے وزیر کل ہوئے ۔ وہ اپنی فکر کی اصابت، ذہن کی رسائی، معلومات کی وسعت اور معاملات کے تدبر کے لئے بے مثل سمجھے جاتے تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں ان کو جو دسترس تھی اس بنیاد پر بادشاہ نامہ کا مؤلف عبدالحمید لاہوری ان کو علامۃ الوری اور فہامۃ العصر لکھتا ہے۔ ان ہی کے مکتوبات کا ایک مجموعہ پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ ان مکتوبات کی تصحیح تو ڈاکٹر ناظر حسن زیدی نے کی ہے لیکن اس کی نظر ثانی کر کے مولانا غلام رسول مہر نے جو اس کے شروع میں مقدمہ لکھا ہے اور اس کے آخر میں جو تعلیقات کا اضافہ کیا ہے، اس سے یہ کتاب نہ صرف باوزن ہوگئی ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے شاہجہانی عہد کی تاریخ کا ایک مفید لٹریچر میسر آگیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کا نام اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کے مقدمہ میں ان کے قلم کی موشگافی، تحریر کی شگفتگی اور تحقیق کی دیدہ ریزی ہوگی۔ علامی سعد اللہ خاں کے حالات ایک جگہ مآثر الامراء کی جلد دوم میں سات آٹھ صفحے میں ملتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کو اپنے مقدمہ میں ماخذ ضرور بنایا ہے لیکن اپنے ۲۲ صفحے کی تحریر اور تحقیق میں علامی سعد اللہ خاں کے متعلق جو کچھ لکھ دیا ہے، آئندہ ان ہی کے ایجاز کا اطناب ہوا کرے گا۔ مولانا مہر نے اپنے مقدمہ میں علامی سعد اللہ خاں کے حالات کے سلسلہ میں بعض مفید باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ علامی سعد اللہ خاں اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں شاہی خزانہ کی رقم خرچ کرنے میں بہت محتاط بلکہ جزرس تھے۔ ان کی دینداری کی وجہ سے شاہی ملازمین بھی متدین ہوگئے تھے۔ اس لئے ایک موقع پر رعایا کے ایک فرد نے شاہجہاں کو مخاطب کر کے کہا کہ اس مبارک زمانہ میں جملہ نیکیاں جمع ہوگئی ہیں بادشاہ عادل، وزیر اعظم جزرس، اہل کار متدین، خلق فدا مرفہ الحال۔ ان عطیات ایزدی کا شکر واجب ہے۔ شاہجہاں نے یہ سن کر بارگاہ باری تعالیٰ میں فریضۂ شکر ادا کیا۔ علامی سعد اللہ خاں کو معلوم ہوا تو اضافہ کیا

"مصالح بقدر خواہش و خواہش بقدر جوہر یک بہم می رسد"

یعنی نیکیوں اور اچھائیوں کی جتنی خواہش انسان کو ہو پوری ہو جاتی ہیں، مگر ایسی خواہش کا انحصار انسانی جوہر کی پاکیزگی یعنی طبیعت اور قصد و نیت کی صفائی پر موقوف ہے۔ علامی سعداللہ خاں کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ وزارت کے فرائض اپنے انسانی جوہر کی پاکیزگی اور اپنی نیت کی صفائی سے انجام دیتے رہے، اسی لئے ایک موقع پر انھوں نے شاہجہاں کی توجہ اس طرف دلائی کہ (۱) سلطنت کی بنیاد عدل پر قائم ہے (۲) ملک و مال میں افزائش شجاعت و سخاوت سے ہوتی ہے (۳) علماء فضلاء کی ہم نشینی اور جاہلوں کے قرب سے پرہیز عقل و دانش کا نشان ہے (۴) اپنے معتقدات پر کاربند رہنا چاہئے۔ شدتوں اور سختیوں میں بھی رشتۂ استقلال ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے (۵) دنیوی امور کے متعلق مناسب تدبیریں اختیار کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے، تاہم سعی و کوشش کے باوجود جو صورت حال پیش آجائے اس کو مقدر سمجھتے ہوئے شکر گذار رہنا لازم ہے (۶) خاندان کی دیرپائی، یتیموں کے لئے رحم و کرم پر موقوف ہے، یہ بھی جان لینا چاہئے کہ حاجت مندوں کی ضرورتیں اس طرح پوری کرنی چاہئیں کہ انسان خود محتاج نہ ہو جائے (۷) امور ملکی کا انصرام وزیروں کے مشورے اور صوابدید سے ہو (۸) نصرت و ظفر خدا کے پاک بندوں سے طلب ہمت پر موقوف ہے (۹) تندرستی کی آرزو اس بنا پر کی جائے کہ مصیبت زدوں کے دکھ درد کا ازالہ کیا جا سکے (۱۰) مجرموں کے جرائم پر خط عفو کھینچ کر خدا سے رحمت کی امید رکھنی چاہئے۔

مولانا مہر نے علامی سعداللہ خاں کے حوالہ سے یہ تمام باتیں قلمبند کر کے مغلوں کے عہد کے اصول حکومت کو متعین کرنے میں بڑا اچھا مواد فراہم کر دیا ہے۔ یہ راقم اپنے مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ بابر سے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک تیموری فرماں روا ان ہی اصولوں کے پابند ہو کر حکومت کرتے رہے۔ اسی لئے فتح و کامرانی ان کے قدموں کو چومتی رہی۔

اس مجموعہ کے ہر مکتوب سے متعلق اس کے شروع میں مفید نوٹ دے دئے گئے ہیں، جس سے ہر مکتوب کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مجموعہ کو ایڈٹ کرنے میں محنت سے کام لیا گیا ہے آخر میں تعلیقات بھی کاوش سے قلمبند کئے گئے ہیں، مگر یہ بات کھٹکی کہ راجہ روپ سنگھ راٹھور اور اس کے ستر سال باڑا کے حالات معاصر تاریخوں میں سے عالمگیر نامہ اور آثر عالمگیری اور مآثر الامراء جیسی مستند کتابوں میں مل سکتے تھے، تو ان کے حالات قلمبند کرنے میں نجم الغنی رامپوری کی کتاب کارنامہ راجپوتاں کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی۔

آداب عالمگیری : اس میں زیادہ تر اورنگ زیب عالمگیر کے جلوس ثانی کے زمانہ تک کے خطوط ہیں جو اس نے یا تو خود لکھے یا لکھوائے اس کا میر منشی منشی الملک شیخ ابوالفتح المخاطب بہ قابل خان تھا، جو اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ سے اس کے بادشاہ بننے کے دوسرے سال تک اس کی ملازمت میں رہا وہ ٹھٹھہ کا رہنے والا تھا، اورنگ زیب اس سے بھی خطوط لکھوایا کرتا تھا۔ ان خطوط کے جو مسودات اس کے پاس تھے ان کو اس کی وفات کے بعد محمد صادق منبلی (المتوفی سنہ ۱۱۲۹ھ) نے مرتب کیا۔ جو انبالہ کا رہنے والا تھا، وہ اورنگ زیب کے چھوٹے بیٹے شہزادہ اکبر کا میر منشی تھا، اس نے قابل خان کے مسودات کو مرتب کرتے وقت ان میں ان مراسلات کا بھی اضافہ کر دیا جو اس نے شہزادہ اکبر کی طرف سے اورنگ زیب عالمگیر اور اراکین سلطنت کو لکھے تھے۔ اس نے اورنگ زیب کی حکومت کے دو سال کی تاریخ بھی عمل صالح اور دوسری تاریخوں سے ماخوذ کر کے اس میں شامل کر دیا ہے اسی کی دو جلدوں کو جناب عبدالغفور چودھری صاحب نے ایڈٹ کیا ہے، عنوان سے

ترتیب دیتے وقت صرف اس نسخہ کو سامنے رکھا ہے جو پبلک لائبریری لاہور میں تھا، حالانکہ سلسلہ دار المصنفین میں جناب سید نجیب اشرف ندوی صاحب کی کتاب مقدمۂ رقعات عالمگیر میں اس کے گیارہ نسخوں کی نشاندہی کر دی گئی تھی جو لاہور کے علاوہ لندن، کلکتہ، پٹنہ، اعظم گڈھ، آگرہ اور رام پور کے کتب خانوں میں موجود ہیں، معلوم نہیں مصحح نے ان نسخوں کی طرف رجوع کرنے کی تکلیف کیوں گوارا نہیں کی، دار المصنفین کے کتب خانہ میں اس کا ایک بہت اچھا نسخہ موجود ہے جو بڑی تقطیع کے ۴۹۵ صفحے پر مشتمل ہے۔ پھر بھی لائق مصحح کی یہ علمی سعی قابل داد ہے کہ ان کی وجہ سے یہ دو مجموعے شائع تو ہو گئے اس کے مقدمہ میں قابل خان اور صادق مطلبی کے حالات سے متعلق مفید معلومات فراہم کر دئے گئے ہیں، پنجاب یونیورسٹی کی شائع کردہ اور مجموعۂ مکتوبات کی طرح اس کے ہر مکتوب کے شروع میں اردو میں اچھے نوٹ دے دیے گئے ہیں، جس سے تمام خطوط کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مصحح نے ایڈٹ کرتے وقت ہر خط کا مطالعہ پورے طور پر کیا ہے یہ دونوں جلدیں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھیں معلوم نہیں اس کی اور جلدیں بھی شائع ہوئیں کہ نہیں، دار المصنفین میں اس کا جو ضخیم نسخہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ چھپ کر کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ تمام جلدیں شائع ہو گئیں تو ایک بہت مفید علمی خدمت انجام پا جائے گی۔

احکام عالمگیری، کلمات طیبات، رقائم کرائم، دستور العمل آگہی اور رموز و اشارات عالمگیری وغیرہ میں بھی اورنگ زیب کے خطوط ہیں۔ اگر ان کو بھی ایڈٹ کر کے شائع کر دیا جائے تو ان کے گہرے مطالعہ سے اورنگ سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں

(باقی)

استدراک

از

مولانا محمد ازہر شاہ قیصر ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم (دیوبند)

افسوس ہے کہ مولانا محمد ازہر شاہ قیصر کا یہ خط ڈاک میں ادھر ادھر ہو گیا تھا
اب کئی ماہ کے بعد ملا تو یہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ع ق

معارف کے ایک نمبر میں مولانا یوسف بنوری کے متعلق آپ کا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی، دیوبند کے قدیم حالات پر آپ کی نظر ہے، اور آپ نے بڑی وسعت قلبی کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے۔ اس مضمون میں ایک ذرا سا تسامح رہ گیا ہے، ڈابھیل میں مجلس علمی مولانا یوسف بنوری نے نہیں بلکہ خود حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قائم فرمائی تھی اور اپنے اس وقت کے نوجوان شاگردوں مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد یحییٰ تھانوی وغیرہ کو تصنیف و تالیف کے کام پر لگایا تھا، مولانا محمد یوسف بنوری ڈابھیل میں دورۂ حدیث پڑھ کر اپنے وطن جا چکے تھے، ڈابھیل میں بہ سلسلۂ تدریس و تصنیف اباجی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد پہونچے اور پھر انھوں نے مجلس علمی کی بڑی خدمت کی ہے، عجیب بات یہ ہے کہ بنوری صاحب کو اباجی رحمۃ اللہ علیہ سے قریب رہنے کا موقع بہت کم ملا، اس کی ابتدا یہ ہے کہ ۱۸ برس کی عمر میں وہ مشکوٰۃ و جلالین کے طالب علم کی حیثیت سے دیوبند آئے، ان کے والد مولانا محمد زکریا صاحب اور ماموں مولانا فضل صمدانی سے اباجی رحمۃ اللہ علیہ

کے تعلقات تھے، مگر بنوری صاحب نے بغیر کسی تعارف کے اپنا ایک عربی قصیدہ اباجیؒ کے سامنے پیش کیا، جسے ملاحظہ فرماکر اباجی نے فرمایا کہ اس میں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں، بنوری صاحب بہت تھوڑی مدت میں اباجی سے قریب ہوگئے، علاوہ عام درس کے کئی کتابیں صرف ان کو اباجی نے پڑھایا، لیکن اباجی سے ان کی معیت اور صحبت کی مدت بہت کم ہے مگر اس بہت کم مدت میں انھوں نے اباجی کو خوب سمجھا، اور ان کے علوم کی بڑی خدمت کی آپ نے مولانا سید محمد طلحہ کا بھی ذکر کیا ہے، میں نے اپنے بچپن میں مولانا طلحہ صاحب کو اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں میں لاہور اور دیوبند میں دیکھا ہے،

آپ نے یہ خبر کسی اخبار میں پڑھی ہوگی کہ حکومت جموں وکشمیر نے ابھی اکتوبر میں اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک سمینار کشمیر میں بلایا تھا جس میں ان کے خاص خاص شاگرد جمع ہوئے تھے، یہ سمینار بہت کامیاب رہا اور اس میں شیخ محمد عبد اللہ صاحب نے کشمیر میں اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک علمی ادارہ قائم کرنے کی تجویز منظور کی، عزیزم مکرم مولانا محمد فاروق میرواعظ کشمیری، مولانا مسعودی، مولانا محمد طیب صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد صاحب اس تجویز کے محرک تھے،

معارف کو اپنے صفحات پر اس تجویز کی تائید کرنی چاہئے اور اس کے قیام پر زور دینا چاہئے، کشمیر میں علمی دینی کام کرنے کا بڑا میدان ہے، اب شیخ صاحب بھی متوجہ ہیں، ایسا علمی دینی اور تصنیفی ادارہ قائم ہوگیا تو بڑا کام ہوگا،

وفیات

آہ! ڈاکٹر ظفرالہدیٰ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ڈاکٹر ظفرالہدیٰ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، علامہ شبلیؒ کی بڑی پوتی کے شوہر تھے، ان کا آبائی وطن تو اعظم گڈھ ضلع ہی میں تھا، مگر ان کے گھر کے لوگ دربھنگہ (بہار) منتقل ہوگئے تھے، اس لئے پٹنہ یونیورسٹی میں اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کی، وہاں سے فارسی اور اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں لکچرار ہوگئے، وہیں سے پنشن پاکر ڈھاکہ میں مقیم تھے کہ ۵ مارچ سنہ ۱۹۹۰ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی وفات علامہ شبلیؒ کے خاندان کا ایک المناک سانحہ ہے، وہ اپنے شاگردوں اور یونیورسٹی کے رفقائے کار میں اپنے اخلاق، اخلاص، محبت اور میٹھی زبان کی وجہ سے بہت مقبول تھے، اسی لئے جب بنگلہ دیش میں خونین انقلاب آیا تو وہاں کی سفاکانہ اور بہیمانہ خونریزی میں ہر طرح محفوظ رہے، ان کے اور رفقائے کار تو کراچی منتقل ہوگئے، لیکن انھوں نے ڈھاکہ ہی میں رہنا پسند کیا، بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کے ساتھ جو بے جا سلوک کیا تھا، اس کی وجہ سے بنگلہ دیش کے لوگوں کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑا سخت رد عمل تھا، اس کو ڈاکٹر ظفرالہدیٰ اپنے خطوط میں یہ لکھ کر دور کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ آخر یہ لوگ بھی مسلمان ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا صالح لٹریچر پیش کرنے کی خاطر شبلی اکیڈمی بھی قائم کی، دارالمصنفین کی مطبوعات کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کرانے کی علمی مہم شروع کی،

ان کا کام کچھ چل نکلا تھا کہ وہ وہاں پہونچ گئے، جہاں ایک روز سب کو جانا ہے۔

ان کو دار المصنفین اور اس کے وسیلہ سے میری حقیر ذات سے بڑی محبت رہی، میں جب کبھی ڈھاکہ گیا تو وہ مجھ سے سگے بھائی کی طرح ملتے، اور خاطر و تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اعظم گڈھ آتے تو ان کا زیادہ تر وقت دار المصنفین ہی میں گذرتا، یہیں قیام کرکے انھوں نے اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا جس کا عنوان یہ تھا، ہندوستان میں ۱۵۲۶ء سے ۱۷۰۷ء تک کے عہد میں فارسی زبان و ادب کا فروغ" ان کے اس مقالہ کے کچھ حصے کراچی کی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سہ ماہی انگریزی جرنل اور معارف میں چھپے، اور اس کی داد ان کو اہل نظر سے ملی، ان کے پورے مقالہ کا اردو ترجمہ ان کے ایک شاگرد سلطان احمد صاحب نے کیا ہے، امید کہ یہ ترجمہ دار المصنفین سے شایع ہوگا، ان کی اہلیہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم۔ بی بی ایس کی ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرکے وہیں پریکٹس کرتی ہیں، انکی اولاد میں صرف ایک لڑکی ہے، وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے لیکن اپنی شرافت، اخلاق، بلندی ہمت، دوست نوازی، اعزہ پروری، اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے ایک عرصہ دراز تک اپنے عزیزوں اور دوستوں کے حلقے میں یاد کئے جائیں گے، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو انکی نیکیوں کی بدولت ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں، آمین، ثم آمین۔

اعجاز صدیقی مرحوم

از جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی

مولانا سیماب اکبر آبادی کے فرزند اور رسالہ "شاعر" کے مدیر، اعجاز صدیقی پر ۹ فروری ۱۹۷۸ء کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اسی روز اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

ایک عرصہ سے مختلف امراض کی وجہ سے اعجاز صاحب کی صحت خراب ہو چکی تھی، کئی بار ہسپتال میں داخل کیے گئے، اچھے اچھے ڈاکٹروں نے بڑی توجہ اور شفقت سے علاج کیا، مگر بقول شاعر

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اعجاز صدیقی فروری ۱۹۵۱ء میں اپنے وطن آگرہ سے بمبئی آئے اور یہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کا رسالہ "شاعر" (ماہنامہ) جو پہلے آگرہ سے نکلتا تھا، اسی سال سے بمبئی سے شائع ہونے لگا، وہ اس کے معیار کو بلند رکھنے میں انتھک کوشش کرتے تھے، اردو سے پُرخلوص محبت اور اپنے قارئین کو صاف ستھرا ادب پیش کرنے کی کوشش، ان کی زندگی کے دو ایسے نمایاں پہلو تھے کہ جن کی وجہ سے اردو کے اچھے اور اہم لکھنے والوں اور شعراء کا انھیں غیر معمولی تعاون حاصل ہوتا رہا، جس کے سہارے وہ "شاعر" کے بڑے بڑے ضخیم خصوصی نمبر نکال سکے، ان میں کرشن چندر ناولٹ نمبر، افسانہ اور ڈراما نمبر اور آج کی ہم عصر اردو ادب نمبر، ہماری زبان و ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلسل علالت، گرتی ہوئی صحت اور محدود وسائل کے ساتھ ایسے ضخیم اور اچھے نمبر شائع کرنا، بڑی جرأت کا کام تھا، بلاشبہ اعجاز صاحب غیر معمولی قوت ارادی کے حامل تھے!

اعجاز صدیقی، ذاتی طور پر مشرقی تہذیب اور قدروں کے علمبردار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے، انھوں نے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات اور دوستانہ مراسم سالہا سال تک آخری دم تک، بڑی خوبی کے ساتھ نبھائے، بمبئی، فلمی دنیا کا مرکز مانا جاتا ہے، جہاں پہنچ کر اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں (یا جدید اصطلاح میں قلمکاروں) کا "ادبی پرہیز" ٹوٹ جاتا ہے مگر اعجاز صاحب نے سب سے تعلقات رکھتے برتتے ہوئے بھی، اپنے قلم کی سلامت روی کو قائم رکھا اردو تحریک اور اس سے متعلقہ مسائل، اعجاز صاحب کے دماغ پر ہر لمحہ اس طرح چھائے

رہتے تھے کہ اُن سے کسی اور موضوع پر گفتگو کم ہوتی تھی، انھوں نے مجموعات "کے تحت شاعر" میں ان مسائل پر اچھے ادارئے لکھے ہیں جن میں فکر کی گہرائی، اور خلوص کا جذبہ، دونوں چھلکتے ہیں، وہ غزل کے شاعر تھے، مشاعروں میں اسوقت بھی مقبول رہے، جب ترنم سے پڑھتے تھے، اور اسوقت بھی دادِ سخن حاصل کرتے رہے جب ترنم سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا، انھوں نے کئی قومی نظمیں لکھیں مثلاً خوابوں کا مسیحا، ہماری جنگ آزادی، ہم امن چاہتے ہیں وغیرہ ان میں سے بعض پر ادبی اداروں کی طرف سے انعامات بھی ملے۔

اعجاز صدیقی کی وفات سے اُردو کی صف سے ایک مخلص، سچا اور جانباز سپاہی اٹھ گیا، اللہ اُن کی منغفرت فرمائے،

حیاتِ سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ۔ ۔ ۔ سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ انکے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی، علمی و ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس اور سال بسال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دار المصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، نیز مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز نگارش کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنی ہے اور ویسی ہی دلکش اور دلچسپ، مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ قیمت ۱۰ روپے منیجر

بابُ التقریظ والانتقاد

"جامِ شعور"

جناب سیّد اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس، لکھنؤ کے حلقے میں اس حیثیت سے جانے، اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں کہ وہ ایک لائق اور دیانت دار اعلیٰ عہدیدار ہیں، اور اپنی ملازمت کی گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود انگریزی اور اردو میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اچھے مضامین اور اچھی کتابیں لکھ کر اپنی علمی صلاحیت اور مذہبیت کا اظہار کرتے رہتے ہیں مگر کوئی اُن سے شاعر کی حیثیت سے واقف نہیں تھا، ۱۹۷۸ء میں جب ان کی عمر تقریباً ۵۰ سال کی ہوئی، تو یکایک اُن کے کلام کا ایک مجموعہ جامِ شعور کے نام سے شائع ہوا، تو ان کے دوستوں اور قریبی تعلق رکھنے والوں کو بھی یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں اور ایک اچھے شاعر۔

اُن کی شاعری کی ابتدا غالباً اُن کی رفیقۂ حیات کی غمناک وفات سے ہوئی، اس سانحہ سے اُن کے تحت الشعور میں جو شاعرانہ جذبات دبے ہوئے تھے، وہ یکایک اُبھر آئے۔ اُن کے اشک مسلسل سے موتی کی لڑی تیار ہونے لگی، اور وہ بھی سب کچھ اپنی شاعری میں کہنے لگے، جو واقعات اُن کے دل پر پڑی تھی، کچھ اشعار تو انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات کی یاد میں کہے، مگر ان کی دائمی جدائی کی کھٹک اور کسک اُنکی غزلوں میں بھی منتقل ہوگئی ہے،

صبح گلشن میں کھلے ہیں جو یہی لالہ و گل — چند رنگین و حسین لمحوں کے مہماں ہوں گے

حیات و موت اگر ہمکنار ہیں ہمدم — مٹے ہیں لوگ یہ کیوں ایسی زندگی کے لئے

رضا کی بات اگر ہو تو کیا خوشی اپنی — خدا یہ تلخیٔ غم کردے سازگار مجھے

ان کا ذوق مذہبی ہے، اس لئے جہاں معرفتِ نفس میں یہ کہہ گئے ہیں،

مقصد ترا لافانی پرواز ہے لاہوتی — شہکار خداوندی یہ ضعف بشر کیا ہے

کیا معجزہ قدرت اللہ نے دکھلایا — کم مایہ سہی لیکن، تقدیر بشر کیا ہے

وہاں معرفتِ حق میں ان کے یہاں یہ اشعار ملیں گے،

معرفت جہل کو چاہئے فکرِ دیدہ ور — سابقہ حیرتوں سے ہے حدِ نگاہ تک مگر

یہ تو مقامِ عشق ہے منزلِ جذب و کیف ہے — جوشِ جنوں سے واسطہ عقل و خرد سے درگزر

پھر اسی جذبہ میں جو حمد لکھی ہے، وہ اُن کے رچے ہوئے مذہبی ذوق کا ثبوت ہے،

نور ہی نور کو بہ کو نغمۂ حمد چار سو — اس کی ضیائے حسن سے بزمِ جہاں سنور گئی

اس کا کرم ہے بیکراں بخشش اس کی بے شمار — دیکھ کے اپنی غفلتیں آج تو آنکھ بھر گئی

پھر ان کی مناجات کا ایک شعر ہے،

وہ سوز دے ملتا ہے جو آشفتہ دلوں کو — ہر غم سے زمانہ کے جو بیگانہ بنا دے

پھر اپنی ایک غزل میں یہ کہتے ہیں،

یہ مصائبِ دلِ پُر محن نہ بدل سکیں گے مرا چلن،

کہ مری محافظِ جان و تن تری ذات ربِ غفور ہے

انھوں نے ایک نعت بھی لکھی، جو پیرا فٹ محمد، وی، میٹی نیکلٹر آف مین کا نیند [illegible] رہی ہیں

آف مین اور دی صبح ازل آف مین کا مصنف ہی لکھ سکتا ہے،

جس زبان اور طرز ادا میں سید ظفر حسین صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اگر وہ سودا اور اشرف علی فغاں کے زمانہ میں ہوتے، تو ان کے معاصرین کہتے کہ ان کی شاعری میں بڑی شیوا بیانی اور مہارت ہے، مگر اب غزل گوئی کا فن اتنا آگے بڑھ گیا ہے، کہ ان کی غزلوں کی لے محض جانی پہچانی اور کبھی کبھی روایتی ہی تصور کی جائے گی، لیکن ان کی خوش قسمتی ہے کہ اس دور کی شاعری کے ایک استاد جناب آنند نرائن ملا نے اُن کی شاعری کی داد یہ لکھ کر دی کہ "ایک فکر رسا اور ایک دردمند دل دونوں نے مل کر انھیں یہ انداز بیان دیا ہے جس میں ان کا خلوص قدم قدم پر نمایاں ہے" یہ اُن کے لئے بہت بڑی سند ہے، امید ہے کہ جب انھوں نے اپنی شاعری کے رُخِ زیبا سے نقاب اٹھایا ہے تو اس کے جلوۂ حسن کو آیندہ بھی نمایاں کرتے رہیں گے،

ان کے اس مجموعہ کی لکھائی چھپائی بہت ہی عمدہ ہے، اس کی قیمت سولہ روپیہ ہے، اس کے ملنے کے پتے یہ ہیں،

(۱) گورنمنٹ نرسری کمپاؤنڈ، مال روڈ لکھنؤ، اور نامی پریس نخاس، لکھنؤ،

"ص ع"

رسالوں کے اقبال نمبر

المعارف مرتبہ۔ مولانا محمد عبد اللہ قریشی، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۴۴،

اقبال نمبر قیمت سالانہ ۱۰ روپئے، پتہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور،

علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات ہندوستان اور پاکستان میں دھوم دھام سے منائی گئی ہیں، دہلی اور لاہور کے عالمی جشن کی روداد معارف کے گذشتہ شماروں میں چھپ چکی ہے اس موقع پر دونوں ملکوں کے رسائل کے خاص نمبروں میں بھی ڈاکٹر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے مشہور علمی ماہنامہ "المعارف" کا اقبال نمبر

پیش نظر ہے، اس کی ابتدا خود ڈاکٹر صاحب کے ایک مضمون سے کی گئی ہے اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ صرف اسلام کے نبی برحق اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنے والوں ہی کو نہ کہ شہنشاہوں اور جمہوری فرمانرواؤں کو حکمرانی کا خداداد حق حاصل ہے، اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ کے اوصاف و خصوصیات اور شہنشاہیت و جمہوریت کے خط و خال بھی دکھلائے ہیں، پروفیسر محمد منور نے جہان اقبال کو جہان قرآن بتاتے ہوئے اس کی مثبت و منفی خصوصیات تفصیل سے لکھی ہے، جناب شاہد حسین رزاقی نے غلط تصوف اور صوفیا کے خلاف اقبال کے خیالات پیش کئے ہیں اور لکھا ہے کہ وہ صحیح تصوف کے مخالف نہ تھے، رحیم بخش شاہین نے اقبال کا پسندیدہ معاشی نظام اسلامی نظام معیشت کو اور ناپسندیدہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی معاشی نظام کو بتایا ہے، انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے ایک طویل اخباری بیان کے اقتباسات نقل کر کے ان لوگوں کی بہت مدلل تردید کی ہے، جو ان کو اشتراکی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، دو مضامین میں اقبال کے نظریۂ تعلیم اور نظریۂ شعر کی وضاحت کی گئی ہے، ایک مضمون میں مغربی تہذیب پر ان کی تنقیدوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، ایک مضمون مسئلۂ فلسطین کے بارہ میں ان کے جذبات و احساسات پر مشتمل ہے، اس میں ترکی، عرب اور دوسرے اسلامی ملکوں کے ابتر حالات پر ان کے اضطراب و بے چینی کا ذکر بھی آگیا ہے، ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے، رسالہ کے لائق مدیر نے اس نیابت کے تمام معلومات اکٹھا کر دئے ہیں، آخری مضمون میں غازی علم الدین کا ذکر ہے ۱۹۲۳ء میں لاہور کے ایک ناشر راج پال نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نہایت گستاخانہ کتاب "رنگیلا رسول" شائع کی تھی، غازی علم الدین نے ان کو قتل کر دیا جس کے نتیجہ میں ان کو پھانسی دی گئی انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کو لاہور میں دفن کیا جائے،

مگر جیل کے حکام نے ان کو میانوالی میں نماز جنازہ کے بغیر دفن کر دیا اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد اقبال اور دوسرے مسلم زعماء کی ان کوششوں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے جن کی بدولت شہید کی نعش لاہور لائی گئی، یہ نمبر اقبال پر سنجیدہ اور باوزن مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مطالعہ کے لائق ہے اور اس سے بہت سی پر مغز اور مفید معلومات حاصل ہوں گی۔

آج کل۔ مرتبہ شہباز حسین صاحب، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲ ۵ ا

اقبال نمبر قیمت سالانہ دس روپئے، پتہ پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی،

یہ ہندوستان کے مشہور ماہنامہ "آج کل" کا اقبال نمبر ہے، اقبال کے عاشق اور پرستار جگن ناتھ آزاد کا مفید مصور مضمون "توقیت اقبال" ان کی کتاب "مرقع اقبال" سے ماخوذ ہے، جناب شبیر احمد خاں غوری نے تصور ملکیت و تقسیم دولت کے بارہ میں اقبال کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے، "اقبال اور عہد جدید" (ظہیر احمد صدیقی) "ایک شاگرد کے تأثرات" (صالحۃ الکبریٰ عرشی) اور دوسرے مضامین بھی اچھے ہیں، لیکن بعض مضامین میں اقبال کے افکار و خیالات کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی ہے، مثلاً خواجہ احمد عباس کا یہ دعویٰ کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح سوشلسٹ تھے، بالکل صحیح نہیں بہت سے مضامین میں اس کی بہت مدلل تردید کی جا چکی ہے، فراق صاحب کے خیال میں اقبال نے دنیا کی مشکلات کا کوئی حل نہیں پیش کیا ہے، انھوں نے ان کے افکار کو کھوکھلا، گمراہ کن اور متضاد بتایا ہے فراق صاحب غیر متوازن باتیں کہنے کے لئے مشہور رہیں، ان کی یہ بات بھی اسی کی نشاندہی کر رہی ہے

کلیم الدین صاحب کے مضمون "اقبال اور عالمی ادب" کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے کہ "اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے" وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ مقام ہمارے آپ کے کہنے سے نہیں ملتا، یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب میاری مغربی شعرا اور میاری

مغربی نقاد اس کی بزرگی اس کی شاعرانہ عظمت کے قایل ہوں۔ یہ وجہ وہی نقاد بتا سکتا ہو جس پر مغربی ادب کا کابوس سوار ہو، کلیم الدین صاحب پر یہ کابوس سوار ہے جب یہ کابوس ان پر سے اتر جائے گا تو وہ اقبال کے مرتبہ و مقام کو متعین کر سکیں گے، اور ان کے رتبہ کو بھی پہچان سکیں گے، اس کے بعد پھر شاید ان کی تنقیدوں کی ناہمواری بھی جاتی رہے گی اور بعض حلقہ میں ان کی تنقیدوں سے جو آتندگی پیدا ہوجایا کرتی ہے وہ بھی ختم ہوجائیگی'

ڈاکٹر قمر رئیس کے مضمون میں بھی بعض جگہ غیر معتدل باتیں ہیں، اقبال پر گوناگوں مفید کتابیں چھپ گئی ہیں، ان کے پیام دعوت، اور افکار و خیالات کی تشریح پورے طور پر ہوگئی ہے، تعجب ہے کہ اس کے بعد بھی اقبال کے بارہ میں بے سروپا باتیں کہہ دی جاتی ہیں، نظموں کا حصہ اچھا ہے اس میں اقبال کی عظمت و کمالات کا اعتراف کیا گیا ہے، اس نمبر میں اقبال کی متعدد تصویریں بھی ہیں،

شیرازہ مرتبہ جناب رشید نازکی صاحب کاغذ و طباعت عمدہ، کتابت معمولی صفحات

اقبال نمبر ۲۰۰ قیمت تحریر نہیں، پتہ جموں اینڈ کشمیر اکاڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر،

یہ سہ ماہی رسالہ شیرازہ کا خاص نمبر ہے جو اقبال کے متعلق مضامین و منظومات پر مشتمل ہے اس میں ان سمیناروں میں پڑھے جانے والے بعض مضامین بھی شامل ہیں جو جموں اور سری نگر میں ہوئے تھے، اس کے مضامین میں اقبال کی زندگی، شخصیت اور فکر و فن کو زیر بحث لایا گیا ہے، شیخ حبیب اللہ کے مضمون میں ڈاکٹر تاراچند کے اس خیال کی تردید ہے کہ اقبال نے خیر و شر کا مسئلہ زرتشت کی تعلیمات سے لیا ہے، مکاتیب اقبال از مشعل سلطان پوری، اقبال اور حیدرآباد از قیصر سرمست، اقبال اور قرآن از زایم۔ اے شیدا، اچھے مضامین ہیں، جگن ناتھ آزاد کا مضمون آقبال شاہ ہمدان کے حضور میں ان کی زیر تسوید کتاب اقبال اور کشمیر کا ایک باب ہے، سب مضامین یک سطح کے نہیں ہیں، پنڈت سرچ رہبر کے مضمون میں بڑی ناہموار باتیں ہیں جن کی تردید خود ادارہ کی طرف سے کی گئی ہے، منظومات کا حصہ اچھا ہے، یہ نمبر بھی مصور ہے، " ض "

مطبوعاتِ جدیدہ

پارسی گویانِ ہند و سند۔ ڈاکٹر ہرومل سدارنگانی متوسط تقطیع کاغذ عمدہ ٹائپ صفحات ۔ ۔ قیمت درج نہیں، مطبوعہ چاپ خانہ رامین۔ ایران ،

ڈاکٹر ہرومل سدارنگانی نے بمبئی اور تہران کی یونیورسٹیوں سے کسبِ فیض کیا ہے' اس کتاب میں انھوں نے تیرہویں صدی تک کے ہند وسندھ کے فارسی شاعروں کا ذکر کیا ہے، یہ چار فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں پنجاب اور شمالی ہند کے بعض علاقوں میں فارسی زبان کے رواج پانے اور بعض ہندی اور سندھی شاعروں کا ذکر ہے، دوسری فصل میں نویں صدی ہجری سے قبل کے ہندوستان اور سندھ میں فارسی شاعری کی اجمالی تاریخ کے ساتھ چند فارسی گو شعرا کا تذکرہ بھی ہے، تیسری فصل میں مغلیہ سلطنت کے زمانہ کے ہندوستان میں فارسی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس عہد کے شعرا کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، نیز سندھ کے ارغون، ترخان مغل اور کلہرہ فرماں رواؤں کے زمانہ کے فارسی گو شعرا کا ذکر بھی ہے، آخری فصل میں تیرہویں صدی ہجری تک کے بعض فارسی گو شعرا کے حالات ہیں، اس میں مرزا غالبؔ اور لالہ امانتؔ رائے وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے، ہر فصل میں شعرا کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے، تیسری فصل زیادہ اہم ہے، کیونکہ دراصل یہی ہندوستان میں فارسی شاعری کا زریں عہد تھا، اس کے متعلق اردو میں اب کئی کتابیں چھپ گئی ہیں، دارالمصنفین کی

کتاب بزم تیموریہ اسی دور کا ادبی مرقع ہے، اور اس سے پہلے کے دور کا ادبی مرقع بزم مملوکیہ ہے،
مصنف نے عام شعراء کے علاوہ تیموری امراء و سلاطین کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا ہے، عرفی،
فیضی، نظیری، ظہوری، طالب آملی، ابو طالب کلیم، سرمد، غنی کشمیری، فانی کشمیری، چندربھان
برہمن، صائب، محمد افضل سرخوش، عبد القادر بیدل اور علی حزین اور سندھ کے غوری کا شانی
اور میر علی قانع وغیرہ سرآمد روزگار شعراء کا ذکر اسی فصل میں ہے، اور تاج الدین ریزہ
شہاب الدین قرہ، خواجہ عمید الدین، امیر خسرو اور امیر حسین دہلوی وغیرہ کا تذکرہ
دوسری فصل میں ہے، اس کتاب میں فارسی شاعری کے مختلف دور کا بہت سرسری
جائزہ لیا گیا ہے، اس لئے بڑی تشنگی معلوم ہوتی ہے، شاعروں کے حالات بھی اختصار سے
لکھے گئے ہیں، اور کلام کا انتخاب اصل ماخذ اور دواوین کے بجائے عموماً تذکروں کی
مدد سے کیا گیا ہے، اگر مصنف ہند و سندھ میں فارسی شاعری کے عہد بعہد ارتقا اور
مختلف دور کا مزید تفصیل سے ذکر کرتے تو یہ کتاب ہندوستان کے فارسی شعر و ادب
پر کام کرنے والوں کے لیے ایک اچھا ماخذ ہو جاتی، سندھ کے ایک شاعر محمد بن ابراہیم
کے متعلق لکھا ہے "پیرو فرقہ نقشبندی بود" (ص ۲۳۳) حالانکہ نقشبندی کسی فرقہ کا نہیں
بلکہ تصوف کے ایک سلسلہ کا نام ہے، بو الہوس کا املا بیہوس (ص ۱۲۲) لکھا ہے اور
کتابت کی غلطی سے غلام علی کو غلاطی ص ۲۷ اور غنی کشمیری کا سنہ وفات ۱۰۷۹ھ
کے بجائے ۱۰۹۹ھ لکھ گیا ہے،

خطبات ماجد - مرتبہ جناب محمد صدیق صاحب دریابادی متوسط تقطیع
کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۱۱ مجلد مع گردپوش، قیمت - ۱۲ روپے
پتہ - ادارہ انشائے ماجدی، ۱۲۷ - راجندر سرانی کلکتہ - ۳۰

جناب محمد صدیق دریابادی مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کے ہم وطن اور خاص عقیدت مند ہیں، انھوں نے اپنے صدیق لبیب اور مولانا کے ادب و انشا کے پرستار حاجی منظور علی لکھنوی کے اشتراک اور مالی تعاون سے کلکتہ میں "ادارہ انشائے ماجدی" کی داغ بیل ڈالی، جس کے اشاعتی پروگرام کی ابتدا زیر نظر کتاب سے کی گئی ہے، یہ مولانا کے چار خطبوں کا مجموعہ ہے، پہلا خطبہ بھتیجی اور آخری تین صاحبزادیوں کے عقد نکاح کے موقع پر لکھے گئے تھے، اور اسی زمانہ میں صدق میں چھپے تھے، ان میں نکاح کے مروجہ مسنون خطبہ کی آیتوں اور کلمات کی تشریح کرکے زوجین کے حقوق و فرائض، نکاح کا مقصد، ضرورت اور طریقہ وغیرہ بیان کیا گیا ہے، اور ضمناً اسلام میں عورت کی حیثیت و عظمت بھی بتائی گئی ہے، اور نکاح کو معیوب سمجھنے، اس کے موجودہ رائج طریقوں اور پسندیدہ شادیوں کی قباحتیں بھی دکھائی گئی ہیں یکسانیت اور تکرار کے باوجود یہ خطبے زوجین کے لئے ہدایت نامہ اور مولانا کے منفرد اور دلکش اسلوب تحریر کی خصوصیات سے معمور ہیں، اس لئے ان کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب ہے، کتاب کی ظاہری نفاست اور حسن طباعت مرتب کی خوش سلیقگی کا ثبوت ہے، لیکن کہیں کہیں اعراب کی غلطیاں ہیں اور مولانا کا ترجمہ قرآن پیش نظر رکھنے کی وجہ سے بعض جگہ قرآنی آیتوں کے ترجمہ کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے، جیسے من نفس واحدۃ کا "ایک نفس واحد" سے یا تساءلون بہ کا "جس کے نام سے ایک دوسرے کے مطالبات حقوق کرتے ہو" (ص ۱۹) اور ص ۲۶ پر لتسکنوا الیھا الخ کا ترجمہ ترجمانی ہوگیا ہے۔

تاریخ ادب عربی حصہ اول، مرتبہ مولانا مقتدی حسن ازہری متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۴۰۲ قیمت درج نہیں ہے: (۱) مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس (۲) مکتبہ ترجمان ۱۴۰۳ پریس اسٹریٹ صدر بازار دہلی۔

اردو میں عربی شعر و ادب کے بارہ میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس لئے لائق مصنف نے جن کو عربی زبان و ادب کا اچھا ذوق ہے، عربی ادب کی تاریخ کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ اس کا پہلا حصہ ہے، جو آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے، اس میں جاہلی دور کے عربی شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، اس مقصد سے پہلے جزیرۂ عرب کی مختصر تاریخ، جغرافیائی حالات، جاہلیت کے مفہوم اور جاہلی دور کی تعیین کی گئی ہے، اور اس دور کے بعض اہم شہروں اور قبائل کے خصوصیات اور زمانہ جاہلیت کے اجتماعی، اقتصادی، دینی اور علمی حالات بیان کئے گئے ہیں، پھر عربی زبان کے مختلف لہجوں، اس کی دوسری سامی زبانوں کی خصوصیات کا ذکر ہے، مصنف نے جاہلی شاعری کی روایت و تدوین کے سلسلہ میں ان مستشرقین کی تردید کی ہے، جو اس کے پورے ذخیرہ کو الحاقی قرار دیتے ہیں، ایک فصل میں بعض شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے، آخر میں جاہلی دور کی نثر کے ضمن میں عربوں کے امثال و خطابت اور کاہنوں کے مسجع کلام پر بحث ہے، لیکن یہ حصہ بہت مختصر ہے، عربوں کی خطابت پر مزید کاوش سے لکھنے کی ضرورت تھی، اشخاص، قبائل اور مقامات پر توضیحی حواشی ہونے چاہئے تھے، پتہ نہیں مصنف کے انتخاب میں چار ہی جاہلی شاعر کیوں آسکے؟ یہ کتاب شعرائے نصرانیہ کے ذکر سے بھی خالی ہے، معلوم نہیں کتابت کی غلطی یا کسی اور سبب سے بعض اشعار کی نقل میں تصرف ہو گیا ہے، اس سے قطع نظر یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اس کی ترتیب میں مصر و شام کی جدید تالیفات کے علاوہ مستشرقین کی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے بھی مفید ہے، کہ یہ نہ بہت مختصر ہے اور نہ زیادہ مطول، جادۂ اعتدال پر۔

مرتبہ پروفیسر عبد المغنی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت

دطباعت معمولی صفحات ۳۳۴ مجلد مع گرد پوش قیمت دس روپیہ ناشر کتاب منزل سبزی باغ، پٹنہ ۴۔

پروفیسر عبدالمغنی نے وقتاً فوقتاً جو ادبی و تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں لکھے تھے ان کے بعض مجموعے پہلے چھپ چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ ۱۲ مضامین پر مشتمل ہے، اس میں صف اول کے علاوہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے چند ادیبوں اور شاعروں کے خدمات شعر و ادب کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے، مصنف نے انیسؔ، غالبؔ، اقبالؔ، تلوک چند محروم، فراق، فیض، عبدالعزیز خالد مانوس سہسرامی، پرویز شاہدی کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے، اور اختر اورینوی، علی عباس حسینی اور شکیل مظفر پوری کی افسانہ نگاری، رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری اور ملا ابن العرب کی طنز نگاری کی خصوصیات دکھائی ہیں، اور ان کے ادبی درجہ و مرتبہ کو واضح کیا ہے، مختلف اصناف مثلاً "جدید اردو شاعری" ڈرامہ اور تھیٹر، اردو افسانہ نگاری اور اسلامی ادب پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے "جدید ادبی مسائل"، "جدید و قدیم کا فریب" اور "اسلامی ادب" خصوصیت سے قابل مطالعہ مضامین ہیں، ان سے مصنف کے ادبی نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ترقی پسند ادب" اور" جدیدیت "کے بڑے ناقد ہیں، دونوں کی انتہا پسندی، خامی بلکہ گمراہی بھی دکھائی ہے اور اسلامی ادب کے گرویدہ ہیں، اس کی خوبیوں اور توازن کا ذکر کیا ہے، انھوں نے فراق کی شاعری کے بارہ میں مناسب خیالات ظاہر کئے ہیں، مصنف کے بعض خیالات اور تبصروں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی ادبی و تنقیدی صلاحیت اچھی ہے، اور مجموعی حیثیت سے ان کے خیالات میں اعتدال و توازن ہے، اس لئے یہ مجموعہ مطالعہ کے لائق ہے،

"ض"

جلد ۱۲۶ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۰ء عیسوی عدد ۵

مضامین

مقالات

آثار علمیہ وادبیہ

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

ہماری مرکزی حکومت کے ایک بہت ہی بااثر وزیر نے اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کا مشورہ دیا ہے جس کے بعد ان کا خیال ہے کہ اردو کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا، اس سے پہلے بھی یہ آواز سنی گئی تھی، مگر وہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھی گئی، اب پھر دہرائی جا رہی ہے،

کسی سیاسی رہنما کا مشورہ سیاسی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوتا ہے، زبان و ادب کا معاملہ بھی سیاست کی نذر ہو رہا ہے، یہ مہم برابر جاری ہے کہ قومی دھارے کی یکسانیت کی خاطر ایک زبان کا ہونا ضروری ہے، ہندی زبان کا رواج ابھی پورے ملک میں قائم نہیں ہو رہا ہے، بعض علاقوں میں اس کی مخالفت بھی ہو رہی ہے، اس کے حامی اب ناگری رسم خط کا سہارا لینا چاہتے ہیں، اور یہ کہکر اس کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوشش میں ہیں کہ رسم خط مشترک ہو گیا تو ملک کے لسانی جھگڑے آسانی سے طے ہو جائیں گے، یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اگر دنیا کے تمام لوگ ایک ہی قسم کا لباس پہننا شروع کر دیں تو سارے عالمی اختلافات ختم ہو جائیں گے، یورپ میں رسم خط اور لباس دونوں یکساں ہیں، مگر وہاں ہر قسم کی باہمی آویزش جاری ہے جس کی انتہا دو عالمگیر لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہے،

اردو ناگری لپی میں لکھی شروع ہو جائے گی، تو اردو پڑھنے والوں کی آئندہ نسلوں کے لئے اس کے گذشتہ لٹریچر کو دریابرد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا، کیونکہ اگر ہماری مرکزی حکومت کا کل سالانہ بجٹ اس کو ناگری رسم خط میں منتقل کرنے میں خرچ کر دیا جائے گا، تو بھی یہ ممکن نہ ہو سکے گا، اس طرح ناگری رسم خط کی خاطر اردو زبان کو اپنی ساری تہذیبی علمی اور ادبی وراثت سے منھ موڑنا ہوگا، علم و ادب اور تہذیب کا بہت بڑا سرمایہ عربی اور فارسی کتابوں میں بھی ہے جو اردو رسم خط کے ذریعہ

سے پڑھ لی جاتی ہیں، وہ کیا ہوں گی، کس میوزیم میں رکھی جائیں گی،؟

ناگری رسم خط میں اردو کو لکھنے کی تلقین کرنے والے، اردو زبان کے مزاج، اس کے حروف تہجی کی صوت، اس کے اعراب کی امتیازی خصوصیات، اس کے ساکن اور متحرک آواز کے طرز ادا، اس کے تلفظ کے حسن سے واقف نہیں۔ وہ اس کے الف ممدودہ، الف مقصورہ اور الف تنوین، تائے دراز تائے مدور، تائے موقوفہ، واؤ معروف، واؤ مجہول، واو عطف، واو معدولہ، ہائے ملفوظ، ہائے مخلوط، ہائے مختفی، ہائے معروف، ہائے مجہول اور ہمزہ وغیرہ کی اہمیت کو کچھ نہیں سمجھتے، اگر سمجھتے تو پھر اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کی نصیحت نہ کرتے، وہ بتائیں کہ ناگری میں اردو کے صحیح املا، اور ہیئت کے ساتھ اعلیٰ، اولیٰ، دعویٰ، عیسیٰ، موسیٰ، علیٰ حالہٖ، یقیناً حکماً، نسلاً بعد نسلٍ، ذوالنون، ذوالفقار، المبشر، کعبہ، شگفتہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، خواجہ، توفیق، ہنبر اور جنبش وغیرہ کو کیسے لکھا جا سکتا ہے، وہ ناگری لپی میں اثر، اور عصر، نذر، اور نظر، آسی، اور عاصی، زہیر، اور ظہیر، زفر، اور ظفر، حال، اور ہال، ہمراہ، ثمر لکھ کر کوئی فرق پیدا نہیں کر سکتے، وہ غور کریں، کہ ژند، پاژند، ژالہ، اور ژولیدہ بیانی کو کیسے لکھ سکتے ہیں، پھر کسی زبان کی لطافت اور نزاکت کو قومی دھارے کے ایک بے جا تخیل کی بنا پر قربان کرنا کہاں تک صحیح ہے،؟

ہندی میں ث، ذ، ژ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، اور ق کے ساتھ کے الفاظ کا صحیح املا لکھا ہی نہیں جا سکتا ہے، اردو رسم خط کی خوبی یہ ہے کہ ہندی کیا اس کو عربی، فارسی، اور انگریزی حروف تہجی پر بھی برتری حاصل ہے، عربی اور فارسی میں ٹ، ڈ، اور ڑ نہیں، فارسی میں چ، ژ اور گ ہیں، تو عربی میں یہ حروف نہیں، عربی اور فارسی بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، ڈھ، اور ڑھ وغیرہ جیسی آوازوں سے بالکل آشنا نہیں، انگریزی خ، ط، ض، ع، اور ق وغیرہ سے بالکل مانوس نہیں، اردو میں ان تمام زبانوں کے حروف تہجی کی آوازسانی

دے گی، اس میں ہر لفظ کا تلفظ پوری صحت کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے۔

ایک عرب مرچ کو مرش، چائے کو شائے، گڑھ کو کرہ بول جائے گا، ایک ایرانی اردو کا لفظ ڈال بونا چاہے گا، تو وہ دال کہہ سکے گا، انگریز اعظم گڑھ کو اعظم گرہ، علی گڑھ کو علی گرہ، الہ آباد کو الہا باد، دہلی کو ڈلی بولتا ہے، ہندی بولنے والے ابوالفضل کو ابو پھیل، عاشق کو آشک، معشوق کو ماسوک، عشق کو اِسک، زلف کو جلپھ، فریاد کو پھریاد، اور انصاف کو انساپھ بولتے یا لکھتے ہیں جبکہ یا غلطی محسوس نہ کریں گے اردو بولنے والے کو ان تمام الفاظ کو صحیح مخرج کے ساتھ ادا کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا، اگر رسم خط میں اضافت کا بھی اہتمام نہیں ہماری شاعری اگر، اگر رسم خط میں اضافت کے بغیر لکھی گئی تو اس کی ساری لطافت جاتی رہے گی۔

......⚬✲⚬......

اورنگ زیب عالمگیر پر یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ نہیں رکھتا تھا، اردو کے رسم خط سے اردو بولنے والوں کو جو جذباتی لگاؤ ہے، اس سے وہ محروم کر دئے گئے تو کیا کوئی مورخ یہ لکھنے کا حق نہیں رکھ سکتا ہے، کہ اس دور کے اورنگ زیب نے وہی سب کچھ کیا، جس کے لئے گذشتہ تاریخ کے اورنگ زیب کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے مسلمان حکمرانوں پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ بے جا طور پر غیر مسلموں سے جزیہ لیا کرتے تھے، موجودہ دور میں جزیہ لینے اور ادا کرنے کی صورتیں بدلی ہوئی ہیں، برسر اقتدار جماعت کی خاطر زبان قربان کر دی جائے، ضمیر کو گروی رکھ دیا جائے، ایمان کو نیلام گھر کے حوالہ کر دیا جائے، اور کردار کو دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بنا دیا جائے، تو یہی اس دور کا قابل قبول جزیہ ہے، مگر صاف ذہن رکھنے والے محبان وطن کو یہ سوچنا ہے کہ یہ جزیہ لینا اور دینا کہاں تک ملک کے لئے مفید ہے۔

......⚬✲⚬......

مقالات

عہدِ نبوی میں نظامِ حکومت

کے

مظاہر اور خصائص

سیرۃ النبی جلد ہفتم کے ایک باب سے کچھ اور حصے

سلسلہ کے لئے دیکھئے معارف ماہ اپریل ۳۳ء

از

مولانا سید سلیمان ندوی

یہ واقعات ایک دنیوی اور ایک اخلاقی سلطنت میں تمایاں حدِ فاصل قائم کرتے ہیں، دنیوی سلطنتوں میں مجرم اس لئے مجرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسروں نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیا ہی سزا کے اجرا سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء استغفار سے ان کا گناہ معاف ہو جائے گا، دنیوی سلطنتوں میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہ نے ماعز پر اس لئے پتھر برسائے تھے کہ انھوں نے حکم الٰہی کی بجا تنفیذ کی توفیق پائی، دنیوی سلطنتوں میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہو سکتا ہے،

اخلاق اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کے صدمہ پہونچانے کے لئے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رسول دنیوی سلطنت خارج کو معاف کرسکتی ہے، بڑے بڑے جرم سے درگذر کرسکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و لاطفت کا برتاؤ کرسکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم کا اغماض نہیں کرسکتی لیکن عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کئے جن سے بظاہر امور جنگی و سیاسی کو نقصان پہونچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور دل پاک تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی ہے کہ انھوں نے اسلام کی کوئی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطب ابن بلتعہ ایک صحابی تھے انھوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا اور خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ جو مہاجرین مکہ میں اپنے آل و اولاد کو چھوڑ کر چلے آئے ہیں ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے لیکن میرے بال بچوں کا کوئی سہارا نہیں تھا اس لئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے ذریعہ سے میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپ نے فرمایا سچ کہتا ہے، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں لیکن آپ نے

فرمایا کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہے ؟ کچھ تو ہے ، جس کی بنا پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے ،

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَکُمُ الْجَنَّۃُ ،	جو چاہو کرو کیونکہ جنت تمھاری قسمت میں لکھی جا چکی ،

یہ سنکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے ،[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ صرف شرکت بدر کی فضیلت ہی پر مبنی نہ تھا ، بلکہ ایک ایسے اصول پر مبنی تھا جسکو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے ، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دوراندیش خیال کیا جاتا ہے ، جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کی سیاسیات کا جزو ہے ، اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص کا رابطہ نہیں پیدا ہوتا لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں کا تمامتر دارومدار اخلاص باللہ اور خلوص باہمی کے اعتماد پر ہے ، اور اسی اعتماد کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی تھی ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے ،

حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَۃِ	حسن ظن ، ایک قسم کی عبادت ہے ،
(ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰)	

---

[1] بخاری جلد ۲ کتاب المغازی ص ۵۶۷ ،

اور قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے۔

ان بعض الظن اثم — بعض گمان گناہ ہوتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے،

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم — جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کریگا وہ ان کو برباد کر دیگا،

اور عمال سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے،

عن معاویۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم او کدت ان تفسدھم — حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا، یا عنقریب برباد کر دوگے

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا حضرت عبداللہ ابن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا، اور اس کی نسبت کہا گیا "اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے" لیکن چونکہ انھوں نے خود اسکو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اسلئے فرمایا کہ ہمکو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے، البتہ جو جرم ہمکو علانیہ نظر آتا ہے اس پر مواخذہ کرتے ہیں؛

دخین حضرت عقبہ ابن عامر صحابی کے منشی تھے، انھوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسایہ شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا وہ لوگ باز نہیں آتے اب ان کے لئے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہ نے فرمایا کہ "مدگذر کرو" دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ کھلم کھلا شراب کا

ہنکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں" حضرت عقبہ نے پھر فرمایا کہ درگذر کر و کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ،

من رای عورۃ فسترھا	جس نے کسی برائی کو دیکھکر چھپالیا ،
کان کمن احیی موؤدۃ[1]	اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہو جس نے
	ان لڑکیوں کو موت سے بچالیا جو زندہ درگور "

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہمکو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑسکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان یہ ہو کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لئے مضر ہے، اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے اس مضمون میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ تمامتر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کے نمایان کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں،

" جاننا چاہئے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول وسعت علم، حسن خط، اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف اس نسبت کے ساتھ ہے جو ان کو سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور اون کا سرپرست اور نگران ہے اس لئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو، اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہو

---

[1] یہ تمام حدیثیں ابو داؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی الستر عن المسلم میں ہیں،

اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطنت کی خوبیوں کا تمامتر دارومدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کرکے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہوجاتی ہے، اور لوگ جھوٹ اور مکر و فریب سے کے دامن میں اس سے پناہ حاصل کرلیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تمام چیزیں ان کا اخلاق بن جاتے ہیں اور ان کا اصلی ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہوجاتا ہے، اور اکثر وہ جنگ کے موقعوں میں اس سے پہلو تہی کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر آمادہ ہوجاتے ہیں، اور اس سے خود سلطنت برباد ہوجاتی ہے، اور اگر اس قسم کے سلاطین کی ظالمانہ حکومت ہمیشہ قائم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کی محبت میں شرابور ہوجاتے ہیں، اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دیدیتے ہیں، اس کے ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہوجاتا ہے سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں بھی چند چیزیں ہیں، مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا خیال رکھنا بھی ایک قسم کی نرمی ہے، اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتداہی کو

انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لئے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور اسی وجہ سے شارع نے حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد ابن سفیان کو معزول کیا تو انھوں نے کہا کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا، یا میں نے کوئی خیانت کی ہے حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تمکو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔

ابن خلدون نے ان سطروں میں جو آئین جہانبانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی، اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف سلطنتوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر اپنی سلطنت کی بنیاد کھڑی کی ہے وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے اسکا نتیجہ یہ ہے کہ نرمی یعنی جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں مجرموں کو سوقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے اثبات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں

ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا،

ان اللہ یعذب الذین یعذبون　　　بے شبہ خدا ان لوگوں کو عذاب دیگا

فی الدنیا،　　　جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں،

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کے قالب میں ظہور کیا اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت اوٹھایا تھا، انھوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا، ایک دفعہ حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیئے گئے ہیں، انھوں نے اس کی وجہ پوچھی لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارہ میں ان کو یہ سزا دیگئی ہے، انھوں نے کہا "میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دیگا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں"[1]،

دنیوی سلطنتیں لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتی ہیں، غیر قوموں کے ساتھ ایک مذہبی مذہب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو جس موقع پر بیان کیا وہ موقع تھا، جہاں غیر قوموں پر ظلم کیا جا رہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کی حقیقت کا لازمی جزء تھا، اور اس لئے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر محیط تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عمال کی نسبت تھا، لیکن معاملات خلافت میں خود آپ کا طرز عمل اس قدر نیاضانہ اور رسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا

---

[1] مسلم جلد ۲ ص ۲۰۹ کتاب الادب،

کر دیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلعم کے اس فیاضانہ طرز عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا، تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت صلعم کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیئے، کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لیکر مبعوث ہوئے ہیں،[1]

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے! آپ نے پوچھا کیا وضو کر کے چلے تھے، اوس نے کہا ہاں، آپ نے دریافت فرمایا، کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی، اوس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا جاؤ خدا نے تم کو معاف کر دیا،[2]

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لیجاتی، ایک بار ایک مجنون الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ نے فرمایا تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپ اس کے ساتھ گئے، اور اوس کا کام انجام دیدیا،[3]

عدی بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے، اور بڑے بڑے درباروں میں رہ چکے تھے جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو اون کو شک تھا کہ آیا حضور بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب اون کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضور بادشاہ نہیں، کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے، اور اس کے بعد فوراً آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے، متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمت اقدس میں آتے تھے، اور نہایت بے تکلفی بلکہ بیباکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے، اور حضور اون کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے،

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۵۰، کتاب الحدود [2] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۴۴ کتاب الحدود [illegible] وہ حد کے قابل نہیں تھا، اس لیے [illegible] اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی [illegible]
[3] [illegible]

ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اوس کی طرف دیکھکر ہنس پڑے، اور اوس کو عطیہ دیا۔[۱] بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہوجاتے تھے جن کے لئے اون کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن اون میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے، ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں اون سے کوئی بے عنوانی نہ ہوجائے، اوس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انھوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا،[۲] لیکن آخر ایک رات کو بے قابو ہوکر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبراکر انھوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر جرم کا اعتراف کیا، آپ نے دو بار فرمایا کیا تم نے ایسا کیا، انھوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی ہاں ہاں، یارسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی، اور اب خدا کا جو حکم ہو اوس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالےٰ نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا ایک غلام آزاد کر دو، انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یارسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یارسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزہ ہی کا نتیجہ ہے، آپنے فرمایا کہ تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو، عرض کی یارسول اللہ ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپنے اون کی یہ بات سنکر ارشاد فرمایا کہ صدقۂ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمکو اس قدر کھجور دیدیگا کہ اوس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے

---

[۱] بخاری جلد ۲ ص ۹۰۰ [۲] ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ دی جائے جیسے کوئی یہ کہے تو میری ماں کے برابر ہو، اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے، اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا

تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری، اور رسول اللہ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا[1]

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص وعقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف وکرم اس دوگونہ جذبہ نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاجہائے مرصع میں نظر نہیں آسکتی اعراب بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے، اور نہ ہو سکتا تھا لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کئے گئے تو ان خودسر بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی مگر جوش عقیدت کے ساتھ قبول کیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے، جو عہد نبوت میں ان سے پیش آتے رہتے تھے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چلکر مدینہ آیا سفر سے پریشان اور بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا، اور شریعت کے احکام پوچھے فرمایا دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی کہ کچھ اور نمازیں بھی، فرمایا نہیں لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی فرمایا نہیں لیکن یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال وجواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا خدا کی قسم میں نہیں کمی بیشی نہ کرونگا، یہ سنکر حضورؐ نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہوگیا، اگر سچا نکلا (بخاری کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا آپ کا قاصد

---

[1] ابوداؤد جلد اص ۲۰۹ کتاب الطلاق،

ہمارے پاس آیا اور اوس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا اوس نے سچ کہا، اوس نے کہا آسمان کو کس نے پیدا کیا، فرمایا اللہ تعالے نے، اوس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے، فرمایا اللہ تعالی نے، اوس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدہ کی چیزیں کس نے بنائی ہیں فرمایا اللہ عزوجل نے، اوس نے کہا اوس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا، اور پہاڑ کو کھڑا کیا اور اونہیں فائدے رکھے کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے، فرمایا ہاں، اوس نے پھر عرض کی کہ آپکے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں، اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے، فرمایا اوس نے سچ کہا، قسم ہے اوس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، کیا خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے، فرمایا بے شک، پھر کہا آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے، فرمایا ہاں، سچ کہا۔ اوس نے کہا قسم ہے اوس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے، فرمایا ہاں۔ پھر کہا آپکے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانۂ کعبہ کا حج کریں، فرمایا ہاں سچ کہا۔ عرض کی اوس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا کیا خدا نے اس کا حکم دیا فرمایا ہاں، اوس نے عرض کی قسم ہے اسکی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کرونگا ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو یہ جنت میں داخل ہوگا۔ (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، کہ اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور اوسی طرح مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا تم میں محمد کون ہیں، لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں، اوس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضور نے فرمایا

ہان کہو، اوس نے کہا کہ مین تم سے کچھ پوچھونگا، اور سختی سے پوچھونگا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا جو چاہو پوچھو، اوس نے کہا مین تمھارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دیکر پوچھتا ہون کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگون کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے فرمایا خدایا ہان پھر کہا خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہون کہ کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتون کی نماز پڑھین فرمایا خدایا ہان، پھر کہا خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہون کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال مین ایک مہینے کا روزہ رکھین، فرمایا خدایا ہان، پھر کہا خدا ہی کی قسم دیکر پوچھتا ہون کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندون سے زکوٰۃ لین اور ہمارے محتاجون کو بانٹ دین فرمایا خدایا ہان، اوس نے کہا مین ایمان لاتا ہون اوس پر جس کو لیکر آپ آئے ہین، اپنے پیچھے والون کا نائب ہو کر آیا ہوں میں ضمام بن ثعلبہ ہون۔ (بخاری کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی کا ایک واقعہ سنئے۔

خیر یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار تھے، وہ بھی اگر اون کی وفات کے بعد گذر گئے تو اون کے ساتھ بھی اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے، اون کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا وہ اسی کو ڈھونڈھنے نکلے تو بدوؤں میں پہونچ گئے، اون کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضورؐ کے تعلق سے وہ اون پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے۔ (ابوداؤد کتاب الحدود، ص ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان تھا، میدان جنگ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حصہ میدان جہاد ہی مین بسر ہوا ہے لیکن صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے، اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانین نثار کی ہین

نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ ابن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہؓ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے۔ عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی ڈاڑھی پکڑ لیتے تھے۔ لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے تھے، کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپؐ کا لعاب دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرہ پر ملتے ہیں، جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹتے ہیں، جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے وہ اس منظر جاہ و جلال کو دیکھکر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں تمام بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر، کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں، جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں۔ جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرہ پر ملتے ہیں، جب آپؐ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے پیش دستی کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لئے لڑتا ہے، جب آپ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے لوگ تعظیماً آپؐ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔[۱]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت

---

[۱] بخاری جلد ۱ ص ۳۷۸ کتاب الشروط

سعد بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ ہمہ تن جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انہوں نے کہا،

ایانا تُرید یارسول اللہ	یارسول اللہ کیا آپ کا اشارہ ہماری
والذی نفسی بیدہ لو	طرف ہے اس ذات کی قسم جس کے
امرتنا ان نخیضھا البحر لاخضناھا	ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ کا حکم ہو
ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا	کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے
الی برک الغماد لفعلنا،	ڈالدیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم
(مسلم کتاب الجہاد باب غزوہ بدر)	ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد[1]
	پر دھاوا کریں گے تو ہم کر دیں گے،

غزوہ احد میں جب آپ نے کفار کی جمعیت کو گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا جوش محبت کی تفسیر اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے، انھوں نے کہا،

بابی انت وامی لاتشرف	میرے باپ ماں آپ پر قربان، آپ
یصبک سہم من سہام	گردن بڑھا کر نہ دیکھئے، کہیں آپ کو
القوم نحری دون نحرک	کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے
(بخاری کتاب المغازی غزوۂ احد)	سینہ کے سامنے ہے،

غیر تو صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے، حضرتؐ کے صحبت یافتہ غیر قوموں میں بھی پہنچ گئے، تو اون کی محبوبیت کا یہی عالم تھا، چنانچہ غیر قوموں

---

[1] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام،

کو بھی جب عمال نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا، تو وہ بھی اون کی گرویدہ ہوجاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو مقرر فرمایا وہ وہاں گئے اور تخمینہ کرکے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا "تو بہت ہو" انہوں نے کہا اچھا میں تخمینہ کردیتا ہوں، تم لوگ اسکا نصف لے لینا، اس انصاف شعاری سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب یکزبان ہو کر پکار اٹھے،

هذا الحق به تقوم السماء	انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے
والارض قد رضينا ان	آسمان و زمین قائم ہیں، جو کچھ تم نے کہا
ناخذه بالذی قلت[1]	ہم اوس کے قبول کرنے پر راضی ہیں،

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے اون کو رشوت دینا چاہی لیکن انھوں نے کہا اے دشمنان خدا! تم مجھکو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو میرے نزدیک محبوب ترین خلائق ہے، اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمھاری دشمنی اور اوس کی محبت مجھکو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سنکر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں[2]

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۵۰ کتاب البیوع۔ [2] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۱

اقبال کے مداح اور نقاد

از، جناب صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری

محترم جناب صوفی نذیر احمد کاشمیری صاحب کا یہ مقالہ اس وقت آیا جب میں ایک لمبے سفر پر تھا، میری ڈاک میں غلطی سے رہ گیا، اسی لئے معارف میں اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی، جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے، اس مقالہ میں فاضل مقالہ نگار کا لب و لہجہ ان کا اپنا ہے، جو معارف کے روایتی لب و لہجہ سے مختلف ہے، مگر ان کے احترام میں اس میں تبدیلی نہیں کی گئی ہے، غالب کے متعلق انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس سے معارف کو پورا اتفاق نہیں، مگر غالب کی مدح کے ساتھ ان کی قدح بھی بہت کی گئی ہے، اس مقالہ میں ان کی قدح کا ایک نمونہ اور بھی سامنے آگیا،

"ص ع"

اخبار ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۱ جون سنہ ء میں ایک مضمون نگار نے اقبال پر ایک تنقیدی جائزہ شائع کیا ہے، اسی سلسلہ میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، راقم اس بحث میں ایک بڑی انسانی خدمت کے پیش نظر حصہ لے رہا ہے، آج عالمگیر انسانی معاشرہ تاریخ کے ایک ایسے مرحلے پر آچکا ہے کہ وہ صرف خود شناس، آدم شناس اور خدا شناس معاشرہ کی حیثیت سے ہی زندہ رہ سکتا ہے، فرد کو معاشرے کی فلاح و بقا اور معاشرہ کو

فرد کی بقا و فلاح کا خیال رکھتے ہوئے اپنے فکر و عمل کو باہم مربوط کرنا ہوگا، اُسے جو کرنا ہوگا وہ بحیثیت انسان کرتا ہوگا، اس کا مرنا جینا انسانی فلاح کے نصب العین سے جبلتی طور پر مربوط رہنے سے ہوگا، اور اگر معاشرے کے خود سر اور خود غرض لوگ اس پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر انسان بھی تاریخ حیات کا ایک بھولا بسرا خواب ہو سکتا ہے، خود سری، خود پسندی خود نمائی و خود غرضی کا نتیجہ اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا۔ خود سری، خود پسندی، خود نمائی و خود غرضی اگرچہ حیوانی انواع کی بقا کی بنیاد ہیں تو یہی خواص انسانی بقا کی ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ہیں، انسان حیوانی خواص کو دبا کر اپنے مخصوص اخلاقی شعور کے سہارے ہی جی سکتا ہے، اور آج علم برائے علم، فن برائے فن، حکمت برائے حکمت بشعر برائے شعر، کے تمام تفرقہ پرور انفرادیت خانوں کو مسمار کر کے ان سب کے ملبے سے ایک ایسی عبادت گاہ کی تعمیر کرنا لازمی ہو گیا ہے، جہاں پوری نوع انسانی اپنے انفرادی و طبقاتی و صنعتی امتیازات کو ختم کر کے کہ ایک ہی صف میں کھڑی ہو، نہ کوئی محمود ہو، نہ کوئی ایاز، نہ آقا اور نہ کوئی بندہ، اور نہ کوئی بندہ نواز ہو۔ اگر کسی فرد کا عمل اس انسانی افادیت سے خالی ہے تو پھر اسے انسان کہلانے کا حق نہیں پہنچتا اور جب وہ انسان کہلانے کا حقدار نہیں تو پھر اسے قدرتاً تمام ان حقوق سے محروم ہو جانا چاہئے، جو اسے بحیثیت انسان حاصل ہیں اور اسے حیوانات کے اس گلے میں شامل ہو جانا چاہئے، جو اس کے ذوق کے مطابق ہو موجودہ دور کے ایک اہم مفکر (رسل) نے خوشی پر فتح حاصل کرنے کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، مفکر موصوف نے کتاب کے پہلے باب کا آغاز ہی "انسان کاش میں حیوان ہوتا" کے ایک فقرے سے کیا ہے، انسان اگر انسانی حیثیت اور اس کے شعور ذات کو دبا کر زندگی گزارنا چاہے تو پھر اسے قطعاً وہی موقف اختیار کرنا ہوگا جو رسل نے حصولِ خوشی کے لیے تجویز کیا ہے، اس کی ایک عالمگیر مثال تو ہپی ازم ہے اور دوسری مثال

نسل ازم ہے، اور اپنے انسانی مقام کو کھو کر آج عالم انسانی اسی حیوانی کشمکش کا ذہنی بن چکا ہے، جو اسے یقیناً یا تو ایک کھلے تصادم کے ذریعہ کائنات سے نیست و نابود کر دیگا یا پھر انسان کے اخلاقی شعور ذات اور اس کے خلاق عمل کی نفی کر دیگا، اور بے تمیز رس کا حیوان بنا کر پھر جنگلوں کی طرف دھکیل دے گا، اس لئے ان ائمہ ضلالت کے یہاں انسانی خوشی یہی ہے کہ انسان شعور نیک و بد سے آزادی حاصل کرتا ہوا حیوانی بے فکرے پن کی دنیا میں چلا جائے۔ موجودہ مغربی تہذیب نے انسانی کنبے کو اسی خطرناک موقف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور چونکہ یہ تہذیب ایک استثنائی رنگ میں عالمگیر ہو چکی ہے لہٰذا اس کا انسانی بدل بھی قطعاً عالمگیر ہو سکتا ہے اور ایسی انسانی تہذیب کے لئے یہ بات اشد درجہ ضروری ہے کہ پوری نوع انسانی کے فکر و عمل میں نہایت درجہ یکسانی و ہم آہنگی ہو اور اس ہم آہنگی و یکسانی کو پیدا کرنے کے لیے سائنس برائے سائنس علم برائے علم، فن برائے فن، ادب برائے ادب کی ساری خود سریوں کو ختم کرتے ہوئے علم برائے انسان، حکمت برائے انسان، فن برائے انسان، ادب برائے انسان و شعور برائے انسان کے دور کا ایک ذمہ داری سے آغاز کرنا ہو گا، ایک ہموار، ہم آہنگ اور اخلاقی احساس ذمہ داری پر مبنی تہذیب ہی موجودہ عالم انسانی کو پر امن و بے خطر کرتے ہوئے، اس اخوت و بھائی چارے کو پیدا کر سکتی ہے، جو طبقاتی تقابل و تحاسد و تنفر کے بجائے باہمی خیر اندیشی اور تعاون پر مبنی ہو۔

شاعر اقبال اقبال اسی دور کا وہ شاعر ہے جس نے اپنے قول و فعل اور فکر و عمل کو انسانی معاشرہ کی افادیت کا پابند رکھا ہے، وہ اپنے اظہار و تعبیر میں اگر محض شاعر ہے تو اپنے فکری مواد کے اعتبار سے ایک جیسے درد دل رکھنے والا انسان ہے، انفرادیت پسندانہ غیر ذمہ داری کے بجائے وہ معاشرے کے دکھ درد اور بھلائی پر نظر رکھتا ہوا شاعری کرتا ہے، صرف یہی بات ہے جو اُسکے

سبب راقم اقبال کے متعلق بدظنی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے،

فلسفۂ خودی اقبال کے افکار میں خودی کا فلسفہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے، ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار اس کی طرف ایک ہلکا سا طنزیہ اشارہ کر گئے ہیں، مذہبی حیثیت سے اقبال کے فلسفۂ خودی پر تنقید کی کافی گنجائش ہے مگر اقبال کے فلسفۂ خودی کا ایک ایسا مفید پہلو بھی ہے، جس پر اقبال کے نقادوں کے ساتھ ہی اس کے مداحوں کی بھی نظر نہیں ہے، حالانکہ فلسفۂ خودی کا یہی پہلو ہے، جس نے اقبال کو اسے اپنا موضوع فکر بنانے پر مجبور کر دیا تھا، اور جس کے واضح ہو جانے کے بعد اکثر وہ اعتراضات غیر متعلق ہو جاتے ہیں، جو اقبال پر کئے گئے ہیں،

یہاں اقبال کا ایک فارسی شعر نقل کرتے ہوئے اس کی حقیقت عرض کی جاتی ہے

خودی را پردہ می گوئی، بگو، من با تو این گویم
مزن کیں پردہ رچاک کہ داماں نگہ تنگ است

ترجمہ: "تو خودی کو پردہ بتاتا ہے تو بتا، مگر میں تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ اس پردہ کو چاک نہ کر ورنہ پھر نظر کہیں ٹھہرے گی نہیں" حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنی انفرادیت کو مرکز بنا کر سوچ بچار کا آغاز کرتا ہے، تو اُسے کچھ متعین حقائق کا پتہ چل جاتا ہے، چاہے وہ از حد محدود ہی کیوں نہ ہوں مثلاً جب وہ یوں سوچتا ہے کہ میں کیا ہوں، کہاں کھڑا ہوں، میری منزلِ مقصود کہاں ہے، وہاں پہنچنے کے لئے مجھے کون سا راستہ اور کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں، تو چاہے یہ سوالات اس کے دائرۂ فکر و عمل کو محدود کر دیتے ہوں لیکن پھر بھی ان سوالات کی کھوج لگاتے ہوئے انسان کو جو حاصل ہوتا ہے وہ ایک طرف واقعات کے کرنے کی چیز ہے، محض تخیلات و اوہام کا سلسلہ نہیں ہے، اور دوسری طرف انسان کی اپنی زندگی کے لئے ان کی افادیت بھی قطعی ہے اور چونکہ یہ سارے سوالات تمام انسانوں کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کے جوابات

کی افادیت بھی سب کے لیے یکساں ہے، وہ پورے نوع انسان کو ایک دائرۂ فکر و عمل میں لانے والی ہے، لہٰذا انسان اپنی سوچ بچار کے نتیجے میں اپنے علاوہ تمام نوع انسانی کی تقدیر و تدبیر کے متعلق بھی بہت سے ضروری و مفید حقائق کو حاصل کر لیتا ہے، لیکن جب انسان اپنی انفرادیت اور خودی کو نظر انداز کرتے ہوئے سوچ بچار شروع کرتا ہے تو وہ پہلے قدم پر ہی لاادریت Agnosticism کا شکار بن جاتا ہے، اور اس کے سارے ادراکات و انکشافات ایک انتشار انگیز چیستان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے اور ان کی قدر و قیمت صرف اتنی ہوتی ہے کہ "جو مانے اس کا بھی بھلا اور جو نہ مانے اسکا بھی بھلا ہو" اور یہ فلسفہ انسان کی راہ فلاح کو تاریک کرنے کا خطرناک فلسفہ ہے، وہ یقین اور قطعیت کا دشمن ہے، اس لئے کہ اگر انسان زندگی کے مختصر وقفے کو محض امکانات کے تجزیے میں صرف کر دے تو وہ اپنے قوائے حیات اور صلاحیتوں کو انتشار کے سپرد کرنے کے سوائے کہیں نہیں پہونچتا، یہی اس کی ہلاکت ابدی ہے، تاریخ کے ان سارے باطنیوں کے افکار کی یہی حیثیت ہے، جنھوں نے اپنے خاص مقام انسانی اور اپنی انفرادیت کا انکار کرتے ہوئے سوچ بچار کا آغاز کیا ہے، وہ اپنے ان بے سروپا افکار کو روحانیت کا نام دیتے ہیں حالانکہ ان افکار کا سرے سے انسان سے ہی کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ ان کی انسانیت تو اسی وقت رخصت ہو گئی تھی، جب انھوں نے اپنی انفرادیت کا انکار کر دیا تھا باطنیہ کا یہ گروہ عمران انسانی کا وہ مخالف گروہ ہے، جس نے آج تک انسانوں کو کوئی پائیدار تہذیب تعمیر کرنے سے محروم کر رکھا ہے، اور اب حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ نوع انسانی کو اپنے فکر و عمل کو انسانی حیثیت کا پابند کرتے ہوئے اپنا نحوۂ عمل متعین کرنا ہوگا،

انسانیت کا شاعر اقبال انسان کی انسانیت کا شاعر ہے، اور تاریخ پر بھی عالمانہ نگاہ

رکھتا ہے، لہذا اس نے اس باطنیہ منفی انداز فکر کے مقابل اپنی شاعری کی بنیاد انسانی انفرادیت کے استقلال اور خودی پر رکھی ہے، جو بہت بڑی خدمت انسانی ہے، چونکہ اقبال کے عام مداحوں اور نقادوں کی طرح ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار کی نگاہ بھی انسانی خودی کے اس مفہوم پر نہیں ہے، لہذا انھیں اسپر اعتراض ہے،

البتہ جب اقبال اس خودی کا رخ خالق کائنات کی طرف کرتا ہوا خود کو اس کی رضا جوئی کا پابند کرنے کے بجائے اسے اپنی رضا جوئی کا مشورہ دیتا ہے تو وہ اپنے تسلیم کردہ معیار اسلام سے گر جاتا ہے، اس لئے کہ مذہب نے خالق کے مقابل تسلیم و رضا اور خود سپردگی کو ہی مخلوق کا ترقی حیات و فلاح بتایا ہے اور امر واقعہ بھی یہ ہے کہ خالق کائنات نے ہر چیز کو پیدا کرتے ہوئے اس کی تربیت و تکمیل کے لئے جو مختلف قوانین بنائے ہیں، مخلوق کی فلاح صرف اس میں ہے کہ اپنی فلاح و بقا کے ان قوانین مقدس کے سامنے تسلیم و رضا بن جائے لہذا خالق کے معین کردہ قوانین کا اتباع ہی انسان کو اپنے خالق کی طرف عروج و معراج دیتا ہے، یہاں اپنی پست خواہشات کی طرف اللہ پاک کو نزول کا مشورہ دینا شاعرانہ لاابالی پن ہے، مگر اس ظاہری گستاخی سے بھی اقبال ایک بڑے خطرے کا توڑ کر رہا ہے خطرہ یہ ہے کہ قلت ہوش اور کثرت جوش سے انسان باطنیہ کی طرح خالق و مخلوق کی دوئی کو اور "من تو شدم تو من شدی" کا الاپ راگ نہ شروع کر دے، اور تمیز مفید و مضر اور شعور خبیث و طیب دولت بے بہا سے انسان کو خالی کر دے، اور اپنے انفرادی استقلال کے احساس سے بے گانہ کرتا ہوا اسے پھر غیر انسانی کائنات میں لے نہ جائے انسان چاہے کائنات کی کلیت کے مقابل اپنی انفرادیت سے دستبردار ہو کر اس کی کلی ہم آہنگی کا دم چھلا بن جائے، یا خالق کائنات کے مقابل اپنی ہستی سے دست بردار ہو کر نعرۂ انا الحق

بلند کر دے، یہ دونوں باتیں انسان کی اپنی مخصوص تدبیر و تقدیر کے لیے ساری معرفت رکھتی ہیں، دونوں صورتوں میں انسان اپنے نظم و نسق کو برباد کرتا ہوا غایت جہل کو غایت معرفت قرار دے دیتا ہے، اور اس طرح اس جہل مرکب کا ارتکاب کرتا ہے، کہ جس کا کوئی علاج نہیں ہے، اقبال کے سامنے انسانی انفرادیت (خودی) کے دونوں پہلو موجود رہتے ہیں اور وہ نہ صرف کائنات کی ناقابلیت اور اس کی وسعتوں کے مقابل بلکہ خود خالق کائنات کے مقابل بھی انسانی استقلال کی حفاظت کرتا ہے، اور یہ انسانی عمران کی بنیاد ہے، اقبال ایک طرف انسان و کائنات کی دوئی کو اور دوسری طرف انسان و خالق کائنات کی دوئی کو قائم رکھتا ہوا اس نورانی جزیرہ کی حفاظت کا سامان کرتا ہے، جسے کائنات انسانی کہا جاتا ہے، اور جو ساری کائنات کے درمیان اور خالق کائنات کے درمیان ایک برزخ ہے، کائنات کے سارے مصالح اور حکمتوں کا ظہور اسی نورانی جزیرے کے ذریعہ ہوتا ہے، انسان کے علاوہ کائنات تو ایک ہیبت انگیز صحرائے مرگ و یاس کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتی، مگر انسان کے اپنے مقام شرفت پر متمکن ہو جانے کے بعد یہ سب صحرائے مرگ و یاس ایک کارخانۂ حکمت و تدبیر بن جاتا ہے، انسان کائنات کے مصالح و حکم کی ایک مختصر سی لوح محفوظ ہے، اس لوح محفوظ کو انسانی بے تمیزی سے بچانا مصلحین انسانیت کا مشترکہ فرض رہا ہے، اور شاعری کے دائرہ میں اقبال نے اس حفاظت کا پورا حق ادا کیا ہے، اقبال، رومی کو اپنا مرشد قرار دیتا ہے، اور اس کی ذاتی بے خودی پر اسے عمر بھر رشک آتا رہتا ہے،

"خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں،
حضرت مولا مجھے صاحب جنوں کر!"

مگر اللہ پاک نے بھی اس دعا کو رد کرتے ہوئے اس سے شاعری کے دائرہ میں

ناموسِ انسانی کی حفاظت کا کام لیا ہے جو بہت بڑا اعزاز ہے، اقبال کے پیر صاحب کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا، رومی کی طرح استغراق و بےخودی کی اقبالی تمنا ایک باطل تمنا تھی، اس لئے کہ انسان تو غائت تمیز مفید و مضر اور نہایت شعور نیک و بد سے بنا ہے، اور یہ غائت ہوش و تمیز کا مقام ہے، نہ کہ بےخودی و بےہوشی کا حیوانی بےفکرا پن ہے، راقم کئی سال تک اس بےخودی کا شکار رہنے کے بعد ہوش و تمیز کی دنیا میں آیا ہے، اور خوب جانتا ہے کہ صاحب ہوش و خرد ہونا کتنی بڑی انسانی سعادت ہے اگرچہ وہ غایت درجہ کا دردسر اور دُودجگر بھی ہے، مگر اس کے سوائے وہ اخلاقی شخصیت تعمیر نہیں ہو سکتی، جو ابدی بقا میں جاتی ہے، اور موت کا جھٹکا جس کے لیے حیات ابدی کا دروازہ کھول دیتا ہے، مگر یہاں پر نقادانِ اقبال کے ساتھ ہی اقبال کے مداحوں کو بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اقبال نبی و رسول نہیں کہ اس کے فکروں میں ثبات و یکسانی اور حقائق کی یکساں تعبیر ہر وقت قائم رہے، تلون و تلوین شاعر کی فطرت ہے، وہ وادی وادی میں گھومتا ہے، اور اس کے قول و فعل میں یک رنگی کا فقدان ہوتا ہے، وہ حقایق کے بیان میں مبالغے اور غلو کو پوری بےاحتیاطی سے برتتا ہے یہ حیثیت شاعر کی تقدیر ہے،

اقبال کی خودستائی اور عدم اخلاص،

ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار کو شکایت ہے کہ اقبال کی شاعری میں اخلاص کی کمی ہے، اور وہ ادنیٰ بائیں کے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اور تحسین و واہ واہ پر نظر رکھتے ہوئے شاعری کرتا ہے، اقبال پر یہ اعتراض کرتے ہوئے صاحب مضمون حق سے اس درجہ دور چلے گئے ہیں کہ جتنی دوری کا امکان ہو سکتا ہے، اقبال نے حقائق و واقعات کے جس احساس شدید کے ماتحت شاعری کی ہے

شاید صدیوں کی شاعری میں تلاش کرنے پر بھی اس کی مثال نہ مل سکے، (اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ شرح کرنے والے لوگوں نے راقم کو گذشتہ تیس پینتیس برسوں میں اس درجہ تنگ کر رکھا ہے کہ راقم اس سلسلے میں اقبال کی ایک چوک کو بھی نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا) مضمون نگار سے عرض ہے کہ اپنے اور ساری دنیا کے لاابالی پسندوں کے محبوب ترین شاعر غالب کے دیوان کو اخلاص کی کسوٹی پر پرکھیں تو انھیں انشاءاللہ ندامت سے سر جھکا دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے گا، غالب کی شاعری کا بہت بڑا حصہ تمسخر اور عوامی واہ واہ حاصل کرنے کے چٹکلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں[1]، صاحب مضمون نے غالب کے کمال کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے، لہٰذا ان سے گزارش ہے کہ وہ غالب کے ذیل کے اشعار پر غور کریں،

(۱) ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

(۲) اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

اس شخص (غالب) کی شاعری کا بڑا حصہ اسی مسخرے پن پر مشتمل ہے، اور صاحب مضمون نہ معلوم کس تعصب کی بناء پر اسے مرقعِ اخلاص قرار دیتے ہیں، مگر اقبال کو جو پہلے خود جلتا ہے اور جب اس جلن کے احساس سے آہ و واہ شروع کرتا ہے، تو تمام محفل جل اٹھتی ہے، صاحب مضمون غیر مخلص اور تماشی بتاتے ہیں، عجب نہیں کہ وہ ابھی تک اخلاص کے مفہوم ہی کو نہ سمجھ سکے ہوں ورنہ وہ کم از کم عدمِ اخلاص کا الزام اقبال پر نہ لگاتے،

دو واقعے | (۱) پہلی جنگ عظیم کا جب خاتمہ ہوا تو ترکوں کا سارا نظام خلافت تقریباً تتر بتر ہو گیا تھا، اس زمانہ میں اقبال نے اپنی نظم "خضرِ راہ" لکھی جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں خود اقبال نے پڑھ کر سنائی، راقم اس زمانہ میں لاہور میں زیر تعلیم تھا، مگر جلسہ میں موجود نہ تھا، جلسہ ختم ہونے کے بعد جب لوگ گھروں کو لوٹے تو شہر کی

۱۔ معارف: صوفی صاحب کے اس خیال سے ہم کو اتفاق نہیں،

مسلم بستی ایک ماتم کدہ بن گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ جب مرحوم نے ذیل کا شعر پڑھا،

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

تو شاعر کی ہچکی بندھ گئی اور محفل تو حشر کدہ بن گئی، آج بھی یہ شعر وہی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، لیکن شاعر کے اس جذبہ کی قدر کرنے کے لیے پاک اور حساس دل کی ضرورت ہے اگر انسان اس دولت سے محروم ہو تو پھر اس دولت کو پرکھنے کی اور کوئی کسوٹی نہیں، شاعری کے معیار اخلاص کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا عین واقعہ ہے کہ اقبال اخلاص کا ایک لاوا ہے جو موقع بہ موقع پھٹ پڑتا ہے، اور اردگرد کی بستیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

(۲) اقبال کا عرصے تک یہ معمول تھا کہ وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ایک آدھ نظم پڑھا کرتا تھا "خضر راہ" کے دوسرے ہی سال اقبال نے "طلوعِ اسلام" نام کی اپنی نظم پڑھی، اس سال کے دوران سیاست کی دنیا میں بڑے بڑے تغیرات رونما ہو چکے تھے، مثلاً یہ کہ ترکوں نے خلافت اسلامی کی ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اپنے آپ کو چند محدود کے اندر محدود کر لیا تھا، مگر اسی ہوم لینڈ کی حدود کو منوانے کے لیے ترک نوجوان سرگیف ہو چکا تھا، لہٰذا اس سارے سوال کو طے کرنے کے لیے جو کانفرنس (لوزان کانفرنس) ہوئی، اس میں ترکی ہوم لینڈ کے سوال کو تقسیم ہی ترکوں کے شرائط پر حل کیا گیا جس سے مسلمانانِ ہند میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر اقبال نے اسی خوشی کی لہر کی تعبیر اپنی نظم "طلوعِ اسلام" میں کی، راقم اس دفعہ خود اس اجلاس کے سامعین میں شریک تھا، راقم کے کانوں میں اقبال مرحوم کی پرترنم آواز اب بھی گونج جاتی ہے، اور اشعار کے ساتھ مرحوم کی بے ساختہ ایکٹنگ بھی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

مثلاً ذیل کے شعر کے ساتھ مرحوم نے ایک دفعہ مشرق کی طرف اور دوسری طرف مغرب کی طرف جھک کر جو ایکٹنگ کی وہ بھولنے والا نہیں، اس لئے کہ اس موقع پر ایک ایکٹر ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا، بلکہ ایک مجذوب حال کھیل رہا تھا، وہ اپنے اندرونی احساس سے مجبور ہو کر کچھ کر رہا تھا۔ اسے شعوری طور پر کرنا شاید وہ اپنی توہین سمجھتا، عوام کی واہ واہ کو حاصل کرنے کے لئے ترنم اور ایکٹنگ کو کام میں لانے والے اور ہوتے ہیں اور اپنے اندرونی واردات واحساسات سے مغلوب ہو کر کمال بے بسی سے تڑپ جانے والے اور ہوتے ہیں، انھیں آپ اقبال و رومی کہہ سکتے ہیں، بلاشبہ اقبال میں اس بات کے لیے بے پناہ تڑپ پائی جاتی ہے کہ اس کے احساسات سارے معاشرے کو اسی طرح اپنی گرفت میں لے لیں جس طرح انھوں نے اقبال کو لے رکھا تھا مگر یہ دادطلبی کا شعبہ ہرگز نہیں ہے، بلکہ شاعری کی حدود کو پھاند کر اصلاح معاشرہ کے اسٹیج پر کام کرنے والوں کا حصہ ہے، اپنے مولا سے اقبال کی دعا تھی کہ عذیر اور بصیرت عام کرنے

اس کی عملی صلاحیت ایک شاعر کی تھی، مگر اس کا دلی جذبہ ایک مصلح کا تھا، معلوم نہیں اقبال کو اس کا احساس کبھی ہوا ہے کہ نہیں مگر امر واقعہ یہ ہے کہ وہ سعدی و رومی کا درمیانہ جوڑ تھا، اقبال میں سعدی کی افادیت اور رومی کا جذبہ دونوں جمع ہو گئے تھے، اور مختلف مواقع پر اپنا اپنا مظاہرہ کرتے رہتے تھے اور اقبال کو شکایت تھی کہ

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں ۔ کبھی سوز وساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

اسی اعتبار سے اقبال اپنے منہ بولے مرشد رومی سے کہیں بڑا خادم انسانیت تھا

پھونک ڈالا ہے میری آتش نوائی نے مجھے ۔ اور میری زندگی کا خود یہی ساماں بھی ہے

سریت و تشکیک کا فقدان سائنس کے مضمون نگار اظہار و یقین سے بیزار محسوس ہوتے ہیں لہٰذا اقبال کی بے محابا ترجمانی حقائق اور یقین بخشی کو وہ اقبال کے فضائل کے بجائے اس کے جرائم و نقائص کی فہرست میں شامل کر کے اس پر طعنہ زن ہیں،

سوال یہ ہے کہ انسانی قافلہ اظہار و یقین کی بنیاد پر اپنے سفر حیات کو جاری رکھ سکتا ہے یا اسے سریت و ابہام و بے یقینی کے ذریعے زندگی کے سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں مدد مل سکتی ہے؟ میں کہتا ہوں جو لوگ سریت و خفا و بے یقینی و تشکیک کے اندھے کنوئیں کا خود فریب مینڈک بننے پر قانع ہونا چاہتے ہیں، برٹرینڈ رسل کی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ کاش میں حیوان ہوتا، انسانی احساس مفید و مضر اور شعور خیر و شر سے آزاد ہو کر جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ حیوانی بے تمیزی ہے اور جب اسی بے تمیزی کو معیار بنا کر عام انسانی معاشرے کو اسے قبول کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، تو وہ انسانیت دشمنی ہے، لہٰذا سریت و تشکیک کے بجائے اظہار و یقین کی دعوت دینے والا اقبال بلاشبہ خادم انسانیت ہے، اور لائق مدح ہے نہ کہ قابل ذم، بلاشبہ اقبال نے عمر بھر اظہار و یقین ہی کو اپنا مشن بنائے رکھا،

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
کہ بدتر موت سے ہے بے یقینی

مگر سریت و بے یقینی کے کوچے میں بھی بحیثیت شاعر وہ کبھی کبھی آجاتا تھا، اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیں،

نہ من انجام و نے آغاز جوئیم
ہمہ رازیم و جان راز جوئیم
گر از روئے حقیقت پردہ گیرند
ہماں یک حرف دیگر را باز جوئیم
برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ایک شاعر اپنے فکر و احساس میں جتنا جامع ہو سکتا ہے وہ جامعیت اقبال میں پائی جاتی ہے، البتہ اس کا فکر و احساس انسانی حدود کے اندر کام کرتا ہے اور وہ ٹیگور کی طرح معاشرے کا محبوب بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ (ٹیگور نے بحیثیت شاعر اپنی آخری تمنا یہ ظاہر کی ہے کہ اسے معاشرے کی محبت حاصل ہو) ستار و سارنگی، ہارمونیم و طبلہ لیکر ہر وقت ایکسکرشن (excursion) کے لئے تیار رہے اور معاشرے کو خوش کرتا رہے بلکہ اقبال معاشرے کے قافلہ کے ساتھ ایک ڈھنڈورچی کی طرح چلتا ہے، اور قدم قدم پر اُسے آگاہ کرتا رہتا ہے کہ اسے کہاں کہاں پڑاو کرنا ہے، اور کس کس وقت پڑاؤ ڈالنا اور کس کس وقت کوچ کرنا ہے، بلاشبہ وہ قافلہ سالار نہیں ہے وہ شاعر ہی ہے، مگر قافلہ کو خواب غفلت میں لے جانے کی لوریاں دینے کے بجائے اسے منزل و راہ منزل کے آداب و خطرات سے آگاہ کرنے کا کام کر رہا ہے، وہ نہ راہزن ہے نہ رہنما بلکہ زود باش و ہوشیار باش و غافل مباش کہنے والا نقارچی ہے۔ لہٰذا معاشرے کا خادم ہے اس کے مجموعہ اشعار کا نام بانگ درا ہے۔

نیشنل ازم اور اقبال ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار کو اس بات کا بھی افسوس ہے، کہ اقبال نے ابتدائی شاعری میں وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا بنا کر پوجنے اور بجائے کا جو پیشۂ آذری اختیار کیا تھا، بعد میں اسے چھوڑ کر ابراہیمی بت شکنی کو اختیار کر لیا ایسے مضمون نگار نہ معلوم کن تعصبات کا شکار بن کر ایک عظیم خوبی کو برائی قرار دے رہے ہیں، وہ عالم انسانی کے اتحاد کی ضرورت سے پوری طرح بیگانہ محسوس ہوتے ہیں معلوم نہیں ان لوگوں کے یہاں کوئی معیار خوب و زشت بھی ہے، یا محض حوادث کی ٹھوکروں کے سہارے وہ زندگی گزار رہے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ

پوری سابقہ تاریخ میں بھی اور آج بھی انسان کے سارے اجتماعی فساد کی بنیاد یہی کنبہ پرستیاں اور نسلی حلقہ بندیاں رہی ہیں۔ انھیں بدی قرار دینے کے بجائے نیکی قرار دینا اور ان کی مخالفت کو ناقابل معافی جرم بتانا اور اخوت انسانی کی تبلیغ و ترویج چھین بھیں جو تاریخ انسانی سے پہلے کی حیوانی وطبقاتی جنگ و آویزش کا حصہ تو ہو سکتا ہے، مگر وہ کسی صورت تاریخ انسانی کا حصہ نہیں ہے۔ اس طبقاتی جنگ، نفرت کا ایک دوسرے سے نفرت، بغض و عناد اور ایک دوسرے کی بیخ کنی و استیصال کا حیوانات کے تنازع للبقا کی تاریخ میں تو کچھ مفہوم ہو سکتا ہے لیکن جو لوگ نوع انسانی کو بھی اس حیوانی آئین جنگ و فساد کا پابند کرنا چاہتے ہیں، وہ بدترین انسانیت دشمن ہیں، وہ حیوانات کی اندھی جبلت کے تقاضوں اور انسان کے اخلاقی و شعوری کردار میں فرق کرنے سے معذور ہو چکے ہیں۔ حیوانات کے جبلی جبر و مکر و ظلم اور انسانی اخلاقی مجاہدہ، افہام و تفہیم، تبلیغ و اصلاح، تعاون و توافق و باہمی خیر اندیشی جیسی مسلمہ اقدار میں فرق نہ کرنا اور سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا انتہائی بے راہ روی ہے۔

اقبال کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سارا انسانی سلسلہ ایک ہی اخلاقی بھائی چارہ ہے، ان کے سارے کے سارے حقوق حیات و فرائض حیات ساری دنیا میں کمال یکسانیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان متعصبانہ کنبہ پرستیوں اور تنگ نظر نسلی قومیتوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو بلا شک و شبہ وہ ایک عظیم خدمت انسانی کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام سے اقبال کی وابستگی کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام نے ساری کائنات مذہب کے مقابل میں وحدت و اخوت انسانی کے اعتقاد پر سب سے زیادہ زور دیا ہے لہٰذا خاک وطن کے ہر ذرہ کو معبود قرار دینے کی دینی آزادی کو چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو اپنانے کے لئے وہ

مجبور ہو گیا ہے، بحیثیت ایک خود شناس و خدا شناس انسان کے وہ اس کے بیے مجبور ہو گیا

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اقبال بحیثیت ایک پیغمبر کے | ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار نے اقبال کے مداحوں کے مبالغوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کی پیغمبرانہ دعاوں پر دھیمی سی ناراضگی کا اظہار کیا ہے، حالانکہ اقبال کے مدّاحوں اور پجاریوں کی مدح سرائی کا یہی پہلو تھا جو سب سے زیادہ قابلِ تنقید تھا، مگر یہیں پہونچکر مضمون نگار کی قوت تنقید دم توڑ گئی ہو

ع وہ نادان گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

ایک پیغمبر کی حالت | ایک پیغمبر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کا نصب العین اس درجہ معین ہوتا ہے کہ پیغمبر کے لیے جاگتے سوتے ایک لمحہ بھی اس سے غفلت ممکن نہیں ہوتی، اس نصب العین تک پہونچانے والے ذرائع اس کے یہاں اس درجہ معین ہوتے ہیں کہ ان کا نام ہی صراطِ مستقیم پڑ گیا ہے، اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی دعوت کا خود کامل ترین نمونہ ہوتا ہے اور یہی معین نصب العین اور اسکی خیر لچکدار ذرائع اور ظاہر و باطن کی ہم آہنگ زندگی۔ تعمیر انسانی کے لیے مدت ہائے دراز تک رہنمائی کا کام دیتے ہیں،

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

اس کے مقابل شاعر کی حیثیت یہ ہے،

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا،

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

مرے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
خرد میری ہے افرنگی مرا ایمان ہے زناری

فکر من در فہم دیں چالاک و تست
تخم کردارے ز خاک من نرست

اقبال نے اپنی سب سے زوردار نظم "شمع و شاعر" میں شمع سے بات چیت کے دوران شاعری کی حقیقت پر جو روشنی ڈالی ہے، اس نے شاعری کی حقیقت اور اس کی حدود کو انتہا درجہ تک واضح کر دیا ہے۔ راقم کی نگاہ میں اقبال کی شاعری کا ایک بڑا شاہکار "شمع و شاعر" ہے۔

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں میں ہو چرچا ترا

بلاشبہ بحیثیت ایک شاعر اپنی سب کمزوریوں پر اقبال کی نظر ہے، اور وہ کھلے بندوں ان کا اقرار بھی کرتا ہے، جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے، رہے وہ لوگ جو اقبال کے کلام کی پیغمبرانہ تشریحیں کرتے ہوئے اس کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں وہ بلاشبہ خیانت کار ہیں اور "بت گر نے بت شکن کو بت ہی بنا کے چھوڑا" کا مصداق ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاعری کی کائنات میں اور اس کے مقابل اقبال کی

اپنی اہمیت کا احساس ہے، اور اس نے کہیں کہیں ظاہر بھی کر دیا ہے، مگر وہ کسی صورت خود ستائی کے درجہ کی چیز نہیں ہے۔ اقبال نے شاعری کو برائے شاعری اختیار نہیں کیا تھا؟ بلکہ اس نے شاعری کو اصلاح معاشرہ کے ذریعہ کی حیثیت سے قبول کیا تھا، اور اسی حیثیت سے اس نے معاشرۂ انسانی کی خدمت کرنا چاہی، اور خوب کی، ایک شاعر معاشرے کے لئے اس سے زیادہ مفید ہو بھی نہیں سکتا۔ راقم کا قطعی یقین ہو گیا ہے کہ انسانی افادیت کے معاملہ میں اقبال رومی سے کہیں آگے نکل گیا ہے۔

آخری بات | راقم نے مضمون کا آغاز بھی اس بات سے کیا تھا، اور اس کا خاتمہ بھی اس بات پر کرتا ہے کہ اقبال اس دور کا تنہا وہ شاعر ہے، جو کم از کم شعر و ادب کے دائرہ میں موجودہ عالمگیر انتشار کو انسانی افادیت کا پابند کر سکتا ہے، اللہ اقبال کے مداحوں کے ساتھ ہی اسکے نقادوں سے بھی راقم کی گذارش ہے کہ وہ اقبال کی ہونے والی برسی کو اقبال کی اس حیثیت کو نمایاں سے نمایاں کرنے کے لیے کام میں لائیں!

تکملہ | (۱) اقبال کا نام رومی کے ساتھ اس طرح نتھی ہو گیا ہے کہ ایک کے متعلق غور و خوض کرنے کے ساتھ ہی دوسرے کا تصور آجاتا ہے، مگر یہ بات سن کر اکثر لوگوں کو حیرت ہوگی کہ اقبال اور رومی کی بنیادی فکر میں بڑا فرق ہے، اس سلسلہ میں یہاں صرف دو باتیں عرض ہیں۔

عشق | (الف) اقبال اور رومی دونوں کے یہاں عشق بنیادی محرک عمل کی حیثیت رکھتا ہے، مگر یہ صرف لفظی اشتراک ہے، اس لئے کہ رومی کے یہاں عشق سے مراد محبت کی وہ امتیاز سوز ذکری ہو جہاں انسان کی توجہ ایک ایسے نقطہ پر مرکوز ہو جاتی کہ وہ پھر دوسری طرف متوجہ ہی نہیں ہو سکتا،

عشق آن شعلہ است کہ چوں برفروخت
ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت،

اور اقبال کے یہاں عشق سے مراد کسی جاندار کی زندگی کا وہ اندرونی زور دار داعیہ ہو جو اُسے مقصدِ زندگی کی طرف دھکیل دے۔ اس میں سارے حیاتی داعیے آجاتے ہیں،

بہ باغاں باد فروردیں دہد عشق	براغاں غنچہ چوں پروین دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است	بماہی دیدۂ رہ بین دہد عشق

(ب) تمام باطنیہ مفکرین کی طرح رومی کے یہاں ادراک کی حقیقت کا صرف ایک ذریعہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ حواس ظاہری اور ان کے متعلقات کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرتے ہوئے انسان اپنے اندر گھس جائے،

چشم بند و گوش بند و لب ببند گر نبینی سرِّ حق بر من بخند (رومی)

لیکن اقبال اس معاملے میں بھی اپنے پیر طریقت کی کھلی مخالفت کرتا ہوا سارے حواس کو کامل طور پر استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہے، گویا عشق اور باطنی رجحان دونوں میں اقبال اور اس کا مرشد یا شیخ طریقت دو جدا جدا راہوں پر مصروفِ سفر ہوتے ہیں، اس بات نے اقبال کی انسانی افادیت کو رومی سے کہیں زیادہ کر دیا ہے،

اقبال اور ٹیگور:- جس طرح اقبال کو اس بات پر شدید اعتراض ہے کہ احباب اُسے ایک شاعر و غزل خوان قرار دیں حالانکہ اس نے شاعری کو چند مقاصد انسانی کو آگے بڑھانے کے لئے اختیار کیا ہے، اسی طرح ٹیگور کو بھی اس بات پر شدید اعتراض ہے کہ اسے مصلح اور لیڈر قرار دیکر اسکی زندگی پر امن ملنے حاشیے چڑھائے جائیں، اس لئے کہ وہ اصولاً نغمہ سرا پرندوں کا ہم جولی و ہم خبر ہے لہٰذا اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اُسی مقام سے تعلق رکھتا ہے، اس نے بعض جگہ یہ بھی کہا ہے کہ وہ کائنات خود کنٹ نیا رنگ اختیار کرنے والے احوال و کوائف کا عکاس اور وزنگر یا نغمہ اُسے ان امراد و رموز کی تحقیق نہیں کہ یہ احوال و کوائف کیوں بدلتے ہیں، اور ان کی پشت پر کون کون مصالح کارفرما ہیں، ٹیگور کا کام صرف یہ ہے

عکاسی کی ہے، لہٰذا ان دونوں شعراء کے اپنے بیان کے مطابق ان کی حیثیتیں خود معین ہو گئی ہیں، ٹیگور معاشرۂ انسانی کا ایک تحسین کار ہے، وہ معاشرے کا صاحب اسرار و نا زدار نہیں ہے، اسے کیوں اور کیا سے کوئی غرض نہیں ہے، اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ پندرہ پندرہ بیس بیس برس کے بچوں کی طرح کیمرہ ہاتھ میں لیکر صبح گھر سے نکلے اور شام کو مناظر فطرت کی ایک اچھی خاصی فلم کا سامان کرتا ہوا اپنے پریم بسیرے یا شانتی نکیتن میں آجائے اقبال اس پیشے کو افیون فروشی کا کاروبار قرار دیتا ہوا رات بھر اس فکر میں کروٹیں بدلتے ہوئے کاٹنے کا عادی ہے کہ افیون کے اسی کاروبار سے معاشرے کو نجات دلا کر کس طرح اسے صحیح حقائق حیات کے سامنے کھڑا کر دے، اقبال بھی انسانی زندگی کو دار الجہاد ہی جانتا ہے، مگر یہ حیوانات کی طبقاتی جنگ کا مظہر نہیں ہے بلکہ وہ ایک جہاد مقدس ہے، جس کے بغیر انسان کی بالقوہ صلاحیتیں ایک مکمل اخلاقی شخصیت نہیں بن سکتیں حالانکہ موجودہ زندگی کی ساری تگ و دو کا ماحصل یہی ہے، مرد مومن یا انسان کامل اسی مکمل اخلاقی شخصیت کا دوسرا نام ہے، جو جہاد مقدس کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے، اقبال کا مرد مومن بھی یہی کچھ ہے،

افق نگاہ کا فرق | ٹیگور کے دوست و دشمن سب ہی کو اس کا اعتراف ہے کہ ٹیگور کا افق نگاہ صرف بنگال تک محدود ہے، اور اقبال کا نقطۂ نگاہ سرتاسر آفاق گیر ہے، بلکہ کائنات گیر ہے، اس لیے اس کا موضوع فکر انسان ہے، جو بظاہر ایک مختصر سی مخلوق ہونے پر بھی اپنے باطن کے اعتبار سے انفس و آفاق سے کہیں زیادہ وسیع ہے دونوں کو اپنے ضمیر میں لئے ہوئے ہے، اس وسعت کو باطنیہ کی عالمگیری پر قیاس کرنا بالکل درست نہیں ہے اس لئے کہ باطنیہ کے ہاں خودی کی انفرادیت کی نفی کے بعد یہ وسعت پیدا ہوتی ہے، وہ محض ایک منفی انداز فکر ہے، جس کا واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا کوئی سر دپا نہیں ہے نہ اس کی

کوئی تعمیری قدر و قیمت ہے، مگر اقبال انسان کو مرکز کائنات بتاتا ہوا کائنات کی وسعت کی طرف بڑھتا ہے،

۱۔ غالب غالب ایک بڑی بھاری اور نہایت ٹوٹی ہوئی تہذیب کے کھنڈرات کا نام ہے، جہاں سانپ بچھو، چوہے، چھپکلی، الو، شہباز، چڑیا، کبوتر سب ہی نے اپنے اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں، مگر ان کھنڈرات کی اور وہاں رہائش کرنے والوں انسانی دنیا کے لیے کوئی افادیت نہیں بلکہ حضرت ہی حضرت ہے، غالب کی زندگی دائمی یاس و ابدی شکست آرزو کو چھپانے اور دبانے کے لیے بجا بہ سازی اور چٹکلہ بازی کا دوسرا نام ہے جہاں مقصدیت اور معنویت انسانیت اور ضروری متعلقات انسانیت کا کوئی کام نہیں ہے، ٹیگور نے ایک آدھ دفعہ کہا تھا کہ وہ ایسے ہندوستان کی تعمیر چاہتا ہو جس کا کردار و رفتار فن رقاصی کا ماڈل ہو اور جس کے گفتار و اقوال موسیقی کے ترنم و آہنگ کا مظہر ہوں گویا ایک تحسین کار کی حیثیت سے اس نے اپنے پیشے کی ماہیت بتا دی تھی مگر غالب کے یہاں زندگی کے کردار و گفتگو کو کسی آئین و ضبط کا پابند کرنا بے جا رکھ رکھاؤ اور رسوم پرستی ہے، وہ تو ایک پاگل کی سڑی ہوئی لاش[1] ہے، جو کھلے ہوئے میدان میں پڑی ہے، اور جس میں ابھی کچھ رمقِ حیات موجود ہے، لہٰذا کبھی تو اس سے مجنونانہ ہنسی اور کبھی تکلیف دہ کراہنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، مگر زیادہ تر بے معنی ہوں ہاں کا سماں رہتا ہے، مگر جب اُسے کبھی کبھی عادات و یا وہ گوئی کے ساتھ ہی معاشرہ کی عادات و اطوار کا احساس ہوتا ہے تو پھر وہ انھیں رازدارانہ طور پر یہ بھی بتا دیتا ہے "نالے کو پابند نے اور پابند آہنگ کرنا دیوانگی ہے"، اس طرح وہ کمال ہوشیاری سے، اپنے مجنونانہ اعمال و افکار پر پردہ ڈالتے ہوئے معاشرے میں اپنی گنجائش

---

[1] معارف کو اس سے اتفاق نہیں

ل لیتا ہے، اسے چیلوں اور چھپکلیوں کا ہمراز و دمساز کتنا موزوں ہوگا۔[1]

مرتا ہوں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی خود ہماری خبر نہیں آتی
کہہ گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بے مقصدی، یاس اور لا اخلاقیت کے تین حیات کش عناصر سے غالب ست تن کی لاش بنی ہے، اور یہ تینوں چیزیں انسانی معاشرے کے لیے پیام مرگ کا حکم رکھتی ہیں اور اسے زندہ کرنے زندہ رکھنے اور مستقبل کے ادب عالیہ اور شعر کے ماڈل کی حیثیت سے قائم رکھنے پر لاکھوں نہیں کروڑوں روپے خرچ ہوئے، اور کئے جا رہے ہیں جو خودکشی، انسانی خودکشی کے ہم معنی ہے، آج ساری انسانیت کی حالت ایسی ہو رہی ہے کہ اس کے سارے فکر و عمل میں عالمی انداز پر تعاون اور خیر اندیشی کی ایک لہر دوڑ جانی چاہئے اور انفرادی نمائش، ریا، خود سری کا خاتمہ ہونا چاہئے، موجودہ تہذیب کے عالمگیر سانچے کو تو بحال رکھا جائے مگر اس کے اندر سے لا اخلاقیت لا روحانیت اور لادینیت کے سارے آثار کی کلی نفی کرتے ہوئے سارے اندرون خانہ کو اخلاقی و روحانی اقدار کے رنگ و روغن سے سجایا جائے، اس لئے کہ باقی کائنات کے مقابل انسانی کائنات کی یہی حقیقت ہے، انسان کائنات کے اندر اخلاقی خود ارادیت سے متصف ایک مخلوق ہے۔

"آدم کو اللہ نے اپنی صورت پر پیدا کیا"

---

[1] معارف کو اس سے اتفاق نہیں،

ابن عبدربہ

از جناب جمیلہ شوکت صاحبہ لاہور (پاکستان)

نام و نسب | شہاب الدین ابو عمر احمد بن محمد بن عبدربہ بن حدیر[1] بن حبیب بن سالم القرطبی مولیٰ ہشام بن عبدالرحمان معاویہ بن عبدالملک بن مروان الاموی[2] ہے، ابن خاقان نے ابن عبدربہ کی کنیت ابو عمرو[3] بتائی ہے لیکن اس کی تردید ابن عبدربہ کے معاصر شاعر یحییٰ القلفاط کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

"فود عینی سترا من ابی عمروا"[4]

ابتدائی حالات | ابن عبدربہ ۱۰ر رمضان ۲۴۶ھ، ۲۹ر نومبر ۸۶۰ء بمقام قرطبہ پیدا ہوا[5]، اس کی اوائل زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں، وہ ماحول اور خاندان جس میں اس نے نشو ونما پائی، پردۂ خفا میں ہے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا دادا اندلس کے دوسرے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالرحمان الداخل کا آزاد کردہ غلام تھا، ابن عبدربہ نے قرطبہ ہی میں تربیت[6] پائی اور وہیں تعلیم حاصل کی۔

ابن عبدربہ نے غربت اور افلاس کی گود میں آنکھ کھولی، لیکن بہت جلد ذہانت و فطانت کی بدولت اندلس کی تاریخ ادب میں نمایاں مقام حاصل کر لیا[7]، اور اسے خلفائے وقت کے دربار میں رسائی حاصل ہو گئی، جس کے بعد اس کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیل گئی۔

جہاں تک ابن عبدربہ کے اساتذہ کا تعلق ہے، سوائے ابن الفرضی کے کسی نے ان کی طرف راہنمائی نہیں کی، وہ کہتا ہے کہ ابن عبدربہ نے فقہ کی تعلیم خشنی بقی بن مخلد[8]

---

[1] یاقوت حموی نے حدیر لکھا ہے لیکن ناشر نے حاشیہ میں تصحیح کر دی ہے یاقوت ۲، ۶۷ [2] ابن خلکان ۱، ۱۳۳، ابن الفرضی ۱، ۳۰، الضبی، ۴۲ [3] ابن خاقان، ۵۱ [4] المقری ۲، ۱۹۱ [5] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۲: ۴۱ [6] ابن الفرضی ۱، ۴۲ [7] یاقوت ۲: ۶۸ [8] بقی ابن مخلد بن یزید القرطبی ۲۷۶ھ (یاقوت ۲: ۲۶۸)

اور ابن مفتاح جیسے چوٹی کے علماء سے حاصل کی، [illegible] اس کے علاوہ اس نے تمام مروجہ علوم تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، موسیقی وغیرہ میں بھی دسترس حاصل کی، لیکن ان تمام علوم میں سے شاعری کی طرف اس کا رجحان زیادہ تھا۔ [illegible]

<u>قرطبہ کی تمدنی اور معاشی حالت</u> قرطبہ، جیسا کہ ہمیں مختلف مصادر سے معلوم ہوتا ہے، اس زمانہ میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ مغرب میں اسے وہی مقام حاصل تھا جو مشرق میں بغداد کو، قرطبہ میں بغداد کی طرح الرصافہ تھا۔ قرطبہ کے بارے میں ابن حزم کا قول نقل کرتے ہوئے المقری نے قرطبہ کو اہل علم و کمال کا مرکز بتایا ہے، [illegible] وہ لکھتا ہے:

فی جوانبه من البساتین والمروج	اس کے ارد گرد باغوں اور چراگاہوں نے
ما زاده نضارة و بهجة [illegible]	اس کی شادابی اور رونق کو بڑھا دیا۔

اہل اندلس علم و ادب کے بہت شوقین تھے۔ وہ اس جذبہ کی تسکین کے لئے مشرق کے دور دراز ملکوں کا سفر کرتے اور اساتذہ سے مستفید ہوتے۔ اسی طرح اہل مشرق بھی اندلس میں تحصیل علم کے لئے آتے۔ مقری نے ایسے لوگوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ [illegible]

اندلس کی اموی حکومت بغداد کی عباسی حکومت کی حریف تھی۔ اہل اندلس اہل مشرق سے کسی میدان میں بھی پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ علمی و ادبی ارتقاء میں ان کا تتبع کرتے، کیونکہ بغداد ان دنوں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ خلفاء نے عوام کے لئے مدرسے اور لائبریریاں قائم کیں کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ سب ملکوں سے کتابیں فراہم کیں اور ان سرکاری لائبریریوں کے علاوہ ذاتی لائبریریاں بھی قائم ہوئیں۔ الحکم ثانی کی ذاتی لائبریری میں چار لاکھ کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ [illegible] اسی خلیفہ نے کتاب الاغانی کے مصنف ابوالفرج کو ایک ہزار دینار

[illegible] ابن مفتاح م ۴۰۲ھ (الدیباج ۳۳۹) [illegible] ابن الفرضی ۱: ۲۴ [illegible] یاقوت ۲: ۹۸ [illegible] معجم البلدان ۴: ۵۹ [illegible] المقری ۲: ۱۰۰ [illegible] المقری ۲: ۱۰۲ [illegible] المقری ۲: ۵۱ بعد [illegible] نکلسن: ۴۱۹

صرف اسی غرض سے بھیج کر وہ کتاب مکمل ہونے پر پہلا نسخہ اسے بھیجے[1] اس ادبی سرگرمی کا دائرہ صرف طلبائے عرب اور موالی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مسیحی بھی علوم عربیہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کا پادری یولوجیوس (Eulogius) کہتا تھا کہ مسیحی اپنی زبان بالکل بھول گئے ہیں، یہاں تک کہ ہزار میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو لاطینی کا ایک کلمہ تک صحیح لکھ سکے[2]، بقول لین پول

They never shoke the name of jeous christ without adding May god dless him. (۳)

ترجمہ: وہ یسوع مسیح کا نام کبھی بغیر رحمۃ اللہ علیہ کا اضافہ کیے ہوئے نہیں لیتے تھے۔

اہل اندلس کو غناء سے خاص لگاؤ تھا۔ شرفائے شہر ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، زریاب مغنی اسی عہد کا ایک نامور موسیقار ہے[4] اس ماحول اور تاریخی پس منظر میں ابن عبد ربہ کی علمی و ادبی شخصیت کی نشوونما ہوئی۔

اخلاق و عادات ابن عبد ربہ زندگی کے بیشتر حصے میں ایک ظریف ادیب نظر آتا ہے، وہ خوشی اور طرب کی تلاش میں رہتا تھا، موسیقی سے بھی اسے خاص شغف تھا، الفتح بن خاقان نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ابن عبد ربہ ایک دفعہ قرطبہ میں کسی امیر کے محل کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں گانے کی آواز آئی۔ اس آواز نے اس کے حواس کو مشتعل اور عقل کو مدہوش کر دیا وہ رک گیا اور صاحب قصر کو یہ شعر لکھ بھیجا[5]

یا من یضن بصوت الطائر الغرد   ما کنت احسب ھذا البخل فی احد

---

[1] نکلسن: ۴۰۹، ملخص Spanish Islam 268

[2] The Moors in Spain 86 [3] نکلسن، ۴۱۰

[5] مطمح ۵۱، ارشاد الاریب، ۲: ۹۸، ضبی، ۱۳۸

لوان اسماع اھل الارض قاطبۃ	اصغت الی الصوت لم ینقص ولم یزد
فلا تضنّ علی سمعی تقلّدہ	صوتًا یجول مجال الرّوح فی الجسد
امّا النّبیذ فانّی لست اشربہ	ولست اٰتیک الّا کسرتی بیدی

ترجمہ:۔ اے وہ شخص جو (دوسروں سے) چہچہانے والے پرندہ کی آواز (سننے کے معاملہ میں بخل کرتا ہے) میں نہیں خیال کرتا کہ کوئی شخص اتنی معمولی سی چیز کے لئے بخل کرتا ہو۔

۲. اگر تمام اہل زمین کے کان بھی اس آواز کی طرف متوجہ ہو جائیں. تو یہ چیز اس کی آواز کو نہ کم کرے گی اور نہ زیادہ

۳. تو مجھ سے نغز سن لینے پر بخل نہ کر. بلکہ اس آواز کے ساتھ مجھ پر احسان کر : وہ آواز جو جسم میں روح کی طرح جولانی کر رہا ہے۔

۴. جہاں تک نبیذ کا تعلق ہے، وہ میں پیتا نہیں، اور میں تیرے پاس نہیں آؤں گا مگر اس طرح کہ میرے ہاتھ میں میرا (اپنا) روٹی کا ٹکڑا ہوگا۔

مالک نے جوں ہی یہ اشعار پڑھے، نیچے دوڑ آیا اور ابن عبد ربہ کو اپنے ساتھ اندر لے گیا، ابن عبد ربہ العقد میں غناء کے متعلق یوں کہتا ہے :

وبعد فھل خلق اللہ شیئًا	کیا عمدہ آواز سے بھی زیادہ اللہ نے
اوقع بالقلوب واشدّ اختلاسًا	دلوں کو متاثر کرنے اور عقل کو سلب کرنے والی
للعقول من الصوت الحسن لاسیّما	کوئی چیز پیدا کی ہے، بالخصوص ایسی آواز جو
اذا کان من وجہ حسن[1]	رخ زیبا رکھنے والے کی جانب سے ہو۔

شراب کے متعلق وہ کہتا ہے :

وحاملۃ راحًا علی راحۃ الید	موردۃ تسعی بلون مـورد

[1] العقد الفرید، ۷ : ۴

متى ما ترى الابريق للكأس راكعاً تصلّ له من غير طهر وتسجد

على ياسمين كاللجين و نرجس كأقراط در في قضيب زبرجد

بذلك وهذى فاله ليلك كلّه وعنها فسل لا تسئل الناس عن غد[1]

ترجمہ: ۱۔ اور کتنی ہی شراب کو ہتھیلی پر اٹھا کر لانے والی عورتیں ایسی ہیں جو سرخ لباس میں ملبوس ہیں اور سرخ رنگ (کی شراب) کو تیزی سے لاتی ہیں۔

۲۔ جب ان میں سے کوئی دیکھتی ہے کہ صراحی پیالے کی طرف رکوع کر رہی ہے تو وہ اس کے لیے وضو کے بغیر نماز پڑھنے لگتی ہے اور سجدہ کرتی ہے۔

۳۔ چنبیلی پر جو چاندی کی طرح ہے اور نرگس پر جو زمرد کی ٹہنیوں پر موتیوں کی بالی کی طرح ہے۔

۴۔ اس شراب اور اس (ساقیہ) کے ساتھ رات بھر لطف اندوز ہوتا رہ اور اس کے بارے میں پوچھ اور لوگوں سے کل کے بارے میں سوال نہ کر۔

ابن کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عورتوں کی مجالس میں بھی اٹھتا بیٹھتا تھا، زندگی کے آخری ایام میں جیسا کہ اس کے اشعار سے ترشح ہے، وہ اس لہو ولعب کی زندگی سے تائب ہو گیا تھا یہاں پر وہ ابو نواس کے مماثل ہو جاتا ہے جو خلیفہ امین کے قتل کے بعد شراب اور رنگ رلیوں کی محفلوں سے تائب ہو کر پاکیزہ زندگی کی طرف مائل ہو گیا تھا ابن عبد ربہ نے آخری عمر میں غزل گوئی ترک کر دی اور زہد و تقویٰ پر اشعار کہنے لگا جس کا نام اس نے "محصات"[2] رکھا، ان اشعار کے ذریعہ اس نے سابقہ عشق و مستی کی شاعری کا اسی بحر اور قافیہ میں ناصحانہ اور زاہدانہ شاعری کے ذریعہ جواب دیا، وہ اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نادم شخص کی طرح نظر ڈالتے ہوئے کہتا ہے:

زمان كان فيه الرشد غيا وكان ابغى من رشادي[3]

[1] معجم الادباء ۲: ۶۷، العقد ۶: ۲۹۰ [2] یاقوت حموی ۲: ۶۹ [3] یتیمۃ الدہر ۲: ۶۹

ترجمہ۔ ایک ایسا زمانہ تھا جب میں بھلائی کو سرکشی (سمجھتا تھا) اور سرکشی کو بھلائی خیال کرتا تھا۔

ابن عبدربہ شعرائے وقت کی طرح دربار اموی سے وابستہ ہوگیا، شاہی دربار تک اس کی رسائی کس طرح ہوئی؟ کچھ پتہ نہیں چلتا، ممکن ہے وہ اپنے وقت کے علم دوست اور ادب نواز خلفاء کی دعوت پر دربار سے منسلک ہوگیا ہو یا انھوں نے ابن عبدربہ کے بلند پایہ اشعار کا شہرہ سن کر اپنا مقرب بنا لیا ہو۔ دربار سے وابستہ ہونے کے بعد وہ خلفاء کی مدح سرائی میں مصروف ہوگیا۔

مذہب | اہل اندلس ابتداء میں اوزاعی مذہب کے پیرو تھے، لیکن حکم بن ہشام کے عہد سے انھوں نے مالکی مذہب اختیار کر لیا۔[1] چنانچہ ابن عبدربہ بھی مالکی مذہب کا پیرو تھا، مگر وہ تمام مذاہب کی قدر کرتا اور غلو سے بچتا تھا، لیکن صاحب البدایہ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ العقد کے مطالعہ سے ابن عبدربہ کا میلان تشیع کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

مغربی عصبیت | مغرب کی اموی حکومت مشرق کی عباسی سلطنت کی حریف تھی اور یہ مخالفت صرف میدان سیاست تک ہی محدود نہ تھی بلکہ میدان علم و ادب پر بھی غالب نظر آتی ہے، اندلس کے عرب و موالی ہر میدان میں اہل مشرق کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ کسی میدان میں بھی ان سے کمتر نہیں، اس باہمی مقابلہ کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کی یہ نوزائیدہ اموی سلطنت علم و ادب، صنعت و حرفت، غرض ہر لحاظ سے عباسی حکومت کی سطح پر آگئی، لہٰذا بہترین علماء، ادباء، فقہا، محدثین، اطباء، فلسفہ میں دسترس رکھنے والے اور فلکیات کے ماہر پیدا ہوئے، جن کی گونج نہ صرف عالم اسلامی بلکہ یورپ میں بھی سنائی دیتی ہے، اور حق تو یہ ہے کہ یورپ تہذیب و تمدن، علم و ہنر اور صنعت و حرفت غرض ہر میدان میں اندلس کا رہین منت ہے۔

اس عہد کے ادباء و شعراء کا رجحان یہ تھا کہ وہ جب مشرق میں کسی ادیب، شاعر یا عالم کا چرچا

---

[1] مقری ۲ : ۱۵۸

سنے تو اس کی تقلید کی کوشش کرتے اور ہر طرح سے اسے نیچا دکھانے کی سعی کرتے۔ اس طرف ابن عبد ربہ کا میلان خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی کتاب کا بیشتر حصہ اہل مشرق کے حالات کے لئے وقف کیا ہے۔ لیکن وہ اس تعصب سے بالکل عاری نہیں، وہ اکثر مقامات پر مشرق کے ادبا و شعرا سے مقابلہ کرتا نظر آتا ہے۔ العقد کے مقدمہ میں اس کی تصریح ملتی ہے۔[1]

جب وہ مشرق کے کسی شاعر کے اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہے تو پھر اسی موضوع اور اسی ردی میں اپنے اشعار بھی لاتا ہے۔[2] وہ اپنے ممدوحین کی خوب تعریف کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے قصائد مبالغہ سے بری ہیں۔ وہ عبد الرحمن الداخل کو "صقر قریش" کہتا ہے اور خلیفہ الناصر کے غزوات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

ولم یکن مثل ھذہ الغزوات للملك — اسلامی اور جاہلی دور کے کسی بادشاہ کے
من الملوك فی الجاھلیة والاسلام[3] — غزوات بھی اس بادشاہ کے غزوات کی طرح نہ تھے۔

تاہم ابن عبد ربہ نے العقد میں اہل مشرق کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا ہے، کیونکہ اندلس کی تمام علمی ترقیوں کے باوجود اس کا یہ عقیدہ تھا کہ علوم عربیہ دراصل مشرق میں پروان چڑھے ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب الصاحب ابن عباد (م ٣٨٥ھ) وزیر آل بویہ نے مشرق میں اس کتاب کا چرچا سنا تو نہایت اشتیاق سے اس کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی لیکن جب دیکھی اور مشارقہ کے حالات سے مملو پائی، تو کہا :

ھذہ بضاعتنا ردت الینا ظننت ان — اس میں تو ہماری ہی پونجی ہم کو واپس کر دی گئی ہے
ھذا الکتاب یشتمل علی شیئ من اخبار بلادھم[4] — میرا تو یہ خیال تھا کہ اس میں خاص انہوں کے ملک اندلس کے حالات ہوں گے

بحیثیت ناقد | ابن عبد ربہ اپنے تنقیدی نظریات میں ابن قتیبہ کا ہم خیال تھا۔ علامہ ابن قتیبہ نے

---

[1] العقد ١ : ٣ [2] العقد ١ : ٢٤ [3] العقد ٥ : ٢١٣ [4] العقد ٥ : ٢٢٣ بعد

[5] یاقوت ٢ : ٦٠۔ ابن عباد کا قول قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے ماخوذ ہے (القرآن ١٢ : ٦٥)۔

فن تنقید نگاری میں انقلاب پیدا کیا اور حسن و قبح کا معیار پہلی بار شعر کی عمدگی اور پستی کو ٹھہرایا[۱]، اور ابن عبدربہ نے بھی اسی طرح کے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اہلِ فضل و کمال کی تقدیم و تاخیر سے اس کو نفع و نقصان نہیں پہونچتا[۲]۔

وفات | آخر عمر میں ابن عبدربہ پر فالج کا حملہ ہوا اور اسی کے اثر سے یہ روشن چراغ قرطبہ میں ۸۱ سال ۸ ماہ اور ۸ دن[۳] دنیا کو اپنے فضل و کمال سے پرنور رکھنے کے بعد اتوار ۱۸ جمادی الاولیٰ ۳۲۸ھ[۴] مطابق سہ مارچ ۹۴۰ء کو گل ہوگیا اور دوشنبہ کے دن مقبرہ بنی عباس میں دفن کردیا گیا[۵]۔

ابن عبدربہ بحیثیت شاعر | ابن عبدربہ اندلس کے خلفائے بنی امیہ کا امیر الشعراء تھا، چار خلفاء[۶] جن کے دورِ حکومت میں وہ زندہ رہا مدح سرائی میں مصروف رہا، ابن عبدربہ کے بہت کم اشعار ہم تک پہونچے ہیں، اگر اس کی شاعری کا وہ تمام ذخیرہ جو بقول حمیدی بیس جلدوں میں تھا، ہم تک پہونچتا تو یقیناً ابن عبدربہ کا مقام اس سے بلند تر ہوتا، وہ اشعار یا قصائد جو ہمیں مختلف کتبِ ادب اور اس کی کتاب العقد میں ملتے ہیں، تقریباً ۱۴۰۰ ہیں، یہ قلیل تعداد ہی اس کو اپنے عہد کا بہترین شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، اس نے شاعری کی تمام اصناف مثلاً غزل، مرثیہ، مدح، ہجو، وصف نگاری وغیرہ میں طبع آزمائی کی، اس کے خیالات نادر اور بلند ہیں، اس کا ہر شعر اس بات پر شاہد ہے کہ اسے عربی زبان پر پوری قدرت حاصل تھی، خیالات میں ندرت، حسن، موضوعات میں تنوع، وسیع علم اور پھر ناقدانہ نظر و فکر، اس کے محبوب جواہر پارے ہیں، وہ موسیقی جو اس کے

۱؎ کتاب الشعراء ۲؎ العقد ۶: ۲۰۵ ۳؎ ابن الفرضی ۱: ۳۷، یاقوت ۲: ۶۷، بغیہ میں ۸۱ سال اور ۸ ماہ اس کی عمر مذکور ہے، مقری ۸۲ سال بتاتا ہے ۲: ۱۹۲ ۴؎ ابن خلکان ۱، ۳۵، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۲: ۳۵۳۔ ۵؎ ابن خلکان ۱: ۳۵ ۶؎ محمد بن عبداللہ (۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ) منذر بن محمد (۲۷۳ھ تا ۲۷۵ھ) عبداللہ بن محمد (۲۷۵ھ تا ۳۰۰ھ) اور عبدالرحمن بن محمد (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ) (لین پول، ۲۱)

اشعار میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے، اس کی تشبیہات اور استعارے نہایت عمدہ اور نادر ہوتے ہیں۔

اہل نظر علماء نے ابن عبدربہ کا اعتراف کیا ہے۔ ابن خلکان کہتے ہیں: ولہ دیوان شعر جید[1] صاحب یتیمۃ الدہر نے لکھا ہے، شعرہ فی نہایۃ الجزالۃ والحلاوۃ وعلیہ رونق البلاغۃ والطلاوۃ[2]. فتح بن خاقان بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں، وان لہ شعراً انتہی منتہاہ[3]۔ ابن شرف القیروانی نے بھی ابن عبدربہ کے مختلف اصناف سخن پر قدرت، اور غزل، مدح، ہجو وغیرہ میں جولانی طبع کا اعتراف کیا ہے[4]۔

مدح: ابن عبدربہ نے مدحیہ قصائد میں نام پایا ہے، وہ صرف خلفاء ہی کی مدح نہیں کرتا بلکہ اہل علم اور امراء کو بھی اپنی مدح کا موضوع بناتا ہے، اس نے صاحب القبلہ "ابو عبیدہ" کی مدح میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں[5]، وہ اپنے مدحیہ قصائد میں ممدوح کی عادات حسنہ اور خصائل حمیدہ کا ذکر کرتا ہے، اس کی شجاعت اور سخاوت پر فخر کرتا ہے اور اس کی جود وسخا کو بارش اور سمندر سے تشبیہ دیتا ہے۔

خلیفہ عبدالرحمن بن محمد کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

یا ابن الخلائف ان ایام الغنی ۔۔۔ ایامک الخیر التی اغنیتنی
بنوالھا وسجالھا وتمالھا ۔۔۔ اسقیتنی حتی لقد اورویتنی

ترجمہ ۱۔ اے خلفاء کے بیٹے حقیقۃً خوش حالی کے دن تمہارا زمانہ خلافت ہے جس نے مجھے امیر بنا دیا ہے۔

۲۔ اپنی بخششوں اور ہر معمولی اور بڑی چیز کے ساتھ۔ انھوں نے مجھے پلایا حتی کہ خوب سیراب کر دیا۔ (باقی)

---

[1] ابن خلکان ۱: ۳۶ [2] ثعالبی ۲: ۹۵ [3] مطمح ۵۱ [4] رسائل البلغاء، ۳۲۳ [5] ابن الفرضی ۱: ۳۱۴ [6] مقابلہ ۲: ۵، العقد ۵: ۲۲۱۔

لاہور کے علمی تحائف

(۲)

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

تاریخ ارادت خان یہ تاریخ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے لے کر فرخ سیر کے عہد تک کے واقعات کا بہت ہی اہم اور مستند ماخذ ہے، اس کا مصنف مرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خاں متخلص بہ واضح تھا، اس کا خاندان چار پشتوں سے تیموری سلطنت کا خدمت گذار رہا، ارادت خاں موروثی خطاب بن گیا تھا. وہ اورنگ زیب کے جانشین شاہ عالم کے زمانہ میں چہار ہزاری منصبدار ہوا، شاعر بھی تھا، تصوف سے بھی ذوق رکھتا تھا اور اپنی تاریخ نویسی کا ثبوت زیر نظر کتاب لکھ کر دیا، جس میں اورنگ زیب کے بعد سے فرخ سیر کے عہد تک کی خانہ جنگیوں کی بہت ہی خوں چکاں داستان ہے، اس دور کی تاریخ اس کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی ہے، اسی لئے اس کے حوالے بکثرت تاریخوں میں آتے ہیں، اس کا انگریزی ترجمہ وارن ہیسٹنگز کے سکریٹری جوناتھن سکاٹ نے ۱۷۸۶ء میں کیا، اس کا ایک ناقص اردو ترجمہ حیدر آباد سے بھی شائع ہوا، مگر اصل کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی، پنجاب یونیورسٹی نے اس کو بھی شائع کر کے ایک مفید علمی کام انجام دیا ہے، اس کی تصحیح و تہذیب مولانا غلام رسول مہر نے کی ہے، جس کے بعد یہ یقین کر لینا چاہئے کہ اس میں تحریر اور تحقیق کی پوری خوش سلیقگی نمایاں طور پر ہوگی، مقدمہ میں مصنف کے خاندان کے ساتھ اس کے ذاتی حالات، اس کی شعر گوئی، نثر نگاری اور زیر نظر کتاب کی اہمیت پر بڑا اچھا تبصرہ ہے، اس کے لکھتے وقت فاضل مرتب کو جو ذہنی اذیت اور کوفت محسوس ہوئی اس کی بھی اس میں عکاسی ہے، عالمگیر کے جانشینوں میں

ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان سے صدمہ پہونچنا لازمی ہے، اس کا اظہار اس طرح جامع اور فنکارانہ انداز میں کیا گیا ہے:

"ہر خانہ جنگی کے بعد جو فرمانروا تخت کا مالک بنا اسے عالمگیر ہی نہیں، پیشتر کے کسی مغل بادشاہ سے بھی کوئی مناسبت نہ تھی، بادشاہی اور حکمرانی کی اصل و اساس رعیت پروری ہے، یہ اصل و اساس دل و دماغ سے محو ہوگئی، ہر نئی خانہ جنگی کے بعد بادشاہ فرمانروا بنے، لیکن نہ انھیں یہ احساس کہ جو وسائل خانہ جنگی میں برباد ہوئے انھیں از سر نو مہیا کر لینا کتنا ضروری ہے، اور آئندہ کے لئے اس تباہی خیز آتش فشاں کا دہانہ بند نہ کیا گیا تو انجام کیا ہوگا، نہ یہ صلاحیت کہ اتنی وسیع سلطنت کے نظم اور اس کے مختلف اجزا کو باہم پیوستہ و وابستہ اور محفوظ رکھنے کے تقاضے کیا ہیں، نہ کارکنوں پر نظر، نہ فرماں روائی کے واجبات ادا کرنے کا کوئی قاعدہ و ضابطہ، نہ سابقین کے جمع کردہ ذخیروں سے ٹھیک ٹھیک کام لینے کا سلیقہ، سلطنت ہی تو دیکھ کر پونے دو سو سال میں دولت کے وسیع انبار فراہم ہوگئے ہیں۔ ان پر ہاتھ ڈالا، جا و بیجا لٹایا، ظاہری طمطراق دکھایا، اور سمجھ لیا کہ اکبر و عالمگیر کی جانشینی کا حق ادا ہوگیا"

مغلیہ سلطنت کے آخری فرماں رواؤں کی یہ سچی تصویر ہی ان کے زوال کے اسباب بھی ہوئے جن پر ایک اچھا مورخ مفصل بحث کر سکتا ہے۔

اس کتاب کو ایڈٹ کرتے وقت ایک خاص بات کی رہنمائی کی گئی ہے، اب تک یہ رواج رہا ہے کہ کسی ایک نسخہ کو متن بنا کر باقی نسخوں کا اختلاف عبارات حاشیے میں درج کر دیا جاتا ہے، لیکن فاضل مرتب نے اختلافات کو سامنے رکھ کر متن کو حتی الامکان صحیح کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ مطالب کی تشریح ہو سکے، اختلافات کی توضیح بھی دی گئی ہے جہاں ان کو خیال ہوا کہ عبارت میں اختلافات کی وجہ سے اصل مسئلہ کے سمجھنے میں اختلاف پیدا ہو جانے کا احتمال ہو، تصحیح کا یہ طریقہ

قابلِ اعتبار ہے۔

دیوانِ داراشکوہ۔ داراشکوہ اپنے علمی ذوق کی وجہ سے تیموری شہزادوں کا گلِ سرسبد، تھا وہ ایک باکمال مصنف، مترجم اور خطاط ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا اور صوفی بھی، اگرچہ وہ مجمع البحرین نہ لکھتا اور رام چندر جی کی طرح اوتار ہونے کا دعویٰ نہ کرتا۔ تو شاید اس کا وہ انجام ہوتا جو ہوا۔ وہ اوتار ہوکر تخت و تاج کا دعویدار ہوا، اور جانشینی کی لڑائیاں بھی لڑا، اس لئے اسکے سارے صوفیانہ خیالات مشکوک ہوگئے، اس نے جہاں بہت سی کتابیں لکھیں اور ترجمے کئے وہاں اس نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، لیکن یہ اب تک طبع نہیں ہوا تھا، قلمی نسخوں کی شکل میں کتب خانوں میں پڑا تھا، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اس کو بھی سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع کرکے ایک کمی کو پورا کردیا ہے، اس میں داراشکوہ کی ۲۱۵ غزلیں اور ۱۲۵ رباعیاں ہیں، شروع میں جناب نبی احمد صاحب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ارکیالوجی (آثارِ قدیمہ) کا ایک مقدمہ ہے، جس میں داراشکوہ کی تصانیف کا سیر حاصل جائزہ لینے کے بجائے ان کا سرسری ذکر ہے ضرورت اس کی تھی کہ اس کے تصانیف میں اس کے خیالات کی جو تدریجی نشو و نما ہوئی اس کا گہرا مطالعہ کیا جاتا، اس سے اس کی شاعری کے صوفیانہ خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی، اس کی شاعری فن و ادب کے لحاظ سے بلند نہیں، اس کی غزلوں میں تغزل بالکل ہی نہیں، البتہ اس کی رباعیاں، اس کی غزلوں سے نسبتاً بہتر ہیں، جن میں جہاں بعض اخلاقی باتیں بیان کی گئی ہیں وہاں اس نے اپنے وحدت الوجودی خیالات کی بھی ترجمانی کی ہے، اس کی یہ رباعیاں تو وحدت الوجود کے عام تصورات و رجحانات کی ترجمانی کرتی ہیں:

ہمسایہ و ہم نشین و ہمرہ ہمہ اوست   در دلق گدا و کسوت شہ ہمہ اوست
در انجمن فرق و نہاں خانۂ جمع   باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

آنکس کہ دریں جہاں نہ گوید ہمہ اوست — یا مغز ندانہ کہ بود عین پوست
چوں مرد یقیں شود براو وحدت ذات — پس مرگ بجائے ورنغ غفلت نیکوست

وحدت الوجود کے ایسے خیالات بہت زیادہ قابل اعتراض نہیں، ایسی سرشاری میں صلح کل ہونا بھی چنداں مضائقہ نہیں،

بود بجہاں نکوتر از مشرب ہیچ — باید کہ ترا بود جز او مطلب!
توحید گزیں و صلح کل پیش بگیر — بگذار تعصب کہ بود مذہب نیز

مگر اس کے بعد یہ پکار اٹھا کہ،

کافر گشتی تو از پئے آزارم — ایں حرت ترا راست، بمی پندار
پستی و بلندی ہمہ شد ہموارم — من مذہب ہفتاد و دو ملت دار

اسی کے بعد علمائے حق کو وحدت الوجود سے سوء ظن پیدا ہو جاتا ہے، کفر کی پستی اور ایمان کی بلندی کو مساوی درجہ دینے سے شریعت محمدی پر اگر ضرب لگتی ہو تو یہ اسلامی وحدت الوجود نہیں، ایک بگڑا ہوا وحدت الوجود ہے، جو علمائے اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں، دارا شکوہ اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا رہتا تو اس کے شاعرانہ خیالات زیادہ توجہ کے لائق نہ ہوتے، مگر جب وہ ان خیالات کا اظہار اپنی تصانیف حسنات العارفین، مجمع البحرین اور رسالۂ حق نما پھر سرِ اکبر اور جوگ بشست کے ترجموں کے سلسلہ میں کرنے لگا تو مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہوں میں اس کا برا رد عمل ہوا، اور جب وہ اس کا دعویدار ہوا کہ اس کو عرفان کی وہ دولت مل گئی جو کسی کو نہیں ملی، اور فضل و رحمت کے سارے دروازے اس کے دل پر کھل گئے تو اس دعوی کے بعد جب وہ تخت طاؤس کو حاصل کرنے کے لئے میدان جنگ میں اترا، تو راسخ مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ تخت حاصل کرکے

اکبر کے دینِ الٰہی کی تجدید کر دے گا۔ اس حیثیت سے دارا شکوہ کو سمجھنے کے لیے دیوانِ دارا شکوہ کا مطالعہ اس کی اور تصانیف کے ساتھ ضروری ہے، اس لئے اس کی طباعت و اشاعت مفید ہے۔ راقم نے اپنی کتاب بزمِ تیموریہ کے پہلے ایڈیشن میں دارا شکوہ کی علمی سرگرمیوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا تھا، مگر اس وقت دیوان دارا شکوہ کا کوئی نسخہ نظر سے نہیں گذرا تھا، اس لئے دارا شکوہ کے اشعار کا انتخاب خود اس کی تصانیف اور مختلف تذکروں سے کیا تھا، بزمِ تیموریہ اب مزید اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہی ہے، اس کی پہلی جلد شائع ہو گئی ہے، دوسرے ایڈیشن میں دارا شکوہ کے اشعار کے انتخاب میں زیرِ نظر دیوان بہت کار آمد ہوگا، اس کے شروع میں جناب جہانگیر خاں صاحب کا مختصر لیکن پرمغز پیش لفظ ہے۔

گلِ رعنا۔ یہ غالب کے منتخب اردو اور فارسی کلام کا اولین مجموعہ ہے، اس کو ہندوستان میں جناب مالک رام صاحب نے بھی شائع کیا ہے، جناب سید وزیر الحسن عابدی صاحب کو غالب اور غالب کی ہر چیز سے وہی شیفتگی ہے جو مالک رام صاحب کو ہے، اسی لئے انھوں نے اس کا ایک علیحدہ ایڈیشن خود تیار کیا ہے، جو ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور سے دسمبر ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ تقریب کے موقع پر شائع ہوا، جناب سید وزیر الحسن عابدی کا شمار پاکستان کے ممتاز اہلِ قلم میں ہوتا ہے، انھوں نے زیرِ نظر کتاب کے اکیاسی صفحے کے مقدمہ میں اپنے قلم کا پورا جوہر دکھایا ہے، شاید اس کے لکھنے میں ان کو وہی خمار آلود لذت ملی ہوگی جو غالب کو کاسِ شیلن اور بادۂ گلفام کے شغل میں ملتی ہوگا، غالب کی کتاب کا نام گلِ رعنا ہے، اس لئے انھوں نے اس لفظ کی تلاش مزے لے لے کر موید الفضلاء، فرہنگ آنندراج، بہار عجم کے علاوہ وحشی، ظہوری، بیدار اور ایجاد وغیرہ کے اشعار میں بھی کی ہے، اور پھر اس پھول کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ اس پھول کے بیچ کی پنکھڑیاں زرد اور سرخ ہوتی ہیں

زرد پنکھڑیوں والا دائرہ نما حصہ اوپر کو اٹھا ہوا ہوتا ہے، اور اس گرد کی قرمزی سرخ پنکھڑیاں نیچے کو
اور نیچے کو جھکی ہوئی ہوتی ہیں، اس کتاب میں گل رعنا کی اس تحقیق و تصویر کی چنداں ضرورت نہ تھی
غالب کے پرستار کو غالب کی ہر چیز سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے گل رعنا سے ایسی دلچسپی کیوں نہ ہوتی
چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں نہ آتی تو غالب کی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوتی اور نہ اس کی اشاعت سے ان کی عظمت
میں کوئی اضافہ ہوا، اگر جناب وزیر الحسن عابدی اس کی ہر ہر سطر پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کر رہے
جیسے منہ میں مصری کی ڈلی رکھ کر چبا رہے ہوں، انھوں نے تمام جزوی باتوں پر بحث کر کے غالب سے اپنی عقیدت
اظہار کیا ہے، مثلاً اس نسخہ میں بعض بندے غلط چھپ گئے یا رہ گئے ہیں، غالب نے اپنے دست نوشتہ نسخہ
پھینکنے کے بجائے ولاء ہرگز لکھا ہے جو مجازاً صحیح ہے، حسرت موہانی نے گل رعنا کی تالیف کو قاضی القضاۃ
سراج الدین علی خاں موجد موہانی کی فرمائش کا نتیجہ بتایا، جو صریحاً غلط ہے، انھوں نے مولوی سراج الدین
کو سراج الدین علی خاں غلط کیا ہے (ص ۲۰) گل رعنا کی کچھ غزلیں نہ نسخہ حمیدیہ میں ہیں نہ نسخہ شیرانی میں
(ص ۲۹) گل رعنا میں تریسٹھ غزلیں ایسی ہیں جو دیوان غالب میں نہیں (ص ۳۰) یہ تریسٹھ غزلیں ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۶ء
کی پیداوار ہیں (ص ۳۱) گل رعنا کا جو نسخہ مالک رام صاحب کے پاس ہے وہ جا بجا سہو قلم کا شکار ہوا ہے
(ص ۳۲) گل رعنا اور کلیات غالب کے بعض قصیدے میں لفظی اختلافات ہیں (ص ۳۴) گل رعنا کی ایک نثر
میں ۱۰ اشعار ہیں، کلیات میں پانچ نا معلوم (ص ۳۸) غزلوں کے بعض اشعار کلیات میں زاید ہیں جو گل رعنا کے
نسخے میں نہیں (ص ۳۹) گل رعنا کی ایک سو ستر اور دو غزلوں میں ستائیس مقطعے غالب کے تخلص کے ہیں اور
باقی اسد تخلص کے (ص ۴۶) غالب نے گل رعنا کے شروع میں اپنا نام صرف اسد اللہ لکھا ہے، مگر
آخر میں محمد اسد اللہ درج کیا ہے (ص ۴۹) وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں غالب نے ظہوری، بیدل، نوعیا
فیضی، نظیری، عرفی، صائب کی ہم زمین اور ہم قافیہ غزلوں میں جو غزلیں کہی ہیں، ان کے مطلعے
دئے ہیں جو سولہ صفحے پر مشتمل ہیں، ان سے فاضل مرتب کے خیال کے مطابق غالب کی عظمت فنی اور

نعت فکر کا اندازہ ہوگا، مگر غالب اور ان کی شاعری کچھ ایسی متنازعہ فیہ رہی ہے کہ جو بات ان کی مدح میں کہی جا سکتی ہے، وہی ان کی قدح میں بھی دہرائی جا سکتی ہے اور جو بات ان کی قدح میں پیش کی جا سکتی ہے وہی ان کی مدح بھی بن سکتی ہے، یہ ضرور ہے کہ غالب نے اپنے فن کی عظمت اور فکر کی رفعت کا ثبوت اساتذۂ فن کی ہم زمین اور ہم قافیہ غزلوں میں غزلیں کہہ کر دیا، مگر ان کے کچھ ایسے ناقد بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ تلون مزاجی اور شاعرانہ بوالہوسی کے ہاتھوں غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی و سرگشتگی میں گذر گیا، آج وہ مرزا جلال اسیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے، کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں، کبھی نظیری کی، کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں، کبھی صائب کا، کبھی کسی کا کبھی کسی کا، اس نقد میں جو شدت ہے، اس کی بھی تردید آسانی سے ہو سکتی ہے، غالب کی ذات اور شاعری کی یہ مدح و قدح برابر جاری ہے، مگر ان کی ذات و شاعری دونوں کی کرامت ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ان کی اور ان کی شاعری کی قدر بڑھتی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جناب سید وزیر الحسن عابدی صاحب کبھی غالب کی شاعری کی شاخ گل پر دکھائی دیتے ہیں، کبھی اس کی بزم گل میں نمودار ہیں، کبھی اس کے سایۂ گل کے نیچے بیٹھ کر اپنی لیاقت و قابلیت کی نکہت بیزی کی ہے۔

بیان واقع۔ یہ نادر شاہ کی تاریخ ہے، جس کو اس کے ایک ہندوستانی متوسل خواجہ عبدالکریم نے مرتب کیا، وہ کشمیر میں پیدا ہوا، شاہجہان آباد میں مقیم تھا، نادر شاہ نے دہلی کو جس طرح لوٹا اور برباد کیا، اس کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لئے اس نے دہلی پر نادر شاہ کے حملہ سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی مستند ہے، اس نے نادر شاہ کی زندگی کے پورے حالات بھی لکھے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد اس کتاب کے مصحح جناب ڈاکٹر کے، بی، نسیم (صدر شعبۂ فارسی، پشاور یونیورسٹی) کا خیال ہے کہ اس کی حقیقی عظمت کا اندازہ ہوگا، یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے وقت کا بڑا جری سپاہی اور اولوالعزم فاتح تھا، اس نے ایران کی تاریخ بھی بدل دی مگر اس برصغیر میں اس کی خوں ریزی،

سفاکی اور غارتگری نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال خواجہ عبدالکریم نے بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس ہزار آدمی تہہ تیغ کئے (ص ۳۷) خود فاضل مرتب نے صفحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مقتولین کی تعداد اسی ہزار تک بتائی جاتی ہے (حاشیہ ص ۳۷) وہ ہندوستان سے مال غنیمت کے طور پر جو چیزیں لے گیا، اس میں بعض مورخوں کے مطابق تخت طاؤس کے علاوہ پچیس کروڑ کے جواہرات، پچیس کروڑ کی اشرفیاں اور سکے، پانچ کروڑ کا سونا چاندی، نو کروڑ کے قیمتی ظروف، بیس کروڑ کا فرنیچر اور دو کروڑ کے کپڑے وغیرہ تھے، ممکن ہے کہ مورخوں کا یہ بیان مبالغہ آمیز سمجھا جائے، مگر خود خواجہ نے لکھا ہے:

"آنچہ نقد و جنس و جواہر آلات و نقرہ و تخت طاؤسی بادشاہ و تخت پا و صندلی پایہ مرصع بادشاہان دیگر و اسپان و افیال وغیرہ ہمراہ برد، حسابش خدائے تعالیٰ جل شانہ بہتر می داند، اغلب کہ زیادہ بر ہشتاد کرور خواہد بود"

ان تفصیلات کے بعد نادر شاہ کی عظمت تو اس برصغیر کے لوگوں میں قائم نہیں ہو سکتی وہ ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا، بابر کی طرح یہاں کے تخت پر بیٹھ کر اس ملک کی تاریخ بدل دیتا تو اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہوتا، مگر وہ آیا، اسلامی اخوت کا خیال کئے بغیر مسلمان حکمرانوں کی حکومت کی بنیاد کھوکھلی اور یہاں کے لوگوں کو تہ تیغ کر کے واپس چلا گیا، بعد اسی کی روایت پر عمل کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو آکر بار بار لوٹا اور چلا گیا، عظمت کی دلیل نہیں، نادر شاہ اس برصغیر اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کے لئے بہت ہی بدنما داغ ہے۔

بیان واقع ۱۹۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوئی، اس کے مصحح نے اس میں اپنا

اور حواشی میں نوٹ انگریزی میں لکھے ہیں، انگریزی زبان کا کابوس اب پاکستان میں ختم ہونا چاہئے
وہاں کے لوگوں کو اپنی قومی اور لسانی خودداری اور وقار کا لحاظ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔

نجات الرشید۔ یہ اکبری دور کے مشہور جید عالم ملا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے،
جن کا چراغ شاہی دربار میں ابوالفضل کے سامنے تو جل نہ سکا مگر اس کے بعد وہ راسخ مسلمانوں کے
ذہن پر برابر چھائے رہے، ابوالفضل نے جب اکبر کے دیدۂ باریک بینش کو اصطرلاب آفتاب ذات
اور اس کے دل حق گزینش کو رسغانۂ سماوات صفات ثابت کر کے اس کے دین الٰہی کی حمایت
کرنی چاہی تو ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے پورے دور کو احداث بدعت قرار دیا، اور اس کا زاہر دی
کی تاریخ فتنہ ہائے امت سے نکالی۔ ان کو کہنا پڑا کہ اس دور میں اسلام کے احکام میں ایسے تغیرات
کئے گئے، جس کی مثال گذشتہ ہزار سال میں نہیں ملتی، اس زمانہ کے تمام کفریات اور حشویات کو
مستحسنات قرار دے کر درباری خوشامد اور حق پرستی کا ثبوت دیا گیا، اسی لئے انھوں نے اپنی
منتخب التواریخ میں شرع مبین اور دین متین کی پوری تائید کی، اور اس زمانہ میں ان ہی کے
قول کے مطابق لوگ جن خرافات باطل اور تطویلات لاطائل کے تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے
ان کو دور کرنے میں قلمی جہاد کیا، وہ خود اپنی منتخب التواریخ کے خاتمہ پر لکھتے ہیں کہ سود ائی قلم
نے اس جہاد کے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے۔ مگر وہ اس کو شافی و کافی نہیں
سمجھتے، اس لئے زیر نظر کتاب نجات الرشید لکھی، اس کے لکھنے میں طبقات اکبری کے مصنف خواجہ
نظام الدین احمد نے بھی پوری اعانت کی، جو اپنی اعتدال پسندی، میانہ روی اور مذہبی
راسخ العقیدگی کی وجہ سے ملا صاحب کی نظر میں گوہر بے بہا تھے۔

اسی کتاب کو جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے ایڈٹ کیا ہے جو اس وقت اپنی محققانہ
بصیرت کی وجہ سے اس برصغیر میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اس کے شروع میں ان کا

یہ مختصر مقدمہ ہے، جس سے ملا صاحب کی علمی سرگرمیوں کا حال مختصر طریقے سے معلوم ہونے کے ساتھ اس کتاب کے لکھنے کا سبب بھی معلوم ہوگا۔ یہ ٹائپ کے حروف میں چھپ کر ۵۲۰ صفحے میں ختم ہوئی ہے اس کی سات فصلوں کی علیحدہ علیحدہ سرخیوں میں تمام شرعی احکام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، جس کا اندازہ اس کتاب کے حسب ذیل کچھ عنوانات سے ہوگا، شہادت دروغ، سوگند دروغ، شرب خمر، سود خوردن، دزدیدن مال، عقوق والدین، افترا بر خدا، ترک صلوٰۃ، ترک زکوٰۃ، آفتاب پرستی، تعظیم کواکب، زنار بستن، تشقہ کشیدن، نکاح با کافراں بستن، کافراں را از دل ساختن بدعت، تعظیم اہل بدعت، استہزا از مسلماناں، سجدہ لغیر اللہ، بر ہیچ رفتن مقامات عبادت، قمار بازی، راہ زنی، خیانت در امانت، ترک امر بالمعروف، چاپلوسی، غیبت، قطع صلہ رحم، حقوق اللہ، صنعت گری، تاخیر در ادائے قرض، خود را از عیب پاک دانستن، ختنہ نا کردن، آبرو تراشیدن، حیلہ آموزی، رنجانیدن ہمسایہ، سائل را از جبر کردن، پل و چاہ شکستن، کفن دزدیدن، آب زراعت دزدیدن، فرق کبیرہ و صغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ شاید ہی کوئی شرعی مسئلہ اور حکم چھوٹ گیا ہو، کتاب میں قرآن مجید اور احادیث کے حوالے جابجا ہیں تمثیلات کے ساتھ تاریخی حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں، بزرگان دین کا بھی ذکر آگیا ہے، اس طرح یہ کتاب مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان، مولانا اشرف علی تھانوی کے مواعظ اور موجودہ دور کی بہار شریعت اور بہشتی زیور وغیرہ کی ملی جلی قسم کی تصنیف ہوگئی ہے، اب جبکہ فارسی کی کتابوں کے مطالعہ کا رواج کم ہوتا جارہا ہے، اگر اس کا اردو ترجمہ بھی ہوجائے، تو نہ صرف اس سے اردو میں ایک صالح لٹریچر کا اضافہ ہوجائیگا بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ ہوسکے گا کہ اکبری دور میں مسلمانوں کو ان کے شرعی مسائل کو کس طرح سمجھانے کی کوشش کی گئی اور آج بھی اس کے ذریعہ سے مفید مذہبی معلومات حاصل کئے جاسکتے ہیں یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی سے [illegible] میں شائع ہوئی۔

فتاویٰ جہانداری: یہ سلاطین دہلی کے عہد کے مشہور مورخ مولانا ضیاء الدین برنی کی تصنیف ہے، جس کو اس دور کے پولیٹیکل سائنس کا ایک مفید لٹریچر سمجھنا چاہیے، اس میں زیادہ تر وہی باتیں ہیں جن کی تعلیمات اسلام نے دی ہیں، مگر کہیں کہیں مصنف کے ذاتی خیالات و رجحانات نمایاں ہو گئے ہیں، جن کو انھوں نے اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، وہ بادشاہت کو غیر اسلامی طرز حکومت قرار دیتے ہیں، اگرچہ اب یہ متنازعہ فیہ مسئلہ بنتا جا رہا ہے، ہمارے رسول اکرمؐ کی تعلیمات میں حکمرانی کی تمام بنیادی باتیں موجود ہیں، مگر طرز حکومت کی کوئی واضح ہدایت نہیں، اور ہونا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ زمانہ، ماحول اور جغرافیہ کے لحاظ سے کوئی ایک طرز حکومت ہر زمانہ، ہر جگہ اور ہر ماحول کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ ایک پیغمبر کی حکومت میں جو شان الوہیت پیدا ہو سکتی ہے وہ ایک عام انسان کی حکومت میں ممکن نہیں مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"در نبوت کمال دین داری ست، و بادشاہی کمال دنیاست، و ہر دو کمال مخالف و متضاد یکدیگر ست، و جمع آں از ممکنات نیست" (ص ۱۴۰)

اور رسول اکرمؐ کے نمونہ کی حکومت کو ناممکن العمل بتا کر لکھتے ہیں:

"پس خلفاء و سلاطین اسلام را ضرورت شد کہ از برائے اعلائے کلمۂ حق و غلبۂ دین و ابقائے ذات خود رسم خسروی زنند" (ص ۱۴۱)

انھوں نے بادشاہت کو قابل قبول طرز حکومت سمجھ کر بادشاہ کے اوصاف متعین کرنے کی کوشش کی ہے، ان کا یہ کہنا ہے کہ بادشاہ اپنے دین میں راسخ ہو (ص ۱۰) وہ اپنے مخلصوں سے بار بار مشورے لیتا رہتا ہو (ص ۲۴) اس کے عزم میں ثبات ہو، تزلزل نہ ہو (ص ۵۰) عدل پسند ہو، ظلم، تعدی اور غارتگری کو پسند نہ کرتا ہو (ص ۶۶) رعایا اور ارکان دولت کے ساتھ شفقت مہربانی

اور احسان کے ساتھ پیش آتا ہو (ص ۸۱) اپنی فوج کی استقامت کا خیال رکھتا ہو (ص ۹۳) داد و ستد کے ساتھ اپنا خزانہ پُر رکھتا ہو (ص ۱۱۴) مملکت کی خبر رسانی کا پورا اہتمام رکھتا ہو تاکہ فتنہ و فساد کی بیخ کنی کرتا رہے (ص ۱۱۸) ملک کے اقتصادی نظام کو ایسا برقرار رکھتا ہو کہ ارزانی ہو اور مخلوق مطمئن ہو۔ (ص ۱۳۱) وہ اپنے اوقات کی قدر کرتا ہو (ص ۱۴۷) اپنی جہانداری میں حق کو مرکز بنائے رکھتا ہو (ص ۱۶۴) فتنہ پردازوں، چوروں، مکاروں اور غاصبوں وغیرہ کو پوری سزا دیتا ہو، مگر جہانداری کے اور معاملات میں عفو پسند ہو (ص ۱۸۳) ضوابط ملکی کی پابندی کرانے میں سخت ہو (ص ۲۱۷) عالی ہمت ہو (ص ۲۲۳) اس کے مزاج پر کسی کا استیلا نہ ہو (ص ۲۹۱) پرانے خاندانوں کی محافظت بھی کرتا ہو۔ ایک بادشاہ کے اخلاقِ حسنہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس میں قبض و بسط، قہر و لطف، اعطا و امساک، اور تواضع و تکبر کی متضاد صفتوں کا جمع ہو جانا بعید نہیں (ص ۲۹۷) مگر وہ اپنے میں اوصافِ رذیلہ پیدا نہ ہونے دے اور نہ رذیلوں سے میل جول رکھے (ص ۳۱۷) اس کی اصلی نجات اس میں ہے کہ اس کی عاقبت بخیر ہو (ص ۳۳۷)

بادشاہ کے ان اوصاف پر کسی بحث کی گنجائش نہیں، یہ ایک آئیڈیل حکمراں کی صفات ہیں، مگر مصنف جب بار بار یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک مسلمان بادشاہ کے لئے لازم ہے کہ وہ کفر و شرک کو ختم کرے، کافروں اور مشرکوں کا قلع قمع کرے اور ان کی آبرو و عزت کو روا نہ رکھے، (ص ۱۴۲) تو یہ نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر عمل رہا، سورۂ نحل ۔۶ میں ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ جس کسی کو چاہتا ہے راہ گم کر دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے، وہ دنیا میں کسی کے کام اور عقیدہ کی باز پرس نہیں کرتا ہے، عاقبت میں کرے گا، اس لئے مسلمان کفر اور شرک کا

ے لئے نہیں بھیجے گئے، بلکہ وہ نیکوں کو محض خوش خبری سنانے، غافلوں کو ہوشیار کرنے
س کی طرف پکارنے اور دنیا میں ایک روشن چراغ جلانے کے لئے مبعوث کئے گئے،
) آپ لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے، اگر لوگوں نے آپ سے روگردانی کی
داری ان پر ہے، آپ پر نہیں، اس کے جواب دہ وہ ہوں گے، آپ نہیں ہونگے
۲۶، انعام ۱۰۷، بنی اسرائیل ۵۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے پیام کو
نے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور زبردستی نہ کی جائے
اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کی شر انگیزی اور بدباطنی
، رکھنے کے باوجود ان سے جو معاہدہ کیا، اس میں اور شرائط کے ساتھ یہ بھی تھا کہ
آزادی حاصل ہوگی، یہود اور مسلمان آپس میں دوستانہ تعلقات رکھیں گے،
۱ص ۹۷-۲۷۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے جو
س میں اس کی وضاحت تھی کہ ان کی جان، زمین، مال، عبادت، مذہب، ان کے
ب، ان کی عبادت گاہیں اور ان کے قبضہ میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کی امان
مد صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں ہیں، انھیں نہ کوئی نقصان پہونچایا جائیگا، نہ کسی تنگی
ائے گا، کسی اسقف کو اس کی اسقفیت اور کسی راہب کو اس کو رہبانیت سے نہیں
. اسی پر خلفائے راشدین کا بھی عمل رہا (کتاب الخراج نوال باب) اس کے بعد
مدین برنی نے ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ جس رویہ کی تلقین کی ہے اس کو ان کی
ذاتی رائے سمجھنا چاہئے۔ انھوں نے اسی قسم کی باتیں اپنی تاریخ فیروز شاہی میں بھی
جن کو پڑھ کر غیر مسلموں کو نہ صرف اشتعال پیدا ہوتا ہے بلکہ ان کے ذہن میں اسلام کا
تصور پیدا ہوجاتا ہے۔

فتاویٰ جہانداری کو ایک خاتون نے ایڈٹ کیا ہے، جنھوں نے انگریزی میں تو اپنا نام ڈاکٹر افسر سلیم خان لکھا ہے، لیکن اردو میں ڈاکٹر مسز اے۔ سلیم خان لکھا ہے، اس میں ان کا فاضلانہ مقدمہ انگریزی میں ہے اور اس کے اندر حواشی بھی انگریزی میں ہیں، انھوں نے انگریزی میں مقدمہ تو شاید اس لئے لکھا ہو کہ ان کو اردو لکھنے میں وہ قدرت نہ ہو جو ان کو انگریزی میں ہے، مگر انگریزی میں حواشی لکھنے کا کوئی عذر قابلِ سماعت نہیں ہو سکتا، اگر کسی مستشرق کے لئے یہ حواشی لکھے ہیں تو جو مستشرق فتاویٰ جہانداری کو پڑھ سکتا ہے وہ فارسی رسم الخط کے حواشی کو بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے پاکستان میں یہ عام خیال ہو گیا ہے کہ وہی شخص باعزت اور وجیہ سمجھا جا سکتا ہے جو انگریزی لباس پہنتا ہے، شاید وہاں کے وہی اہلِ علم بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں، جو اپنی مادری زبان میں کمزور ہوں لیکن انگریزی زبان میں پر زور ہوں،

مقدمہ میں اس کتاب کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے، وہ تنقیدی جائزہ کا بہت اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے، اب تک بادشاہوں کے جنگی اور ملکی کارناموں ہی پر تبصرہ ہوتا رہا ہے، مگر طرزِ حکومت پر فکری و نظری جائزہ بہت کم لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اس مقدمہ کی تحریر ایک بہت ہی سودمند اضافہ ہے، امید کہ اسی قسم کی تحریریں اور بھی لکھی جاتی رہیں گی

ڈاکٹر افسر سلیم خاں نے فتاویٰ جہانداری کی تعریف شاید ضرورت سے زیادہ ہی کر دی ہے، کہ یہ کتاب غزالی کی نصیحت الملوک، نظام الملک طوسی کی سیاست نامہ، ابن طقطقی کی تاریخ فخری اور کیکاؤس کی قابوس نامہ کے انداز کی ہے (ص ۵۵) اسی کے ساتھ وہ لکھتی ہیں کہ مکیاولی کی پرنس سے بھی مشابہت دی گئی ہے، (ص ۵۸) مگر وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ ضیاء الدین برنی کے سامنے ایک خیالی بادشاہ کا تخیل تھا، پھر ان کی کتاب میکاولی کی پرنس کی صف میں کیسے شامل کی جا سکتی ہے، جس میں صرف عیاری، مکاری اور فریب دہی کی تعلیم دی گئی ہے، مقدمہ کی قابلِ قدر تحریر میں

انگریزوں کی تصانیف کے حوالے جا بجا ہیں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور سافانڈ جیسے ثانوی حوالے کو دیکھ کر تعجب ہوا جو باتیں ان سے لی گئی ہیں وہ عربی اور فارسی کی مستند کتابوں سے لی جاسکتی تھیں، احیاء العلوم سے کئی باتیں یورپین مصنف کے سہارے لکھی گئی ہیں، (ص ۸۰) اور جو بات زیادہ کھٹکی وہ یہ کہ کلام پاک کی آیتیں بھی انگریزی کتابوں کے حوالے سے درج کی گئی ہیں (ص ۲۹) ان باتوں سے قطع نظر مقدمہ میں جو اظہار خیال کیا گیا ہے اس میں توازن اور احتیاط پسندی ہے، یہ کتاب بھی ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی،

تاریخ کنج پورہ - کنج پورہ کرنال ضلع کی ایک ریاست تھی، جس کو یوسف زئی کے ذکا خیل کے ایک پٹھان نجابت خاں نے ۱۱۴۲ھ میں قائم کیا، ۱۰۵ صفحے کی اس کتاب میں اس ریاست کی تاریخ ۱۲۲۳ھ تک کی ہے، اس میں نجابت خاں کی تصویر اچھی نہیں ابھری ہے، کیونکہ اس نے اپنی جاگیر کو محفوظ رکھنے کی خاطر نادر شاہ سے ساز باز کی، اسی طرح اس کے جانشینوں نے احمد شاہ درانی، مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کا ساتھ دے کر دہلی کے مغل فرمانرواؤں کو نظر انداز کیا، اس کتاب کا مولف کوئی غیر معروف شخص اثر نیازی ہے، جس کو فارسی زبان لکھنے میں زیادہ مہارت نہیں، لیکن اس ریاست کی تاریخ جاننے کے لئے یہ کتاب مفید ہے اس کو ایڈٹ جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے کیا ہے، باقر صاحب کے نام کے آگے پیچھے کچھ نہیں لکھا ہے، خیال ہوتا ہے کہ یہ باقر صاحب لاہور کے مشہور اہل قلم اور مصنف ڈاکٹر محمد باقر سے مختلف ہیں، اس میں بھی تمہید اور حاشیے انگریزی میں ہیں، یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں طبع ہوئی، عام خیال ہے کہ لیتھو کی چھپائی میں طباعت کی بہت سی غلطیاں ہونا ناگزیر ہیں، یہ ۱۰۵ صفحے کی کتاب ٹائپ حروف میں چھپی ہے، لیکن اس میں چار صفحے کا تصحیح نامہ منسلک کیا گیا ہے،

فہرست مخطوطات شیرانی - اس کی تین جلدیں ہیں، جن میں اس برصغیر کے مشہور عالم پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کے جمع کردہ ساڑھے تین ہزار مخطوطات کا اجمالی تعارف ہے، ان میں ذخائر

فارسی اور بقیہ دوسری زبانوں میں ہیں، پروفیسر شیرانی مرحوم کی یہ قیمتی دولت پنجاب یونیورسٹی نے ان کی رحلت سے پہلے خرید لی تھی، اس کی فہرست کی تینوں جلدیں جناب ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے تیار کی ہیں جو ادارۂ تحقیقات پاکستان میں ریسرچ افیسر تھے، پھر اورنٹیل کالج لاہور میں لکچرر ہو گئے، پاکستان میں کیٹلاگ تیار کرنے کا آرٹ برابر فروغ پا رہا ہے، اور وہاں اس کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے، یہ تین جلدیں بھی اسی اہمیت کے پیش نظر تیار ہوئیں، اس کی پہلی جلد تاریخ ہند کی فہرست پر نظر دوڑائی، عنوان تاریخ ہند میں عہد کی تقسیم کئے بغیر ساری کتابیں درج کر دی گئی ہیں، اگر سلاطین دہلی، شاہان مغلیہ اور متفرق ریاستوں کی تاریخوں کا ذکر عہد کے اعتبار سے ہوتا تو اس سے زیادہ خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا، ان فہرستوں کو دیکھ کر پروفیسر محمود شیرانی کی قدر دل میں اس حیثیت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ انھوں نے ان نسخوں کے جمع کرنے میں کیا کیا پریشانیاں نہ اٹھائی ہوں گی، فہرست نگار کا بیان ہے کہ دنیا بھر میں بعض مخطوطات کے واحد نسخے صرف اسی مجموعہ میں ہیں، بعض نسخے مولفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اسی میں قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی ہے جو فردوسی (متوفی ۴۱۱ھ) کے زمانہ میں لکھی گئی، واجد علی شاہ نے ۱۲۸۵ھ میں اپنی تصنیف عشق نامہ جو اپنے ہاتھ سے لکھی تھی وہ بھی اس میں موجود ہے،

ہم ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ گرانقدر مطبوعات بھیج کر ہم کو نوازا، اب اس ادارہ کو دار المصنفین کی طرف سے یہ پیام ہے کہ تاریخ ہند کے سلسلہ میں انگریزوں کے زمانہ میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے جتنی کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ اب کہیں بھی نہیں خریدی جا سکتی ہیں، جو کتب خانوں میں ہیں ان کے اوراق اتنے خستہ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں کہ ان کا پڑھنا بہت مشکل ہے، اگر ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور ان کتابوں کے نئے اڈیشن شائع کرنا شروع کر دے تو یہ اس کے مزید بڑے علمی احسانات ہوں گے، امید کہ یہ ادارہ دیا سنوا اٹھے گا،

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

شیخ نذیر حسین مدیر اردو دائرہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور

بھوپال

مکرم :- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عید کی مبارکباد کا شکریہ۔ آپ کے حالات سن کر خوشی ہوئی۔

سلیس عبارت کی حسب ذیل کتب سوانح و تواریخ کا مطالعہ فرمائیں،

سیرۃ ابن ہشام، مقدمہ تاریخ ابن خلدون، کتاب البیان والتبیین للجاحظ، عام مطالعہ کے لئے تاریخ ابن خلدون تا تاریخ ابو الفداء، حدیث میں مشکوٰۃ شروع کیجئے،

المثل السائر، کتب معانی و ادب میں سے ہے، اس میں قرآن پاک کی آیات کی فصاحت و بلاغت کے تذکرے جا بجا آئے ہیں، کتاب کا نام المثل السائر ہے، اسی نام سے عربی کتب فروشوں کی دوکانوں پر ملے گی، الحمد للہ تعالیٰ اب تک بخیر ہوں،

والسلام سید سلیمان ندوی

۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء

بھوپال

مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جواب دیر سے جا رہا ہے، قلب میں انشراح نہ تھا، آج جواب کی نوبت آئی،

(۱) نہج البلاغہ آپ پڑھ سکتے ہیں اس کے اردو ترجمے کا حال مجھے معلوم نہیں، (۲) جاحظ کی کتاب المحاسن والاضداد ادب کے لئے مفید ہے، اس میں مختلف موضوعات پر خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، اور اچھے اور برے دونوں نتائج دکھائے گئے ہیں، عبارت سادہ اور انشاپردازانہ، غیر پر تکلف، نیز طبقات ابن سعد کی عبارت بھی پر تکلف نہیں ہے (۳) دلائل الاعجاز میں اصول فصاحت و بلاغت کے مسائل ہیں، ضمناً کہیں کہیں قرآن پاک کے اعجاز پر بھی بحث کی گئی ہے، آپ کافیہ پڑھ چکے ہیں، تو پھر کسی کتاب کی کیا ضرورت ہے، یہ کتاب بہرحال اچھی ہوتی ہے، اور مشکل ہے، آج کل النحو الواضح ایک کتاب مصر میں لکھی گئی ہے، مدارس میں رائج ہے،

حریری اور متنبی تو ادب عربی کو برباد کر دیتی ہیں، اس قسم کی کتابوں کو کبھی نہ پڑھیں کہ ان سے مذاق فاسد ہوگا، آپ حسب ذیل کتابیں پڑھیں،

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، (۲) دلائل الاعجاز جرجانی (۳) اسرار البلاغۃ جرجانی (۴) کتاب البیان والتبیین جاحظ، (۵) نقد الشعر قدامہ، (۶) کتاب الصناعتین ابو ہلال عسکری،

والسلام سید سلیمان ندوی،

۲۲ مارچ سنہ ۵۰ء

بھوپال

مکرم: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خط ملا۔ مقدمہ ابن خلدون بار بار دیکھیں اور سمجھ کر دیکھیں، سوانح مشاہیر اسلام کیلئے

تاریخ ابن خلکان دیکھیں، نہایت عمدہ کتاب ہے، اور زبان و ادب کے لحاظ سے بہت قابل قدر، ابن اثیر ہو واقعات کی کھتونی ہے، اس میں زبان کی حلاوت اور ادب کا نمک نہیں، عربی اشعار کے ایسے مجموعے جن میں ہر دور کا کلام ہو آج کل متعدد لکھے گئے ہیں، اور کتب فروشوں کے پاس ملتے ہیں، مگر جو بات ابو تمام کے حماسہ کی ہے وہ کسی میں نہیں اگو یہ صرف جاہلیین اور اسلامیین کے کلاموں کا مجموعہ ہے،

حجاز کے موجودہ سفر کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا، اس لئے کوئی تحریر بھی شائع نہ ہو سکی،

والسلام سید سلیمان ندوی ۱۱ راپریل ۱۹۵۰ء

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی و سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کے جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی، علمی و ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بسال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دارالمصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، نیز مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، اور دلچسپ، مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، قیمت ۲۰ روپیہ ۵۰ پیسے،

"منیجر"

ادبیات

عطائے خاص

از

جناب ڈاکٹر محمد نشار الرحمٰن خاں نشاؔ صدر شعبۂ اردو ناگپور یونیورسٹی ناگپور

روح پرور خلش سوزِ محبت دے دی		مجھ کو اللہ نے کیا خوب یہ دولت دیدی
اس سے بڑھ کر کوئی احسان نہیں ہو سکتا		ایک غم دے کے جہاں بھر کی مسرت دیدی
بخش کر اک دلِ آزردہ و آلام پسند		سیکڑوں نعمتوں کی ایک ہی نعمت دیدی
شکر ہے اس کا عطا کر کے فقیرانہ مزاج		نگہِ ہر دو جہاں میں مجھے عزت دیدی
حسن صورت کا تو کن ہی نہیں ہے لیکن		ناز اس پر ہے کہ انساں کی سیرت دیدی
غمِ انساں میں مرے دل کو تڑپ جانے کی		خاص توفیق باندازۂ ہمت دیدی
ازرہِ لطف و کرم دے کے قلم کی دولت		مجھ کو اربابِ زر و سیم پہ سبقت دیدی
جو لگا لیتی ہے ہر شے کی حقیقت کا سراغ		اس کی رحمت نے مجھے ایسی بصیرت دیدی

نشاؔ کہہ کر اسے آئینۂ عکسِ دوراں
تم نے مضمونِ غزل کو بڑی وسعت دیدی

باب التقریظ والانتقاد

دی ریلیجن آف اسلام مرتبہ سید قطب

از

ڈاکٹر انور شبنم دل یونائیٹڈ اسٹیٹس انٹرنیشنل یونیورسٹی سین ڈیاگو کیلیفورنیا

"ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر انور شبنم دل بڑے راسخ اور اہل دل مسلمان ہیں، سید قطب
کی کتاب پر ان کی یہ تقریظ انگریزی میں تھی جس کا آزاد اردو ترجمہ مولوی عمیر الصدیق
ندوی نے کیا ہے، امید کہ معارف کے ناظرین اسکو پڑھ کر محظوظ ہوں گے" (معارف)

جناب سید قطب نے عربی میں ایک کتاب "ھذا الدین" لکھی تھی جس کا انگریزی ترجمہ "اسلام دوست" نے دی ریلیجن آف اسلام کے نام سے کیا ہے یہ کیلیفورنیا کے المنار پریس میں چھپا ہے، اس کی ضخامت ۱۰۰ صفحے ہے،

اس دور کے ایک ممتاز مفکر کی لکھی ہوئی اس چھوٹی سی کتاب سے اس دور میں اسلام کی اہمیت کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ دنیا کے موجودہ حالات میں اسلام کی تجدید کے لیے حالات کس قدر سازگار اور امید افزا ہیں، اس میں سات چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں، چار صفحے میں وہ عربی اصطلاحات و اسماء درج کر دیئے گئے ہیں، جن کا استعمال کتاب میں ہوا ہے، اس کے مترجم، طابع اور ناشر ہماری داد کے مستحق ہیں کہ ان کی وجہ سے ایسی دلآویز کتاب ہمارے ہاتھوں میں پہونچ گئی ہے،

ادبیات

عطائے خاص

از

جناب ڈاکٹر محمد نشاط الرحمٰن خاں نشاؔ، صدر شعبۂ اردو ناگپور یونیورسٹی، ناگپور

روح پرور خلش سوزِ محبت دے دی ۔۔۔ مجھ کو اللہ نے کیا خوب یہ دولت دیدی

اس سے بڑھ کر کوئی احسان نہیں ہو سکتا ۔۔۔ ایک غم دے کے جہاں بھر کی مسرت دیدی

بخش کر اک دلِ آزردہ و آلام پسند ۔۔۔ سیکڑوں نعمتوں کی ایک ہی نعمت دیدی

شکر ہے اس کا عطا کر کے فقیرانہ مزاج ۔۔۔ نگہِ ہر دو جہاں میں مجھے عزت دیدی

حسنِ صورت کا تو کچھ نہیں ہے لیکن ۔۔۔ ناز اس پر ہے کہ انسان کی سیرت دیدی

غمِ انساں میں مرے دل کو تڑپ جانے کی ۔۔۔ خاص توفیق باندازۂ ہمت دیدی

از رہِ لطف و کرم دے کے قلم کی دولت ۔۔۔ مجھ کو اربابِ زر و سیم پہ سبقت دیدی

جو لگا لیتی ہے ہر شے کی حقیقت کا سراغ ۔۔۔ اس کی رحمت نے مجھے ایسی بصیرت دیدی

نشاؔ کہہ کر اسے آئینۂ عکسِ دوراں

تم نے مضمونِ غزل کو بڑی وسعت دیدی

باب التقریظ والانتقاد

دی ریلیجن آف اسلام مرتبہ سید قطب

از

ڈاکٹر انور شبنم دل یونائیٹڈ اسٹیٹس انٹرنیشنل یونیورسٹی سین ڈیاگو کیلیفورنیا

"پروفیسر ڈاکٹر انور شبنم دل بڑے راسخ اور اہل دل مسلمان ہیں، سید قطب کی کتاب پر ان کی یہ تقریظ انگریزی میں تھی جس کا آزاد اردو ترجمہ مولوی عمیرالصدیق ندوی نے کیا ہے، امید کہ معارف کے ناظرین اسکو پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔" (معارف)

جناب سید قطب نے عربی میں ایک کتاب "ھذا الدین" لکھی تھی جس کا انگریزی ترجمہ اسلام دوست" نے دی ریلیجن آف اسلام کے نام سے کیا ہے یہ کیلیفورنیا کے المنار پریس میں چھپا ہے، اس کی ضخامت ۱۰۰ صفحے ہے،

اس دور کے ایک ممتاز مفکر کی لکھی ہوئی اس چھوٹی سی کتاب سے اس دور میں اسلام کی اہمیت کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ دنیا کے موجودہ حالات میں اسلام کی تجدید کے لیے حالات کس قدر سازگار، اور امید افزا ہیں، اس میں سات چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں، چار صفحے میں وہ عربی اصطلاحات و اسماء درج کر دیئے گئے ہیں، جن کا استعمال کتاب میں ہوا ہے، اس کے مترجم، طابع اور ناشر ہماری داد کے مستحق ہیں کہ ان کی وجہ سے ایسی دل آویز کتاب ہمارے ہاتھوں میں پہونچ گئی ہے،

سید قطب (۱۹۰۶ء - ۱۹۶۶ء) اس کا آغاز یہ لکھکر فرماتے ہیں کہ اسلام کی جو کار فرمائی انسانی زندگی میں ہے، اس کا یہ بنیادی نکتہ اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے، کہ اسلام حیات انسانی کے لیے خدا کی ایک مقررہ شاہراہ ہے، یہ انسان کی اس جد وجہد سے طے ہو سکتی ہے جو انسانی صلاحیتوں اور اس کے ماحول کے مادی وسائل کے اندر ہوتی ہے، (ص ۲) اسلام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کی محدود طاقت کو نظرانداز نہیں کرتا، ہر ترقی کے مختلف مدارج میں انسانی کو انکی کے مادی تقاضے سے بھی غفلت نہیں برتتا ہے پھر ایک مسلمان کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ضروری کوشش کرے تو انسان کے بنائے ہوئے نظام کے مقابلہ میں اللہ کی مقررہ شاہراہ پر چل کر نسبتاً زیادہ آرام اور اعتدال کے ساتھ انسانی ترقی کی بلند تر منزل تک پہنچ سکتا ہے،

سید قطب ان لوگوں کے شبہات کو خاص طور سے دور کر دیتے ہیں، جو اسلام کی فطرت اور اس کی کارفرمائی سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں، اور غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اس سے معجزانہ کارنامے کی توقع رکھتے ہیں، قرآن مجید میں اس کی تصریح ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت بدلنے کی خواہش نہیں کرتی، اسی طرح جو خدا کی راہ کو تلاش کرتے ہیں اسی کو خدا راہ دکھاتا ہے، اللہ تعالےٰ نے انسانی زندگی کے لئے ایک راہ مقرر کر دی ہے، جو انسانی کوشش سے طے ہو سکتی ہے، اور اس میں اللہ تعالےٰ کی رہنمائی اور رحمت شامل حال ہو جاتی ہے، قرآن مجید کی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ افراد اور سوسائٹی کی زیادہ سے زیادہ فلاح کے لیے باہمی مفاہمت کا ماحول پیدا ہوتا رہے، اسلام اور مسلمان کے عروج و زوال کی تاریخ اس بات کی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررکردہ

راہ کو طے کرتا انسانی کوششوں پر چھوڑ دیا گیا ہے، سید قطب ایک اہم بات کی طرف یہ لکھکر توجہ دلاتے ہیں کہ مذہب کی صداقت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ لوگ خود اس کے لئے کوشاں نہوں وہ اس کی صداقت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہوں، یا پس وپیش کرتے ہوں تو وہ اپنی عدم آمادگی اور پس وپیش کی کیفیت کے خلاف اس طرح جد وجہد کریں کہ وہ اسلام اور اس کی حقانیت تک پہونچ سکیں، (ص ۹) اگر صحیح راستہ کی جد وجہد میں جوش اور لگن ہو تو ایک فرد کو بلند تر افق دکھائی دیتا ہے، پھر اس کی پوری شخصیت انسانیت کی فلاح کے لیے ایک متحرک قوت بن جاتی ہے، انسانی جد وجہد سے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ راہ کو طے کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رہنمائی سے بے نیاز ہو جائے، سید قطب بجا طور سے اس پر زور دیتے ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رہنمائی کے حقائق انسان کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ قائم نہیں ہوں گے اسکا دین مکمل نہیں کہا جائے گا،

اسلام کا اصلی عقیدہ یہ ہے کہ ہم دین کو قبول کرتے ہوئے اس کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے رسول ہیں، یعنی اللہ اور صرف اللہ ہی الوہیت کا مالک ہے، اور اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ انسان کے لئے ایک راہ مقرر کرے جس پر انسان کو چلنا ضروری ہے، انسان کو یہ راہ دکھلانے والے ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اگر ہم اس عقیدہ کے ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو راہ قرآن اور سنت کے ذریعہ سے بتائی گئی ہے، وہی اصلی راہ ہے تو ہم اسی کے مطابق ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور رہیں،

سید قطب نے یہ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے کہ اگر انسانی زندگی اور تخلیق کے مقصد میں ہم آہنگی نہیں ہوتی تو پھر بڑا پریشان کن تصادم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مغربی دنیا کی موجودہ صورت حال سے کیا جا سکتا ہے، جہاں بے مثال مادی خوشحالی اور سائنس کے علوم کی ترقی کے باوجود انسانی زندگی اور انسانی معاملات میں بڑا بحران ہے۔

اس کے بعد سید قطب اسلام کے خلاف دو بڑے الزامات کی تردید کرتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کے عروج کا زمانہ بہت مختصر ہے۔ اسلام ایک زندہ و فعال قوت کی حیثیت سے باقی نہیں رہا۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ اسلام کا زوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی شروع ہو گیا، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ضرور شہید ہوئے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں اختلافات بھی پیدا ہوئے، ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جن سے انتشار پیدا ہوا، مگر ان تمام باتوں کو اسلام کے دشمن اس رنگ آمیزی سے پیش کرتے ہیں کہ بہت سے خوش عقیدہ مسلمانوں میں بھی کم و بیش یہ شک پیدا ہونے لگتا ہے کہ اسلام ایک متحرک قوت اور ابدی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ مسلمان عوام اپنی صحیح تاریخ سے واقف نہیں ہیں، جس سے ان کے اس شک میں اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن گذشتہ دس صدیوں میں مسلمانوں نے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کارنامے انجام دے ہیں، ان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی سطوت کا زمانہ ایسا مختصر ہے کہ اس کو ایک اتفاقی حادثہ یا ایک ایسی کرامت کہی جائے جو پھر کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی، تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ سب کچھ ایک پر جوش انسانی جدوجہد کی بدولت عمل میں آیا۔ اسلام کے دور عروج میں بہت سی بلند ترین شخصیتیں پیدا ہوئیں جو انسانیت کے ایسے نمونے تھے کہ انسانی تاریخ کے کسی دور کی بھی شخصیتیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں یہ مرد اور خواتین اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے اندر رہ کر اپنی

کوششوں سے نیکی کی راہ میں کیا کچھ حاصل نہیں کر سکتا ہے، اسلام کی یہ عظیم نعمت عرب کے فلاکت زدہ صحرا میں پیدا ہوئی۔ تاریخ بتاتی ہے، کہ اس کو کن کن مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایسے مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں دس صدیوں تک چھائے رہے، جنھوں نے انسانی ترقی کے لئے نمایاں کام انجام دیئے۔ اسلام کی تعلیمات سے اب بھی ایسے مسلمان پیدا ہو سکتے ہیں، اگر پیدا ہونے کی کوشش کی جائے اس کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ انسان کی فطرت سے پورا تعاون کرکے اس کی پوری قوت کو بروئے کار لایا جائے۔ (ص ۴۳)

اسلام کے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ اس کا اخلاقی نظام بہت ہی سخت اور غیر لچک دار ہے، یہ صحیح ہے کہ خدا کی مکمل اطاعت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، کیونکہ اسی سے انسان کے اندر نیک اور تعمیری کام کرنے کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں، اور وہ ان منفی طاقتوں کو قابو میں رکھ سکتا ہے، جو اس کی راہ میں حارج ہوتی ہیں۔ اسلام کے عروج کا جو زمانہ ہے وہ منفی صورت حال کے خلاف مسلمانوں کی عظیم ترین اور مشکل ترین جد وجہد کا بھی زمانہ ہے وہ منفی حالات کو قابو میں لا کر مثبت حالات میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوئے،

انسانی ترقی میں اسلام کے جو اثرات ہیں اس کا اعتراف انسانیت کے مؤرخوں نے کیا ہے، سید قطب اس نتیجے پر پہونچے ہیں،

"یورپ میں لوتھر اور کیلوین نے مذہب میں اصلاحات کیں، یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور اب بھی جاری ہے، جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ ہوا استبدادیت سے نجات حاصل ہوئی، انگلستان میں میگنا کارٹا اور فرانس میں وہاں کے انقلاب سے انسانی مساوات اور حقوق کی تحریکوں کی ابتدا ہوئی، تجرباتی طریقے ایسے

اختیار کئے گئے جن سے سائنس میں پرشکوہ ترقی ہوئی، تاریخ کو ان ساری ترقیوں پر ناز ہے، لیکن یہ سب اسلام کی لہر سے بنیادی طور پر متاثر ہوئیں۔

ہم کو اچھی طرح احساس ہوگیا ہے کہ ہم اسلام کی راہ پر چل کر کہاں پہونچ سکتے ہیں، اور اس راہ کو چھوڑ کر کس سمت میں بھٹک سکتے ہیں، سید قطب نے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ جب ہم کو یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے تو دنیا کے لئے اسلام کی راہ پر چلنے کی فضا سازگار ہو گئی ہے،

جزیرۃ العرب میں اسلام کے خلاف جو حالات پیدا ہو گئے تھے وہ اسلام کے لئے ایک چیلنج تھا، ایک بات جو عمل میں آچکی ہے وہ پھر عمل میں لائی جا سکتی ہے، جو کچھ عمل میں لایا تھا وہ کوئی معجزہ نہ تھا بلکہ یہ سب کچھ اس لئے عمل میں آیا کہ انسانی فطرت کی تمام عظیم قوتوں کو استعمال میں لایا گیا، وہ عظیم قوتیں پھر میسر ہو جائیں، اور اب تو یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام کے بڑھنے والے اثرات کا بھی تجربہ ہو چکا ہے، موجودہ دنیا مذہب سے دور ہوتی جارہی ہے، جس سے لوگوں کو خدا کی طرف مائل کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے اس چیلنج کے منفی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے، لیکن ہم کو قرآن کے ان الفاظ کو غور سے پڑھنا چاہئے،

ولا تھنوا ولا تحزنوا	اور بے دل نہ ہو اور نہ کسی
وانتم الاعلون ان	طرح کا غم کرو اگر مومن ہو تو
کنتم مومنین (آل عمران رکوع ۱۴)	تم ہی غالب رہو گے،

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں اسلام کے طرز حکومت کی خوبیاں اور دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں اس کی برتری دکھائی گئی ہے، مولفہ۔ مولانا محمد اسحاق سندیلوی، قیمت ۔۔ ۴۰ ۔ ۹

منیجر

مطبوعاتِ جدیدہ

مشرق وسطیٰ کی ڈائری ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ترجمہ مولوی شمس الحق ندوی متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۹۴ مجلد مع خوبصورت گردپوش قیمت ۱۵ روپئے، پتہ ۔ مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اصلاح و تبلیغ کے کام سے طبعی مناسبت اور خاص دلچسپی ہے، اس کے لئے وہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ کے علاوہ کئی عرب ملکوں اور یورپ و امریکہ کا بھی سفر کرچکے ہیں، پہلی مرتبہ وہ ۱۹۵۱ء میں مشرق وسطیٰ تشریف لے گئے تھے، جس کا روزنامچہ ۱۹۵۴ء میں "مذکرات سائح فی الشرق العربی" کے نام سے شائع ہوا تھا مگر ابھی تک اس کا اردو ترجمہ نہیں چھپا تھا، حالانکہ مولانا کی عربی کتابوں کے اردو اور اردو کے عربی ترجمے فوراً ہی شائع ہوجاتے ہیں، زیر نظر کتاب اسی ڈائری کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ ہے، وہ تقریباً آٹھ مہینے مصر، شام اور سوڈان میں قیام پذیر رہے اور اس عرصہ میں وہ وہاں کے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں گئے، علمی، ادبی دینی، اور تبلیغی اجتماعات اور کانفرنسوں میں شریک ہوئے، کتب خانوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں اور آثار قدیمہ کی سیر کی، علمی، تعلیمی، دینی و اجتماعی حالات کا مشاہدہ کیا، قومی، ملی، مذہبی اور سیاسی تحریکوں کا مطالعہ کیا، مختلف اصحاب علم و ادب سے ملاقات کی اور ان سے علمی و تعلیمی موضوعات اور اصلاحی و دینی مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا، یہ ڈائری ان ہی مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے، مولانا نے مصری علما کو ہندوستان کے عام حالات خصوصاً یہاں کی علمی و مذہبی سرگرمیوں اور عربی

و اصلاحی تحریکوں سے واقف بھی کرایا ہے، اور ان کے سامنے اپنے دعوتی تجربات بھی رکھے ہیں، اور ان کے تجربوں اور مشوروں سے فائدہ بھی اٹھایا ہے، مگر جس خیال سے ان کو اختلاف ہوا اس کو کسی لاگ لپیٹ کے بغیر ظاہر کر دیا ہے، اس اعتبار سے یہ ڈائری ایک دستاویز ہے، اس سے عرب ملکوں کے علمی، ادبی اور اجتماعی حالات اور وہاں کے مختلف مدارس فکر و مکاتب خیال کے مصنفین اور رہنماؤں کے بارہ میں مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتے ہیں، نیز خود مصنف کے دینی احساسات، دعوت و تبلیغ سے شغف اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے ان کی تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ۱۹۵۶ء میں لبنان کا سفر کیا تھا، آخر میں وہاں کے سہ روزہ قیام کے تاثرات و مشاہدات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں،

تذکرہ اشارات بینش (فارسی) : مرتبہ سید مرتضیٰ بینش، ترتیب و تحشیہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۰ روپئے ناشر انڈو پرشین سوسائٹی ۲۷۷۰ ، ایشیخ چاند اسٹریٹ لال کنواں دہلی ۶۔

سید مرتضیٰ بینش گذشتہ انیسویں صدی میں کرناٹک (دکن) کے صاحب کمال شاعر و ادیب تھے، "اشارات بینش" ان کی قلمی یادگار ہے، یہ جنوبی ہند کے اکثر فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، جو گذشتہ صدی میں مدراس سے چھپا تھا، مگر اب بالکل نایاب تھا، حسن اتفاق سے اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود تھا اسی کی مدد سے دلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے اس کو دوبارہ شائع کیا ہے، اس پر لائق مرتب کا مفید مقدمہ اور حواشی و تعلیقات بھی شامل ہیں، اس میں جن شعرا کا تذکرہ ہے، ان کے ذکر سے عموماً شمالی ہند کے تذکرے خالی ہیں، اس حیثیت سے یہ اہم ہے، مصنف نے ہر شاعر کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں اور ان کے کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں، مقدمہ

میں انیسویں صدی کے سیاسی و ادبی حالات، مصنف کے سوانح اور اس تذکرہ کی اہم خصوصیات کا ذکر ہے، اور تعلیقات در اصل متن پر اضافہ ہیں، ان میں ہر شاعر کے مزید حالات دوسرے ماخذوں کی مدد سے لکھے گئے ہیں، حواشی میں ہجری سنین کی عیسوی سنین سے مطابقت، عربی فقروں کے ترجمے اور بعض دوسرے مصادر کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ تذکرہ محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے، اور اس سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو مدد ملے گی لیکن کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں جو غالباً کتابت و طباعت کا نتیجہ ہیں، آخر میں اسماء و اعلام کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے،

گوپال متل ۔ مرتبہ جناب محمد عبد الحکیم صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۴۷ مجلد مع گرد پوش قیمت پندرہ روپے۔ ناشر نازش بک سنٹر ترکمان گیٹ دہلی،

جناب گوپال متل اردو کے ایک اچھے صحافی، ادیب اور شاعر ہیں، اس کتاب میں ان کی خدمات ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ دراصل مرتب کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایم اے فائنل کے لئے تحریر کیا تھا اور اب اس کو کچھ اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے چار ابواب میں متل صاحب کے حالات زندگی اور صحافی، ادیب و شاعر کی حیثیت سے ان کی خدمات بیان کی گئی ہیں، پانچویں باب میں اردو ادب میں ان کا درجہ بتایا گیا ہے اور چھٹے باب میں ان کے کلام اور تحریروں کا انتخاب دیا گیا ہے، آخر میں متل صاحب کی طبعزاد کتابوں اور ترجموں کی فہرست درج ہے، یہ کتاب ایم اے فائنل کا ایک مقالہ ہے اس حیثیت سے اس کا معیار اچھا ہے لیکن اس میں متل صاحب کے حالات بہت اختصار سے لکھے گئے ہیں، کہیں کہیں تکرار و مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کو کسر کے باوجود یہ طالب علمانہ کوشش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے اور اس سے متل صاحب کے آئندہ سوانح نگار کو بڑی مدد ملے گی، شروع میں محمود سید کمانی نے گوپال متل کی شخصیت کے خط و خال بہت خوبی سے دکھائے ہیں،

نورالایمان ۔ مرتبہ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی مترجمہ مولوی اختیار احمد قادری تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۰ قیمت ساٹھ روپئے ناشر اسلامک اکیڈمی، مبارکپور، اعظم گڈھ، یوپی۔

مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی متبحر علما و مصنفین میں تھے "نورالایمان بزیارۃ آثار الرحمٰن" ان کی مشہور تصنیف ہے، یہ اس کا اردو ترجمہ ہے، اس میں مدینہ طیبہ، روضۂ مبارک اور قبور کی زیارت کے دلائل و آداب تحریر کئے گئے ہیں، ان امور کے نفس جواز میں کوئی اختلاف نہیں البتہ ان کے لئے "شد رحال" بیان کو فرض اور عظیم عبادت سمجھنے میں اختلاف ہے اور یہ صرف ابن تیمیہؒ ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ بعض دیگر اسلاف سے بھی منقول ہے جیسا کہ خود تقریظ نگار نے بھی اعتراف کیا ہے، (ص ۹) مصنف نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے، اور اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض آثار مقدسہ جنت البقیع، مساجد اور کنوؤں کا ذکر کرکے ان کے مقدس و متبرک ہونے کو ثابت کیا ہے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استعانت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو شفاعت سے خلط ملط کر دیا ہے، اور اسی طرح مُردوں کے تصرف کو بھی ثابت کیا ہے، یہ اور اس طرح کی بعض دوسری رائیں دوسرے لوگوں کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، تقریظ نگار اور مترجم کی تحریروں میں مناظرانہ رنگ غالب ہو گیا ہے، مترجم نے بعض مسائل میں مولانا کی رایوں سے اختلاف کیا ہے، جیسے مولانا کے نزدیک قبروں پر پردے ڈالنا مکروہ ہے اور جب میت گل کر مٹی ہو جائے تو قبر پر کھیتی کرنا، عمارت بنانا اور اس کے اوپر چلنا جائز ہے (ص ۱۱۱) قبر پر زینت کے لئے عمارت بنانا حرام ہے اور بعد دفن قبر کا مستحکم کرنا مکروہ ہے (ص ۱۰، ۱۵) وغیرہ، لیکن مترجم کو ان باتوں سے کلی اتفاق نہیں، مولانا نے سنن ابو داؤد کے حوالے سے لکھا ہے کہ قبر کے پاس جانور ذبح کرنا اسلام میں نہیں ہے، محشی کے نزدیک اگر یہ عام آدمی اور اشتہار کے بجائے ایصال ثواب کے لئے ہو تو جائز ہے، اس طرح تو جس حکم کو چاہے جائز اور ناجائز ثابت کیا جا سکتا ہے، "ض" ۔

جلد ۱۲۱ ماہ جمادی الاخری سنہ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۷۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے متعلق ایک ایکٹ لوک سبھا میں زیر غور ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر اس کی طرف لگی ہوئی ہے کہ یہ منظور ہو کر ان کی امنگوں اور تمناؤں کو کہاں تک پورا کرتا ہے، اور حکومت اپنی وطنی رواداری اور سیاسی فراخ دلی کا ثبوت کس طرح دیتی ہے،

مسلم یونیورسٹی کا کردار خصوصی ہے، یا تاریخی یا اقلیتی، اس پر بحث جاری ہے، جمہوریت میں الفاظ کی بڑی پر فریب دل آویزی ہوتی ہے، جن سے دلوں کو بہلانے، جذبات سے کھیلنے، قانونی فوائد اٹھانے اور ضرورت کے وقت باہمی آویزش پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، مسلم یونیورسٹی بھی جمہوریت کی تماشا گاہ بنی ہوئی ہے، یہ تلقین جاری ہے کہ یہاں فرقہ واریت نہ ہو، یہ قومی دھارے سے الگ تھلگ نہ ہو، سیکولرزم کا نمونہ ہو، مگر جب کسی اسلامی ملک کا کوئی سربراہ یا ممتاز شخص ہندوستان آتا ہے، تو اس کو اس کی زیارت کے لئے ضرور بھیجا جاتا ہے، تاکہ وہ دیکھ کر خوش ہو کہ یہاں کی سیکولر حکومت میں یہاں کی اقلیت اپنی تعلیمی، تہذیبی، اور دینی روایات کے ساتھ ایک عظیم ادارہ کو کس طرح قائم کئے ہوئے ہے، مگر سیکولرزم کے اس نشان کے ہاتھی کو دکھا کر یہ بھی اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اقلیتی کردار کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا،

اس راج ہٹ کے نتیجہ کا کوئی گہری اور ضروری نہیں ہے، کیرالا میں عیسائیوں کی درسگاہوں کا اقلیتی کردار تسلیم کر لیا گیا ہے، خود یو۔پی میں مسلمانوں کے بعض کالجوں کی طرح اعظم گڈھ کے شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج کو اقلیتی ادارہ مان لیا گیا ہے، اس کا سارا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، حالانکہ یہاں پڑھنے والے طلبہ کی اکثریت غیر مسلموں کی ہے، مگر مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار محض اس لئے تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ حکومت نہیں چاہتی کہ اس کا کردار اقلیتی ہو،

حکومت کو یہ شبہ ہے کہ کہیں یہ اپنے اقلیتی کردار کی وجہ سے سیکولرزم کے خلاف ایک زبردست محاذ نہ بن جائے، اس ملک کے ہر حصہ میں یونیورسٹیاں ہیں، جو یہاں کی اکثریت کے مزاج اور مرضی کے مطابق چل رہی ہیں، ان کے ذریعہ سے اگر سیکولرزم پنپ نہیں سکتی اور صرف ایک مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے سیکولرزم سپرد خاک ہو سکتی ہے، تو اس سے ظاہر ہے کہ سیکولرزم کے عاشقوں کی برات محض شاخ آہو پر ہے

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا سومناتھ ہے، محمود غزنوی نے اپنے فاتحانہ اور سپاہیانہ جوش میں سومناتھ کو مسمار کیا تھا تو وہاں کے پوجاری اپنی بیچارگی اور بے بسی میں اس کو مسمار ہوتے دیکھتے رہے، اگر ہندو مورخین محمود غزنوی کی اس غیر روادارانہ بلکہ بقول ان کے اس سفاکانہ حرکت کو آج تک نہیں بھولے ہیں، موجودہ دور حکومت کے محمود غزنوی مسلمانوں کے سومناتھ کو برباد کر دیں، اور اس کے پوجاری اپنی بے چارگی اور بے بسی میں اس کی غارتگری کو دیکھتے رہ جائیں تو کیا مسلم مورخین اس غیر روادارانہ حرکت کو بھول جائیں گے، یا اس کو اپنی تاریخ کے صفحات پر ایسی طرح تازہ رکھیں گے جس طرح غیر مسلم مورخین گجرات کے سومناتھ کی بربادی کو تازہ رکھے ہوئے ہیں؛

حکومت اگر واقعی سیکولرزم کی کامیابی کی خواہاں ہے، تو مسلم یونیورسٹی کو اپنی رواداری اور فراخ دلی کی تجربہ گاہ بنائے، تاکہ یہاں اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات و احساسات کی نشو و نما اس کی مرضی کے مطابق ہوتی رہے، یہاں اقلیت کے زیادہ سے زیادہ طلبہ جمع ہو کر اچھے سائنسداں، اچھے ڈاکٹر، اچھے انجینیر، اچھے اہل قلم، اچھے ماہر تعلیم اور اچھے صاحب دماغ پیدا ہوتے رہیں تو کیا وہ ملک کی سیکولرزم کے لئے مفید ثابت نہ ہوں گے؟ اور اگر اقلیت کے طلبہ حصول تعلیم کی آسانیوں سے محروم ہو کر بددل، غیر مطمئن، حکومت سے بدظن اور مشکوک رہے تو

کیا وہ ملک کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے کے لئے بار نہ ہوں گے ؟ اقلیت کو اکثریت کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے تو اکثریت کا اقلیت کو مطمئن رکھنا بھی کم ضروری نہیں،

رہا یہ شبہ کہ اقلیتی کردار کے تسلیم کرلینے سے مسلم یونیورسٹی فرقہ واریت کا مرکز بن جائے گی جس سے سیکولرزم اور قومی دھارے کو نقصان پہنچے گا، تو یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ دلوں کی تسخیر راج ہٹ کے ذریعہ سے نہیں ہوتی، اکبر کے دینِ الٰہی اور سیاسی حکمتِ عملی میں بظاہر بڑی رواداری اور سیکولرزم تھی، مگر وہ اپنی راج ہٹ کے تمام ذرائع استعمال کرنے کے باوجود ملک کو اپنی مرضی کے مطابق نہ بنا سکا بلکہ مسلمانوں میں تو وہ غیر مقبول رہا اورنگ زیب پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو تو خوش کر سکا لیکن غیر مسلموں کو اپنے سے برگشتہ رکھا، مگر شیر شاہ سوری اور کشمیر کے زین العابدین ہندوستان کے وہ مثالی حکمراں ہیں جن پر ملک کے ہر طبقہ کو اعتماد رہا، وہ کسی جبر و استبداد، دباؤ اور راج ہٹ کے بغیر یہاں کے لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری موجودہ اور آئندہ حکومت اکبر یا اورنگ زیب کی روش پر چلتی ہے یا شیر شاہ سوری اور زین العابدین کی روایت کو اختیار کرنا پسند کرتی ہے، اس کا فیصلہ خود اصحابِ حکومت نہیں، بلکہ آئندہ کے مورخین ہی کریں گے،

یہ خاکسار دار المصنفین کے ایک ضروری کام سے جون کے دوسرے ہفتہ میں پھر پاکستان جا رہا ہے، مولانا عبد السلام قدوائی ادھر کچھ عرصے سے علیل تھے، اب رو بصحت ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو ہر طرح اچھا رکھے، تاکہ دار المصنفین ان سے برابر مستفیض ہوتا رہے، آج کل دار المصنفین کی نئی مطبوعات میں تذکرۃ المحدثین جلد دوم تو چھپ کر تیار ہے، غالب مدح و قدح کی روشنی میں (جلد دوم) بھی طبع ہو رہی ہے ۔۔۔ یہ دونوں کتابیں جلد ہی اراکین دوامی کی خدمت میں پہنچ جائیں گی،

مقالات

یہود اور قرآن مجید

از

ضیاء الدین اصلاحی

سلسلے کے لئے دیکھئے معارف فروری ۱۹۸۲ء

میرے گذشتہ مضامین سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ یہود پر اللہ نے گوناگوں انعامات کئے تھے، اور ان کو دین و دنیا کی برکتوں سے مالا مال کیا تھا، ان کے اندر انبیاء و رسل بھی مبعوث کئے تھے، اور ان میں حکمراں اور سلاطین بھی پیدا کئے تھے، لیکن انھوں نے خدا کی نعمتوں سے متمتع ہونے اور اس کی ہدایت کی قدر کرنے کے بجائے کفر و انکار کا رویہ اختیار کیا، اس کے دین کو مذاق اور تماشا بنایا، اس کی اور اس کے پیغمبروں کی شان میں ایسی ایسی گستاخیاں کیں جن کی کسی موحد اور خدا کو ماننے والی جماعت سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی، غرض ان کے عقائد، عبادات، اعمال و اخلاق میں گوناگوں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، ان کا نہ خدا پر ایمان رہ گیا تھا، نہ رسالت پر، وہ دنیا طلبی میں اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ آخرت کا تصور اور دین کی اصل روح بالکل ہی غائب ہو گئی تھی، عبادت کی پابندیوں سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا، اخلاقی خوبیاں ایک ایک کر کے ان سے رخصت ہو گئی تھی، اور رذائل اور ذمائم اخلاق ان میں رچ بس گئے تھے، اللہ کی طرف سے ان کو

بار بار متنبہ کیا گیا اور سنبھلنے کی دعوت دی گئی، مگر انھوں نے کوئی پرواہ نہ کی، یہاں تک کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کی اعجاز پروری اور مسیحا نفسی بھی اُن کے اندر کوئی ایمانی روح نہ پھونک سکی تو سب سے آخر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ٹھیک اُن کے صحیفوں کی پیشین گوئی کے مطابق ہوئی، لیکن انھوں نے اس نعمت عظمیٰ کی بھی ناقدری کی، اور اس آخری موقع کو بھی ضائع کر دیا، اور بجائے سنبھلنے کے اور بگڑتے گئے، اس لئے وہ خدا کی گرفت میں آگئے کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی قوم اس کی بخشی ہوئی نعمت کی ناقدری کرتی، اور اس کے دیئے ہوئے موقع کو گنوا دیتی ہے، تو اپنے کئے کی سزا پاتی ہے،

ولا یظلم ربک احداً (کہف) — اور تیرا خدا کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔

اس قانون کے مطابق یہودکو ان کو سرکشی، عناد اور نافرمانی کی سخت سزائیں دی گئیں، اور وہ تباہیوں اور ہلاکتوں سے دوچار ہوئے، جو دوسروں کے لئے عبرت کا باعث ہیں، ذیل میں ان کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو۔

ہدایت الٰہی سے محرومی یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہود پر اللہ نے سب سے بڑا فضل و انعام یہ کیا تھا کہ ان کو اپنی ہدایت و شریعت کی نعمت سے نوازا تھا لیکن جب انھوں نے اس کی ناقدری کی تو خدا نے بھی اُن کو اپنی ہدایت سے محروم کر دیا، ارشاد ہے،

کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْماً کَفَرُوا	اللہ کیسے ان لوگوں کو ہدایت دے گا
بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ وَشَھِدُوا اَنَّ	جنھوں نے ایمان لانے اور رسول کے
الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَجَاءَھُمُ الْبَیِّنَاتُ	برحق ہونے کی شہادت دے چکنے اور
وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ	اپنے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آجانے
(آل عمران ۱۰)	کے بعد بھی کفر اختیار کیا، اور اللہ تو

ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

انھوں نے اپنی بدبختی سے ایمان وھدایت پر ضلالت کو ترجیح دی، اور رسول اکرمؐ کی صداقت آشکارا ہوجانے اور آپؐ کی بعثت کے متعلق شریعت موسوی کے بعد حضرت مسیحؑ کی بشارت سننے کے باوجود محض ضد تعصب اور حسد کی بنا پر آپؐ کا انکار کردیا اور آپ کے خلاف الزام تراشیاں کرتے، اور اللہ پر جھوٹی تہمتیں عائد کرتے رہے، اس لئے وہ اس کے مستحق تھے، کہ خدا کی ہدایت ان سے چھین لی جائے، چنانچہ فرمایا:۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی	اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا
عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَھُوَ یُدْعٰی	جس نے اللہ پر جھوٹ گڑھا، درانحالیکہ
اِلَی الْاِسْلَامِ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی	اس کو اسلام کی طرف بلایا جارہا
الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ	تھا، اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت
(صف: ۷)	نہیں دیتا،

وہ کتاب وشریعت کے حامل اور ہدایت الٰہی کے امین بنائے گئے تھے، مگر انھوں نے اس میں خیانتیں کیں، کیا ایسے خائن، بدبخت، اور ظالم لوگ خدا کی نعمت وہدایت سے نوازے جانے کے لائق تھے،

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ	کیا بری مثال ہے ان لوگوں کی،
کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ	جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا
لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ	اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت
(جمعہ: ۵)	نہیں دیتا،

قرآن مجید نے ان کی ہدایت الٰہی سے محرومی کا ذکر دوسرے پیرایوں میں بھی کیا ہے،

ازاغت قلوب: یعنی دلوں کا کج کردینا، اللہ نے یہ سزا اُن کی کج روی کی بنا پر دی، اور انھیں راست روی سے محروم کردیا۔

فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ	پس جب وہ کج ہوگئے، تو اللہ نے
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ	بھی اُن کے دلوں کو کج کردیا، اور
الْفَاسِقِيْنَ،	اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت
(صف ۵۱)	نہیں دیتا،

طبع قلوب: اُن کی بداعمالی اور کج روی کی بنا پر ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، قرآن مجید نے صراحت سے کہا:-

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ	سو بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَاءَ	عہد کو توڑا، اور اللہ کی آیتوں
بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا	کا انکار کیا، اور نبیوں کو قتل کیا،
غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا	اور یہ کہا کہ ہمارے دل بند ہیں
بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا	بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب
قَلِيْلًا ۝	سے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے تو
(نساء - ۱۵۵)	وہ کم ہی ایمان لائیں گے،

قساوت قلب: پتھروں کی سختی مشہور ہے۔ گر پھر بھی بعض پتھروں سے چشمے پھوٹتے اور نہریں بہتی ہیں، اور پہاڑ بھی خدا کی ہیبت سے چور چور ہو جاتا ہے۔ قوم بنی اسرائیل نے صحرائے سینا میں ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹتے دیکھا تھا، اور طور خدا کی ہیبت سے کوہ طور پاش پاش ہونا اُن کے مشاہدہ میں آچکا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے دل پتھروں یا ان سے بھی زیادہ سخت

ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ان میں نیکی اور تقویٰ کی روئیدگی اور حق و ہدایت کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی تھی،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ	پھر اس کے بعد بھی تمھارے دل سخت
ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ	ہو گئے چنانچہ وہ پتھر کی طرح ہیں، بلکہ
قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا	سختی میں ان سے بھی بڑھ کر، اور بعض پتھر
يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ وَاِنَّ مِنْهَا	تو ایسے بھی ہیں، کہ ان سے نہریں بہتی
لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ	ہیں، اور بعض پھٹ جاتے ہیں، اور
وان منها لما يهبط من	ان سے پانی نکلتا ہے، اور بعض وہ ہیں
خشية الله وما الله بغافل	کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے گر جاتے ہیں
عَمَّا تعملون،	اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے
(بقرہ ۹ - ۷۴)	بے خبر نہیں ہے،

خود یہود کے مذہبی صحیفوں سے بھی ان کی قساوت قلب کا پتہ چلتا ہے:۔

"وہ تربیت پذیر نہ ہوئے، انھوں نے اپنے چہرہ کو چٹان سے سخت تر بنایا، انھوں نے پھرنے سے انکار کیا[1]..... "سارے اہل اسرائیل بے حیائی کی پیشانی رکھتے اور سنگدل ہیں[2]...... اس نے ان کی سنگدلی کے سبب غمگین ہو کر، اور چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر کر کے ان کو دیکھا[3]..... تو اپنی سختی اور ناتائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لئے اپنے واسطے غضب کما رہا ہے[4]،

یہود کی اس قساوت قلبی سے مسلمانوں کو بچنے کی بڑی تلقین کی گئی ہے،

---

[1] یرمیاہ ۵-۳، [2] حزقیل ۳-۷، [3] مرقس ۳-۵، [4] رومیوں ۲-۵،

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ	کیا ایمان والوں کے لئے قریب نہیں ہوا
قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ	کہ ان کے دل جھک جائیں ، اللہ
الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا	کی یاد اور اس حق کے لئے جس کو
الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ	اللہ نے اتارا ہے ، اور وہ ان لوگوں
الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ	کی طرح نہ ہوں جن کو پہلے کتاب دی
مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ،	گئی تھی ، سو ان پر مدت لمبی ہوئی تو
(حدید : ۱۶)	اُن کے دل سخت ہو گئے ، اور اُن میں
	سے اکثر فاسق ہیں ،

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہود کا ہدایتِ الٰہی سے محروم کیا جانا ان کے لئے بدترین سزا تھی ،

غضبِ الٰہی | یہود کو متنبہ کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ کجروی سے باز نہ آئیں گے تو اُن پر خدا کا غضب نازل ہوگا ، اور سخت ہلاکت و تباہی سے دوچار ہوں گے ،

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَنْجَيْنَاكُمْ	اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے دشمن
مِنْ عَدُوِّكُمْ وَوَاعَدْنَاكُمْ	سے تم کو نجات دی ، اور تم سے طور
جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا	کے داہنی جانب کا وعدہ کیا ، اور
عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى كُلُوا	تم پر من وسلویٰ اتارا ، کہ ان پاکیزہ
مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا	چیزوں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہے
تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ	کھاؤ ، اور سرکشی نہ کرو کہ تم پر میرا
غَضَبِي وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ	غضب نازل ہو جائے ، اور جس پر
غَضَبِي فَقَدْ هَوَى ، (طٰہٰ : ۸۱)	میرا غضب نازل ہو سو وہ ہلاک ہوا ،

لیکن یہ تنبیہ کارگر نہ ہوئی، اور وہ دنیا پرستی میں اس طرح محو ہوئے، کہ سعادت و کامرانی کی جگہ ذلت و خواری اور خدا کی رحمت کے بجائے اس کے غضب کا اپنے کو مستحق بنا لیا، اللہ کی طرف سے سرخ روئی اور کامرانی کے جو مواقع اُن کو عطا کئے گئے، وہ ان کو ضائع کرتے رہے، اُن کی ہدایت و اصلاح کے لئے پیغمبر بھیجے گئے، اور سب سے آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، مگر انھوں نے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا، اور وہ امامت و شہادت کے اس منصب جلیل سے معزول کر دئے گئے، جس پر ان کو مامور کیا گیا تھا۔

ضربت علیھم الذلۃ اینما	ان پر ذلت چپکا دی گئی، خواہ کہیں
ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل	بھی پائے جائیں، سوائے اس کے
من الناس وباؤ بغضب	کہ اللہ کا کوئی عہد ہو یا لوگوں کا
من اللہ وضربت علیھم	کوئی عہد ہو، اور وہ اللہ کا غضب
المسکنۃ ذلک بانھم کانوا	لے کر لوٹے، اور ان پر پستی چپکا دی
یکفرون بآیات اللہ ویقتلون	گئی، یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی
الانبیاء بغیر حق ذلک بما عصوا	آیتوں کا انکار کرتے تھے، اور پیغمبروں
وکانوا یعتدون ۔	کو بلا وجہ قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ
(آل عمران : ۱۱۲)	سے کہ انھوں نے نافرمانی کی، اور
	حد سے بڑھ جاتے تھے۔

یہود کی اسی مغضوبیت کی بنا پر خدا نے مسلمانوں کو ان سے ترک موالات کی تعلیم دی ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تتولوا	اے ایمان والو! ان لوگوں کو

قوماً غضب اللہ علیہم،	دوست نہ بناؤ جن پر اللہ تعالیٰ
(ممتحنہ ۱۳)	کا غضب نازل ہوا ہے۔

اور ان منافقین کا نہایت تحقیر سے ذکر کیا گیا ہے، جو یہود سے دوستی کی پینگیں بڑھائے ہوئے تھے،

الم تر الی الذین تولوا قوماً	کیا ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے
غضب اللہ علیہم،	ایسے لوگوں کو دوست بنایا جن پر
(مجادلہ ۱۴)	خدا کا غضب ہوا ہے۔

مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ	خداوندا! ہم کو سیدھا راستہ چلا
صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے
غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَ	انعام کیا ہے، نہ ان کا جن پر غضب
لَا الضَّالِّينَ، (فاتحہ)	ہوا ہے،

خود توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی ناشکری اور انبیاء کو جھٹلانے اور قتل کرنے کی بنا پر بار بار خدا کے غضب اور اس کی لعنت کا نشانہ بنے۔

"انھوں نے ایسی شرارتیں کیں کہ جن سے خداوند کو غصہ دلایا، کیونکہ انھوں نے بت پوجے، باوجودیکہ خدا نے انھیں کہا تھا کہ تم یہ کام نہ کیجیو...... اور اپنے تئیں بیچ ڈالا کہ خداوند کے حضور بدکاریاں کریں، کہ اسے غصہ دلاویں، ان باتوں سے خداوند بنی اسرائیل پر نپٹ غصہ ہوا"[1]

---

[1] سلاطین ۲: ۱۷-۱۲، ۱۸

زبور میں ہے :-

"خداوند نے سنا اور نہایت غصہ ہوا، اس لئے یعقوب میں ایک آگ بھڑکائی اور اسرائیل پر قہر بھی اٹھا کیونکہ انھوں نے خدا پر اعتماد نہ کیا، اور اس کی قیامت پر اعتماد نہ رکھا" [1]

بنی اسرائیل کی تاریخ بھی گواہ ہے کہ اُن پر بار بار خدا کا قہر و غضب نازل ہوتا رہا، کبھی ان میں باہم شدید خانہ جنگی اور سخت خون ریزی ہوئی، کبھی دوسری قوموں نے اُن کو پرغمال بنایا، مثلاً نازیوں کی یہود دشمنی تو ابھی کل کی بات ہے، آگے مزید تفصیل آئے گی،

ذلت و نکبت | یہود کی مسلسل ناشکری، آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور دوسری نافرمانیوں کی بنا پر ذلت و خواری، اور کم حوصلگی و پست ہمتی، ان پر مسلط کر دی گئی جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے:

"گو یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے، لیکن اہلِ تحقیق کا اتفاق ہے کہ یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں، وہاں کی آبادی میں انہی کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے" (ج ۱۰، ص ۱۵۰)

قرآن نے ایک جگہ مسلمانوں کو یہود کی اسلام دشمنی کی وجہ سے ہراساں اور پست ہمت ہونے سے روکا ہے، اور بتایا ہے کہ یہ اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوجود تمھارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے، اسی ضمن میں اُن کی ذلت و نکبت کا یوں ذکر کیا ہے،

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ

ان پر ذلت چپکا دی گئی، خواہ وہ کہیں بھی پائے جائیں، بجز اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی سہارا ہو

---

[1] زبور ۷۸، آیت ۲۱ تا ۲۲

وضربت عليهم المسكنة	یا لوگوں کی طرف سے، اور وہ اللہ
ذلك بأنهم كانوا يكفرون	کا غضب لے کر لوٹے، اور ان پر
بآيات الله ويقتلون الأنبياء	چپکا دی گئی پستی، یہ اس سبب سے کہ
بغير حق ذلك بما عصوا و	وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے
كانوا يعتدون،	اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ
(آل عمران: ۱۱۲)	اس سبب سے ہوا کہ وہ حد سے بڑھ
	جاتے تھے،

"اینما ثقفوا" کے الفاظ سے یہود کی ذلت و پستی کی ہمہ گیری ظاہر ہوتی ہے، اب ان کے لئے عزت و سربلندی کی صرف یہی راہ ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل کو بدلیں اور خدا کا دامن تھام لیں یا کسی انسانی گروہ کے زیر حمایت آجائیں، لیکن یہ سہارے بس عارضی اور وقتی ہیں، موجودہ اسرائیلی حکومت بھی امریکہ وغیرہ طاقتور حکومتوں کی بدولت قائم ہوئی ہے، دوسری جگہ ان کی ابدی ذلت وخسران اور دائمی رسوائی کا اس طرح ذکر ہوا ہے،

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ	اور یاد کرو جب تیرے خداوند نے فیصلہ
عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ	کیا کہ وہ روز قیامت تک ان پر
يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ	ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو
رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَ	ان کو سخت عذاب چکھاتے رہیں گے
إِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ	بے شک تیرا خداوند جلد پاداش
	دینے والا اور بے شک وہ بخشنے والا
(اعراف: ۱۶۷)	مہربان ہے،

یہ تنبیہ خدا کا ہی بنی اسرائیل کو آٹھویں صدی قبل مسیح سے مسلسل کی جا رہی تھی، خود ان کے صحف و اسفار میں ہے:۔

"اور اگر تم میرے سننے والے نہ ہو، اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو، ...... اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا، ...... اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا، اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کئے جاؤ گے، اور جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں، تم پر حکومت کریں گے" (احبار ۲۶: ۱۴-۱۷)

"تیرے بیٹے اور بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی، اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی، اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا" (استثناء ۲۸: ۳۲)

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی ہر دور میں عملاً تصدیق ہوتی رہی ہے، اس کے ثبوت کے لئے یہود کی تاریخ کے بعض واقعات آگے نقل کئے جائیں گے۔

رہی یہ بات کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ، امریکہ اور روس نے عربوں کے علی الرغم اقوام متحدہ میں تجویز منظور کرا کے اسرائیلی حکومت قائم کرا دی اور پھر ۱۹۶۷ء میں ان ہی کی امداد سے اس کو کچھ مزید کامیابی حاصل ہوئی، اور عربوں کے مزید علاقے اس کے قبضہ میں آگئے تو اس سے کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اب بھی اسرائیلی حکومت کی بقا امریکہ کی سرپرستی کی بدولت ہے، دیکھئے یہ سہارا کب تک باقی رہتا ہے؟ جیسا کہ ابھی اوپر گذرا ہے، کہ یہود کو لوگوں کے سہارے اور انسانی گروہ کے زیر حمایت کچھ موقع مل سکتا ہے، (وحبل من الناس)

لعنت اور پھٹکار | لعنت ذلت سے دھتکارنے یا رحمت الٰہی سے دور کرنے کا نام ہے، رحمت الٰہی سے دوری کے بعد آدمی کی حیثیت اس درخت کی طرح ہو جاتی ہے، جس کی جڑیں کٹ گئی ہوں،

اب اسے کتنا ہی پانی دیا جائے مگر سرسبزی و شادابی ممکن نہیں ہے، کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی زیادہ سخت ہے، جو اسے فنا کر دے، لعنت کے بعد وہ قوم زندہ تو رہتی ہے مگر اس کی زندگی صرف ذلت و خواری کی ایک داستان عبرت ہوتی ہی

قرآن نے جابجا یہود کی اس حالت کا ذکر کیا، اور اسی کے ساتھ ان اسباب کا ذکر بھی کیا ہو جن کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق ہوئے تھے، ملاحظہ ہو۔

وقالوا قلوبنا غلف بل لعنهم الله	اور یہود کہتے ہیں کہ ہمارے دل بند ہیں
بکفرهم فقلیلاً ما یؤمنون	(نہیں) بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی
(بقرہ ۱۱ ـ ۸۸)	وجہ سے لعنت کر رکھی ہے، سو وہ بہت
	تھوڑا ایمان رکھتے ہیں،

وہ نہایت فخر سے کہتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواہ کچھ کہیں اور کریں ہم پر اثر نہیں ہو سکتا ہے، ہمارے دل غلاف کے اندر ہیں اس لئے گرد و غبار اور خس و خاشاک سے محفوظ ہیں، قرآن نے کہا کہ ضد اور ہٹ دھرمی سے حق کو قبول نہ کرنا کوئی قابل قدر بات نہیں ہے۔

ولما جاءهم کتاب من عند الله	اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے
مصدق لما معهم وکانوا	ایک کتاب آگئی جو مطابق ہے، اس
من قبل یستفتحون علی الذین	چیز کے جو ان کے پاس ہے (پہلے سے)
کفروا فلما جاءهم ما عرفوا	موجود ہے، اور اس کے پہلے وہ خود
کفروا به فلعنة الله علی الکافرین	کافروں پر فتح چاہتے تھے نیکن جب
(بقرہ ۱۱ ـ ۸۹)	ان کے پاس وہ آگئی جسکو خوب جانتے تھے

[illegible] لعنت ہو

ایک جگہ ان کے بینات و ہدی کو چھپانے کا انجام یہ بتایا گیا ہے،

ان الذین یکتمون ما انزلنا	بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو
من البینات والھدی من بعد	جو ہم کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں
ما بیناہ للناس فی الکتاب	سے نازل کر چکے ہیں بعد اس کے کہ
اولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم	ہم اسے لوگوں کے لئے کھول کر بیان
اللاعنون	کر چکے ہیں کتاب میں یہی وہ لوگ ہیں
(بقرہ - ۱۵۹)	کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت
	لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں

"لاعنون" کی وضاحت دوسری جگہ اس طرح کی گئی ہے :-

اولٰئک جزاؤھم ان	یہی وہ لوگ ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ
علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ	ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سارے
والناس اجمعین	انسانوں کی لعنت ہوتی ہے،

(آل عمران - ۸۷)

گویا وہ صرف اللہ کی لعنت ہی کے نہیں بلکہ ملائکہ اور ساری خلقت کی لعنت کے سزاوار ہیں، اس لئے کہ اللہ نے ان کو امامت و شہادت کے منصب پر مامور کیا تھا، اور ان کو کتاب و ہدایت کی نعمت بخشی تھی، اور ان سے عہد لیا تھا کہ وہ اس امانت کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کریں گے اور اس کو ان سے پوشیدہ نہ رکھیں گے، مگر انھوں نے اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کی اس لئے لوگ بھی ان کے لئے بد دعا کریں گے، اور خدا کی مخلوق کی بھی ان پر دھتکار پڑے گی۔

یہود کی دین حق سے بیزاری اور مسلمانوں سے بغض و نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ توحید کے بجائے شرک میں ملوث ہو گئے تھے، اور مشرکین کو مسلمانوں سے بہتر اور ہدایت یافتہ سمجھنے لگے تھے، کیا اس کے بعد وہ خدا کی رحمت سے دور کیے جانے اور لعنت و ملامت کئے جانے کے مستحق نہ تھے، فرمایا:-

اولٰئک الذین لعنهم الله	یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے
ومن یلعن الله فلن تجد له	اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم
نصیرا (نساء - ۵۲)	ان کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔

تورات بھی ان کی ملعونیت کے ذکر سے بھری ہوئی ہے ملاحظہ ہو:-

"لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہوگا کہ اس کے سارے فرمانوں اور حکموں پر جو آج کے دن تجھے بتاتا ہوں دھیان رکھ کر عمل نہ کرے، تو ایسا ہوگا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی، اور تجھ تک پہنچیں گی تو شہر میں لعنتی ہوگا، اور تو کھیت میں لعنتی ہوگا، تیرا ٹوکرا اور کٹھرا لعنتی ہوگا، تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل، تیری گائے، بیل کی بڑھوتری، اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہو جائیں گے تو اندر آنے کے وقت لعنتی ہوگا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا، خداوند ان سارے کاموں میں جن میں تو کرنے کے لئے ہاتھ لگا دے، تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کرے گا، یہاں تک کہ تو ہلاک ہوگا، اور جلد نابود ہو جائے گا، تیرے عملوں کی برائی کے باعث جن کے سبب تو نے مجھے ترک کیا، خداوند ایسا کرے گا کہ وبا تجھ سے لپٹی رہے گی" (استثناء باب ۲۸ - ۱۵ - ۲۰)

"دیکھو میں آج کے دن تمہارے آگے برکت اور لعنت رکھ دیتا ہوں، برکت جب کہ

تم خداوند اپنے خدا کے حکموں کو جو آج میں تمہیں فرماتا ہوں، مانو، اور لعنت جب کہ خداوند اپنے خدا کی فرمانبرداری نہ کرو، اور اس راہ سے جس کی بابت آج میں تمہیں فرماتا ہوں پھر کے غیر معبودوں کی پیروی کرو جنہیں تم نے نہیں جانا۔" (استثنا باب ۱۱: ۲۹-۲۸)

قرآن مجید نے یہود پر حضرت داؤد اور حضرت مسیح کی لعنت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:-

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ	بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا
اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ	ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان
وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا	سے لعنت ہوئی، یہ اس وجہ سے کہ انہوں
عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ،	نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ
(مائدہ: ۷۸)	جایا کرتے تھے،

لیکن اس کا مقصد صرف ان دو نبیوں کی لعنت کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ حضرت داؤد سے لے کر حضرت مسیح تک ہر ہر نبی نے ان پر لعنت کی ہے، کیونکہ خود تورات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیاء نے ان پر لعنتیں بھیجی ہیں، قرآن نے ابتداء و انتہا کے دو نبیوں کا نام محض اختصار کی وجہ سے لیا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کی اصل سیاسی عظمت کی ابتداء حضرت داؤد ہی کے زمانہ سے ہوئی تھی، اور حضرت مسیح اسرائیلی سلسلۂ نبوت کے آخری پیغمبر ہیں، اس لئے اول و آخر کے دو نبیوں کا نام لینے سے گویا تمام نبیوں کا ذکر ہو گیا ہے، یہاں اختصار کی بنا پر ان ہی دونوں پیغمبروں کی لعنتوں کو نقل کیا جاتا ہے،

"پر شریر کو خدا کہتا ہے تجھے میرے حکموں کے بیان کرنے سے کیا کام؟ کیوں اپنے منہ سے میرے عہد کا ذکر کرتا ہے، حالانکہ تو تربیت سے عداوت رکھتا ہے، اور

میرے کلام کو اپنے پیچھے پھینکتا ہے، جب تو چور کو دیکھتا ہے، تو اس سے راضی ہوتا ہے، اور زانیوں کا شریک ہوتا ہے، تو اپنا منہ شرارت پر چلاتا ہے اور زبان سے دغا کا منصوبہ باندھتا ہے، تو بیٹھے کے اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے اور اپنی ہی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے، تو نے یہ کام کئے، اور میں خاموش رہا، تو نے گمان کیا کہ میں تجھ ہی جیسا ہوں، پر میں تجھے ملامت کروں گا، اور تیرے کاموں کو تیری آنکھوں کے آگے ایک ایک کر کے دکھاؤں گا، اب اے خدا کے فراموش کرنے والو، اس کو سوچو، ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں پارہ پارہ کروں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔" (زبور ۵۰: ۱۶-۲۲)

حضرت مسیح کی لعنت و ملامت ملاحظہ ہو:۔

" اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس، تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو، کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے، تو اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بناتے ہو،...... اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پودینہ اور سونف اور زیرے پر تو دہ یکی دیتے ہو، پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے، لازم تھا کہ یہ بھی کرتے، اور وہ بھی نہ چھوڑتے، اے اندھے راہ بتانے والو، مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو، اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں، اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کر، تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں،

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے
مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح
کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی
دیتے ہو، مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم
پر افسوس کہ نبیوں کی قبریں بناتے ہو اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو،
اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں شریک
نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔۔۔۔
اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے، اس لئے دیکھو میں نبیوں کو
اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے تم بعض کو قتل کرو گے،
صلیب پر چڑھاؤ گے، اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے، اور شہر
بشہر ستاتے پھرو گے، تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا، تم پر
آئے، راست باز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے
تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا، میں سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ
اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔ اے یروشلم اے یروشلم تو جو نبیوں کو قتل کرتی ہے، اور
جو تیرے پاس بھیجے گئے، ان کو سنگسار کرتی ہے، کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی
اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے، اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں،
مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے، کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب
سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔" (متی ۲۳: ۱۴-۳۹)

(باقی)

ابن عبد ربہ

(۲)

از جناب جمیلہ شوکت صاحبہ لاہور، پاکستان

ہجو: اس کی ہجو بڑی سخت لیکن لطیف ہوتی ہے، وہ دوسرے شعراء کی طرح سوقیانہ ہجو نہیں کرتا، بلکہ منجھے ہوئے انداز میں اپنے مقابل پر طنز کرتا ہے، ایک دفعہ ابن عبد ربہ نے بادشاہ کے کسی درباری سے ایک قیدی رہا کروانے کے بارے میں سفارش کی لیکن اس نے انکار کر دیا اس پر اس نے فوراً طنزیہ اشعار لکھے [2]

مرثیہ نگاری: ابن عبد ربہ نے مرثیے صرف رشتہ داروں کے کہے ہیں، اس کے مرثیے گہرے غم و غمازی کرتے ہیں اور نہایت موثر اور درد انگیز ہوتے ہیں:

بليت عظامك والأسى يتجدد   والصبر ينفد والبكاء لا ينفد
يا غائبا لا يرتجى لإيابه   ولقاؤه دون القيامة موعد [1]

ترجمہ: تیری ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں لیکن میرا غم بار بار نیا ہوتا رہتا ہے، صبر ختم ہو گیا لیکن رونا ختم نہیں ہوا، اے غائب ہونے والے جس کی واپسی اور ملاقات کی اب قیامت کے دن کے علاوہ کبھی امید نہیں۔

غزل: ابن عبد ربہ نے غزل میں کثرت سے طبع آزمائی کی ہے، اس کے غزلیہ اشعار بڑے عمدہ اور لطیف ہیں اور اس کا انداز بیان بڑا پُرسوز اور احساسات بڑے نازک ہیں، غزل میں اس کے یہ اشعار بہترین سمجھے جاتے ہیں: [3]

صحا القلب إلا خطرة تبعث الأسى   لها زفرة موصولة بحنين
بلى ربما حلت عرى عزماته   سوالف آرام واعين عين

---

۱ العقد ۱: ۱۸۴، ۲ العقد ۳: ۱۸۴، یتیمۃ الدہر ۲: ۷۰، ۳ العقد ۴: ۲۱۰

ترجمہ ۱. دل ہوش میں آگیا، لیکن ابھی ایک احساس ہے جو تم کو ابھارتا ہے اور ایک بیم آتا ہے جس کے ساتھ ایک شدید خواہش ہے۔

۲. یہ نہیں بلکہ بسا اوقات اس کے مضبوط ارادوں کی گرہوں کو سفید ہرنوں کی گردنوں کے پہلوؤں اور بڑی آنکھوں والی گایوں نے ڈھیلا کر دیا ہے۔

ایک دفعہ ابن عبد ربہ کو اپنے محبوب کے کوچ کرنے کا علم ہوتا ہے تو بہت غمگین ہوتا ہے، اتفاق سے بارش ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے سفر ملتوی کرنا پڑتا ہے، اس موقع پر وہ یہ اشعار کہتا ہے:

هلا ابتكرت لبين انت مبتكر　　　هيهات يأبى عليك الله والقدر

مازلت ابكي حذار البين ملتهفا　　　حتى رثالي فيك الريح والمطر

ترجمہ: ۱. صبح سویرے ہی کیوں نہ بیدار ہو گیا، اس جدائی کے لئے جو تجھے صبح ہی کرنی تھی، افسوس کہ اللہ اور تقدیر نے تجھے اس کی اجازت نہ دی تھی۔

۲. میں جدائی کے خوف سے برابر روتا رہا، یہاں تک کہ تیرے معاملہ میں ہوا اور بارش کو بھی مجھ پر ترس آگیا۔

<u>وصف نگاری</u> | ابن عبد ربہ کو وصف نگاری میں ید طولیٰ حاصل تھا، وہ قدرتی مناظر، جنگ وجدال، سامان حرب، گھوڑوں وغیرہ کی نہایت عمدہ تصویر کشی کرتا ہے اور پھر اس کے خوبصورت استعارے شعر کو اور زیادہ لطیف بنا دیتے ہیں۔ باغ کی تعریف میں اس نے جو اشعار کہے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

ومدمنة بالحزن حاك لها الندى　　　برودا من الموشي حمر الشقائق

يقيم الدجى اعناقها ويميلها　　　شعاع الضحى المستن في كل شارق

ترجمہ ۱. اس کو [illegible] کتنا خوبصورت باغ ہے جس کے لئے شبنم کے پھولدار کپڑے کو سرخ

سوسن کے پھولوں سے بنا ہے۔

۲۔ تاریکی ان کی گردنوں کو سیاہ کر دیتی ہے، لیکن دوپہر کی تیز شعاعیں انھیں ہر صبح چمکا دیتی ہیں

زہدیا| ابن عبد ربہ کو زمانۂ شباب میں غزل گوئی میں کمال حاصل تھا، لیکن زندگی کے آخری ایام میں اس نے زہد و تقوی کو اپنی شاعری کا موضوع بنالیا، اس طرح اس نے اپنے ان اشعار سے اپنی زندگی کے داغ کو دھونا چاہا جو اس نے زمانۂ شباب میں گزاری تھی، جوانی میں اس نے کہا تھا:

هلا ابتكرت لبين انت مبتكر الخ

بڑھاپے میں اسی وزن اور قافیے میں یہ اشعار کہے:

ماذا الذی بعد شیب الرأس تنتظر | یا قادرا لیس یعفو حین یقتدر
هلا ابتكرت لبین انت مبتكر[1] | انت المقول له ما قلت مبتدئا

۱۔ اے وہ قدرت رکھنے والے کہ جو معاف نہیں کرتا جب تجھے قدرت حاصل ہوتی ہے،

میرے سر کے بال سفید ہو جانے کے بعد تو کس چیز کا منتظر ہے۔

۲۔ تو ہی وہ ہے جس کے بارے میں میں نے شروع میں کہا تھا: هلا ابتكرت الخ

تشبیہات| ابن عبد ربہ کی تشبیہات نہایت اچھوتی اور عمدہ ہوتی ہیں، اس نے تشبیہات میں متقدمین کی اتباع کے ساتھ جدت بھی پیدا کی ہے، اس کے اس شعر میں بڑی خوبصورت تشبیہ ہے:

كما جرى ذهب فی صفحتی ورق[2] | بیضاء یحمر خداها اذا خجلت

وہ سفید رنگ کی عورت جب شرماتی ہے تو اس کے رخسار ظاہر ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ چاندی کی طشت کے دونوں اطراف میں سونا بہہ رہا ہے۔

بیانیہ شاعری| ابن عبد ربہ کو بیانیہ شاعری میں بھی ملکہ حاصل تھا، گر اس سے پہلے عبداللہ بن معتز

[1] مطمح ۵۲، یاقوت، ۲: ۳۲ [2] العقد، ۷: ۱۰۹

(م ۲۹۶ھ)[1] نے بھی اس طرز پر اشعار کہے تھے لیکن وہ زیادہ طویل نہ تھے، ابن عبد ربہ نے عبد الرحمان الناصر کے عہد کی تاریخ ایک ارجوزہ میں قلمبند کی، لیکن اس کی یہ شاعری موضوع کی خشکی، خیال کی کمزوری اور رزمیہ شاعری کے اصولوں سے دوری کی بنا پر بیانیہ شاعری سے زیادہ معلمانہ و ناصحانہ شاعری کی حیثیت رکھتی ہے[2]۔ اس کا یہ طویل ارجوزہ العقد میں چھپا ہوا ہے[3]۔

موشحات ابن عبد ربہ نے موشحہ کے طرز پر لوک گیت بھی لکھے، بقول علامہ ابن خلدون اس فن کا موجد مقدم بن معافر الفریری تھا، جو امیر عبد اللہ بن محمد المروانی کے دور کا نامور شاعر تھا، ابن عبد ربہ نے اس سے یہ فن سیکھا، لیکن افسوس دونوں میں سے کسی کا موشح ہم تک نہیں پہنچ سکا[4]، شاعری کی یہ صنف اندلس اور مشرق میں نہایت مقبول ہوئی۔

العقد الفرید ابن عبد ربہ نے العقد الفرید جیسی بیش قیمت کتاب تالیف کرکے ادب عربی کی گراں مایہ خدمت انجام دی ہے، بقول جرجی زیدان[5] یہ کتاب اس زمانے کا دائرۃ المعارف یعنی تمام علوم کا مخزن ہے، اس میں بہت سی مفید باتیں، متفرق مسائل، مختلف واقعات، انساب، امثال، طب، موسیقی، شعر و شاعری، تاریخ و جغرافیہ کے متعلق معلومات جمع کردی گئی ہیں اس نے صرف عربوں کی تصانیف پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ یونانی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کے تراجم سے بھی استفادہ کیا ہے، مصنف نے اپنی کتاب کو پچیس[6] ابواب میں

---

[1] عبد اللہ ابن المعتز اور ابن عبد ربہ کے ارجوزوں کا مطلع یوں ہے:

الحمد للہ علی آلائہ　　احمدہ والحمد من نعمائہ　　(دیوان ابن المعتز)

فالحمد للہ علی اغمائہ　　حمداً جزیلاً علی نعمائہ　　(العقد ۵، ۲۲۵)

[2] زیات، ۳۱۸　[3] العقد، ۵: ۲۲۵ ، ۲۳۶　[4] مقدمہ ابن خلدون، ۴، ۵

[5] جرجی زیدان، ۲، ۴۲۔

تقسیم کیا ہے، پھر اس نے تمام مواد ہار کے موتیوں کی طرح مرتب کیا ہے، اور ہر "باب" کے نام کسی قیمتی پتھر یا جوہر پر رکھا، درمیانی یعنی تیرھویں باب کا نام "الواسطہ" (یعنی درمیان کا موتی) رکھا ہے، اس کے بعد بالترتیب "الثانیہ" کی زیادتی کے ساتھ وہی نام ہیں جو پہلے بارہ ابواب کے ہیں، یاقوت نے ان ابواب کی ترتیب کچھ مختلف بتائی ہے۔[۱]

مؤلف نے ابواب باندھنے اور مضامین کو ترتیب دینے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ پہلے اس باب کی غرض و غایت بتاتا ہے پھر اس موضوع پر بہترین مواد جمع کرکے اسے عمدہ طریقے سے ترتیب دیتا ہے۔

تالیف کا مقصد: ابن عبد ربہ نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کا ارادہ کیا جس میں ہر علم اور ہر فن پر نادر معلومات فراہم ہوں، وہ خود کہتا ہے: میں نے اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں کا جملہ فنون متفرق و منتشر ہیں، چنانچہ میں نے پیش نظر کتاب میں عوام و خواص کی نادر باتوں کو جمع کر دیا ہے۔[۲]

العقد الفرید مرتب کرتے وقت اس نے ابن قتیبہ کی معرکہ آرا تصنیف عیون الاخبار کا تتبع کیا ہے، اس کے علاوہ اس نے اصمعی، ابو عبید اور جاحظ وغیرہ کی تصانیف اور قرآن، حدیث تورات اور کتب متقدمین سے بھی استفادہ کیا ہے، بعض مواقع پر وہ دوسرے مصنفین کے پورے ابواب مثلاً کتاب الکامل کا باب الخوارج من و عن نقل کر جاتا ہے۔ لیکن عموماً وہ نوادر کو منتخب کرکے انھیں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔[۳]

ترتیب و تبویب میں جو مشکلات اسے پیش آئیں، اس کا اظہار یوں کرتا ہے:

---

[۱] یاقوت نے ۲۲ ویں باب کی جگہ ۲۰ ویں باب کو اور ۲۵ ویں باب کی جگہ ۲۳ ویں باب کو دی ہے (معجم

[۲] العقد ۱ : ۲ [۳] العقد ۱ : ۳ ۔

واختیار الکلام اصعب	کلام کا انتخاب کرنا مستقل تالیف سے
من تالیفہ[1] -	زیادہ دشوار ہے۔

ابن عبد ربہ کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ وہ جو کچھ انتخاب کرے عام سطح سے بلند اور علمی و ادبی لحاظ سے ارفع ہو تاکہ لوگ اسے عامی یا سوقی نہ سمجھیں، غالباً نوادر کے انتخاب میں اس کے سامنے افلاطون کا یہ نظریہ بھی تھا:

عقول الناس مدونة فی	لوگوں کی عقلیں ان کے اقلام اور
اطراف اقلامھم وظاھرۃ فی	تحریروں میں مدون ہوتی ہیں اور ان کے
حسن اختیارھم[2]	حسن انتخاب سے وہ نمایاں ہوتی ہیں۔

گویا کہ اس نے تمام معلومات کا انتخاب :

الذین یستمعون القول فیتبعون	جو لوگ بات کو توجہ سے سنتے ہیں
احسنہ[3]	پھر عمدہ کو اختیار کرتے ہیں۔

کے مطابق رطب و یابس کو چھوڑ کر ہر عالم کے بہترین کلام کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

اس انتخاب اور حسن ترتیب نے لوگوں کو اس کا مداح بنایا ہے اور اسے اس کی اس کتاب ہی نے شہرت دوام بخشی ہے، ادب عربی ابن عبد ربہ کا ممنون ہے کہ اس نے یہ عمدہ کتاب پیش کر کے عربی ادب کی گراں مایہ خدمات سرانجام دی ہیں، لہٰذا ہر دور کے ادبا اور نقاد اسے عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں، ابن الفرضی اسے شاعر الاندلس و ادیبہا بتاتا ہے[4]، فتح بن خاقان حجۃ الادب[5] کے نام سے یاد کرتا ہے، ضبی کہتے ہیں:

---

[1] العقد ۱ : ۲ [2] ایضاً [3] القرآن ۳۹ : ۱۹ [4] ابن الفرضی ۱ : ۳۷ [5] مطمح، ۵۱۔

علم والادب والنظر ... صاحب علم و ادب و نظر تھا۔

ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں:

احد محاسن الاندلس علما وفضلا ونبلا[2] | وہ علم و فضل اور شرافت کے لحاظ سے اندلس کے بہترین لوگوں میں تھا۔

کتاب کی اہمیت | العقد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن عبد ربہ کا میلان مزاح اور ظرافت کی طرف زیادہ تھا، چنانچہ اس نے مزاح کے لئے ایک مستقل باب وقف کیا ہے، جس کے آغاز میں وہ کہتا ہے:

هی نزهة النفس وربیع القلب | یہ نفس کی سیرگاہ، قلب کی فصل بہار،
ومرتع السمع ومجلب الراحة | کان کی چراگاہ، اور راحت و سرور کا خزانہ
ومعدن السرور، فان | ہے، کیونکہ قلوب جب تھک جاتے
القلوب اذا کلت عمیت[3] | ہیں، تو اندھے ہو جاتے ہیں۔

پھر اپنے اس قول کی تائید میں احادیث بھی بیان کرتا ہے، مثلاً:

روحوا القلوب ساعة بعد ساعة[4] | دقتاً فوقتاً قلب کو فرحت و تازگی بخشو۔

اس کے علاوہ وہ قصے کہانیاں بھی بیان کرتا ہے، مثلاً دارۃ جلجل کا واقعہ[5]، شریح الغوانی کا قصہ وغیرہ، ان کے علاوہ وہ الف لیلۃ و لیلۃ کے قصے بھی بیان کرتا ہے، ابن عبد ربہ پہلا شخص ہے جس نے مختلف دور کے قصے کہانیوں کو ایک کتاب میں مدون کیا، اسی طرح وہ نوادر وغیرہ کا بھی ذکر کرتا ہے، اگر مزاح کا پہلو اس کی کتاب کے اکثر ابواب میں غالب ہے، لیکن اس کے

---

[1] البغیۃ، ۱۳۶ [2] یتیمۃ الدہر ۲: ۶۵ [3] العقد ۸، ۶: ۸۱ [4] الجامع الصغیر ۲: ۲۱؛ العقد الفرید ۸: ۸۱ [5] العقد، ۸: ۹۱ [6] العقد، ۸: ۹۳۔

ساتھ ہی ہر باب جس کا بنیادی مقصد علمی وادبی تھا ، ابن عبدربہ اپنی کتاب میں مختلف علوم وفنون جمع کرنے کی غرض بھی بتاتا ہے کہ وہ ایک ادیب کی حیثیت سے اس کو ایک ادبی شہ پارہ بنانا چاہتا ہے ، وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں ابن قتیبہ کا یہ قول نقل کرتا ہے :

ومن اراد ان یکون ادیبا	جو ادیب ہونا چاہے تو اس کو علوم میں
فلیتفنن فی العلوم[۱]	مہارت حاصل کرنی چاہئے ۔

اسی ادبی مقصد کے پیش نظر وہ اکثر روایات بیان کرتے ہوئے اسناد حذف کر جاتا ہے ، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے :

اخبار ممتعۃ وحکم ونوادر	دلچسپ خبروں اور دانش کی حکمتوں کو متصل
لا ینفعہا الاسانید باتصالہ ولا	سندوں سے بیان کرنے میں فائدہ نہیں اور ان کی
یضرہا ما حذف منہا[۲]	سندیں حذف کرنے میں کوئی نقصان نہیں ۔

وہ طویل و بسیط کہانیوں اور روایات کو نہایت مختصر انداز میں بیان کرتا ہے[۳] ، اس طرح ابن عبدربہ اپنے سے پہلے کے مصنفین سے کئی لحاظ سے مثلاً اختصار ، تبویب ، سہولت الفاظ اور مافی الضمیر کے اظہار میں سبقت لے گیا ، اس کا ادبی مقصد کتاب کے ابواب پر نظر ڈالنے ہی سے نمایاں ہوتا ہے ، جو علمی وادبی فوائد کا خزینہ ہیں ۔

تاریخی اہمیت | یہ کتاب ایک قسم کا دائرۃ المعارف یعنی انسائیکلوپیڈیا ہے ، جس میں اس وقت کے تمام مروجہ علوم کو جمع کر دیا گیا ہے ، اس کا شمار قدیم مصادر میں کیا جاتا ہے ، اس سے عربوں کے اجتماعی ، سیاسی ، معاشی اور ادبی حالات کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کے مطالعہ سے بعض ایسی نادر کتابوں کا بھی علم ہوتا ہے جو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئی ہیں ، مثلاً بقول قلقشندی ابو عبیدہ کی

---

[۱] العقد ۲ : ۹۵ [۲] العقد ۱ : ۲ [۳] العقد ۱ : ۳

کتاب الامثال کا اکثر و بیشتر حصہ اس میں نقل کر دیا گیا ہے[۱]، اسی طرح الشیبانی، التمیمی، المدائنی القتیبی وغیرہ کی روایات اس میں محفوظ ہیں، جرجی زیدان کتاب کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں بعض ایسے تاریخی واقعات ملتے ہیں جو دوسری تاریخ کی کتابوں میں ناپید ہیں، مثلاً زیاد، حجاج اور آل ابی طالب کے حالات بڑی شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں، اور بقول اس کے،

وهو من امهات كتب الادب الموثوق بها[۲] — وہ ادب کی قابل اعتبار کتابوں میں ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے العقد میں ایک نقص ضرور نظر آتا ہے، وہ یہ کہ مؤلف اسناد پر توجہ نہیں دیتا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ کتاب کا اصل مقصد ادبی ہے، لہٰذا یہ عیب زیادہ قابل التفات نہیں رہتا، دوسری چیز جو بطور مورخ اس کے رتبہ کو کم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ابن عبد ربہ خبریں بیان کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیتا، ایک موقع پر لکھتا ہے کہ یزید اپنے باپ معاویہ کی وفات کے وقت اس کے پاس تھا، لیکن دوسری جگہ اس سے انکار کرتا ہے[۳]۔

علوم دینیہ کے آخذ کے اعتبار سے بھی العقد الفرید بڑی اہمیت کی حامل ہے، وہ فقہا اور ائمہ کے اقوال و فتاوی کا ذکر، نیز دیگر شرعی امور میں ان کے اختلافات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، اس کے علاوہ قرآن مجید کی بعض آیات اور احادیث نبوی کی تفسیر بھی بیان کرتا ہے۔

زمانۂ تالیف | العقد کے زمانۂ تالیف کی صحیح تعیین ایک مشکل امر ہے، لیکن بعض شواہد سے

۳۲

۱۔ صبح الاعشی ج ۱ ص ۲۹۳ ۲۔ جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغة العربیہ ج ۲ ص ۲۰۶ ۳۔ العقد ۱۲۱:۱۴، العقد ۱:

پتہ چلتا ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنی زندگی کے آخری ایام اور غالباً ۳۲۲ھ میں تصنیف کی، کیونکہ اس نے عبد الرحمٰن کے عہد کے حالات کے بارے میں جو ارجوزہ لکھا ہے، اس میں ۳۲۲ھ تک کے حالات مذکور ہیں، لیکن مؤلف خود ۳۲۸ھ تک زندہ رہا۔ اگر اس بات کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی کتاب میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا۔ اس کا ثبوت اس سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ وہ عبد الرحمٰن الناصر کو "الناصر لدین اللہ" اور "امیر المومنین" کے القاب سے یاد کرتا ہے[1] اور یہ خطابات اسے ۳۱۶ھ میں عطا ہوئے۔

العقد میں رد و بدل | دوسری کتابوں کی طرح العقد میں بھی مؤلف کی موت کے بعد کچھ اضافے تکملے کے طور پر کئے گئے، جو ابن عبد ربہ ہی کی طرف منسوب ہیں، مثلاً کتاب "الیتیمۃ الثانیہ" میں بغداد کے چار عباسی خلفاء الراضی، المتقی، المستکفی، اور المطیع کا ذکر ہے، حالانکہ ان چاروں نے ۳۲۸ھ کے بعد وفات پائی[2]

کتاب کا نام | آج کل علمی حلقوں میں یہ کتاب العقد الفرید کے نام سے معروف ہے، لیکن بعض ناقدین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مؤلف نے اس کا نام العقد رکھا تھا اور صفت الفرید کا اضافہ بعد میں ہوا۔ سب سے پہلے اس خیال کا اظہار براکلمین نے کیا۔[3] دلیل میں وہ قدیم مصادر کو پیش کرتا ہے، جن میں الفرید کا لفظ مستعمل نہیں، حمیدی کہتا ہے: ولہ الکتاب الکبیر والمسمّی کتاب العقد فی الاخبار۔[4] ابن خاقان کہتا ہے: لہ التالیف المشہور الذی سمّاہ بالعقد،[5] یاقوت بھی اسے صاحب کتاب العقد فی الاخبار[6] کے نام سے یاد

---

1. Spanish Islam. P. 428 2. الراضی (۳۲۲ھ - ۳۲۹ھ) المتقی (۳۲۹ھ - ۳۳۳ھ) المستکفی (۳۳۳ھ - ۳۳۴ھ) المطیع (۳۳۴ھ - ۳۶۳ھ) 3. انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، P. 423 4. الحمیدی، 116 5. مطمح، 51 6. یاقوت، ۲: ۶۷۔

کرتا ہے، قلقشندی[۱] اور حاجی خلیفہ[۲] بھی اس کی کتاب کو العقد ہی کہتے ہیں، اب صرف ایک کتا المستطرف باقی رہتی ہے، جس میں مصنف کہتا ہے کہ میں نے اپنی اس کتاب میں اکثر حصہ العقد ا سے نقل کیا ہے[۳]، گو ہم صحیح وقت کی تعیین نہیں کر سکتے کہ کب العقد کے ساتھ صفت الفرید کا اضا ہوا ہے، لیکن بعض واقعات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نام وزیر شافعی کی تالیف العقد الفرید للملک الشعراء[۴] سے پہلے معروف نہ تھا اور ہمارے خیال میں صاحب مستطرف اگر پہلا شخص نہیں تو قدیم ترین شخص ہے جس نے اس کی کتاب کو العقد الفرید کہا ہے۔

اختصار | العقد الفرید کا اختصار دو دفعہ ہو چکا ہے، سب سے پہلے ابو اسحاق ابراہیم[۵] بن عبد الرحمٰ نے کیا، پھر ابن منظور[۶] صاحب لسان العرب نے، لیکن یہ دونوں ضائع ہو چکے ہیں، حال ہی میں مصر سے ایک مختصر ایڈیشن طبع ہوا ہے تاکہ نصاب میں شامل کیا جا سکے، یہ مختار العقد کے نام سے مشہور ہے، ۱۹۱۳ء میں مطبع جمالیہ سے شائع ہوا۔

بعد میں آنے والے ادبا نے العقد الفرید سے استفادہ کیا، ان میں سے ایک الابشیہی (م ۸۵۰ھ) صاحب المستطرف ہے، وہ مقدمہ میں کہتا ہے: نقلت کثیرا مما نقلہ بعید فی کتابہ[۷]. صاحب خزانۃ الادب نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ کتابیں جن سے اس نے فائدہ اٹھایا ان میں العقد بھی شامل ہے، اسی طرح ابن خلدون بھی اپنے مقدمہ میں اکثر العقد کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان کے علاوہ قلقشندی اور نویری نے بھی اس کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ان کے علاوہ متاخرین میں سے جنھوں نے نوادر پر کتب تالیف کیں، سب نے العقد الفرید پر اعتماد کیا ہے۔

---

[۱] صبح الاعشیٰ ۱ ؛ ۳۹۳، ۹، ۳۶۲ [۲] حاجی خلیفہ ۴، ۲۳۲ [۳] المستطرف [۴] حاجی خلیفہ ۳۰ ؛ ۲۳۲،

[۵] ابو اسحٰق م ۸۵۰ھ بغیۃ الوعاۃ ۱۸۲ [۶] ابن منظور م ۷۱۱ھ بغیۃ الوعاۃ ۱۰۶ [۷] المستطرف ۔۔ ۲۔

ابن عبد ربہ کی تصنیفات میں سے صرف العقد الفرید ہم تک پہونچی ہے، حمیدی نے ابن عبد ربہ کے اشعار کے بیس[۱] اجزاء دیکھے تھے[۱] لیکن وہ ہم تک نہیں پہونچے، اس کے علاوہ حاجی خلیفہ نے اس کی ایک اور کتاب الوفرة فی العلم والادب[۲] کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ کتاب بھی ہم تک نہیں پہونچی۔

طباعت | العقد الفرید متعدد بار قاہرہ سے چھپی، پھر ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۶ء مکتبہ صادر بیروت سے یہ کتاب چھپتی رہی، یہ ایڈیشن تینتیس اجزاء پر مشتمل ہے، کرم بستانی نے اسے شائع کیا ہے بہت سی اغلاط کو صاف کیا ہے، اور حواشی بھی دیئے ہیں۔

اس کے بعد محمد سعید العریان نے نہایت صحت و دقت نظر سے اس کتاب کو مطبعہ استقامہ سے شائع کیا، وہ اغلاط جو ابتدائی ایڈیشنوں میں نظر آتے ہیں، وہ کافی حد تک اس ایڈیشن میں صاف کر دیئے گئے ہیں، میں نے بھی اسی ایڈیشن پر انحصار کیا۔

۱؎ یاقوت ۲ : ۶۸ ۲؎ حاجی خلیفہ ۵ : ۳۰۲۔

لاہور کے علمی تحائف

از

(۲)

سید صباح الدین عبد الرحمن

معارف کے گذشتہ صفحات میں زیادہ تر ان مطبوعات کا ذکر آیا ہے، جو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہوئی ہیں، ابھی ذاتی کتابوں کا ذکر باقی رہ گیا ہے جن کی تفصیلات بیان کرنے میں کئی مہینے صرف ہوں گے، مگر خوشی اس کی ہے کہ یہ سلسلہ دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے اور تقاضا ہے کہ یہ ابھی جاری رہے، تاکہ سرحد کے اس پار کی علمی و ادبی سرگرمیاں معلوم ہوسکیں، جی تو چاہتا ہے کہ ان مطبوعات پر سیر حاصل ناقدانہ تجزیہ بھی ہو، مگر یہ ممکن نہ ہو سکے گا، کیونکہ پھر یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا، اس لئے آئندہ میری تحریر میں زیادہ تر تعارفی اور تاثراتی رنگ ہوگا۔

نقوش کا اقبال نمبر: لاہور میں رسالہ نقوش کے مدیر جناب طفیل صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، علامہ محمد اقبال کے جشن کی کارروائی کے موقع پر تو دو تین ملاقاتیں محض سرسری رہیں، مگر ان کی پہلی ملاقات ہی میں کشش اور جاذبیت محسوس ہوئی، انھوں نے اپنے یہاں ایک علمی مجلس بھی منعقد کی تھی، اصرار سے مجھ کو بھی بلایا تھا، مگر مجھ کو کراچی پہونچنے کی عجلت تھی، اس لئے اس میں شرکت نہ کر سکا، کراچی سے لاہور واپس آیا تو معذرت خواہ ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا، مگر وہ خود ملنے چلے آئے، میں جناب حکیم سعید دہلوی کی عنایت سے ہمدرد دواخانا کی شاخ لاہور میں مقیم تھا، وہیں ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ان کی صحیح عمر تو نہیں بتا سکتا مگر وہ پورے جوان نظر آئے، اسی کے ساتھ ایک مدیر کی حیثیت سے جہاں دیدہ، جہاں آشنا

جواں حوصلہ اور جواں دل بھی، جب وہ میرے سامنے بیٹھ کر سنجیدہ اور متین لہجہ میں باتیں کر رہے تھے، تو مجھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں ایک الٰہ دین کے پاس بیٹھا ہوں، جس کے پاس ایک طلسمی چراغ ہے، اسی سے وہ جن کو نکال کر اس کی مدد سے نقوش کے ضخیم خاص نمبر شائع کیا کرتے ہیں، انھوں نے اب تک جتنے خاص نمبر نکالے ہیں، ذرا ان کی تفصیلات سنئے:— (۱) غزل نمبر ۵۲۰ صفحے (۲) افسانہ نمبر دو جلدیں ۱۰۹۰ صفحات (۳) مکاتیب نمبر دو جلدیں ۱۰۲۸ صفحات (۴) طنز و مزاح نمبر ۹۸۰ صفحات (۵) لاہور نمبر ۱۲۰۴ صفحات (۶) ادب عالیہ نمبر ۱۲۷۲ صفحات (۷) آپ بیتی نمبر دو جلدیں ۱۹۶۴ صفحات (۸) شخصیات نمبر دو جلدیں ۱۵۱۴ صفحات (۹) خطوط نمبر تین جلدیں ۱۷۲۰ صفحات (۱۰) غالب نمبر تین جلدیں، ۱۰۵۶ صفحات (۱۱) اقبال نمبر تین جلدیں ۱۸۲۲ صفحات (۱۲) پطرس نمبر ۶۴۰ صفحات (۱۳) منٹو نمبر ۴۸۴ صفحات (۱۴) شوکت نمبر۔ ان کے علاوہ متعدد سالنامے اور خاص نمبر اور ہیں، ان خاص نمبروں کے صفحات کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ الٰہ دین کے چراغ کے جن ہی کے ذریعہ سے کاغذ بھی فراہم کر لیتے ہیں، کاتب بھی ان کو مل جاتے ہیں، اچھی چھپائی کا بھی انتظام ہو جاتا ہے، فرمے بھی آسانی سے موڑ لئے جاتے ہیں اور ان کی جزبندی بھی ہو جاتی ہے اور ان کو ان کے چراغ کا جن دردسر تک بھی ہونے نہیں دیتا، ورنہ ایک رسالہ کی کتابت و طباعت میں جو پریشانیاں ہوتی ہیں، ان کا اندازہ اس کا ایک مدیر ہی کر سکتا ہے، عام طور سے کسی کی قدر اس کی وفات کے بعد ہی کی جاتی ہے، مگر نقوش کے مدیر جناب طفیل صاحب نے اپنے اس رسالہ کے ذریعہ سے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کی قدر علمی و ادبی حلقہ میں برابر ہو رہی ہے، آئندہ ان پر مقالے اور شاید کتابیں بھی لکھی جائیں، کہ انھوں نے علمی خدمت کرنے کا ایک نیا جذبہ دیا، لگن پیدا کرنے کی راہ دکھائی، مشکل کام کو

آسان کرنے کا سلیقہ سکھایا، مضمون نگاروں کو اکسا کر ان کو مضامین لکھوانے پر آمادہ کرنے کا ڈھنگ بتایا۔ جب ان کے سارے خاص نمبروں پر ایک ساتھ نظر ڈالی جائے گی تو اس سے ہر شخص کو اتفاق ہوگا کہ انھوں نے علم و ادب اور فکر و فن کے جواہر پاروں کو سمیٹ سمیٹ کر خوب اچھی طرح بانٹنے کی کوشش کی ہے، اور جب بھی یہ پڑھے جائیں گے تو ان سے نظر و فکر کی جلا ضرور ہوگی۔

طفیل صاحب نے نقوش کے اقبال نمبر کی دو جلدیں خاص طور سے پیش کیں جو ۱۲۲۸ صفحات کی ہیں، ان کے علاوہ ایک جلد اور شائع کرنے والے تھے جو شاید اس وقت تک چھپ چکی ہوگی۔ ان میں اس برصغیر کے مقالہ نگاروں کے ۷۰ مضامین ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ ان میں وہ ساری چیزیں ہیں، جو پہلے سے معلوم تھیں اور وہ بھی ہیں جو اب تک معلوم نہیں ہو سکی تھیں۔ مضامین میں بڑا تنوع ہے، اقبال کی حیات، اقبال بارگاہ رسالت میں، اقبال چند عاشقان رسول کے حضور، اقبال اور روحانیت، اقبال کا نظام فکر، اقبال کا نظریۂ تاریخ، اقبال کا مثالی انسان، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، اقبال اور آرزوئے نایافت، اقبال کا تصور قرآنی، اقبال اور ملت اسلامیہ وغیرہ کے عنوانات سے اندازہ ہوگا کہ ان دو جلدوں میں کیا کیا چیزیں پیش نہیں کی گئی ہوں گی، میری نظر اس حصہ پر زیادہ گئی جس کی سرخی "اقبال جن سے متاثر ہوا" ہے، "متاثر ہوا" کے بجائے اگر "متاثر ہوئے" لکھا جاتا تو علامہ محمد اقبال کی پوری تعظیم کا بھی اظہار ہو جاتا۔ اس حصہ میں تین مضامین کو بہت شوق سے پڑھا، ایک تو ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ کا مضمون جو "اقبال اور ابن عربی" کے عنوان سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں توازن، تناسب اور اعتدال ہوتا ہے، یہ مضمون بھی اسی کا ایک نمونہ ہے، ڈاکٹر صاحب علامہ محمد اقبال کو

وحدت الوجود کا منکر ثابت کرتے ہیں، اس مسئلہ کے بہت بڑے حامی ابن عربی تھے، جن کی بہت سخت مخالفت بعض حلقوں میں کی گئی ہے، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ابن عربی کی مخالفت اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ ان کی مخالفت مختلف گوشوں سے ہوتی رہی ہے، بلکہ انھوں نے ابن عربی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال کو ابن عربی سے محض اس لئے اختلاف نہیں تھا کہ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے، بلکہ اس لئے تھا کہ ان کا نظام فکر یونانیت اشراقیت اور مجوسی اثرات کا مرکب ہے، ان کی زبان بھی رمزی ہے، جب وہ اس زبان کا استعمال قرآن کی تفسیر میں کرتے ہیں تو قرآن مجید کی روح کو نقصان پہونچتا ہے، ابن عربی کے نزدیک ہر شے کا ظاہر ہے اور ایک باطن بھی، چنانچہ ان کے نزدیک قرآن مجید کے الفاظ کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، بس یہیں سے علامہ اقبال کا ابن عربی سے اختلاف شروع ہوجاتا ہے، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ علامہ کا اختلاف ابن عربی سے محض وحدت الوجود کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ اس کشف خاص کو مسئلہ عام بنا دیا، اگر محض وحدت الوجود مدنظر ہوتی تو وہ حسین بن منصور حلاج کے بھی اتنے ہی مخالف ہوتے جتنے ابن عربی کے ہیں، مگر حلاج کے معاملہ میں وہ مثل قدیم صوفیہ کے اس لئے رواداری برتتے ہیں کہ اس کا اعلان انا الحق جذبۂ خاص سے نمودار ہوکر اس کی ذات تک محدود رہا۔

ڈاکٹر صاحب نے وحدت الوجود کے شہید اعظم منصور حلاج کا ذکر تو کر دیا ہے، لیکن علامہ محمد اقبال نے حلاج سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی زیادہ تفصیل نہیں لکھی ہے، اگر حلاج اور اس کے نعرۂ انا الحق سے متعلق علامہ محمد اقبال کی پوری رائے کا تجزیہ کیا جائے تو پھر یہ باور کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے مخالف تھے، گلشن راز جدید میں وہ یہ سوال کرتے ہیں :

کدامی نکتہ را نطق است انا الحق چہ گوئی ہرزہ بود آں رمز مطلق

اس کے جواب میں رمز انا الحق کی تشریح کرتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں :

بخودگم بہر تحقیق خودی شو انا الحق گوے و صدیق خودی شو

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی خودی کی تکمیل انا الحق ہی کے ذریعہ سے کرنا چاہتے تھے ،

جاوید نامہ میں حلاج کی نوا تو بہت گونجی ہے ، اس کی زبان سے علامہ اقبال کہتے ہیں :

نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

اور نظیری کا یہ مصرع بھی نقل کرتے ہیں :

کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

پھر حلاج کی یہ تصویر کھینچی ہے :

مرد آزادے کہ داند خوب و زشت می نگنجد روح او اندر بہشت

اس کے عشق کی یہ نوعیت بتائی ہے :

عشق آزاد و غیور و ناصبور در تماشائے وجود آمد جسور

عشق ما از شکوہا بیگانہ ایست گرچہ او را گریۂ مستانہ ایست

اس کی زندگی کی خلش کا لب لباب یہ بتایا ہے :

بے خلشہا زیستن نا زیستن باید آتش در تہ پا زیستن

زیستن ایں گونہ تقدیر خودی ست از ہمیں تقدیر تعمیر خودی است

یعنی آتش عشق ہی سے حلاج کی خودی کی تقدیر کی تعمیر ہوئی ، اس نے نار حیات میں جل کر

اسرار حیات بتایا :

من بخود افروختم نار حیات مردہ را گفتم ز اسرار حیات

اس کی زبان سے اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ایک گناہ کیا ، لیکن اسی گناہ کے ذریعہ

نور و نار کی خبر پہونچائی :

من ز نور و نار او دادم خبر   بندۂ حرم ! گناہ من نگر !

حلاج ہی کی زبان سے کہتے ہیں کہ بندگی کا راز الا اللہ ہی میں ہے :

کس ز سر عبدہٗ آگاہ نیست   عبدہٗ جز سر الا اللہ نیست

لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ   فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ

اس نعرہ کا اعجاز حلاج کی زبان سے یہ بتاتے ہیں :

اے خنک مردے کہ از یک ہوئے او   نہ فلک دارد طواف کوئے او

مگر ان کے خیال میں اس نعرہ کی خوبی یہ ہونی چاہئے :

وائے درویشے کہ ہوئے آفرید   باز لب بربست و دم در خود کشید

اس سلسلہ میں اقبال یہ بھی کہتے ہیں :

اگر فردے بگوید سرزنش بہ   اگر قومے بگوید ناروا نیست

مگر حلاج کی زبان سے بھی یہ ادا کرتے ہیں کہ :

چاک کن پیراہن تقلید را   تا بیاموزی از و توحید را

توحید کی انتہا ہی اسلامی وحدت الوجود ہے، بشرطیکہ اس میں خواہ مخواہ کی عیاشانہ ذہنی آمیزش نہ ہو۔ حلاج سے متعلق اقبال کے خیالات کا اندازہ ان کے اس شعر سے بھی ہوگا:

بود حلاجے بشہر خود غریب   جاں ز ملا برد و کشت او را طبیب

اور جو یہ کہہ گئے ہیں اس کے کیا معنی ہیں :

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند   بندۂ حق را بدار آویختند

منصور حلاج سے متعلق اقبال کے ان خیالات کے بعد یہ کیسے یقین کیا جائے کہ وہ وحدت الوجود کے

منکر تھے، پھر انھوں نے جو یہ کہا ہے : "

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست — درو پست و بلند و کاخ و کو نیست

زمین و آسمان و چار سو نیست — درین عالم بجز اللہ ہو نیست

اس میں وحدت الوجود ہی کی تو ترویج ہے، اردو میں بھی ان کے ایسے اشعار بہت ملیں گے

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو — پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ہو

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری — نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

خودگیری و خودداری و گلبانگ انا الحق — آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر — اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی — کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری — ترے بدن میں اگر سوز لا الٰہ نہیں

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور — اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

ایک جگہ تو تعریضاً اپنے متعلق یہ بھی کہہ گئے ہیں : ط

پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

علامہ اقبال نے اپنی کتاب تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں حلاج کے نعرہ انا الحق کو واردات باطن کے کمال کی معراج تصور کیا ہے، اور وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان الفاظ میں متکلمین کے لئے ایک چیلنج ہے۔ (انگریزی ایڈیشن ص ۹۶)۔

منصور حلاج اور انا الحق سے متعلق علامہ اقبال کی ان خیال آرائیوں کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے ذرا محل نظر ہو جاتی ہے کہ وحدت الوجود کے مسئلہ پر علامہ اقبال کے

فروخت کر رہا ہوں جس بھاؤ خریدے تھے، اب میں بھی اپنے بھائیوں کی طرح مہنگے داموں خرید کر کھاؤں گا، اس جذبۂ ایثار سے لوگ بے حد متاثر ہوئے، چند برس کے بعد ملک تقسیم ہوا اور پنجاب میں خون کے دریا بہنے لگے، مولوی رحمت اللہ صاحب اس وقت زندہ نہ تھے لیکن ان کا خلوص سب کو یاد تھا، حالات سے گھبرا کر جب ان کے لڑکوں نے ترک وطن کرنا چاہا تو گاؤں کے سارے غیر مسلم ان کے پاس آئے اور کہا آپ بالکل پریشان نہ ہوں، مولوی صاحب تو دیوتا تھے، کس کی مجال ہے کہ ان کے لڑکوں پر ہاتھ اٹھائے، اس گفتگو کے بعد لڑکے گاؤں میں اطمینان سے رہے، اور ساری غیر مسلم آبادی ان کی معاون و مددگار رہی۔

یہ سطور ابھی پریس نہیں گئی تھیں کہ مولوی عبدالحمید ندوی کے انتقال کی خبر ملی، وہ بارہ بنکی کے ایک گاؤں بھیکوپور کے رہنے والے تھے، بڑے مخلص حق پسند اور بہی خواہ خلق تھے ۱۹۱۹ء میں ندوہ میں داخل ہوئے، تحریک خلافت شباب پر تھی، حمید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے اس کی وجہ سے سادگی طبیعت ثانیہ بن گئی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی صحبت نے ان کے اندر ندوہ کی محبت اور خاموش خدمت کا جذبہ پیدا کیا، تعلیم سے فراغت کے بعد قیام زیادہ تر وطن ہی میں رہا لیکن ندوہ برابر آتے جاتے رہتے تھے دوستوں کے اصرار سے کئی برس تک جنگل میں تعلیمی خدمت انجام دی، ان کے مخلص شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا اور ایک بڑا تعلیمی مرکز قائم ہو گیا، عرصہ سے دل کے مریض تھے، رمضان میں ندوہ آئے، مولانا ابوالحسن علی سے ملنے رائے بریلی جانے کا ارادہ تھا، دفعۃً دل کا دورہ پڑا اور تھوڑی دیر میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے صاحبزادہ مولوی عبدالرشید ندوی اور دوسرے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ناظم صاحب دارالمصنفین سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے تازہ خط سے معلوم ہوا کہ اُنٹی کی دوسری قسط کا معاملہ طے ہو گیا ہے، امید ہے کہ اس مہینہ میں وہ اعظم گڈھ واپس آ جائیں گے۔

آدمی خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ خود خدا آدمی کو لالہ کے حسن، نرگس کی آنکھوں، پرندوں کے چہچہوں، پھولوں کی خوشبوؤں، چاند، آفتاب، محلوں اور وادیوں میں تلاش کرتا رہتا ہے، زندگی کا موتی انسان کے خاکی جسم میں گم ہو گیا ہے، اور یہ فیصلہ کرنا ہے کہ دنیا آدمی ہے یا خود خدا ہے:

در خاکدان ما گہر زندگی گم است   این گوہرے کہ گم شدہ ما ئیم کہ اوست

یہ کیا ہے، اس کو ہمہ اوست یا ہمہ از وست جو چاہے کہہ لیجئے۔ اقبال پرانے وحدت الوجود کی طرح پیوستن کے بجائے گسستن کے قائل ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں فراق میں وصال سے زیادہ لذت ہے۔ وہ شکوۂ تقدیر یزداں بھی پسند نہیں کرتے، بلکہ وہ تقدیر یزداں بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کشتۂ لذت پیکار بن کر ابد کو تسخیر کرنے کا پیام دیتے ہیں، وہ دونوں جہان کو اپنے شعلہ کی محض موج دخان بن کر اپنے کو جاوداں دیکھنا پسند کرتے ہیں، انھوں نے خود خدا کی زبان سے انسان کو گویا الوہیت کا درجہ دے دیا ہے۔ خدا انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

جہاں را زیک آب و گل آفریدم   تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم   تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

اس کا جواب انسان عاجز محض ہو کر نہیں دیتا ہے، بلکہ خدا کی عطا کی ہوئی شان الوہیت کے ساتھ اپنی آفرینش کا بھی دعویدار ہوتا ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم   سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

علامہ اقبال بندہ اور بندہ کے خدا دونوں کو ایک دوسرے کا مطلوب اور لازم ملزوم سمجھتے ہیں

نہ او را بے نمودِ ما کشودے   نہ ما را بے کشودِ او نمودے

اسی کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں :

نہ ما را در فراقِ او عیارے   نہ او را بے وصالِ ما قرارے

وحدت اور کثرت کی ایک اچھوتی تعبیر علامہ اقبال نے اس طرح کی ہے :

اسرار ازل جوئی بر خود نظرے وا کن   یکتائی و بسیاری، پنہانی و پیدائی

علامہ اقبال پرانے وحدت الوجودی کی طرح انسان کو مجبور، معذور، مقہور اور مغلوب دیکھنا پسند نہیں کرتے، خود خدا کی نظر میں یزداں صفات آدم کے مقام اور احترام کے خواہاں ہوتے ہیں، وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ متناہی خودی لامتناہی خودی میں جذب ہو کر اپنی ہستی فنا کر دے بلکہ یہ کہ لامتناہی متناہی کی آغوش محبت میں آ جائے، بعض مسلم مفکرین کی وجہ سے وحدت الوجود کا مسئلہ جامد، غیر موثر اور غیر متحرک بن گیا تھا، اقبال نے اس کو فعال، موثر اور متحرک بنا دیا ہے، ان کی وحدت الوجود میں نو فلاطونیت، یونانیت، اشراقیت، عجمیت اور فلسفہ ویدانت کی ہندویت نہیں، بلکہ اسلامی وحدت الوجود کا ایک تجدیدی رنگ ہے، جس میں شریعت اور اسلامی نظام فکر کے ساتھ فطرت کی حنا بندی ہے اور انسان کے خاکی جسم میں انداز افلاکی اور آداب خداوندی ہے، جس طرح اب یہ اچھی طرح واضح ہو تا جا رہا ہے کہ اقبال اسلامی تصوف کے نہیں بلکہ بگڑے ہوئے ہوئے تصوف کے مخالف رہے، اسی طرح جتنا گہرا مطالعہ کیا جائے گا، اتنا ہی یہ اندازہ ہوگا کہ اقبال بگڑی ہوئی وحدت الوجود بلکہ نو فلاطونی، یونانی، اشراقی، عجمی، ویدانتی اور غیر شرعی وحدت الوجود کے مخالف تھے، لیکن اسلامی وحدت الوجود کے حامی رہے اور ان کو ہونا بھی چاہیئے تھا،

ورنہ وہ اپنے پیر رومؔ کے معنوی مرید صحیح طور پر نہ ہو سکتے تھے۔ بعض حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال وحدت الوجود کے مقابلہ میں وحدت شہود سے متفق ہیں، جس کے علم بردار حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ ہیں۔ اگر حضرت مجدد الف ثانی کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر وحدت الوجود کے منکر نہیں، اس کی غلط تعبیر کو غلط سمجھتے ہیں، وہ وحدت الوجود کے مسئلہ سے نہیں، بلکہ اس کے ان مدارج سے اختلاف کرتے ہیں، جن میں شریعت کا دامن چھوٹ جانے کا احتمال یا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے علماء کو تو یہ سمجھایا کہ اگر وحدت الوجود کی تشریح صحیح طور پر کی جائے تو یہ گمراہی نہیں، اور صوفیہ کو سمجھایا کہ اگر علوم لدنیہ کی مطابقت علوم شرعیہ سے نہیں ہے تو ایسے تمام علوم کا حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی وجود و شہود پر بڑی اچھی بحث کی ہے، ان کا خیال ہے کہ شیخ محی الدین اکبر کی وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانی کی وحدت الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں، وجود و شہود محض نزاع لفظی ہے، ان میں مطابقت ہے، مخالفت نہیں۔ علامہ اقبال کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ وہ وحدت الوجود کے بجائے وحدت الشہود سے متفق تھے، تو شاہ ولی اللہؒ کی اس رائے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ علامہ اقبال کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ وحدت الوجود کے منکر نہیں، بلکہ اس کی غلط تعبیر کو غلط سمجھتے تھے، تو کیا یہ صحیح نہ ہوگا

اقبال جن سے متاثر ہوئے ان میں عراقی اور سنائی بھی تھے، انھوں نے عراقی کے تصور زمان و مکان سے استفادہ کیا۔ اس پر مولانا امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون زیر نظر اقبال نمبر میں ہے، جناب بشیر احمد ڈار صاحب اقبالیات کے بہت بڑے ماہر ہیں، انھوں نے بڑے فاضلانہ بلکہ والہانہ انداز میں ثابت کیا ہے کہ اقبال سنائی کے کن کن خیالات سے

متاثر ہوئے ۔ اسی سلسلہ کے بعض مضامین میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اقبال غالب اور حافظ سے بھی متاثر ہوئے ۔ مگر نقوش کے اس نمبر کا یہ حصہ تشنہ اس لحاظ سے ہے کہ کچھ مضامین ایسے بھی ہونے چاہئے تھے ، جن میں یہ دکھایا جاتا کہ اقبال نے قرآن سے خودی کی تعلیم کیسے حاصل کی ، عشق رسول کے ذریعہ ان کی خودی کی نشوونما کیسے ہوئی ۔ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عشق و محبت کی استواری اور رازداری سے کیسے سرشار رہے ، ان کو خاصۂ خاصان عشق اور ان کے عشق کو سرمطلع دیوان عشق کیوں کہا ؟ حضرت عمرؓ کے دل بیدار ، فقر اور سلطانی میں کیا کیا جلوے دیکھے ؟ حضرت علیؓ کے ایمان میں ان کو عشق کا سرمایہ کیسے ملا ؟ حضرت بلالؓ کی نوائے جگر گداز میں ان کو نور نبوت کیسے نظر آیا ؟ رسم سلمان ، گلیم بوذرؓ اور دلق اویس میں ان کو کیا کیا چیزیں ملیں ؟ پیر روم کے ذریعہ سے ان پر راز زندگی اور سر مرگ کیسے فاش ہوا ؟ ان کے یہاں عبد الکریم جیلیؒ کے خیالات پائے جاتے ہیں کہ نہیں ؟ انھوں نے حضرت فضیلؒ اور حضرت ابو سعیدؒ سے پاک مردانگی کا درس کیسے حاصل کیا ؟ حضرت جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ کے جمال کو بے نقاب کیسے دیکھا ؟ منصور کے عرفان کی تجلیوں میں عین فطرت کی تجلی کیسے دیکھی ؟ حضرت سید احمد رفاعی کے ضمیر کے نور کو کسب کرنے کی فکر کیسے کی ؟ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل بے تاب اور درون ناشکیبائی میں کیفیت کس کس طرح محسوس کی ؟ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے لحد کی زیارت میں دل کی زندگی کیسے پائی ؟ حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ کے ذریعہ ان کو شعور ولایت اور شعور نبوت کا فرق کیسے معلوم ہوا ؟ حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی خاک کو زیر فلک مطلع انوار کیوں قرار دیا ؟ نگاہ غزالیؒ کی طرف ان کی نظر کیوں اٹھی ، بو علی سینا کے مقام فکر تک کیوں پہونچنے کی کوشش کی ؟ حیرت فارابی سے کیوں متحیر رہے ؟ نظریۂ نور سے متعلق ان کے خیال کو ابن رشد سے کیسے تقویت پہونچی ؟ ابوالمجد سنائی نے حمید بغدادی کے خیالات کو اپنے اشعار میں کیوں منتقل کیا ؟ ابن تیمیہ

ابن خلدون، البیرونی اور ابن حزم کے کن خیالات سے متاثر ہوئے؟ جمال الدین افغانی اور سرسید کے افکار کا اثر ان پر کہاں تک ہوا، سخن گوئی میں فرید الدین عطار کی غلامی کیوں کی؟ عراقی کے اشعار سے کیوں لذت آشنا ہوئے؟ بو علی قلندر پانی پتی میں گل رعنا کی دلآویزی کیوں پائی؟ اللہ تعالیٰ سے امیر خسرو کے سینے کے آتشدان کے سوز کے کیوں طلب گار رہے؟ اپنے کو کشتۂ جامی کیوں قرار دیا؟ عرفی کی غیرت اور تخیل اور فیضی کی توانائی اور جوش کو کیوں اپنانے کی کوشش کی، غنی کشمیری کی نواسنجی، غالب کی روح اور میر کا درد اپنے میں کیوں سمونے کی کوشش کی؟ پھر طارق بن زیاد، عبد الرحمن اول، سلیم، سنجر، طغرل، محمود غزنوی، مراد، بابر، شیر شاہ سوری، عالمگیر اور ٹیپو سلطان ان کے شاعرانہ ذہن پر کیوں چھائے رہے؟

اقبال کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ موضوعات ایسے ہیں جن پر سیر حاصل مضامین لکھنے کی ضرورت ہے، اب تک بہت کچھ اس پر لکھا گیا ہے کہ وہ برگساں، گوئٹے، نطشے، شوپنہار، دانتے، ہیگل اور ملٹن وغیرہ جیسے یورپی فلسفیوں اور شاعروں کی رتھ پر سوار ہو کر اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرتے رہے، مگر اقبال کو ان فلسفیوں اور شاعروں کی گاڑی کا قلی قرار دینا ان کی عظمت و جلالت اور اسی کے ساتھ اسلامی غیرت و حمیت پر ضرب کاری لگانا ہے۔

نقوش کے زیر نظر نمبر میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے بجا یہ لکھا ہے کہ :

"اقبال کے نظام فکر کو مرتب کرتے وقت سب سے پہلے اس امر کو ملحوظ رکھنا لازمی ہوگا کہ ان کی فکر قرآنی تعلیمات اور اسلامی شعائر اور اقدار کے ماتحت تشکیل پائی ہے، اور اگرچہ انھوں نے مغربی فلسفہ اور جدید سائنس کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، لیکن ان سب کو اسلام کے بنیادی اصول پر پرکھنے اور ان اصول سے مطابق یا مخالف ہونے کی بنا پر انھیں قبول یا مسترد کر دیا ہے، بلکہ اس معاملہ میں وہ مسلم متکلمین کے ساتھ بھی یہی سلوک روا

رکھتے ہیں کہ ان متکلمین کے خیالات جہاں کہیں قرآنی تعلیمات کے منافی ہوں، انھیں بھی مسترد کر دیتے ہیں"

یہ میرے استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندوی کی آواز بازگشت ہے، انھوں نے علامہ محمد اقبال کی وفات کے موقع پر لکھا تھا کہ وہ حکیم تھے، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتے، بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتے تھے، اقبال کے متعلق دارالمصنفین کا یہی مکتب فکر ہے، اور یہاں کے ارباب قلم نے برابر یہی دکھایا ہے، کہ اقبال نے اپنے عقائد کی بنیاد تمام تر قرآن مجید پر رکھی، اور انھوں نے اپنی شاعری سے عصائے موسیٰ اور ید بیضا، دونوں کا کام لیا اور مغربی تہذیب اور جدید افکار کی جڑ پر تیشہ چلایا، اس کے ایک ایک عیب کو بے نقاب کیا، اسلام کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا (اقبال کامل ص ۱۱۰ و معارف اکتوبر ۱۹۷۱ء)

اقبال کو دکھ تھا کہ:

گنوا دی ہم نے، جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اقبال نے اپنے اسلاف کی میراث ہی کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی ہے تاکہ نہ صرف ہم کو بلکہ گرتی ہوئی انسانیت کو زمین پر سے اٹھا کر ثریا تک پہونچائیں، اسی میں ان کی اصلی عظمت ہے۔

نقوش کے زیر نظر اقبال نمبر میں ایک مضمون "اقبال اور رسالہ معارف" بھی ؟

معارف میں ۱۹۱۶ء سے اب تک اقبال پر جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں، اگر ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں ہو جائیں، مضمون نگار معارف کے ان پورے مضامین کا احاطہ نہ کر سکے ہیں، اس کے ابتدائی دور کے صرف مضامین کا ذکر آیا ہے، زیر نظر مجموعہ میں پروفیسر طاہر تونسوی کا ایک مضمون "اقبال اور سید سلیمان ندوی" بھی ہے، اب اس میں مزید اضافہ کر کے انہوں نے اس کو ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ لاہور کے قیام میں مجھ سے اس پر ایک تحریر بھی لکھائی تھی، خدا کرے یہ کتاب علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جائے

(باقی)

حیات سلیمان

یہ محض سید صاحب علیہ الرحمہ کی سادہ سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ ان کے دور کی پوری علمی تاریخ ہے، جس میں اس دور کی تمام ملی و قومی، سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز کی پوری تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین کی تاسیس اور عہد بہ عہد ترقی کی روداد کے ساتھ ترک دارالمصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان اور وہاں کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی و ملی و دینی خدمات انجام دی ہیں، ان سب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، یہ اسلوب تحریر اور طرز انشا کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنی ہے، ویسے ہی دلکش، دلچسپ اور پر از معلومات۔

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت ۲۷ روپیہ ۵۰ پیسے

وفیات

آہ ماہرُ القادری!

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

جناب ماہر القادری کی وفات کی خبر سے بہت ہی دل گیر ہو و دل فگار ہو کر جب یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو کراچی کی ساری علمی و ادبی مجلسیں یاد آرہی ہیں،

کراچی بار ہا جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کی ممتاز علمی شخصیتوں کی یادوں کی قندیلیں روشن کرتا رہتا ہوں، ان میں بہت سے اللہ کو پیارے بھی ہو گئے، اختر جونا گڈھی مرحوم یاد آتے ہیں ان کی کتاب طبقات الامم دار المصنفین سے شایع ہوئی تھی، معارف میں مولانا شبلیؒ پر اچھے مضامین لکھے، وہ بزرگ محترم مولانا سید ابو ظفر ندوی مرحوم کے ساتھ جونا گڈھ سے شہاب رسالہ بھی نکالا کرتے تھے، دار المصنفین کے بڑے قدر دان رہے، وہ جس محبت سے کراچی میں ملے اس کی یاد برابر باقی رہے گی، ان ہی کے یہاں کھانے پر حفیظ ہوشیار پوری مرحوم سے ملا تھا، ان کے پر کیف نغمۂ شعری سے بھی محظوظ ہوا تھا، ان کی محبت بھری باتوں میں بڑی کیفیت تھی، ممتاز حسن مرحوم (ریٹائرڈ سکریٹری محکمہ فنانس حکومت پاکستان) یاد آتے ہیں تو ان کی علم نوازی، کرم گستری اور دوست پروری کے معطر اور نکہت بیز پھولوں کے بارے دبتا چلا جاتا ہوں، ایک رات جناب جمیل عالی کے دسترخوان پر میں جناب ممتاز حسن مرحوم، ابن انشاء مرحوم، اور پاد قبل بجیر پیر حسام الدین راشدی کے ساتھ شریک ہوا، رات کو ایک بجے تک علمی و ادبی باتیں ہوتی رہیں، وہ

رات بھی کیسی حسین اور بہار آفریں تھی، ممتاز حسن مرحوم ایک تناور سایہ دار علمی برگد تھے، اسی کے چھاؤں کے نیچے کراچی کے ارباب علم جمع ہوتے اور اُن کے سایۂ عاطفت میں اپنے علمی و ادبی ذوق کو پھلتے پھولتے محسوس کرتے جناب ابن انشا، مجلسوں میں تو اکثر خاموش بنے رہتے، مگر اخبار کے کالم میں خوب بات کی پھلجڑیاں اور پٹاخے بن جاتے انکی موت پر پاکستان کے اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو ماتم ہوا ہے، وہ قابل رشک ہے، جمیل عالی صاحب ابھی بقید حیات ہیں، خدا کرے ابھی بہت دنوں زندہ رہیں، اخبار کے کالم اور ٹیلی ویژن کے تو وہ ہیرو سمجھے جاتے ہیں جناب پیر حسام الدین راشدی تو کراچی کے نہ صرف پرنس اسکالر ہیں، بلکہ وہاں کے علمی معشوقوں کے معشوق ہیں، ان کی کوٹھی تو میرے لیے ایک علمی زیارت گاہ بن گئی ہے، ان کو نوشت و خواند کے کمرے میں پہونچ جاتا ہوں تو وہاں علم و فن کی کرنیں میرے ذہن کو گرماتی رہتی ہیں، وہ اپنے یہاں کراچی کے اہل علم کو برابر مدعو کر کے ان سے ملاقاتیں کراتے رہتے ہیں، ان ہی کے یہاں پہلی دفعہ فلسفہ اور فلسفۂ اقبالیات کے بہت بڑے ماہر جناب بشیر احمد ڈار صاحب سے ملا، ان کے عجز، انکسار اور استغنا سے ان کا علم و فن دب کر رہ گیا ہے، اقبال پر ان کا جب کوئی مضمون پڑھتا ہوں تو نظر و فکر میں کندن سی چمک پیدا ہو جاتی ہے، راشدی صاحب ہی کے دولت کدہ پر پروفیسر شیخ عبدالرشید سے بار ہا ملاقاتیں ہوئیں، مگر علمی باتوں میں جوان رعنا نظر آتے ہیں، تاریخ کے ہر پہلو پر ناقدانہ نظر رکھتے ہیں، راشدی صاحب ہی کے یہاں ڈاکٹر ریاض الاسلام صدر شعبۂ تاریخ کراچی یونیورسٹی سے کئی بار ملا، خاموش، متین اور سنجیدہ ہیں، مگر کام کرنے کی لگن کی وجہ سے کسی نہ کسی علمی کام میں لگے رہتے ہیں، اور اب تک بہت سی کتابوں کے مصنف

ہو چکے ہیں، کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو اردو کے ایک مصنف اور نقاد کی حیثیت سے تو جانتا تھا، مگر جب ان کی کتاب اقبال اور مسلک تصوف پڑھی تو ان کو علم معرفت کا اداشناس بھی سمجھنے پر مجبور ہوا، اور جب ان کی یہ کتاب ختم کی تو محسوس ہوا، کہ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی کتاب پڑھنے کو ملی، یہ کتاب جناب ڈاکٹر معزالدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈیمی کے ذریعہ سے ملی جس کے لئے ان کا شکر گذار ہوں، ڈاکٹر معزالدین صاحب کراچی میں تھے، تو اس طرح سے جیسے کوئی شفیق چھوٹا بھائی ملتا ہو، ان کی ملنساری میں بڑی دل آویزی ہے، جناب شریف المجاہد جرنلزم کے فن کے استاد ہیں ان کا مضمون جہاں کہیں دیکھتا ہوں ضرور پڑھتا ہوں۔

جناب مشفق خواجہ — تو اردو ادب کے حبیب بن کر اب اس کے محبوب بن گئے ہیں، ہر مجلس میں ان کی شان محبوبیت قائم رہتی ہے، وہ میری دل نوازی جس طرح کرتے ہیں، اس کی روداد کم دل آویز نہیں۔

کراچی کے علمی حلقہ میں جناب حکیم سعید دہلوی سے بھی بار بار ملنے کا اتفاق ہوا خوش روئی جامہ زیبی اور مہمان نوازی کے پیکر ہیں، ان کی علم نوازی میں وہی شان پائی جاتی ہے جو تیموری دربار کے امراء کے یہاں ہوا کرتی تھی، معلوم نہیں کیسی کیسی علمی مجلسیں منعقد کیا کرتے ہیں، اور کس کس طرح سے ارباب علم کو اپنی فیاضیوں سے سیراب کرتے رہتے ہیں

کراچی کی علمی مجلسوں میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی تو بلبل ہزار داستان ہیں کہیں بیٹھ جائیں تو وہی چھائے رہتے ہیں، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ اسلام یہود و نصاریٰ کے صحائف، افریقہ کے جنگلی قبائل، تبلیغ اسلام روڈیشیا کے آئین اسمتھ، انگریز مورخ ٹوائن بی، جٹی، مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، پاکستان تحریک، شدھی سنگٹھن،

شعروادب، امیرمینائی، جوش ملیح آبادی، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، غزل، دوہے،
ٹھمری گیت اور بربے پر ایک سانس میں گفتگو کر کے سامعین کو ساکت و صامت
بنا دیتے ہیں، وہ اپنی معلومات کے لحاظ سے انسائیکلو پیڈیا ہیں، مولانا ناظم ندوی
سابق شیخ الجامعہ مدرسہ بہاولپور، کو عربی شعروادب میں بڑا عبور رہے، عربی کے
اشعار برجستہ سناتے ہیں، اور خود بھی کہتے ہیں، عربی میں ان کی گہری نظر کا معترف کراچی
کا پورا علمی حلقہ ہے، مہمان نوازی اور دوستوں کی دلجوئی، کا پورا حق ادا کرتے ہیں، مولانا احسن
مثنیٰ ندوی، پاکستان کے موتمر اسلامی کے صدر ہیں، بہت اچھے مقرر ہیں، اپنے اردگرد
دوستوں اور نوجوانوں کو ساتھ رکھنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں، نوجوانوں میں کام کرنے کا
جذبہ پیدا کرنے کا بھی خاص سلیقہ رکھتے ہیں، تقریر بھی روز کے اڈیٹر ہیں اپنے نقشوں اور چہچہوں
سے مجلس کو گرم رکھتے ہیں، ان کے ہمدم اور دمساز ظفیرالحسن صاحب ہیں جو بیدل
لائبریری کے جنرل سکریٹری ہیں، ان میں علمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور رکھانے
کی بڑی لگن ہے، کسی نہ کسی مفید کام میں لگے رہتے ہیں، ڈاکٹر مطیع الاسلام صدر شعبہ فارسی
کراچی یونیورسٹی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی تصانیف پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں، مجھ کو
بزم صوفیہ کے مصنف کی حیثیت سے جس اخلاص سے ملتے ہیں، اس کے لئے ان کا شکر گذار
ہوں، جناب شفیق بریلوی نے ارمغان لغت مرتب کر کے کراچی کے علمی حلقہ میں بڑی مقبولیت
حاصل کر لی ہے، بڑے متحرک اور فعال قسم کے اہل علم ہیں، یزدانی انصاری صاحب سے ملنے
کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے جسم کے کسی حصہ کو چھو لیجئے تو علم ہی کی آواز بلند ہوگی،
انگریزی میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مستقل مقالہ نگار ہیں، اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز
کے بھی شاید رکن ہیں، شاہجہانی دور کے علامی سعد اللہ خان پر ایک کتاب بڑی محنت

اور ذوق ریڈیو سے لکھی ہے، پروفیسر ایوب قادری تو ان گنت کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، عہد مغلیہ کے دور کی فارسی کتابوں کا اردو ترجمہ کر گئے ہیں، غیر معمولی ملکہ حاصل کر لیا ہے، کراچی یونیورسٹی میں اس کے وائس چانسلر جناب احسان رشید صاحب سے ملا تو ان کی قدر اور شخصیت اور تواضع سے متاثر ہوا، وہیں شعبۂ اردو کے پروفیسر ابو الخیر کشفی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے جس طرح پذیرائی کی اس سے ان کا ممنون ہوا،

ڈاکٹر معین الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی امور خانہ بصیرت کی وجہ سے ان کی ذات خود ایک علمی انجمن بنی ہوئی ہے، ان کی ملاقات درس و تدریس کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

جناب خالد اسحٰق کراچی کے بہت ہی مقبول اور مشغول ایڈوکیٹ ہیں، ایک روز انھوں نے اپنے یہاں برادرم ڈاکٹر سلمان ندوی کے ساتھ کھانے پر مدعو کیا تو ان کا کتب خانہ دیکھ کر خوش ہوا، ان کا علمی ذوق پورے شہر میں مشہور ہے، بڑے دیدہ ور سیاست داں اور ایڈوکیٹ سمجھے جاتے ہیں، بڑی شستہ و رفتہ گفتگو کرتے ہیں، اردو، پنجابی، سندھی اور انگریزی ایک ساتھ بولتے ہیں، دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے درد رکھتے ہیں، ان ہی کے یہاں جناب صلاح الدین اڈیٹر تجارت سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بنیادی حقوق نامے ایک کتاب لکھی ہے، جس کی دھوم پورے پاکستان میں ہے، ان کی اس کتاب کی رونمائی کے موقع پر انگریزی زبان کے لائق مصنف جناب جمیل احمد صاحب سے ملاقات ہوئی جنھوں نے Hundred Great men Ones of the world لکھی ہے، یہ پورے پاکستان بلکہ بیرون پاکستان میں بہت ہی شوق سے پڑھی جا رہی ہے، اس کا ایک نسخہ مجھ کو بھی

عنایت کیا، بہت ہی خاموش قسم کے اہل قلم معلوم ہوئے،

ماہر القادری مرحوم کی ماتمی تحریر کے سلسلہ میں یہ ساری باتیں بظاہر بے جوڑ معلوم ہونگی، لیکن اس لمبی تمہید کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کراچی کے علمی حلقہ کی بہت سی، ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر ان میں سب سے رعنا، دل آویز اور باغ و بہار شخصیت مولانا ماہر القادری کو پایا، جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے، دن ہو تو مجلس کے گل سرسبد بن گئے، رات ہے تو شمع محفل نظر آئے۔

ان سے غائبانہ تعارف ۱۹۳۵ء سے بھی پہلے کا تھا، انھوں نے اپنی ایک غزل ایک بار معارف میں چھپنے کے لیے بھیجی، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کا ذوق شعری بہت عمدہ تھا، اس میں انھوں نے کچھ اصلاح دیدی، ماہر القادری صاحب نے اسکو پسند نہیں کیا، حتجاجاً ایک خط حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو لکھا، اس کا جواب سید صاحبؒ نے بہت ہی نرم اور ٹھنڈے انداز میں دیا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے اس کا ذکر کراچی کی علمی مجلس میں برابر کرتے، جب میں ۱۹۰۵ء میں پاکستان گیا تو مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے بزرگانہ و عزیزانہ مراسم پیدا ہوئے انھوں نے مجھکو اپنے یہاں مدعو کیا تو جناب ماہر القادری کو مجھ سے ملنے کے لیے خاص طور پر بلایا، وہ ان کو اس قدر پسند کرتے کہ اپنے یہاں چھوٹی بڑی جو بھی دعوت کرتے تو ان کو ضرور بلاتے، خود ماہر القادری صاحب ان کے بڑے دلدادہ تھے یہ دلدادگی بلا وجہ بھی نہ تھی، مولانا ظفر احمد انصاری کراچی میں اپنے قدر دانوں، دوستوں اور مخلصوں کے پیر مغان ہیں، وہ سند یافتہ عالم تو نہیں ہیں، بلکہ الہ آباد یونیورسٹی سے ام۔ اے۔ کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے، ال۔ ال۔ بی کے امتحان میں بھی

امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی، شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے ہیں، ان کی ایک قومی نظم کی بھی شہرت ہوئی تھی، مگر وہ پاکستان کی تحریک میں شریک ہوئے تو پھر سیاست ہی کے ہو کر رہ گئے، مسلم لیگ کی کمیٹی آف ایکشن اور ... آل انڈیا مسلم لیگ سنٹرل پارلیمنٹ بورڈ کے سکریٹری پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری بھی رہے، جناب لیاقت علی خان مرحوم کے ساتھ بھی کام کیا، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مسلم لیگ میں شامل ہوئے، پاکستان کی دستور سازی کے سلسلہ میں جو تعلیمات اسلامی کا بورڈ بنا، اس کے بھی سکریٹری رہے، اور جب استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ پاکستان پہونچے تو ان کے ساتھ بھی کام کیا، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلانے میں ان کا نمایاں ترین حصہ رہا جب میں ان سے ملا تو وہ پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے بڑے با اثر آزاد رکن تھے، حکومت اور حزب مخالف دونوں ان کی رائے کی قدر کرتے، وہ اپنی نرم، شیریں سبک، متوازن اور متین باتوں سے اپنے ملنے والوں کے دلوں کی تسخیر کرتے ہیں شہرت یا کوئی ذاتی فائدہ نہیں چاہتے، گمنام رہ کر پاکستان کے تعمیری کاموں میں لگے رہتے ہیں، اس لیے پاکستان کے گمنام معمار کہلاتے ہیں، عربی کا ایک مدرسہ بھی ان کی نگرانی میں چل رہا ہے پاکستان کے سربراہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق ان کی بے لوثی بے غرضی، رائے کی اصابت کے معترف ہیں ان کی ذات گرامی میں کچھ ایسی ہی مقناطیسیت ہے، دارالمصنفین کی مطبوعات کے حق طباعت و اشاعت کا جو معاہدہ نیشنل بک فونڈیشن کراچی سے ہوا اس سلسلہ میں ہر قسم کی مدد پہونچائی ان کے یہاں ادیب، شاعر، عالم، وکیل، سیاست داں سب ہی جمع ہوتے ہیں، جناب

ماہرالقادری تو ان کے قلب کی دھڑکن بن کر رہے، الٰہ کے یہاں ماہر صاحب سے جو ملاقات ہوئی، تو یہ مشفقانہ راہ و رسم میں تبدیل ہوگئی، پھر خدا جانے کتنی ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ میری قیام گاہ پر آتے، اور میں ان کے گھر پر حاضر ہوتا، دعوتوں اور جلسوں میں ان کا ساتھ رہتا، علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا، ان دنوں وہ لاہور ہی میں تھے، کافی رات گذر چکی تھی تو وہاں ملنے آئے، اور دیر تک اپنی باتوں سے محظوظ کرتے رہے،

ان کی شیوہ بیانی ان کی خاص چیز تھی، اس وقت ان کی طلاقت لسانی زیادہ بروئے کار آتی جب وہ اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے، تصوف، وحدت الوجود، بدعت، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، بریلوی علماء، زبان، ادب، تذکیر و تانیث ان کا خاص موضوع ہوتا، تصوف کے مخالف اور وحدت الوجود کے منکر تھے، ان دونوں مسائل پر گفتگو کرتے وقت پسینہ میں شرابور ہو جاتے، ان کو چھیڑنے کے لیے ان کے دلائل کا رد کیا جاتا تو پھر ان کی قوت گویائی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا، کلام پاک اور حدیث کا سہارا لے کر اپنے معترض کو قائل کرنے کی کوشش کرتے، کلام پاک کی آیتیں پڑھتے اور حدیث کے حوالے دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہم کو کوئی مستند عالم مخاطب کر رہا ہے، حالانکہ انھوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم گھر ہی پر پائی تھی، انگریزی تعلیم شاید میٹرک ہی تک حاصل کی تھی، مگر بحث کرتے وقت اپنی مذہبی اور علمی معلومات میں جید علماء اور انگریزی دانوں سے کسی حال میں دبتے نظر نہیں آتے، ان کو معلوم تھا کہ یہ راقم بزم صوفیہ کا مصنف ہے، تصوف اور وحدت الوجود کے خلاف بولتے وقت میرا ہاتھ پکڑ لیتے اور میری دلجوئی کی خاطر کہتے کہ میں تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کا مخالف

نہیں ہوں، مگر تصوف میں جو غیر اسلامی اور راہبانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے، اس کا مخالف ہوں وہ میری کسی بات سے قائل ہونا پسند نہیں کرتے، جب بحث کرتے ہیں اُن کو پسینہ آنے لگتا تو موضوع کا رخ بدل دینے کی کوشش کی جاتی، ایسے ہی ایک موقع پر جب ان کی بحث میں بہت تیزی آ رہی تھی تو ایک صاحب بول اٹھے کہ مولانا شبلیؒ شان نزول کو مذکر لکھتے ہیں، شان تو مونث ہے، شان نزول بھی مونث ہونا چاہئے، پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا بولے کہ مولانا شبلیؒ نے شان نزول کو مذکر لکھا ہے تو یہی صحیح ہے، ان کے یہاں زبان کی کوئی غلطی نہیں مل سکتی، وہ مولانا شبلیؒ کے بڑے عقیدت مند تھے، بارہا ان کی زبان سے سنا کہ مولانا شبلیؒ ایک طرف اور ساری علمی و ادبی امت دوسری طرف ہو، تو بھی ان کا پلہ بھاری ہوگا، ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، ماہر صاحب اردو زبان کے محاوروں تذکیر و تانیث اور واحد و جمع پر بڑی اچھی نظر رکھتے، کہتے کہ در و اگر جمع کے ساتھ استعمال ہو تو معنی بدل جاتے ہیں، در واٹھ رہے ہیں سے مراد دروزہ ہوتا ہے، ستو کے ساتھ پینا ہمیشہ جمع کے ساتھ استعمال ہونا چاہئے ستو پئے صحیح ہے، ستو پی بولنا غلط ہے، کہنے لگے کہ جوش ملیح آبادی نے ایک جگہ رنگینی پھٹ پڑی کا محاورہ استعمال کیا ہے، شباب اور جوانی کے لئے پھٹ پڑنا استعمال ہوتا ہے، رنگینی پھٹ پڑنا غلط ہے، کہتے کہ ہر زبان کا مرکز ہوا کرتا ہے، حجاز عربی اور ایران فارسی کا مرکز ہے، تو اردو کا مرکز لکھنو اور دہلی کو تسلیم کرنا پڑیگا، وہیں کے روزمرے اور محاورے مستند سمجھے جائیں گے اسی کے ساتھ اقبال کے بہت معترف تھے، کہتے کہ میر کی شاعری آہ ہے، سودا کی واہ ہے، مگر اقبال کی شمع راہ ہے، رومی نے مسلمان کو ولی اللہ بنانے کی کوشش کی تو اقبال نے کافر کو مسلمان بنایا، اقبال کی وفات پر انھوں نے ایک غمناک نظم بھی لکھی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں،

کاروان خواب میں تھا بانگ درا سے پہلے		ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے
اللہ اللہ ترا قافلۂ نطق و کلام		بال جبریل کے سایہ میں ہوا گرم خرام
صرف مشرق نہیں مغرب کو بھی پیغام دیئے		تجھ و فکر پہ اسرار خودی فاش کئے
تو کبھی شعلۂ رقصاں، کبھی رفتار نسیم		موج کوثر ترے اشعار کہیں ضرب کلیم
ایک نئی طرز نئے باب کا آغاز کیا		شکوہ اللہ تعالیٰ سے بصد ناز کیا
ترے شعروں میں کہیں معرکۂ بدر و حنین		کہیں ایمان براہیم کہیں عزم حسین
اس لئے ہے تری ایک ایک محبت قبول		ترا سرمایۂ دانش تھا فقط عشق رسول
محفل رومی و عطار تھی مدت سے خموش		ترے نغموں نے بنایا اسے ہنگامۂ جوش
علم و حکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ		کس نزاکت سے ہم آغوش کئے شیشہ و سنگ
فکر افسردہ کو پرواز عطا کی تو نے		لب خاموش کو آواز عطا کی تو نے

اس جامع نظم میں اقبال کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، مگر جب ان سے کہا جاتا کہ رومی اور اقبال دونوں تصوف اور وحدت الوجود کے قائل تھے، تو پھر ان کی بحث میں تیزی آجاتی، لیکن انکی بڑی خوبی یہ تھی کہ تلخ بحث کرنے میں کتنے ہی منہمک ہوجاتے، رخ بدل جاتا تو یکایک وہ بذلہ سنج، لطیفہ گو اور قہقہوں اور چہچہوں کے مالک بلا شرکت غیرے ہوجاتے، اس برصغیر کا کوئی سیاسی، علمی، ادبی اور معاشرتی لطیفہ ایسا نہ تھا، جو ان کے ذہن کے خزینہ میں محفوظ نہ تھا، اگر کوئی کسی اچھے لطیفہ کو صحیح طور پر بیان نہ کرتا تو وہ بدخط ہوکر اس کی اصلاح کرتے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے محلس کو زعفران بنائے رکھتے، کہتے کہ وہ نیند کے بادشاہ ہیں، نیند ہر وقت میری آنکھوں میں دھری رہتی ہے ریل کے مسافروں کے ہجوم میں بیٹھے بیٹھے سویا ہوں اس طرح کہ دہلی سے ریل چلتی تھی

آنکھ لگی اور امرت سر پہونچ کر آنکھ کھلی، دنیا میں صرف ایک ہی شخص نیند میں ان سے بازی لے گیا، ایک بحری جہاز ڈوبنے لگا تو ایک شخص اس کے عرشہ سے سمندر میں گر گیا مگر سمندر کے پانی پر گرنے سے پہلے کچھ لمحات کے لئے وہ سو گیا، ان کی تفریحی باتوں کے درمیان ان سے ان کی غزلیں سننے اور سنانے کی فرمایش ہوتی تو پھر ان کی نعت، نظم، غزل اور گیت کے نغمے فضا میں اس طرح گونجنے لگتے کہ معلوم ہوتا کہ وہ پئے ہوئے ہیں اور پیا رہے ہیں، وقت گذرتا جاتا، ان کی زمزمہ سنجی اور گلفشانی جاری رہتی، وہ رخصت ہوتے تو جی چاہتا کہ وہ دوسرے دن پھر ملتے، خود مجھ سے اور میں ان سے ملنے کے لیے بے قرار رہتا، کبھی چائے اور کبھی کھانے پر بلا لیتے، بریانی اور گاجر کے حلوے بہت شوق سے کھاتے، اور دوستوں کو کھانے کے لئے اصرار کرتے، کراچی میں ابھی گذشتہ فروری ہی میں اپنی قیام گاہ پر مولانا ظفر احمد انصاری، پیر حسام الدین راشدی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، بزمی انصاری، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی، مولانا ناظم ندوی کاظم، ام اے، شفیق بریلوی، ڈاکٹر آفتاب صدیقی محمود الرحمٰن آہنگ کے ایڈیٹر بیتاب حسن اور جنگ کے نامہ نگار اقبال احمد صدیقی ظفر الحسن، ڈاکٹر محمد تقیم اور ڈاکٹر محمد طیب وغیرہ کو اپنے یہاں شام کی چائے پر مدعو کیا، ماہر القادری کی وجہ سے تو صبح صبح بنارس اور شام شام اودھ بن جاتی، وہ کیوں نہ ہوتے مجلس کو مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی اور جناب ماہر القادری دونوں نے ل کر لوٹا، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں کس کی نغمہ سنجی زیادہ کام کر رہی ہے، مگر جب حضرت ماہر القادری، اپنی نظمیں سنانے لگے تو پھر سب ہی لوگ دم بخود تھے، جنگ کے نامہ نگار نے کہا کہ یہ مجلس کراچی کی یادگار مجلس میں شمار کی جائے گی،

دارالمصنفین کا معاملہ کراچی کے نیشنل بک فونڈیشن سے ہو رہا تھا تو انھوں نے

ہر طرح کی اخلاقی مدد پہونچائی تھی، جس کے لئے اس کا شکر گذار رہا، کراچی سے اعظم گڈھ آتے وقت گذشتہ فروری میں ان سے رخصت ہوا، تو انھوں نے بھینچ بھینچ کر پیار کیا، کیا معلوم تھا کہ پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی، ۱۰؍ مئی کی رات کو پاکستان کی خبروں میں یکایک سنا کہ پاکستان کے مشہور ادیب، نقاد اور شاعر وفات پاگئے، ان کی تدفین مکہ معظمہ کی جنت المعلیٰ میں ہوگی،

یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھا، غایت اضطراب میں رات کے زیادہ حصہ میں کروٹیں لیتا رہا، ان کا ہشاش بشاش چہرہ، ان کی سرگیں آنکھیں، ان کی دل آویز باتیں، ان کے لطیفے چٹکلے غزل اور نظم سنانے میں ان کی مترنم آواز کانوں میں گونجتی رہی، خیال آیا کہ مولانا شبلیؒ استاذی محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ، دار المصنفین اور خود اس عاجز راقم کا ایک بڑا قدر دان جاتا رہا، استاذی المحترم نے کراچی پہونچ کر اسلامی ملک کے علماء کا ایک احتفال منعقد کیا تھا، اس کے انعقاد میں وہ بھی شریک تھے، اس موقع پر انھوں نے ایک نظم بھی کہی تھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں،

یہ حقیقت آپ کو اچھی طرح معلوم ہے
آج دین حق جہان میں ہر جگہ مظلوم ہے

دین سے بیزار دولت مند بھی نادار بھی
نفس کی خواہش کے بندے شیخ بھی بے خوار بھی

قوم کی وہ بیٹیاں جن کو بننا تھا بتول
مدرسوں میں سیکھتی ہیں ناچ گانے کے اصول

مال و زر جاہ و تعیش منزل مقصود ہے
آدمی کا اس جہان میں آدمی معبود ہے

زندگی نان و شکم کے ماسوا کچھ بھی نہیں
دل میں سب کا خوف ہے خوف خدا کچھ بھی نہیں

ہر طرف باطل کے جھنڈے ہر طرف بازیگری
روس کا فتنہ بھی ہے اور لعنت افرنگ بھی

اپنی منزل سے ہیں اب تک ناشناس و بے خبر
مطمئن ہیں آج تک ہم کفر کے دستور پر

پھر اسی احتفال میں مصر، شام، عراق، الجزائر، افغانستان، برما اور انڈونیشیا کے

علمائے کرام کو للکار کر کہا تھا کہ

روک دو طاغوت کے طوفان کو بڑھ کر روک دو

ان کی اس نظم کی تعریف سید صاحب نے بھی کی تھی، وہ معارف کے قدر دان ہونے کی حیثیت سے اس کو پابندی سے پڑھتے، میرے قیام کراچی میں معارف جب ان کے پاس پہونچتا، ملنے کے ساتھ ہی اس کے مضامین کے معیار کی تعریف کرنے لگتے، کہتے کہ اس کا معیار اس کے ابتدائی دور سے اب بہت اونچا ہوتا جا رہا ہے، پھر جب کسی سے تعارف کراتے تو میری تمام تصانیف کا نام شمار کرنے لگتے، گذشتہ فروری میں اعظم گڈھ پہونچا تو ایک نعت معارف میں چھپنے کے لئے بھیجی جو معارف سے ان کے لگاؤ کا ثبوت تھا۔

ان کے کوئی اولاد نہ تھی، غالباً اب سے چھ سات برس پہلے ان کی اہلیہ کی وفات ہو گئی تھی، اپنے چھوٹے بھائی مسرور حسین کے بچوں کو اپنی اولاد سمجھتے رہے، ناظم آباد میں ایک اچھی کوٹھی خریدی تھی، جس کی اب لاکھوں روپیے کی قیمت لگائی جا سکتی ہے، ان کی سجی سجائی کوٹھی سے ان کی خوش مذاقی اور خوش سلیقگی ظاہر ہوتی تھی، یہاں اپنے دوستوں کو برابر چائے اور کھانے پر بلایا کرتے، ان کے مدعوئین اختلافی مسائل چھیڑ کر ان کے خیالات سن کر محظوظ ہوتے، انھوں نے کراچی پہونچ کر ۱۹۴۹ء میں رسالہ فاران نکالا، اس کی اشاعت تو بہت زیادہ نہ تھی، لیکن یہ اپنے مضامین کی سنجیدگی اور علمیت کی وجہ سے قدر کی نظر سے دیکھا جاتا، اس رسالہ کی وجہ سے ان کی عزت و وقعت میں اضافہ ہوتا رہا، ان کے قدر دان ان کے رسالہ میں کافی اشتہارات دیتے جس سے ان کو کبھی مالی پریشانی اٹھانی نہیں پڑی، وہ مشاعروں اور علمی و ادبی مجلسوں میں ہر جگہ مدعو ہوتے، جس مشاعرہ میں وہ نہ ہوتے، وہ سونا رہتا، گذشتہ

مینہ جدہ ایک مشاعرہ میں گئے، جس میں حفیظ جالندھری بھی مدعو تھے، مشاعرہ سے پہلے مکہ معظمہ عمرہ کے لیے گئے، وہاں سے آئے تو مشاعرہ میں شرکت کی، ڈھائی بجے رات کو اپنا کلام سنایا، اور اس کے فوراً ہی بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، ان کی میت مکہ مکرمہ لے جائی گئی، جہاں بیت اللہ میں نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی، اور اسی سرزمین میں سپرد خاک کر دیے گئے، بڑے خوش قسمت تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی محبت ان کی گھٹی میں پلائی گئی تھی، وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں،

خدا شاہد اور میری اشفتہ مزاجیاں اس کی گواہ ہیں کہ زندگی ہر طرح کے مرحلوں سے گزری، مگر کسی عالم میں بھی وہ مکہ اور مدینہ کی یاد سے خالی نہیں رہی" اسی یاد کی بدولت اپنی آرزوؤں کی جنت میں آخری آرام گاہ پائی،

ان کی زندگی کے مرحلے کی مختصر داستان یہ ہے: وہ کیسر کلاں ضلع بلند شہر یو-پی میں سن ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد نے ان کا نام منظور حسین رکھا، مگر وہ اپنے تخلص ہی کی وجہ سے مشہور ہوئے، سن ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی سے میٹرک پاس ہوئے، سن ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد گئے، وہاں چودہ پندرہ برس رہ کر مختلف اوقات میں باب حکومت نظامت چشمہ سعدی فوج، صدر محاسبی، ہائی کورٹ، دیوانی اور نظام فوجداری میں ملازم رہے، شاید وہیں مولانا عبد القدیر بدایونی سے بیعت ہوئے، مگر معلوم نہیں پھر کیوں تصوف سے بیزار ہو گئے، وہ حیدر آباد سے نجف اشرف، کربلا، بصرہ اور مدائن کے سفر پر گئے، یہاں ان کو اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے مہاراجہ سر کشن پرشاد، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولوی عنایت اللہ، جوش ملیح آبادی، ہوش بلگرامی، نظم طباطبائی، ہادی رسوا، مسعود علی محوی، فانی بدایونی، نواب بہادر یار جنگ، نواب کاظم

بعد نواب نثار جنگ کی مجلسیں بھی ملتی رہیں۔

حیدرآباد میں وہ اپنی نعتیہ نظم ظہور قدسی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے ان کو مولانا شبلیؒ سے بڑی عقیدت تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت پر جو نظم لکھی اسکا عنوان بھی یہی رکھا جو مولانا شبلی نے اپنی سیرۃ النبی میں رکھا تھا، بڑی لمبی نظم ہے، اس میں نوّے اشعار ہوں گے، پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے جذبات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر مقدم کے ترانے گنگنانے میں بے قابو ہو رہے ہیں، اس کے احساسات کی مے عشرت چھلک رہی ہے، شادمانی کے پھولوں سے وہ لدا ہوا ہے، اس کی عقیدت کے موتی جھلملا رہے ہیں، اس کے ہر شعر میں گل ولالہ کی رعنائی ہے، وہ نعت نہیں لکھ رہا ہے، بلکہ خوشی کا گیت گا رہا ہے، ولادت کا ذکر آتا ہے تو جوش طرب میں کہتے ہیں، شہر دوسرا محمد مصطفیٰ غمگسار بے کساں، شفیع عاصیاں، نبیٔ آخری، جہان کی روشنی، مظہر شان احد، فاتح بدر واحد ہادی دین مبین، رحمۃ للعالمین، شہ کون مکان، وجہ تخلیق جہاں، رہبروں کے پیشوا، شمع بزم انبیا دست گیر بے نوا، دردمندوں کی دوا، مخبر صادق لقب، سید والانسب، چشمہ صدق وصفا، ہادی خدا، عرش کے مسند نشیں، بزم خلوت کے مکین، خاتم پیغمبراں، امیر کارواں، زندگی کے مدعا، محبوب خدا، پیکر صبر و رضا، جد شاہ کربلا، قبلہ ارباب دین، صادق الوعد امیں، دافع رنج والم، صاحب جود وکرم، رسول محتشم نبی محترم تشریف لائے، پھر سلام بھیجتے ہیں ان کے عقیدت مندانہ جذبات کا سیلاب روکے نہیں رکتا ہمارے رسول نے بیکسوں کی جو دستگیری کی، بادشاہی میں جو فقیری کی، اسرار محبت کو جس طرح سمجھایا، زخم کھا کر دشمنوں پر جو پھول برسائے، اپنے خون کے پیاسوں ۔۔۔ کو جو دعائیں دیں، گالیاں سن کر جو دعائیں دیں، سہلائی گئی، خاطر جو [illegible] ۔۔۔ [illegible] کے رہ کر جس طرح [illegible] ۔۔۔ [illegible]

درس بصیرت ہے، جس کی ذات فخر آدمیت ہے پھر اسی انداز میں کہیں گنبد خضریٰ شب معراج کے دولہا، شمع شبستانِ ازل، ابد کی بزم کے کنول، بہار گلشن عالم اور فخر جبین آدم پر درود بھی بھیجے ہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نعت کے لکھنے میں شاعر کے اندر بے پناہ عقیدت کے جذبات کارفرما تھے، یہ نعت ایسی مقبول ہوئی کہ اس کو ایک علیحدہ رسالہ میں شائع کیا گیا جس میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا تعارف ہے، اس میں وہ رقمطراز ہیں،

اس سلام میں ماہر نے حتی الوسع پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قسم کے صفات منسوب کرنے سے احتراز کیا ہے، جن میں شان نبوت سے کوئی مناسبت نہیں ہے لیکن عام شعراء جس کے انتساب میں بے باک ہیں، یہ تو ان کا سلبی کارنامہ ہے، اس کے بعد انھوں نے سیرت طیبہ کی مستند کتابوں اور احادیث کے مفید ذخیروں سے ان سچے واقعات کا انتخاب کیا ہے، جن کی توثیق و تصدیق پر محدثین اور علماء سیر کی مہریں ثبت ہو چکی ہیں، پھر انہیں واقعات صادقہ کو اپنے خاص بلیغ اور اچھوتے انداز میں نظم کا لباس پہنایا ہے،

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ۔

ان کی شعریت کے متعلق اسی قدر عرض کر سکتا ہوں کہ وہ پڑھے جاتے اور بے اختیار میرے دل سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ کر آنکھوں کی راہ سے نکل رہا تھا، اگر شعر کی بلندی پستی کا معیار اس کی تاثیری کیفیت ہے تو کم از کم اس معیار پر میرے خیال میں ان کی یہ نظم بلند مقام کی مستحق ہے،

آخیر میں وہ لکھتے ہیں،

مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ماہر القادری کا اس سلام کے بعد میلادی مجالس

سلاموں کی تاثیر وافادیت میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوگا، مسلمانوں کو چاہیے کہ آیندہ
اسی سلام کو میلاد کی مجلسوں میں پڑھنے اور پڑھانے کا دستور جاری کریں اور وہ
دن کچھ دور نہیں کہ ماہر کا یہ سلام پشاور سے برما تک اور کاٹھیاواڑ سے راس
کماری تک کے علاقوں کو فتح کرے گا،

مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اہل دل دیوبندی عالم کی یہ ستایش جناب ماہرالقادری کی نعت کے لیے حرف آخر ہے، اور یہ سلام واقعی بہت مقبول ہوا اور خدا جانے کتنی مجلسوں میں پڑھا گیا، خود ماہرالقادری صاحب کی زبان سے کتنی بار سنا گیا، ان کے پڑھنے کا انداز بھی ایسا تھا کہ وہ پڑھتے تو سننے والے کے دل سے آنسوؤں کا سیلاب بہ کر آنکھوں کی راہ سے نکلنا ناگزیر تھا، جناب ماہرالقادری نے اپنے اس سلام کو اس نعتیہ کلام کے مجموعہ کے ساتھ بھی شایع کیا، جس کا نام انھوں نے ذکر جمیل رکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں،

خدا کے پاک کے ناموں کی قسم رسول پاک کے مقدس نام کی لذت کبھی کم نہیں ہوئی، جتنی بار بھی محمد کہئے اک نیا کیف اور ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے محمد رسول اللہ سن کر یا کہہ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کجکلاہیاں بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں اللہ کے نام کے بعد اسی نام پر خاتمہ چاہتا ہوں،

اسی میں وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ

میں نے اپنے آقا و مولا کی مدح لکھ کر گناہ و معاصی کی کوشش کی ہے، اللہ کی رحمت اور نبی کی شفاعت سے کیا بعید ہے کہ یہی کام نیک وسیلۂ بخشش اور ذریعۂ نجات بن جائے قیامت کے دن ایک ہاتھ میں فرد عمل اور دوسرے ہاتھ میں ذکر جمیل ہوگی،

ذکر جمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے مختلف طریقوں سے

جو محبت و عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے عجب کیا اس نعت گو کے لیے یہی وسیلۂ بخشش ہو جائے، انھیں ایک نعت صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے ہے، جو اسی انداز میں کہی گئی جس میں نظم گذشتہ کے جواب اقبال سہیل کی نعت مدیح کوثر بہت مقبول ہوئی، وہ مجھ سے برابر کہتے رہے کہ اقبال سہیل کے بہت قائل اور معترف ہیں، اس مجموعہ کے اور دوسرے کچھ عنوانات یہ ہیں انسان گمرے پیدا شد، اسیران بدر، حریت کا مبلغ اعظم، جشن ولادت، دیار اقدس میں پیغمبر انسانیت، جانوروں سے حسن سلوک، شاہ حبشہ کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر، ساقی نامہ، اور معراج کی رات وغیرہ۔

ان کی آخری تمنا یہ تھی کہ ذکر جمیل کا کچھ حصہ دربار اقدس میں حاضر ہو کر اپنی زبان سے عرض کریں، اور اس کے بعد اسی جان حیات کے سامنے دم نکل جائے، جس کے قدموں پر جان نچھاور کرنے کے لیے دی گئی تھی، ان کی یہ تمنا بڑی حد تک پوری ہوئی، وہ ۱۹۵۲ء میں حج کے لیے گئے، ظاہر ہے کہ روضۂ نبوی کے سامنے پہنچ کر ان کی کیا قلبی کیفیات ہوئی ہوں گی ذکر جمیل کے کون کون اشعار کو نہ دہرایا ہوگا، اور اس وقت تو اپنی جان وہاں نچھاور نہیں کی لیکن ۱۹۶۱ء میں اپنے رسول کے مولد و منشاء میں سپرد خاک ہو کر اپنی آخری تمنا پوری کی۔

وہ ۱۹۵۲ء میں حج کے لیے گئے تو واپسی پر کاروان حجاز کے نام سے اپنا سفرنامہ شائع کیا، جس میں ان کی پوری تصویر نظروں کے سامنے گھومتی نظر آتی ہے، وہ اس میں لکھتے نہیں دکھائی دیتے، بلکہ جن لوگوں کو ان کی صحبت میں ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہے ان کو اس کے پڑھنے میں محسوس ہوگا کہ وہ بول رہے ہیں، اور لوگ ان کو سن رہے ہیں انھوں نے پورا سفرنامہ بہت ہی والہانہ انداز میں لکھا ہے، جب وہ حرم شریف پہنچے تو فجر کی نماز کے لیے اذان ہوئی، ان کو اس میں بڑی دلکشی محسوس ہوئی، صبح کا سہانا وقت تھا

بو قبیس کی چوٹیوں پر سپیدۂ سحر کے آثار کا آغاز ہو رہا تھا، حرم کے در و دیوار میں ان کو تجلیاں نظر آئیں، بیت اللہ کی جلالت شان، اور در و دیوار پر سیاہ غلاف کے سکوت کا باوقار منظر ان کے لئے جنت نگاہ بن گیا، اسی وقت بہت سے اشعار قلمبند کئے، جن میں سے کچھ یہ ہیں،

حرم میں اذان سحر اللہ اللہ
کہ ہیں وجد میں بام و در اللہ اللہ

یہ میزاب رحمت یہ رکن یمانی
مقامات اہل خبر اللہ اللہ

دھڑکتے ہوئے دل کا بے کس سہارا
مناجات با چشم تر اللہ اللہ

تجلی میں دھوئے ہوئے سنگریزے
یہاں کے نجوم و قمر اللہ اللہ

مقام ابراہیم پر یہ نمازیں
یہ ہر سجدہ معراج سر اللہ اللہ

جلال الٰہی کی تابندگی میں
جھلکتے ہوئے بام و در اللہ اللہ

وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت
مسلسل ہے پیش نظر اللہ اللہ

حج کے بعد جب وہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت بھی انھوں نے فی البدیہہ کچھ اشعار کہے جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا
بعد مکہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا

جیسے جنت کے دریچوں سے جھلکتی ہو بہار
پہلی منزل ہی کے انوار سحر کیا کہنا

تپش شوق بھی ہے گرمی موسم بھی ہے،
اور پھر اس پہ مرا سوز جگر کیا کہنا

خشک آنکھوں کو مبارک ہو جھیلنی شوق
ہیں رواں اشک بہ انداز دگر کیا کہنا

مدینہ منورہ پہونچ کر جب مسجد نبوی میں پہونچے تو کہتے ہیں،

* یہ سرو قامت ستون، یہ مصفا جھاڑ فانوس، یہ نظر افروز نقش و نگار الگ الگ

جو آنکھوں میں کھبی جا رہی ہے، اس ظاہری چمک دمک سے بڑھ کر جمال و رحمت کی فراوانی! جیسے مسجد نبوی کے در و دیوار سے رحمت کی خنک شعاعیں نکل رہی تھیں!

داماں نگہ تنگ، گل حسن تو بسیار   گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

کی معنویت آج سمجھ میں آئی، تجلیوں کا وہ ہجوم کہ آنکھیں جلوے سمیٹتے سمیٹتے تھکی جا رہی ہیں، یہاں کے انوار کا کیا پوچھنا، یہ آفتاب جہاں تاب بھی چارہ اس جلوہ گاہ کے ذروں کا ادنیٰ غلام ہے دائیں بائیں اوپر نیچے، ادھر ادھر روشنی ہی روشنی اور نور ہی نور، مگر لطف یہ کہ آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں، یہ آنکھوں کا نہیں خود یہاں کی تجلیوں کا کمال ہے،

انھوں نے مسجد نبوی کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، باب جبریل، جنت فاطمہؓ صفہ، مسجد قبا، اور میدان احد کا بھی والہانہ انداز میں ذکر کیا، سید نا حمزہ کے مزار، جنت البقیع، سیدہ فاطمہؓ، حضرت امام حسنؓ حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادقؒ حضرت عثمان بن عفانؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور مشہور محدث امام مالکؒ کے مزارات کی زیارت میں ان پر جو کیفیات طاری ہوئیں، ان کو بہت ہی موثر انداز میں بیان کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ایک ایک ذرہ پر دل کھنچا، اور موت بھی یاد آئی، وہ قبر پرستی کے تو قائل نہیں تھے، مگر رقمطراز ہیں کہ جنت المعلاۃ کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا، اس میں صحابہ کرام، تابعین عظام، اور اکابر اولیا آسودہ ہیں، حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر کو چھوڑ کر ہر طرف جھاڑ جھنکار اور کوڑا اور ریزوں کی بہتات اور گندگی نظر آتی ہے، یہ تو ان نفوس قدسیہ کی قبریں ہیں جو ہم سب کے مخدوم اور محسن ہیں، عام مسلمانوں کی قبروں کے ساتھ بھی یہ سلوک جائز نہیں میرے دوستو! ہی

تاثرات کی یادگار ہیں،

فغاں کروں کہ شکایت سنہوں کہ بخت سیاہ ٹ — کھڑا ہوا ہوں میں ٹوٹے ہوئے مزاروں پر

تجلیاں تو چھپانے سے چھپ نہیں سکتیں — ہزار خاک اڑائے کوئی ستاروں پر

جب وہ تصوف اور قبر پرستی کے خلاف اپنے دوستوں سے بحث کرتے، تو ان کے ان اشعار کا حوالہ دیا جاتا، وہ تھوڑی دیر کے لیے جز بز تو ضرور ہو جاتے مگر پھر اپنی طلاقت لسانی سے اپنے معترضین کو خاموش کر دیتے، مگر اس سفرنامہ میں انھوں نے یہ لکھ کر اپنی فراخدلی کا بھی ثبوت دیا ہے کہ مدینہ منورہ ہی میں ترجمان السنۃ کے مصنف مولانا بدر عالم میرٹھی سے ملاقات ہوئی، ان کے بعض حکمت آمیز نکتوں نے میرے دل کی کتنی گرہیں کھول دیں، ان کے بعض ارشادات پر میں گفتگو کر سکتا تھا، مگر میں نے بات کو طول دینا پسند نہیں کیا، رشتہ تصوف میں کچھ ایسے پیچ بھی پڑے ہوئے ہیں، جن کو سلجھانا دشوار ہے، انھوں نے بار بار کہا کہ اہل تصوف، فقہا اور مفسرین پر کوئی نیک نیتی کے ساتھ ذرا سی بھی تنقید کرتا ہے تو اس دور پر انکار و الحاد میں متشککین اور منکرین کو شہ مل جاتی ہے، اور انکار و تشکیک کے لئے مسالہ ہاتھ آجاتا ہے، یہ لکھ کر تو لکھ گئے، لیکن اپنی نجی صحبت میں تصوف کے متعلق ان کے وہی خیالات رہے جن کا اظہار اپنی نجی صحبتوں میں کرتے رہے،

ان کا سفرنامہ کاروان حجاز ان کے تمام ذہنی خیالات کا کشکول ہے، اس میں تبلیغی جماعت، تحریک پاکستان، قبر پرستی، تصوف، شاہ ابن سعود، شریف حسین، حرکون کی حکومت اور دوسرے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کھل کر کیا ہے، ان کی طبیعت میں بڑی صاف گوئی تھی، ظاہر اور باطن یکساں تھا، اس لئے ان کے دل میں جو بات ہوتی وہ ان کی زبان اور تحریر میں برملا آجاتی، مگر اس کا لحاظ ضرور رکھتے کہ خیر کے بجائے شر نہ ابھرنے پائے،

اس لحاظ سے وہ خوش قسمت تھے،

۱۹۵۹ء میں ان کے کلام کا مجموعہ فردوس کے نام سے مکتبہ چراغ راہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے شائع ہوا، اس کے کچھ عنوانات یہ ہیں، لا الہ الا اللہ، صبح سعادت، طیبہ کی زیارت ہوتی ہے، منقبت، سلام، سوئے مدینہ، نغمۂ حرم حجاز سے رخصت ہوتے ہوئے، نوائے جبریل، خلافت الٰہی، مغربی تہذیب، مسلمان عورت سے، سجدۂ تکبیر، اشتراکیت وغیرہ ان کے کچھ برق پارے اور کچھ غزلیں بھی اس میں ہیں، ان کی شاعری پر تبصرہ مختصر طریقہ پر یہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے سامنے ایک مقصد تھا ان کا مقصد ان کی شاعری پر چھایا ہوا ہے، انکے نقاد کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مقصد نے ان کے فن شاعری کو دبا رکھا ہے، وہ اپنے مقصد کی ترویج اپنے زور کلام کے ذریعہ جس طرح کرتے رہے، اس سے ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی، لیکن وہ دب کر اپنی شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے انکے خیالات سے چاہے کوئی کتنا ہی اختلاف کرے لیکن وہ آخر وقت تک ایک جواں ہمت اور جواں حوصلہ شاعر رہے، یہ بانگ دہل کہا،

میں کسی خوف سے خاموش نہیں رہ سکتا　　ظلمت شام کو میں صبح نہیں کہہ سکتا

وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے معتقد تھے، اور ان کے جو خیالات تھے، وہی اپنی شاعری میں پیش کرتے رہے، وہ اسلام پسند شاعر کہلانے میں، فخر محسوس کرتے رہے، رہی ان کی غزل گوئی تو بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں،

اب وقت ہے کہ شعر و ادب کی زبان سے　　مفہوم لا الٰہ بتاتے ہوئے چلیں

اور اپنے اس جذبہ پر ان کو پورا اعتماد رہا، اس لئے کہتے ہیں،

مرا ہر شعر آئینہ شاہدِ آیات قدرت ہے،　　وہاں جذبِ یقین کی ترجمانی ہو جہاں میں ہو

تو وہ اپنی قادرالکلامی سے اس میں غزل کی وہ ساری خوبیاں پیدا کر سکتے تھے، جو غزل کے اجزائے ترکیبی کے لیے ضروری ہیں، ان میں وہ نغمہ، ترنم، موسیقیت، ایمائیت، جذباتیت اور کیفیت پیدا کر کے نرالی شان پیدا کرتے رہے، ان کی اس غزل کو پڑھ کر کون ہے جس میں کیف و سرور نہیں پیدا ہو سکتا ہے،

جب غم کی لطافت بڑھتی ہے، جب درد گوارا ہوتا ہے
اشکوں میں تبسم ڈھلتا ہے، فریاد میں نغمہ ہوتا ہے
فرقت کی بھیانک راتوں میں کیسا طرفہ تماشا ہوتا ہے
شمعیں بھی فروزاں رہتی ہیں اور گھر میں اندھیرا ہوتا ہے
بیمار کی حالت کیا کہیے درد آخری حد میں آپہونچا
پرسش کا زمانہ بیت گیا تسکین سے اب کیا ہوتا ہے
سورج کی شعاعیں افسردہ، آنکھیں پرنم، دل پژمردہ
اک جب بھی سویرا ہوتا تھا اک اب بھی سویرا ہوتا ہے
وہ یاد سلامت ہے جب تک دنیا کے غموں کی کیا پروا
کانٹوں میں بھی رہ کر اے ہمدم پھولوں میں بسیرا ہوتا ہے
سمجھو تو خوشی سب کچھ ہے، دیکھو تو خوشی کچھ بھی نہیں
آواز بھی ہے، الفاظ بھی ہیں مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے
ماہر مرے شعروں کے خاکے اس طرح مرتب ہوتے ہیں
کچھ دل بھی تقاضا کرتا ہے، کچھ ان کا اشارا ہوتا ہے

انھوں نے کچھ افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں، جن کے نام یہ ہیں، انگڑائی، طلسم حیات،

حسن و شباب ، نگینے ، جب میں جوان تھی ، کردار اور کالج ہاؤس وغیرہ ، اسلام کے موضوع پر ان کے چھوٹے چھوٹے رسالے آخری رسول ، خدا اور کائنات ، دریتیم ، اور نقش توحید بھی شائع ہوئے ، ان کے روزنامچے اور خطوط بھی طبع کئے گئے ہیں ۔

ان کے اشعار کے اور دوسرے مجموعوں کے نام نغمات ماہر ، جذبات ماہر اور محسوسات ماہر ہیں ، اور بھی کچھ چھپنے کو باقی رہ گئے ہوں گے ، ان تمام مجموعوں کو سامنے رکھ کر آئندہ ان کے شاعرانہ کمالات پر مقالے لکھے جائیں گے ، وہ فاران جس انداز میں نکالتے رہے وہ خود ایک بڑا کارنامہ ہے ، ہند و پاکستان دونوں جگہوں کے ارباب قلم کو ڈر لگا رہتا کہ کہیں فاران کے مدیر کی نظر ان کی تحریروں پر پڑ گئی تو وہ زبان و بیان اور فکر کی ساری خامیوں کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیں گے ، اس طرح وہ فاران کے ذریعہ سے علم و ادب کے بڑے محتسب بھی رہے ، فاران میں نقش اول کے عنوان سے جو کچھ لکھتے ، وہ اس برصغیر میں شوق سے پڑھا جاتا ، ان کے مجموعے بھی اگر شائع ہوں گے تو آئندہ ان سے بڑی علمی بصیرت حاصل ہوگی ، انھوں نے فاران میں جو مضامین لکھے ہیں ، ان کو بھی کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ہے ، ان سے علم و ادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا ، فاران کا جو سیرت نمبر ان کی ادارت میں نکلا تھا وہ بھی کتاب کی صورت میں شائع ہو جائے تو یہ بھی ایک بلند علمی کام ہوگا ، انھوں نے اس کے نقش اول میں لکھا تھا :

”دنیا اگر فوز و فلاح اور سکون و اطمینان چاہتی ہے ، تو اسے چاہئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات کے مطابق اپنے کو بدلے ، چاہے اس تبدیلی میں معاشرے کی ایک ایک اینٹ کو کیوں نہ اکھیڑنا پڑے مگر نہیں ہو سکتا کہ تمدن و تہذیب اور معاشرے کی غلط کاریوں سے ۔۔۔۔۔۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں ایک شوشہ کی بھی تبدیلی گوارا کر لی جائے، زندگی اور ترقی تمام تر اسوۂ حسنہ کی اتباع کا نام ہے، جہاں یہ اتباع نہیں وہاں رجعت ہے زوال ہے، اور موت ہے۔

ان کا یہ پیغام دنیا کے تمام گوشوں تک تو نہ پہونچ سکے گا، مگر پاکستان تو ان کے اس پیغام کو کم از کم سن کر اس پر غور کر سکتا ہے۔

ان کو سیر و سیاحت کا بھی بڑا شوق تھا، ۱۹۶۹ء میں جنوبی اور مشرقی افریقہ کی دعوت پر وہاں کے مشاعرے میں شرکت کی تو روم، اسپین اور انگلستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے کراچی واپس آئے، لندن تو مشاعرہ میں غالباً کئی بار گئے۔

وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، خدا جانے ان کے بھائی مسرور حسین پر کیا گزری ہوگی معلوم نہیں پاکستان کے علم و ادب کے حلقوں میں ان کے بغیر جو بے رونقی آگئی ہے، وہ پھر کب واپس آئے گی ان کے احباب ان کی بذلہ سنجیوں سے محروم ہو کر جو سوگوار ہوئے ہونگے ان کی سوگواری کب ختم ہوگی، مولانا ظفر احمد انصاری ان سے مل کر اپنے بڑھاپے میں جو جوانی کی جو رعنائی محسوس کرتے تھے، وہ اب ان کا بیشتر بقیۂ زندگی میں شاید ہی محسوس ہو، انکی وفات پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اشکبار آنکھیں معلوم نہیں کتنے دنوں کے بعد خشک ہوں گی، وہ اپنی نظموں عشق رسول کی تابنا کیوں، اسلام کے تمام پر دل کی اپنی دھڑکنوں کی بدولت کوثر و تسنیم کے کنارے ضرور کھڑے ہونگے، مگر اپنے تمام ملنے والوں کو اپنا یہ پیام چھوڑ گئے ہیں،

ماہر میں محبت کے صحیفوں میں ملوں گا،

ڈھونڈیں جو کبھی مجھکو میرے ڈھونڈنے والے

ادبیات

غزل

از

ڈاکٹر سلام سندیلوی شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی

اپنے داغوں کا ترے سامنے خرمن رکھ دوں
میری خواہش ہو ترے ہاتھ پہ گلشن رکھ دوں

اشک برساؤں ترے عارضِ گلگوں پر میں
جی میں آتا ہے کہ انگارے پہ ساون رکھ دوں

اپنی راحت کے لئے کیوں میں اسے دوں زحمت
شاخِ بوسیدہ پہ کیوں بارِ نشیمن رکھ دوں

کچھ زباں سے نہیں کہتی ہے یہ غم دل شبنم
اس کے منھ میں ذرا برگِ گلِ سوسن رکھ دوں

آپ کرتے ہیں زمیں پر مہ و انجم کی تلاش
آپ کے سامنے اشکوں بھرا دامن رکھ دوں

شرم کی وجہ سے نطق رہ نہیں کرتی ہے
چشمِ نرگس پہ ذرا پلکوں کی چلمن رکھ دوں

کتنے تارے ہیں مگر پھر بھی ہے ظلمت ہر سو
چرخ پر داغِ جگر کا مہِ روشن رکھ دوں

کچھ تو ہمدردی کے جذبات سے وہ واقف ہو
سنگ میں آئینے کے قلب کی دھڑکن رکھ دوں

غیر کے دل کا بھی ارمان نکل جائے سلام
برق کے سامنے خاشاکِ نشیمن رکھ دوں

مطبوعات جدیدہ

قصاص عثمان جلد اول، مرتبہ جناب محمد کاظم عثمانی ہارونی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، بہتر صفحات ۱۴۴، قیمت ۶ر، پتہ از مصنف، ۱۹۰۔ A دائرہ شاہ اجمل الہ آباد ۳ یو، پی

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت اسلامی تاریخ کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے، باغیوں کی ریشہ دوانی سے حالات اتنے پیچیدہ ہوگئے کہ قاتلوں اور ان کے ہم نواؤں کو سزا بھی نہ دی جا سکی، سبائیوں کی فتنہ پردازی نے امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور افتراق و انتشار کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کا انسداد آج تک نہ ہو سکا، مگر مصنف کا یہ اصل مدعا ان کی ژولیدہ بیانی کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ گیا ہے، صحابہ کرام کی عزت وتکریم بھی زیر بحث آگئی ہے، اظہار خیال میں احتیاط کے بجائے انتہا پسندی اور بے باکی سے کام لیا ہے، حضرت علیؓ کی سیرت کو داغ دار کر دیا ہے، انھیں ضدی اور حصول خلافت کا شائق بتایا ہے (ص ۵۰ و ص ۶۲) مصنف کو اپنے بارہ میں خیال ہے کہ انھوں نے جو "صدائے حق" بلند کی ہے، وہ گذشتہ چودہ سو برس میں کسی نے نہیں کی تھی (ص ۲۲) غالباً اسی احساس اور خوش فہمی نے ان کو امت کے اکابر اور مفسرین کرام کے بارہ میں اس قدر جری بنا دیا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اصحاب عشرہ مبشرہ پر طعنہ زنی اور اتہام انگیزی کی (ص ۶۴) ان کو امت کے اندر کوئی شخصیت محفوظ و مصئون نظر نہیں آتی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اسلام کو کچھ انھوں نے کچھ نہیں کیا (ص ۹۵) جب صحابہ و تابعین کے بارہ میں خیالات یہ ہیں تو مفسرین

غریب کس شمار میں ہیں، ان پر تحریف اور حذف واضافہ کا الزام عائد کیا ہے (ص ۱۸) — حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے پیدا ہوئے، ان کے دوررس اثرات ہماری تاریخ پر پڑے ہیں، مگر ایسا نہیں کہ راہ حق اور صراط مستقیم نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، سبائیوں کی سازشیں اور فتنہ انگیزیاں مسلم ہیں، لیکن حضرت علیؓ اور کبار صحابہ کی ذات محل نظر نہیں ہوسکتی، مصنف اپنی کتاب کو تحقیق کا شاہکار سمجھتے ہیں (ص ۱۹ – ۲۱) ان کا یہ دعویٰ واقعات کی روشنی میں صحیح ثابت نہیں ہوتا ہے، حضرت عثمانؓ کے بعد فتوحات کا انکار تاریخ کا انکار ہے، امویوں، عثمانی ترکوں اور تیموریوں کی فتوحات ناقابل انکار ہیں، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں لاکھوں میل کا رقبہ ان کے عہد میں اسلامی مملکت میں شامل ہوا۔ مصنف اپنی انتہا پسندی میں حضرت علیؓ کو خلفاء راشدین میں شمار نہیں کرتے ہیں (ص ۹۴) مگر یہ پوری امت کے اجماع کے خلاف ہے، صحابۂ کرام کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ وہ حافظ قرآن تھے، مگر محافظ قرآن نہ تھے، بہت ہی قابل اعتراض ہے، صحابہ اگر قرآن مجید کی حفاظت نہ کرتے تو آج ہمارے پاس قرآن مجید محفوظ شکل میں کس طرح پہونچتا؟ حضرت عثمانؓ کا قصاص نہ لئے جاسکنے کے اسباب تھے، جو تاریخ کے اوراق میں کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر مصنف ان واضح حقائق کو نظرانداز کرگئے ہیں۔ خیالات کی طرح تحریر میں بھی ناہمواری ہے، اس کتاب کے مباحث ومضامین میں کوئی ربط وتسلسل نہیں، الفاظ اور فقرے تک بے محل استعمال کئے گئے ہیں، مثلاً میرے جذبات کے اظہار کا یہ ایک پرکیف منظر ہے، میں اسے رو رو کر لکھ رہا ہوں (ص ۳۰) جب پرکیف منظر ہے تو ہنس ہنس کر لکھنا چاہئے تھا نہ کہ رو رو کر، حکم کی جمع ہر جگہ احکامات لکھی ہے، تفسیر اور آواز کو مذکر اور حالات کو مونث لکھا ہے، بزرگوں نے مشاجرات صحابہ کے باب میں سکوت اور کف لسان کی تاکید کی ہے، مصنف ایک مشہور مذہبی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں، لیکن انھوں نے صحابۂ کرام اور ان کے دور کی جو تصویر

پیش کی ہے، اس کے بعد خود ہی غور کریں کہ کہاں تک مسلمانی ہے؟

قصیدۃ الاعشیٰ الکبیر فی مدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ تصحیح وتحقیق

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب، صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، تقطیع کلاں،

کاغذ متوسط ٹائپ صفحات ۲۵، قیمت درج نہیں، ناشر مکتبہ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اعشیٰ عرب جاہلیت کے ممتاز شعراء اور اصحاب معلقات میں تھا، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملا، مگر اسلام کی سعادت نصیب نہ ہوئی، وہ قبول اسلام کے ارادہ سے دربار نبوت میں حاضر ہونے جا رہا تھا، لیکن رؤسائے قریش نے روک دیا، اس موقع کے لئے اس نے جو قصیدہ کہا تھا اس کے اشعار اعشیٰ کے کلام کے متعدد مجموعوں کے علاوہ تاریخ وادب عربی کی کتابوں میں موجود ہیں، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے آکسفورڈ کے قیام کے زمانہ میں لیڈن کے کتبخانہ میں امرؤ القیس اور اعشیٰ کے کلام کے ایک قلمی مجموعہ میں یہ قصیدہ بھی دیکھا، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ابو عمرو شیبانی کی روایت سے ہے جب کہ دوسرے مجموعوں میں وہ ابو العباس ثعلب کی روایت سے نقل ہوا ہے، علاوہ ازیں اس میں قصیدہ کی شرح بھی تھی، گو شارح کے نام کی تشریح نہیں، تاہم ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ ابو الغنائم مسلم بن محمود شیزری کی شرح ہے اب انھوں نے علمی وادبی خدمت کے خیال سے اس قصیدہ اور اس کی شرح کو مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، حاشیہ میں حوالوں کی تخریج، روایتوں کے فرق و اختلاف کی تصریح، مشکل الفاظ کی وضاحت اور اسماء و اعلام کے مختصر ترجمے دیئے گئے ہیں، شروع میں ان کے قلم سے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی ہے، اس میں اعشیٰ کے شاعرانہ کمالات، قصیدہ کا پس منظر، اس کی اہمیت اور زیر نظر مخطوطہ کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، عام خیال ہے کہ اعشیٰ صلح حدیبیہ کے بعد خدمتِ نبوی میں حاضر ہونے کے قصد سے نکلا تھا اور اس کو رئیس مکہ ابو سفیان نے سو اونٹ دے کر

واپس کر دیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے بھی مقدمہ میں اسی روایت کو نقل کیا ہے، لیکن ان کے شائع کردہ نسخہ کی شرح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے، اور اس زمانہ کے رؤسا عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل نے اعشیٰ کو روکا تھا، ڈاکٹر صاحب نے دونوں روایتوں کے تضاد پر کوئی گفتگو نہیں کی ہے، انھوں نے مقدمہ میں بعض علمائے ادب کی اس رائے کا ذکر تو کیا ہے کہ "اعشیٰ کی جانب اس قصیدہ کی نسبت صحیح نہیں ہے" لیکن خود اس کی صحت و عدم صحت پر کوئی بحث نہیں کی، جس سے پتہ چلتا کہ ان کے نزدیک یہ قصیدہ واقعۃً اعشیٰ کا ہے یا نہیں۔

انتخاب کلام آصف سابع، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰ علاوہ فہرست ودیباچہ، مجلد، پتہ: دفتر معتمدی، ایچ، ای، ایچ دی نظامس ٹرسٹس پریڈ ویلا، فتح میدان کلب، حیدرآباد، آندھرا پردیش۔

اردو زبان کی ابتدا ہی سے حیدرآباد دکن اس کا مرکز رہا ہے، بہمنی دور میں اردو شاعری کا یہاں آغاز ہوا، اور اس نے عہد قطب شاہی وعادل شاہی میں ترقی کی منزلیں طے کیں، ان حکمرانوں نے شعروادب اور علوم وفنون کی سرپرستی کی جو روایت قائم کی تھی، وہ آصف جاہی دور میں بھی نہایت شان سے قائم وبرقرار رہی، اس خانوادہ کے امرائے ذی شان علم پروری وادب نوازی کے ساتھ خود بھی شعروسخن کا مذاق رکھتے تھے نظام الملک آصف جاہ سابع کا دور اس حیثیت سے زیادہ ممتاز ہے، اردو یونیورسٹی انھیں کے دور میں قائم ہوئی، انجمن ترقی اردو کی بنیادیں مستحکم ہوئیں، مولانا شبلی مرحوم اور دارالمصنفین بھی ان کی فیاضیوں سے متمتع رہے ہیں، سیرۃ النبی کی پہلی جلد شائع ہوئی تو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں نذر کیا جس کو

ملاحظہ فرماکر بہت مسرور ہوئے اور دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ جاری کیا، وہ خود بھی صاحب علم و کمال تھے اور شعر و سخن کا ستھرا اور عمدہ مذاق رکھتے تھے، شاعری مدت العمر ان کا مشغلہ رہا، اس لئے کلام کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑ گئے ہیں جس کی اشاعت کے لئے خود اپنی زندگی ہی میں ایک ٹرسٹ اور جمع و ترتیب کے لئے ایک کمیٹی مقرر کردی تھی، کمیٹی کلام کو اکٹھا کر کے مرتب کر چکی ہے، مگر ابھی مکمل کلام کی اشاعت میں تاخیر ہوگی۔ اس لئے ٹرسٹ نے سردست دو منتخب مجموعے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ پہلا مجموعہ ہے جو اردو و فارسی قطعات، قصائد، نعت و منقبت اور غزلوں کے علاوہ بعض نثریوں پر مشتمل ہے۔ ان کا ادبی ذوق پختہ اور مطالعہ گہرا تھا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے بقول "وہ اردو شعر کی عظیم روایت کے محافظ اور ضامن تھے" کلام میں سادگی، زبان و بیان میں صفائی، سلاست، روزمرہ اور محاوروں میں بے ساختگی، تشبیہ و استعارات میں دلکشی اور طرز ادا میں لطافت ہے، ان کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص عقیدت اور والہانہ تعلق تھا۔ اس لئے نعتوں میں جوش، مستی اور سرشاری کی عجیب کیفیت ہے۔ وہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ اور شہدائے کربلا سے بھی غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن ان سے متعلق شاعری میں تفضیلی رنگ آگیا ہے، شروع میں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے قلم سے ایک دیباچہ ہے۔ اس میں کلام پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام ارباب ذوق کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے،

حج مسنون: مرتبہ ۔ مولانا مختار احمد ندوی، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ الدار السلفیہ محمد علی بلڈنگ، مومن پورہ، مولانا محمد علی روڈ بمبئی

اردو میں حج پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس کے لائق مصنف کو اللہ نے حج و زیارت کی کئی بار سعادت عطا کی ہے، اس لئے ان کو حج کے احکام و مسائل سے عملاً واقفیت ہے، اور انھوں نے حج کی حقیقت، اہمیت اور فضیلت نیز اس سے متعلق اکثر ضروری اور اہم باتیں اس کتاب میں اختصار سے تحریر کی ہیں، اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ تمام مسائل و مناسک کتاب و سنت کے حوالے سے تحریر کئے گئے ہیں، اور مزید سہولت کے لیے نمبروار ان کا خلاصہ بھی دے دیا گیا ہے، مصنف نے حج کے سلسلہ کی بدعتوں اور غلط رسموں کی تردید پر بھی پورا دھیان دیا ہے، البتہ وہ اہل حدیث ہیں، اور اسی مسلک کے مطابق احکام و مسائل تحریر کئے ہیں، اس لئے بعض مسائل سے دوسرے فقہی حلقوں کو اتفاق نہ ہوگا، لیکن کتاب مفید اور ہر شخص کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے، زبان عام فہم اور پیرایہ بیان دلنشین ہے،

ائمہ اربعہ از مرتبہ مولانا ابو العرفان ندوی تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۰، قیمت دو روپے پچیس پیسے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مولانا ابو العرفان ندوی نے بہت عرصہ پہلے لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالہ صبح صادق کے لئے ائمہ اربعہ کے حالات لکھے تھے، اب مکتبہ جامعہ نے ان کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اردو میں غالباً ابھی تک ان ائمہ کے حالات کسی کتاب میں یکجا نہ تھے، یہ مضامین اوسط درجہ کے لوگوں کے لئے لکھے گئے تھے، اس لئے ان میں ائمہ اربعہ کے فقہی کارناموں اور ان اہم مسائل سے تعرض نہیں کیا گیا ہے، جو عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے، بلکہ مختصر حالات اور بعض موثر اور سبق آموز واقعات زندگی کے ذکر ہی پر اکتفا کیا گیا ہے، کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے، اس لحاظ سے کامیاب اور مختصر ہونے کے باوجود مفید ہے،

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۲۴

ماہ جولائی ۱۹۷۹ء تا دسمبر ۱۹۷۹ء

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	پروفیسر سید امیر حسن عابدی دہلی یونیورسٹی	۲۱۵	۷	جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش	۳۴۶
۱	جناب مولوی حبیب الرحمن صاحب ندوی مئو، اعظم گڈھ	۳۰۳	۸	ڈاکٹر شعیب اعظمی ریڈر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ دہلی	۱۳۳
۲	جناب ریاض الدین احمد صاحب سابق پرنسپل حمیدیہ کالج الہ آباد	۱۹۹	۹	سید صباح الدین عبد الرحمن	[illegible]
	ڈاکٹر ریاض الرحمن خاں شیروانی ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۳۷۴، ۴۳۷	۱۰	ضیاء الدین اصلاحی	[illegible]
	جناب زہرہ عرشی صاحبہ رام پور	۶۱	۱۱	ڈاکٹر ظہور رضوی برق صدر شعبۂ فارسی و اردو جین کالج آگرہ	۲۶۴
	مولانا سید سلیمان ندوی	[illegible]			

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۲	عبدالسلام قدوائی ندوی	۳۲۳، ۳۴۲
۱۳	جناب سید عزت النساء ایم اے ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	۲۲۱
۱۴	ڈاکٹر محمد شمس الحق شمسی لکچرر پوسٹ گریجویٹ عربک کالج پرشین انسٹی ٹیوٹ پٹنہ	۳۹
۱۵	جناب محمد صدر الحسن متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۲۲۶
۱۶	حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین	۸۲
۱۷	محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے علیگ ندوی رفیق دارالمصنفین	۲۰۳
۱۸	محمد منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین	۳۳، ۴۶۹
۱۹	جناب سید محمد ہاشم صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۹۱
۲۰	شاہ نصیر احمد پھلواروی معاون رفیق دارالمصنفین	۵۳، ۳۹۱
۲۱	ڈاکٹر سید وحید اشرف ریڈر شعبہ عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی	۱۰۰

شعراء

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	اثیر جناب مصطفےٰ علی اثیر خلف منشی ممتاز علی صاحب آہ مرحوم تلمیذ امیر مینائی	۲۳۱
۲	جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ رامپور	۲۱۲
۳	جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری	۴۵، ۳۴۳
۴	ڈاکٹر سلام سندیلوی کالیبۃ شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی	۱۵۴
۵	جناب صالحہ عرشی	۳۳۲
۶	جناب طفیل احمد صاحب مدنی آبادی	۴۵
۷	عشق جناب عبدالباری صاحب عشق خلف منشی ممتاز علی صاحب آہ مرحوم تلمیذ امیر مینائی	۳۴۳

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۲۲)

ماہ جولائی ۱۹۷۸ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۲

جلد ۱۲۲ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۸ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

عرصہ ہوا ایک مجلس میں بہت سے لوگ جمع تھے، سیاسی مسائل زیر بحث تھے، اور اقوام عالم کی طاقت و صلاحیت کا جائزہ لیا جا رہا تھا، اس موقع پر ایک نوجوان مسلمان نے کہا کہ ہم دنیا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، دنیا کے گوشے گوشے میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں، اس وقت ان کی تعداد ستر کروڑ سے بھی متجاوز ہے، لاکھوں میل کا رقبہ تو ایسا ہے جہاں ہم ہی ہم ہیں، اس مجلس میں ایک جہاں دیدہ اور زمانہ کے سرد و گرم چشیدہ بزرگ بھی موجود تھے، انھوں نے اس نوجوان کو خطاب کرکے کہا محض تعداد کی زیادتی سے کیا ہوتا ہے؟ سیکڑوں جانوروں کے گلہ کو ایک بچہ ہنکا کر جدھر چاہتا ہے، لے جاتا ہے، اصل تو صلاحیت و لیاقت ہے، جب یہ نہیں تو کروڑوں کی تعداد بھی بیکار ہے، یہ کہکر ان بزرگ نے آہ سرد بھری اور کہا کہ تم کہتے ہو کہ مسلمان ستر کروڑ ہیں لیکن میں کہتا ہوں، اے کاش ستر ہزار ہی ہوتے مگر ہوتے مسلمان۔

اس بات کو سنے ہوئے بہت دن ہو گئے، اب وہ بزرگ دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کے الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں، تاریخ کے اوراق ان کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں قرون اول کے مسلمانوں نے تعداد کی قلت سامان کی کمی، اور مشکلات و موانع کے باوجود عزم و حوصلہ اور ہمت و جانبازی کے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جن پر آج تک دنیا محو حیرت ہے، ان کی شجاعت و عزیمت کا یہ حال تھا کہ جب مدینہ منورہ میں پہلی مردم شماری ہوئی، اور مسلمانوں کی تعداد پندرہ سو

نکلی تو انھوں نے ایک پرزور نعرہ لگایا، اور کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم ڈیڑھ ہزار ہوگئے ہیں، اب ہمیں دنیا میں کون دبا سکتا ہے یہ محض خالی الفاظ نہ تھے، بلکہ ان کے پیچھے ایمان و یقین اور عزم و ہمت کا زور تھا، انھوں نے زبان سے جو کچھ کہا تھا، اسے سچ کر دکھایا، اور چند ہی برس میں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں ان کی فتح و کامرانی کے پھریرے اڑنے لگے، دنیا کی عظیم الشان حکومتیں، دل بادل فوجوں کے ساتھ ان کی راہ روکنے کے لئے بڑھیں، مگر سارا لاؤ لشکر اس سیل رواں کے سامنے تنکے کی طرح بہہ گیا، اور عرب کے شتربانوں نے ایرانی و رومی شہنشاہی کے پرخچے اڑا دیئے،

یہ انقلاب اس تیزی کے ساتھ ہوا، اور دنیا کے اتنے طویل اور عریض خطہ میں ہوا کہ مورخین آج تک اس کی توجیہ سے عاجز ہیں، اگر تاریخ کی مستند اور ناقابل انکار شہادت موجود نہ ہوتی تو یہ واقعات افسانے معلوم ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب کے تہی مایہ اور بے برگ و بار بدوؤں نے چند برسوں میں سارے عالم کو زیر و زبر کر ڈالا، اور جہاں بانی و جہاں آرائی، تہذیب و تمدن، علم و فن، اور اخلاق و شائستگی کا ایسا روشن نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ صدیوں کے بعد بھی اس کی آب و تاب میں کمی نہیں آئی،

یہ سب تعداد کی قلت کی حالت میں ہوا، لیکن ان کا کردار بلند، سیرت پاکیزہ، اور دل نور ایمان سے منور تھے، لیکن آج ان کے نام لیوا کروڑوں کی تعداد میں ہیں مگر خس و خاشاک سے زیادہ ان کی وقعت نہیں ہے، ان کے پاس حکومتیں بھی ہیں، دولت بھی ہے، ساز و سامان بھی ہے، مگر دل بے نور، دماغ کند، اور دست و بازو شل ہیں، ان کے اندر نہ جوش عمل ہے نہ ولولۂ کار، نہ عزیمت صادقہ ہے نہ ہمت مردانہ، عیش پسندی، اور عافیت کوشی ان کا شیوہ ہے، ان کے اندر نہ کسی اقدام کی ہمت ہے نہ

کسی حریف سے ٹکر لینے کا حوصلہ، وہ محض نعروں سے دشمنوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں، پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر لکھنؤ کے ظریف اخبار اودھ پنچ نے جرمن توپوں کو مخاطب کرکے ایک طنز آمیز نظم شائع کی تھی، جس کا ایک مصرع یاد ہے، ع :- جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلادیں گے،

اس ظریف اخبار نے کم از کم بانس چلانے کا تو حوصلہ کیا تھا، مگر آج مسلمان حکومتوں میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے، عرب جن کے بعض بزرگوں نے ایران و روم کی سطوت و جبروت کو خاک میں ملا دیا تھا، ان کے نام لیوا آج اسرائیل جیسی چھوٹی حکومت کے ہاتھوں مسلسل زک پر زک اٹھا رہے ہیں، اور کچھ بنائے نہیں بنتی، [illegible] برس پہلے جب لارڈ بالفور نے فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کا اعلان کیا تھا تو عرب چلا چلا کر کہہ رہے تھے، دیکھتے ہیں کہ اسرائیلی حکومت کس طرح قائم رہتی ہے، انگریزوں کے ہٹتے ہی دم کے دم میں ہم اسے نیست و نابود کر دیں گے، اسرائیلی حکومت عربوں کے درمیان اس طرح گھری تھی کہ عرب متحد ہوتے تو کب کی فنا ہو چکی ہوتی لیکن انھیں اسرائیل سے زیادہ اپنے بھائیوں کو زیر کرنے کی فکر تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر معرکہ میں عربوں کو شکست ہوئی، اور اپنا علاقہ دشمن کے حوالہ کرنا پڑا، لیکن اس دلخراش تجربہ کے بعد آج بھی اتحاد باہمی مفقود ہے، اور رزم ہو یا بزم ہر جگہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے،

میری صحت ابھی تک قابلِ اطمینان نہیں ہے، بخار جا رہا، مگر جگر اور طحال کا ورم ہنوز باقی ہے، علاج جاری ہے، اور ڈاکٹر جلد بحالی صحت کے متوقع ہیں، خدا کرے میں جلد اس قابل ہو جاؤں کہ مستعدی کے ساتھ دار المصنفین کی خدمات انجام دے سکوں،

مقالات

یہود اور قرآن مجید

از

ضیاء الدین اصلاحی

ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

خزی | قرآن مجید نے یہود کی سزاؤں میں اس کو بھی بیان کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ اُن کے اس طرز عمل کا ذکر ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی ان باتوں کو مانتے ہیں، جو اُن کی خواہشات کے مطابق ہوتی ہیں لیکن ان باتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں، جو ان کی مرضی اور خواہشات کے خلاف ہوتی ہیں، ایسی ناروا حرکت کرنے والوں کا انجام یہ ہوگا،

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں اُن
اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ	کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ	کے سوا اور کچھ نہیں، اور آخرت میں
الْعَذَابِ ؕ	یہ شدید ترین عذاب کی طرف لوٹائے
(بقرہ - ۸۵)	جائیں گے،

سورہ مائدہ میں خدا کی آیتوں میں اُن کی تحریف اور اُن کے احکام میں قطع و برید

کا انجام بیان کیا ہے :۔

اولئک الذین لم یرد اللہ ان	یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ
یطھر قلوبھم، لھم فی الدنیا	نے پاک کرنا نہیں چاہا، ان کے لئے
خزی ولھم فی الاٰخرۃ عذاب	دنیا میں بھی رسوائی ہے، اور
عظیم،	آخرت میں بھی ان کے لئے بڑا
(مائدہ : ۴۱)	عذاب ہے،

یہود ونصاریٰ نے اپنی گروہ بندی اور باہمی عناد کی بنا پر ایک دوسرے کے معابد کو مسمار کیا، بیت المقدس میں ایک نے دوسرے کو ذکر وعبادت سے روکا، اس سلسلہ میں ان کے درمیان خونریز جنگیں ہوئیں، ان کی ان حرکتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا :۔

لھم فی الدنیا خزی ولھم فی	ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور
الاٰخرۃ عذاب عظیم ۔	آخرت میں عذاب عظیم ہے،

(بقرہ : ۱۱۴)

ابھی آپ یہود کی ذلت پستی، اور رسوائی کا مجمل ذکر ہوا ہے، قرآن نے اس کی چند صورتیں بھی بیان کی ہیں، یہاں ان کی مختصر تفصیل اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ اوپر ان کی مغضوبیت، ملعونیت، اور ذلت ورسوائی کا جو ذکر ہوا ہے، ان سب کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے،

وادی تیہ میں سرگردانی | بنی اسرائیل اکثر خانہ بدوشی اور جلا وطنی کی مصیبت میں مبتلا رہے، اور کبھی ایک جگہ ان کو چین سے رہنا نصیب نہ ہوا، حضرت ابراہیمؑ کا وطن بابل (عراق) تھا، مگر انھوں نے اپنے بیٹے حضرت اسحٰقؑ کو فلسطین میں بسایا، ان کے فرزند حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کے

بیٹوں نے رشک وحسد میں اپنے چھوٹے بھائی حضرت یوسفؑ کو ایک کنویں میں ڈال دیا، لیکن قدرت الٰہی نے انھیں مصر کے تخت حکومت تک پہنچا دیا، اور اس طرح ان کے والد اجداد وغیرہ اعزا مصر پہنچ گئے، یہاں عرصہ تک وہ عزت وراحت کے ساتھ رہے، لیکن حضرت یوسفؑ کے بعد آہستہ آہستہ اُن کے اندر اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ فراعنہ کے ہاتھوں بنی اسرائیل ذلت وخواری میں مبتلا ہوئے، بالآخر خدا نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ انھیں فرعون کے مظالم سے چھٹکارا دلایا، اس کی سزا یہ دی گئی کہ وہ چالیسؔ سال تک خانہ بدوشوں کی طرح حیران وسرگرداں پھرتے رہے،

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ	خداوند نے فرمایا تو یہ سرزمین ان پر
اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ	چالیسؔ سال کے لئے حرام ٹھہری، یہ
فِى الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ	لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے، سو
الْفٰسِقِيْنَ،	تو اے موسیٰ ان نافرمان لوگوں
(مائدہ ۴-۲۶)	کا غم نہ کھا،

اس کے بعد وہ جس ذلت وخواری کے ساتھ ادھر ادھر منتشر پھرتے رہے اس کی طرف اس مضمون میں پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، آگے ان کے خوف ودہشت، قید وبند اور جلاوطنی وبربادی کے بعض واقعات بیان کئے جائیں گے،

بنی اسرائیل کی ذلت وانتشار کا ایک واقعہ | حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے، ان کی مذہبی واخلاقی حالت بہت خراب تھی، ان پر ان کے دشمنوں کی ان پر یورش تھی، فلسطینی ان کا قتل عام کر رہے تھے، اور اُن کے خوف سے بنی اسرائیل اعقرون سے لے کر جات تک کے بڑے بڑے سارے شہر خالی کر دیتے تھے، قرآن مجید کی مذمت ولیل

آیت میں اسی کی طرف یوں اشارہ ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوا مِنْ	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوفٌ حَذَرَ	جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے
الموت،	باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں
(بقرہ ۲۴۴)	سے بھاگ کھڑے ہوئے،

بنی اسرائیل اس بیچارگی اور ذلت سے اس قدر تنگ اور پریشان تھے کہ حضرت سموئیلؑ سے انھوں نے درخواست کی، کہ ایک امیر مقرر کر دیں تاکہ اس کی سربراہی میں وہ دشمنوں کا مقابلہ کر کے ان کے قبضہ سے اپنے شہروں کو نکال سکیں، حضرت سموئیلؑ کو ان کے مزاج سے واقفیت اور ان کی بزدلی اور پست ہمتی کا تجربہ تھا، اس لئے انھوں نے کہا کہیں تم میدان جنگ سے فرار نہ اختیار کر لو، اس پر انھوں نے جواب دیا، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ ہماری یہ درگت ہو چکی ہے کہ

وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِی	بھلا ہم خدا کی راہ میں جہاد کیوں
سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا	نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں
من دیارنا وابنائنا،	سے نکال دیئے گئے ہیں، اور اپنے
(بقرہ ۲۴۶)	بچوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں،

مگر ہوا وہی جس کا حضرت سموئیلؑ نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ عین وقت پر بنی اسرائیل نہایت بزدلی سے یہ کہکر میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے کہ

لا طاقة لنا الیوم بجالوت	اب ہم میں جالوت اور اس کی فوج
وجنودہ، (بقرہ ۲۵۰)	سے لڑنے کی سکت نہیں،

مقدس تابوت کا چھن جانا	بنی اسرائیل کی اس سے بڑھ کر کیا ذلت و رسوائی ہوسکتی ہے کہ ان کے مذہبی آثار و تبرکات تک اُن کے دشمن اُن سے چھین لے گئے، تورات میں مقدس تابوت

کے چھینے جانے کا واقعہ یوں بیان ہوا ہے،

"اور فلسطی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا، اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی، کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے، اور خدا کا صندوق چھن گیا، (سموئیل اب ۴ آیات ۱۰ و ۱۱)

اس صندوق (تابوت) کو ان کے قبلہ کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اس کو اپنے خیمہ عبادت میں ایک خاص جگہ پر نہایت اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور دعا و عبادت کے وقت اسی کی طرف متوجہ رہتے، ان کے ربی و کاہن غیبی رہنمائی کے لئے بھی اسی کو مرجع بناتے، مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بنی اسرائیل کے حوصلے قائم رکھنے میں یہ صندوق ایک بڑا عامل تھا، حضرت موسیٰ کے زمانہ میں تو اس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئی تھیں لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ اور ان کے خاندان کے بعض تبرکات بھی محفوظ کر دیئے گئے تھے،

ایسے مقدس اور اہم تابوت کا چھن جانا ان کے لئے کس قدر ذلت و رسوائی، اور رنج و غم کا باعث تھا، اس کا اندازہ تورات کے اس بیان سے ہوگا،،

"اور خدا کا صندوق چھن گیا جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا، تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا، اور اس کی گردن ٹوٹ گئی، ......

اور کہنے لگی کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی، اس لئے کہ خدا کا صندوق چھن گیا تھا، اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے، سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے

جاتی رہی، کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے۔ (سموئیل ا ب ۴ آیات ۲۱ تا ۲۲)

اس سخت حادثہ کی وجہ سے تقریباً بیس سال تک بنی اسرائیل پر یاس اور مردنی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی، تورات ہی کا بیان ہے،

"اور جس دن سے صندوق قریۂ یعریم میں رہا، تب سے ایک مدت ہوگئی یعنی بیس برس گذرے، اور اسرائیل کا سارا گھرانہ خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا"

(سموئیل ۷-۲)

لیکن خدا نے اپنے فضل سے تابوت کی واپسی کا سامان کرکے بنی اسرائیل کو عزت و سربلندی عطا کی، قرآن مجید نے طالوت کے قصہ میں تابوت کی اہمیت اور اس کی بنی اسرائیل میں دوبارہ واپسی کا اس طرح ذکر کیا ہے:-

وقال لهم نبيهم ان آية	اور ان کے نبی (سموئیل) نے ان سے
ملكه ان ياتيكم التابوت	کہا کہ اس (طالوت) کی امارت کی
فيه سكينة من ربكم	نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ
وبقية مما ترك آل موسى	صندوق آجائے گا، جس میں تمہارے
وآل هرون تحمله الملائكة	خداوند کی طرف سے سامان تسکین اور
ان فى ذلك لآية لكم ان	آل موسیٰ و آل ہارون کی چھوڑی
كنتم مومنين،	ہوئی یادگاریں ہیں، صندوق کو
(بقرہ: ۲۴۸)	فرشتے اٹھائے ہوں گے، بے شک
	اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر
	تم ایمان رکھتے ہو،

تورات کے ناقلین نے تابوت کی واپسی کے واقعہ کو گڈ مڈ کر دیا ہے، اس لئے اس کا بیان قرآن سے مختلف ہے،

بنی اسرائیل کی ایک نہایت عبرتناک سزا

بنی اسرائیل کا بھی عجیب معاملہ تھا، اگر ان کو خدا کی طرف سے کوئی موقع اور مہلت دی جاتی تو وہ اس کی مطلقاً قدر نہ کرتے بلکہ انتہائی ڈھیٹ اور جری ہو کر مزید شرارتیں کرنے لگتے، جن کی انھیں سخت سزا بھگتنی پڑتی، یہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے کہ سبت (سنیچر کا دن) ان کے یہاں کتنا متبرک و مقدس تھا، مگر ان کی ایک جماعت کو اس کی حرمت و تقدس پامال اور برباد کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا، ان نافرمانوں کو یہ سزا دی گئی،

فقلنا لهم کونوا قردة خاسئین، (بقرہ: ۶۵)	سو ہم نے ان سے کہا ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ،

گو اس کے متعلق تورات خاموش ہے لیکن قرآن کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایسا مشہور و متعارف واقعہ تھا جس کو عہد نبوت کے یہود بھی اچھی طرح جانتے تھے، چنانچہ فرمایا،

ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت ٥ (بقرہ: ۶۵)	اور بلاشبہ تم نے ان لوگوں کو خوب جان لیا ہے جنھوں نے سبت کے معاملہ میں حد سے تجاوز کیا،

اور دوسری جگہ ہے۔

وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِي كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ اِذۡ	اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو سمندر کے کنارے تھی جب کہ وہ سبت

یعدون فی السبت ۔ | کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرتے تھے،
(اعراف: ۱۶۳)

سورۂ مائدہ میں اس کی بھی تصریح ہے کہ

وَجَعَلَ مِنْهُمُ القِرَدَةَ وَ | اور ان کے اندر سے اللہ نے بندر
الخنازیر (مائدہ: ۶۰) | اور سور بنائے،

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ واقعی بندر بنا دئے گئے تھے، اور ان کی جسمانی ہیئت تبدیل ہو گئی تھی، یا ان کی صورتیں تو مسخ نہیں کی گئی تھیں، اور نہ وہ بندروں اور سوروں کے جسم و قالب میں تبدیل ہوئے تھے، بلکہ اپنی سیرت و عادت اور فراخ خصلت کے اعتبار سے بندروں اور سوروں جیسے ہو گئے تھے، ان میں سے جس تاویل کو بھی اختیار کیا جائے، نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہود نے اپنے کو جس طرح بے لگام اور بے قید بنا لیا تھا، اور جس طرح وہ اپنی خواہشات کے غلام ہو گئے تھے، اس کے بعد چاہے ان کے اور بندروں کے درمیان صوری فرق رہا بھی ہو، لیکن معنوی فرق تو بالکل ہی باقی نہیں رہ گیا تھا، اسی حیثیت سے ان کی تشبیہ گدھوں اور کتوں سے بھی دی گئی ہے،

مثل الذین حملوا التوراۃ ثم | ان لوگوں کی مثال جن کو تورات
لم یحملوھا کمثل الحمار | کا حامل بنایا گیا، مگر وہ اس کے
یحمل اسفارا ۔ | واقعی حامل نہیں بن سکے، گدھے
(جمعہ: ۵) | کی طرح ہے جو کتابوں کا پشتارہ
اٹھائے ہیں،

دوسری جگہ فرمایا:-

ولكنه اخلد الى الارض	لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہوا،
واتبع هواه فمثله كمثل	اپنی خواہش کی پیروی کی، سو اسکی
الكلب ۰ (اعراف: ۱۷۶)	مثال کتے جیسی ہے،

دراصل یہ یہود کی لعنت و پھٹکار کی ایک نہایت جامع اور بلیغ تعبیر ہے،

مذہبی سختیاں اور بندشیں یہود کو ان کی سرکشی اور شرارت کی یہ سزا بھی دی گئی کہ دین جو فی نفسہ آسان اور سہل تھا، ان کے لئے بہت دشوار اور مشکل کر دیا گیا تھا، قرآن مجید نے یہودی مذہب کی غیر معمولی شدت کو اصر و اغلال کہا ہے، اور بتایا ہے کہ نبی اکرمؐ ان کو ان بیجا سختیوں، احکام و عقائد کے ناقابل تحمل بوجھ اور دوسری بیڑیوں اور زنجیروں سے نجات دلانے کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں

ويضع عنهم اصرهم و	اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں
الاغلال التي كانت عليهم	اتارتا ہے جو ان پر تھیں،
(اعراف، ۱۵۷)	

یہود نے اپنی شرارت پسندی کی وجہ سے بعض مسائل کے بارہ میں اس قدر سوالات کئے کہ ان کے لئے جواز کی راہیں تنگ ہو گئیں، مثلاً جب خدا نے ان کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے اس کی نوعیت متعین کرانے کے لئے سوالات کا طومار باندھ دیا، جس کی وجہ سے ایک آسان حکم کی تعمیل بہت دشوار ہو گئی،

ان کی باغیانہ روش اور سرکشی نے بھی ان کے لئے جائز کو ناجائز اور حلال کو حرام بنا دیا،

فبظلم من الذين هادوا	پس ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جنھوں نے
حرمنا عليهم طيبات	یہودیت اختیار کی، ہم نے ان پر بعض پاکیزہ
احلت لهم (نساء، ۱۶۰)	چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال تھیں

علمائے یہود نے تحریم و تحلیل کا قانون اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا، اس کے نتیجے میں خود انھوں نے بہت سی جائز چیزوں کو یہود کے لئے حرام قرار دیا تھا، ان کے اس طرح کے طبع زاد فتوے اور من گھڑت رائیں توراۃ کا جزو بن گئی تھیں، اور ان کو وہی درجہ حاصل ہو گیا تھا جو خود کتاب اللہ کا ہے، قرآن نے جب ان کی ان خود ساختہ حرمتوں کو مسلمانوں کے لئے جائز اور حلال قرار دیا، تو وہ معترض ہوئے کہ مسلمان ملت ابراہیمی کی اتباع کے دعویٰ کے باوجود اس کے محرمات کو حرام نہیں سمجھتے، چنانچہ ان کے اسی طرح کے ایک فقہی اعتراض کو نقل کر کے یہ جواب دیا گیا ہے :-

کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِبَنِی	ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا،
اسرائیل اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَائِیل	بجز اس کے جو اسرائیل نے خود اپنے
عَلٰی نَفْسِہٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ	اوپر حرام کر لیا تھا، قبل اس کے کہ
تُنَزَّلَ التَّوْرَاۃُ قُلْ فَاْتُوْا	تورات اترے، تو تم کہدو کہ
بِالتَّوْرَاۃِ فَاتْلُوْھَا اِنْ	تورات لاؤ اور اسے پڑھو اگر تم
کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ۔ (آل عمران ۹۳)	سچے ہو،

واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اتفاقاً یا طبعی کراہت وغیرہ کے سبب سے اونٹ کے گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا، ان کی اقتدا میں ان کے بعض متبعین بھی اس کے استعمال سے پرہیز کرنے لگے، بعد میں یہودی فقہا نے حضرت یعقوبؑ کے ایک طبعی اور ذوقی عمل کو حکم الٰہی کا درجہ دیدیا ہے اور سرے سے اونٹ ہی کو حرام قرار دیدیا، حالانکہ نہ یہ خدا کا حکم تھا اور نہ اس کو ملت ابراہیمی سے کوئی واسطہ تھا، یہود کی اس بغاوت اور سرکشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ

وَعَلَی الَّذِیْنَ ھَادُوْا حَرَّمْنَا	اور ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے

علیہم کل ذی ظفر ومن	سارے ناخن والے جانور حرام کئے،
البقر والغنم حرمنا علیھم	اور گائے اور بکری کی چربی بھی ان
شحومھما الا ما حملت ظھورھما	پر حرام کر دی، بجز اس کے جو ان
او الحوایا او ما اختلط بعظم	کی پیٹھ یا انتڑیوں سے پیوست ہو
ذلک جزینٰھم ببغیھم وانا	یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو،
لصادقون (انعام: ۱۴۶)	یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی ...

اس سے معلوم ہوا، کہ اونٹ کی طرح بہت سے دوسرے جانور، پرند اور چربی بھی یہود کے لئے حرام قرار دیدی گئی تھی، تورات میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے،

"پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم بنی اسرائیل سے کہو سب چارپایوں میں جو زمین پر ہیں تمھیں کھانا روا ہے، سو یہ ہیں سب چارپایے، کھروالے جن کا کھر چرا ہو، اور وہ جگالی کرتے ہوں، تم انھیں کھاؤ، مگر ان میں سے جو جگالی نہیں کرتے ہیں یا کھر ان کے چیرے ہوئے نہیں ہوتے ہیں، ان کو نہ کھاؤ، جیسے اونٹ وہ جگالی تو کرتا ہے پر کھر اس کا چرا ہوا نہیں ہوتا، سو وہ تمھارے لئے ناپاک ہے، اور سافن کہ وہ جگالی کرتا ہے، لیکن کھر اس کا چرا ہوا نہیں تو وہ بھی تمھارے لئے ناپاک ہے، اور خرگوش کہ وہ تو جگالی کرتا ہے، پر اس کا کھر چرا ہوا نہیں ہے، وہ بھی تمھارے لئے ناپاک ہے، (احبار ۱۱ - ۱ تا ۸)

اس حکم کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ :-

"اور سب چارپایے جن کے کھر دو حصے ہیں ہوں، پر پاؤں چرے ہوئے نہ ہوں اور جگالی کرتے ہوں وہ تمھارے لئے ناپاک ہیں، جو کوئی ان کو چھوئے گا وہ

"ناپاک ہوگا، اور ہر ایک جو تلیوں کے بل چلتے ہیں، اور پاؤں پہ چلنے والے ہر طرح
کے جانوروں میں سے تمھارے لئے ناپاک ہیں، جو کوئی ان میں سے کسی کی لاش کو
چھوئے گا، وہ شام تک ناپاک رہے گا، اور جو کوئی ان میں سے کسی کی لاش کو
اٹھائے گا، وہ کپڑے اپنے دھوئے اور شام تک ناپاک رہے گا، اور یہ سب
تمھارے لئے ناپاک ہیں۔" (احبار ۱۱۔ ۲۶ تا ۲۸)

چربی کے متعلق توراۃ کا حکم ملاحظہ ہو:۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہہ تم لوگ نہ تو بیل کی، نہ بھیڑ
کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا، جو جانور خود بخود مر گیا ہو، اور جس کو درندوں
نے پھاڑا ہو، اس کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ، پر تم کسی حال میں نہ کھانا،
کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھائے، جسے لوگ آتشیں قربانی کے طور پر خداوند
کے حضور چڑھاتے ہیں، وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائیگا"

(احبار ۲۲:۱۷۔ ۲۵)

سبت کے احکام سے بھی یہودی مذہب کی سخت گیری اور تشدد ظاہر ہوتا ہے، یہود کے
یہاں یہ دن نہایت مقدس اور محترم تھا، توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس دن سارا کاروبار
بند کر دینے کی ہدایت کی گئی تھی، لونڈی غلاموں، یہاں تک کہ مویشی اور جانوروں سے بھی
کام کاج لینے کی ممانعت تھی، یہود کے علماء نے اپنے غلو و تشدد سے اس حکم کو اس قدر بڑھایا کہ اس دن
مریضوں کے لئے صحت اور شفا کی دعا بھی نہیں کی جا سکتی تھی، اور جو لوگ اس دن کی حرمت اور تقدس
کا خیال نہ کر کے اپنے کاروبار کو ترک نہیں کرتے تھے توراۃ کے باب خروج میں انکو ہلاک کرنے اور مار ڈالنے
کا حکم تھا، دوسری جگہ ہے:۔

اور جب بنی اسرائیل بیابان میں تھے، انھوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ سبت کے دن لکڑیاں جمع کرتا تھا، تب وہ اس کو جو لکڑیاں جمع کر رہا تھا، پکڑ کر موسیٰ اور ہارون اور ساری جماعت کے پاس لائے، انھوں نے اسے قید میں ڈالا کیونکہ ان کو نہیں کہا گیا تھا کہ اس سے کیا کیا جائے، تب خداوند نے موسیٰ سے فرمایا کہ یہ شخص مار ڈالا جائے، ساری جماعت خیمہ گاہ کے باہر اس پر پتھراؤ کرے، چنانچہ ساری جماعت اسے خیمہ گاہ کے باہر لے گئی، اور اسے سنگسار کیا کہ وہ مر گیا جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا" (گنتی ۱۵: ۳۲-۳۶)

لیکن احترام و تقدس صرف یہود کے لئے مخصوص تھا اور ان کو یہ سخت ترین حکم ان کی سرکشی اور شرارت کی وجہ سے دیا گیا تھا قرآن نے جب اس حقیقت کا اعلان کیا تو انھوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا، کہ مسلمان دین حنیف اور ملت ابراہیمی کے متبع ہونے کے باوجود سبت کی حرمت و تقدس کے قائل نہیں ہیں، قرآن نے ان کے اس مزعومہ کی تردید کی اور بتایا کہ اس حرمت کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ تمہارے اختلاف اور عدم اطاعت کی تم کو سزا دی گئی ہے،

انما جعل السبت علی	سبت تو صرف ان لوگوں کے لئے
الذین اختلفوا فیہ و	بنایا گیا تھا، جنھوں نے اس کے بارہ
ان ربک لیحکم بینھم	میں اختلاف کیا تھا اور بیشک
یوم القیامۃ فیما کانوا	تیرا خداوند قیامت کے روز ان
فیہ یختلفون ۵	کے درمیان ان چیزوں کا فیصلہ
(نحل: ۱۲۴)	کر دے گا جن میں یہ جھگڑتے ہیں،

غرض یہ مذہب سختی اور شدت کا مجموعہ بن گیا تھا، تورات کے باب احبار میں طہارت

اور عورتوں کے جدا احکام بیان ہوئے ہیں، اُن سے اس مذہب کی سخت گیری پوری طرح واضح ہو
یہود کی دو بڑی تباہیاں | یہود کو اپنی شرارتوں اور مفسدانہ حرکتوں کی بنا پر دو زبردست
تباہیوں اور سخت ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا تھا، یہودی تاریخ کے ان واقعات
کی جانب قرآن نے ان آیتوں میں اشارہ کیا ہے،

وقضینا الی بنی اسرائیل فی	اور ہم نے بنی اسرائیل کے بارہ میں
الکتاب لتفسدن فی الارض	کتاب میں طے کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ
مرتین ولتعلن علوا کبیرا	زمین میں فساد برپا کرو گے، اور
فاذا جاء وعد اولاھما بعثنا	بڑی سرکشی دکھاؤ گے، سو جب ان
علیکم عبادا لنا اولی باس	میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو
شدید فجاسوا خلال الدیار	ہم نے تم (بنی اسرائیل) پر اپنے سخت
وکان وعدا مفعولا، ثم	زور آور بندوں کو مسلط کر دیا جو
رددنا لکم الکرۃ علیھم و	انھوں نے گھروں میں گھس کر ان کو
امددناکم باموال وبنین	تاراج کیا، پھر ہم نے تم کو دوبارہ
وجعلناکم اکثر نفیرا ، ان	ان پر غلبہ کا موقع دیا، اور مال
احسنتم احسنتم لانفسکم و	اولاد سے مدد کی، اور تمہاری تعداد
ان اسأتم فلھا فاذا جاء	بڑھا دی، تم نے اگر بھلائی کی، تو
وعد الآخرۃ لیسوؤا وجوھکم	اپنے ہی لئے، اور اگر برائی کی تو بھی
ولیدخلوا المسجد کما دخلوہ	اپنے لئے، پھر جب دوسرے وعدہ
اول مرۃ ولیتبروا	کا وقت آیا، (تب بھی اپنے طاقتور

مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل ۴-۷)

بندے مسلط کے آکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں، اور مسجد بیت المقدس میں پہلی مرتبہ کی طرح داخل ہو جائیں اور جس چیز پر ان کا بس چلے، اسے تباہ کر ڈالیں،

پہلی تباہی اور بخت نصر کا بیت المقدس کو تاراج کرنا

پہلی مرتبہ بابل و نینوا کے بادشاہ بخت نصر[1] نے ان کو زد و کوب کیا، اور یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

اس زمانہ میں یہود سخت دینی و اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے، اور ان پر دنیا پرستی کا ایسا غلبہ تھا کہ کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر اوہام و خرافات میں پڑ گئے تھے، سفلیات پر عقیدہ رکھتے تھے، اور جادوگری کو اپنا پیشہ اور مشغلہ بنا لیا تھا، علاوہ ازیں ان کے اندر شدید خانہ جنگی اور قبائلی عصبیت کی آگ بھی بھڑک اٹھی تھی، اسرائیل اور یہودیہ کی الگ الگ سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں، اسرائیلی ریاست کے لوگوں میں ہمسایہ قوموں کے اثر سے مشرکانہ عقائد چل پڑے تھے، اسی زمانہ میں حضرت الیاسؑ مبعوث ہوئے، اور انھوں نے ان کو شرک بت پرستی اور اخلاقی پستی سے باز آنے کی دعوت دی لیکن سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی

---

[1] بابل و نینوا کی سلطنتیں نہایت مستحکم اور متمدن تھیں، ۶۱۲ ق م میں نینوا کی تباہی کے بعد آشوری فرماں روائی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، اس کے بعد بابل کی شہنشاہی کی بنیادیں مزید مستحکم ہو گئیں، اور اس کی قوت و شوکت میں بڑا اضافہ ہو گیا، بخت نصر اسی ترقی یافتہ اور عظیم الشان حکومت کا فرمانروا تھا، اس کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا، بیت المقدس پر اس کا

مشرک بیوی کے ایما سے ان کے پیچھے پڑ گئی، اس بنا پر ان کو ہجرت کرنی پڑی، غرض جب یہ لوگ کسی طرح باز نہ آئے تو آشوری فاتحین نے مسلسل حملے کئے، اسی زمانہ میں عاموس نبی نے بھی ان کو بار بار تنبیہ کی، لیکن شاہ اسرائیل نے خدا کے اس برگزیدہ پیغمبر کو ملک بدر کر دیا، اس کے بعد ہی آشور کے سخت گیر فرمانروا ساگون نے سامریہ کو فتح کر کے اسرائیل کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، اس میں ہزاروں اسرائیلی مارے گئے، اور ہزاروں تتر بتر ہو گئے، اور ان کی جگہ غیر قومیں اسرائیلی علاقوں میں آباد ہو گئیں،

یہودیہ کی حکومت بھی حضرت سلیمانؑ کے بعد شرک اور اخلاقی برائیوں میں ملوث ہو گئی تھیں، اس کے ایک بادشاہ نے اخی اب کی بیٹی سے شادی کر لی، اس مشرک شہزادی نے یہودیہ میں شرک و بت پرستی کو مزید فروغ دیا، اور سامریہ کی اسرائیلی ریاست کی طرح اس پر بھی آشوریوں نے متعدد حملے کئے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، لیکن وہ اس کا خاتمہ نہ کر سکے، مگر جب حضرت یسعیاہؑ اور حضرت یرمیاہؑ کی مسلسل دعوت و تلقین کے باوجود بھی وہ شرک و بت پرستی اور اخلاقی پستی سے باز نہ آئے، تو چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو اپنے زیر نگیں کر لیا، اور یہودیہ کے بادشاہ کو قید کر لیا، اس کے بعد بھی انھوں نے اپنے حالات کی اصلاح نہ کی، بلکہ بابل کے خلاف بغاوت اور شورش پر آمادہ ہو گئے، ۵۸۶ ق م میں اس نے زبردست حملہ کر کے یروشلم کو تباہ اور مقدس ہیکل کو مسمار کر دیا، اس سخت تباہی میں بے شمار یہودی قتل کئے گئے، اور بے شمار قید کئے گئے، اور جو بچے وہ بابل

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹) سے شادی کر لی تھی، اور اس کے پھندے میں پڑ کر خود بھی مشرک ہو گیا تھا، اسی نے سامریہ میں بعل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا تھا، اور اسی کی کوششوں سے اسرائیل کے شہروں میں بعل کے نام پر علانیہ قربانی کی جاتی تھی،

منتشر ہوگئے، یا ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے،

ایک طویل عرصہ کی غلامی اور پسپائی کے بعد جب یہود کے اندر ایمان و عمل کے تقاضے پورا کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اور وہ توبہ و انابت اور اصلاح حال کے لئے آمادہ ہوئے، تو اللہ نے اُن پر اپنی رحمت نازل کی، اور بابل کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، بنوکدنصر (بخت نصر) کے جانشین کو ایرانی فاتح، سائرس نے شکست دے کر بنی اسرائیل کو اپنے وطن میں واپس جاکر دوبارہ آباد ہونے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی اجازت دی، زبور میں ہے:-

"سو اس نے اُن کے دکھ پر نظر کی، جب کہ اس نے اُن کا نالہ سُنا، اور اس نے اُن کے لئے اپنے عہد کو یاد فرمایا، اور اپنی رحمتوں کی فراوانی کے مطابق پچھتایا، اس نے ایسا کیا کہ ان سب نے بھی جو انھیں اسیر کرکے لے گئے، اُن پر ترس کھایا،" (زبور ۱۰۶: ۴۴تا ۴۶)

"میں خداوند نبی اسرائیل کا خدا یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی، اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائے جائیں گے، اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا، جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا، اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا، جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے، اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا، اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی، خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے، کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا، کہ امتوں کو اس کے قابو میں کردوں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں، اور دہرے ہوئے دروازے اس کے لئے کھول دوں، اور وہ دروازے بند نہ کئے جائیں گے، میں نے اس کو صداقت

کے لئے برپا کیا ہے، اور میں اس کی ساری راہیں آراستہ کروں گا، وہ میرا شہر بنائے گا، اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض کے چھڑائے گا،

(یسعیاہ ۴۰: ۲ تا ۲۸)

"خورس بادشاہ کی سلطنت کے پہلے سال مجھکو خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے، حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں، بنایا جائے، اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں، اور خرچ بادشاہ کے خزانہ سے دیا جائے، اور خدا کے گھر کے سنہرے روپہلے برتن بھی جنہیں بنوکدنذر یروشلم کی ہیکل سے نکال لایا اور بابل میں لا رکھا، سو پھیر دیئے جائیں اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی جگہ رکھ دیئے جائیں یعنی خدا کے گھر میں رکھ دیئے جائیں (عزرا ۶: ۱-۵) (باقی)

تذکرۃ المحدثین

از ضیاء الدین اصلاحی

سلسلہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے بعد اسلام کے سب سے زیادہ مقدس طبقہ محدثین کرام کا سلسلہ اب شروع کیا گیا ہے، جس کے دو حصے شائع ہو کر ارباب علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، اور دو حصے زیر تالیف ہیں، جن میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات اور ان کی ہندوستان میں حدیثی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہوگا، اور یہی حصہ پہلے شایع ہوگا۔

پہلا حصہ امام مالک اور ائمہ صحاح اور دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے، اور دوسرا حصہ چوتھی صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین کے حالات اور ان کی حدیثی خدمات پر مشتمل ہے، قیمت حصہ اول ۵ – ۱۳ حصہ دوم – ۱۶

منیجر

الموافقات شاطبی

(اسلامی قانون کی ایک اہم کتاب)

از

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔ اے (علیگ)

ابو اسحاق شاطبی (المتوفی سنہ ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء) علمائے اسلام میں بڑی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، حدیث و تفسیر، فقہ و تصوف، لغت و بلاغت اور اصول فقہ میں ان کو کامل درک حاصل تھا، ان کا شمار اسلامی قانون کے ان چند منتخب ماہرین میں کیا جاتا ہے، جن کے مخصوص افکار اور مجتہدانہ نظریات نے پورے عالم اسلام کے قانون ساز علماء کو متاثر کیا ہے، شاطبی کی شہرۂ آفاق تصنیف "الموافقات فی اصول الاحکام" آج تک اصول فقہ اسلامی کا مطالعہ کرنے والوں کا اہم ماخذ ہے، خاص طور پر شاطبی کا مخصوص نظریۂ "مصلحت" (جس کی مبسوط وضاحت آئندہ کی جائے گی) جدید قانون سازی میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اس کتاب کی اہمیت کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مصر کے شہرۂ آفاق عالم مفتی محمد عبدہ اپنے تلامذہ اور اہل تعلق کو "تشریع اسلامی کا ادراک پیدا کرنے کے لئے الموافقات کے مطالعہ کا برابر مشورہ دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ محمد الخضری نے اپنی کتاب "اصول الفقہ" کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ انھیں اسلامی قوانین کو سمجھنے کے لئے الموافقات کا مطالعہ کرنے کا مشورہ محمد عبدہ ہی نے دیا تھا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی تصنیف "آئین و قوانین اسلام" میں پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں الموافقات کا قومی زبانوں میں ترجمہ کئے جانے کی پر زور سفارش کی ہے تاکہ وہاں کے ماہرین قانون اسلامی فقہ کی روح

۔مقصد سے پورے طور پر ہم آہنگ ہوسکیں۔

اس موضوع پر بعد میں جتنی بھی کتابیں منصہ شہود پر آئیں، سب کے مصنفین شاطبی ہی کی خوشہ چینی اور الموافقات کا طواف کرتے نظر آتے ہیں، خاص طور پر عصر حاضر کے جدید علماء مثلاً ابوزہرہ، معروف الدوالیبی، محمد الخضری، مصطفیٰ الزرقاء اور یوسف موسیٰ وغیرہ اصول فقہ سے متعلق اپنی تصانیف میں قدم قدم پر شاطبی کے حوالوں کو اپنی تحقیقات میں وزن و وقار پیدا کرنے کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں، شاطبی کے علوئے مرتبت اور جلالت شان کی حد یہ ہے کہ علامہ رشید رضا مصری نے اپنی کتاب "تاریخ الاستاذ الامام شیخ محمد عبدہ" کے مقدمہ میں انھیں آٹھویں صدی ہجری کے مجددین میں شمار کرتے ہوئے ان کے علمی کارناموں کو ابن خلدون کے ہم پایہ قرار دیا ہے، فاضل بن عاشور اور عبد المتعال الصعیدی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ شاطبی اپنی اہمیت و عظمت اور قانون شریعت کی روح و مقاصد کی جو انھوں نے تشریح و وضاحت کی ہے اس کے باعث امام شافعی سے بھی فائق ہیں، جنھیں اصول فقہ کا ابوالآبار قرار دیا جاتا ہے، محمد الخضری نے "اصول الفقہ" میں الموافقات سے بھرپور استفادہ کا صریحی اعتراف کیا ہے، اس کے مقدمہ میں انھوں نے مدلل وضاحت کی ہے کہ شاطبی کے مخصوص فقہی نظریات سے اسلامی قوانین کی اس اصل روح کو اجاگر کیا ہے جسے عہد وسطیٰ کے ماہرین قانون اسلامی نے نظر انداز کر دیا تھا۔

لیکن شاطبی کی اس تمام اہمیت کے باوجود نہایت تعجب و حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک ان کی حیات و کارناموں اور فقہی افکار کا کوئی باضابطہ اور منظم مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، ان کے معاصرین میں لسان الدین ابن الخطیب (المتوفی ۷۷۶ھ) اور ابن خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ) نے غرناطہ اور اس عہد کے بکثرت اہل قلم کا تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا ہے، لیکن انھوں نے بھی شاطبی کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابن الخطیب شاطبی کے ہم درس تھے، اس لئے یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا

کہ وہ ان سے ناواقف تھے۔ اسی طرح طبقات مالکیہ کے مصنفوں میں شاطبی کے ہم عصر ابن فرحون (المتوفی ۷۹۹ھ) نے الدیباج المذہب تصنیف کی اور بدر الدین القرافی (المتوفی ۱۰۰۸ھ) نے توشیح الدیباج کے نام سے اس کا تکملہ لکھا، لیکن ان دونوں نے بھی شاطبی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

الموافقات کے ایک مرتب عبداللہ دراز نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "چونکہ شاطبی کے فقہی افکار نہایت دقیق، پیچیدہ اور عسیر الفہم ہیں اس لئے محققین ان پر قلم اٹھانے میں دقت محسوس کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شاطبی کے نظریات کی افادیت و اہمیت کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لئے صرف فقہی وسعت معلومات کافی نہیں بلکہ اصول فقہ کے تدریجی ارتقاء، اس کے عہد بعہد کے تغیرات اور فلسفہ و تصوف سے کماحقہٗ واقفیت بھی ضروری ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ شاطبی کے دور میں ہونے والی سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیوں سے بھی واقفیت پیدا کی جائے اس پس منظر کے بغیر ہمیں شاطبی کے بعض مخصوص نظریات و افکار باہم متضاد، مبہم اور ناقابل فہم معلوم ہوں گے، ان ہی تمام وجوہ نے الموافقات جیسی قابل قدر تصنیف کے گہرے و تفصیلی مطالعہ کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی ہے۔"

راقم کی تلاش و تحقیق کے مطابق شاطبی کی وفات کے تقریباً دو سو برس کے بعد لکھی گئی احمد بابا تنبکتی[1] (المتوفی ۱۰۳۶ھ) کی نیل الابتہاج بتطریز الدیباج وہ پہلی کتاب ہے جو شاطبی کی

[1] احمد بابا کا پورا نام ابوالعباس احمد بن احمد الصنہاجی ہے، تنبکتو کے اروان نامی ایک گاؤں میں ۲۱ ذی الحجہ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء کو پیدا ہوئے، اپنے عہد کے مشہور صاحب کمال اہل علم اور جامع الفنون شخصیت کے حامل تھے، خاص طور پر فقہ اور سوانح نگاری میں یگانۂ عصر تھے، انھوں نے فقہ مالکی، صرف و نحو اور دوسرے موضوعات پر تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان کا سب سے عظیم تصنیفی کارنامہ فقہائے مذہب مالکیہ کے اس تذکرے کا تتمہ و تکملہ ہے جسے چودہویں صدی کے نصف ثانی میں ابن فرحون مالکی نے الدیباج المذہب فی معرفۃ

سوانح حیات کا اولین ماخذ قرار دی جاسکتی ہے اور بعد کے محققین جنھوں نے شاطبی پر کچھ لکھا ہے، وہ احمد بابا ہی کے تذکرے کو اپنا ماخذ بناتے ہیں، یہ کتاب احمد بابا نے مراکش میں اپنی قید کے زمانہ میں تصنیف کی تھی، ان کو شاطبی سے غیر معمولی عقیدت تھی، جس کا اظہار نیل میں شاطبی کے تذکرہ کی ہر سطر سے ہوتا ہے، ایک جگہ وہ رقمطراز ہیں :

"نویں صدی ہجری میں بعض علماء اپنے درجہ اجتہاد تک پہونچ جانے کا خود اعلان کرتے ہیں، جب کہ امام شاطبی اور حفید بن مرزوق خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی علماء مذکورۃ الصدر اہل علم سے بہت زیادہ اجتہادی منصب کے مستحق ہیں" (ص ۲۱۷)

یوں تو اس مضمون میں شاطبی کے سوانح و کمالات کے لئے راقم سطور کے پیش نظر تمام دستیاب ماخذ رہے ہیں، لیکن نیل الابتہاج سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے، شاطبی کا پورا نام ابو اسحاق

اعیان علماء المذھب کے نام سے تالیف کیا تھا، احمد بابا نے اپنی اس یادگار تصنیف کا نام نیل الابتہاج بتطریز الدیباج رکھا، اس کتاب کی تکمیل مراکش میں ۱۰۰۵ھ میں ہوئی، اس کے بعد مصنف نے اس کا خلاصہ بھی شائع کیا جس میں صرف ان مالکی فقہا کو لیا ہے جو ابن فرحون کی کتاب میں درج ہونے سے رہ گئے تھے اس کا نام کفایۃ المحتاج لمعرفۃ ما لیس فی الدیباج ہے، نیل مراکش سے ۱۳۱۷ھ میں علیحدہ سے بھی طبع ہوچکی ہے اور الدیباج کے حاشیہ پر بھی ۱۳۲۹ھ میں طبع ہوئی۔

احمد بابا کی یہ قاموس سولھویں صدی کے آخر تک المغرب کے مشہور علماء اور ان کی تصانیف کے بارے میں معلومات کا ایک بیش قیمت ماخذ ہے، مالکی مذہب کے فقہاء کے علاوہ اس میں اس زمانے کے بڑے بڑے مراکشی صوفیہ اور اہل دل کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں، احمد بابا نے ۶ر شعبان ۱۰۳۶ھ مطابق ۲۲ر اپریل ۱۶۲۷ء کو اپنے وطن میں وفات پائی۔

ابراہیم بن موسیٰ بن محمد ہے، ان کے خاندان، ولادت اور عہد طفولیت کی دوسری تفصیلات سے تمام تاریخیں خاموش ہیں، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غرناطہ میں پروان چڑھے اور وہیں ان کی تعلیم مکمل ہوئی، اس وقت بنی نصر کی حکومت کا آفتاب اقبال بلند تھا شاطبی نے سلطان محمد خامس کا زمانہ پایا تھا جو علمی و فنی ترقی کے اعتبار سے ایک عہد روشن شمار ہوتا ہے، علماء و فضلاء کی کثرت اور علمی چرچوں کے باعث سرزمین غرناطہ رشک آسمان بنی ہوئی تھی، شمالی افریقہ کے دور دراز خطوں کے طلبہ اور اہل علم جوق در جوق اس مرکز تعلّم کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، چنانچہ شاطبی کو اپنے عہد کے یگانۂ فن اساتذہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا تھا، دستور زمانہ کے مطابق انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز عربی اصول و قواعد اور ادب و لغت سے کیا تھا، جس کی تحصیل انھوں نے ان فنون کے دو ماہرین ابو عبداللہ محمد بن علی الفخار البیری (المتوفی ۷۵۴ھ) اور ابو القاسم الشریف السبتی (المتوفی ۷۶۰ھ) سے کی تھی۔

اول الذکر اپنے نحوی کمال کے باعث اندلس میں سیبویہ العصر کے لقب سے مشہور تھے، ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے کہ:

قل فی الاندلس من لم یاخذ	اندلس میں خال خال ہی کسی طالب علم نے
عنه من الطلبة۔	ان سے استفادہ نہ کیا ہوگا۔

امام شاطبی ان کی وفات تک مسلسل ان کے دامن فیض سے وابستہ رہے، الافادات میں شاطبی نے ابن الفخار سے عربی زبان کی جامع تعلیم حاصل کرنے کا بصراحت ذکر کیا ہے، اسی طرح ابو القاسم الشریف السبتی بھی اندلس میں عربی لسانیات پر اپنے غیر معمولی عبور کے باعث "خدا کی روشن نشانی" خیال کئے جاتے تھے، کحالہ احمد رضا نے معجم المؤلفین میں ان کی مقصورہ حازم کی ایک شرح کی نشاندہی کی ہے، اس شرح کے بارے میں صاحب شذرات الذہب کی رائے ہے کہ اس کے مطالعہ سے قلب و دماغ کو روشنی اور انشراح کی دولت ملتی ہے۔

اندلس کے مشہور فقیہ ابو سعید بن لب بھی شاطبی کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے، جن کی مجلس درس ۷۵۴ھ میں مدرسہ نصریہ میں آراستہ تھی، ابن الفخار البیری کی وفات کے بعد ہی غرناطہ کے منصب قضا پر فائز ہوئے۔ اپنے غیر معمولی فقہی کمال و مہارت کے باعث فتاوی کا مرجع تھے، احمد بابا نے ان کے گوناگوں علمی و عملی کمالات و فضائل کا بہت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے، امام شاطبی کی فقہ کی مکمل تعلیم ان ہی ابن لب کے سایۂ عاطفت و تربیت کی رہین منت تھی، لیکن بایں ہمہ خود اجتہادی صلاحیت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے متعدد مسائل میں اپنے استاذ ابن لب سے برملا اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔

مذکورۃ الصدر ارباب کمال کے علاوہ شاطبی نے بہت سے ان علماء سے بھی اکتساب علم کیا تھا جو کسی سفارتی مشن پر غرناطہ وارد ہوئے تھے، مثلاً قاضی ابو عبد اللہ المقری (المتوفی ۷۵۹ھ) جب ۷۵۷ھ میں سلطان ابو عنان کی جانب سے ایک سفارت میں غرناطہ آئے تو شاطبی نے ان سے اصول فقہ کی تحصیل کی، امام مقری فقہ مالکی کے ممتاز عالم اور بکثرت علوم کے جامع تھے، سلطان ابو عنان نے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد ان کے ساتھ انعام و اکرام کا خصوصی معاملہ کیا اور شہر فاس کے منصب قضا پر مامور کیا تھا، لسان الدین ابن الخطیب نے الاحاطہ میں لکھا ہے کہ عہدۂ قضا سے سرفراز ہونے کے بعد ان کا اصلی جوہر خوب چمکا اور اپنی حق پژوہی کے باعث وہ ہر خاص و عام کے محبوب بن گئے تھے، تصوف میں المقری کی تصنیف کتاب الحقائق والرقائق بہت مشہور ہے، شاطبی کو ان ہی کے فیض صحبت سے سلسلۂ شاذلیہ کے تصوف سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

امام شاطبی نے علوم عقلیہ میں اپنے عہد کے دو ممتاز اہل علم ابو علی منصور الزواوی اور ابو عبد اللہ الشریف التلسانی (المتوفی ۷۷۱ھ) سے مہارت حاصل کی تھی، اول الذکر ۷۵۳ھ میں

اندلس آتے تھے، ابن الخطیب نے عقلی و نقلی علوم میں ان کی جامعیت و مہارت اور حسن کردار کی بہت شاندار الفاظ میں تحسین کی ہے، غرناطہ کے فقہاء سے ان کے معرکے اکثر گرم رہتے تھے اسی باعث مورد الزام قرار دے کر ۷۶۵ھ میں اندلس سے نکال دیئے گئے، شاطبی نے الافادات والانشادات میں زواوی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے استاذ ابن سفر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ امام فخرالدین رازی نے اپنی مشہور تفسیر قرآن میں چار مختلف علوم کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان چاروں کتابوں کے مؤلفین معتزلی ہیں، چنانچہ انھوں نے اصول دین اور اصول فقہ کے لئے ابوالحسین کی کتاب "الدلائل" اور "المعتمد" تفسیر کے لئے قاضی عبدالجبار کی تصنیف کتاب "التفسیر" اور قواعد و بلاغت کے لئے زمخشری کی "کشاف" کو اپنا مشعل راہ بنایا ہے۔ علامہ شاطبی کے اس انکشاف سے یہ اہم حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ معتزلی علم کلام کے فروغ میں امام رازی کا نمایاں حصہ تھا۔

اصول فقہ سے شاطبی کا خاص شغف مذکورہ بالا اساطین علم و فن کے دامن فیض سے وابستہ رہ کر خود علامہ شاطبی بھی جامعیت و مہارت کے درجۂ کمال کو پہونچے، لیکن ان کے فکر و شغف کی خصوصی جولانگاہ اصول فقہ تھی، یہ حقیقت ہے کہ اندلس میں اس وقت فقہ و اصول کی طرف نسبتاً اعتناء بہت کم پایا جاتا تھا۔ اصول فقہ کی طرف شاطبی کے غیر معمولی میلان کا خاص سبب ان کا معاصرانہ یہ احساس تھا کہ نوع بہ نوع معاشرتی تغیرات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں فقہ اسلامی کا روایتی انداز ناکافی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تصنیف "الاعتصام" میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"جب سے میرے سن شعور کا آغاز اور میرے اندر حصول علم کا شوق پیدا ہوا، ہمیشہ میں دلائل شریعت اور اس کے اصول و فروع کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا، میں نے حتی الامکان نہ تو کسی علم کی تحصیل میں کوتاہی کی اور نہ کسی خاص فن کو اپنی خصوصی دلچسپی کا محور

بنایا ہیں نے اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لے کر خود کو علم کے بحر ذخار میں غرق کر دیا، یہاں تک کہ بعض مرتبہ تو ایسا لگا کہ اپنے فنا ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے قوت عطا فرمایا اور شریعت کے ان نکتوں کو مجھ پر منکشف کیا، جو میری فہم و تدبر سے بالاتر تھے، چنانچہ خداوند قدوس کی اعانت خاص سے میں برابر منزل کی طرف آگے بڑھتا گیا، میں نے اصول الفقہ سے متعلق تمام مسائل و فروعات پر غور و فکر سے کام لیا، اور یہیں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ بدعت کیا چیز ہے؟ کون سی بات ناجائز ہے اور کون سی جائز؟ دین کے اصولوں اور فقہ سے مقابلہ کرتے ہوئے میں نے خود کو اس جماعت کا ہم آہنگ و ہم نوا بنانے کی کوشش کی جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد اعظم فرمایا ہے۔ (ج ۱، ص ۹)

شاطبی کے زمانہ میں کسی بھی مسئلہ میں مراعات اختلاف کا اصول عام تھا جس کے تحت علماء کی باہم مختلف آراء کو یکساں طور پر صحیح تسلیم کیا جاتا تھا، اس رجحان و میلان کی انتہا یہ تھی کہ اختلاف رائے کا ذکر فخریہ کیا جاتا، خود شاطبی نے اپنے اس احساس کا ذکر کیا ہے کہ "امام مالک اور ان کے معاصر علماء کے اقوال کا باہمی اختلاف اکثر میرے ذہن پر حاوی رہتا تھا" اور شاطبی کو اس سے بڑی ذہنی الجھن اور پریشانی لاحق رہا کرتی تھی، چنانچہ اپنے استاذ ابو سعید بن لب سے تحصیل علم کرتے ہوئے اکثر ان کو ایسی پیچیدگیوں سے سابقہ پڑا، وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

"ایک بار میں اپنے دوستوں کے ساتھ استاذ ابو سعید بن لب سے ملنے گیا، انھوں نے فرمایا کہ میں تمہیں وہ چند بنیادی اصول بتانا چاہتا ہوں جن پر میں نے فلاں فلاں فتوے میں انحصار کیا ہے، اور میں تم پر یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے ان اصولوں کی مطابقت کیسے ضروری خیال کی، ہم لوگ ابن لب کے قاعدے سے واقف تھے، اس لئے اس کے بارے میں ہم نے ان سے بحث کی، ابن لب نے فرمایا کہ فتویٰ دینے کے سلسلہ میں یکساں اصول

ہوشیار رکھو، تمام علما اس اصول کو صحیح خیال کر کے اس پر عمل کرتے ہیں، وہ یہ کہ مستفتی سے کبھی سختی سے پیش نہ آیا جائے۔

اس کے بعد شاطبی لکھتے ہیں کہ،

كنت قبل هذا المجلس قد أورقت	اس ملاقات سے قبل امام مالک اور ان کے
على وجوه الاشكال في أقوال	رفقاء کے بہت سے اقوال مجھے اشکال و
مالك وأصحابه بعض أرق	تذبذب میں مبتلا کر دیا کرتے تھے، لیکن اس
المجلس شرح الله بنور ذلك	گفتگو کی روشنی سے اللہ نے میرا سینہ
الكلام صدري فارتفعت	کھول دیا اور مطمئن کر دیا اور دفعۃً
ظلمات تلك الاشكالات	ان اشکالات و پیچیدگیوں کی تاریکی دور
دفعة واحدة، ولله الحمد	ہو گئی، خدا کا شکر ہے، اللہ ابن لب کو
وجزاه عني خيرا	جزائے خیر عطا فرمائے۔

(نیل الابتہاج ص ۴۹)

اندلس کے بدلتے ہوئے معاشرہ اور تغیر پذیر سیاسی و معاشرتی حالات نے علمائے وقت کے لئے بڑے مسائل پیدا کر دیے تھے، شاطبی نے ان تمام تغیرات و انقلابات سے گہری دلچسپی لی اور متعدد علماء کو خط لکھ کر کئی اہم معاملوں میں ان کی رائے اور عمل سے اپنے اختلافی نقطۂ نظر کا مدلل اظہار کیا اور قوانین شریعت کے بنیادی مقاصد سے متعلق بہت سے اصولی سوالات اٹھائے، ذیل میں بعض مسائل میں علمائے وقت سے شاطبی کے مباحثوں اور اختلاف رائے کا ذکر کیا جاتا ہے،

(۱) غرناطہ کی زوال پذیر اقتصادی حالت کے پیش نظر سلطان نے عوام پر کچھ نئے ٹیکس نافذ کئے، فقہائے وقت اور علما [illegible]

شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شاطبی نے اس مسئلہ میں خود اپنے استاذ مفتی ابن لب کی مخالفت کرتے ہوئے یہ استدلال کیا کہ عوامی فلاح و بہبود اگرچہ پوری قوم کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن اس ہنگامی وقت میں یہ ذمہ داری سرکاری خزانے کی طرف منتقل ہو گئی ہے، لہٰذا مصالح کا تقاضا ہے کہ اس مقصد کے لئے عوام حکومت سے اشتراک عمل اور مالی تعاون کریں۔

(۲) ایک عرصہ سے اندلس میں یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ جمعہ کے خطبہ میں سلطان یا خلیفۂ وقت کا نام ایک آئینی حکمراں کی حیثیت سے ضرور لیا جاتا تھا، الموحدون نے اس رواج میں ایک مزید اضافہ یہ کر دیا کہ نماز جمعہ کے بعد اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بھی خلیفہ کا ذکر کرنا ضروری قرار پا گیا، شاطبی اور بعض دوسرے علماء نے پوری جرأت حق گوئی کے ساتھ اس رواج کے خلاف آواز بلند کی، ونشریسی نے المعیار المغرب میں قیاس ظاہر کیا ہے کہ اسی مخالفت کی پاداش میں شاطبی کو امامت سے معزول کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا، اس عہد کے کچھ علماء نے شاطبی کی رائے کی تردید بھی کی اور پورے اندلس و شمالی افریقہ میں عرصۂ دراز تک اس بحث کی گونج سنائی دیتی رہی، جن ممتاز علماء نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ان میں غرناطہ کے چیف جسٹس ابوالحسن النباہی، ابوسعید بن لب، محمد القشتلی (قاضی فاس) اور ابن عرفہ (قاضی تونس) کے نام خصوصیت سے لائق ذکر ہیں، شاطبی کے تلمیذ رشید ابوبکر بن عاصم (جو بعد میں النباہی کے جانشین ہو کر غرناطہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے) وہ واحد شخص ہیں، جنھوں نے شاطبی کے موقف کی حمایت و تائید میں سرگرم حصہ لیا۔

(۳) اس عہد میں سب سے زیادہ بحث و اختلاف کا موضوع مراعاتِ اختلاف کا مسئلہ تھا، جس کے باعث علامہ شاطبی نے اپنے "مقاصد الشریعۃ" کے اصولوں کی تشکیل کی "مراعات" کے اصول نے نہ صرف مختلف مسائل میں فقہاء کے یہاں اختلاف آراء کے وجود کو تسلیم کیا بلکہ اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی کر غور و فکر کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا، بعض علماء نے تو یہاں تک خیال ظاہر کیا کہ کسی بھی

حالات میں پہلے تمام اختلافی آراء کی جستجو لازمی ہے، اور پھر اس کے بعد ان نظریات پر اس طرح عمل کیا جانا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی رائے نظر انداز نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے اس اصول سے بعض مسائل میں تو بڑی سہولتیں پیدا ہوئیں، مگر اس کے باعث کچھ موقعوں پر دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

علامہ شاطبی نے اصول مراعات کے جواز کو چیلنج کیا اور مختلف علماء مثلاً ابن تاب قشتلی، ابن عرفہ اور شریف التلمسانی وغیرہ کو خطوط لکھے۔ ان علماء نے جواب میں جو وضاحتیں کیں، ان سے شاطبی کو شرح صدر نہ ہو سکا۔ دراصل شاطبی کا عقیدہ تھا کہ قوانین شریعت میں اختلاف آراء کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ شریعت کے تمام اصول ایک ہی منبع سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم عصر علماء کو شاطبی کے جو مباحثے اور اختلافات ہوئے ان کے باعث شاطبی نے قوانین شریعت کے منبع و مصدر کی وحدت سے متعلق مسائل کی تحقیق شروع کی اور انھوں نے مقاصد شریعت اور شارع کے اصل غرض و غایت پر بھی تحقیقات کیں، اسی غور و فکر اور تلاش و تحقیق کے نتیجہ میں شاطبی کے مشہور اجتہادی نظریہ "مقاصد الشریعہ" کے اصولوں نے جنم لیا، جن کی تشریحات ان کی تصنیف "الموافقات" میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

الموافقات میں شاطبی نے قوانین شریعت کے مروجہ نظریات اور وقت کی عام ہوا کے خلاف اپنے مخصوص و منفرد آراء کا اظہار کیا ہے، اس کے باعث ان کو بدعت و الحاد کے الزامات کا نشانہ بنا پڑا۔ احمد بابا نے "نیل الابتہاج" میں شاطبی کے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں، جن سے ان قلبی جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے جو شاطبی کے دل میں علماء وقت کی مخالفتوں اور بدعت کے الزام سے پیدا ہوئے تھے، وہ کہتے ہیں:

بلیت یا قوم والبلوی منوعۃ بمن اداریہ حتی کادیردینی
دفع المضرۃ لاجلب لمصلحۃ فحسبی اللہ فی عقلی وفی دینی

شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، شاطبی نے اس مسئلہ میں خود اپنے استاذ مفتی ابن لب کی مخالفت کرتے ہوئے یہ استدلال کیا کہ عوامی فلاح و بہبود اگرچہ پوری قوم کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن اس ہنگامی وقت میں یہ ذمہ داری سرکاری خزانے کی طرف منتقل ہوگئی ہے، لہٰذا مصالح کا تقاضا ہے کہ اس مقصد کے لئے عوام حکومت سے اشتراک عمل اور مالی تعاون کریں۔

(۲) ایک عرصہ سے اندلس میں یہ رواج چلا آرہا تھا کہ جمعہ کے خطبہ میں سلطان یا خلیفۂ وقت کا نام ایک آئینی حکمراں کی حیثیت سے ضرور لیا جاتا تھا، الموحدون نے اس رواج میں ایک مزید اضافہ یہ کردیا کہ نماز جمعہ کے بعد اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بھی خلیفہ کا ذکر کرنا ضروری قرار پاگیا، شاطبی اور بعض دوسرے علماء نے پوری جرأت حق گوئی کے ساتھ اس رواج کے خلاف آواز بلند کی، ونشریسی نے المعیار المعرب میں قیاس ظاہر کیا ہے کہ اسی مخالفت کی پاداش میں شاطبی کو امامت سے معزول کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا، اس عہد کے کچھ علماء نے شاطبی کی رائے کی تردید بھی کی اور پورے اندلس و شمالی افریقہ میں عرصۂ دراز تک اس بحث کی گونج سنائی دیتی رہی جن ممتاز علماء نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ان میں غرناطہ کے چیف جسٹس ابوالحسن النباہی، ابوسعید بن لب، محمد القشتلی (قاضی فاس) اور ابن عرفہ (قاضی تونس) کے نام خصوصیت سے لائق ذکر ہیں، شاطبی کے تلمیذ رشید ابوبکر بن عاصم (جو بعد میں النباہی کے جانشین ہوکر غرناطہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے) وہ واحد شخص ہیں، جنھوں نے شاطبی کے موقف کی حمایت و تائید میں سرگرم حصہ لیا۔

(۳) اس عہد میں سب سے زیادہ بحث و اختلاف کا موضوع مراعات الخلاف کا مسئلہ تھا، جس کے باعث علامہ شاطبی نے اپنے "مقاصد الشریعۃ کے اصولوں کی تشکیل کی "مراعات" کے اصول نے نہ صرف مختلف مسائل میں فقہاء کے یہاں اختلاف آراء کے وجود کو تسلیم کیا بلکہ اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی کے غور و فکر کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا، بعض علماء نے تو یہاں تک خیال ظاہر کیا کہ کسی بھی

معاملہ میں پہلے تمام اختلافی آرار کی جستجو لازمی ہے، اور پھر اس کے بعد ان نظریات پر اس طرح عمل کیا جانا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی رائے نظر انداز نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے اس اصول سے بعض مسلک میں تو بڑی سہولتیں پیدا ہوئیں، مگر اس کے باعث کچھ موقعوں پر دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

علامہ شاطبی نے اصول مراعات کے جواز کو چیلنج کیا اور مختلف علما رمثلاً ابن قباب فشتلی، ابن عرفہ اور شریف التلمسانی وغیرہ کو خطوط لکھے۔ ان علما نے جواب میں جو وضاحتیں کیں، ان سے شاطبی کو شرح صدر نہ ہو سکا، دراصل شاطبی کا عقیدہ تھا کہ قوانین شریعت میں اختلاف آرار کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ شریعت کے تمام اصول ایک ہی منبع سے پیدا ہوئے ہیں، ہم عصر علمار کے شاطبی کے جو مباحثے اور اختلافات ہوئے ان کے باعث شاطبی نے قوانین شریعت کے منبع و مصدر کی وحدت سے متعلق مسائل کی تحقیق شروع کی اور انھوں نے مقاصد شریعت اور شارع کے اصل غرض و غایت پر بھی تحقیقات کیں، اسی غور و فکر اور تلاش و تحقیق کے نتیجہ میں شاطبی کے مشہور اجتہادی نظریہ "مقاصد الشریعہ" کے اصولوں نے جنم لیا، جن کی تشریحات ان کی تصنیف "الموافقات" میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

الموافقات میں شاطبی نے قوانین شریعت کے مروجہ نظریات اور وقت کی عام ہوا کے خلاف اپنے مخصوص و منفرد آرار کا اظہار کیا ہے، اس کے باعث ان کو بدعت و الحاد کے الزامات کا نشانہ بننا پڑا۔ احمد بابا نے "نیل الابتہاج" میں شاطبی کے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں، جن سے ان قلبی جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے جو شاطبی کے دل میں علمار وقت کی مخالفتوں اور بدعت کے الزام سے پیدا ہوئے تھے، وہ کہتے ہیں:

بلیت یا قوم والبلوی منوعة — بمن اداریه حتی کا دیردینی

دفع المضرة لاجلب لمسلحة — فحسبی الله فی عقلی وفی دینی

(اے میرے اہل قوم! میں نوع بنوع آلام و آزمائشوں میں مبتلا ہو گیا ہوں اور آزمائشیں جس کو گھیر لیتی ہیں، تقریباً فنا کر ڈالتی ہیں، آپ لوگ اس لئے میری مذمت کرتے ہیں کہ میں غلطیوں کا تدارک کر رہا ہوں اور مصلحت کے حصول کے لئے کوشاں ہوں، خدا میرے افکار و عقائد کو پائندہ رکھنے میں میری مدد فرمائے)

علاوہ ازیں خود شاطبی نے الاعتصام میں اپنے مصائب کی داستان بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے

"میں نے متعدد عوامی پیشوں مثلاً وعظ و تبلیغ اور امامت کو اختیار کیا، جب میں نے اپنی راہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی تو میں نے خود کو ہم عصر علماء کی جماعت میں منفرد پایا، ان کے یہاں کہنہ روایات اور دیرینہ رسوم و رواج کا غلبہ تھا، میں ایک دوراہے پر اضطراب و کشمکش کے عالم میں کھڑا تھا، ایک راستہ تو میرے لئے یہ تھا کہ دوسرے علماء سے اختلاف رائے کرتے ہوئے میں اپنے نزدیک جادۂ صواب پر قائم رہوں، ایسی صورت میں ظاہر ہے مجھے ان عواقب کے لئے تیار رہنا تھا، جو کہنہ روایات اور رائج تصورات کے خلاف آواز بلند کرنے والے کو ہر دور میں پیش آتے رہے ہیں، خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ روایتی انداز فکر کے حامل لوگوں کو یہ ادعا ہو کہ ان ہی کے نظریات "سنت ثابتہ" پر مبنی ہیں۔

دوسری راہ میرے لئے یہ تھی کہ سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عام لوگوں کی اتباع کروں اور صراط مستقیم سے منحرف ہو جاؤں، میں نے فیصلہ کیا کہ اتباع سنت کی راہ میں اپنی حقیر جان قربان کر دوں گا، چنانچہ میں نے بہت سے مسائل میں اپنے اس فیصلہ پر عمل کیا، نتیجہ کے طور پر جلد ہی عتاب و مخالفت کا نشانہ بن گیا اور مجھ پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے، یہاں تک کہ مجھے بدعت بلکہ کفر کے اتہام میں بھی ملوث کیا گیا" (ج ۱ ص ۹ - ۱۱)

الاعتصام ہی میں شاطبی نے ان الزامات کی تفصیل بھی درج کی ہے جو ان کے خلاف

ے گئے تھے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

"(۱) کہا جاتا ہے کہ میں دعا کی عدم افادیت کا قائل ہوں، اس الزام کا سبب یہ ہے کہ مجھے نماز کے اختتام پر اجتماعی دعا کے عام رواج سے اتفاق نہ تھا۔

(۲) مجھ پر تشیع و رفض کے ساتھ یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ میں بعض خلفائے اسلام کے خلاف بغاوت کا حامی ہوں، اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں جمعہ کے خطبہ میں خلفائے راشدین کے نام ذکر کیے جانے کے رواج کا قائل نہیں تھا۔

(۳) مجھے اس الزام سے بھی متہم کیا گیا کہ میں دین میں جبر اور سختی کا بھی قائل ہوں، اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ فرائض و فتاویٰ کے سلسلہ میں صحیح روایات و احادیث کی پابندی میرا معمول تھا جب کہ میری مخالفت کرنے والے علماء اس چیز کو بسا اوقات نظر انداز کر دیتے اور مستفتی کی سہولت و پسند کے مطابق فتوے دے دیا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہائے وقت کے افکار و نظریات کی مخالفت کرنے کے باعث شاطبی پر محض بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے اتہامات عائد کئے گئے، اور تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، وقت کے رواں دواں دریا کے رخ کو موڑنے والی تمام عبقری شخصیتوں کے چہرے الزامات کی جراحتوں سے داغ دار ہیں، لیکن علم و فن کی بارگاہ میں ایسے افراد کو نمایاں ترین مقام عطا ہوتا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اندلس اور شمالی افریقہ کے ان ہی علماء نے شاطبی کی مخالفت کی جو منصب قضا یا دوسرے سرکاری عہدوں پر مامور تھے۔

شاطبی کے فیضان صحبت سے مستفید ہونے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے، احمد بابا نے ان کے تین نمایاں تلامذہ کا ذکر کیا ہے، جن میں ابوبکر محمد بن عاصم (المتوفی ۸۲۹ھ) [illegible] کے ساتھ اپنے غیر معمولی فضل و کمال کے باعث شہرت کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر چمکے، غرناطہ کے

قاضی القضاۃ بھی مقرر ہوئے، ان کی منظوم کتاب تحفۃ الحکام فی نکت العقود والاحکام بہت مشہور ہے، جو عام طور پر عاصمیہ یا تحفۃ ابن عاصم کے نام سے معروف ہے، اس کتاب میں قاضیوں کے لئے فقہ مالکی کے اصول مرتب کئے گئے ہیں، یہ الجزائر اور فاس سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

شاطبی کی وفات | جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، شاطبی کا سال ولادت نامعلوم ہے، لیکن وفات کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ ۸ شعبان بروز چہارشنبہ ۷۹۰ھ میں ہوئی۔

تصنیفات | ابو اسحاق شاطبی نے مختلف فنون میں قابل قدر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) عنوان التعریف باسرار التکلیف: یہ عام طور پر الموافقات فی اصول الاحکام کے نام سے معروف و متداول ہے، چار جلدوں پر مشتمل اس شہرۂ آفاق تصنیف نے شاطبی کے نام کو حیات جاوید عطا کی ہے، اس کا موضوع اصول فقہ اور شریعت کے اسرار و حکم ہے، اب تک اس کے متعدد اڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔

پہلی بار سنہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء میں تونس سے شائع ہوئی، جسے صالح القائجی، علی الشنوفی اور احمد الورتانی نے مرتب کیا ہے، ۱۳۲۶ھ میں موسیٰ جار اللہ کے ترکی زبان میں مقدمہ کے ساتھ اس کا صرف پہلا حصہ قازان میں بھی چھپ چکا ہے، دوسرا مکمل اڈیشن مطبع سلفیہ قاہرہ سے سنہ ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء میں طبع ہوا، جسے شیخ الازہر محمد الخضر الحسین نے مرتب کیا ہے، راقم سطور کے پیش نظر الموافقات کا یہی نسخہ ہے، تیسرا اڈیشن شیخ عبداللہ دراز کے قیمتی حواشی و ترتیب کے ساتھ مطبع مصطفیٰ محمد میں طبع ہوا، چوتھا اڈیشن مطبع محمد علی قاہرہ میں چھپا، جسے محمد محی الدین عبدالحمید نے مرتب کیا ہے۔

(۲) الاعتصام: تین جلدوں پر مشتمل توحید کی کتاب ہے، اس میں دس ابواب میں بدعت کی

تعریف اور اس کے ماخذ واحکام وغیرہ پر مبسوط بحث کی گئی ہے، سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۳ء میں اس کتاب کے کچھ اقتباسات علامہ رشید رضا نے اپنے مشہور رسالہ 'المنار' قاہرہ میں شائع کئے تھے پھر موصوف نے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے مکمل کتاب کی اشاعت کی جس کا متن کتب خانہ شنقیطی میں محفوظ الاعتصام کے ایک مستند نسخہ پر مبنی ہے، رشید رضا چونکہ خود بھی بدعت کے خلاف تیغ بے نیام تھے اس لئے انھوں نے الاعتصام پر اپنے مقدمہ میں شاطبی کے موحدانہ افکار و عقائد کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور ان کو رد بدعت کا ایک مجاہد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، علاوہ ازیں پروفیسر مارگولیتھ نے سنہ ۱۹۱۶ء میں رسالہ "دی جرنل ایشیاٹک سوسائٹی" میں الاعتصام پر ایک ناقدانہ تبصرہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ عمیق و دقیق افکار کے باعث یہ کتاب عسیر الفہم ہے۔

(۳) شرح علی الخلاصۃ فی النحو : چار ضخیم جلدوں میں الفیۂ امام مالک کی شرح ہے، اس کی افادیت و اہمیت کے بارے میں احمد بابا رقمطراز ہیں کہ

لم یؤلف مثلہ بحثا وتحقیقا	میرے علم و واقفیت کے مطابق بحث و تحقیق
کما اعلم	کے اعتبار سے اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی،

مکتبۃ الازہریہ میں اس کا ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے، جس کا آغاز اس طرح ہے :

"اللّٰھم انا نحمدك علی ما علمت ونشکرك علی ما انعمت"

اس قلمی نسخہ کے کاتب کا نام عمر بن عبداللہ المنظراوی ہے۔

(۴) کتاب المجالس : یہ صحیح بخاری کی کتاب البیوع کی نہایت فاضلانہ شرح ہے، احمد بابا نے اعتراف کیا ہے کہ

فیہ من الفوائد والتحقیقات	اس میں جو قیمتی باتیں اور تحقیقات پیش

ما يعلمه الا الله ۔   کی گئی ہیں، ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

ان کے علاوہ شاطبی کی تالیفات میں الافادات والانشادات، عنوان الاتفاق فی علم الاشتقاق، کتاب اصول النحو، رسالہ شاطبی اور فتاوی شاطبی قابل ذکر ہیں جن کے قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔

مراجع: اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱۔ نیل الابتہاج بتطریز الدیباج	احمد بابا التنبکتی
۲۔ نفح الطیب جلد ۷	مقری
۳۔ المعیار المغرب	ونشریسی
۴۔ الاعتصام	شاطبی
۵۔ الاحاطہ فی اخبار غرناطہ	لسان الدین ابن الخطیب
۶۔ الموافقات جلد ۱ ۔ ۴	شاطبی
۷۔ شذرات الذہب جلد ۷	ابن عماد حنبلی
۸۔ البستان فی ذکر العلماء والاولیاء بتلمسان	ابن مریم المدیونی
۹۔ المجددون فی الاسلام	عبد المتعال الصعیدی
۱۰۔ اعلام الفکر الاسلامی	فاضل بن عاشور
۱۱۔ تاریخ الاستاذ الامام محمد عبدہ	رشید رضا
۱۲۔ اصول الفقہ	محمد الخضری
۱۳۔ معجم المؤلفین	کحالہ عمر رضا
۱۴۔ الاعلام جلد ۱	خیر الدین زرکلی
۱۵۔ معجم المطبوعات	یوسف سارکیس

تصوّف کا مقصد

از

ڈاکٹر محمد شمس الحق شمسی لکچرر پوسٹ گریجویٹ عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ

تصوف کا لفظ قرآن و حدیث میں نہیں آیا ہے، صحابہ کرام کی زبان سے بھی اس لفظ کی ادائگی منقول نہیں، تصوف کی لفظی تحقیق بہت بعد کی ہے، کسی کا خیال ہے کہ یونانی لفظ تھیا سوفی کی تعریب ہے، اشراقی فلاسفہ کا انداز فکر، طرز عمل اور ان کی فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں اور اشراقی تجربوں کی بنا پر بعض اصحاب علم تصوف کا سلسلہ فلسفۂ اشراق سے ملاتے ہیں اور بعض لوگ اسے اصحاب صفہ کے حلقۂ ذکر سے مربوط کرتے ہیں، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ صوف سے بنایا گیا ہے کیونکہ پرانے صوفی اکثر موٹے جھوٹے کپڑے اور اون کی بنی ہوئی پوشاک استعمال کرتے تھے، جیساکہ اوپر کہا جاچکا ہے یہ سب بعد کی موشگافیاں ہیں، تصوف کا لفظ جس طرح بنا ہو اور جیسے بھی رائج ہوا ہو، اس کا مقصد اصلاح نفس تھا اور آج تک ہے، یہ مقصد شریعت کا مقصود اور انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف یہ نہ تھا کہ اللہ کی آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں، بلکہ آپ لوگوں کو رذائل سے بچاکر اخلاق عالیہ سے آراستہ کرنا چاہتے تھے، قرآن مجید میں تصریح ذکر ہے

ھوالذی بعث فی الامیین	وہی (اللہ) ہے جس نے ان پڑھوں کے درمیان
رسولاً منھم یتلو علیھم آیاتہ	انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے
ویزکیھم ویعلمھم الکتاب	سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں

والحکمۃ وان کانوا من قبل | پاکیزہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے
لفی ضلال مبین۔ (جمعہ ۲) | بے شک اس سے پہلے وہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اس طرح کی آیتیں کئی جگہ قرآن مجید میں ہیں، ان آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تزکیہ نفس کی طرف خاص طور سے توجہ کرتے تھے، جس طرح کسی برتن کو قلعی کرنے سے پہلے اچھی طرح مانجا جاتا ہے، کیونکہ جب تک میل کچیل اور داغ دھبے اچھی طرح صاف نہ ہو جائیں برتن میں چمک دمک اچھی طرح پیدا نہیں ہو سکتی ہے، اسی طرح اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دلوں کو گناہوں کی آلائشوں سے صاف کیا جائے اور بد عملیوں کے داغ دھبے دور کئے جائیں، تزکیہ کے بغیر کتاب و حکمت کی تعلیم موثر نہیں ہو سکتی ہے، یہی تزکیہ نفس تصوف کا مقصود ہے، صوفی گناہوں کو صرف ترک ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی جڑیں تلاش کرکے دل کی گہرائیوں سے نکال کر پھینک دیتا ہے، یہ کام آسان نہیں ہے، ہوس چھپ چھپ کر سینوں میں گھر بنانا چاہتی ہے، خواہشات بسا اوقات رذائل کو فضائل کی شکل میں پیش کرتی ہیں، لیکن ایمان و اخلاص کے سہارے وہ نفس و شیطان کے جال سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اس راہ میں اسے بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے اور سخت ریاضت و جانفشانی سے کام لینا ہوتا ہے، اللہ کی حضوری اور معیت کا تصور اس کے لئے مدد و معاون ہوتا ہے، اسی حقیقت کی طرف حدیث صحیح میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، ایک بار حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایمان و اسلام کے بارے میں آپ سے سوالات کئے، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی دریافت کیا احسان کسے کہتے ہیں، آپ نے فرمایا: احسان اس کا نام ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، لیکن اگر اتنا اونچا تصور تمھارے لئے ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ خیال کرو کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی جو کام بھی کرے یہ خیال کرلے کہ اللہ کی نظر کے سامنے ہے اور اللہ ظاہر ہی کو نہیں دیکھتا

بلکہ باطن سے بھی باخبر ہے، وہ ارادے اور نیت کو بھی بخوبی جانتا ہے، معمولی طور پر تو ہر مسلمان خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس لفظی ایمان کو حقیقت کا رنگ دینا بڑا مشکل ہے، اس راہ میں طرح طرح کے پیچ و خم پیش آتے ہیں اور قدم قدم پر شیطان کے جال میں الجھنے کا خطرہ رہتا ہے، لیکن اللہ کی معیت اور حضوری کو عین الیقین کے درجے تک پہونچائے بغیر نہ ایمان کامل ہو سکتا ہے نہ عمل صلاح و تقویٰ سے معمور ہو سکتا ہے، اسی کو قرآن مجید میں اخلاص سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔ (بینہ)	انھیں اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی، اطاعت و فرماں برداری پورے اخلاص کے ساتھ کی جائے۔

اسی کو حدیث شریف میں حسن نیت کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: انما الاعمال بالنیات یعنی عمل کا دار و مدار نیت پر ہے، اگر نیت خالص ہوگی تو عمل مقبول ہوگا ورنہ آدمی خواہ کچھ کرے اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہو سکتا ہے، جب تک کہ نیت میں خلوص اور ارادے میں پاکیزگی نہ ہو۔

تصوف کی لغوی تحقیق میں چاہے جو موشگافیاں کی گئی ہوں اور صوفیوں کے تذکرے چاہے جس انداز میں کیے گئے ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اپنی روح اور مقصد کے اعتبار سے تصوف شریعت کے منشا کے مطابق ہے، بہت ممکن ہے کہ تصوف کی طویل تاریخ میں کچھ قابل اعتراض باتیں مل جائیں اور بعض صوفیوں کے قول و فعل میں اعتراض کی گنجائش نکل آئے، لیکن اکابر صوفیہ نے ہمیشہ تصریح کی ہے کہ تصوف کتاب و سنت ہی سے ماخوذ ہے اور طریقت شریعت ہی کی عملی شکل ہے، ان بزرگوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو تلقین کی کہ شریعت سے ہٹ کر خدا رسیدگی ممکن نہیں ہے، زندگی جس قدر اللہ کے احکام کے مطابق اور سنت نبوی کے موافق ہوگی اسی قدر راہ ولایت کا سفر آسان ہوگا۔

صوفیہ کرام کے مختلف سلاسل و طبقات میں غالباً سب سے زیادہ مشہور و مقبول بزرگ حضرت

شیخ عبدالقادر جیلانی کی "فتوح الغیب" فن سلوک پر آپ کی کتاب ہے، اس کتاب کا پہلا مقالہ تعمیل اوامر اور اجتناب نواہی اور رضا بالقدر والقضاء پر ہے، اس میں فرماتے ہیں:

لابد لکل مؤمن فی سائر احواله	ہر مومن کے لئے یہ تین چیزیں لازمی ہیں،
من ثلثة اشیاء، امر یمتثله	ایک یہ کہ اوامر الٰہی کی تعمیل کرتا رہے،
ونهی یجتنبه، وقدر	دوسرے یہ کہ منہیات سے بچتا رہے، تیسرے
یرضی به	یہ کہ قضاء وقدر الٰہی پر راضی رہے۔

دوسرا مقالہ اتباع سنت اور ترک بدعت پر ہے، آغاز میں ہی فرماتے ہیں:

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا و	سنت کی پیروی کرتے رہو، راہ بدعت
لا تمرقوا۔	نہ اختیار کرو، اطاعت کرو اور دائرۂ
	اطاعت سے باہر نہ آؤ۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

ینبغی للمؤمن ان یشتغل اولاً	مومن کو چاہئے کہ سب سے پہلے فرائض پر
بالفرائض فاذا فرغ منها اشتغل	متوجہ ہو، جب یہ ادا کر چکے تب سنتوں کو
بالسنن ثم یشتغل بالنوافل	اختیار کرے، اس کے بعد نوافل پر متوجہ ہو
والفضائل فمن لم یفرغ من	لیکن جو شخص اپنے فرائض سے فارغ نہیں ہوا
الفرائض فالاشتغال بالسنن	اس کے لئے سنتوں میں مشغول ہونا حماقت
حمق ورعونة فان اشتغل بالسنن	و نادانی ہے، اس لئے کہ ادائے فرائض سے
والنوافل قبل الفرائض لم یقبل	قبل سنن و نوافل غیر مقبول رہیں گے اور
منه واهین (فتوح الغیب ص ۱۴۳)	جو شخص ایسا کرے گا خوار ہوگا۔

وصال سے ذرا قبل اپنے بڑے صاحبزادے شیخ سیف الدین عبدالوہاب کو وصیت فرمائی ؛

علیك بتقوی الله وطاعته	خدا کے تقوی اور طاعت کو اپنے اوپر
ولا تخف احدًا ولا ترج احدًا	لازم رکھو، بجز خدا کے کسی سے خوف یا امید
وکل الحوائج الی الله واطلبها	نہ رکھو، تمام حاجات کو خدا ہی کو سونپو،
منه ولا تثق باحد سوی الله	اور اسی سے طلب کرتے رہو، سوائے خدا
	کے کسی پر اعتماد نہ رکھو.

شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں :

"تصفیہ قلوب وتزکیہ نفوس براہ راست تعلیمات مصطفوی کا ثمرہ ہے، اور جو شخص اس سرچشمہ ہدایت ورشد سے جتنا زیادہ سیراب ہوا، اسی مناسبت سے صفائے قلب وتزکیہ نفس میں بھی اسی نے زیادہ ممتاز مرتبہ حاصل کیا" (عوارف المعارف ص ۶)

ایک قدیم بزرگ شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے صوفیہ کی تعریف یوں کی کہ

القائمون بعقولهم علی فهم السنة	اپنی عقل کو سنت رسول پر صرف کرتے ہیں
والعاكفون علیها بقلوبهم	اور اپنے قلب کو اس پر متوجہ رکھتے ہیں،

شیخ سہروردیؒ اس تعریف کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ،

هذا وصف تام وصفهم به	یہ ان (صوفیوں) کی بہترین تعریف ہے
(عوارف المعارف ص ۲۷)	جو کی گئی.

شیخ ہجویریؒ کا ارشاد ہے ؛

"خلق پر تمام راستے مسدود کر دئے گئے ہیں، سوائے اس کے کہ سنت نبوی کے نقش قدم پر چلا جائے، ہمارا سارا طریقہ کتاب الٰہی وسنت رسول کا پابند ہے" (رسالہ قشیری ص ۱۹)

ایک جگہ فرماتے ہیں :

"جو شخص حافظ کلام الٰہی و عالم احادیث مطلق نہیں، اس کی تقلید در بارۂ طریقت درست نہیں، اس لئے کہ ہمارے اس مذہب علم (سلوک) کا ماخذ قرآن و حدیث ہیں" (رسالۂ قشیریہ ص ۱۹)

عہد رسالت اور دور صحابہ میں تعلیم و تزکیہ اور احسان و اخلاص کا یہی رنگ قائم رہا، صحابہ کرام سبھی اس راہ پر گامزن تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے ان کے دل و دماغ کو اتنا اور اس قدر منور کر دیا تھا کہ باطل ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا، خلافت راشدہ کے بعد جب نظام حکومت میں تغیر ہوا اور آگے چل کر بادشاہوں کا عمل دخل بڑھا اور متاع دنیوی مطمح نظر بننے لگی تو اس کا اثر پورے مسلم معاشرے پر پڑا، بادشاہوں اور امیروں کی دیکھا دیکھی ملت کے دوسرے طبقے لذات دنیاوی کی طرف مائل ہو گئے، کلمۂ حق کہنا دار پر چڑھنے کا مرادف تھا، اس زمانہ میں دین کو بچانے اور اخلاص و احسان کی روح کو زندہ رکھنے کیلئے منظم کوشش کی ضرورت صلحائے امت کو محسوس ہوئی اور تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بہت سے لوگوں نے دنیا کے جاہ و منصب اور دولت و حشمت سے صرف نظر کر کے اپنی پوری زندگی لوگوں کے اصلاح حال میں صرف کر دی، یہیں سے ہمیں صالحین و مصلحین کا ایک گروہ مصروف کار نظر آتا ہے، حضرت حسن بصریؒ، حضرت سفیان ثوریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت ابن سیرینؒ، حضرت سید ابو سعیدؒ، حضرت سعید بن المسیبؒ، حضرت قاسم بن محمدؒ، حضرت جعفر صادقؒ اور ان کے ساتھیوں نے خاص طور سے اس اہم کام کی طرف توجہ کی، ان بزرگوں نے وقت کی سیاست سے اپنے دامن کو پورے طور سے بچایا، ترک دنیا حقیقی صوفیہ کا مقصد نہ تھا لیکن لوگوں کی اصلاح کے لئے ترک دنیا ناگزیر تھی، کیونکہ امراء و سلاطین کو اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو پھر کام کا کیا ذکر ہے جان کی بھی خیر نہیں تھی، چنانچہ ہر طرح کی احتیاط کے باوجود بہت سے بندگان خدا کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا، یہ سلسلۂ رشد و ہدایت آئندہ نسلوں میں بھی جاری رہا، خالص تاریخی بحث کے اعتبار سے ممکن ہے کہیں کہیں مرشد و مسترشد کے درمیان ملاقات ثابت نہ ہو، لیکن مجموعی طور پر ایک طبقہ

دوسرے طبقہ سے کسب فیض کرتا رہا اور بزرگوں کی تعلیمات و ہدایات کو آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتا رہا حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں علمائے اسماء الرجال کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی، لیکن ان کے بچپن کا ابتدائی زمانہ مدینہ منورہ میں گذرا، پھر بعد کو وہ بصرہ آئے، اگر مدینہ منورہ میں ان کی عمر کم مانی جائے تو بصرہ میں تو وہ سن شعور کو پہونچ چکے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ میں کافی دنوں رہے، اس لئے حضرت حسن بصری کی ان سے ملاقات ممکن ہے اور سند میں اتصال کیلئے امکان لقاء کافی ہے، جیساکہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح کے مقدمہ میں دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے۔

بعد کے لوگوں میں حضرت فضیل بن عیاضؒ، شفیق بلخیؒ، حبیب عجمی، حاتم اصمؒ، بایزید بسطامیؒ، ذوالنون مصریؒ، بشر حافیؒ، جنید بغدادیؒ، ابوبکر شبلیؒ، اسد محاسبیؒ، شیخ علی ہجویریؒ، ابوالقاسم قشیریؒ، امام غزالیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ، خواجہ عثمان ہارونیؒ، خواجہ عبدالواحدؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، بیشمار اشخاص نے بندگان خدا کو راہ حق دکھائی اور اپنی تعلیم و تلقین سے لاکھوں انسانوں کے دلوں کا زنگ دور کیا اور ان کے قلوب کو نور عرفان سے منور کیا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی بہت سے نفوس قدسیہ پہونچے اور ان کی بدولت اس ملک میں بھی فیضان حق کے چشمے رواں ہوئے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاءؒ، شیخ بہاء الدین ملتانیؒ، خواجہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، سید محمد گیسو دراز، مخدوم احمد یحییٰ منیری، مخدوم شرف الدین احمد، مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ، مخدوم جہانگیر اشرفؒ، شاہ مینا لکھنویؒ، شاہ عبدالرزاق بانسویؒ، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ، مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت شاہ بدر الدین پھلواریؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ وغیرہ بے شمار بزرگان دین گذرے ہیں جن کے نام لیوا آج بھی باقی ہیں اور اپنے بزرگوں کی طرح رشد و ہدایت کے کام میں لگے ہوئے ہیں، تصوف کی تاریخ میں بہت سے

تذکرِ مقامات آتے ہیں اور بعض صوفیہ کے پیچیدہ اقوال نظر سے گذرتے ہیں، بہت سے لوگوں نے ان اقوال کو مرکز بحث و توجہ بنالیا ہے اور موافقت و مخالفت میں تصانیف کے انبار لگ گئے ہیں، جذب و سکر، وجد و حال، وجود و شہود کے مباحث سے کتب خانے بھر گئے ہیں، لیکن یہ مسائل تصوف کا اصل مقصود نہیں ہیں بلکہ علم و نظر اور احساسات و تجربات کے کچھ اشارے ہیں، اذکار و اشغال اور فکر و ریاضت کے دوران کچھ مناظر نظر کے سامنے آتے ہیں اور بعض اصحاب کی زبان سے غلبۂ حال کی بنا پر کچھ الفاظ نکل جاتے ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اکابر صوفیہ نے باربار یہ تصریح کی ہے کہ کتاب و سنت سے سر مو تجاوز درست نہیں ہے، قرآن و حدیث ہی علم کا سرچشمہ اور حقیقت کا معیار ہے، کسی حال میں شریعت سے انحراف جائز نہیں ہے، شاہراہِ نبوت سے ہٹ کر ولایت کی منزل تک پہونچنا ناممکن ہے، اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے تو ان مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ افکار و خیالات پر زمانہ کے علوم و معارف کا اثر پڑتا ہے، ابتدائے اسلام میں عرب میں منطق و فلسفہ اور نجوم و ہیئت وغیرہ علوم رائج نہ تھے، قرآن مجید اور احادیث میں مخاطبین کی حالت کے پیش نظر سادہ طریقہ سے دینی مسائل بیان کردئے گئے، جو مسائل روزمرہ کی عملی زندگی سے تعلق رکھتے تھے ان پر عمل کرکے مسئلہ کو مزید واضح کردیا گیا، لیکن جن امور کا تعلق غیبی حقائق سے تھا، ان کے بارے میں زیادہ غور و فکر اور بحث و مباحثہ سے منع کردیا گیا تاکہ تعبیر میں غلطی نہ ہو، کیونکہ قرن اول کی معمولی غلطی آئندہ عظیم الشان غلطیوں کی بنیاد بن جاتی، اسی لئے ان مسائل پر سوالات سے منع کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کو بڑی تاکید کی کہ جو ضروری باتیں انھیں بتائی جائیں ان کو سمجھیں اور عمل کریں، لیکن غیر ضروری امور کے بارے میں سوال نہ کریں، کیونکہ سوالات سے آئندہ کے لئے دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا، اس طرح صحابہ کرام کو اس کا عادی بنادیا گیا کہ سوال سے احتراز کریں، عہد صحابہ کے بعد جب عباسی عہد میں یونانی علوم و فنون کے ترجمے شائع ہوئے اور گھر گھر نئے خیالات و افکار

بحثیں ہونے لگیں، اس زمانہ میں شریعت کے سادہ مسائل بحث و نظر کا موضوع بن گئے اور توجیہ و تاویل کے دروازے کھل گئے، ایک زمانہ تک راسخ العقیدہ مسلمان ان مباحث کو بری نظر سے دیکھتے رہے، محدثین کے حلقوں میں فلسفیانہ موشگافیوں کو بہت ناپسند کیا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ ان عقلی علوم کا عام رواج ہوگیا اور ان کے اثر سے ذہنوں میں نئی نئی الجھنیں پیدا ہونے لگیں، ان حالات میں علم کلام کی بنیاد پڑی تاکہ دینی حقائق کو علم و استدلال سے بھی ثابت کیا جائے اور عقل کو نقل کے ماننے پر مجبور کیا جائے، اسی صورت حال سے صوفیہ کو دوچار ہونا پڑا، ان کے صاحب علم و نظر اصحاب نے ان علوم سے پوری واقفیت حاصل کی، مشائین کے ساتھ انھوں نے اشراقیین کے افکار و خیالات سے بھی واقفیت حاصل کی نیز ان کے گروہ میں ریاضتوں اور اصلاح نفس کے جو طریقے رائج تھے ان سے بھی واقفیت حاصل کی، اور خود اپنے تجربوں سے انھیں جانچ کر صحیح و غلط میں امتیاز کیا، امام غزالیؒ، امام فخر الدین رازیؒ، شیخ محی الدین ابن عربیؒ، ذو النون مصریؒ وغیرہ بہت سے اصحاب یونانی علوم و فنون سے بخوبی واقف تھے، ان لوگوں کی تحریروں میں دینی مسائل کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ عقلیت پسند بھی اس سے متاثر ہوں، اسی طرح واردات قلبی و مشاہدات باطنی کے بیان میں کہیں کہیں فلسفیانہ زبان استعمال کی گئی ہے، اگر ان کے بیانات غور سے پڑھے جائیں اور ان کے باطنی مشاہدات کا اچھی طرح تجزیہ کیا جائے تو وقت کے افکار اور عقلی استدلال کی جھلک صاف نظر آتی ہے، جس طرح متکلمین کی تعبیر اور انداز بیان پر محدثین نے شروع میں بڑی دار و گیر کی تھی، اسی طرح ان فلسفہ داں صوفیوں کے طرز بیان اور انداز تعبیر پر بھی راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اعتراض کیا، جس طرح متکلمین کے مختلف مکاتب فکر تھے اسی طرح فلسفہ و حکمت سے واقف اور ریاضت و صفائی باطن کے مختلف طریقوں سے آشنا صوفیہ کے یہاں بھی تعبیر و انداز بیان کے اعتبار سے مختلف طبقے ہیں، گو متکلمین کی طرح ان کی حلقہ بندی نہیں کی گئی، مگر ان کے درمیان بھی بڑا تفاوت تھا۔

لاہور کے علمی تحائف

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۴)

ماہ نو کا اقبال نمبر: یہ ۲۳۰ صفحے پر مشتمل ہے، ماہ نو حکومت کی سرپرستی میں شائع ہوتا رہتا ہے، پاکستان کا مقبول ماہانہ مجلہ ہے، اس میں گذشتہ تیس سال سے علامہ اقبال پر جتنے مضامین شائع ہوئے، ان ہی کا بہت اچھا انتخاب ہے، اسی لئے اس میں بہت سے مرحومین مثلاً میاں بشیر احمد، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مولوی عبد الحق اور ضیاء الدین احمد برنی کے بھی مضامین پڑھنے میں آئے، علامہ اقبال پر جتنا بھی کچھ لکھا جائے گا، پھر بھی بہت کچھ لکھنے کو باقی رہ جائے گا، وہ تو نظر و فکر اور شعر و ادب کے ترشے ہوئے کوہ نور ہیں کہ جس پہلو اور جس زاویہ سے ان کو دیکھا جائے گا ان میں طرح طرح کے انوار نظر آئیں گے، اس نمبر میں ان کے نظریۂ فن ادب، خون جگر کی نمود، مذہبی شعور، تصور الٰہ انسانی پہلو، تصور فقر، تصور عشق، تصور معاشرہ، تصور تعلیم، احترام آدمی، نظریۂ حرکت وغیرہ پر مفید مضامین ہیں، اقبال مولانا روم سے جس طرح متاثر ہوئے، اس پر خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ، رفیق خاور اور میاں بشیر احمد کے بہت اچھے مقالات ہیں، میں نے ذاتی طور پر جناب بشیر احمد ڈار صاحب کا مقالہ "اقبال اور نطشے" کو بہت ہی شوق اور غور سے پڑھا، اور جب اس کو ختم کیا تو مجھ کو خوشی ہوئی کہ اس میں وہی ساری باتیں قلمبند کی گئی ہیں جو میرے

تحت الشعور میں تھیں ۔ جناب بشیر احمد ڈار اقبال کے متعلق جو کچھ لکھ دیں اس کو بہت ہی غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے ، کیونکہ اقبال شناسی میں ان کا مرتبہ بہت ہی بلند اور ارفع ہے ، عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال کے ہاں انسان کامل کا تصور نطشے سے ماخوذ ہے ، مگر ڈار صاحب نے علامہ اقبال کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کامل کا جو نقشہ نطشے کے ذہن میں تھا وہ اقبال کے لئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھا ۔ ڈار صاحب نے اسرار خودی کے مقدمہ انڈین اینٹی کیوری میں علامہ اقبال کے ایک مضمون سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک انگریزی مورخ کے سوال کے جواب میں علامہ اقبال کی ایک انگریزی تحریر اور آخر میں علامہ اقبال کی تشکیل جدید کے آخری خطبہ کے ایک اقتباس سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ کامل انسان کا ایک تخیلاتی نقشہ نطشے کے ذہن میں ضرور موجود تھا ۔ لیکن بد قسمتی سے الحاد اور اشتراکی تعصبات سے وہ گمراہ ہو گیا ، جب اقبال نے انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ ان کے کانوں تک نہ پہونچا تھا ، نہ اس کی کتابیں ان کی نظروں سے گذری تھیں ، اقبال کے خیال میں نطشے کے فوق البشر کا تصور سراسر مادیت پر مبنی ہے ، یہ حیاتیاتی پیداوار ہے ، اس کے برخلاف علامہ اقبال کا اسلامی انسان کامل روحانی عوامل کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے ، علامہ اقبال نطشے کو ذہین اور فطین ضرور سمجھتے رہے ، مگر ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور فطانت کی بدولت ضائع ہو گیا ، وہ اپنی اندرونی قوتوں سے زندگی کی جھلک ضرور دیکھتا رہا ، مگر یہ جھلک لا حاصل اس لئے ثابت ہوئی کہ اسے کوئی مرشد کامل نہ ملا ، جو اس کی رہنمائی کرتا ، اقبال اس کو مجذوب فرنگی کہتے ہیں ، اور اپنے ایک شعر میں کہہ گئے ہیں ؛

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اور یہ بھی کہتے ہیں ؛

کاش بودے در زمانِ احمدے تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

اگر محنت دریافت کی جائے تو یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے نطشے، شوپنہار، اور برگساں وغیرہ جیسے مغربی مفکرین کے خیالات کو بھی اسی طرح رد کیا ہے، جس طرح انھوں نے نطشے کے انکار کو کیا ہے، یہ کوئی دعویٰ نہیں کرتا کہ اقبال مغربی مفکرین کی دھاروں سے بے نیاز رہے، بلکہ انھوں نے توان کا گہرا مطالعہ کیا، مگر جیسا کہ پہلے کہا گیا، مطالعہ کرنے میں ان سب کو اسلام کے بنیادی اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی، اگر وہ اسلامی عقائد کے مطابق تھے توان کو قبول کیا، ورنہ ان کو رد کیا اور اگر قبول کیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان سے متاثر ہوئے، بلکہ ہم اپنے استاذ محترم کے الفاظ کو پھر یہ لکھ کر دہراتے ہیں کہ انھوں نے علوم الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے راز داں ہونے کی حیثیت سے نئے فلسفہ کے ہر راز کو جاننے کے بعد اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھایا، اور اسی حیثیت سے ان کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی مغربی مفکر کی فکر کی آواز بازگشت اقبال کی شاعری میں سنائی دیتی ہے تو کیا اس کی تعبیر یہ نہیں ہے کہ خود مغربی مفکر نے اسلام کے مفکرین سے خوشہ چینی کی، فلسفہ میں قطعیت تام کی کوئی چیز نہیں تو اسلام کے مفکرین کے یہاں کیا وہ فکر نہیں جو مغربی مفکرین کے یہاں ہے، البتہ اس کو پیش کرنے کا وہ موثر اور جاندار انداز اسلام کے مفکرین کے یہاں نہیں جو مغربی مفکرین کے یہاں ہے، اقبال نے اسلامی مفکرین کی چیزوں کو جب موثر اور جاندار طریقہ پر پیش کیا تو مغربی مفکروں کے خیالات سے مرعوب ہونے والوں کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ مغربی مفکرین ہی کے رستہ کے مسافر ہیں، یہ تو بہت آسانی سے دکھا دیا گیا ہے کہ اقبال مغرب کے اس اور اس مفکر سے متاثر ہوئے، لیکن رومی، سنائی، عراقی اور ایک دو ایسے اور اسلامی مفکروں کے اثرات کے تجزیے کی تو ضرور کوشش کی گئی، لیکن ان حکماء، علماء اور صوفیہ کے اثرات کی باضابطہ کھوج لگانے کی

اب تک کوشش نہیں کی گئی ہے جن سے اقبال کیا بلکہ مغربی مفکرین بھی متاثر ہوئے ، اگر اقبال کا مطالعہ اس حیثیت سے کیا گیا تو اقبال ہرگز مغربی مفکرین کے کاسہ لیس یا دریوزہ گر نظر نہیں آئیں گے ۔

جناب بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اقبال نے کلام پاک کی کن کن آیتوں اور ہدایتوں سے اپنی خودی کے فلسفہ کی تشکیل کی، ضرورت اس کی ہے کہ ان اجمالی اشاروں کو تفصیل سے بیان کیا جائے ۔

ماہ نو کے زیر نظر نمبر میں آخر میں اقبال کی مختلف سرگرمیوں کی تصویریں بھی ہیں ، اس کے آخری صفحہ پر عبدالرحمن چغتائی نے اقبال کی جو تصویر بنائی تھی ، وہ دکھائی گئی ہے ۔

ثقافت سہ ماہی کا اقبال نمبر : یہ اسلام آباد کے پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا ترجمان ہے ، اس کی مجلس مشاورت میں پاکستان کے چوٹی کے اہل علم اور اہل قلم شریک ہیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں ، ڈاکٹر محمد حسن دانی ، پیر حسام الدین راشدی ، ڈاکٹر این ، اے ، بلوچ ، پروفیسر قدرت اللہ فاطمی اور عطا شاد ہیں ، چیف ایڈیٹر اعجاز احمد سیرین ہیں ، اس کی کتابت و طباعت ایسی اعلیٰ اور عمدہ ہے کہ اگر اردو کا ہر رسالہ اسی طرح شائع ہوتا رہے تو اردو زبان کے فروغ میں کوئی قدغن کارگر نہیں ہو سکتا ہے ، اس کے مضامین کے عنوانات یہ ہیں ، علامہ اقبال کا نظریہ دعا ، انا ، شعور اور خودی ، اقبال اور عطیہ بیگم ، اقبال اور عہد حاضر ، اقبال اور تصور انقلاب ، جاوید نامہ ، اقبال کا فلسفۂ تعلیم و تربیت ، اقبال اور اسلامی ثقافت کی روح ، اقبال کی شعری علامتیں ، برصغیر میں جدید مسلم الٰہیات کی تشکیل میں اقبال کا حصہ ، قومی کردار اور فکر اقبال کے تناظر میں اقبال کا ایک شعر ، اقبال شخصیت و کردار ، بلوچستان اور اقبال ، یہ تمام مضامین بڑی خوش سلیقگی اور خوش مذاقی سے لکھے گئے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد ناظرین پر یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ اقبال کا خیال تھا کہ ہم دعا ہی سے مذہبی واردات کو اس کے قریبی یا مماثل واردات سے ، خواہ وہ اخلاقی ہوں یا جمالیاتی ،

تعلق کے ساتھ ہندوستان کے عربی مراکز اور اسلامی اداروں سے بھی گہرا ربط رہا، اور مختلف علمی و ادبی انجمنوں کے رکن رہے، عالم اسلام میں اپنی خدمات کی بنا پر انھیں بڑی شہرت حاصل تھی، ۱۹۲۸ء سے دمشق کی مشہور علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" کے رکن منتخب ہوئے، اس کے ترجمان "المجلۃ العربی" میں آپ کے بہت سے مضامین شائع ہوئے، عربی کے سب سے اہم لغت لسان العرب کی اشاعت کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں بھی میمن صاحب کا نام شامل تھا، ان کی ان وسیع خدمات کے صلہ میں جامعۂ ازہر کی طرف سے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند دی گئی۔

آپ کی دوسری مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ دوسری قابل ذکر علمی و ادبی کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ابن رشیق، ۲۔ نسب عدنان وقحطان، ۳ نظرۃ علی دیوان نعمان بن بشیر الانصاری، ۴۔ ماانفق لفظہ واختلف معناہ، ۵۔ النتف، ۶۔ الطرائف الادبیۃ، ۷۔ الکلید الخزانۃ۔ ۸۔ عرام بن الاصبغ السلمی الاعرابی کی اسماء جبال تہامہ، ۹۔ زیادات المتنبی۔ ۱۰۔ ثلاث رسائل، ۱۱۔ المداخل، ۱۲۔ فرائد القصائد ۱۳۔ دیوان الشنفری، ۱۴۔ دیوان ابراہیم الصولی، ۱۵۔ دیوان حمید بن ثور ۱۶۔ الفاضل للمبرد، ۱۷۔ حواشی اللسان، ۱۸۔ اغلاط معجم الادباء یاقوت، ۱۹۔ خلاصۃ السیر۔ ۲۰۔ ابواب مختارہ، ۲۱۔ الفائت، ۲۲۔ اغنیاء الجرجانی، ۲۳۔ دیوان سحیم العبد، ۲۴ دیوان کعب، ۲۵۔ المقصور للفراء، ۲۶۔ التنبیہات وغیرہ وغیرہ،

"م، ن، ن"

ماننے والے تھے، ایک ایسا دین جس نے مستقبل کی باگ ڈور عام انسانوں کے ہاتھ میں دے کر تحقیق اور مشاہدے کا حکم لگا دیا ہے، اقبال کے نزدیک اسلامی الٰہیات میں اس یونانی نظریے کو قبول کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے کہ کائنات ایک ساکن اور جامد وجود ہے، قرآن حکیم کے نزدیک کائنات ایک متحرک، تخلیقی اور ہرآن تغیر پذیر وجود ہے، اسی تصور پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے، کوئی مسلم معاشرہ تغیر و تبدل کے تصور کو نظرانداز نہیں کر سکتی، وہ جمود اور سکون کا دشمن ہے، اس کے نزدیک زندگی صرف تغیر اور انقلاب سے عبارت ہے، اقبال کا حسین معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی دنیا بھی ہے جہاں بے انصافی اور عدم مساوات کا نام بھی نہیں، یہ معاشرت اپنے معنوں میں جمہوری تو ہے، لیکن اس طرح کی جمہوری نہیں، جس کا تصور یورپ نے دیا ہے، وہ مغربی طرز جمہوریت کے اسی لئے مخالف تھے کہ ان کے نزدیک یہ طریقہ انصاف اور عدل پر مبنی نہیں، یہ ایک شاطرانہ نظام ہے جس میں چند سیاسی آقا اپنے مفادات کے لئے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکساتے ہیں، اقبال کے نزدیک ان ساری خرابیوں کا علاج اسلام کے مثالی معاشرہ میں ہے، جہاں استحصال نام کی کوئی شے نہیں، لیکن اسلام کا مثالی معاشرہ نعرے سے وجود میں نہیں آتا، اس کے لئے ایک مسلسل عمل اور حسن کردار کی ضرورت ہے جو اقبال کی رائے میں صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب انسان عشق و مستی کی منزل کو چھو لیتا ہے۔

اقبال کی یہ وہ تعلیمات ہیں جن کو بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے، خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے اہل قلم اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے مصنف اور اہل قلم اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھ کر جو کچھ لکھتے ہیں، وہ کیا ان کی صرف ذہنی کرشمہ سازیاں اور قلمی جلوہ آرائیاں ہیں، یا پاکستان کا معاشرہ بھی اقبال کے تخیل کے

مطابق بن رہا ہے، یا رسائل و جرائد میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد پاکستان کی ساری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے؟ اس کا جواب پاکستان کے دانشوروں سے طلب کرنا ضروری ہے اگر وہ اس کا جواب تشفی بخش نہیں دے سکے تو اقبال کے یہ تمام خاص نمبر بہلانے والے کاغذی کھلونے ہی کی حیثیت رکھیں گے، پاکستان کے قیام میں ایک مبلغ اسلام نے بہت دکھ اور درد کے ساتھ خود مجھ سے کہا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کے لئے کوریا، جاپان، یوگوسلاویہ اور دوسرے ممالک گئے، اور وہاں کے کچھ لوگوں کو مسلمان کیا، مگر خود کراچی میں ان کی گردن شرم سے جھکی رہتی ہے کہ یہاں کی نوے فیصدی عورتوں اور اسی فی صدی مردوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے، ان کی یہ گفتگو سن کر خود مجھ کو دکھ ہوا کہ اقبال مسلمانوں کا ایک وطن بنا کر یہاں اسلام کی تشکیل جدید چاہتے تھے تاکہ یہ اسلام کا قلعہ بن جائے، مگر وہاں کا معاشرہ مثالی یا بقول علامہ محمد اقبال ملکوتی بننے اور عشق و مستی کی منزل کو چھونے کے بجائے یہ کہاں جا رہا ہے؟ اس کا فیصلہ خود اہل پاکستان کر سکتے ہیں، مگر اتنا ضرور لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ پاکستان جاتے ہوئے ہم جب امرتسر پہونچتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر فوراً یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم سکھوں کے شہر میں ہیں، مگر لاہور، اسلام آباد، اور کراچی پہونچ کر وہاں کے لوگوں کی وضع قطع اور ان کے رہن سہن اور طور طریقے کو دیکھ کر یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم اسلامی شہر میں گھوم رہے ہیں۔

پاکستان مصور کا اقبال نمبر، اس میں علامہ محمد اقبال پر فارسی میں مضامین ہیں، جن کے کچھ عنوانات یہ ہیں، اقبال و قائد اعظم پیش بیں و واقع بیں، از دکتر م۔ معز الدین، اقبال بعنوان فیلسوف سیاسی مسلمانان شبہ قارہ از جی الانہ، مذہب و علوم از دیدگاہ اقبال، از دکتر محمد رضی الدین صدیقی، اقبال ایجاد کنندہ پاکستان، از سید عبد الواحد، نغمات آزادی آخرین علامہ اقبال از دکتر محمد ریاض، اقبال و رومی از دکتر خلیفہ عبد الحکیم، بحث در آثار

وسبک اشعار، علامہ اقبال از استاد دکتر حسین خطیبی، سیر اقبال شناسی در ایران، از سید مرتضیٰ موسوی وغیرہ۔

ان مقالات میں استاد دکتر حسین خطیبی کا مضمون بحث در آثار وسبک اشعار علامہ اقبال، دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہے، استاد دکتر حسین خطیبی خالص ایرانی ہیں، وہ رقمطراز ہیں کہ اقبال کی فارسی شاعری میں جہاں سبک ہندی ہے، وہاں سبک عراقی اور سبک خراسانی بھی ہیں، ان کا خیال ہے کہ اقبال جہاں رومی، سنائی، عطار کو مخاطب کرکے ان کے رنگ میں اشعار کہتے ہیں تو ان میں سبک خراسانی پیدا ہو جاتا ہے، ان کی مثنویوں، اسرار خودی، رموز بے خودی، جاوید نامہ، مسافر، پس چہ باید کرد، اے اقوام شرق میں، مثنوی مولوی کا سبک اور وزن ہے، پیام مشرق اور دوسرے قطعات میں بوعلی سینا اور رومی کا رنگ ہے، گلشن راز جدید میں محمود شبستری کی تقلید کی گئی ہے، بعض اشعار میں بابا طاہر عریاں کی روش ہے، حافظ اور سعدی کے سبک میں جو غزل سرائی کی گئی ہے ان میں سبک عراقی زیادہ نمایاں ہے، اگر یہ مضمون واقعی کسی اہل نظر ایرانی کا ہے اور کسی سیاسی مصلحت کے بغیر لکھا گیا ہے تو یہ اقبال کیلئے بڑا خراج عقیدت ہے، ورنہ ایرانی شعراء تو طالب آملی، کلیم، قدسی اور صائب کو بھی سبک ہندی کے نمائندے سمجھ کر ان کو زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔

اس زیر نظر اقبال نمبر میں بھی اقبال کی زندگی کے مختلف حصوں کی بہت سی تصویریں ہیں

پاکستان پکٹوریل کا اقبال نمبر: اس میں اقبال پر انگریزی میں مضامین کا انتخاب ہے جو اس انگریزی مجلہ کے گذشتہ شمارے میں شائع ہوتے رہے، ان میں اقبال کو اسلام کا فلسفی بتایا گیا ہے، ان کے نظریہ سیاست اسلامی پر بھی بحث کی گئی ہے، آرٹ اور لٹریچر پر ان کے خیالات کی وضاحت کی گئی ہے، تعلیمات پر ان کے افکار بھی بتائے گئے ہیں، پاکستان کی

تحریک میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے ، اس کی تفصیل بھی ہے ۔ انسان کو جس طرح انھوں نے بلند کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی دکھایا گیا ہے ۔ اقبال کی شہرت یورپ میں کیسی ہے ، اس پر بھی مضمون ہے ۔ مذہب کے متعلق اقبال کے کیا خیالات تھے ، شاعری اور غزل گوئی میں ان کا کیا درجہ ہے ، ان پر بھی مضامین ہیں ، اقبال اور دانتے ، اقبال اور ملٹن پر بھی مقالات ہیں ۔ میری نظر اقبال اور ملٹن کے مضمون پر زیادہ ٹھہری ، خود مضمون نگار کو اعتراف ہے کہ اقبال نے اپنی کسی نظم میں ملٹن کا ذکر نہیں کیا ہے ، اور یہ صحیح ہے ، شیکسپیر پر ان کے کچھ اشعار ہیں ، مگر انہیں ملٹن کے لئے تعریفی کلمات نہیں لکھے محض اس لئے کہ ملٹن اور اقبال دونوں کی شاعری میں شیطان اور زوال آدم کا ذکر ہوا ، اگر اس لئے اقبال پر ملٹن کے اثرات دکھانے کا جواز ہو جاتا ہے ، تو یہ صحیح نہیں ، توارد کا ہو جانا اثر پذیر ہونے کا ضروری ثبوت نہیں ۔ غالب کے یہاں بھی توارد کی مثالیں ملتی ہیں ، مگر ان کو اپنے ہی خیال خانۂ ازل پر فخر رہا ، اور اسی فخر میں یہ کہہ گئے ہیں کہ شاعری کوئی چیک یا تمسک تو نہیں جس پر کسی خاص آدمی کا دستخط یا مہر یا نام ہو ، یہ ایک نوٹ ہے کہ جس کے ہاتھ میں آ جائے اسی کی ملکیت ہے ، اقبال کی ملکیت کا اندازہ بھی اسی روشنی میں لگانا چاہئے ۔

ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ کا اقبال نمبر : یہ اقبال نمبر پاکستان کے مشہور صحافی حبیب الرحمٰن شامی کی ادارت میں شائع ہوا ہے ، اس کی ضخامت زیادہ نہیں ، مگر مختلف مضامین میں اقبال کی زندگی کے جزوی واقعات دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں ، مثلاً وہ بڑے نرم دل تھے ، بات بات پر رو پڑتے تھے ، خود کبھی مرغی ذبح نہیں کی اور نہ ذبح ہوتے دیکھی ، انھوں نے کبھی کسی ملازم کو نہیں ڈانٹا ، اپنے بڑے بھائی عطا محمد کے بہت زیادہ فرماں بردار تھے ، ان کو کبوتروں سے بہت زیادہ محبت تھی ، اپنے دوستوں کے ساتھ کبوتر اڑایا کرتے اور کہتے کہ کبوتروں کو نیلگوں فضا کی لامحدود وسعتوں میں اڑتا ہوا دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

جیسے میں خود بھی ان کے ساتھ آسمان کی رفعتوں میں شریک پرواز ہوں، وہ بچپن میں منظوم قصے اپنی شیریں آواز میں عورتوں کو سنایا کرتے تھے، لندن میں غیر اسلامی طریقہ سے ذبح شدہ جانوروں کا گوشت استعمال کرنے سے پرہیز کرتے رہے، لندن میں نماز کا شغف زیادہ بڑھ گیا اور برابر کہتے کہ یورپ نے مجھے مسلمان کر دیا، یورپ سے تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے تو وہی ہمیشہ کا تہبند بندھ گیا، وہی بنیان بدن پر رہ گیا، اور وہی کمبل شانوں پر سوار ہو گیا، ایک بار انھوں نے گورنمنٹ کالج میں آئن شٹائن کے نظریے پر ایک لکچر دیا تو مختلف مفکرین کے نظریات کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سائنس اور تصوف کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا ہے، صوفیاء کی واردات اور سائنس ایک وقت ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔ مولانا محمد علی کہا کرتے کہ اقبال نے ہمیں مسلمان بنایا ہے، ایک بار وہ علامہ اقبال سے ملنے لاہور آئے، ملاقات کے بعد دونوں کو کہیں باہر جانا تھا، علامہ نے بوٹ منگوائے، تو مولانا محمد علی نے جھک کر ان کے تسمے باندھنے کی کوشش کی، علامہ نے پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے ہنس کر کہا کہ تم اس قابل نہیں کہ میرے بوٹ کے تسمے باندھ سکو، وہ گول میز کانفرنس کے نمائندہ بن کر لندن جا رہے تھے تو دہلی اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال ہوا، اس وقت مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سکریٹری اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ ہے جس پر اپنے دلائل کی اساس قائم کروں، میرے ساتھ صرف حق و صداقت کی ایک جامع کتاب قرآن مجید ہے، جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا، وہ یورپ کے سفر میں سولینی سے بھی ملے، اس نے ان سے پوچھا کہ میری فاشسٹ تحریک کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے، لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے

ممنوع ہو سکتا ہے، لیکن یہ ایک ایسی بات تھی جو مسولینی کو خود اکم ہی سمجھ میں آسکتی تھی۔ مسولینی سے ملنے کے بعد اخبار نویسوں نے ان سے مسولینی کے بارے میں رائے پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ آپ کا ڈوچے بغیر بائبل کا لوتھر ہے۔" ایک دفعہ کسی نے علامہ محمد اقبال کو لکھا کہ آپ نے مسولینی کے متعلق دو نظمیں لکھی ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اگر اس بندۂ خدا میں رحمانی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہوں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔

اسلامی جمہوریہ کے اقبال نمبر میں اس قسم کے بہت سے دلچسپ واقعات ہیں، جن کو پڑھ کر ناظرین کو غیر شعوری طور پر احساس ہوگا کہ اقبال کی شاعری کی طرح ان کی شخصیت میں بھی بڑی رعنائی اور دل آویزی تھی، اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن، حدیث، اسلام کے حکما، علما اور صوفیا، سے متاثر ہو کر اپنے خیالات پیش کرتے رہے تو اس کے یہ ہرگز معنی نہیں کہ وہ اسلام کے محض مبلغ بنے رہے، بلکہ ان کو فکر رہی کہ موجودہ مادیت میں انسانیت کی فلاح و بہبود اور انسان کامل کی نشوونما کیسے ہو، ان کا عقیدہ تھا کہ انسان جمادی، نباتی اور حیوانی مدارج سے گذر کر انسانیت کے موجودہ مرتبے پر فائز ہوا ہے، مگر یہ اس کی آخری منزل نہیں، ابھی اسے آگے بڑھنا اور ملکوتی درجہ پر پہونچنا ہے، ان کے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ انسان اس ملکوتی درجہ پر اللہ تعالیٰ کے آخری پیام اسلام ہی کے ذریعہ سے پہونچ سکتا ہے، ان کے نزدیک اسلام میں احترام آدمی، مقام آدمی، عروج آدم اور یزداں صفات آدم کا جو تصور ہے وہ دنیا کے تمام نظریات کے مقابلہ میں بہتر اور بلند ہے، اسی لئے ان کے پہلو دار پیام کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے، زیر نظر اقبال نمبر میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کو مہاراجہ میسور کی دعوت پر علامہ اقبال میسور گئے، جہاں میسور یونیورسٹی میں اس کے وائس چانسلر کی

زیر صدارت ایک لکچر دیا، اس موقع پر یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے ایک غیرمسلم پروفیسر نے اپنی تقریر میں کہا، "ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں، مگر وہ ہم سب کے ہیں، وہ کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں،" اقبال کو اس حیثیت سے بھی دیکھ کر ان کے بلند مقام کو متعین کرنا ہے۔

ماہنامہ محفل کا اقبال نمبر: اس کے مدیر الطاف جاوید ہوشیارپوری ہیں، ایک روز انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کی گیلری سے گذر رہا تھا تو ایک صاحب نے یہ نمبر پیش کیا، جس کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ پنجاب کا ہر رسالہ اپنے شاعر مشرق کو خراج عقیدت پیش کرنے میں آگے آگے تھا اقبال کی محبوبیت اور مقبولیت اس موقع پر کچھ ایسی ہی بڑھی ہوئی تھی، اس نمبر میں حسب ذیل مضامین ہیں: اقبال کا نظریۂ فن، قرآن اور اقبال، اقبال کے نظام فکر میں سائنس کا مقام، اقبال کے تعلیمی افکار، اقبال کا تصور خودی، اقبال اور فنون لطیفہ، اقبال بحیثیت آفاقی مفکر، اقبال اور ملت، اقبال کی چار نظمیں، اقبال کے تین شعر، کلام اقبال میں شہباز، شاہین اور عقاب کی لطیف رمزیت، علامہ اقبال مذہب سیاست اور معیشت، اقبال کی نظر میں عورت کی اہمیت، اقبال اپنے تصر احساس میں، اقبال اور نوجوان وغیرہ۔ پھر اقبال پر بہت سی نظمیں بھی ہیں، مذکورہ بالا عنوانات پھینے نہیں، ان پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن پھر بھی بہت کچھ لکھنے کو باقی رہ گیا ہے، ان ہی عنوانات پر آیندہ اور بھی اہل قلم لکھ کر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور جتنا زیادہ لکھا جائے گا اتنا ہی اقبال کندن کی طرح چمکتے نظر آئیں گے۔

ہنر و مردم کا اقبال نمبر: یہ فارسی مجلہ ایران کی وزارت فرہنگ و ہنر کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس کو ہاتھ میں لیتے وقت خیال ہوا کہ اس میں ایرانی دانشوروں کے مضامین ہوں گے مگر ان کے بجائے زیادہ تر پاکستانیوں ہی نے اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا ہے، اس سے گمان ہوا کہ شاید ایرانی اب تک اقبال کے مرتبہ کو صحیح معنوں میں پہچان نہیں سکے ہیں، اقبال ایران کی

عقیدت مندانہ نظمیں رنگی یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہو سکتی ہیں، ڈاکٹر حسین خطیبی کا ایک مضمون سبک شعر اقبال پر ہے، اس موضوع پر ان کے خیالات کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا ایک انٹرویو اقبال پر ہے، اقبال جناب ذبیح اللہ صفا کے صرف ایک انٹرویو کے مستحق نہ تھے جناب ذبیح اللہ صفا کا ان پر ایک مضمون ہونا چاہئے تھا، تب ہی ایران کی اقبال شناسی کا تخیل ہوتا، اقبال پر وہاں کے مشہور شاعر بہار کے دو تین اشعار بھی ایران کی اقبال شناسی کا ثبوت نہیں

اقبال پر بھی ڈاکٹر معزالدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی لاہور کی عنایت سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی "اقبال اور مسلک تصوف" اور جناب ابوسعید نورالدین صاحب کی "اسلامی تصوف اور اقبال" ملیں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی کتاب پڑھ کر متاثر ہوا، ان کو ادیب، نقاد، ماہر لسانیات کی حیثیت سے تو جانتا تھا، مگر اس کتاب کو پڑھ کر ان کے صاحب دل ہونے کا بھی اثر ہوا، ان دونوں کے علاوہ اقبال کے جشن کے موقع پر 'پس چہ باید کرد' کا انگریزی ترجمہ از جناب بشیر احمد ڈار، 'علامہ اقبال کی فارسی' اور 'ایقان اقبال' از پروفیسر محمد منور، 'کتابیات اقبال' از جناب رفیع الدین ہاشمی، 'ذکر اقبال' پیش کش جناب اصغر یعقوب، 'پاکستان کی نظریاتی بنیادیں' از ڈاکٹر وحید قریشی، 'تاریخ جمہوریت' اور 'انڈونیشیا' از شاہد حسین رزاقی، 'حدیقۃ الاولیا' از مفتی غلام سرور لاہوری، 'انتخاب گنج شریف' از حضرت سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری، 'مسلمانان پنجاب کی تعلیم' از سید مصطفیٰ علی بریلوی، 'باقیات عتیق' مرتبہ سید محمد حسین رضوی، 'تاریخ تعلیم' از جناب وارث سرہندی، 'موج کوثر' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، 'احوال و آثار سید شرافت نوشاہی'، 'احوال و آثار عبداللہ' محمد اقبال مجددی، 'کلیات محمد حسن براہوئی' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، 'وصیت نامہ بابا طاہر با ترجمہ منظوم بہ اردو' ترجمہ و ترتیب حضور احمد سلیم، 'یار غار' از جناب حسن الدین سہروردی، 'حصول پاکستان' از پروفیسر احمد سعید وغیرہ ملیں۔ ان شاء اللہ ان کتابوں کا ذکر معارف کی آئندہ اشاعتوں میں آئے گا۔ (باقی)

چہار مقالہ کی تاریخی اہمیت

از

ڈاکٹر زہرہ مرتضی صاحبہ رام پور

فارسی کی قدیم نثری کتابوں میں چہار مقالہ ادبی اور تاریخی دونوں ہی حیثیتوں سے اہم ترین کتاب ہے، یہ کتاب نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف ہے جو شاہان غور کے دربار سے منسلک تھا وہ بڑی جامع حیثیتوں کا مالک تھا اور بیک وقت شاعر، نثر نگار، ماہر علم نجوم، طبیب اور مصاحب تھا اس کی ان صلاحیتوں کا ثبوت اس کی تصنیف چہار مقالہ ہے، یہ کتاب اس نے چار موضوعات پر لکھی ہے اور ہر موضوع سے متعلق ایک مقالہ ترتیب دیا ہے، چونکہ وہ خود ان تمام علوم و فنون میں اچھی دستگاہ رکھتا تھا اس لئے اس کی تحریر مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

اس کتاب کا نام مجمع النوادر ہے، لیکن یہ چار مقالوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے چہار مقالہ کے نام سے مشہور ہوئی، امین احمد رازی نے "تذکرہ ہفت اقلیم" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مجمع النوادر اور چہار مقالہ دونوں علیحدہ اور مختلف کتابیں ہیں، اور ایک کا مصنف نظامی عروضی اور دوسری کا حاجی خلیفہ ہے، لیکن یقیناً صاحب ہفت اقلیم کو غلط فہمی ہوئی ہے، حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں نظامی عروضی کی تصنیف کا نام مجمع النوادر تحریر کیا ہے اور چہار مقالہ کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ چہار مقالہ اس کے پاس موجود تھی، اور اس نے رودکی اور امیر نصر سامانی کی جو حکایتیں لکھی ہیں وہ اس سے ماخوذ ہیں، اگر یہ دونوں کتابیں ایک نہ ہوتیں تو یکساں حکایتیں یکساں الفاظ میں کیسے مل سکتی تھیں۔

ثانیاً یہ کہ قاضی احمد غفاری نے نگارستان کے مقدمہ میں تقریباً تیس حکایتیں تاریخ و ادب اور مختلف شعراء کے ذکر میں مجمع النوادر سے اخذ کی ہیں۔ عبدالوہاب قزوینی کے الفاظ میں:

"ایں حکایات بعینہا اکثر بلکہ کلہم مسطور در چہار مقالہ است"

صاحب مجمع الفصحاء رضا علی خاں نے بھی اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مجمع النوادر نظامی عروضی مشہور بہ سمرقندی موسوم بہ چہار مقالہ"

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چہار مقالہ اور مجمع النوادر ایک ہی کتاب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب بادشاہوں اور ان کے درباری ماحول سے متعلق ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جس سے علوم و فنون کے شیدائی استفادہ کرتے چلے آئے ہیں اور استفادہ کرتے رہیں گے۔

نظامی عروضی کا مقصد بادشاہوں کو اور ان سے متعلق شعراء و ادباء، نجومیوں اور طبیبوں کو یہ بتانا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کیسے پیش آئیں، ممکن ہے آج اس کی اہمیت ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن دربارداری کے عہد میں اس کی بڑی اہمیت تھی، بادشاہوں کی نازک مزاجیاں اہل علم و فن کے لئے اکثر جان لیوا ثابت ہوتی تھیں، اور چونکہ اہل فن کے لئے گذر اوقات کے راستے بھی محدود تھے، اس لئے ان کے لئے بادشاہوں سے مفر بھی نہ تھا، خود بادشاہوں کے لئے بھی اہل فن ناگزیر تھے، بادشاہوں کے اکثر اوقات جنگ و جدال میں گذرتے تھے، اس لئے ان کے ذہن کے لئے یہ لوگ تسکین اور سامان مسرت بہم پہنچاتے تھے، نظامی کا مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے لئے باعث زحمت نہ بنیں، بلکہ باعث رحمت ہوں۔

وہ ایک اچھا ادیب تھا، چہار مقالہ اس امر کی واضح شہادت ہے، یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں معاصرانہ واقعات و حوادث کے بارے میں خاصی تفصیلات ہیں، بہت سے

واقعات خود اس کے چشم دید ہیں اور بہت سے واقعات کے سنانے والے اس کے زمانہ تک زندہ تھے یا جو اس کے زمانہ کے لوگوں کے ذہن سے فراموش نہیں ہوئے تھے، اس طرح اس کتاب کی اہمیت ایک تاریخی دستاویز کی ہوگئی ہے، یہ چاروں مقالے اہم تاریخی واقعات پر مشتمل ہیں، مثلاً عمر خیام کے بارے میں نظامی عروضی نے بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں، خیام کی شہرت اور یورپ وغیرہ میں اسے روشناس کرانے میں نظامی کا بڑا ہاتھ رہا ہے، اس لئے کہ یہی وہ پہلی تصنیف ہے جس میں اس کے بارے میں مفصل معلومات درج ہیں، اسے خیام سے شرف ملاقات بھی حاصل ہوا تھا، اس لئے اس کے بیانات یقیناً مستند ہیں، اسی حکایت میں نظامی عروضی نے خیام کی پیش گوئی کا تذکرہ بھی کیا ہے: "گور من در موضعی باشد کہ ہر بہاری باد شمالی بر من گل افشانی می کند"۔

محمود غزنوی اور فردوسی کے تعلقات کے سلسلہ میں چہار مقالہ کی حکایت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس ضمن میں اس نے بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں، گو بعض مورخین کو اس سے اختلاف ہے مگر اس کی اہمیت سے صرف نظر ممکن نہیں ہے۔

اس میں بہت سے ایسے واقعات کی تفصیل ہے جن کا شاہد مصنف چہار مقالہ کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا، بہت سے واقعات اور ایسے شعراء و ادباء کے نام اس میں محفوظ ہیں جو زمانے کے انقلاب میں فنا ہو چکے ہیں، بہت سی ایسی کتابوں کے ناموں کا اس سے پتہ چلتا ہے جن کا منظر ہستی پر اب کہیں وجود نہیں ہے، اس میں ایسے تاریخی واقعات بھی مذکور ہیں جن کا تذکرہ کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔

مقالۂ دوم جو شعر و شاعری پر مشتمل ہے بہت سے سامانی، غزنوی، سلجوقی اور غوری خاندان کے شاعروں کے سلسلہ میں معلومات کا خزینہ ہے، خصوصیت سے رودکی، فرخی، عنصری، ازرقی اور سعد سلمان کے بارے میں بڑی تفصیلات ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ چہار مقالہ میں سلاطین، امراء، وزراء اور معاصرین کے تذکرے ان کی داد و دہش اور مجلس عیش و نشاط کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔

اہل نجوم اور دبیروں کے سلسلہ میں بہت سے اہم اور مفید مسائل پر بحث کی گئی ہے، جو ان علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ہیں۔

حکیم ابو علی سینا، ابو ریحان البیرونی اور زکریا رازی کے متعلق نظامی نے جو حکایات تحریر کی ہیں وہ لائق توجہ ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض جگہ ہم عصر واقعات کے لکھنے میں اس سے غلطیاں ہوئی ہیں اور مشہور و معروف ناموں کے لکھنے میں سہو ہوا ہے، کہیں کہیں سن و سال کی تقدیم و تاخیر بھی کی ہے، اس طرح کی بہت سی لغزشیں مصنف نے کی ہیں جن میں کچھ حسب ذیل ہیں:

(۱) اس نے اسکافی کو نوح بن منصور بن نوح بن نصر بن احمد سامانی کا دبیر فرض کیا ہے حالانکہ وہ اس کے دادا نوح بن نصر کا دبیر تھا اور تقریباً اس کی پیدائش سے بیس سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔

(۲) سامانیوں کے سردار ابو علی احمد بن محتاج چغانی کو نوح بن منصور سامانی کا ہم عصر قرار دیا ہے، جب کہ وہ تقریباً ۲۲ سال قبل وفات پا چکا تھا۔

(۳) حکایت اول میں نظامی عروضی نے بیان کیا ہے کہ نوح بن منصور سامانی کے حکم پر سبکتگین نے بلوقیوں کے ساتھ الپتگین پر حملہ کیا، یہ واقعہ تاریخی حقیقت کے بالکل خلاف ہے، سبکتگین نے خود بلوقیوں پر حملہ کیا تھا نہ کہ الپتگین پر، الپتگین اس واقعہ سے پیشتر فوت ہو چکا تھا۔

(۴) اسی حکایت میں ابو علی بن محتاج کو بخارا کے لشکر میں سبکتگین کا معاصر بتایا ہے جب کہ

وہ اس واقعہ سے ۴۹ سال قبل وفات پا چکا تھا۔

(۵) حسن بن سہل اور اس کے بھائی فضل بن سہل میں اشتباہ ہو گیا ہے، اسی وجہ سے اسے ذو الریاستین لکھا ہے، حالانکہ یہ لقب اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی فضل بن سہل کا تھا، اسی طرح مامون کی بیوی کو فضل بن سہل کی بیٹی سمجھا ہے، حالانکہ وہ حسن بن سہل کی بیٹی تھی۔

(۶) مقالۂ اول کی ساتویں حکایت میں سلطان مسعود سلجوقی کو سلطان سنجر لکھا ہے اور استرشد باللہ کی جنگ کو سلطان سنجر کے ساتھ بیان کیا ہے، حالانکہ مورخین باتفاق رائے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جنگ سلطان مسعود کے ساتھ ہوئی تھی، سلطان سنجر کے ساتھ نہیں۔

(۷) اسی مقالہ کی دسویں حکایت میں بغراخاں کو سلطان محمود غزنوی کا معاصر بتایا ہے جبکہ وہ ایلک خاں کا معاصر تھا۔

(۸) ایک اور بڑی تاریخی غلطی جسے اس حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مصنف اس کا عینی شاہد ہے، امیر شہاب الدین قلمش الپ غازی کے سلسلہ کی ہے، امیر شہاب الدین اصل میں ایک نامعلوم شخصیت ہے، مگر مصنف نے چونکہ خود اس واقعہ میں موجود ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اس لئے اس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی، سوائے اس کے کہ اس مقام پر عبارت میں تحریف ہوئی ہے۔

(۹) مقالۂ سوم کی حکایت اول میں عرب کے مشہور و معروف فلسفی یعقوب بن اسحٰق الکندی (متوفی ۲۵۹ھ) کو یہودی قرار دیا ہے، حالانکہ وہ پشتینی مسلمان تھے اور ان کے دادا اشعث بن قیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، اور اس سے متعلق ایک غلط حکایت بیان کی ہے۔

(۱۰) اسی مقالہ کی چھٹی حکایت میں نظام الملک طوسی کے قتل کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ فرقۂ باطنیہ کے ہاتھوں بغداد میں ہوا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رمضان ۴۸۵ھ میں خواجہ نظام الملک طوسی ملک شاہ سلجوقی کے ہمراہ اصفہان سے بغداد جا رہے تھے، راستے میں نہاوند کے مقام پر قیام کیا

اسی جگہ فرقۂ باطنیہ کے فدائیوں میں سے کسی نے اسے شہید کر دیا۔

(۱۱) چوتھے مقالہ کی چوتھی حکایت میں طبیب اجل ابوبکر محمد زکریا رازی کو منصور بن نوح سامانی کا ہم عصر قرار دیا ہے، حالانکہ منصور بن نوح بن نصر سامانی کا زمانۂ حکومت ۳۴۹ھ سے ۳۶۵ھ تک ہے اور زکریا رازی کی وفات ۳۲۲ھ میں واقع ہوئی ہے، غالباً غلطی سے منصور بن اسحٰق کے بجائے منصور بن نوح سامانی کا نام لکھ دیا ہے۔

(۱۲) شیخ ابوعلی سینا کو علاء الدولہ کاکویہ کا وزیر بتایا ہے، حالانکہ وہ شمس الدولہ بن فخرالدولہ دیلمی کے وزیر تھے، علاوہ بریں شیخ کی وزارت ہمدان کے بجائے رے میں فرض کی ہے۔

یہ اور اس قسم کی کچھ اور غلطیاں نظامی نے ان مقالوں میں کی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔

تاریخی اہمیت کے علاوہ قدر و منزلت میں اس کی ادبیت کو بڑا دخل ہے، اس میں نظامی نے اپنی ادبیانہ صلاحیتوں کا کامیاب ترین نمونہ پیش کیا ہے، اس کی عبارت بہت صاف اور دل کش ہے، وہ مختصر الفاظ میں کثیر معانی کو سمونے کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتا تھا، عبدالوہاب قزوینی نے اس کی ان صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"از حیث سبک انشا آں کہ در ایجاز لفظ و اشباع معنی و سلاست کلام و اجتناع ثقیلہ و صنائع لفظیہ بدوہ کہ شیوۂ ناخوش غالب نویسندگان ایران بخصوص متاخرین ایشاں بودہ سرمشق انشار و نمونہ چیز نویسی ہر ایرانی جدید باید باشد۔"

اس لحاظ سے وہ فارسی نثر نگاروں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ہے، اس کی عبارت میں بے ساختگی و روانی اس کی طرز ادا میں دل فریبی و دل کشی اس کی بندشوں میں چستی اور اس کے فقروں میں ایسی پیوستگی ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی، انھیں چیزوں نے چہار مقالہ کو یک لازوال

حسن بخشا ہے، پروفیسر براؤن نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

One of the most interesting and remarkable prose work in Persian and one which throws a far fuller light than any other book on the intimate life of Persian and Central Asian Courts in the Twentieth Century of our era.

فارسی ادب کے نقادوں نے اسے موجودہ دور تک کی کتابوں میں بہترین قرار دیا ہے، ملک الشعراء بہار، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ڈاکٹر معین اور پروفیسر براؤن سبھی نے اس کی تعریف کی ہے، اس کتاب کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے اور اس کا ایک بہت عمدہ اڈیشن ایران کے مشہور اور بلند پایہ محقق عبد الوہاب قزوینی نے شائع کیا ہے، جس میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنے انداز نگارش کے لحاظ سے تاریخ بیہقی، تاریخ گزیدہ، تذکرۃ الاولیاء، اور گلستان سعدی کے ہم پلہ ہے، ظاہر ہے ایسی کتاب کا مصنف تاریخ ادبیات ایران میں کتنا اونچا مقام رکھتا ہوگا۔

غالب
مدح و قدح کی روشنی میں

غالب کی زندگی ہی میں ان کی مدح و قدح شروع ہو گئی تھی اور نظم و نثر کی صحت میں ان پر اظہار خیال ہونے لگا تھا، جس سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ان کی حمایت و مخالفت میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے، اس کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، اس کا دوسرا حصہ زیر طبع ہے —— مؤلفہ سید صباح الدین عبد الرحمن قیمت ۵، حصہ اول

وفیات

یاد خلیل

از

ضیاء الدین اصلاحی

مرزا غالب مرحوم نے عارف کی موت پر کہا تھا ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی مرحوم کی خبر وفات سن کر بے ساختہ یہ شعر زبان پہ آگیا، ابھی شاید وہ پچاس کے ہوں، بھلا یہ مرنے کے دن تھے، لیکن تقدیر کے راز کون سمجھ سکتا ہے ان اجل اللہ اذا جاء لا یؤخر۔

وہ بہت ہونہار، لائق اور ذی استعداد تھے، اپنی صلاحیت سے انھوں نے اس کم سنی ہی میں اردو کے مشہور نقادوں، ممتاز ادیبوں اور اہم شاعروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی تھی، ان کا نام ادبی حلقوں میں عزت سے لیا جاتا تھا اور ان کے خیالات کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

وہ اعظم گڈھ کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے تھے، سرائے میر کے قریب ایک گاؤں سیدھا سلطان پور کے رہنے والے تھے، ان کے والد محترم مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم بڑے نیک نفس اور مقدس بزرگ تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا قیام انھیں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے، جس کے نظم و نسق کی ذمہ داری ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے بعد میں علامہ شبلی مرحوم کے ایماء سے قبول کرکے اس کو بڑی شہرت و ترقی دی تھی، مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحبزادوں میں خلیل صاحب سب سے چھوٹے مگر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب میں

ممتاز تھے، انھوں نے شبلی نیشنل اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا،
تعلیم مکمل کر چکے تو وہیں شعبۂ اردو میں لکچرر ہو گئے، بعد میں ترقی کرکے ریڈر ہوئے، وہ اپنے استادوں
ماں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی عقیدت کا دم بھرتے تھے، وہ ان کے ادب دانشا کے ٹیسٹ ملت
اوران سے تلمذ اپنے لئے مایۂ فخر خیال کرتے تھے، رشید صاحب کی طرح ان کو بھی اردو اور علی گڈھ سے
عشق تھا، سر سید نگر میں ایک خوبصورت اور کشادہ مکان تعمیر کرایا تو اس کا نام "اردو باغ" رکھا،
علی گڈھ سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ وہاں سے بہت کم باہر نکلتے، اپنے وطن بھی کئی کئی برس کے
بعد آتے اور چار چھ روز سے زیادہ قیام نہ کرتے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا تعلق ایک علمی و دینی گھرانے سے تھا، ان کے والد بزرگوار متورع عالم
تھے، اپنا چار بڑے بھائی بھی دینی تعلیم حاصل کرکے علم و دین کی خدمت میں مشغول رہے، افسوس ہے
کہ اب مولانا حبیب الرحمٰن ؒ برادر اصلاحی کے سوا سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، خلیل صاحب کی
نشو و نما اسی علمی و دینی ماحول میں ہوئی تھی، وہ علی گڑھ گئے تو ان کے خیالات میں ترقی پسندی
آئی اور دین کی طرف میلان میں کمی ہو گئی، مگر الحمد للہ چند برس قبل ان میں پھر تبدیلی آ ئی،
وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے تھے اور دین و مذہب سے تعلق بڑھ گیا تھا، انھوں نے
ایک مرد مومن کی طرح خندہ پیشانی کے ساتھ موت کا خیر مقدم کیا، اپنی آخری کتاب "مضامین نو"
کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"گذشتہ ایک سال سے موت و حیات کی جس کشمکش سے گذر رہا ہوں، اس نے زندگی کی بے ثباتی
اور ناپائداری کے نقش کو اور گہرا کر دیا ہے، یوں تو میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں،
مگر اس کے بلاوے اور پکار پر لبیک کہنے کو اپنے لئے باعث برکت سمجھتا ہوں، اس "جہانِ
گندم و جو" میں ہمیشہ کے لئے رہنے، یہاں بستی بسانے اور چھا ئی چھانے کی تمنا پہلے تھی"

اور نہ اب ہے۔"

کتب بینی اور مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا، رات رات بھر جاگ کر کتابیں پڑھتے تھے، اسی میں ان کی صحت خراب ہو گئی، جب شبلی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے تو پابندی سے دارالمصنفین کے کتب خانہ میں آ کر اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھا کرتے تھے، اسی تعلق کی بنا پر اعظم گڈھ آتے تو دارالمصنفین بھی ضرور آتے اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب سے دیر تک علمی گفتگو، دارالمصنفین اور اردو وغیرہ کے مسائل پر باتیں کرتے، یہاں کے پرانے کارکن مولوی عبد الباری صاحب سے زیادہ مانوس تھے، ان کے پاس اسی طرح بیٹھتے جس طرح طالب علمی کے زمانہ میں بیٹھا کرتے، اپنی آخری کتاب "مضامین نو" انھیں کے نام معنون بھی کی ہے۔

ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، جو کچھ پڑھتے سب ذہن نشین ہو جاتا، اردو ادبیات پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، اردو کی ترقی پسند تحریک کا بڑی گہرائی اور دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔

گفتگو دلچسپ اور معلومات افزا کرتے، یوں تو شعر و ادب کے سبھی شعبوں سے دلچسپی تھی مگر تنقید ان کا خاص موضوع تھا، وہ ادبی و تنقیدی مسائل میں اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے جس کو بہت مربوط اور مدلل انداز میں پیش کرتے تھے، چاہے کسی کو ان کے خیالات سے اتفاق نہ ہو مگر وہ ان کی قوتِ استدلال، جوشِ بیان، دلنشیں انداز، منطقیانہ ترتیب اور خود اعتمادی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، ان کی گفتگو اور تحریر میں جانبداری اور مصلحت کو دخل نہ ہوتا، وہ خود ترقی پسند ادیب تھے، مگر اس ادب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر ان کی نظر تھی، اس کے انتہا پسندوں کی طرح "عوامی ادب" کی دھن میں وہ

اردو زبان کی پرانی روایات کو نظر انداز نہ کرتے، بعض نامور ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں پر بھی بے لاگ تنقید کرتے، اظہار رائے میں نہ کوئی بے جا رعایت کرتے اور نہ کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پرواہ کرتے، مولانا شبلی مرحوم کی عظمت کے معترف تھے مگر ان کے بعض ادبی و تنقیدی خیالات کے ناقد تھے اور مولانا کے عقیدت مندوں کے سامنے بھی ان کے متعلق بے جھجک اظہار خیال کرتے۔ اپنے ایک مضمون میں مولانا کے تنقیدی مسلک کی وضاحت کرکے اس پر کچھ رد و کد کی ہے، مگر آخر میں یہ اعتراف بھی کیا ہے:

> "شعرالعجم اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ اس نے اپنے دامن میں فارسی شاعری کے بہترین جواہر پاروں کو سمیٹ لیا ہے، شبلی نے ان کی تشریح و ترجمانی ایسے موثر انداز میں کی ہے کہ عجم کا حسن طبیعت ہم پر ایک لازوال نقش چھوڑ جاتا ہے، شبلی کی تنقیدی نگارشات نے کئی نسلوں کے مذاق سخن کی تربیت کی ہے، وہ موجودہ دور میں بھی کافی دور تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔"

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مولانا شبلی نے میرانیس کی حمایت کے جوش میں ان کے کھاتے میں مرزا دبیر کے اچھے اشعار بھی ڈال دیے ہیں، جیسے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

میں نے کہا آپ خود جوش بیان میں خلاف واقعہ بات کہہ رہے ہیں، مولانا شبلی نے بھی اس شعر کو مرزا صاحب ہی کا بتایا ہے، کہنے لگے نہیں! جب میں نے ان کو موازنۂ انیس و دبیر دکھایا، تب جا کر چپ ہوئے، مگر ان کے قلم میں بے راہ روی اور تحریر میں اعتدال تھا، اس لئے اختلاف کے باوجود شائستگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاتا۔

خلیل الرحمن اعظمی کی زندگی سادہ تھی، وہ تکلف، بناوٹ، نمائش اور ظاہر داری کو پسند نہ کرتے تھے۔ جو ان کے دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی، وہ اپنی کسی ادا سے رعونت یا اپنی عظمت کا

احساس نہ ہونے دیتے۔ اعظم گڈھ آتے تو اپنے ایک ایک ساتھی اور دوست کو تلاش کرکے اس سے نہایت بے تکلفی سے ملتے، اپنے بزرگوں اور استادوں سے عقیدت و احترام کا برتاؤ کرتے اور تواضع و انکسار سے پیش آتے، ان کی جو حیثیت تھی اس کی بنا پر جہاں جاتے اونچے سے اونچے درجہ کے لوگ ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہتے، مگر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے، اعظم گڈھ آتے تو میر علی حماد عباسی صدر شعبۂ انگریزی شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے یہاں ہمیشہ قیام کرتے، جو ان کے کلاس فیلو، بے تکلف رفیق اور گہرے دوست تھے، اس سال فروری میں دارالمصنفین گیا، تو معلوم ہوا کہ وہ بھی آئے ہیں، ان سے ملنے کے خیال سے ان کے بڑے بھائی جناب پرواز اصلاحی کے پاس گیا اور ان کی قیام گاہ کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اپنے اسکول کے ساتھی حاجی نیاز اعظمی کے یہاں مقیم تھے مگر اب چلے گئے ہیں۔

خلیل اعظمی نے کم عمر پائی، لیکن جو عمر پائی وہ اردو کی خدمت میں گذار دی، درس و تدریس ان کا اصلی مشغلہ تھا اور وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اچھے اور کامیاب استاد تھے، تصنیف و تالیف سے مدت العمر سروکار رکھا، ان کے قلم نے نظم و نثر دونوں میں گلکاری کی ہے، کلام کے دو مجموعے "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہدنامہ" چھپے ہیں، ان سے شاعری میں ان کی جدت طبع اور منفرد انداز کا پتہ چلتا ہے، لیکن ادیب و نقاد کی حیثیت سے ان کی زیادہ شہرت ہوئی "مقدمۂ کلام آتش" ان کی طالب علمی کے زمانہ کی تحریر ہے، مگر اسی کی بدولت وہ اردو کے مشہور ادیبوں اور نقادوں میں شمار کئے جانے لگے، "نوائے ظفر" بھی اسی طرح کی کتاب ہے "فکر و فن" "زاویۂ نگاہ" اور "مضامین نو" ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں، جدید نظموں کا ایک انتخاب "نئی نظم کا سفر" کے عنوان سے کیا تھا، ان کی زیادہ اہم کتاب "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" ہے جو ترقی پسند ادب کی تاریخ پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے، یہ دراصل ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، اس کے تین حصوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تاریخ

ان کے خدمات ادب کا جائزہ اور ان کے خیالات پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ کتاب محنت و جستجو اور سلیقہ سے لکھی ہے۔ اس کی ترتیب و پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہے۔ اعتدال و غیر جانبداری کی وجہ سے اس کو سنجیدہ ارباب ذوق نے پسند کیا ہے۔ مقالہ کے نگراں اور ممتحن جناب مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی اپنی رپورٹ میں اس کی بہت تحسین کی تھی۔ جب یہ شائع ہوکر دارالمصنفین آئی تو سب سے پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور کئی نشستوں میں اس کی تعریف کرتے رہے اور مجھ سے فرمایا کہ میں خود اس پر ریویو کروں گا، ان کے تبصرے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مصنف نے بڑی محنت اور تلاش، و تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لئے ترقی پسند ادب کا پورا دفتر کھنگالا ہے اور بڑے اعتدال و توازن اور حسن مذاق سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے اس کی پوری سرگذشت اور اس کا ہر رخ سامنے آجاتا ہے مصنف ایک مشاق اہل قلم اور دیدہ ور نقاد ہیں، یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی نمایاں ہے اس سے اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا۔"

خلیل الرحمن اعظمی کے ابھی متعدد مضامین کتابی صورت میں چھپنے سے رہ گئے ہوں گے، انجمن ترقی اردو کو ان کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہئے، چند برس پہلے انھوں نے انجمن کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" میں "میر اصغر" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا جسے اس وقت بہت پسند کیا گیا تھا، اس کا مجموعہ بھی شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

ان کی اٹھان بہت شاندار تھی، آئندہ ان کی بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر یہ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود، بلڈ کینسر کے موذی مرض نے ایک سال سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا، بالآخر یکم جون ۱۹۷۸ء کو پیام اجل آگیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین

ادبیات

غزل

از

جناب ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب ریڈر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی

جب غم میں مسرت کا ہلکا سا خیال آیا　　محسوس ہوا ایسا وہ زہرہ جمال آیا
قطروں میں عرق کے وہ ڈوبی ہوئی پیشانی　　تابندہ ستاروں میں، اک سیمیں ہلال آیا
سائل جو پشیماں ہے، اس میں ہے خطا اُس کی　　کیوں دست طلب اُٹھا، کیوں لب پہ سوال آیا
تابندہ جبیں پر تم ڈالو نہ شکن کوئی　　آئینۂ جاں چٹکا، آئینے میں بال آیا
کیا میری وفاؤں میں کچھ تم نے کمی پائی　　کیوں آنکھوں میں اشک آئے، کیوں دل میں ملال آیا
ہے فصل بہاراں کی آمد کا یہی مطلب　　طائر چلے گلشن کو، صیاد کا جال آیا
فطرت کو بھی اس حد تک تسخیر کیا میں نے　　ہونٹوں پہ ہنسی آئی جب دل میں ملال آیا
ممکن ہے کہ گلشن کا ماحول بدل دیتا　　لیکن گل رنگیں پہ ناوقت زوال آیا

نایاب سلام اتنی، کیوں جنس محبت ہے
کیا شہر محبت میں، پھر قحط کا سال آیا

غزل

از

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

اڑاتا پھر رہا ہے خاک اک دیوانہ برسوں سے
مرتب ہو رہا ہے عشق کا افسانہ برسوں سے

خدا معلوم کس کے منتظر ہیں میکدے والے
بڑھائی جا رہی ہے رونقِ میخانہ برسوں سے

یہاں بھولے سے بھی لب پر نہ حرفِ آرزو آیا
محبت ہے مگر افسانہ در افسانہ برسوں سے

نہ میں وحشی نہ سرگشتہ نہ میں بے خود نہ وارفتہ
نہ جانے کیوں مجھے کہتے ہیں دیوانہ برسوں سے

خوشا نسبت کہ سوزِ عشق سے آتش بجاں ہوں میں
سبق لیتی ہے مجھ سے فطرتِ پروانہ برسوں سے

خدا معلوم کس کی جستجو کس کی تمنا ہے
بھٹکتا پھر رہا ہے جوہرِ دیوانہ برسوں سے

غزل

از جناب طفیل احمد مدنی

جب خود کو ترے غم میں مٹایا تو بنے ہیں
ہم نے تجھے جی جان سے چاہا تو بنے ہیں

دل اہلِ محبت کے ہیں وہ ساغرِ نایاب
قدرت نے جنھیں خود ہی بنایا تو بنے ہیں

اے ذوقِ سفر بڑھنے میں اب کیں ہے تامل
ہر راہ میں کچھ نقشِ کفِ پا تو بنے ہیں

یا رو یہ خرد والے ہی کچھ کر کے دکھائیں
دنیا کو دکھانے کو مسیحا تو بنے ہیں

اے کاش طفیل ابرِ کرم ٹوٹ کے برسے
ہم تشنگی و کرب کے صحرا تو بنے ہیں

مطبوعات جدیدہ

اعیان الحجاج حصہ دوم: مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۱۴، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مکتبہ اعظمی، مئو، اعظم گڑھ

حج اسلام کا بنیادی رکن اور ملت ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار ہے، اس کی اہمیت کی وجہ سے اردو میں اس کے حقائق و فوائد اور آداب و مناسک پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن حجاج کے متعلق کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اعیان الحجاج کے نام سے دو جلدوں میں یہ تذکرہ لکھا ہے، جو امت کے مشاہیر و اکابر حجاج کے سوانح و واقعات پر مشتمل ہے، پہلی جلد ۱۹۸۱ء میں چھپی تھی اور اسی زمانہ میں اس پر معارف میں ریویو ہوا تھا، اس دوسری جلد میں پہلی اور دوسری صدی ہجری سے اس صدی کے نصف اول تک کے مختلف طبقوں کے ۳۶۸ افراد کا ذکر ہے، جن میں ارباب حکومت، علمائے امت اور اصحاب علم و حکمت کے ساتھ ممتاز خواتین کا بھی ذکر ہے، ان کے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کے ساتھ ان کے موثر و سبق آموز اقوال بھی نقل کئے ہیں، اور واقعات حج ایسے دلآویز پیرائے میں لکھے ہیں جس سے حج و زیارت کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس کے دینی و دنیاوی فوائد و برکات کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ناموں کی ترتیب سنین یا حروف تہجی کے مطابق نہیں دی گئی ہے، جس سے تلاش میں دشواری ہوتی ہے، بعض تذکرے حج یا اس سلسلہ کے کسی واقعہ کے ذکر سے خالی ہیں، جیسے امام حسن بصریؒ کے مکہ تشریف لے جانے کا ذکر تو ہے، مگر ان کے حج کے بارہ میں کچھ درج نہیں ہے، ابو عبداللہ مغربی کے

چارہ پاسات ۹۶ سے حجوں کا ذکر ہے، لیکن کسی ایک حج کی بھی کوئی جزئی کیفیت نہیں بیان کی گئی ہے، واقعات وحالات کے انتخاب سے مولانا کے مذاق وذوق کا پتہ چلتا ہے، مگر بعض واقعات ایسے نقل کئے گئے ہیں جو لوگوں کے لئے باعث تشویش ہوں گے، مثلاً ابو محمد جوینی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی سال میں دوبار زکوٰۃ نکالتے تھے، یا ابو القاسم زنجانی طواف کے لئے آتے تو مطاف ان کے لئے خالی کر دیا جاتا اور لوگ حجر اسود سے زیادہ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے، ان روایتوں کی تحقیق کی ضرورت تھی، ان معمولی فروگذاشتوں کے علاوہ کتاب قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

"ع۔ص"

زبان اور قواعد : مرتبہ جناب رشید حسن خاں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۰۵، قیمت ۱۰ روپیے، شائع کردہ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی۔

اردو کے مشہور اہل قلم جناب رشید حسن خاں کو املا، تلفظ اور لسانیات کے مسائل سے زیادہ دلچسپی ہے، ترقی اردو بورڈ نے اردو املا کے مسائل پر غور کرنے کے لئے جو سہ نفری کمیٹی مقرر کی تھی اس کے ایک رکن وہ بھی تھے، اردو املا پر ان کی ایک ضخیم کتاب پہلے شائع ہو چکی ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے تلفظ اور اس سے متعلق مباحث پر اظہار خیال کیا ہے، یہ حسب ذیل نو مضامین پر مشتمل ہے (۱) صحت الفاظ (۲) مشترک الفاظ (۳) لغت اور استعمال عام (۴) طلائی۔ بالائی (۵) ترکیب ہند (۶) سقوط حروف علت (۷) اعلان نون (۸) مختارات امیر مینائی (۹) بحر البیان

پہلا مضمون زیادہ اہم اور طویل ہے، اس میں عربی وفارسی کے تقریباً ڈھائی سو ایسے الفاظ پر گفتگو کی گئی ہے جن کی حرکات اردو میں تبدیل ہو گئی ہیں، یا جو فارسی وعربی الفاظ کے قاعدے کے مطابق بے تکلف اردو میں بولے جاتے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ عربی وفارسی کے الفاظ نہیں ہیں، اس قسم کے الفاظ کے بارہ میں عام خیال یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کے استعمال میں عربی وفارسی حرکات وقواعد کی پابندی کی جائے، فاضل مصنف کے خیال میں یہ رائے صحیح نہیں ہے،

ان کے نزدیک یہ تبدیلیاں اردو کے مزاج اور ہندوستانی لہجے کے اقتضا سے خود بخود عمل میں آئی ہیں، اس لئے ان کو قبول کرنا ہی بہتر ہے، اس کے ثبوت میں انھوں نے پنڈت دتاتریہ کیفی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا حالی اور انشاء اللہ خاں انشاء کی تحریروں کے اقتباسات اور اساتذہ کے کلام سے شواہد پیش کئے ہیں، یہ سب الفاظ اس موضوع کی مشہور کتاب "قاموس الاغلاط" سے منقول ہیں، مصنف نے ان کے بارے میں نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ وغیرہ بعض دوسری کتابوں کے مندرجات بھی درج کر دئے ہیں، تیسرا مضمون بھی اسی نوعیت کا ہے، ان دونوں کے ضمن میں لغت کی موجودہ کتابوں کی خامیوں کی نشاندہی کر کے ایک جدید لغت کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے، دوسرے مضمون میں ایسے چند لفظوں کا ذکر ہے جن کی تذکیر و تانیث کے متعلق اہل زبان مختلف الرائے ہیں، چوتھے مضمون میں اس کا ذکر ہے کہ ملائی کو اہل لکھنؤ نے کب سے بالائی کہنا شروع کیا اور اب ان میں فصیح کون ہے، مصنف دونوں کو فصیح سمجھتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے بالائی کو ترجیح دینے والے اہل لکھنؤ کی تردید کی ہے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں مقالے بھی مصنف کی تلاش و محنت اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں، "مختارات امیر مینائی" میں امیر کے مکاتیب کی مدد سے زبان و بیان کے دلچسپ نکات، الفاظ و محاورات، تلمیحات و متروکات، تذکیر و تانیث اور قواعد و عروض کے متعلق امیر کے خیالات واضح کئے گئے ہیں، مصنف کو ان کے جس خیال سے اختلاف ہوا ہے، حواشی میں اس کی تردید کی ہے۔ شروع میں ناسخ سے شروع ہو کر امیر و جلال پر ختم ہونے والے اردو شاعری کے دور کی خصوصیات بھی قلمبند کی گئی ہیں، آخری مضمون میں قواعد، لغت اور اردو مصادر کے متعلق امام بخش ناسخ کے بیٹے اور شاگرد امداد علی بحر لکھنوی کا ایک فارسی رسالہ نقل کیا گیا ہے،

لائق مصنف نے اس پر بھی مفید حواشی لکھے ہیں اور شروع میں آبرو کے حالات و کمالات اور رسالہ کے اہم نکات و خصوصیات کا ذکر کیا ہے، یہ سب مضامین اہل علم و نظر کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں، اصولی حیثیت سے تلفظ کے متعلق مصنف کی رائے سے اتفاق کے باوجود بعض الفاظ کے متعلق ان کے افکار و خیالات محل نظر ہیں، متعدد لفظوں کے بارہ میں شواہد پیش نہیں کئے گئے ہیں جیسے متوفی (بکسر فا) ص ۴۷، اعراف (بکسر اول) ص ۹۹، تمیز (فتح اول) ص ۲۰۲، مصنف نے بعض لفظوں کے متعلق دو سفارشیں پیش کی ہیں، جیسے عصمت (بہ کسر و فتح اول) ص ۱۱۵، شتر (بفتح و ضم دوم) ص ۲۱۶، عندلیب ص ۲۱۶ غلاف، ص ۲۱۹، ندامت، ص ۲۲۰ (سب بہ کسر و فتح اول) ایسی صورت میں یکسانی کس طرح پیدا ہوگی اور انتشار سے کیسے بچا جائے گا، جس سے خود لائق مصنف نے بھی عموماً بے اطمینانی ظاہر کی ہے، اس رجحان کی پوری تائید نہیں کی جا سکتی کہ جو لفظ اصل کے خلاف بولے گئے، چاہے ان کا چلن نہ بھی ہوا ہو، انھیں اصل کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے، انھوں نے عجلت کے بارے میں لکھا ہے کہ عربی میں بکسر اول ہے، لیکن اس کے معنی بچھیا اور چرخی کے ہیں، جلدی کے معنی میں بفتح اول ہے: جو اردو میں بضم اول بولا جاتا ہے، نیز عجلہ بکسر اول تا، مدرسہ سے ہے جیسے مدرسہ و مکتبہ وغیرہ۔

صحبت یار آخر شد، ڈاکٹر شعیب اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۲۴ مجلد قیمت ۴۵ روپیہ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ اردو بازار، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۶

جولائی سنہ ۷۶ء میں ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں کے تیرہ[۱۳] اساتذہ و طلبہ کا ایک وفد بنیاد فرہنگ ایران کی دعوت پر ایران گیا تھا، اس میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ فارسی کے ریڈر ڈاکٹر شعیب اعظمی بھی تھے، زیر نظر کتاب اسی سفر کی سرگذشت ہے، اس وفد نے اصفہان، شیراز، خراسان اور تہران کی تاریخی

سیاحت کی ہے مصنف نے مستقل عنوانات قائم کرکے وہاں کے قیام کی مفصل روداد تحریر کی ہے جس میں روزانہ معمولات ومشغل کے علاوہ لوگوں سے ملاقاتوں اور مشہور اور تاریخی مقامات کی سیاحت کے مفصل حالات بیان کئے ہیں، جس سے ایران کی تہذیب، معاشرت اور طرز ماند و بود کا بھی خاصا اندازہ ہوجاتا ہے، لیکن ان کو اہل علم سے ملنے اور درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کو دیکھنے اور کتب خانوں اور علمی اداروں کے مشاہدے کا کم اتفاق ہوا، زیادہ رگذرگاہوں اور بازاروں میں گشت رہا، اس لئے ان مقامات پر جس سطح کے لوگوں سے سابقہ ہوتا ہے زیادہ تر انھی کی زندگی کو قریب سے دیکھ سکے، جیسا کہ تہران کے زیر عنوان انھوں نے خود لکھا ہے "ہم خوش تھے کہ چلو ایک ایسے اجتماع میں شرکت کرنے کا موقع میسر آیا جو خالص ادبی تھا اور جس میں ایران کے ممتاز مورخین، محققین، مصنفین، شعراء، علماء اور فضلاء کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملے گا، کیونکہ اب تک علم و ادب کے میدان میں ہمارا معاملہ بالکل صفر تھا اور ہم صرف گھوم پھر کھا پی اور سو جاگ کر ایران کی سیر کر رہے تھے" اس لئے دور حاضر کے ایرانی فضلاء اور وہاں کے علمی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں اور سیاسی، تمدنی، مذہبی اور اخلاقی حالات کا اس میں کم ذکر ہے اور سڑکوں، شاہراہوں اور ہوٹلوں کے متعلق دلچسپ واقعات تفصیل سے درج ہیں، آئندہ ایران جانے والوں کو اس کتاب سے بہت فائدہ ہوگا، مصنف نے پیرایۂ بیان دلچسپ اور رنگین اختیار کیا ہے، اس لئے عام لوگ بھی اس کو شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے، کہیں کہیں زبان وبیان کی بعض غلطیاں نظر آئیں، جیسے صبح سویرے (اٹھنے) کا اس طرح ذکر کیا ہے "خواب عدم سے بیدار ہوئے" (ص ۸) ناپسندیدہ غذا کو بے رغبتی سے کھانے کے بارہ میں لکھا ہے "غرض ان سب (ماکولات) سے نبرد آزما تھے" (ص ۵۰) مندرجہ ذیل جملوں میں بھی خط کشیدہ الفاظ بے محل استعمال ہوئے ہیں: "اپنے دلچسپ سفرنامہ روشنائی نامہ، سعادت نامہ اور زاد المسافرین دیوان کی میراث چھوڑ گیا" (ص ۱۴۶) شیراز اپنے جدید و قدیم کے دور ابھی یہ تھا (ص ۱۶۲) ہم سب بھوکے تھے اس لئے دال میں چاول اور شربت پیاسے سے جی بہلانا مگر ضمن کے بغیر گذرا (ص ۹۸) جیسے کھانے کی ڈش ایک فریج میں رکھ کر دو روز تک استفادہ حاصل کرتے رہے

[illegible]

جلد ۱۲۳ ماہ شعبان المعظم و رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۹ء عدد ۲

مضامین

شذرات

اردو کی بے چارگی اور کس مپرسی محتاج بیان نہیں، گزشتہ تیس برس سے وہ جن حالات سے گزر رہی ہے، کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، اس اثنا میں مرکز اور صوبوں میں مختلف حکومتیں بنیں، اور بگڑیں، مگر اردو جس حال میں تھی، آج تک اسی حال میں ہے، الکشن کے زمانہ میں ووٹ کی خاطر اردو والوں سے خوش آیند وعدے کئے جاتے ہیں، ہر پارٹی اپنے منشور میں اردو کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے، اور یقین دلاتی ہے، کہ اگر وہ برسر اقتدار آگئی تو اردو کے لئے بہت کچھ کرے گی، ان طفل تسلیوں سے اردو داں خوش ہو جاتے ہیں، اور خوش آیند توقعات قائم کر لیتے ہیں، لیکن انتخاب میں کامیابی کے بعد جب ان وعدوں کو عمل میں لانے کا سوال ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ع :-

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

تیس سال سے یہی حال ہے نہ کبھی وعدہ کرنے والوں نے اپنا وعدہ پورا کیا؛ توقع کر لینے والے اپنی توقعات سے دست بردار ہوئے، اور ایک کے بعد ایک کو آزماتے رہے مگر وعدہ شکنی کے مسلسل تجربوں کے بعد بھی اُن کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آئی پچھلے دنوں اردو کی ایک مجلس میں کسی دل جلے نے کہا "آخر کب تک یہ تماشا ہوتا رہے گا کہ ع

ہم کہیں گے حال دل، اور وہ فرمائیں گے کیا

آخر ہماری عزت و خودداری کا جذبہ کب بیدار ہوگا، یہ سُن کر اہل محفل نے کہا ہمارے پاس زبان کے سوا اور کیا ہے، اسی سے جس طرح بنتا ہے عرض و نیاز کر رہے ہیں، شاید کسی دن قبولیت کی گھڑی آجائے، اور بے التفاتی التفات خاص سے بدل جائے،

افسوس ہے کہ ہم اردو کی محبت کے دعویدار ہیں لیکن ہمارے دل جوشِ عمل اور ولولۂ کار سے خالی ہیں، ہم نہ قیس کی طرح صحرا نوردی کی ہمت رکھتے ہیں، نہ فرہاد کی طرح کوہکنی کی سکت ہمارے دست و بازو اُن بکار ہیں، نہ پاؤں آمادۂ رفتار، بس منہ میں زبان رکھتے ہیں، اور الفاظ کے زور سے یہ مہم سر کرنا چاہتے ہیں لیکن؎ ایں خیال است و محال است و جنوں

اہل ہمت تو دوسروں کی مدد سے حصول جنت کو بھی عار سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں:-

رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت — حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

پھر ہمیں کیا ہو گیا ہو کہ غیروں کی طرف ہماری آنکھیں لگی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری زبان کی بقا و ترقی اُن کی نگاہ و کرم پر منحصر ہے، آخر یہ دن بھی کب تک، ہمیں اپنی زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے خود جد و جہد کرنا چاہئے،

اگر اردو والے تھوڑا سا وقت صرف کریں تو ہر بستی اور محلہ میں شبینہ اور صباحی مدرسے قائم ہوسکتے ہیں، اسکولوں کے بچوں کی فہرست بنالی جائے، اور اُن کے سرپرستوں کو آمادہ کیا جائے کہ آدھ گھنٹے کے لئے ان مدارس میں انھیں آنے کی اجازت دیں، اگر محنت و توجہ سے کام کیا جائے تو اس تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ ہوسکتا ہے، اور چند ماہ میں اردو خوانوں کی ایک نئی نسل تیار ہوسکتی ہے، اس میں مصارف کا بھی کوئی خاص سوال نہیں ہے، رضاکارانہ طور پر کام کرنے والے ہر جگہ

مل سکتے ہیں، ذرا سی ترغیب کی ضرورت ہے،

* * *

لاہور سے اردو میں جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام شائع ہو رہی ہے، اس کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، قارئین کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہندوستان میں بھی ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کی طرف سے ایک اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کی جارہی ہے، بارہ جلدوں کا منصوبہ تھا، ان میں سے چار مکمل ہوگئی ہیں، اور آٹھ زیر ترتیب ہیں، خدا کرے وہ جلد تیار ہو کر اشاعت کی منزل تک پہونچ جائیں،

* * *

حیدرآباد کا دائرۃ المعارف محتاج تعارف نہیں، اس نے اسلامی علوم و فنون کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے، اس کی بدولت سیکڑوں نادر کتابیں چھپ کر منظر عام پر آگئی ہیں، ملک کی تقسیم اور ریاست حیدرآباد کے خاتمہ کے بعد اس کے مستقبل کے بارہ میں لوگوں کو تشویش تھی لیکن پہلے ڈاکٹر عبدالمعید خاں پھر پروفیسر عبدالوہاب بخاری اور اب جسٹس شرف الدین احمد اور ان کے رفیقوں کی محنت و توجہ کی بدولت اس کا کام بدستور جاری رہا، خدا کے فضل سے ہر سال کافی کتابیں شائع ہوتی ہیں، ابھی حال میں ابن حبان کی کتاب الثقات، ابن حدیدہ کی المصباح المضیٔ، بقاعی کی نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ابن جوزی کی نزہۃ الاعین النواظر فی علم الوجوہ والنظائر، ابونعیم کی دلائل النبوۃ، شہرزوری کی نزہۃ الارواح، اور سمعانی کی الانساب کی آٹھویں جلد شائع ہوئی ہیں، دارالمصنفین دائرۃ المعارف کے سربراہ جسٹس شرف الدین احمد اور ان کے کارکنوں کو علم و فن کی اس گراں بہا خدمت پر مبارکباد دیتا ہے،

* * *

مقالات

یہود اور قرآن مجید

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

یہود کی دوسری تباہی اور یروشلم کی بربادی | اتنی سخت ٹھوکر کھانے کے بعد بھی یہود نے کوئی سبق نہ لیا، اور وہ بتدریج کفر و شرک کی آلائشوں اور فسق و فجور کی آلودگیوں میں لوٹ اور ظلم و فساد اور بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہوتے گئے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ پہلے ہی کی طرح ان کو دوبارہ پھر ویسی ہی عبرتناک سزا بھگتنی پڑی، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے :-

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو طویل غلامی و بدحالی کے بعد از سر نو فروغ حاصل ہوا، حضرت عزیرؑ نے دین موسوی کی تجدید کی اور یہود کی عملی و اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی پستیوں کو دور کر کے ان کو شریعت کے قوانین کا پابند بنایا اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کر کے اسے یہود کا مرکز و قبلہ بنایا، اس طرح ارض یہودیہ میں ان کی از سر نو حکومت مستحکم ہوئی، لیکن سکندر اعظم کی فتوحات اور یونانیوں کے عروج نے ایرانی سلطنت کی شان و شوکت کم کر دی جس سے یہودیوں کو بھی سخت دھکا لگا اور آہستہ آہستہ حضرت عزیرؑ کی پھونکی ہوئی دینی حرارت اور اخلاقی روح بھی ان سے ختم ہونے لگی اور دنیا پرستی ان پر غالب آتی گئی اور وہ شدید

خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ ان میں باہم اتنا اختلاف و انتشار بڑھ گیا تھا کہ خود ان کے ایک گروہ نے رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی، اس نے بیت المقدس پر قابض ہو کر یہودیوں کی آزادی و اقتدار کا خاتمہ کر دیا، لیکن رومیوں نے مفتوح علاقہ پر براہ راست نظم و نسق قائم کرنے کے بجائے خود یہودی قوم کے ایک شخص ہیرودِ اعظم کو فلسطین اور شرق اردن کا فرماں روا بنا دیا، اس کی وفات کے بعد اس کی ریاست اس کے تین بیٹوں میں تقسیم ہو گئی، اس کے ایک بیٹے نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر دیا اور جب حضرت مسیحؑ نے بنی اسرائیل کی اصلاح کا کام شروع کیا تو تمام یہودی علماء اور پیشواؤں نے ان کی مل کر مخالفت کی، ۴۱ء میں ہیرودِ اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرماں روا بنا دیا جن پر ہیرودِ اعظم اپنے زمانہ میں حکمراں تھا، اس نے حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں پر سخت مظالم ڈھائے اور ان کے اصلاح و تجدید کے کام کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت لگا دی۔

اس دور کے یہودیوں کی مذہبی و اخلاقی حالت اور ان کے دینی رہنماؤں اور پیشواؤں کے زوال و انحطاط کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے سامنے حضرت یحییٰؑ کا سر قلم کر دیا گیا، مگر کسی نے اس ظلم و بربریت کے خلاف نہ کوئی آواز اٹھائی اور نہ کسی طرح کی نکیر و ملامت کی، حضرت مسیحؑ کی سزائے موت کا فیصلہ کیا گیا، مگر چند راست باز لوگوں کے سوا کسی نے بھی اس نار وا حرکت پر شرم و ندامت کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت مسیحؑ نے ان کی اس حالت زار پر جس غم و غصہ کا اظہار کیا ہے، اس کا ذکر اناجیل اربعہ میں موجود ہے۔

ہیرود اگرپا کے زمانہ میں یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش پیدا ہو گئی، یہودیوں نے رومیوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی جس کو روکنے میں ہیرود اگرپا ثانی اور معلی پر دکیور یٹر فلورس ناکام رہے۔ بالآخر ۷۰ء میں طیطس نے یروشلم کو فتح کر کے

...سے زیادہ یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا اور ہزاروں کو گرفتار کرکے غلام بنا لیا اور ہزاروں کو پر مشقت کاموں میں لگا دینے کے لئے مجبور کر دیا، عورتیں فاتحین کے تصرف میں آگئیں، یروشلم بالکل مسمار کر دیا گیا اور فلسطین سے یہودیوں کا اقتدار و اثر اس طرح ختم ہو گیا کہ پھر ان کو ... کا موقع نہ ملا، قیصر ہیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ بسایا، مگر مدت مدید تک یہودیوں کو داخل ہونے کی بھی اجازت نہ تھی۔

...تباہیوں کے متعلق خود ...یفوں کی آگاہیاں | قرآن مجید کا جو بیان اوپر نقل ہوا ہے اس میں اس کی تصریح بھی تھی کہ ان تباہیوں کے بارہ میں یہود کو ان کے صحف و اسفار کے ذریعہ ...دیا گیا تھا، چنانچہ تورات کے باب سلاطین میں ہے:

"اور ایسا ہوا کہ جب سلیمان خداوند کا گھر اور بادشاہ کا قصر بنا چکا اور سلیمان کی سار[ی] ...نا جو اس کے دل میں تھی پوری ہو چکی تو خداوند سلیمان کو دوسری بار دکھائی دیا، جس طرح کہ ...جبعون میں دکھائی دیا تھا، اور خداوند نے اسے کہا میں نے تیری مناجات جو تو نے میرے آگے کی سنی اور اس گھر کو جو تو نے بنایا کہ میرا نام ابد تک اس میں رہے، مقدس کیا، سو میری نگاہ اور میرا دل سدا اس پہ رہے گا اور اگر تو میرے حضور اسی طرح رہے گا جیسے تیرا باپ داؤد دل کی راستی اور صداقت سے رہا اور ان سب حکموں پر جو میں نے تجھ سے کئے عمل کرے گا اور میری شریعتوں اور میری عدالتوں کی حفظ کرے گا تو میں تیری سلطنت کا تخت اسرائیل میں ہمیشہ قائم رکھوں گا، جیسے میں نے تیرے باپ داؤد سے وعدہ کیا اور کہا کہ تیرے یہاں مرد کی کمی نہ ہوگی جو اسرائیل کے تخت پہ بیٹھے، پر اگر تم یا تمہاری اولاد میری پیروی سے کسی طرح برگشتہ ہوگے اور تم میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو جو میں نے تمہیں بتائیں، حفظ نہ کروگے اور اجنبی معبودوں کی عبادت کرنے کو جاؤ گے اور انہیں

سجدہ کروگے تو میں اسرائیل کو اس سرزمین سے جو میں نے انہیں دی ہے، کاٹ کردوں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لئے مقدس کیا ہے، اپنی نظر سے گرا دوں گا، اور اسرائیل تمام جہان میں ضرب المثل اور انگشت نما ہوگا اور اس بلند گھر کے برابر سے جو کوئی گذرے گا حیران ہوگا اور سیٹی بجائے گا اور وہ کہیں گے کہ خداوند نے اس سرزمین اور اس گھر سے ایسا کیوں کیا، تب وہ جواب دیں گے، یہ اس لئے ہوا کہ انھوں نے خداوند اپنے خدا کو جو ان کے باپ دادوں کو زمین مصر سے نکال لایا، ترک کیا اور اجنبی معبودوں کو اختیار کیا اور انھیں سجدہ کیا اور ان کی بندگی کی، اس لئے خداوند نے ان پر یہ سب بلا نازل کی۔

(سلاطین، کتاب اول، باب ۹ آیت ۱ تا ۹)

"تب خداوند کا غصہ اپنے لوگوں پر بھڑکا ایسا کہ اس نے اپنی میراث سے بھی نفرت کی اور اس نے انھیں غیر قوموں کے قبضے میں کر دیا، سو وہ جو ان کا کینہ رکھتے تھے ان پر مسلط ہوئے، ان کے دشمنوں نے ان کو ستایا، وہ زیر دست ہو کے ان کے تابع ہو گئے، اس نے بارہا ان کو رہائی دی، پر انھوں نے اپنی مشورت سے اسے بیزار کیا اور وہ اپنی بدکاری کے سبب پست کئے گئے۔"

(زبور ۱۰۶، ۴۰ - ۴۳)

اسی طرح حضرت یسعیاہؑ، حضرت یرمیاہؑ اور حضرت حزقیلؑ کی کتابوں میں بھی یہود کی اس تباہی و ہلاکت اور یروشلم کی بربادی کے متعلق کھلی ہوئی تنبیہات موجود ہیں، جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے

عہد نبوی کے یہود: یہ زمانہ نبوت سے قبل کے یہودیوں کا ذکر تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت نے ان کے لیے صلاح و فلاح کا ایک آخری موقع فراہم کیا تھا، جس کی اگر وہ قدر کرتے اور توبہ و اصلاح کا راستہ اختیار کر کے آپؐ پر ایمان لاتے تو خدا کی رحمت کے سزاوار اور اس خیر و برکت میں حصہ دار بن جاتے جس کو لے کر آپؐ مبعوث ہوئے تھے، لیکن انھوں نے آپؐ کی مخالفت کا بیڑا اٹھا لیا اور نجات و سعادت کی اس راہ پر گامزن نہ ہوئے جس کی قرآن دعوت دے رہا تھا اور وہی حرکتیں اور شرارتیں پھر شروع کر دیں جیسی کرتے رہے تھے، تو خدا نے بھی ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا:

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ	ہو سکتا ہے کہ اب تمھارا خداوند تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابقہ روش دہرائی تو ہم بھی پھر اپنی سزا دہرائیں گے۔
(بنی اسرائیل: ۸)	

حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت یہود کے مذہبی صحیفوں کی پیشین گوئیوں[1] کے مطابق ہوئی تھی اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؐ نبی برحق ہیں:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ	جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ اس کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔
(بقرہ: ۱۴۶)	

وہ آپ کی آمد کے مشتاق و منتظر تھے، ایک یہودی، ابن الہیبان شام چھوڑ کر مدینہ میں آباد ہو گئے تھے، مدینہ کے یہود قحط اور دوسری مصیبتوں کے وقت ان سے دعائیں کراتے تھے، انھوں نے اپنے انتقال کے وقت یہود کو جمع کر کے کہا: میں شام جیسے سرسبز و شاداب

[1] اس مضمون میں یہ پیشین گوئیاں پہلے نقل کی جا چکی ہیں۔

ملک کو چھوڑ کر یہاں اس لئے آیا تھا کہ مجھے ایک نبی کا انتظار تھا، جس کی بعثت کا زمانہ قریب ہے اور جو یہاں ہجرت کر کے آئے گا، میں اگر زندہ رہتا تو اس کی اتباع کرتا، دیکھو! تم لوگ اس کی اطاعت کرنا۔ اگر تم نے اس کی مخالفت کی تو قید کئے جاؤ گے اور قتل کئے جاؤ گے[1]

یہود کی مشرکین سے جنگ ہوتی تو وہ ان پر فتح پانے کے لئے خدا سے اس رسول کے آنے کی دعائیں مانگتے تھے،

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا. (بقرہ: ۸۹)	اور یہ لوگ پہلے سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعا مانگتے ہیں۔

ابو العالیہؒ سے روایت ہے کہ یہود یہ دعا کرتے تھے کہ "خداوندا! اس نبی کو بھیج جس کو ہم اپنے یہاں لکھا ہوا پاتے ہیں، تاکہ مشرکین پر ہم غالب آئیں، اور ان کو قتل کریں[2]

یہی وجہ ہے کہ حق پسند اور صلحائے یہود نے آپؐ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور جب ان کی تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ آپ ہی وہ نبی ہیں جن کا ہمارے صحیفوں میں ذکر تھا تو ان کو ایمان لانے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا، حضرت زیدؓ بن سعنہ فرماتے ہیں کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نشانیاں بتائی گئی ہیں وہ سب آپ کے چہرے بشرے سے عیاں تھیں لیکن مجھ کو دو باتوں کا تجربہ کرنا تھا کہ کیا آپ کا حلم آپ کے غصہ پر سبقت لے جاتا ہے اور جاہلانہ حرکتیں آپ کے ضبط وتحمل کو مزید بڑھا دیتی ہیں، جب ان کا بھی تجربہ ہو گیا تو میں نے اسلام قبول کر لیا[3]

یہ حق پسند لوگ آپ کے مخالفین کے مقابلہ میں آپ کے پشت پناہ ہو جاتے تھے، چنانچہ حضرت مخیریقؓ غزوۂ احد کے موقع پر یہود مدینہ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد تم پر ضروری ہے، اس لئے آج تم سب کو ان کی مدد کرنی چاہئے

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۱۲۷ [2] تفسیر ابن جریر ج ۱، ص ۳۱۰ [3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۶۰۵ : ذکر اسلام زید بن سعنہ

ان لوگوں نے کہا : آج سبت ہے، ہم کیسے تلوار اٹھا سکتے ہیں؟ فرمایا : سبت کیا چیز ہے، چنانچہ وہ خود سربکف خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے اور جام شہادت نوش کیا۔[1]

ان حق پسند لوگوں نے جس طرح خود آگے بڑھ کر اسلام قبول کیا تھا، اسی طرح وہ چاہتے تھے کہ ان کی قوم بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائے، مشہور یہودی صحابی عبداللہؓ بن سلام کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کی خبر ہوئی تو وہ آپؐ کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ آپؐ سے تین باتیں دریافت کرتا ہوں، جو انبیاءؑ کے سوا کسی کو نہیں معلوم، جب آپؐ ان باتوں کا جواب دے چکے تو انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا، اس کے بعد کہا کہ یہود فتنہ پرداز قوم ہے اور میں عالم کا بیٹا عالم اور رئیس کا بیٹا رئیس ہوں، آپ یہود سے میرے متعلق دریافت کیجئے اور ان کو میرے مسلمان ہونے کی خبر نہ دیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو بلا کر اسلام کی دعوت دی اور ان سے عبداللہؓ بن سلام کے بارہ میں دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ وہ ہمارے سردار اور سردار کے بیٹے ہیں، آپ نے فرمایا : کیا وہ مسلمان ہو سکتے ہیں؟ جواب ملا : کبھی نہیں! عبداللہؓ بن سلام مکان کے ایک گوشہ میں موجود تھے، آپ نے ان کو آواز دی تو کلمہ پڑھتے ہوئے نکلے اور یہود سے کہا، خدا سے ڈرو : تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ رسول ہیں اور ان کا مذہب سچا ہے، یہود اپنی اس اہانت پر بہت برہم ہوئے اور عبداللہ بن سلام کو جھوٹا اور بدترین شخص کہتے ہوئے چلے گئے۔[2]

اسی طرح کا واقعہ حضرت میمونؓ بن یامین کا بھی ہے، جو احبار یہود میں تھے۔[3]

قرآن مجید نے ان ہی حق پسند اور صلحائے اہل کتاب کی جا بجا تعریف کی ہے :

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ جن لوگوں کو ہم نے کتاب سے نوازا

---

[1] اصابہ ج ۳ ص ۳۹۳ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۶۱ [3] اسد الغابۃ ج ۲ ص ۲۲۷

يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ	وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے خداوند کی جانب سے
بِالْحَقِّ ۔ (انعام : ۱۱۴)	حق کے ساتھ اتاری گئی ہے ۔

یہ لوگ اپنی حق پسندی اور راست روی کی بنا پر دہرے اجر کے مستحق ہوں گے ؛

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ	جن لوگوں کو ہم نے قرآن سے پہلے کتاب
هُم بِهِ يُؤْمِنُونَ ، وَإِذَا يُتْلَىٰ	دی تھی، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور
عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ	جب وہ ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو
مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ	کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے بیشک
مُسْلِمِينَ ، أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ	یہ حق ہمارے خداوند کی جانب سے
أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا ۔	ہے، ہم اس کے آنے سے پہلے ہی سے
(قصص ۵۲، ۵۴)	مسلمان تھے، یہی لوگ ہیں جن کو ان کا
	اجر ان کے صبر کی وجہ سے دوبار دیا جائیگا

کفار قریش آنحضرتؐ اور قرآن کے متعلق اپنے شکوک ظاہر کرتے تو ان کے سامنے ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا جاتا کہ

أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ	کیا ان لوگوں (مشرکین) کے لئے یہ کافی
عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۔	نشانی نہیں ہے کہ اس کو بنی اسرائیل کے
(شعرا ، ۱۹۷)	علماء جانتے ہیں ۔

دوسری جگہ ہے :

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ	اے نبی ! ان سے کہو کہ کیا تم نے کبھی
عِندِ اللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِ	خیال کیا کہ اگر یہ کلام اللہ کی طرف سے ہو

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ.
(احقاف: ۱۰)

اور تم نے اس کا انکار کیا، ورانحالیکہ اس جیسے کلام پر بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے، وہ ایمان لے آیا اور تم نے گھمنڈ کیا۔

لیکن یہ یہود کا ایک قلیل گروہ تھا، ورنہ وہ من حیث الجماعۃ کفر وانکار کے مرتکب ہوئے حالانکہ ان کو آپ کا خیر مقدم کرنا چاہیئے تھا اور آپ پر ایمان لانے میں سبقت کرنی چاہیئے تھی، اور دوسروں کو بھی اسی جانب آمادہ اور راغب کرنا چاہیئے تھا، لیکن انھوں نے ایمان کی راہ میں سبقت کرنے کے بجائے کفر کی راہ میں سبقت کی اور مخالفت میں آپ کے دشمنوں اور کفار مکہ کے ہم نوا اور پشت پناہ بن گئے تھے، اس طرح انھوں نے ایسے زریں موقع کو گنوا دیا جس کے نتیجے میں وہ بد تر سے بد تر ہوئے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

عہد نبوی میں یہود کے تین بڑے قبیلے بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع مدینہ اور اس کے نواح میں آباد تھے، آپ نے ان سے معاہدہ کیا، مگر یہود نے بہت جلد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کر کے عہد شکنی کی، پہلے بنو قینقاع نے کھلم کھلا معاہدہ کی خلاف ورزی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت سمجھایا، مگر وہ کسی طرح باز نہ آئے تو ۲ھ کے آخر میں ان کا محاصرہ کیا گیا، بالآخر انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے، آپ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا مال واسباب، اسلحے اور آلات صنعت وغیرہ چھوڑ کر مدینہ خالی کر دیں، قرآن نے بنو نضیر کی جلا وطنی کے ضمن میں ان کی جلا وطنی کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ

ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے اپنے کیے کا مزہ

پکھ چکے ہیں۔ (حشر : ۱۵)

بنو نضیر معاہدہ کے باوجود غزوۂ احد میں مسلمانوں کی مدافعت میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ قریش کی پشت پناہی اور ان کو بھڑکانے میں حصہ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے ان کے پاس کہلا بھیجا کہ دس دن کے اندر مدینہ خالی کر دیں۔ جب انھوں نے مدینہ خالی کرنے سے انکار کیا تو ان کا بھی محاصرہ کیا گیا، چنانچہ چند ہی روز میں وہ اپنی بستیاں اس شرط پر خالی کرنے کے لئے تیار ہو گئے کہ اسلحہ کے علاوہ جو سامان بھی وہ اپنے اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں لے جائیں۔ اس طرح یہودیوں کا دوسرا قبیلہ بھی مدینہ سے نکل گیا۔ قرآن نے ان کی رسوائی کا بہت مفصل ذکر کیا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ	وہ اللہ ہی ہے، جس نے اہل کتاب
كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	کافروں کو پہلے ہی جاؤ میں ان کے
مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ	گھروں سے باہر نکال دیا، تمھیں ہرگز
مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا	یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے
اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ	اور وہ بھی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ان کے
اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ	قلعے انھیں اللہ سے بچا لینے والے
لَمْ یَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِیْ	ہیں، سو اللہ نے ان کو اس طرح
قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ	دھر لیا جدھر کا ان کو گمان بھی نہ تھا
بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی	اس نے ان کے دلوں میں رعب
الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓ	ڈال دیا، وہ خود اپنے ہاتھوں سے
اُولِی الْاَبْصَارِ	اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ۔

(حشر ۲ و ۵)

مومنین کے ہاتھ بھی ان کے گھروں کو برباد کر رہے تھے، پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!.... تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے حکم سے تھا اور تاکہ اللہ نافرمان لوگوں کو رسوا کرے۔

یہود کا تیسرا بڑا اور طاقت ور قبیلہ بنو قریظہ تھا، اس نے غزوۂ احزاب میں علانیہ حصہ لیا تھا، لیکن جب اس میں قریش کے لشکر جرار کو شکست ہوئی تو رسول اللہؐ نے پھر ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ان سے صلح کا معاملہ کرنا چاہا، مگر وہ سخت بدتمیزی پر آمادہ ہوگئے، اس لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ان لوگوں کا بھی آخری فیصلہ کیا جائے، اس طرح ان کا بھی محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک ماہ کے محاصرے کے بعد انھوں نے خود درخواست کی کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں وہ ہم کو منظور ہے، حضرت سعدؓ کا قبیلہ اوس بنو قریظہ کا حلیف تھا، انھوں نے تورات کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے۔ قرآن نے یہ واقعات اس طرح بیان کئے ہیں:

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ

اور اللہ نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، ان کی گڑھیوں سے

الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ
وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا وَأَوْرَثَكُمْ
أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ
وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا وَكَانَ اللَّهُ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا۔

(احزاب: ۲۶، ۲۷)

نکال دیا اور ان کے دلوں میں رعب
ڈال دیا، ایک گروہ کو تم قتل کرتے
اور دوسرے کو قید کرتے، اس نے
ان کی زمین اور ان کے گھروں اور
مالوں کا تم کو وارث بنا دیا، اور
اس زمین کا بھی جس کو تم نے روندا نہیں
تھا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مدینہ سے جلاوطن ہونے کے بعد یہود خیبر میں جا بسے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاہدہ کرنا چاہا لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے بلکہ شرارتوں اور سازشوں پر اتر آئے اس لئے آپ مقابلہ کے لئے نکلے، بالآخر خیبر بھی فتح ہوا اور یہود کی درخواست پر زمین ان کے قبضے میں باقی رہنے دی گئی، مگر وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو دیتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب ان لوگوں نے پھر سرکشی کی تو ان کو سرزمین حجاز ہی سے نکال دیا گیا۔

بعد نبوت کے بعد: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے اب تک برابر یہود ذلت، رسوائی، انتشار اور پراگندگی کا شکار، اور قوموں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ در بدر کی خاک چھان رہے ہیں اور کہیں بھی ان کو چین سے رہنا نصیب نہیں ہو رہا ہے۔ مغرب کی موجودہ ترقی کے دور سے پہلے ان پر عیسائی مظالم ڈھاتے رہے ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ دی پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں:

"ساڑھے تین سو برس تک سلطنت انگلستان نے یہودیوں کو اپنے ملک میں داخل نہیں ہونے دیا[1]، اس زمانہ میں مسلمانوں کا برتاؤ ان کے ساتھ ہمدردی اور رواداری کا تھا ان کے رحم و کرم

[1] دعوت اسلام ص ۹۵، اردو ترجمہ از عنایت اللہ صاحب

اسلامی ملکوں میں یہود کو پناہ ملی تھی، ایک عیسائی مصنف اڈورڈ عطیہ لکھتا ہے:

"عربوں اور ترکوں کی حکومت کی پوری تاریخ میں عرب ممالک میں یہودی اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا گیا، جب یورپ میں یہودیوں کو ہدف ظلم و ستم بنایا جاتا تھا تو انھیں صرف مسلمانوں کی حکومت میں پناہ ملی۔"[1]

لیکن جب عیسائیوں کا جوش انتقام کم ہوا اور عالم اسلام پر یورپ کا سیاسی و معاشی تسلط ہو گیا تو اپنی ذہنی برتری اور کاروباری صلاحیت کے باعث یہودیوں کا عیسائی ممالک میں زور و اثر بھی بڑھ گیا، اس لئے انھوں نے پہلے اپنے لئے ایک قومی وطن اور اپنی ایک قومی مملکت کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ اور امریکہ کے سہارے وہ فلسطین میں وہاں کی مقامی آبادی، عیسائیوں اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، ظاہر ہے یہ سہارا ہمیشہ باقی نہیں رہے گا، دنیا کی اکثر قومیں اسے ایک غاصب حکومت خیال کرتی ہیں اور خود یورپ کے انصاف پسند لوگ بھی اس کو بین الاقوامی سازش اور استعمار کی پیداوار سمجھتے ہیں۔

اسی زمانہ میں جرمنی میں نازی برسر اقتدار آئے اور انھوں نے یہودیوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ پہلی جنگ عظیم میں یہودیوں کی سازش نے جرمنی کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا، اس بنا پر ہٹلر کو ان سے سخت نفرت اور دشمنی ہوگئی تھی اور اس نے ۲ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے بعد جرمنی میں بسنے والے تمام یہودیوں کو ملک بدر کر دیا، وہ دراصل اس صدی کا یہود کے لئے دوسرا بخت نصر تھا۔

اخروی عذاب ابھی تک یہود کی دنیاوی سزاؤں کا ذکر تھا، ان کو دنیا کی طرح آخرت میں بھی سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا، قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس کی صراحت

[1] مذاہب عالم ندوی، ص ۳۰۴ بحوالہ The Arabs, p. 26

موجود ہے۔ چند آیتیں ملاحظہ ہوں :

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ	بے شک جن لوگوں نے اہل کتاب
اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ	اور مشرکوں میں سے کفر کیا، وہ
فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا	جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے،
اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ۔	یہی بدترین خلائق ہیں۔

(بینۃ : ۶)

ان کے اللہ سے باندھے ہوئے عہد توڑنے کا یہ انجام ہوگا :

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ	بیشک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی
وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا	قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض
اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ	فروخت کرتے ہیں، ان کے لئے آخرت
فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ	میں کوئی حصہ نہیں، اور اللہ نہ ان کو
اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَوْمَ	بات کرے گا اور نہ قیامت کے روز
الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ	ان کی طرف دیکھے گا، اور نہ ان کو
عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔	پاک کرے گا، ان کے لئے دردناک
(آل عمران : ۷۷)	عذاب ہوگا۔

یہود اپنے کو خدا کا محبوب سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کو خدا کا عذاب لاحق نہ ہوگا، اور اگر ہوا بھی تو محض چند روز کے لئے۔ ان کے اس غلط خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا :

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتْ	البتہ جس نے کوئی برائی کی اور
بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ، فَاُولٰٓئِکَ	اس کے گناہ نے اس کو گھیرے میں

أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ. (بقرہ: ۸۱)

لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

آخرت میں نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی اور نہ کسی طرح کی سعی و سفارش انکے کام آئے گی:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (بقرہ: ۸۶)

یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے عوض خرید لیا ہے، تو نہ ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا، اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

وہ آخرت کے عذاب سے بچ نہیں سکتے:

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

(آل عمران: ۱۸۸)

سو ان کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو، ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے

دنیا و آخرت دونوں میں ان کے اعمال رائگاں جائیں گے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (آل عمران: ۲۲)

یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت جائیں گے اور انکی کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

ایک جگہ ان کے کتمان حق کی سزا بیان ہوئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ الخ (بقرہ ۱۷۴)

بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو خدا نے کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض حقیر معاوضہ لیتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اپنے پیٹوں میں آگ کھا رہے ہیں

مثنوی اسرارِ خودی پر ایک نظر

از ڈاکٹر سید وحید اشرف ریڈر شعبۂ عربی و فارسی و اردو، ... یونیورسٹی

اقبال کی عالمی شہرت کی ابتدا مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت سے ہوئی، سب سے پہلے اس کا ترجمہ انگریزی میں نکلسن نے کیا، بڑے بڑے ادبا و شعرا نے اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا، انگلینڈ کے ایک مشہور شاعر و نقاد[1] نے اس کی اشاعت پر اقبال کے بارے میں یوں رائے پیش کی تھی:

"ہمارے ملک کے شاعر کیٹس کے زمانہ کی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور بلبلوں اور پرندوں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے موضوعوں پر نظمیں لکھ رہے ہیں، اور ادھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہو رہی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح تسلط کر لیا ہے ..... یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے، جس کے حسن و جمال کے آئینے میں فلسفۂ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں، اس میں خوابوں کی فراوانی ہے، لیکن ان میں اتحاد پایا جاتا ہے وہ اس کی منطق ساری کائنات کے لئے آوازِ غیب کا حکم رکھتی ہے"

ملک کے مشہور انگریزی ادیب ملک راج آنند نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا تھا:

"اس شخصیت کا شمار مغرب کے بہترین شاعروں اور نقادوں میں ہوتا ہے، ان کا یہ خراجِ تحسین ایسا ہے جسے اقبال کو اپنی کلاہِ فخر کا آویزہ سمجھنا چاہیے"

---

[1] اس کا نام غالباً ریڈ ہے، لیکن اس وقت پورے طور پر حافظہ ساتھ نہیں دے رہا ہے، عرصہ ہوا اس کا اقتباس نیرنگِ خیال کے اقبال نمبر میں دیکھا تھا۔

انگلینڈ کے ایک ایسے شاعر و نقاد کے قلم سے اقبال کی عظمت کا اعتراف جہاں ایک غیر معمولی واقعہ کو ظاہر کرتا ہے وہاں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں شاعری کا معیار کیا ہے اور وہاں اس کی بڑائی کا کیا تصور ہے۔ مغرب میں اقبال کو بیشتر ترجمہ کے ذریعہ سمجھا گیا ہے، شاعری میں وہ پُرکاری اور فن کاری جو اصل زبان میں موجود ہوتی ہے، ترجمہ میں منتقل نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے جو لوگ فارسی کی شعری زبان کی لذت سے نا آشنا ہیں، وہ اقبال کے فارسی کلام کی حلاوت اور دل کشی کو پوری طرح محسوس نہیں کر سکتے۔ اقبال نے دنیا کو اپنی جس فکر کی عظمت سے متاثر کیا ہے وہ فارسی زبان میں پہلی بار اسرار خودی کے ذریعہ آشکارا ہوئی۔ اقبال کی عالمگیر مقبولیت اس کے کلام کی آفاقیت کی دلیل ہے، اس کے کلام کے ترجمہ میں اگرچہ اصل جوہر تمام و کمال نمایاں نہیں ہو سکتا، تاہم اس قدر شعریت ضرور باقی رہتی ہے جو ہر قدر دانِ فکر و فن کے دل و دماغ کو اپنا اسیر بنالے، یہ اقبال کے فکر و فن کی عظمت کی بیّن دلیل ہے۔

اقبال نے اسرار خودی میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا بقیہ کلام اسی کی تفسیر ہیں، یہ وہ سمندر ہے، جس کی پہنائیوں میں لامتناہی امکانات پوشیدہ ہیں، اس لئے اس مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ ناممکن ہے، یہاں جو کچھ لکھا جائیگا وہ صرف ایک اجمالی تعارف ہوگا۔

اقبال کا سارا کلام اگرچہ اسلامی افکار اور تعلیمات کا حامل نظر آتا ہے لیکن اس کی آفاقی اور فطری اپیل ملک و قوم اور نسل و رنگ کی حدود سے بالاتر ہے، اسرار خودی کے اشعار اگرچہ چند موضوعات کے تحت لکھے گئے ہیں، لیکن یہ پوری زندگی کو محیط ہیں، اقبال نے اس مختصر شعری مجموعہ میں قوموں کے عروج و زوال کے

اسباب کی نشاندہی کردی ہے۔ انھوں نے انسانیت کی بقا اور اس کی سربلندی
جو وسیلہ قرار دیا ہے اسے بالکلیہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی شاعری
ادب اور زندگی کو ہم معنی بنا دیا۔ اگر شاعری پیغمبری ہے تو اس کا سب سے پہلا
مصداق اقبال ہے۔ یہ اولیت زمانہ کے اعتبار سے نہیں بلکہ جامعیت کے اعتبار
ہے، اور اگر اقبال اس کے مستحق نہیں تو دنیا کا کوئی بھی شاعر اس کا مصداق
نہیں ہو سکتا۔

اقبال کی شاعری کے کسی بھی حصے پر اظہار رائے کرتے وقت اُن کے
تصور خودی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خودی اور اقبال لازم و ملزوم ہیں
خودی اقبال کی علامت بن گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی قدروں کی بلندی
کے لئے خودی کو بلند کرنا ناگزیر ہے۔ ان کی شاعری اسی نظریۂ خودی کی تفسیر
و تبلیغ ہے۔ یہ موضوع ان کی پوری شاعری پر محیط ہے، یہی عشق ہے،.....
..... یہی جوہر انسانیت ہے۔ اسی کی بقا سے انسانیت کی بقا ہے اور اس کی فنا
سے انسانیت کی موت ہے۔ اس لئے اس کا تحفظ انسان کا سب سے پہلا
فرض ہے۔ اسی پیغام کو اقبال نے فارسی زبان میں سب سے پہلے اسرارِ خودی کے
ذریعہ عام کیا ہے۔

اقبال کا نظریۂ خودی صوفیہ کے احساسِ نفس یا تعین ذات کا ہم معنی ہے۔ اقبال
۱۹۱۵ء میں اسرارِ خودی کے دیباچہ میں لفظ خودی کے بارہ میں اپنی جو رائے ظاہر
کی تھی، اسے ناظرین یہاں ملاحظہ فرمائیں:

"لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ

اس نظم میں بمعنی غرور نہیں استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم نفس، احساس نفس یا تعین ذات ہے، مرکب لفظ بے خودی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔

(مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج)

اسرارِ خودی کے بارے میں ایک جگہ اقبال نے یوں لکھا:

"میرا دعویٰ ہے کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں۔"

(مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج)

اسرارِ خودی کے تمہیدی اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افکار و جذبات کا سمندر شاعر کے اندر موجیں مار رہا ہے، اور باہر نکلنے کے لئے بےتاب ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار محض فکری عقدہ کشائی نہیں کرتے بلکہ ان میں ایک نہایت حساس شاعر کے دل کی دھڑکنیں بھی محسوس ہوتی ہیں۔ کتاب کا اصل مضمون خودی کی تفسیر سے شروع ہوتا ہے، اس میں تکوین کائنات اور بقائے حیات کے فلسفہ کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ فلسفہ شاعری میں ڈھل گیا ہے، اس میں زندگی پر بڑی گہری نظر ڈالی گئی ہے، اقبال کے نزدیک کائنات کا وجود اس لئے ہوا ہے کہ خدا کی ذات کا اثبات اس کے غیر ہی سے ممکن ہے، خودی ہی خیر ہے، خیر اسی وقت ابھرتا اور ارتقا پذیر ہوتا ہے جب وہ شر سے متصادم ہوتا ہے، یا خودی جب غیر خود سے متصادم ہوتی ہے، خیر و شر کا یہ تصادم مسلسل ہے، شر کا غلبہ عارضی ہوتا ہے اور وہ صرف

اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی مستحکم تر خودی کا عامل پیدا ہو۔ اس طرح خودی مسلسل اور بتدریج استحکام پذیر اور ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ مستحکم اور ترقی یافتہ خودی پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہے، جن کی ذات میں انسانیت کی تکمیل ہوئی ہے، اس لئے وہ خودی تمام انسانوں کے لئے نمونہ ہے، خودی عمل کیلئے بے تاب ہوتی ہے، اس لئے خودی اور عمل لازم و ملزوم ہیں، جہاں عمل نہیں وہاں خودی نہیں، زندگی کے تمام صفات حسنہ کا انحصار اس عمل پر ہے جس کا سرچشمہ خودی ہے، اقبال کے یہ تمام بیانات مشاہدہ پر مبنی ہیں، انھوں نے اس کے اظہار کے لئے مجرد فلسفہ کا سہارا نہیں لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے انداز بیان میں فطری اپیل پائی جاتی ہے۔ خودی کے بارہ میں اسرار خودی سے یہاں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں،

پیکر ہستی ز آثار خودی ست — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او — غیر او پیداست از اثبات او
سازد از خود پیکر اغیار را — تا فزاید لذت پیکار را
بہر یک گل خون صد گلشن کند — از پئے یک نغمہ صد شیون کند
حسن شیریں عذر درد کوہ کن — نافہ ای عذر صد آہوئے ختن
شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت — تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت
وا نمودن خویش را خوئے خودی ست — خفتہ در ہر ذرہ نیروی خودی ست
قوت خاموش و بے تاب عمل — از عمل پابند اسباب عمل

چوں خودی آرد بہم نیروی زیست   می کشاید قلزمے از جوئے زیست

خودی کی تعریف کے بعد اقبال نے ان موضوعات کا احاطہ کیا ہے: خودی کس طرح مستحکم ہوتی ہے اور کیونکر ضعیف ہو جاتی ہے؟ ملت اسلامیہ میں اس کے ضعف کے کیا اسباب ہیں؟ خودی کے استحکام کے نتائج کیا ہیں؟ خودی کی تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ خودی کی قوت تخریب کا سبب نہیں، بلکہ تعمیر اور ارتقاے حیات کا سبب ہوتی ہے۔ اپنے نظریات کو زیادہ موثر اور عام فہم بنانے کے لئے چند شخصیات اور حکایات کا ذکر کیا ہے، آخر میں وقت کی اہمیت اور اثر انگیز دعا، پر کتاب کو ختم کیا ہے، تمام موضوعات نہایت خوبصورتی کے ساتھ منطقی انداز میں مربوط ہیں۔

اقبال کے یہاں عشق اور خودی کہیں کہیں ہم معنی نظر آتے ہیں۔ یہ عشق اس ذات کے ساتھ عشق کا نام ہے جس نے اپنی خودی کی تربیت کر لی ہو، چونکہ تخلیق کائنات کا مقصد ہی ارتقاے خیر ہے، اس لئے ہر دور میں خدا نے خودی کا نمونہ پیدا کیا، تاکہ وہ دوسروں کی خودی کی تربیت کا کام انجام دے سکے، آخر میں پیغمبر آخر الزماںؐ کو اس کا حامل بنایا، جن کی ذات میں خودی کی تکمیل ہو چکی ہے، اب یہی ذات تمام انسانوں کے لئے خودی کا نمونہ ہے، اس لئے اقبال بالخصوص مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ذات مصطفیٰؐ کے ساتھ عشق ہی ان کی خودی کا ضامن ہے:

در دل مسلم مقام مصطفیٰؐ است
آبروے ما ز نام مصطفیٰؐ است

اس کے بعد ذات مصطفیٰؐ کی بعض ان خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کے

اثرات صرف حیات پر ہی نہیں بلکہ نظامہائے حیات پر مترتب ہوتے ہیں، چند خصوصیات کو صرف ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے :

در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

یعنی آپ نے بنی نوع انسان کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دیا، اس ضابطۂ حیات پر عمل کرنے والی ایک قوم کی تشکیل کی اور اس ضابطۂ حیات کو اس قوم پر نافذ کر کے سیاست مدن کا ایک نمونہ پیش کر دیا، انسانیت کے لئے یہ تین اشیاء ناگزیر ہیں، تاریخ عالم میں ہمیں صرف ایک ہستی ایسی ملتی ہے جس نے ان تینوں کو یکجا بہم کر دیا ہو، اس لئے اس ذات کو خودی کا نمونہ بنانے کے لئے انسان عقلاً مجبور ہے، اس آئین کے بعض اثرات کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے :

در دعائے نصرت آمین تیغ او — قاطع نسل سلاطین تیغ او
در جہاں آئین نو آغاز کرد — مسند اقوام پیشیں در نورد
در نگاہ او یکے بالا و پست — با غلام خویش بر یک خواں نشست
آنکہ بر اعدا در رحمت کشاد — مکہ را پیغام لاتثریب داد
امتیازات نسب را پاک سوخت — آتش او ایں خس و خاشاک سوخت

یعنی جس نے ملوکیت کو ختم کیا، نسل و رنگ، حسب و نسب، اونچ نیچ کے تمام امتیازات مٹا دئے اور جو تمام انسانوں کے لئے رحمت ہی رحمت ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال انسانوں کے خود ساختہ آئین کا مخالف ہے اور صرف

نظام اور طبقاتی تقسیم کو ظلم سمجھتا ہے۔

آرزو اور عشق | ان دونوں سے خودی کا نتیجہ خواری، غلامی اور ناداری ہے جو حریت فکر کو چھین لیتی ہے اور خودی کو کمزور و ناتواں بنا دیتی ہے، اقبال نے اسرار خودی میں عنوان تو یہ قائم کیا ہے کہ خودی سوال سے ضعیف ہو جاتی ہے مگر اس کے تحت جو اشعار ہیں، ان میں پیغام حریت پنہاں ہے۔ اقبال نے گدائی اور دست سوال دراز کرنے کی ممانعت کی ہے، لیکن ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ ایسی تعلیم جس کا مقصد صرف حصول رزق کے لئے انگریزوں کی غلامی کرنا ہے خودی کی قاتل ہے، کہتے ہیں:

تا کجے دریوزۂ منصب کنی
صورت طفلاں زنی مرکب کنی

محنت کوشی، مشکل پسندی اور خودداری کی تعلیم دیتے ہیں:

ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز
آبروئے ملت بیضا مریز

اقبال نے خودی کی قوت تسخیر بیان کرنے کے بعد ان امور کی نشاندہی کی ہے جن کے سبب مسلمانوں کی خودی ضعیف ہو گئی ہے، یہ امور دو اجزا پر مشتمل ہیں۔ ایک افلاطونی نظریۂ اعیان جسے صوفیہ نے قبول کر کے ملت اسلامیہ میں عام کیا، جس کے نتیجہ میں نفی خودی اور نظریۂ وحدت الوجود جیسے محض فلسفیانہ مباحث نے زور پکڑا اور قوت عمل کم ہوتی گئی، دوسرے وہ شعرا جن کی شاعری یاس و قنوطیت اور زندگی سے فرار کا پیغام ہے، جو محض عیش کوشی اور موت سے دنیا کی حامل ہے اور جیسا

زندگی اور طلب و درد چاہ کا کوئی سامان نہیں ہے، بعض شعراء کے یہاں اگر گلی تعلیمات بھی ہیں، تو ان پر مستی صہبا اور لذت جسم و نظر کا ایسا ہوش ربا پردہ ہے جس نے شعر کی اصل حقیقت اور زندگی کے حقیقی تقاضوں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہ دی، لہٰذا اقبال نے ان دونوں پر کاری ضربیں لگائی ہیں، اقبال کے ان نظریات پر بحث کی بڑی گنجائش ہے، یہاں اس بحث کا موقع نہیں، لیکن اقبال کے اس خیال سے گریز کی گنجائش نہیں ہے کہ زندگی عمل کا نام ہے، ایسا عمل جو انسانیت کی حفاظت و بقا اور ترقی کا ضامن ہو، ان کے سارے کلام سے یہی درس ملتا ہے کہ:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کی اس تعلیم سے کون انکار کر سکتا ہے، اقبال کی تعلیم کی یہی وہ آفاقیت ہے جو ان کو تمام انسانوں کا شاعر بنا دیتی ہے۔

لیکن علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کو خاص طور سے مخاطب کیا ہے، اس لئے وہ انھیں بتاتے ہیں کہ خودی کی تربیت کیونکر ہو سکتی ہے، اس تربیت کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا ہے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی، اطاعت کا مطلب اس آئین کی اطاعت ہے جو اسے اس ذات کو ملا ہے، جس کی خودی کامل ہے اور اس ذات کی اطاعت ہے جس نے اس آئین پر عمل کر کے اور تربیت کے ذریعہ اپنی خودی کی تکمیل کر لی ہو، ضبط نفس سے مطلب ہر اس کام سے باز رہنا ہے جو اس آئین کے خلاف ہو، اور نیابت الٰہی کے مرحلہ میں پہونچ کر اس کے اندر وہ قوت تسخیر پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ کائنات پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔

اقبال نے اسرار خودی میں ہندوؤں کو بھی مخاطب کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہندو اپنی راہ سے ہٹا ہوا ہے اور مسلمان اپنی راہ سے، دونوں کو عشق و محبت کی جو تعلیم ان کے مذاہب سے ملی ہے ان سے وہ عملاً محروم ہیں، دونوں ہی اس زمین کو جنت نظیر بنانے کے اور اس راہ میں

مصائب برداشت کرنے کے بجائے زندگی اور عمل سے فرار کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اسی لئے وہ شیخ کی زبان سے برہمن کو خطاب کرتے ہیں:

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور   تو ز آزر من ز ابراہیم دور

اقبال کے جہادِ زندگی، تسخیرِ کائنات اور خودی کے نظریئے سے اور شاہین و عقاب وغیرہ کے بطور علامات استعمال کرنے سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وہ جہاد بالسیف کے ذریعہ مسلمانوں کو زمینوں پر قبضہ کرنے اور دوسری قوموں کو اپنا محکوم بنانے کی دعوت دیتا ہے، اس کی تائید میں وہ اقبال کا یہ نعرہ بھی پیش کرتے ہیں:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ان لوگوں نے یا تو اقبال کے نظریۂ خودی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اور یا ان کا تجاہل عارفانہ ہے۔

اس قول کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مسلمان ساری دنیا کو اپنا تابع فرمان بنا لیں، اقبال کی تعلیم آفاقی تعلیم ہے، انھوں نے اپنے وطن اور برادرانِ وطن کی محبت کے ساتھ تمام دنیا کے لوگوں سے محبت کرنا سکھایا ہے، لیکن عقلی طور پر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم پوری زمین کو اپنا وطن سمجھ لیں، اور اس کے سب بسنے والے انسانوں کو ایک ہی نسل قرار دیں، اور تمام جغرافیائی اور تاریخی حد بندیوں کو ڈھا دیں، وہ اس تعلیم کے لئے مسلمانوں کو اس لئے مخاطب کرتے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں، اس کے علاوہ مسلمانوں کے آخری پیغمبرؐ نے نسل و رنگ، ملک و قوم، اور اونچ نیچ کے تمام دنیاوی امتیازات عملاً ختم کر کے عدل کا ایک نمونہ بھی پیش کر دیا۔

اقبال نے اسرارِ خودی میں صاف آشکارا کر دیا ہے کہ جوع الارض کا جذبہ حرام ہے

آتش جانِ گدا جوعِ گدا ست   جوعِ سلطاں ملک و ملت را فناست

ایک گدا کی خودی کو رس کی بھوک جلادیتی ہے جب وہ کاسۂ گدائی اٹھاتا ہے، اور فتح ملک کا جذبہ ملک وملت دونوں کی خودی کو فنا کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ اقبال نے جہاں تربیت خودی کے مراحل بیان کئے ہیں، وہاں یہ نہیں کہا ہے کہ ایسا تربیت یافتہ شخص زمین کا بھوکا ہو جاتا ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اپنی خودی کو استوار کرنے والا عناصر پر حکمراں ہو جاتا ہے، وہ خود پختہ ہوتا ہے اور ہر خام کو پختہ کر دیتا ہے وہ دوسروں کو یقین کی وہ قوت عطا کرتا ہے، جس سے دلوں کے اوہام کے صنم ٹوٹ جاتے ہیں۔

پختہ سازد فطرت ہر خام را   از حرم بیروں کند اصنام را

وہ دنیا میں اخوت و محبت کا قانون جاری کر دیتا ہے۔ اس کی ذات انسانیت کا حاصل قرار پاتی ہے، وہ ہستی تمام انسانوں کے لئے باعث رحمت ہوتی ہے۔

اقبال نے جن ہستیوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے، وہ لوگ محبت کے پیکر تھے، وہ اپنی خودی کی بدولت مرجع خلائق تھے، ان کے آگے بادشاہوں کی بھی گردنیں جھکی تھیں! وہ خود صاحب فقر تھے لیکن سلاطین ان کے محتاج تھے، اور وہ عالم سے بے نیاز تھے، وہ بوریا نشین تھے، لیکن تخت و تاج ان کے آگے سرنگوں تھے، ان کی صحبت کیمیا اثر تھی، انھوں نے خزف کو صدف، قطرہ کو گوہر، ذرہ کو آفتاب، کاہ کو کہکشاں اور خاک کو زر افشاں بنا دیا، اسرار خودی میں جن لوگوں کے نام بطور مثال آئے ہیں، ان میں حضرات انبیاءؑ کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، سید علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، بایزید بسطامیؒ، شمس تبریزؒ مولانا رومؒ، حسام الحق ضیاء الدینؒ، بوعلی قلندرؒ اور امام شافعیؒ کے نام ہیں، ان میں سے ہر ایک کی زندگی جوع ارض اور ملوکیت کے دائرے سے خارج ہے اور ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو صوفی کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ شواہد ان لوگوں کی غلطی کی تردید کرتے ہیں، جو اقبال کی تعلیم سے جرمن ارض کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

اقبال مولانا رومؒ کو اپنا مرشد کہتے ہیں، لیکن انھوں نے بعض مغربی مفکرین کا مطالعہ کرکے ان کے افکار کی اصلاح کی ہے۔ اقبال کو جہاں بھی عمل و حرکت کا فلسفہ ملا، وہاں رجوع کیا، اور جو چیز ان کی طبیعت سے مطابقت رکھتی تھی اسے قبول کر لیا۔ جہاں کہیں نظر آئی اس میں راستی پیدا کی، تاہم اقبال اور بعض مغربی مفکرین میں فکر کی مماثلت محض اتفاقی کہی جا سکتی ہے، اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اقبال نے نکلسن کے نام لکھا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں:

> "میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدہ پر قلم اٹھایا تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہونچا تھا، نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں۔"

(نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء)

اقبال جس فلسفۂ خودی کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ تمام جدید فلسفیانہ نظریات سے آگاہی حاصل کریں اور جو فلسفہ ان کے نظریۂ خودی سے متصادم ہوا، اس کی خامی کو آشکارا کیا اور جہاں کوئی بے اعتدالی نظر آئی اس میں اعتدال پیدا کیا، اس کے بغیر اقبال کا فلسفۂ خودی پورے زور و قوت کے ساتھ ذہنوں میں نافذ نہیں ہو سکتا تھا، انھوں نے برگساں کے نظریۂ زمان سے جب آگاہی حاصل کی تو اس میں ان کو جزوی حقیقت نظر آئی، برگساں نے اپنے تصور زمان کو پیش کرکے دہریت کی تبلیغ کی، اس کے علاوہ برگساں کا نظریۂ زمان خودی کو ضعیف بناتا ہے، اس لئے اقبال کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے وقت کو دیکھیں اور ایسا نظریہ پیش کریں جس سے خودی کو تقویت

حاصل ہو، کیونکہ ہر وہ چیز جو خودی کو ضعیف کرنے والی ہے، وہ ان کے نزدیک غیر حقیقی ہے حقیقت خودی کے مترادف ہے، اقبال کو اپنے نظریۂ زمان کی تشکیل میں دو اسلامی اقوال سے بھی معاونت حاصل ہوئی، ایک تو خود حدیث قدسی جو لا تسبوا الدھر کے مضمون کی حامل ہے، اور دوسرا قول امام شافعیؒ کہ الوقت سیف۔

میں فلسفہ کا طالب علم نہیں ہوں، اس لئے اس مسئلہ کی فلسفیانہ توجیہ کی توقع مجھ سے بے سود ہے، البتہ مسئلہ کو جس طرح میں نے سمجھا ہے اسے اختصار کے ساتھ یہاں پیش کر رہا ہوں۔

برگساں دہر کو اصل حقیقت تصور کرتا ہے، اس کے نزدیک اس کے سوا کوئی دوسری حقیقت وجود نہیں رکھتی، تغیر اور ارتقاء اس کی ماہیت میں داخل ہیں، زمان یا وقت مکان سے الگ شے ہے، برگساں نے وقت کو ابدی اور اصل حقیقت قرار دے کر خدا کے وجود کا انکار کر دیا، اقبال نے وقت کو ابدی تو تسلیم کیا، لیکن اس تصور کو توحید کا رنگ دے دیا۔

وقت کا ایک عام تصور وہ ہے جس کے تحت اسے روز و شب، ماہ و سال اور امروز و فردا کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے، یعنی وقت عارضی اور قابل تقسیم ہے، دوسرا تصور حدیث قدسی کی رو سے یہ ہے کہ وقت غیر منقسم ہے، دونوں تصورات کے اثرات اعمال پر الگ الگ مرتب ہوتے ہیں، پہلے تصور کے مطابق روز و شب اور ماہ و سال سے وقت کی تخلیق ہوتی ہے، دوسرے تصور کے مطابق روز و شب اور ماہ و سال کی تخلیق وقت سے ہوتی ہے، پہلے تصور کا تعلق انسان کے جسمانی مقتضیات سے ہے، دوسرے تصور کا تعلق انسان کی روحانی ضروریات سے ہے اور اس تصور کے

تحت اس کی جسمانی ضروریات اس کے روحانی مقتضیات کے تابع ہوجاتی ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے کا تعلق اِس دنیا سے ہے جو فانی ہے اور دوسرے کا تعلق زمان سے ہے، جو ازلی اور ابدی ہے، جسم کا تعلق اِس دنیا سے ہے اور روح کا تعلق زمان سے ہے، وہ لوگ جو امروز و فردا کے اسیر ہیں، ان کی نظر کوتاہ ہے، وہ صرف جسمانی آسودگی کے درپے ہیں، ان کے سود و زیاں کا پیمانہ الگ ہے، وہ عارضی اور مادی مفاد کے لئے روح کی ضرورت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس لئے ان کے اعمال خودی کو ضعیف بناتے ہیں، ان کے مقاصد پست ہوتے ہیں اور وہ انسانیت کے اعلیٰ جوہر سے ناآشنا ہوتے ہیں، اس کے برعکس جو زمان کے تسلسل کو ابدی اور غیر منقسم سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک روح کے تقاضوں کی تکمیل اولیت کا درجہ رکھتی ہے، ان کی مادی ضروریات بھی ان کے روحانی تقاضوں کے تابع ہوتی ہیں، ان کے مقاصد میں بلندی ہوتی ہے اور ان کی خودی بھی بلند اور مستحکم ہوتی ہے، ان کے سود و زیاں کا پیمانہ دوسرا ہوتا ہے، ان کی زندگی میں سکون یا ٹھہراؤ نہیں آنے پاتا، کیونکہ حقیقت لمحاتی یا عارضی نہیں ہے، ابدی حقیقت نسلِ انسانی سے مسلسل عمل کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ انسانیت ہمیشہ ارتقا پذیر رہے، جمود خودی کی موت ہے۔

برگساں نے اگرچہ وقت کو غیر منقسم قرار دیا لیکن اس سے اس نے جو نتیجہ اخذ کیا اس سے کوئی عملی فلسفہ وجود میں نہیں آسکتا جس کے ذریعہ انسان کی خودی تربیت پاسکے، اس نے توحید کا انکار کرکے اپنے فلسفہ کو بے جان اور بے مقصد بنا دیا، وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ زمانہ، عمل اور توحید میں کامل مطابقت ہی سے خالص خیر وجود میں آسکتا ہے۔ اس لئے اقبال نے مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ وہ دوش و فردا کے اسیر نہ ہوں اور اپنے مقاصد کو بلند کرکے عمل کے ذریعہ اپنی خودی کو استوار کریں۔

آخر میں کتاب ایک رقت آمیز دعا کے ساتھ ختم کی گئی ہے، یہ دعا بھی اقبال کی شخصیت اور

عصر حاضر کی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔

علامہ اقبال اپنے فلسفیانہ افکار کو شعر کے بجائے صرف نثر میں بیان کر سکتے تھے۔ ان کا مقصد بھی شاعری کرنا نہیں، بلکہ عالم انسانیت کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنا پیغام پہونچانا تھا، لیکن اس پیغام کے لئے انھوں نے وسیلہ شعر کو بنایا۔ وہ خود کہتے ہیں:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　　بت پرستی بت گری مقصود نیست

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اشعار میں جو تاثیر ہے، وہ نثر میں ممکن نہیں۔ اور یہی اقبال کے ایک عظیم شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ اقبال کے کلام کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے وسیع علم کی ضرورت ہے اور خصوصاً فلسفہ ہائے جدید پر پوری نظر رکھنے کی ضرورت ہے لیکن اقبال کی یہ سحر کاری ہے کہ ان کے اشعار پڑھنے کے ساتھ ہی دل میں اتر جاتے ہیں ایک نشتر ہے جو اپنا کام کر جاتا ہے۔ فلسفہ کے ایسے دقیق مسائل کو اس آسانی کے ساتھ بیان کر جانا کہ وہ فلسفہ ہی نہ معلوم ہوں صرف اقبال کا کام ہے۔

اقبال کی شاعری عام روایتی شاعری نہیں ہے، اگرچہ ان کے کلام میں گل و بلبل، وامق و عذرا، شیریں و فرہاد وغیرہ اردو فارسی شاعری کے سبھی علائم موجود ہیں، لیکن اس نے ان سب سے کام دوسرا لیا ہے، اقبال نے دوسری علامتیں بھی اختراع کر لی ہیں مثلاً شاہین و عقاب، نرگس و باز وغیرہ۔ لیکن ان تمام علامتوں کے استعمال میں کہیں اجنبیت نہیں محسوس ہوتی۔ اقبال کی استعمال کردہ نئی علامتیں یا پرانی علامتوں کے نئے مفاہیم زبان و ادب سے کلیۃً ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اس طرح اقبال نے جہاں اپنے افکار سے ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے، وہاں اردو و فارسی زبان و ادب کو نئے امکانات سے روشناس کر کے انھیں وسیع تر اور حسین تر بنانے کی کوشش کی ہے۔

امام الحرمین عبد الملک جوینیؒ

از

شاہ نصر احمد پھلواری، معاون رفیق دارالمصنفین

چوتھی پانچویں صدی ہجری کا زمانہ اس حیثیت سے اسلامی تاریخ کا عہد زریں قرار دئے جانے کا مستحق ہے کہ اس میں نہ صرف سیاسی غلبہ و تسلط کے اعتبار سے دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اسلام کا پرچم شان و شوکت سے لہرا رہا تھا، بلکہ مختلف علوم و فنون، خاص طور پر فلسفہ و کلام اور طب و حکمت کی جتنی حیرت انگیز ترقی اس عہد میں ہوئی، اس کی نظیر دوسری صدیوں میں خال خال ہی ملتی ہے، ارباب فضل و کمال کی کثرت سے دنیائے علم مہبط خیر و برکت بنی ہوئی تھی، ابونصر فارابی، حافظ ابونعیم اصفہانی، حافظ ابوبکر بیہقی، شیخ بوعلی سینا، عمر خیام، ابوریحان بیرونی، امام غزالی اور ابن ہیثم جیسی یگانہ روزگار اور نادرۂ عصر شخصیتیں اسی عہد میں آسمان علم و فن پر مہر و ماہ بن کر چمکیں، ان میں امام الحرمین عبد الملک جوینی، اپنے گوناگوں علمی فضائل و کمالات، غیر معمولی جلالت مرتبت اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے اقران و اماثل میں عدیم النظیر تھے، عرصہ تک حرمین شریفین میں ان کا حلقۂ درس مرجع عام بنا رہا، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے فیضان درس سے بیک وقت چار سو طلبہ بہرہ یاب ہوتے تھے، حرمین کے منصب افتاء پر فائز ہونے کے باعث امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہوئے، سلاطین عہد ان کی بارگاہ علم میں سر عقیدت خم کرنا مایۂ صد افتخار خیال کرتے تھے، لیکن بایں ہمہ شہرت و عبقریت اور علوئے شان، ابھی تک محققین نے

ان کے ساتھ شایانِ شان اعتنا نہیں کی ہے اور راقم سطور کے علم و واقفیت کے مطابق اردو میں غالباً ان کی کوئی مستقل سوانح عمری بھی نہیں لکھی گئی ہے، چنانچہ رجال و تراجم کی کتابوں میں منتشر طور پر امام موصوف کے جو حالات و کمالات ملتے ہیں، پیش نظر مضمون میں ان ہی کی خوشہ چینی سے ایک مرقع تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے

نام و نسب | اصل نام عبد الملک، کنیت ابو المعالی، ضیاء الدین اور امام الحرمین لقب ہے[1] امام نسلاً عرب ہیں، عماد الدین ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان کا نسبی تعلق قبیلہ سنبس سے ہے[2] سنبس کے بارے میں امام الحرمین کے والد ماجد نے فرمایا:

نحن من العرب من قریۃ   ہم عرب کے اس قریہ سے تعلق رکھتے

یقال لھا سنبس[3].   ہیں جسے سنبس کہا جاتا ہے.

اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ سنبس کسی جگہ کا نام ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سنبس کوئی شہر یا قریہ نہیں ہے، بلکہ عرب کے مشہور قبیلہ طے کی ایک شاخ ہے، غالباً امام کے والد سے روایت کرنے والے نے قبیلہ کی جگہ قریہ کہہ دیا ہے، یا بعد کے کسی راوی سے غلطی ہو گئی ہے، قبیلۂ طے محتاج تعارف نہیں ہے، عہد جاہلیت کے نامور فیاض حاتم کی بدولت اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے، عہد اسلام تک ابو سلیمان داؤد، ابو الحسن علی بن حرب جیسے ارباب فقہ و حدیث ابو تمام حبیب بن اوس جیسا شہرۂ آفاق شاعر و ادیب اور اسی طرح دوسری اہم شخصیتیں طے سے تعلق رکھتی ہیں، اس قبیلہ کا مورث اعلیٰ جلہمہ بن ادد تھا جس کا

---

[1] یہاں نسب نامہ کی تفصیل نظر انداز کر دی گئی ہے، جنھیں دلچسپی ہو اس کے لئے ملاحظہ کریں طبقات ج ۳ ص ۲۰۸ تبیین کذب المفتری فیما نسب الی ابی الحسن الاشعری ، ۲۵۰

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۲، ۱۲۸ [3] طبقات ج ۳ ، ۲۰۸،

عرفی نام طائی تھا، اس کی شاخ سنبس بھی تاریخ میں معروف و مشہور ہے، علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں اس کی تصریح کی ہے اور بتایا ہے کہ شعراء اور اہل علم و فضل کی ایک جماعت اس قبیلہ سے نسبت رکھتی ہے[۱]۔

سنبس بن معاویہ بن جرول قبیلۂ طے کا ایک شخص تھا، اس کی نسل سنبسی کہی جاتی ہے[۲]

صحابی رسول حضرت رافع بن ابی رافع جو سنہ ۸ھ کے سریہ ذات السلاسل میں شریک تھے وہ بھی سنبسی تھے[۳]۔

وطن | امام کے اسلاف نے نقل وطن کے بعد خراسان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی خراسان کا شہر 'جوین' امام کا مولد و مسکن ہے، یہ شہر بسطام سے نیشاپور جاتے ہوئے دو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا، اسے فارسی میں 'گویان' کہتے تھے جو عربی میں 'جوین' ہو گیا[۴]،

قدیم خراسان کا یہ شہر بڑا مردم خیز تھا۔ ابو عمران موسیٰ بن العباس جوینیؒ جیسے محدث اسی خاک سے اٹھے۔ جنھوں نے طلب حدیث میں دمشق، کوفہ، مصر اور رملہ کا سفر کیا اور اس زمانہ کے نامور محدثین سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، جوین اپنے باغوں، چشموں، نہروں اور قدرتی مناظر کی دلفریبی کی وجہ سے مضافات نیشاپور میں وادی نشاط کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔ امام الحرمین اور ان کے خانوادۂ علم و کمال کا مولد و مسکن ہونے کی وجہ سے اس شہرت میں اور چار چاند لگ گئے۔

شیخ ابو محمد عبداللہ جوینیؒ | رکن الاسلام شیخ ابو محمد عبداللہ جوینی امام الحرمین کے والد تھے انھیں تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ ابوبکر عبداللہ بن احمد القفال المروزی

۱؎ کتاب الانساب ج ۲، ۳۶۲ ۲؎ تاج العروس ج ۴، ۱۶۸ ۳؎ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ج ۱، ۴۹۴ اسد الغابۃ ج ۲، ۱۵۷ ۴؎ معجم البلدان ج ۳، ۱۸۱، روضات الجنات ۴۲۳، تقویم البلدان ۴۵۰، مراصد الاطلاع ج ۱، ۳۴۵

(م ۳۸۷ھ) سے حدیث کی تحصیل کی، انھیں اپنے استاد سے ایسی مناسبت تھی کہ جب نیشاپور میں درس گاہ قائم کی تو در و دیوار سے استاد کا رنگ جھلکتا تھا، ان کے ذریعہ خراسان میں شیخ قفال کے مسلک کی خوب ترویج و اشاعت ہوئی[1]

۴۰۳ھ میں جب وطن واپس آئے تو نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کی، کسب معاش کے لئے کپڑے بننے کا کام اختیار کیا، چونکہ فقہ و اصول اور تفسیر و حدیث میں کمال حاصل تھا اس لئے آپ کے گرد ارباب طلب و شوق کا ہجوم ہونے لگا اور بہت جلد ان کی اقامت گاہ مرکز علم و دانش کی حیثیت سے پورے خراسان میں مشہور ہوگئی اور افتاء و تدریس میں ان کے محاسن و کمالات کی شہرت دور دور تک پہونچی، سبکی جیسے صاحب نظر نے لکھا ہے:

وکان ماهرًا فی القاء الدروس	وہ تدریس میں مہارت تامہ رکھتے تھے

ان علمی کمالات اور تدریسی محاسن کے ساتھ وہ اوصاف حسنہ سے آراستہ اور حسن سیرت و کردار سے مزین تھے۔ ہر تذکرہ نگار ان کی اس علمی جامعیت اور اخلاقی کمال کا معترف ہے، معاصرین اپنے ہم چشموں کے فضل و کمال کا مشکل سے اعتراف کرتے ہیں، لیکن یہاں وہ بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ان کے علم و اخلاق کا مبالغہ سے ذکر کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ "اگر انبیاء اور رسل کی آمد کا سلسلہ ختم نہ ہوچکا ہوتا تو ان کو نبوت کا مرتبہ حاصل ہوتا"[2] ابوالقاسم بن منصور امشؒ کی مجلس میں جب شیخ جوینیؒ کا ذکر آیا تو وہ ان کی مدح میں اس طرح گویا ہوئے:

من الطف اخلاقه واحسنها	ان کے حسن سیرت کا لطیف تر نکتہ
انه رجل رکین الجملة	پہلو یہ ہے کہ وہ جامع ترین آدمی تھے

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۴۔ [2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳۔

وافر العقل جاد فی امرہ کلہ	نہایت دانشور، تمام امور میں معتدل
لا تری فیہ شیئًا من الرعونۃ	ان میں رعونت مطلق نہیں تھی اطلاکر
لما واقہ ظاہرہ باطنہ وموافقۃ	ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا، اور اس
سرہ علانیتہ و زھدہ فی	ریاست سے بے رغبتی تھی: جو ان کو
الریاسۃ التی صارت تطلبہ وھو	ڈھونڈتی تھی، وہ ان کی طرف لپکتی
یھرب منھا وترغب فیہ وھو	تھی لیکن وہ اس سے گریز کرتے تھے،
یبعد عنھا [۱]	

اپنے معتقدات کے لحاظ سے وہ اشعری تھے، شیخ جوینی کی تصانیف میں ان کی تفسیر ان کی مفسرانہ عظمت کا شاہکار ہے [۲] تفسیر کے ساتھ انھیں ادب میں بھی کمال حاصل تھا، ادب کی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے پائی تھی جس میں شیخ کی رفعت شان کا اندازہ اس کے کیا جا سکتا ہے کہ ابوالحسن علی الباخرزی ان کے فیض صحبت سے ادیب اور شاعر بنا، باخرزی نے ان سے اپنی تعلیم و تحصیل کے بارے میں لکھا ہے:

قد اختلفت الیہ فصارت	میں ان کی خدمت میں بارہا حاضر
دھم ایامی بمجالستہ غررًا	ہوا، ان کی ہم نشینی سے میری تیرہ زندگی
وملأت جیبی وحجری من	کا نور ہو گیا، میرا دامن طلب ان کی
حسن عبارتہ دررًا۔	گفتگو کے درہائے شہوار سے بھر گیا۔

لیکن حدیث، فقہ اور تفسیر کے ساتھ اشتغال نے شیخ کو ادبی خدمات کا موقع نہیں دیا، وہ علوم دینیہ کو ادب پر ترجیح دیتے اور ادب سے انتساب پسند نہیں کرتے تھے، ابوالحسن باخرزی نے

---

[۱] تبیین ص ۲۵۸ [۲] ابن خلکان نے لکھا ہے وصنف التفسیر الکبیر المشتمل علی انواع العلوم [۳] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۱

ان کے مرثیے کے دو شعر نقل کئے ہیں، جو انھوں نے کسی دوست کے انتقال پر کہے تھے
کا بیان ہے کہ شیخ جوینی نے نہ مجھے اپنے کسی شاگرد کو اپنے اشعار میں سے کچھ بھی نقل کرنے
اجازت دی، ورنہ اس میدان میں ان کی جولانی فکر اور حسن بیان کا اندازہ ہوتا، اور
سے مجھے ان کے لکھے ہوئے مرثیے کے دو شعر مل گئے ہیں جن سے ان کی مہارت کا اندازہ

رأیت العلم بکاءً حزینا — ونادی الفضل والحزنا دوینا
سألتهما بذاك فقیل اودی — ابو سهل محمد بن موسیٰ

علم کو میں نے گریاں و طول پایا۔ کمال و فضل اس حادثہ پر چیخ چیخ کر رو دئے۔
میں نے ان دونوں سے اس کی وجہ پوچھی۔ تو معلوم ہوا کہ ابو سہل محمد بن موسیٰ مدفون ہو گئے

شیخ جوینی کے سفر حج میں شیخ ابو القاسم قشیری، احمد بیہقی، ابو القاسم فورانی اور دوسرے
ہمراہ تھے، ان لوگوں نے حجاز کے بعد بغداد کا سفر کیا اور حجاز و بغداد کے محدثین سے
کی اجازت حاصل کی۔ امام کے چچا ابو الحسن علیؒ کا لقب شیخ الحجاز تھا، ان کے شیوخ
کی تعداد شیخ جوینیؒ کے شیوخ سے زیادہ ہے، اور تصوف میں ان کی ایک تصنیف "کتاب
کا ذکر ملتا ہے، یہ کتاب مصنف کے دست خاص کی لکھی ہوئی علامہ سمعانی کو دستیاب

امام کی ولادت اور تعلیم | امام الحرمین کی ولادت شنبہ کے دن ۱۸ رمحرم ۴۱۹ھ (مطا
۱۰ رفروری ۱۰۲۸ء) کو ہوئی، امام نے جب ہوش سنبھالا تو نیشاپور و بغداد کی جامع
کے علاوہ خود اپنا گھر ایک مرکز علم نظر آیا، جہاں دور دور کے تشنگان علم جمع تھے، ا
اپنے والد ہی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور بہت جلد تحصیل علم کی منزلیں طے ہو
وہ اپنی خداداد ذہانت و فطانت کی بنا پر علمی غوامض کا ادراک بہت جلد کر لیتے تھے

لہ وفیات الاعیان، ۱۹۲ کہ روضات الجنات، ۲۴۴ کہ کتاب الانساب ۱ ص ۲۴۴ شذرات ج ۳ ص

تعلیم کی رفتار عام متعلمین سے تیز تھی۔ والد کو ان کی اہلیت وصلاحیت پر بے حد مسرت ہوتی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مستقبل میں یہ متعلم بزم علم ودانش کا صدر نشین ہوگا، اور ایسا ہی ہوا، ابتدائے شباب ہی میں وہ جملہ علوم نقلیہ وعقلیہ کی تحصیل سے فارغ ہوگئے اور والد ماجد کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی صلاحیت کا بھی تذکرہ ہونے لگا، تذکرہ نویس کا بیان ہے کہ

واشتہر فی صباہ وضربت | کمسنی ہی میں اس طرح مشہور ہوگئے
باسمہ الامثال۔ | کہ ان کا نام ضرب المثل بن گیا۔

والد کی جانشینی | یہ شہرت والد کے ذیل وضمن میں نہ تھی، بلکہ اپنے ذاتی کمال کی بنا پر تھی، ذیقعدہ ۴۳۸ھ (مطابق ۱۰۴۷ء) میں والد کا انتقال ہوا، اس وقت ان کی عمر محض ۱۹ برس کی تھی، لیکن اپنے علم وکمال کی بنا پر درس وافتا میں ان کے جانشین قرار پائے،[1] ان کی اعلیٰ تدریسی صلاحیت کی بنا پر والد کے قائم کردہ مرکز علم کو پہلے سے بھی زیادہ آب وتاب حاصل ہوئی اور وہ تمام طلبہ جو شیخ جوینی سے اکتساب فیض کر رہے تھے، اب امام الحرمین کی بساط درس کے حاشیہ نشین ہوگئے، شیخ جوینی کی وفات کی خبر مشہور ہوئی تو محدث وفقیہ ابو القاسم عبد الرحمن فورانی (م ۴۶۱ھ) نیشاپور آئے، وہ الابانۃ اور العدۃ کے مصنف کی حیثیت سے اس عہد کے فقہاء اور اصولیین میں بڑا مقام رکھتے تھے، الابانۃ کی شرح در شرح تتمۃ الیتیمۃ مدت دراز تک اصفہان میں شافعی فقہ وافتاء کا مستند ترین ماخذ رہی ہے[2] امامؒ کے والد شیخ جوینیؒ اور محدث فورانیؒ دونوں نے قفال مروزی سے درس حدیث لیا تھا، اس لئے نیشاپور میں شیخ جوینیؒ کے انتقال کے بعد درس وافتاء کی بزم میں جو خلا پیدا ہوگیا تھا، اسے پر کرنے کے لئے بظاہر

---

[1] روضات الجنات: ۴۳۶ [2] کشف الظنون .....

ان سے بہتر کوئی شخصیت نظر نہ آتی تھی، وہ نیشاپور آئے تو لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا مگر امام الحرمین نے اپنے والد کے رفیق درس کے اس سفر کو قصد تعزیت پر محمول کیا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ کم سنی کی بنا پر انھیں اپنے والد کی مسند نشینی کا اہل نہیں سمجھا جاتا اور محدث نورانی کی طرف نظریں اٹھ رہی ہیں تو ان سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا، ان کے انداز گفتگو، قوت استدلال اور نتائج بحث کو دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے، نیشاپور کے تمام علمی حلقوں نے امامؒ کو والد کی جانشینی کا مستحق قرار دیا، خود محدث نورانی ان کے علم اور تفقہ کا خاموش اعتراف کرتے ہوئے مرو واپس گئے[1] لیکن بایں ہمہ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور ان دونوں صاحبوں کے درمیان ناچاقی کی روایتیں کتابوں میں درج ہو گئیں، امام الحرمین کی ایک کتاب "نہایۃ الطلب فی درایۃ المذہب" ہے، اس میں بعض مسائل کے ذکر میں فورانی کے چند اجتہادات کا ذکر آگیا ہے اور امامؒ نے ان سے اختلاف کیا ہے اور ان کو غیر مصیب کہا ہے، لیکن تسامحات فورانی کے تذکرہ اور ان پر بحث کے وقت ان کے نام کی تصریح نہیں کی ہے، لوگوں نے اس سے غلط مفہوم پیدا کر لیا کہ ان دونوں میں علمی چشمک تھی، اور اس سے فورانی کی تنقیص مقصود تھی، اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امام الحرمینؒ اپنے والد کی حیات میں عبد الرحمن فورانی کے درس میں گئے لیکن ان کی کمسنی کی وجہ سے فورانی نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی، یہ دیکھ کر امام ان کے درس سے اٹھ کر چلے آئے[2]

اس واقعہ کی بنا پر مورخین کو غلط فہمی ہو گئی اور بات کہاں سے کہاں جا پہنچی، اگر اتنی بات ذہن میں ہو کہ امام الحرمین جیسے مایۂ ناز عالم اور صاحب ورع و تقویٰ

---

[1] طبقات الشافعیہ للمصنف ۵۶ [2] مرآۃ الجنان ج ۳، ۱۳۷، ابن خلکان ج ۱، ۵۰۹، البدایہ ج ۱۲، ۱۸

بزرگ، جن کی عظمت ساری امت کو تسلیم ہے، ان سے اتنی رکیک اور معیارِ اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں ہو سکتی، تو ساری روایات پادر ہوا ثابت ہونگی امام الحرمین کو شیخ فورانی کی تذلیل مقصود ہوتی تو ان کا نام کیوں حذف کر دیتے، اور صرف "قال بعض المصنفین" یا " فی بعض التصانیف " پر اکتفا کیوں کرتے

در اصل امام الحرمین نا صرف محدث و مفسر نہیں تھے، وہ فلسفہ وکلام سے بھی آگاہ تھے، اور فقہ پر ان کی گہری نظر تھی، اس لئے نقل کے ساتھ عقل اور روایت کے ساتھ درایت کو بھی پیش نظر رکھتے تھے، اس بنا پر اجتہاد و استنباط مسائل میں انکی نظر عمیق تھی اور شیخ ابوالقاسم فورانیؒ پر تفقہ کے ساتھ نقل و روایت کا رنگ غالب تھا اس لئے یہ سمجھنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ اختلاف رائے، اختلاف فکر و نظر کی بنا پر ہے، علامہ سبکی نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے، ان کے نزدیک "ان تسامحات کی نشان دہی سے امام کا مقصد فورانی کی تنقیص ہرگز نہیں ہے، وہ نقل روایت میں ان پر غلط بیانی کا الزام بھی نہیں لگاتے، بلکہ بحیثیت محقق، امام ادراک غوامض اور تجزیۂ مسائل کے خواہاں تھے، اور فورانی کثرت روایت اور ظاہر عبارت سے استدلال و استنباط کرتے تھے، نقطۂ نظر کے اس فرق کی وجہ سے دونوں کے نتائج تحقیق میں اختلاف ناگزیر ہے امام الحرمین نے ان مختلف فیہ مسائل کی توضیح اپنے انداز سے کی ہے اور شیخ فورانیؒ کی غلطی کی وضاحت کر دی ہے، علامہ سبکیؒ نے لکھا ہے کہ:

هذا اقصى ما تمد الامام بقوله[1] امام کا مقصود صرف اتنا ہی تھا۔

اس پورے معارضے میں امام الحرمینؒ کی سیرت کا یہ پہلو بے حد دلکش ہے کہ انھوں نے

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۳، ۲۲۵۔

اپنا روئے سخن مسائل کی طرف رکھا، کبھی ذاتیات کو زیر بحث نہیں لائے، اور نہ فریق کا کسی جگہ نام لیا، اس سے امامؒ کے اخلاص نیت کا پتہ چلتا ہے، بہرحال اس بحث و گفتگو نے امام کی قابلیت نمایاں کر دی اور وہ اپنے والد کے جانشین قرار پائے اور پوری یکسوئی کے ساتھ درس و افتاء میں منہمک ہو گئے، لیکن اپنی شہرت و وجاہت کے باوجود تحصیل علم کے ذوق نے انھیں اس عہد کے مختلف اکابر کی علمی مجلسوں تک پہنچایا۔

نیشاپور

حبذا شہر نیشاپور کہ در روئے ارض
گر بہشت ست خود اینست وگرنے خود نیست

نیشاپور اب بھی ایران کا قابل دید شہر ہے، لیکن ایک زمانہ میں وہ یکتائے روزگار سمجھا جاتا تھا، اور شعراء و ادباء اس کے قصیدے پڑھتے تھے۔ علاء الدین عطا ملک جوینی نے اس کو زہرۂ ارض قرار دیا ہے، شرف و برتری کے لحاظ سے اسے انسان سے تشبیہ دی کہ معدن علوم و فنون ہونے کی وجہ سے یہ شہر انسان کی طرح لائق اکرام ہے[1]، ابو العباس محمد بن عیسیٰ شاعر نے اسے مردم چشم قرار دیا ہے، وہ کہتا ہے:

وما ذا یصنع المرء ببغداد و کوفان
و نیسابور فی الارض کالانسان فی الانسان[2]

(آدمی بغداد اور کوفہ کو کیا کرے گا، نیشاپور زمین میں ایسا ہے جیسے کہ انسان کے اندر پتلی)

اس عہد کا نیشاپور کسی طرح بغداد سے کم نہیں تھا، مختلف ارباب علم و فضل وہاں مجتمع تھے یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ یہ مشہور ہے کہ دنیا کے بڑے شہر تین ہیں، نیشاپور جو مشرق

[1] تاریخ جہاں کشا ج ۱ ص ۱۳۳ [2] تتمۃ الیتیمۃ ج ۲ ص ۹۷

دروازہ ہے، دمشق جو مغرب کا دروازہ ہے، موصل جو مشرق و مغرب کی گذرگاہ تھی[1]
اس جغرافیائی اہمیت کے ساتھ اس کی یہ تاریخی اہمیت بھی قابل لحاظ ہے کہ چوتھی صدی کے
وسط میں عہد اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ وہیں قائم ہوا، اس کی تعمیر کا فخر ناصر الدولہ
ابوالحسن محمد بن ابراہیم سیمجوری (م ۳۷۲ھ) کو حاصل ہے[2]، ناصر نے ابوبکر محمد بن فورک
(م ۴۰۶ھ) کی تدریس کے لئے یہ مدرسہ قائم کیا[3]۔ ابوبکر محمد بن فورک متکلمین اشاعرہ میں بڑی
حیثیت رکھتے ہیں۔ نیشاپور میں امام ابوالحسن اشعری کے مسلک کی ترویج انھیں کی کوششوں کا
نتیجہ ہے اور علوم القرآن اور فقہ میں سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ عراق اور ری
میں مناظروں کی وجہ سے ان کا سکون ختم ہوگیا، تو اہل نیشاپور کی قدر شناسی نے انھیں
نیشاپور پہونچایا، ناصر الدولہ نے ان کے قیام اور درس کے لئے ایک عمارت بنوادی،
جسے تاریخ اسلام میں اولین اصطلاحی درسگاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس سے پہلے کسی
اصطلاحی مدرسہ کے وجود کا سراغ نہیں ملتا ہے، بلاشبہہ نیشاپور میں درس حدیث و قرآن کا
سلسلہ جاری تھا، مگر اس کے لئے مساجد و زاویے اور اکابر علماء کے علمی حلقے مخصوص تھے،
مقریزی نے اسلامی مدارس میں اولیت کا تمغہ بیہقیہ کو دیا ہے، علامہ شبلی بھی اس تحقیق کے
متفق ہیں، لیکن ان کے تلمیذ رشید علامہ سید سلیمان ندوی نے زین الاخبار کے حوالہ سے
بن فورک کے مدرسہ کو بیہقیہ سے قدیم بتایا ہے، علامہ سبکی نے بھی یہی لکھا ہے، امام الحرمین
کے عہد میں یہ موجود نہیں تھا، مگر دوسرے مدارس باقی تھے، جن میں قابل ذکر یہ ہیں؛
مدرسہ سعدیہ جو سلطان محمود غزنوی کے بھائی نصر بن سبکتگین نے اپنی امارت
نیشاپور کے زمانہ میں بنوایا تھا اور امام ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد کا مدرسہ، جس کے نامور فرزند

---

[1] معجم البلدان ج ۸، ۹۹ [2] زین الاخبار ۵۲ [3] طبقات ج ۳، ۵۲ شذرات الذہب ج ۳، ۱۸۱۔

قاضی ابوالطیب طبری اور ابوالقاسم قشیری ہیں، اور ابوسعید اسمٰعیل بن علی مثنیٰ استرابا
مدرسہ۔ لیکن ان تمام مدارس میں خاص شہرت اور اہمیت مدرسہ بیہقیہ کو حاصل ہے؟
کے مدرسہ کے بعد وجود میں آیا تھا، اس لئے تاریخ مدارس میں یہ دوسرا مدرسہ شمار ہوتا
اس کی مرکزیت نے مقریزی کو اسے اولین مدرسہ کہنے پر مجبور کیا:

والمدارس مما حدث	اسلامی تاریخ کی نئی چیزوں میں مدارس
فی الاسلام ولم تکن تعرف	کی تعمیر بھی ہے، صحابہ وتابعین کے
فی زمن الصحابة ولا التابعین	زمانہ میں لوگ اس سے واقف نہیں
انما حدث عملها بعد اربع	تھے، ہجرت کی چار صدیاں گذرنے
مائة من سنی الهجرة واول	کے بعد اس کا عمل شروع ہوا، اسلام
من حفظ عنه انه بنی مدرسة	میں سب سے پہلے اہل نیشاپور نے
فی الاسلام اهل نیشا بورفبنیت	مدرسہ قائم کیا اور وہاں مدرسہ بیہقیہ
بها المدرسة البیهقیة[1]	بنایا گیا۔

شیوخ امام الحرمین | اس مدرسہ میں طلبہ کے لئے سب سے زیادہ پرکشش شخصیت استاذ ا
عبدالجبار الاسکاف الاسفرائینی کی تھی، جو اپنے عہد کے مشہور فقہاء و متکلمین میں شمار ہوتے
انھوں نے مناظرہ، اصول فقہ اور علم کلام میں اہم کتابیں تصنیف کیں، وہ مدرسہ بیہقیہ
علم کے صدر نشین تھے اور امام دوریۃ البیہقی ان کے نام کا جز تھا، ابن عساکر نے لکھا۔

شیخ کبیر جلیل من افاضل العصر	فضلائے روزگار میں ایک جلیل القدر
ودرس الفقهاء والمتکلمین	فاضل اور مشہور فقہاء ومتکلمین کے

[1] خطط مقریزی ج ۴، ۱۹۲

من اصحاب الاشعری. سرخیل تھے.

تدریس کے خصوصی مشاغل کے ساتھ زہد و فقر اور ورع و تقویٰ میں بے نظیر تھے.

له اللسان والنظر فی الکلام الذی	درس و افتا میں ان کا قول اور ان کی
والتقدم فی الفتوی مع لزومه	بصیرت مستند تھی، ساتھ ہی ساتھ
طریقة السلف من الزهد	اسلاف کے طریقہ فقر و زہد کی خصوصیات
والفقر والورع کان عدیم النظیر	کے بھی حامل تھے، اپنے عہد میں
فی وقته ما رای مثله [1]	بے نظیر تھے.

علم کلام اور اصول میں امام الحرمین کے شیوخ میں اسفرائینی بھی ہیں، جن کے حلقۂ درس میں وہ پابندی سے شریک ہوتے تھے، والد کے بعد جس کا علمی پرتو امام پر پڑا وہ اسفرائینی ہیں امامؒ نے اصول و کلام کا درس انھیں سے لیا اور ان کی درسی تقریریں کئی جلدوں میں انھوں نے مرتب کیں، خود فرماتے ہیں:

کنت علقت علیه فی	میں نے ان کے پاس کلام و عقائد
الاصول اجزاء متعددة [2]	کی تقریروں کے متعدد مجلدات
	تیار کئے تھے.

چونکہ مدرسہ بیہقیہ کو شہرت و عظمت عبدالجبار الاسفرائینی کے درس سے حاصل تھی اور امام ان کی مجلس میں ایک عرصہ تک بالالتزام شریک ہوتے رہے، اس لئے بعض لوگوں نے امامؒ کو مدرسہ بیہقیہ کا فرزند کہا ہے، لیکن در اصل وہ اپنی تعلیم والد سے ہی مکمل کر چکے تھے اور اب خود صاحب درس تھے.

---

[1] طبقات ج ۳، ۲۲۰، [2] ایضاً ۲۵۴.

امام کے شیوخ میں دوسری قابل ذکر شخصیت ابو عبداللہ خبازیؒ کی ہے ، یہ علوم قرآنیہ اور حدیث کے بلند پایہ عالم تھے۔ انھوں نے مرو میں ابوالہیثم محمد کشمیہنی سے صحیح بخاری کی سماعت و روایت کی ہے ، جو بخاری کے تلمیذ خاص محمد بن یوسف فربریؒ کے شاگرد ہیں ، صحیح بخاری کی روایت کرنے والوں میں کشمیہنی بڑی اہمیت رکھتے ہیں اسی طرح ان کے تلمیذ ابو عبداللہ خبازیؒ کا نسخۂ بخاری بھی معیار صحت مانا جاتا ہے۔ ابن عساکر نے لکھا ہے :

وکان الاعتماد فی وقته على سماعه ونسخته[1]	خبازی کے زمانہ میں بخاری کا وہ نسخہ جو خبازی سے مروی ہو ، اور ان سے سنا گیا ہو ، صحیح اور مستند سمجھا جاتا تھا۔

ابو عبداللہ خبازی نے دوسرے اہم امام حدیث سے بھی روایت کی ہے جو علم حدیث میں علو مرتبت کے ساتھ تجوید و قرارت اور علوم قرآنیہ میں اختصاص کا درجہ رکھتے تھے اسی لئے وہ ابو عبداللہ مقری کے نام سے مشہور ہیں ، انھوں نے قرارت اپنے والد سے سیکھی[2]، امام الحرمین ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ نیشاپور کی ایک مسجد میں ان کا درس ہوتا تھا ، مسجد مستفیدین سے بھری رہتی تھی ، سلطان الپ ارسلان سلجوقی کے وزیر عمید کندری کے دور پر فتن میں مصائب کی تاب نہ لاکر متعدد ائمۂ اشاعرہ نیشاپور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے مگر اس وقت بھی خبازی نیشاپور میں مسلک حق کی ترجمانی کرتے رہے۔

---

[1] تبیین ۲۶۶ ۔ [2] العبر فی خبر من غبر ج ۳ ، ۳۱۹ ۔

امام الحرمین صبح علامہ خبازی کی مسجد جاتے اور ان سے علوم قرآن وحدیث کا درس لیتے، تجوید وقرارت کی طرف خاص توجہ رہتی، اس کے بعد اپنی درسگاہ میں آکر درس دیتے، پھر مدرسہ بیہقیہ میں اسفرائینی کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔

امام کا یہ معمول زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا، اس عہد میں یونانی فلسفہ کی اشاعت نے اسلامی آبادیوں میں ہلچل مچادی تھی، عقلی موشگافیوں نے سیدھے سادے عقائد کو چیستاں بنادیا تھا اور ایسے فرقے وجود میں آگئے جو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹتے جارہے تھے، ان فرقوں کی اصلاح ان کی غلط فہمیوں کی تصحیح اور عام مسلمانوں کو ان کے ضرر سے بچانے کی بڑی ضرورت تھی، اس لئے اس زمانہ کے اہل حق نے علم کلام اور بحث ومناظرہ کی طرف توجہ کی، امامؒ کو ان مسائل سے فطری مناسبت تھی اس لئے انھوں نے خاص طور سے اس میدان میں قدم رکھا اور متکلم کی حیثیت سے پورے خراسان وبغداد میں ان کی شہرت ہوگئی۔

نیشاپور سے ہجرت امام کے عہد میں نیشاپور میں سلجوقیوں کا پھریرہ لہرارہا تھا اور سلطان طغرل بیگ سریر آرائے سلطنت تھا، علم وفن کی قدردانی کے لئے یہ سلاطین تاریخی شہرت رکھتے ہیں اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے افکار وعقائد کے لحاظ سے زندقہ، اعتزال اور رفض سے پاک تھے، اہل سنت والجماعت کے پیرو اور امام ابوحنیفہؒ کے متبع تھے[1] علم وفن کی بزم آرائی اور سیف وقلم کے اجتماع میں ان کے وزراء بھی ممتاز مقام رکھتے تھے، مگر طغرل بیگ کا وزیر عمید الملک ابونصر محمد کندری سلاجقہ کے دامن اعتدال پر ایک بدنما دھبہ ہے، وہ نیشاپور سے دور طریثت کے گاؤں

---

[1] تاریخ گزیدہ، ۴۳۳۔

کندر کا ایک دہقانی تھا، جو اپنے ذاتی جوہر و قابلیت کی بنا پر طغرل بیگ کے دربار میں پہونچا۔

ہوا یہ کہ طغرل بیگ کو ایک مترجم کی ضرورت تھی، کندری فارسی و عربی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا تھا، موفق کے ذریعہ وہ سلجوقی دربار میں پہونچا اور اپنی اہلیت کی بنا پر مترجم کے لئے منتخب ہوگیا، اور رفتہ رفتہ مترجم و حاجب کے عہدہ سے ترقی کرتے کرتے سلطان طغرل کا دست راست بن گیا اور سفر و حضر میں ہم رکاب رہنے لگا، سلطان بغداد گیا اور خلیفہ قائم بامراللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عمید کندری ہی کے واسطہ سے اسے خلیفہ سے شرف کلام حاصل ہوا، کندری سیاست کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا، انتظامی سلیقہ بھی تھا، علمی و ادبی ذوق بھی تھا، شروع میں اس نے اپنے خیالات کے اظہار میں احتیاط کی اور علماء و مشائخ سے روابط قائم کئے، یہاں تک کہ امام الحرمین اور ابوالقاسم قشیری جیسے صاحبان علم و تقوی بھی اسکے یہاں آتے تھے، لیکن جب سلطان پر اس کا اثر مستحکم ہوگیا اور امور سلطنت پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی تو اس نے اپنے افکار و خیالات کی اشاعت شروع کر دی، اور اہل حق اس کے ہاتھوں مصائب میں مبتلا ہوگئے، سلطنت سلجوقیہ کو اگر نظام الملک طوسی جیسا وزیر ملا، جو اس ملک کے لئے مایۂ ناز اور باعث افتخار تھا تو عمید کندری نے اسکے دامن عزت کو داغدار کر دیا، اس کے عہد وزارت میں نیشا پور میں اتنا بڑا فتنہ رونما ہوا جس کی نظیر تاریخ اسلام میں کم ہی مل سکتی ہے، کندری کے فساد اعتقاد کے بارے میں صاحب طبقات رقمطراز ہیں:

کان معتزلیاً رافضیاً — وہ عقیدۃً معتزلی اور رافضی تھا

خبيث العقيدة لم يبلغنا	فرق ضالہ کے تمام گمراہ کن عقائد
ان احدا اجتمع له من	اس میں جمع تھے، اس اجتماع خباثت
خبث العقيدة ما اجتمع له	وضلالت میں اس کی نظیر نہیں
فانه علیٰ ما ذکر کان یقول	ملتی ہے، اس کے بارے میں کہا
بخلق الافعال وغيره من	جاتا ہے کہ قدریہ، روافض، کرامیہ
قبائح القدرية وسب	اور مجسمہ کے عقائد مثلاً خلق افعال
الشيخين وسائر الصحابة	اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اور
وغير ذلك من قبائح	تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان
الروافض وتشبيهه الله	میں نازیبا الفاظ اور اللہ تبارک وتعالیٰ
تعالیٰ بخلقه وغير ذلك من	کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا اور دیگر
قبائح الكرامية والمجسمة	عقائد باطلہ اس کے اندر موجود تھے،
وكان له مع ذلك تعصب عظيم[1]	اس کے ساتھ وہ بڑا متعصب بھی تھا

جمال الاسلام ابو محمد ہبۃ اللہ الموفق کے صاحبزادے ابو سہل بن الموفق اشعری فاضل تھے، بڑے ذی وجاہت اور صاحب اثر تھے، دینی ودنیاوی دونوں اعتبار سے ممتاز تھے، والد کے انتقال کے بعد ان کو طغرل بیگ نے جمال الاسلام کا خطاب دیا۔ شاہی کرم گستری کے ساتھ عوام وخواص میں اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کے متعلق منصب وزارت کی امید کی جانے لگی۔ ان کے مکان پر شوافع اور احناف کا مجمع ہوتا تھا اور علمی انداز میں مناظرے ہوتے۔ ان کے خوان پر نعمت پر ابو القاسم قشیری بھی

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲، ۲۷۰۔

موجود ہوتے تھے، ابن موفق کی مقبولیت کا یہ سماں دیکھ کر عمید کندری کو ان سے ذاتی عناد پیدا ہوگیا، اس کے ساتھ اس کو شوافع سے خصوصی نفرت اور اشاعرہ سے دلی عداوت تھی، اس کا مذہبی تعصب ضرب المثل تھا، اس نے سلطان کو اشاعرہ کی طرف سے بدظن کرنا شروع کیا، بادشاہ حنفی تھا۔ کندری کی ہم مذہب جماعت نے خود کو حنفی ظاہر کرکے کندری کی پوری حمایت کی، یہ لوگ اشاعرہ کے صحیح عقائد کو ایوان شاہی میں غلط طور سے پیش کرتے اور ان کی طرف فرق ضالہ کے فاسد عقائد منسوب کرتے، بالآخر طغرل اشاعرہ سے ایسا بدظن ہوا کہ برسر منبر امام ابوالحسن اشعریؒ پر لعنت کا شاہی فرمان صادر ہوگیا اور اشاعرہ کو مساجد و منابر سے روک دیا گیا، اور ان کی جگہ ان کے مخالفین قدریہ اور مجسمہ آگئے، اس وقت اہل ہوا پورے طور پر آزاد ہوگئے اور اہل حق کے لئے بڑے ابتلاء و آزمائش کا دور آگیا[1]

بالآخر نوبت یہاں تک پہونچی کہ امام الحرمین کو تدریس و افتاء اور وعظ و پند سے روک دیا گیا، مجبوراً امام نے نیشاپور سے ہجرت کا ارادہ کرلیا اور ۴۴۵ھ (مطابق ۱۰۵۳ء) میں خاموشی سے نیشاپور کو چھوڑ دیا،[2] ان کی روانگی کے بعد ان کے خلاف نیز شیخ ابوالقاسم اور رئیس فراتی کے خلاف شہر بدر ہو جانے کا حکم جاری ہوگیا، موخر الذکر دونوں بزرگ قلعہ کہندز میں قید کردیئے گئے، لیکن امام الحرمین چونکہ نیشاپور کو خیرباد کہہ چکے تھے اس لئے محفوظ رہے[3]

اس پرآشوب دور میں جب کہ ذہنی و قلبی سکون مفقود تھا، اشاعرہ میں دو جماعتیں ہوگئیں ایک نے ہجرت اختیار کی اور دوسری نے مذہب اشعری سے اپنی برات ظاہر کی مگر ان کے علاوہ چند نفوس گوشۂ عزلت میں ایسے بھی نظر آتے ہیں جو اپنے وطن میں رہ کر بھی مذہب کو سینہ سے لگائے رہے ان میں امام کے استاذ خبازیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ نیشاپور ہی میں رہ کر راہ حق پر قائم رہے

---

[1] طبقات ج۲ : ۲۷۰ [2] العبر ج۳ : ۱۳۲ [3] طبقات ج۲ : ۸۵ [4] تبیین : ۲۶۴ مقدمہ کی کتب پر

رومی ہندی شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ

از

ڈاکٹر شعیب اعظمی، ریڈر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ، نئی دہلی

حضرت شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مشہور صوفیوں اور مجذوبوں میں شمار ہوتے ہیں، ان کی زندگی کے حالات کے بارہ میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں، اور جو کچھ اس زمانہ کے تذکروں اور بعد کی تاریخوں میں ملتا ہے، اس کے بیشتر واقعات میں مبالغہ اور عقیدت کا غلبہ ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کے والد بزرگوار حضرت فخرالدین عراق سے ہندوستان آئے اور حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہوگئے، حضرت شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ کی والدہ ماجدہ بی بی جمال مولانا سید نعمت اللہ ہمدانیؒ ں بہن تھیں، قلندر صاحب کی ولادت ۶۲۵ھ میں پنجاب میں بدھا کھیڑا میں ہوئی، اوائل عمر ں مروجہ علوم حاصل کئے اور خاص طور سے شیخ شرف طعمہ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، م متداولہ سے بہرہ مند ہوکر دہلی میں قطب مینار کے جوار میں درس و تدریس میں مشغول گئے اور اپنی علمی شہرت کی بناپر فتویٰ نویسی کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز ہوئے، اس مشغلہ کی ت زیادہ نہیں رہی، معاصر علماء کا ایک گروہ ان کا مخالف ہوگیا، جن میں سرفہرست مولانا راج الدین اور مولانا ظہیر علی کے نام ہیں، لیکن مشاہیر علماء و فضلاء کی ایک جماعت ایسی بھی ، جو ان کا احترام کرتی تھی، مولانا صدرالدین، مولانا ناصرالدین، مولانا قطب الدین مکی ،

مولانا وجیہ الدین پائلی، قاضی ظہیر الدین بخاری، قاضی حمید الدین، مولانا فخر الدین مولانا احمد بخاری، مولانا نجیب الدین سمرقندی اور مولانا معین الدین دولت جیسے جلیل القدر علماء ان کے معتقدین میں شامل تھے، پھر بھی چند علماء کی کثرت بیتے متاثر ہو کر قلندر صاحب درس اور فتویٰ نویسی کی خدمت سے دستبردار ہو گئے اور کوچہ کی راہ لی اور شدید ریاضت و مجاہدہ کے بعد عالم سکر و مستی میں آبادی سے موڑ کر صحرا کا رخ کیا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رقمطراز ہیں:

شرف الدین پانی پتی او را بوعلی قلندر نیز گویند، از مشاہیر مجاذیب اولیاء ست، می گویند کہ در اول حال تحصیل علم کرد، و در طریقت مجاہدہ و سلوک و ریاضت نمود، و آخر مجذوب شد، کتابہا را در آب انداخت[1]

شرف الدین پانی پتی جو بو علی قلندر کہے جاتے ہیں، مشہور ولیوں اور مجذوبوں میں ہیں، ابتدا میں علم کی تحصیل کی اور طریقت کی راہ میں مجاہدہ، سلوک اور ریاضت کے مراحل طے کئے، آخر میں مجذوب ہو گئے تھے اور کتابوں کو پانی میں ڈال دیا تھا۔

امین رازی "ہفت اقلیم" میں لکھتے ہیں:

آخر کارش بجائے رسید کہ ہمیشہ مستغرق بودے، و سخن نگفتے، و اگر گوشہ چشمے بہ کسے انداختے

آخر میں ہمیشہ استغراق کی کیفیت طاری رہتی اور کوئی بات چیت نہیں کرتے تھے، اگر کسی کی طرف

[1] اخبار الاخیار، ص ۱۳۰

گفتہ دراطاعت ... بیکہ	نگاہ اٹھا دیتے تو اس کو سکت
بہوت شدے و خاکستر شدے	باقی نہ رہتی، بلکہ وہ بھسم ہوت اور
شرح زعشق تو گشت آں قلندر مست	خاکستر ہو جاتا۔

کہ جملہ مدعیاں از جہاں بشستن مردند[1]

ایک روایت ہے کہ قلندر صاحبؒ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بھی رشتۂ ارادت رکھتے تھے، لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بقول یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ قلندر صاحب نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت شمس الدین تبریزیؒ سے ملاقات کی اور ان دونوں بزرگوں سے خرقۂ خلافت بھی پایا، مگر اس روایت کو بھی مشکوک قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اب تک یہ بات صحیح طور پر معلوم نہیں کہ قلندر صاحب نے ہندوستان کی سرزمین سے باہر قدم نکالا تھا یا نہیں، مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان کے معاصر علماء اور مشائخ میں مولانا ضیاء الدین سنامی، خواجہ شمس الدین ترک، خواجہ قطب الدین، نجم الدین قلندر، کبیرالاولیا شیخ جلال الدین پانی پتی، حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو وغیرہ قلندر صاحب سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے، حضرت امیر خسرو نے تو سلطان علاء الدین خلجی کے ہدایا کے ساتھ قلندر صاحب کے یہاں حاضری دی تھی، ان کو اپنے اشعار سنائے تھے، ان کا کلام بھی سنا تھا اور قلندر صاحب کی زبان سے اپنے کلام پر تحسین و آفرین کے کلمات کی سند بھی پائی تھی، امیر حسن سجزی دہلوی بھی ان کے یہاں آتے رہتے تھے اور اپنا کلام بھی سناتے تھے۔

---

[1] ہفت اقلیم ص ۴۶۹

اس زمانہ کے سلاطین اور شہزادگان نیز امرا نے کبار بھی قلندر صاحب سے گہری عقیدت رکھتے تھے، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک خاں، غیاث الدین تغلق کو ان کے ارشادات کی سماعت کا شرف حاصل رہا ہے، قلندر صاحب غیاث الدین تغلق کو عزیز رکھتے تھے، گو نہ وہ درباری شاعر تھے اور نہ قصیدہ نگاری ان کی طبیعت کے موافق تھی تاہم غیاث الدین تغلق بادشاہ کی مدح میں ان کا شاندار قصیدہ دونوں کے تعلقات کی نشاندہی کرتا ہے۔

قلندر صاحب کی عمر تقریباً ایک سو بیس[۱۲۰] سال بتائی جاتی ہے، ۱۷ رمضان ۷۲۴ھ کو ان کی وفات ہوئی، وہ اپنی زندگی ہی میں ۶۹۹ھ میں اپنی ابدی خوابگاہ کے لئے روضہ اور عمارت تعمیر کرا چکے تھے، جہاں آج آسودۂ خاک ہیں، ان کے مختلف قطعات تاریخ کہے گئے، جن میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں؛

بو علی اشرف و نجیب و شریف وصل شد چوں بوصل رب ودود
از کاش شرف دلی زماں نیز فرما شرف دلی زماں،
باز شد سن رحلتش پیدا زیب عالم قلندر مسعود[۱]

ان کے وصال کے بعد خضر خاں اور شادی خاں بن علاء الدین نے روضہ میں درگاہ اور مدرسہ کی عمارت کا اضافہ کیا۔ آج تک ان کا مقبرہ مرجع خلائق ہے اور سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔

قلندر صاحب صرف ایک صوفی، مجذوب اور قلندر کی حیثیت ہی سے مشہور نہیں ہیں، بلکہ ایک اچھے صاحب قلم اور عمدہ شاعر کی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتے ہیں

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۲۰۔

نثر میں مکتوبات بنام اختیار الدین اور حکیم نامہ شرف الدین کا ذکر ملتا ہے، بقول شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ یہ مکتوبات، بزبان عشق و محبت مشتمل بر معارف، حقائق توحید، ترک دنیا طلب آخرت و محبت مولیٰ کے مضامین کے حامل ہیں، لیکن ان کی نسبت قلندر صاحب کی جانب شک و شبہہ سے خالی نہیں، نثر سے کہیں زیادہ قلندر صاحب نظم میں کمال رکھتے ہیں، انھیں قصیدہ، غزل، قطعات، رباعی اور مثنوی ہر صنف کلام پر دسترس تھی، وہ خود اپنے کو ایک بزرگ شاعر اور خاقانی و نظامی کا ہم مقابل سمجھتے تھے:

شرف دیدہ ہر دیت کلام قدس آوردہ نہ چوں نظم نظامی داں نہ چوں اشعار خاقانی[1]

قلندر صاحب نے متقدمین شعرا کے کلام کا مطالعہ بھی کیا تھا اور وہ ان کی پیروی پر اظہار فخر بھی کرتے ہیں:

جہاں کہ دستاویزی دمن برادریم ہمہ ہماں قدر کہ بود جائگی مناسب بود[2]
کردم مطابقت بہ ظہیر آنکہ گفت او شرح غم تو لذت شادی بجاں دہد[3]

قلندر صاحب ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، لیکن خراسانی اور عراقی ہونے پر فخر کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کی ولایت اور شاعری کی شہرت ہندوستان کے باہر عراق و خراسان میں بھی پہونچ گئی ہے، وہ افسوس کرتے ہیں کہ وہ کیوں ہندوستانی ہیں؟:

شرف بہند و در عارفی کشادو نشرد وصلے بردم و خراسان ولایتش دانند[4]
مرا مگو کہ زہندوستان ست ہندی شرف بہند بہ ست ولیکن عراقیست[5]

ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ واقعۃً انھوں نے جو کچھ اپنے اور اپنے کلام کے بارہ میں

[1] کلام قلندری : ۱۳۴ [2] ایضاً : ۱۰۵ [3] ایضاً : ۱۱۰ [4] ایضاً : ۱۰۸ [5] ایضاً : ۹۹۔

کہا ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں، قلندر صاحب کی باقیات میں دو مثنویاں اور ایک کلیات یادگار ہیں، مثنوی گنج الاسرار اور رسالہ عشقیہ کے عنوان کے تحت ہے، گنج مختلف حکایات منظوم کا مجموعہ اور عشقیہ تین سو باسٹھ اشعار پر مشتمل ہے، کلیات میں تقریباً سترہ سو اشعار ہیں، جس میں قصیدہ، رباعی، قطعہ اور غزل کے عمدہ نمونے ہیں، عشقیہ قلندر صاحب کی مشہور ترین مثنوی ہے، اور بقول کسے "ہر بیتش از متاع عرفان معمور و ہر شورش عارفاں را موجب وجد و سرور است"، صاحب نزہۃ الخواطر نے مثنوی کے چند عنوانات اس طرح مقرر کئے ہیں:

"درویشی چیست و نفس کشتن، طلسم ہستی شکستن، ترک از غیر گفتن، از خود
بستن و بدوست پیوستن و در آتش محبت سوختن و خاکستر شدن"[1]

دراصل ان تمام عنوانات کی تہہ ان تمام افکار و خیالات اور عقلی و نقلی علوم پر منحصر ہے، جو اس زمانہ میں عالم اسلام کے صوفیا کے حلقہ میں مروج تھے، ان ابیات میں عشق الٰہی مردان خدا، صوفی، زاہد، عارف، فقر و فاقہ، قناعت، یاد خدا، مسکینی، تواضع ایثار، مجاہدہ، ریاضت، زہد و تقویٰ، شاہ و گدا، حلال و حرام، ترک دنیا اور حرص و ہوس، غرض وہ تمام موضوعات جو صوفیا اور علماء کے یہاں اصطلاحی یا عملی طور پر برتے جاتے ہیں، وہ قلندر صاحب نے شرح و بسط سے بیان فرمائے ہیں، انھوں نے ہر سوال کا جواب دیا ہے، قرآن اور حدیث سے ثبوت کے علاوہ عرفاء و صلحاء کے اقوال بھی تائید میں پیش کئے ہیں، منصور اور بایزید بسطامی کے مسلک کی وضاحت کی ہے، خصوصیت سے وحدۃ الوجود کے عقیدہ اور اثبات کی

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۲ : ۴

تشریح کی ہے، ان خیالات کو اگر بنظر دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ قلندر صاحبؒ مولانا جلال الدین رومیؒ کے ہم خیال ہی نہیں بلکہ ان کے افکار و خیالات کے مبلغ ہیں، وہ تمام جذب و مستی، شور و ہیجان، ہمہ و دلولہ اور وجدانی کیفیت جو مولانا رومؒ کے اشعار میں دیکھی اور پائی جاتی ہے، قلندر صاحبؒ کے کلام میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مولانا رومؒ کے یہ خیالات ہندوستان میں کس ذریعہ سے آئے؟ قلندر صاحبؒ نے انھیں کہاں سے اخذ کیا؟ ان کے کلام میں وہ سب افکار و خیالات پائے جاتے ہیں جنھیں مولانا رومؒ نے مثنوی میں پیش کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا رومؒ اور قلندر صاحبؒ کا سال پیدائش ایک ہی ہے، مولانا رومؒ نے تقریباً ستر سال عمر پائی اور قلندر صاحب نے سو سال سے زیادہ کا سن پایا، اس زمانہ کی کتابوں اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محی الدین اکبر کے خیالات و افکار صوفیا اور علماء کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے اور اگرچہ متشدد علماء کے نزدیک ان خیالات کا مطالعہ اور ان پر غور و خوض معیوب اور ان کی ترویج و اشاعت کفر کے مترادف تھی، لیکن تصوف کے حلقوں اور صوفیا کی خانقاہوں میں یہ افکار پہونچ رہے تھے بعض صوفیا اور علماء ان خیالات کے نہ صرف گرویدہ تھے۔ بلکہ ان کی اشاعت کے دلدادہ بھی تھے، بقول پروفیسر خلیق نظامی اس وقت کی اکثر خانقاہوں میں شیخ اکبر کی تعلیمات پر عمل ہوتا تھا۔

جب ہم قلندر صاحب کے کلام کو پڑھتے ہیں اور خاص طور سے رسالہ عشقیہ اور کنز کا مطالعہ کرتے ہیں تو نہ صرف بیشتر اشعار میں مولانا روم کا اثر پاتے ہیں بلکہ

ان کے متعدد اشعار مولانا رومؒ کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مولانا رومؒ کی مثنوی کی منظوم حکایتیں قلندر صاحب کی مثنوی کے اوراق میں دیکھی جا سکتی ہیں، مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں: "داستان ہای دیگر" "الماس و پسر مالدار" "استاد و شاگرد احول" اور داستان قلندر "مانند دزد یہ اگر جہود ان کہ درمیان نصرانیان فساد انگیخت" "شبلی معقلہ" "محقق نصیر الدین و افضل" "مرد جاہل در محفل دانایان" "دو نا بینا و چہار رفیقاں کہ سیوۓ یافتند" اور "شاعر پیر بوالہوس و شیخ سادہ لوح در مریدان"۔

علاوہ ازیں رسالہ عشقیہ میں بعض عنوانات جیسے حکمت عارفان عشق و عاشق، ایمان کامل، ایمان تقلیدی، ظاہر و باطن، استدلالیاں، احوال جہاں، خاصان و عامیان، ذات باری، علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، حقیقت ذات حق، شکوہ، آزادی اور خود شناسی وغیرہ کی کثرت ہے، اگر ہم ان کی گہرائی میں جائیں تو مولانا رومؒ کی آواز بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

اب آیئے قلندر صاحبؒ کی مثنوی کے جستہ جستہ اشعار کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان کے اندر کہاں کہاں مولانا روم کے خیالات کا عکس نظر آتا ہے، مولاناؒ نے عشق کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے فارسی داں ہی نہیں، بلکہ علوم اسلامی سے تعلق رکھنے والے اصحاب بھی اچھی طرح واقف ہیں، مولاناؒ نے عشق کو جالینوس اور افلاطون قرار دیا ہے اور تمام بیماریوں کا طبیب بتایا ہے، دیکھئے قلندر صاحب اسے کس طرح پیش کرتے ہیں:

عشق می داند ہمہ بازی و ہیچ　　　　غیر عشق آخر چہ باشد ہیچ ہیچ

عشق شور انگیز باشد در جہاں — او خبر دارد ز خورشید نہاں
چیست اسرار نہاں عشقت دریں — کے شناسد عشق را ہر بوالہوس
عشق چوں مستی کند اے ہوشیار — صد ہزاراں می کشد در پاے دار
عشق محورست دوام عشق است — عشق گرداند فنا ہر شے کہ ہست[1]

قلندر صاحب کے نزدیک زندگی کی یہ تب و تاب اور دنیا کا سارا سوز و ساز عشق ہی کا مرہونِ منت ہے:

دل ز سازِ عشق با دلبر رسد — عشق کو تا جامۂ ہستی درد
عشق کو بے بال در طیراں کند — عشق کو در لامکاں جولاں کند
عشق کو تا تاجِ سلطانی دہد — عشق کو ملکِ سلیمانی دہد
عشق کو تا چشمِ دل بینا کند — عشق کو تا سینہ پر سودا کند
عشق کو تا عقل را زائل کند — عشق کو تا عقل را جاہل کند
عشق کو تا جام مدہوشی دہد — عشق باید تا فراموشی دہد
تشنگانِ عشق را جانے دگر — ہر زماں از غیب احسانے دگر[2]

عاشق اور عشق لازم و ملزوم ہیں، عاشق کیا ہے، وہ عشق سے کیا رابطہ رکھتا ہے اور دونوں کی قربت سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ عاشق عشق کی بدولت کہاں پہونچتا ہے اور اس راہ میں کیا کیا مصائب برداشت کرتا ہے؟ قلندر صاحبؒ بتاتے ہیں:

عاشقاں در پردۂ صد پردہ اند — ذاتِ حق را عارفاں خو کردہ اند
عاشقاں مست اند انجام است — ہیچ ناید در نظر بالا و پست

---

[1] کلامِ قلندری ص ۱۴ [2] ایضاً ص ۸۹ - ۹۰۔

غیر حق ہرگز نہ بیند در وجود | ہر چہ ہست از خویش داند نیست بود
عاشقاں چوں نام حق را بشنوند | دین و دنیا ہر دو را بر ہم زنند[1]

قلندر صاحب کے کہنے کے مطابق عشاق سوائے دوست کے کوئی دوسری چیز نہیں دیکھتے:

عاشقانند در جہاں مستِ خدا | تو چہ دانی عشق را اے بر گدا
عاشقاں را جز ہدایت کار نیست | ذوق شاں جز شربتِ دیدار نیست
مست حق را با قلا ورزی چہ کار | بہر را با پیرہن دوزی چہ کار[2]

ان کا خیال ہے کہ مست حق ہی حقیقی عاشق ہے اور جس نے عشق کا مفہوم سمجھا۔ اس تک پہونچا اور جب وہاں پہونچا وہ چیزے دگر ہو گیا:

گر کسے کو با خدا یک رنگ شد | وصف او از ملک و دم زنگ شد
معنیِ یک رنگی آمد ذوقِ حق | بندہ را آرام اندر ذوقِ حق
او برنگ صاحبی دمال و جاہ | ما برنگ بندگی اندر پناہ
او برنگ صاحبی دار و خبر | بندہ را از بندگی باشد خبر
او برنگ صاحبی فرماں روا | ما برنگِ بندگی روشن گدا[3]

یہی عاشق مردان خدا کہلاتے ہیں، جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ذات باری میں فنا ہو کر اعلیٰ درجہ پر پہونچتے ہیں:

ہم مردان خدا دانی کہ چیست | فارغ انداز قید ہاے سرگذشت
یک نفس بے یاد او نگذاشتند | خوش علم بر نہ فلک افراشتند
یاد حق مردان حق را زندہ است | چشمشان خوش خفتہ و بر گوہر است[4]

---

[1] کلام قلندری: ۸ [2] ایضاً: ۴۰ [3] ایضاً، ۴۰، ۴۴ [4] ایضاً: ۶۹۔

مولانا نے فیہ ما فیہ اور مثنوی دونوں میں یاد خدا کو خاص اہمیت دی ہے، جس کی بدولت دونوں جہاں کی بے پایاں نعمتیں میسر ہوتی ہیں، قلندر صاحب کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے:

چوں دل تو مائل یاد خداست　　آں خدائے پاک از تو کے جداست
یاد او بنیاد عمر جاوداں　　یاد او سرمایۂ صاحب دلاں
یاد او درد دو عالم را دواست　　یاد او ہر گم شدہ را رہنماست[1]

عشق، عاشق اور یاد عشق باری تعالیٰ ان تینوں کو عقل نہیں سمجھ سکتی ہے، وہ با وجود فہم و ادراک نور بصیرت سے محروم ہے، دیکھئے! قلندر صاحبؒ نے عشق و عقل کا موازنہ کس طرح کیا ہے، ان کے نزدیک عشق ہر صورت میں ارفع و اعلیٰ ہے، عقل فقط جزو کی حیثیت رکھتی ہے اور عشق کل ہے:

عقل جز از عشق کل دایم جداست　　عشق کل با عقل کل ہم آشناست
عقل چوں در حضرت بیچوں رسید　　عقل جز منکر شود کہ چوں رسید
عشق جاں باز آمدہ اندر جہاں　　عقل باشد در پناہ ایں و آں
عشق باشد نکتہ داں باریک بیں　　عقل را تو جاہل و حیراں بیں
عقل را سر رشتہ گم باشد دوام　　عشق باشد ماند دار و نیک نام
عشق را اندر سرا ہائے لامکاں　　عقل را حیرت بود از کار آں
عشق جاں قرباں کند ہر صبح و شام　　قم باذن اللہ رسد ہر دم مدام[2]

یہی باتیں مولانا روم کے یہاں کس ایجاز و اختصار کے ساتھ پائی جاتی ہیں:

---

[1] کلام قلندری: ۵، [2] ایضاً: ۳۶، ۳۸۔

در بیان پردہ خون عشق را گلزار ہا — عاشقاں را با جمال عشق بیچوں کار ہا
عقل گوید شش جہت حدست و بیروں راہ نیست — عشق گوید راہ ہست و رفتہ ام من بار ہا
عقل بازاری بدید و تاجری آغاز کرد — عشق دیدہ زاں سوی بازار ہا بازار ہا
اے بسا منصور پنہاں ز اعتماد جان عشق — ترک منبر ہا بگفتہ بر شدہ بر دار ہا
عقل گوید پا منہ اندر فنا جز خار نیست — عشق گوید عقل را کاندر تو است ایں خار ہا[1]

مولانا رومؒ نے استدلالیوں کو پاسے چوبیں دسبے تمکیں کی مانند بتایا ہے، قلندر صاحب اس خیال کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

اہل برہانند استدلالیاں — آنچہ ظاہر ہست باطن ہیچ آں
از دلیل عقل اثبات آورند — ہیچ نادیدہ خیالے می نہند
نیست تمکیں اہل استدلال را — ہمچو شاخ عرعری از آں رجا
پس مدلل کے کند حق را درست — از دلیلش پاک باشد حق نخست[2]

مولانا رومؒ کی ہدایت ہے کہ انسان اپنا ہاتھ اس شخصیت کے ہاتھ میں دے، جو اس کی رہنمائی کر سکے۔ بظاہر آدمی، دیو اور جن یکساں ہیں اور ہر کس و ناکس کا انھیں پہچان لینا آسان نہیں ہے، صرف مردان حق ہی باخبر ہیں، منافق بندر کی طرح کرتب دکھاتا ہے اور مرد مومن عشق خدا کو مقصود جانتا ہے۔ مردان خدا کا کام روشنی وگرمی اور کار دونان حیلہ اور بے شرمی ہے۔ قلندر صاحبؒ اسی مضمون کو ذیل کے اشعار میں یوں کہتے ہیں:

کے کند سالوس ہاں مرد خدا — با خدا باشد ہمیشہ نے جدا

---

[1] سیری در دیوان شمس: ۱۲۱ [2] کلام قلندری: ۹ .

کار پاکاں باد عمل سازاں مسنج — گر بسنجی رنج بینی گسنج گسنج

سر ایشاں را کجا داند کسے — واقف از اسرار جو دہر خفتے[۱]

مولانا رومؒ کے نزدیک یاد خدا سب سے بڑی عبادت ہے اور ان کے کہنے کے مطابق یہی یاد عارف کو اعلیٰ مرتبہ عطا کرتی ہے۔ قلندر صاحبؒ بھی اسی طرح خدا کی یاد کو لازمی قرار دیتے ہیں :

در دل بندہ چو حق پرتو فگند — خار ہجرش را زپاے دل فگند

ہمچو قطرہ چو بدریا اوفتاد — عین دریا گشت و وصلش دست داد

قطرہ چوں شد بدریا آشنا — بعد ازیں تفریق می باید ترا[۲]

یہی آشنائی وہ چیز ہے جو ماسوی اللہ کچھ اور دیکھنے نہیں دیتی ہے اور جب آشنائی حاصل ہوئی، ہر چیز بےحقیقت ہو گئی۔

زنگِ دل از صیقل لا پاک کن — سینہ با تیغ محبت چاک کن

اسم ذات او چو بر دل نقش بست — سکہ ضرب محبت خوش نشست

گشت چوں ہر نقش نقش لا الہٰ — غیر نقش اللہ را اے دل مخواہ[۳]

اسی طرح علم لدنی حاصل کرنے کے لئے دیدۂ بینا چاہیے، مولانا رومؒ نے قرآنی کلمات اور آیات کا بکثرت استعمال کیا ہے، کلمۂ مازاغ البصر کو بطور شہادت لائے ہیں، قلندر صاحبؒ نے بھی اس کو فراموش نہیں کیا ہے :

گفت پیغمبر کہ "مازاغ البصر" — فہم کن در مغز معنی اے پسر

عارفاں آرند دلیل مصطفےٰ — گفت مازاغ البصر و ماطغیٰ

---

۱ کلام قلندری : ۴ ۲ ایضاً : ۷ ۳ ایضاً : ۵۵۔

ذات حق با تست نے از تو جدا — خویش را دریاب کردم یکصدا[1]

انھیں افکار و خیالات کی بنا پر قلندر صاحبؒ پورے عالم کو اللہ تعالیٰ کے احد بے پایاں کا رہین منت سمجھتے ہیں، دنیا کی ہر چیز حسن حقیقی سے متاثر ہے، یہی مسلک ہے جو وحدت الوجود کے رجحان کی نشاندہی کرتا ہے اور قلندر صاحبؒ اشعار میں جا بجا پایا جاتا ہے، اشعار ذیل پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

هرکه بوئے بشنوم از بوے او — مست انتم بے خبر در کوے او
سنبل از بوئے دیش شد تابدار — لالہ از رخسار او شد داغدار
صد زباں در وصف آں سوسن کشید — غنچہ با صد شوق پیراہن درید
نرگس بیمار چشم از سرکشاد — جام زرین در کف سیمیں نہاد
نخل سرو از قامت زیبائے او — سبز و خرم گشت تا سرپائے او
بلبل و قمری بہ بستاں نوحہ کرد — ہر یکے در صحن دارد درد و کرب
ہر طرف برخاست از وے ہائے و ہو — ہر زباں دارد دل از وے گفتگو
اے شنیدی نغمۂ چنگ و رباب — سینہ بریاں شد ز سوز دل کباب[2]

اس کا آخری شعر مولانا روم کی "بشنو از نے چوں حکایت می کند" کی یاد دلاتا ہے، "قلندر صاحب صرف اسی ہی پر اکتفا نہیں کرتے اور یار حقیقی کو "جزو اور کل" دونوں میں دیکھتے ہیں:

یار را می بیں تو در ہر آئینہ — سوز و ساز اوست در ہر لحظہ
ہرچہ بینی در حقیقت جلوہ اوست — شمع و گل پروانہ و بلبل از وست

---

[1] کلام قلندری: ۲۵، ۲۶ [2] ایضاً: ۸۶۔

هرچه آید در نظر از جزو و کل — بیشهٔ صحرا، بلبل بستان و گل
مرغ و ماهی مار و مور و خیر و شر — چشمهٔ حیوان، باران، برق و ابر
سنگ خارا، لعل کان یاقوت و دُر — ظلمت و نور نیر ماه و خور
هرچه باشد آب و آتش باد و خاک — جمله را مخلوق کرد آن صنع پاک
گوهر جان مطلع انوار اوست — معدن دل مخزن اسرار اوست[1]

صوفیہ کے حلقوں میں ہمہ اوست کا تصور خاصا نفوذ کر چکا تھا. قلندر صاحب بھی اس فلسفے سے کافی دلچسپی رکھتے تھے، وہ "دریائے ہو" میں غرق ہونا چاہتے تھے اور اپنے وجود کو دریائے عدم کی نذر کر دینا چاہتے تھے:

کے بود علم الٰہی سکر و صحو — علم حق اینجا بود دریائے محو
تا نگردی قطره در دریائے ہو — دُرّ وحدت را نیابی ہیچ رو[2]

مگر قلندر صاحب کا خیال ہے کہ وہی صوفیہ اس کے شناور ہو سکتے ہیں جن کے پاس مجاہدہ، ریاضت اور فقر و استغنا کی دولت ہو، زاہدان خشک اس میدان کے مرد نہیں ہیں:

صوفیاں غرق اند در دریائے ہو — نیست زاہد خشک را ہیچ آبرو
زاہداں را مزد روزینہ بود — صوفیاں را عشق دیرینہ بود
زاہداں دایم بوند محتاج ناں — صوفیاں بگذشتہ اند در دو جہاں[3]
تو چہ دانی حال صوفی را کہ چیست — مرد صوفی راست اثبات قویست[4]

صوفی کی اصل دولت تقویٰ ہے نہ کہ پرانی گدڑی، شانہ، مسواک، سجادہ مدوا،

---

۱ کلام قلندری: ۷۷ ۲ ایضاً: ۸۷ ۳ ایضاً: ۵۹ ۴ ایضاً: ۵۴۔

یہ تمام چیزیں نمائش اور دھوکہ بازی کے لئے ہیں، دعاگوئی بھی محض شیطانی فعل رہ گئی ہے۔ نماز کا مفہوم کیا ہے اور نماز کس کے لئے ہے؟:

زہد و تقوی نیست کز آں بہر خلق — صوفی گوشی و پوشی کہنہ دلق
شانہ و مسواک و تسبیح و ریا — جبّہ و دستار و قلب بے صفا
دام اندازی برائے مرد و زن — خویش را گوئی منم شیخ زمن
چوں شوی استادہ از بہر نماز — دل بود در گاؤ خرائے حیلہ ساز
ایں نماز تو شود آخر تباہ — ذکر باطل ہا کند روئے سیاہ[1]

یہی نماز مولانا روم کا بھی موضوع ہے، وہ نماز کی اصلیت اور اس کا مدعا و مقصد اس طرح بیان کرتے ہیں:

اگر نہ روئے دل اندر برابرت دارم — من ایں نماز حساب نماز نشمارم
ز عشق روئے تو من رو بقبلہ آوردم — دگرنہ من ز نماز و ز قبلہ بیزارم
مرا غرض ز نماز آں بود کہ پنہانی — حدیث درد فراق تو با تو بگذارم
وگرنہ ایں چہ نمازے بود کہ من با تو — نشستہ روئے بمحراب و دل بیازارم[2]

مثنوی معنوی میں بہت سی حکایتوں میں ایک حکایت استاد اور شاگرد احول کی ہے، اسی طرح کی ایک حکایت قلندر صاحبؒ کی مثنوی میں الماس فروش اور شاگرد کی ہے، مولاناؒ کی حکایت کا شاگرد ایک کے بجائے دو آئینے دیکھتا ہے اور قلندر صاحب کا شاگرد الماس کو پتھر سمجھتا ہے۔ دونوں بزرگوں کی رائے ہے کہ یہ نظر کی تقصیر ہے، قلندر صاحب کہتے ہیں:

---

[1] کلام قلندری: ۸۱ [2] کلیات شمس ج ۳

ہرچہ می بینی بدانی از نظر　　گر بدانی قدر خود زاے پسر
قدر خود را خود بداں تو نیک نیک　　چند چوں مرغان زنی تو جیک جیک

مولانا نے طوطی کی تمثیل سے اپنی مثنوی میں ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے، انھوں نے طوطی کو ایک خاص نشان مانا ہے اور اس کی زبان سے بہت سی باتیں کہلوائی ہیں قلندر صاحب کی مثنوی بھی طوطی کے ذکر سے خالی نہیں، ان کے یہاں بھی طوطی اہم ہے مگر ذرا دوسرے انداز میں :

ایں جہاں طوطی صفت باشد تمام　　اخذ حرف و صوت دارد خلق عام
طوطی آموختہ گوید سخن　　او چہ داند سر با علم لدن
طوطیاں باشند از ادراک دور　　طبع ایشاں می بود زیشاں نفور
تاں ایشاں سر بسر ابتر بود　　حال شاں از گاؤ خر کمتر بود[1]

گفتگو داریم با طوطی صفت　　ما نمی دانیم سر معرفت
طوطیاں خوانند پیش مرد و زن　　کار انسان ست فہمیدن سخن
طوطیاں را از معانی چہ خبر　　در کلام ایشاں نمی باشد اثر
ہیچ طوطی دیدہ عارف بود　　اندرون قطرہ کس غارت بود
طوطی خوش می بسنجد ایں سخن　　از لسان غیب از علم لدن[2]

کبھی قلندر صاحب مولانا روم کے الفاظ، کلمات اور محاورات استعمال کرتے ہیں، اور کبھی اصطلاحات کو بغیر کسی تبدیلی کے کام میں لاتے ہیں۔ مولانا کے ایک لفظ "سوفسطائی" کو قلندر صاحب نے اس طرح استعمال کیا ہے :

---

۱ کلام قلندری : ۱۶　۲ ایضاً : ۵۵　۳ ایضاً : ۵۶

گفت سوفسطائی آں دانائے دہر   کیں جہاں وہم و خیال ست در نگر[1]

مولانا رومؒ نے ایک نجومی کی حکایت میں "نقد عمرت" کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ قلندر صاحبؒ نے بھی یہی چیز اپنے یہاں برتی ہے :

خواب نسیاں ترا مبہوت ساخت   نقد عمرت را ہمہ برباد ساخت[2]

مولاناؒ کا قول ہے "ایں جہاں کوہست و فعل ما ندا" قلندر صاحبؒ نے یہی بات دوسرے انداز سے کہی ہے :

پس توئی مختار ہر فعلے کہ ہست   نیک کر دی ایں جہاں را بند دست[3]

مولاناؒ کے نزدیک :

یک نفس بودن ز پیش اولیاء   بہتر از صد سالہ زہد و اتقاء

اور قلندر صاحبؒ کا کہنا ہے :

آنچہ در صد سال عمرش برنیافت   صحبت شاں ہمچو خورشیدی بتافت[4]

مولانا نے فرمایا ہے : عشق نبود عاقبت ننگے بود اور قلندر صاحب کا خیال ہے :

مرد دیں عاقبت مجنوں بود   مرد دنیا دار خود محزون بود[5]

مولانا :

صحبت صالح ترا صالح کند   صحبت طالح ترا طالح کند

قلندر صاحب :

صحبت دانا ترا شاداں کند   صحبت ناداں ترا حیراں کند[6]

مولانا رومؒ نے عطارؒ اور سنائیؒ کو اپنا پیش رو مانا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق عطار نے

---

[1] کلام قلندری : ۱۶ [2] ایضاً : ۱۰ [3] ایضاً : ۲۳ [4] ایضاً : ۶۹ [5] ایضاً : ۲ [6] ایضاً : ۸

عشق سے ہفت خوان کو طے کر لیا تھا اور وہ خود ابھی ایک کوچہ میں درماندہ تھے، عطار لوگ سیکڑوں سال میں بھی پیدا نہیں ہو سکتے، عطار روح تھے اور سنائی دو آنکھیں اور خود مولانا ان دونوں کے بعد اس میدان میں تن تنہا تھے۔ قلندر صاحبؒ نے بھی عطار کو اپنا محترم اور رہبر مانا ہے، اور خواجہ ہی سے اسرار حقیقت معلوم کئے ہیں:

سر معنی آنچہ بود عطار گفت — نیست ما را زہرہ گفت و شنفت
اوست سلطان حقیقت در جہاں — سر ہاے در جہاں کردہ عیاں
فیض بخش ست در جہاں اشعار او — سودمند ست مرد ما گفتار او
گفتہ اند بس بی بیاں اسرار را — در بریں شیوہ کہ گفت عطار را[1]

قلندر صاحب نے اپنی مثنوی میں زور استدلال کے لئے جا بجا لفظ مولوی کا استعمال کیا ہے:

مولوی فرمود در نظم ایں بیاں — بر تو گردد روشن اسرار نہاں[2]
ایں سخن در گوش دار اے جان — مولوی گفتہ ز روے امتحاں[3]
ہم خدا خواہی و ہم دنیاے دوں — ایں خیال ست و محال ست و جنوں[4]
مولوی فرمود نشنیدی مگر — سنگ گر می بود می کردے اثر

اے کماں از تیرہا پر ساختہ — صید نزدیک ست دور انداختہ
از چہ بیہودی ز درد دری ای فلاں — آہ از دست تو دارم صد فغاں[5]

مولانا کا ایک معروف مصرعہ "پس سخن کوتاہ باید والسلام" ہے، جسے قلندر صاحب نے

[1] ایضاً، ۳۵ [2] ایضاً، ۸۶ [3] ایضاً، ۸۳ [4] ایضاً، ۸۳۔

بکثرت سے استعمال کیا ہے:

ہیچ ہیچ ست حاصل عالم تمام	پس سخن کوتاہ باید والسلام[1]
چوں قلم بشکست آخر شد کلام	پس سخن کوتاہ باید والسلام[2]
گفت بار آرزو باشد تمام	گر رود تن با شیم یکجا والسلام[3]
نیست حق را در حقیقت ہیچ نام	دم زدن اینجا نباید والسلام[4]
گوش نزداں در نیابد ایں کلام	پس سخن کوتاہ باید والسلام[5]
صحبت عامہ عذابیست با تمام	گر بپرہیزی ثوابست والسلام[6]

اسی قبیل کے صدہا اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ قلندر صاحبؒ مولانا رومؒ کے نام، خیالات اور مثنوی معنوی سے اچھی طرح واقف تھے، ان کے افکار کا مطالعہ کیا تھا اور استفادہ کیا تھا، لیکن تعجب یہی ہے کہ اس زمانہ کے ملفوظات فوائد الفواد، سیرالاولیا اور خیرالمجالس تک مولانا روم کے خیالات اور ابیات سے خالی ہیں، سیرالاولیاء میں اشعار کا بکثرت استعمال ہوا ہے، اور خواجہ، ہمام، خسرو، سعدی کے اشعار جا بجا مل جاتے ہیں، لیکن مولانا روم کے اشعار نہیں ملتے۔ پس قلندر صاحبؒ نے یہ سب کس ذریعہ سے حاصل کیا، وہ علم یونان سے بخوبی واقف تھے:

ز نکتہائے جمال تو علم یونانی	بزیر پرتو انوار کمترا ز کم شد[7]

ان کے یہاں کبھی کبھی خیام کا اثر بھی مل جاتا ہے:

از روئے حقیقت نفسِ یکیم ہمہ	وز تحت بے برگ ودائیم ہمہ

---

[1] کلام قلندری: ۳۰ [2] ایضاً، ۳۱ [3] ایضاً: ۳۳ [4] ایضاً: ۳۳۔
[5] ایضاً: ۱۳ [6] ایضاً، ۱۳ [7] ایضاً: ۱۰۶۔

چو منزل ما بزیر خاک ست یقیں	حیران شدہ در جہاں چرائیم ہمہ

اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہوتا ہے کہ مثنوی کا پہلا نسخہ ہندوستان میں کب آیا، قدیم مثنی نسخوں میں ہزار دیں ہجری کے بعد کی تاریخیں ملتی ہیں اور اس سے قبل کے کسی نسخہ کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ عبد اللطیف گجراتی کی شرح میں بھی ہندوستانی نسخوں کا حوالہ نہیں ملتا۔ بہر حال یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ رسالہ عشقیہ کو قلندر صاحب نے منظوم کیا یا کسی اور نے؟ اگر یہ مثنوی ان کی ہے تو خیالات اور افکار کہاں سے آئے اور یہاں تک کہ سلمان ساوجی اور لسان الغیب کس طرح مثنوی میں مذکور ہوئے، کیونکہ یہ دونوں ہی قلندر صاحب کے بعد کے شاعر ہیں اور آٹھویں صدی ہجری کے ہیں۔

آخر میں مختصراً یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اگر اس مثنوی کو ہم قلندر صاحبؒ کی مثنوی تسلیم نہ کریں، پھر بھی بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ قلندر صاحب بڑے باکمال شاعر تھے، ان کے اندر شاعری کا ملکہ نقطۂ عروج تک پہونچا ہوا تھا۔ ان کی مثنوی، قصیدہ، غزل اور قطعہ کے صدہا ابیات میں وہی جوش وطنطنہ ہے جو مولانا روم کے کلام میں پایا جاتا ہے، یہاں قلندر صاحب کی ایک غزل کے چند اشعار کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جن سے قول بالا کی پوری تصدیق ہوتی ہے:

گر شبے دست دہد وصل تو از غایت عشق	تا قیامت نشود صبح دمیدن ندہد
گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد	تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہد
گر برائے سر کوئے تو رسد دست رہی	عرش را بر سر کوئے تو رسیدن ندہد
ہدیہ روئے تو گر ملک دو عالم بدہند	یعلم اللہ کہ سر موئے تو دیدن ندہد[1]

[1] کلام قلندری: ۱۲۳۔

گر بدام دل من افتد آں عنقا باز　　　گرچہ صد حملہ کند بال و پریدن ندہم
گر شرف باد وزد بوئے ز زلف تو برد　　　باد ما نیز دریں شہر وزیدن ندہم

ان تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کیوں نہ ہم قلندر صاحب کو رومیِ ہند کہیں؟

مراجع

۱۔ اللہ دیا چشتیؒ	سیر الاقطاب	نول کشور، لکھنؤ	۱۸۸۹ میلادی
۲۔ بو علی قلندر پانی پتیؒ	کلام قلندری	جت پرشاد، میرٹھ	۱۸۹۰ میلادی
۳۔ خلیق احمد نظامی	تاریخ مشائخ چشت	ندوۃ المصنفین، دہلی	۱۹۵۳ میلادی
۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن	بزم صوفیہ	دار المصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۵۰ میلادی
۵۔ شاہ عبدالحق دہلویؒ	اخبار الاخیار	مطبع مجتبائی، دہلی	۱۳۳۲ ہجری
۶۔ علی دشتی	سیری در دیوان شمس	امیر کبیر، تہران	۲۵۳۵ شاہنشاہی
۷۔ محمد ثناء اللہ خاں	اذکار ابرار	مفید عام، آگرہ	۱۳۲۶ ہجری
۸۔ مفتی غلام سرور	حدیقۃ الاولیاء	نول کشور، کانپور	۱۹۰۶ میلادی
۹۔ مفتی غلام سرور	خزینۃ الاصفیاء	نول کشور، کانپور	۱۹۰۶ میلادی
۱۰۔ میرزا آفتاب بیگ	تحفۃ الابرار	مطبع رضوی دہلوی	۱۳۲۳ ہجری

مطبوعات جدیدہ

دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات : مرتبہ ڈاکٹر خورشید نعمانی، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۴۴، قیمت مجلد مئے روپے ؛ (۱) دارالمصنفین اعظم گڈھ یو، پی (۲) مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی (۳) عبدالخالق نیلیش ۱۸۰، اے پاٹ روڈ، کرلا، بمبئی ۷۰

دارالمصنفین علامہ شبلی مرحوم کی اہم یادگار ہے، ان کے اخلاص کی بنا پر اس کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی اور یہ اپنی خصوصیات کے ساتھ اب تک قائم ہے اور ان شاء اللہ آئندہ قائم رہے گا، گو دارالمصنفین کی گوناگوں خدمات اور کارناموں سے ملک و بیرون ملک کے اہل واقف ہیں لیکن نام و نمود سے پرہیز کی وجہ سے اس کے خدمت گذاروں نے خود اس کے متعلق قدردانوں کے اصرار و تقاضے کے باوجود کوئی مبسوط کتاب لکھنا اور شائع کرنا پسند نہیں کیا، زیر نظر کتاب جناب خورشید نعمانی کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر بمبئی یونیورسٹی نے ان کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری دی ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں دارالمصنفین کا تخیل، اس کے مقاصد اور قیام کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں انیسویں صدی کے نصف آخر کا تاریخی جائزہ لے کر اس دور کے مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی حالت بیان کی گئی ہے، اور سرسید کی اصلاحی کوششوں، علی گڈھ اور ندوہ کی تحریکوں کی روداد اور ان سے مولانا شبلی کا تعلق دکھایا گیا ہے، مصنف کا اصل مقصد

دارالمصنفین کی ادبی خدمات بیان کرتا ہے، اس پر تیسرے باب میں گفتگو ہے، اس میں یہاں کے اہل قلم کی اردو و فارسی ادب سے متعلق ان تصنیفات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے جو دارالمصنفین یا کسی اور ادارہ سے شائع ہوئی ہیں، باقی چار ابواب میں دارالمصنفین کی ابتداء سے اب تک کے رفقاء کے مختصر حالات، تمام مطبوعات کا تعارف، ماہنامہ معارف کی خصوصیات اور دارالمصنفین کے مخصوص علمی، فکری اور تحقیقی نقطۂ نظر اور منفرد اسلوب تحریر کا ذکر ہے، لائق مصنف کو دارالمصنفین سے بڑا تعلق ہے، ان میں لکھنے پڑھنے کی اچھی صلاحیت ہے اور وہ برسوں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے زیر تربیت رہے، ان کے علاوہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے بھی علمی رہنمائی حاصل کی، اس لئے یہ کتاب بڑی دلچسپی، محنت اور سلیقہ سے لکھی ہے اور بڑی حد تک حق ادا کر دیا ہے، جس کے لئے دارالمصنفین کے قدر دانوں اور علمی حلقہ کو ان کا ممنون ہونا چاہئے، بعض خامیوں کی اس لئے نشاندہی کی جاتی ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی تصحیح کی جا سکے، پہلے باب میں دیوبند کی تحریک کا کوئی ذکر نہیں، گو مولانا شبلی کا اس سے تعلق نہ تھا، تاہم انیسویں صدی کا جائزہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، وہ لکھتے ہیں "مولانا کے استعفے (ندوہ کے معتمد تعلیم کے عہدہ) کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے مخلصین اور معتمدین یعنی مولوی سید عبد الحئی صاحب اور منشی احتشام علی نے بھی ..... استعفے دے دئے" (ص ۳۴) یہ دونوں بزرگ ندوہ کے معاملات میں مولانا کے مخالف تھے اور انھوں نے مولانا کی ہمدردی میں استعفے نہیں دئے تھے، چنانچہ اس کے بعد ہی جب مولانا خلیل الرحمٰن صاحب ناظم مقرر ہوئے تو دونوں حضرات پھر اپنے اپنے عہدہ پر فائز ہو گئے، تیسرے باب میں دارالمصنفین کی کچھ ادبی کتابوں پر بعض اہل قلم کے اعتراضات کا جائزہ لے کر اکثر کی تردید

کی گئی ہے، مگر کہیں کہیں خود بھی اعتراض کیا ہے جو ملوناً خود د فکر سے خالی ہے، جیسے مولانا عبد السلام مرحوم کے ایک مضمون "شاعری بطور پیشے" پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مولانا نے اس سلسلہ میں کوئی دو ٹوک بات نہیں کہی کہ وہ ایسی شاعری کو پسند کرتے ہیں یا ناپسند" دراصل مولانا کا مقصد اس قسم کی شاعری کا جائزہ لے کر اس کے فوائد اور نقصانات دکھانا ہے، اس لئے اس کے بارہ میں اپنی پسند یا ناپسند نہیں لکھی ہے، مگر ان کے انداز تحریر سے یہ خود ہی ظاہر ہے، نقوش سلیمانی کے سلسلہ میں یہ اعتراض بہت مبہم ہے کہ "شعوا کے اجتماعی مفہوم سے وہ (سید صاحب) پوری واقفیت نہیں رکھتے" دار المصنفین کی عام کتابوں کے تعارف کے ضمن میں متعدد کتابوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور عربی مطبوعات سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ مولانا عبد العزیز میمن کی ابو العلا و ما الیہ ادبی حیثیت سے بھی اہم ہے، مولانا حمید الدین کا انتقال سرائے میر میں بتایا ہے (ص ۳۹) یہ غلط ہے وہ اپنے ہم وطن ایک ڈاکٹر سے علاج کرانے متھرا گئے تھے، وہیں ان کا انتقال بھی ہوا، اور تدفین بھی، مولانا مسعود علی کے بارہ میں لکھا ہے کہ "مولانا شبلی کے پائنتی دفن ہیں" (ص ۵۰) حالانکہ وہ ان کے سرہانے کچھ فاصلہ پر دفن ہیں، مولانا سعید انصاری کی تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں ہوئی تھی، لیکن ان کو ندوہ کا فارغ التحصیل بتایا ہے، (ص ۶۵) ان کی مرتبہ تفسیر ابو مسلم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا تعلق دار المصنفین سے نہیں ہے حالانکہ یہ یہیں سے ۱۹۲۱ء میں چھپی تھی، ایک جگہ لکھتے ہیں "امام فخر الدین رازی کا درجہ علمائے اسلام میں سب سے ممتاز ہے" (ص ۲۷۷) "بہت" کے بجائے "بہت" لکھنا چاہیئے تھا۔ ایک جگہ نزع کے وقت کے بجائے نزاعی وقت (ص ۵۶) لکھا ہے وطن کا لفظ مونث ہے، اس کو مذکر لکھا ہے (ص ۲۴) مقلیہ ہر جگہ میقلیہ چھپا ہے

"ہندوستان عربوں کی نظر میں" کے تعارف میں اکثر عرب مصنفوں اور سیاحوں کے نام غلط تحریر ہوگئے ہیں، "ہندوستان کے سلاطین و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر" کا تعارف مکرر ہوگیا ہے۔

تاریخ ادبیات تاجکستان: مترجمہ جناب کبیر احمد جائسی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۹، مجلد قیمت تیرہ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔

ایران کے علاوہ فارسی زبان کی ترقی و اشاعت میں جن ملکوں کا زیادہ حصہ رہا ہے ان میں تاجکستان بھی ہے، یہ اب سویٹ یونین کی ریاست ہے، لیکن پہلے مغربی ایران ہی کا ایک حصہ تھا، اس سے علیحدگی اور سیاسی اختلاف کی بنا پر یہاں کی زبان تاجکی کہلانے لگی اور اب اس میں روسی اور دوسری مقامی زبانوں کے الفاظ بھی داخل ہوگئے ہیں اور رسم الخط اور بعض لفظوں کا تلفظ بھی فارسی سے مختلف ہوگیا ہے، لیکن انصاف پسند ایرانی فضلا اب بھی اسے فارسی دری سمجھتے ہیں، اردو میں ایران کی خدمات ادب پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن تاجکستان کا فارسی زبان و ادب کی خدمت میں کیا حصہ رہا ہے، اس سے اردو داں طبقہ کو واقفیت نہیں ہے، زیر نظر کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی، یہ یرزی ریپکا کی ہسٹری آف پرشین لٹریچر کے اس باب کا شگفتہ اردو ترجمہ ہے جس میں تاجکی ادبیات کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے، اس کے دو حصے ہیں: پہلے میں سولہویں صدی سے روسی انقلاب (۱۹۱۷ء) تک کی عہد بعہد تاریخ اور ادبی خصوصیات کے علاوہ اہم شاعروں کا ذکر ہے، اور دوسرے میں انقلاب کے بعد سے موجودہ دور (۱۹۶۶ء) تک کی تاجکی شاعری اور دوسرے اصناف ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں

شاعروں اور مصنفوں کا مختصر تذکرہ اور تاجکستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات بھی تحریر کئے گئے ہیں، اردو میں دوسرے ملکوں اور زبانوں کی تاریخ ادب پر پہلے کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں، یہ اسی مفید سلسلہ کی کڑی ہے، فارسی ادب سے واقفیت کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے، اگر لائق مترجم تاجکستان کے مختصر تاریخی اور جغرافیائی حالات بھی لکھ دیتے اور ان مباحث کی تشریح کر دیتے جو اردو خواں طبقہ کے لئے نامانوس ہیں، تو یہ کتاب زیادہ مفید ہو جاتی۔

نقوش ابوالکلام آزاد : مرتبہ مولانا محمد یونس خالدی، قیمت درج نہیں، پتہ مولانا آزاد میموریل اکیڈمی عے یشیشر باغ روڈ، لکھنؤ

مولانا ابوالکلام آزاد میموریل اکیڈمی لکھنؤ کا ذکر معارف میں آ چکا ہے، اس کی شائع کردہ پہلی کتاب پر تبصرہ بھی ہو چکا ہے، اس سال اکیڈمی نے دوسری کتاب نقوش ابوالکلام آزاد شائع کی ہے، یونس صاحب مولانا آزاد سے بخوبی واقف ہیں، انھوں نے ان کو قریب سے دیکھا بھی ہے اور ان کی خدمت میں باریابی بھی پاتے رہے ہیں، الہلال اور البلاغ کے علاوہ انھوں نے مولانا کی تصانیف بھی غور سے پڑھی ہیں، اس زمانہ میں جب کہ صف اول کے لوگوں میں کوئی باقی نہیں رہ گیا ہے، مولانا کے بارہ میں یونس صاحب سے زیادہ علم رکھنے والا شاید ہی کوئی اور ہو، انھوں نے اس کتاب کی ترتیب کا کام بڑے شوق سے اپنے ہاتھ میں لیا تھا، لیکن کوشش کے باوجود مولانا کے نیازمندوں کو قلم اٹھانے پر آمادہ نہ کر سکے، اس کے بعد اس کے سوا اور کیا چارۂ کار تھا کہ پرانے مضامین نئے قالب میں پیش کئے جائیں، کتاب کا زیادہ تر حصہ انتخابات و اقتباسات پر مشتمل ہے، جنھیں یونس صاحب نے سلیقہ سے مرتب کر دیا ہے، ہر مضمون کے ساتھ مضمون نگار کا تعارف بھی کرا دیا ہے، لیکن

تعریف و توصیف میں اس فیاضی سے کام لیا ہے کہ نئے قارئین کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

حرارتیں: از جناب نذیر فراز مبارکپوری صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت نفیس، صفحات ۱۷۵، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت دس روپے، کتاب مصنف سے معرفت ساں پرنٹ مبارکپور اور ہلال بکڈپو مبارکپور ضلع اعظم گڈھ سے ملے گی۔

جناب نذیر فراز مبارکپوری ایک اچھے غزل گو شاعر ہیں، ان کی غزلوں کے اس مجموعہ سے ان کے ستھرے ذوق اور تغزل سے مناسبت کا پتہ چلتا ہے، غزل بڑی لطیف اور نازک صنف سخن ہے، فراز صاحب اس کے نشیب و فراز سے واقف اور تغزل کے مزاج شناس ہیں، انھوں نے غزل کے خاص موضوع حسن و عشق کے جذبات و معاملات کی مصوری کے علاوہ عہد حاضر کے واقعات و مسائل کی ترجمانی ایسے سلیقہ سے کی ہے کہ غزل کی رنگینی و رعنائی اور اس کی لطافت و حلاوت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، طرز ادا کی دلکشی اور زبان و بیان کی روانی و صفائی سے مصنف کی فنی صلاحیت اور پختگی کا اظہار ہوتا ہے، امید ہے یہ مجموعہ مقبول ہوگا، چند اشعار سے رنگ سخن کا اندازہ ہوگا:

ہیں مصر اس پہ خدایان شعور و دانش — آبرو شعبدہ بازوں کی بچالی جائے
صبح یک کرن اجالوں کے لئے ترسے گا — ہم اگائیں گے اسی رات کے پہلو میں سورج
منتقل قدم قدم پہ اگر ہیں تو کیا ہوا — دانشوروں کے ذہن میں دارالاماں تو ہے

"ع ح"

جلد ۱۲۲ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۸ء عدد ۳

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

ہندوستانی مسلمان ایک عرصے سے قلت وکثرت کے طلسم میں گرفتار ہیں، یہ سوچ سوچ کر کہ ان کی تعداد کم ہے وہ حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے اندر کمزوری و بیچارگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے لیکن کیا تعداد کی کمی کوئی ایسا راز سربستہ ہے جس کا اچانک انکشاف ہوا ہے؟ تاریخ کا کونسا دور ہے جس میں انھیں اکثریت حاصل تھی؟ واقعہ تو یہ ہے کہ جب سے انھوں نے اس ملک میں قدم رکھا، اس وقت سے آج تک برابر اقلیت ہی میں ہے، لیکن یاس وہراس کی کیفیت جس میں وہ گذشتہ تیس ۳۰ برس سے مبتلا ہیں ان کے اندر کبھی نہیں پیدا ہوئی، آٹھ سو ۸۰۰ برس کے طویل زمانہ میں شکست وزوال کے بہت سے مناظر انھوں نے دیکھے، اور بارہا شدید مشکلات سے دوچار ہوئے لیکن چراغ امید کبھی گل نہیں ہونے پایا، انھوں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے بجائے مصائب و مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور عزم و حوصلہ کے ساتھ میدان حیات میں قدم بڑھانے کی کوشش کی

۵۷ء ہی کا تصور کیجئے، ساری قوم کیسی شدید مصیبت میں مبتلا تھی کل جو عرش نشین تھے انھیں آج فرش خاک بھی نصیب نہ تھا جن کے سروں پر تاج شاہی تھا اب ان کے گلوں میں پھانسی کے پھندے تھے، جو اطلس ودیبا اور زربفت وکمخواب کی پوشاک زیب تن کرتے تھے انھیں دو گز گزی بھی میسر نہ تھی، انگریزوں کی آتش غضب روز افزوں تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جان ومال، عزت وناموس، دین ومذہب اور تہذیب وثقافت سبھی کا خاتمہ ہے لیکن اس ہنگامۂ دار وگیر میں اللہ کے کچھ بندے عزم وہمت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو گرداب حوادث سے نکال کر ساحل مراد تک پہونچا دیا۔

اس نازک وقت میں ایک طرف سرسید اور ان کے رفیقوں نے قوم کو نئے حالات و مسائل سے باخبر کیا،

اور جو لیگیوں سے نبرد آزمائی کے لئے نیا ساز و سامان فراہم کیا، ان کی بدولت ملت نیم جان کو حیات نو نصیب ہوئی اور اس نے نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ کارزار حیات میں قدم رکھا، دوسری طرف مولانا محمد قاسم اور ان کے عقیدت مندوں نے بدعات و خرافات کے خارزار کو صاف کرکے دین کے سرچشمہ تک رسائی کی راہ ہموار کی، اس تب معانی نے قوم کے اندر نئی توانائی پیدا کی، ان شکستہ کو نئے بال و پر عطا کئے اور فلک پیمائیوں کا حوصلہ بخشا۔

۱۹۴۷ء سے اس وقت تک مسلمان جن مشکلات سے دوچار ہیں ان کی شدت سے انکار نہیں، لیکن اس کا علاج نہ گریہ ہے نہ فریاد، نہ نوحہ خوانی ہے، نہ سینہ کوبی، یہاں نہ شکایت سود مند ہے نہ آہ و زاری، بلکہ عزم و حوصلہ سے کام لینے اور ہمت و جرأت کے ساتھ قدم بڑھانے کی ضرورت ہے، ایک خوددار قوم کی طرح ہم نہ رعایت کے طالب ہوں، نہ عنایت کے خواستگار، بلکہ بلندی کردار اور صلاحیت کار سے آراستہ ہو کر زندگی کے میدان میں قدم رکھیں، ہمارے اخلاق پاکیزہ اور ہماری پسندیدہ خدمات بے لوث اور کارکردگی شک و شبہہ سے بالاتر ہو، اگر ہم اس امتحان میں پورے اترے تو لوگ ہمیں قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور عزت کے ہاتھوں لیں گے پھر نہ طلب حقوق کی ضرورت ہوگی، اور نہ حصول مراعات کی حاجت، ہمارا اخلاص خود ہماری وکالت کرے گا۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مشکل سے چالیس برس ہوئے ہوں گے، بلب گڑھ (ہریانہ) کے قریب ایک نیک سیرت مسلمان مولوی رحمۃ اللہ رہتے تھے، گاؤں میں اکثریت غیر مسلموں کی تھی، مگر مولوی صاحب سے سبھی محبت کرتے تھے، ان کا معمول تھا کہ فصل کے زمانہ میں سال بھر کی ضرورت کا اناج خرید لیا کرتے تھے، دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو نرخ آسمان سے باتیں کرنے لگے، ایک دن لوگوں نے سنا کہ مولوی صاحب اپنا غلہ فروخت کر رہے ہیں، خیال ہوا کہ زیادہ نفع کی خاطر ایسا کر رہے ہیں، لیکن جب معلوم ہوا کہ سترہ، اٹھارہ سیر فی روپیہ کے حساب سے گیہوں بیچ رہے ہیں تو لوگ حیران ہوئے، ان کے ایک برہمن دوست نے اتنی ارزاں فروشی کی وجہ پوچھی تو مولوی صاحب نے کہا: بھائی ہم سے برداشت نہیں ہوتا کہ ہم سستا اناج کھائیں اور ہمارے بھائی مہنگا خریدیں، اب تو نوالے کانٹوں کی طرح حلق میں چبھتے ہیں، اس لئے میں اپنے گیہوں ہی بھاؤ

مطبوعات جدیدہ

الاسلام از جناب وحیدالدین خاں صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۴ مجلد قیمت: ۱۵ روپیہ، پتہ: رسالہ بک ڈپو، ۴۲۰۳ کشن گنج، دہلی ملے

اس کتاب میں دین کے بعض پہلوؤں کی تشریح اور دعوت دین کے اصول اور طریقے بیان کئے گئے ہیں، دین کی حقیقت کے سلسلہ میں عبادت کا مطلب اس کے تقاضے، مظاہر نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کی روح اور صراط مستقیم کی اہمیت و حقیقت کا ذکر ہے۔ مصنف نے اسوۂ نبوی اور سیرت رسولؐ بیان کرکے اس کے آئینہ میں دعوت دین کے آداب بتائے ہیں، اور دکھایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز و اختتام کس طرح کیا اور اس سلسلہ میں پیش آنے والے مصائب و موانع میں کیا رویہ اور حکمت عملی اختیار فرمائی، دعوت الی اللہ کی اہمیت و فضیلت اور مضمون دعوت کی وضاحت بھی کی ہے، اور اس کے لئے موجودہ معیار کے مطابق ایک اہم دعوتی مرکز کی ضرورت بھی بیان کی ہے، ان کے خیال میں اس کا قیام موجودہ مسلم حکومتوں کے وسیع ذرائع اور مالی وسائل کی بنا پر بہت آسان ہے، ایک مضمون میں ملت کی تعمیر و تحفظ کے ضروری اور اہم خطوط کا ذکر ہے، ایک اور مضمون میں اس زمانہ کی اسلامی تحریکوں اور دینی دعوتوں کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور ان کے طریقہ دعوت کی خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، آخر میں مختلف مضامین دے کر ثابت کیا ہے، کہ اس دور میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی قبولیت اور اس کی جانب میلان کے گوناگوں امکانات پیدا ہو گئے ہیں بشرطیکہ

[illegible]

مقالات

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

سیرۃ النبی جلد ہفتم کا ایک باب مارچ تا مئی [illegible] کے معارف میں
شائع ہو چکا ہے، آج اس کا ایک اور باب پیش خدمت ہے (ع۔ق)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف و خطر کی جا سکے اور اس کے لئے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	خدا نے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي	عمل کئے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	حاکم بنائے گا، جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	جو ان سے پہلے تھے، اور ان کے لئے
الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے

مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور : ۷)

پسند کیا ہے، جاری کرے گا، اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا، میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لئے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک کا ہو جائے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال : ۵)

اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ : ۲۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے: علم و عبادت، تندرستی، روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہی حق تعالیٰ کی اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا:

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (نحل : ۴)

اور جنھوں نے نیک کام کئے ان کیلئے دنیا میں بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر بہتر ہے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی، ان کو بشارت ہے :

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران : ۱۵)	تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا، اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے۔

جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں :

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ (نحل : ۶)	اور جنھوں نے گھر چھوڑا خدا کے لئے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہو۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ (اعراف ۱۹)	اور (اے خدا) ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی

بھلائی اونچی اچھی اور پائدار ہے، اس لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا تو مل جائے گی، مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ، أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ہود: ۲)	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا، مٹ گیا، اور ان کی کمائی اکارت چلی،
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ، وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (شوریٰ، ۲)	جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔
مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ. (آل عمران: ۱۵)	جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا، اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور شکر گذاروں کو ہم پورا انعام دیں گے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا
لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ، ثُمَّ
جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ ، يَصْلَاهَا مَذْمُومًا
مَدْحُورًا ، وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ
وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا

(بنی اسرائیل : ۲)

جو کوئی چاہتا ہو، دنیائے عاجل کو
تو ہم جلد دے دیتے ہیں، جس کو چاہتے
ہیں، پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ کو
بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہوگا برا
ہوکر، دھکیلا جاکر، اور جو کوئی آخرت
چاہے اور اس کی پوری کوشش کی
اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی
کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا
فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

(نساء : ۱۹)

تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے
تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا
اور آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلبگار ہے اس کے لئے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا، تو دنیا تو اس کو مل جائے گی، مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیادت ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے:

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ	تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور
وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا	حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی۔
(نساء : ۸)	

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں :

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے
اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ	احسان کو یاد کرو، جب تم میں نبی بنائے
مُّلُوْكًا۔ (مائدہ : ۲۰)	اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد
اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ طالوت کی نسبت خبر دی گئی :

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ	بے شبہہ خدا نے طالوت کو تمہارا
مَلِكًا۔ (بقرہ : ۳۲)	بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا :

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ	اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت
(بقرہ : ۳۲)	دے دے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا :

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً	اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں
فِي الْاَرْضِ (ص : ۲)	بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی :

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا	اے پروردگار! میری مغفرت کر اور

لَا يَنْبَغِىْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِىْ. (ص : ۳)

مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی۔ اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے دے، اور جس سے چاہے چھین لے:

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران : ۳)

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے، چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اس نے اپنا قاعدہ کلیہ بتا دیا ہے:

اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِىْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (الانبیاء : ۷)

بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں، اس اعلان میں خدا کے فرماں بردار لوگوں کے لئے پیام ہے۔

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے، فرمایا:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌ ۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔ (حج : ۶)

اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے۔ وہ کہ ہم اگر ان کو زمین میں جما دیں، تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں۔ اور برے کاموں سے روکیں، اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے۔ ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھ خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعز اسی منشا کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي	اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ
دِينِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ	کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آئے
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (نور : ۱)	اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لئے تیار رہنا۔

فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ	تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے
(بقرہ : ۲۸)	رسول سے لڑنے کے لئے خبردار ہو جاؤ،

اس لئے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے، تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا[1]، جو لوگ اسلام کے ملک میں فساد کریں، ڈاکہ ڈالیں، لوٹ مار کریں، قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے، اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور قید یا جلا وطنی ہے، اور ان کی اس بےکسی و بےبسی کی کیفیت کو، اور دنیاوی رسوائی کہا ہے:

---

[1] ابوداؤد، باب اخذ الجزیۃ۔

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (مائدہ ۵)

یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں، اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے تو حضرت موسٰی علیہ السلام نے انھیں تسلی دی:

اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا، اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (اعراف ۱۵)

خدا سے مدد مانگو، اور ثابت قدم رہو، زمین تو خدا کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنادیتا ہے، اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔ (اعراف ۱۵)

قریب ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمھیں زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آخر جب وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا، تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام و بے کس قوم خلافت الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ

اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث

وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا	بنادیا، جس میں ہم نے برکت دی ہے،
وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ	اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے
عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا	حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے'

(اعراف : ١٦)

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی، لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے سامنے سے منہ پھیرنے لگے، تو دفعۃً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا اللہ نے ان سے چھین کر دوسروں کو دے دیا۔ ان کی نظر بندی کی ...

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي	اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا
الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ	کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور
مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا	بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے
فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا	پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر
بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي	اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو وہ
بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا	ملک میں گھس گئے، اور اللہ کا وعدہ ہو کر
خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا	رہتا ہے، پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا،
مَفْعُولًا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ	اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی، اور
عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ	تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم
وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا	نیکی کرو گے تو اپنے لئے، اور برا کرو گے
إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ	تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت
وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ	آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا تاکہ تمہارے

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُوۡٓــٴُــا وُجُوۡهَكُمۡ — منہ بگاڑ دیں، اور بیت المقدس میں

وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ — ویسے ہی گھس جائیں، جیسے تمھارے

كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا — پہلے دشمن پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے

مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا (بنی اسرائیل ۱) — اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں

ہر باخبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض کو بیان کئے گئے ہیں، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انھیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہوگا،

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی، تو انھیں پہلے ہی ہشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے، جب تک احکامِ الٰہی کی پیروی کی جائے گی، جب ان سے منہ پھیر دگے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے ان کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے، اور دو دفعہ ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس ان سے چھنا اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا، ایک بابل کے بادشاہ بنوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں، اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا کٹ جانا، ظالم بادشاہوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہونا، اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا نمونہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی، چنانچہ اوپر کی آیت کے بعد ہی ارشاد ہوا،

عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ وَاِنۡ — امید ہے کہ تمھارا پروردگار تم پر رحم کریگا

عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ	اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کروگے، تو
لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۔ اِنَّ هٰذَا	ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے
الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ	اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ
وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ	بنا رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ	جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو
اَجْرًا كَبِيْرًا ۔	جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے
(بنی اسرائیل : ۱)	کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہوگئی، کیونکہ انہیں سنا دیا گیا:

اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ	تم میرا وعدہ پورا کرو، تو میں تمہارا
(بقرہ : ۵)	وعدہ پورا کروں گا۔

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ	کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، اور
اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور
وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا	محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور
وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا	اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں کے
مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ وَاِذْ	سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر

أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ
دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ
أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ
ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ
ثُمَّ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ
أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا
مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ
عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ
وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ؀

(بقرہ : ۱۰)

سیبیجے، اور جب ہم نے تم سے عہد لیا
کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا اور اپنے
کو ان کے وطن سے نہ نکالنا تو تم نے
اقرار کر لیا، اور تم (اس بات کے) گواہ
ہو، پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی
کر دیتے ہو، اور اپنے میں سے بعض
لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے
انھیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو،
اگر وہ تمھارے پاس قید ہو کر آئیں تو
بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو،
حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام
تھا (یہ) کیا (بات) ہے کہ تم کتاب
(خدا) کے بعض احکام کو مانتے ہو،
اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لئے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیا

اور فرمایا:

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ
إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی
سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا
کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن

-

اَشَدِّ الْعَذَابِ ۔	سخت سے سخت عذاب میں ڈال
(بقرہ : ۱۰)	دیے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا دی گئی:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ	اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے
اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ	جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے نام کا
وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ	ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی
مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ	ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو
اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا	کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں،
خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ	مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا
عَظِيْمٌ ۔	میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا
(بقرہ : ۱۴)	عذاب ہے۔

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہوں اور خدا کی زمین میں فساد اور غارتگری پھیلاتے ہوں، ان کے لئے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، ان کو سولیوں پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے جائیں، ان کو ملک سے باہر یا قید کر دیا جائے:

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ	یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے،
فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ	اور آخرت میں ان کے لئے بڑا
(مائدہ : ۵)	(بھاری) عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنھوں نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی
شریعت بنا لیا تھا، یہ سزا سنا دی گئی،

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيمٌ (مائدہ ۶)

دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں
بھی بڑا عذاب ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنیاد پر دین میں
کج بحثی کرتے ہیں، اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منھ پھیرتے ہیں، ان کیلئے
بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي
اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا
كِتَابٍ مُّنِيرٍ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ
عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ، لَهٗ فِي الدُّنْيَا
خِزْيٌ وَّنُذِيقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
عَذَابَ الْحَرِيقِ۔ (حج ۱، ۱)

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا
(کی شان میں) بغیر علم (و دانش) کے اور
بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے
جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ
لیتا ہے، تاکہ (لوگوں کو) خدا کے
راستے سے گمراہ کر دے، اس کے لئے
دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے
دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں)
کا مزہ چکھائیں گے۔

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی نے خبردار کر دیا،

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ
سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو
(معبود) بنا لیا تھا، ان پر پروردگار کا

وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ	غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی
نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ.	میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم
(اعراف : ۱۹)	افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے

ہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لئے ذلت، قومی مسکنت اور غضب الٰہی کے مستوجب ہو گئے، کیونکہ انھوں نے احکام الٰہی سے انحراف کیا، خدا کے رسولوں کو قتل کرتے اور عہد کو توڑتے رہے،

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	اور (آخرکار) ذلت (اور رسوائی)
وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ	اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ	دی گئی، اور وہ خدا کے غضب میں
اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ	گرفتار ہو گئے، یہ اس لئے کہ وہ خدا
الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا	کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور
يَعْتَدُوْنَ.	(اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے
	تھے (یعنی) یہ اس لئے کہ نافرمانی کئے
(بقرہ : ۷)	جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

آخرالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لئے مہلت کا آخری موقع تھا، لیکن ان کی بدستور قائم رہی، اس پر خدا نے قیامت تک کے لئے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ا قسمت میں لکھ دی:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا	یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو
ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ	دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے،

وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ

(آل عمران : ۱۲)

بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آجائیں اور یہ لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لئے کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے یہ اس لئے کہ یہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

دوسری سورہ میں ہے :

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ

(اعراف : ۲۱)

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے شخص کو مسلط رکھے گا، جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں گے بیشک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے، تاریخ کا کونسا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انھوں نے اپنے کئے کی سزا نہیں پائی ہے، اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر مجموعہ سے یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے۔ قرآن پاک کی دعا یہ ہے :

اَللّٰھُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ — اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو
مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ — چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ — چھین لے جس کو چاہے عزت دے اور جس کو
بِیَدِكَ الْخَیْرُ ۔ — چاہے ذلت دے۔

ان آیتوں میں لف و نشر مرتب ہی یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا۔ لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے، احکام الٰہی سے انحراف انبیاء و مصلحین امت کا قتل و تکذیب، حرص و طمع، سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُھُمْ — (خدا نے فرمایا کہ) جن لوگوں نے بچھڑے کو
غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَذِلَّةٌ فِی — (معبود) بنالیا تھا، ان پر پروردگار کا غضب
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِی — واقع ہوگا اور دنیا کی زندگی میں ذلت نصیب
الْمُفْتَرِیْنَ (اعراف: ۱۹) — ہوگی اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچے کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر اس مفتری کے لئے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہ سائی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں در بدر پھریگا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئیگا

وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ — اور جس کو (اس کے اعمال کی پاداش میں) خدا
(حج: ۲) — رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت — بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت
(با ۲۶)

امام الحرمین عبدالملک جوینیؒ

از شاہ نصر احمد پھلواروی معاون رفیق دارالمصنفین

(۲)

امام الحرمین کا سفر بغداد | والد کے انتقال کے بعد امام سات برس اپنے وطن نیشاپور میں رہے، اس عرصہ میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا، تصنیف و تالیف، تدریس و افتا، اور تقریر و خطابت ہر میدان میں ان کے قدم آگے بڑھ رہے تھے، گمراہ فرقوں سے مناظروں کا سلسلہ بھی رہا تھا، ان سرگرمیوں کی وجہ سے وہ کندری کی نظر میں تھے، اس لئے انھیں خاص طور پر شہر چھوڑ دینے کا حکم ہوا، امام نے پہلے ہی اس کا اندازہ کر لیا تھا، چنانچہ انھوں نے نیشاپور سے باہر نکل کر عسکر میں قیام کیا، امام کے شہر سے روانہ ہوتے ہی نیشاپور میں ہلچل مچ گئی، علماء و صلحاء کی ایک بڑی جماعت مقام عسکر میں آ کر جمع ہو گئی اور وہاں سے امام الحرمین کی قیادت میں یہ قافلہ بغداد کی طرف روانہ ہوا[۱]۔

بغداد میں امام کے مشاغل | دولت عباسیہ کے قیام اور دارالخلافت بغداد کی تعمیر پر تین صدیاں گذر چکی تھیں، اس وقت مسند خلافت پر قائم بامراللہ تمکن تھا، لیکن ہارون و مامون اور معتصم و متوکل کی شان و سطوت قصۂ پارینہ بن چکی تھی، ہر طرف طوائف الملوکی کی گرم بازاری تھی، خلیفہ کی حیثیت تبرک سے زیادہ نہ تھی، دارالخلافت بساسیری کے استبداد سے بدحال تھا، آخر کار خلیفہ نے

---

[۱] مرآۃ الجنان ۳ : ۱۲۵، تبیین : ۲۰۸، الاعلام ج ۲ : ۵۹۱۔

طغرل بیگ کو اس کی سرکوبی کے لئے دعوت دی، چنانچہ نیشاپور سے امام الحرمین اور ان کے بغداد آنے کے بعد ۴۴۷ھ میں طغرل بیگ نے بغداد میں قدم رکھا، بساسیری کے اقتدار اور دارالخلافت سلجوقیوں کے زیر اثر آگیا، اس طرح امام جس سلطنت سے نکلے تھے، پھر اس میں داخل ہوگئے۔[1]

بغداد اس وقت جملہ ادیان و مذاہب کی پناہ گاہ اور افکار و نظریات کی رزم گاہ تھا، یہاں ہر شخص کو فکر و اعتقاد کے بارے میں آزادی حاصل تھی، اور مناظروں کا بازار گرم رہتا تھا، بغداد میں علمی پایہ کی کوئی ایسی درسگاہ قائم نہیں ہوسکی تھی جو مدرسۂ نیشاپور کی ہم پلہ ہو، لیکن کے فقہائے ودرس کی شکل میں بکثرت تعلیم گاہیں قائم تھیں، جو اپنی گراں بہا وسیع علمی خدمات کی وجہ سے مشہور آفاق تھیں، ان کی بنا پر اکناف عالم کے علماء و فضلاء کے لئے بغداد ایک مرکز کشش بنا ہوا تھا، امام کلام و عقائد کی طرف طبعی میلان کی وجہ سے بغداد کی اس وسعت اور رنگارنگی سے بہت مانوس ہوگئے، یہاں مختلف اہل مذاہب سے تبادلۂ خیالات اور بحث و گفتگو کا موقع ملا، انھوں نے ہر مذہب کے بارے میں پوری واقفیت حاصل کی اور اس کے ساتھ اہل سنت خصوصاً شافعی و اشعری اکابر علماء سے اکتساب علم بھی کرتے رہے، اس طرح ان کے کلامی ذوق میں مزید نکھار اور آب و تاب پیدا ہوگئی، اور تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اپنی علمی جامعیت اور وسعت نظر کی بنا پر اصحاب علم و کمال کی بزم میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا، اور ان کی مہارت، عقلی موشگافی، علمی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی کی سارے بغداد میں دھوم مچ گئی، صاحب طبقات الشافعیہ کا بیان ہے:

ولقی بالا کابر من العلماء　　اکابر علماء سے ملے، ان سے

---

[1] مختصر تاریخ بغداد ... ج ۲، ابوالفداء ج ۲، ۱۷۳، تاریخ گزیدہ ج ۱، ۴۳۶، تاریخ دول الاسلام ج ۲، ۱۹

وديار سهم ويناظرهم حتى	تبادلۂ خیالات اور مناظرہ کرتے تھے
طار ذكره في الاقطاع	اس کی وجہ سے سارے ملک میں
وشاع ذكره واسمه	ان کا نام لیا جانے لگا اور ان کے
فملأ البلاد به[1]	آوازۂ شہرت سے ساری دنیا گونج

اٹھی۔

اس وقت مذاہب اربعہ کے مشاہیر اہل علم اور صاحبان تدریس و تصنیف میں خطیب بغدادی، قاضی ماوردی شافعی، قاضی ابو عبداللہ دامغانی حنفی، ابو الفضل محمد بن عبداللہ ابن عمروس مالکی، ابو محمد حسن بن علی جوہری، ابو الحسن علی بن ابراہیم باقلانی اور ابو اسحٰق ابراہیم بن علی جیسے نوابغ روزگار اور فضلائے عصر مدینۃ العلم بغداد کے علمائے نامدار اور وہاں کی مجالس علمی کے درشاہوار تھے۔

بغداد کی مناظرانہ فضا نے امام کے کلامی جوہر کو مزید جلا دی، اور انھیں اس رزمگاہ علما مرکز نگاہ اور مرجع خلائق بنا دیا، لیکن علم حدیث کی تشنگی اب بھی باقی تھی، ہر چند کہ وہ متعدد مشائخ سے حدیث کی قرأت و سماعت کا شرف کمسنی ہی میں حاصل کر چکے تھے، پھر ذرا بڑے ہوئے تو اپنے والد شیخ جوینی اور قاری ابو عبداللہ خبازی سے باقاعدہ حدیث کا درس لیا، ابو سعد عبدالرحمٰن بن حسن بن علیک سے سنن دارقطنی کی سماعت کی، فقہ کے اختلافی مسائل میں وہ انھیں احادیث پر اعتماد کرتے تھے، منصور کی چالیس احادیث کا مجموعہ بھی کتاب الاربعین کے نام سے مرتب کیا تھا، اپنے شاگردوں کو اس کا درس بھی دیتے تھے، عبدالغافر فارسی کہتے ہیں کہ میں نے امام سے یہ چالیس حدیثیں سنی ہیں[2]۔

[1] شذرات الذہب ج ۳، ۳۵۹، طبقات ج ۳، ۲۵۲، [2] تبیین ۲۸۵، طبقات ج ۳، ۲۵۲۔

ان محدثین کے علاوہ دوسرے مشاہیر اہل علم سے بھی سند اجازت کا ثبوت ملتا ہے،
ابن خلکان نے لکھا ہے

وسمع الحدیث من جماعة	علمائے حدیث کی کثیر جماعت سے
کثیرة من علمائها، وله اجازة	حدیث کی سماعت کی اور حافظ ابونعیم
من الحافظ ابی نعیم الاصبهانی	اصبہانی صاحب حلیة الاولیاء سے بھی
صاحب حلیة الاولیاء[1]	اجازت حدیث حاصل کی.

ان محدثین سے سماعت واجازت کے باوجود بغداد میں بھی امام نے اپنے ذوق کی سیرابی کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا، اور محمد الجوہری کی طرف رجوع ہوئے جو اپنی محدثانہ حیثیت کی بنا پر بغداد میں خاص امتیاز رکھتے تھے، ابن جوزی نے اس کی تصدیق کی ہے[2]

بغداد جیسے علم وفن کے مرکز میں امام کا اتنا ممتاز ہونا ان کی عظمت وکمال کی دلیل ہے ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام جس وقت بغداد میں آئے تھے، صرف چھبیس سال کے تھے، لیکن سفر بغداد اور وہاں کا قیام ان کے صحیفۂ حیات کا اتنا اہم باب ہے کہ اگر وہ مہاجر بغداد نہ ہوتے تو شاید امام الحرمین بھی نہ ہوتے، اس کم سنی میں یہ سفر ہجرت ان کے لئے رحلت علمی ثابت ہوا.

سفر حجاز | ۴۴۰ھ میں امام الحرمین بغداد آئے تھے اور آٹھ سال کے بعد جب کہ ان کی شہرت کی بازگشت پورے اسلامی قلمرو میں سنی جارہی تھی، بیت اللہ کی کشش نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور وہ عازم کعبہ ہوئے، حکومت کی زیادتیوں سے اشاعرہ پر وطن کی زمین تنگ ہوگئی تھی اور امن وسکون کی خاطر وہ دوسرے شہروں کا رخ کر رہے تھے، اس سلسلہ میں مذہبی مرکز اور

---

[1] ابن خلکان ج ۱، ۵۱۵ [2] الکامل ابن اثیر ج ۱۰، ۵۰، المنتظم ج ۹، ۱۸.

دارالامن ہونے کی وجہ سے حجاز خاص طور سے ان کی پناہ گاہ تھا، موسم حج میں یہ لوگ حجاز میں جمع ہو جاتے تھے، امام الحرمین نے حجاز میں طویل قیام کیا اور وہاں وعظ و تذکیر کے ذریعہ اصلاح عام کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے، اور درس و افتا اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ علم کی اشاعت بھی کرتے رہے، ان کا دن خلق کے ہجوم میں اور شب خالق کے حضور میں گذرتی تھی، رات کو طواف کعبہ اور تہجد میں مشغول رہتے تھے، علامہ سبکیؒ نے لکھا ہے:

وجاور بمكة اربع سنين	وہ مکہ معظمہ میں چار سال تک درس و افتا
يدرس ويفتي ويجتهد في	عبادت و ریاضت اور علم کی نشر و اشاعت
العبادة ونشر العلم حتى شرفت	میں معروف رہے، ان کی ذات سے
به ذلك النادي واشرقت	مکہ کی مجلس کو شرف حاصل ہوا، اور
فلاح ذلك الوادي واسبلت	وادی حجاز کے دشت و جبل روشن
عليه الكعبة ستورها واثباتت	ہو گئے، ان کے طواف کے وقت کعبہ نے
عليه وهو يطوف بها كلما	اپنے غلاف کے سایہ میں لیکر ان کا نور مقدم
اسود جنح الليالي بيض ديجورها	کیا اور جب رات کی تاریکی چھا جاتی تو وہ
وصفت نيته مع الله[1]	اس کو روشن کر دیتے اور ان کی نیت اللہ
	کے ساتھ خالص ہو جاتی۔

قیام حجاز کے علمی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے فتاوی کو ہے، ان کے پاس دور دور سے استفتے آتے تھے، وہ عام مفتیوں کی طرح کسی ایک مذہب کے جزئیات کے مطابق فتوی نہیں دیتے تھے، انھیں جملہ مذاہب پر عبور حاصل تھا، ان کی نظر وسیع

---

[1] طبقات الشافعیۃ ج ۳، ۲۵۲۔

اور فکر عمیق تھی، اس بنا پر ان کے جوابات بڑے اہم اور گراں قدر ہوا کرتے تھے، حجاز میں ان کے تبحر کی شہرت کا باعث ان کے یہی فتاوے ہوئے، ابن خلکان کا بیان ہے :

ثم خرج الی الحجاز وجاور	حجاز تشریف لے گئے، چار سال تک
بمکۃ اربع سنین یدرس	مکہ میں قیام کیا اور درس وافتا کی خدمت
ویفتی ویجمع طرق المذھب[1]	انجام دیتے رہے، ہر ایک مذہب میں فتویٰ دیتے تھے۔

امام کا قیام زیادہ تر مکہ مکرمہ ہی میں رہا، تذکرہ نگاروں نے مدینہ منورہ کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن وہاں کے مدت قیام کی تصریح نہیں کی ہے، صرف ابوبکر بن ہدایۃ اللہ مصنف نے لکھا ہے کہ دس دن مدینہ میں قیام رہا ان کے الفاظ ہیں :۔

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے مدینہ حاضر ہوئے ...... اور دس دن وہاں قیام کیا[2]"

امام الحرمین کا لقب امام الحرمین کا شاندار لقب سرزمین حرم ہی کا عطیہ ہے، اس کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ لوگ عبدالملک جوینی کو بھول گئے اور امام الحرمین سب کی زبانوں پر چڑھ گیا، تمام سوانح نگار اور تذکرہ نویس ان کا اسی لقب سے ذکر کرتے ہیں، لیکن کس بنا پر یہ لقب دیا گیا، اس بارہ میں تذکرہ نگار مختلف الرائے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حرمین شریفین میں صلوات خمسہ کی امامت کرتے تھے، اس لئے ان کو امام الحرمین کہا گیا، ابو الفداء بھی انھیں لوگوں کے خیال سے متفق معلوم ہوتے ہیں[3]، لیکن یہ توجیہ قرین قیاس نہیں ہے، اصل میں ان کو

---

[1] ابن خلکان ج ۱ : ۵۱۵، مفتاح السعادۃ .... تبیین ۲۸۰ . [2] ابوبکر حسینی مصنف کی طبقات الشافعیہ صفحہ ۱۶۲ [3] ابوالفداء ج ۲ : ۲۸۰

قب اس لئے ملاکر حرمین شریفین میں ایک طویل مدت تک ان کا قیام رہا، اور اس قیام کے
ہاں وہاں کے اہل علم ان کے علمی تفوق کا اعتراف کرتے تھے اور اہم مسائل میں ان کی طرف
...ع ہوتے تھے، مورخین نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے، صاحب مرآۃ الجنان لکھتے ہیں،

وجاور بمكة اربع سنين	امام نے چار سال مکہ میں قیام کیا، درس
يدرس ويفتي ويجمع طرق	دیتے اور تمام مذاہب کے طریقوں پر
المذهب ويقبل على التحصيل	فتوی دیتے اور علم بھی حاصل کرتے،
وبهذا قيل له امام الحرمين	اسی لئے امام الحرمین کہلائے، گویا وہ
قلت هكذا، قيل انه لقب	حرمین میں متعین ہو گئے تھے، وہ وہاں
بهذا اللقب بهذا السبب	فتوی دیتے تھے اور وہاں کے علماء پر
وكانه صار متعينا في الحرمين	انھیں تقدم حاصل تھا، اور احتمال یہ
متقدما على علمائها مفتيا فيها	بھی ہے کہ تعظیم کے لئے ان کو امام الحرمین
ويحتمل انه على التفخيم له	کہا گیا ہو جیسا کہ عام محاورہ ہے کہ تعظیم
كما هو العادة في اقوالهم ملك	کے لئے ملک البحرین اور قاضی الخافقین
البحرين وقاضي الخافقين	کہا کرتے ہیں، اور حرمین شریفین کی
ونسبة امامته في الحرمين	طرف ان کی امامت کی نسبت ان دونوں
لشرفهما توصل الى الاشارة	(مقدس شہروں) کے شرف کی وجہ سے
الى شرفه وفضل براعته	ہے، جس سے امام کے شرف و برتری
وفضله وتحقيقه وفهمه	تیزی و ذکاوت اور تحقیق و فہم کی طرف
وعند الله في ذلك حقيقة علمه	اشارہ ہے، حقیقت کا علم اللہ کو ہے

مرآۃ الجنان ج ۳، ص ۱۲۵، الکامل ج ۱۰، ص ۴۱، ج ۱۰ ص ۱۱

نیشاپور کے سیاسی انقلابات | سلجوقی پایۂ تخت نیشاپور، فتنۂ کندری میں ارباب فضل و کمال سے تقریباً خالی ہوگیا تھا، وہاں شوافع اور اشاعرہ کی اکثریت تھی اور یہی لوگ عمید کے بدف ستم بنے، خراسان کے علاوہ حجاز، شام، عراق بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے اور وہاں کے علماء نے اس قیامت خیز شورش کے خلاف احتجاج کیا، حافظ ابوبکر بیہقی نے کندری کے پاس ایک طویل مراسلہ روانہ کیا، اور شیخ ابو القاسم قشیری نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام شکایۃ اھل السنۃ بما نالھم من المحنۃ ہے، نیشاپور میں اعاظم اشاعرہ کی مسندیں نوحہ خواں تھیں مدارس سنسان تھے، امام الحرمین کے مناظرے اور ان کے مذہبی رزم و پیکار کی خموشی سے قدریہ و مجسمہ وغیرہ دوسرے فرقوں کے لئے میدان خالی تھا، یہ اہل جو اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر فائز ہوئے اور نیشاپور میں موجود اہل حق عزلت نشین ہوگئے، خراسان کی مساجد میں دس سال تک امام ابو الحسن اشعری پر برسر منبر سب و شتم جاری رہا، علامہ سبکیؒ نے لکھا ہے:

وصار لابی الحسن بھا اسوۃ	اور شیخ ابو الحسن علی کی مثال حضرت
لعلی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ	علیؓ بن ابی طالب جیسی ہوگئی، یعنی
فی زمن بعض بنی امیۃ[1]	حضرت علیؓ کی شان میں بعض بنی امیہ کے زمانہ میں نازیبا الفاظ کہے جاتے تھے اسی طرح شیخ ابو الحسن اشعری کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔

کندری کا خاتمہ | ۴۵۵ھ میں طغرل بیگ کا انتقال ہوگیا، اور الپ ارسلان تخت نشین ہوا اس عہد کے آغاز ہی میں عمید کا ستارۂ اقبال غروب ہوگیا۔ پے در پے سلطان کی ناراضی کے

[1] طبقات ج ۲، ۲۷۰۔

اسباب مہیا ہونے لگے، بالآخر محرم ۴۸۵ھ میں اسے موصلہ کے قید خانہ میں پہونچا دیا گیا، اور
اسی سال کے آخر میں اپنے اعمال کی سزا میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اور اب نظام الملک
جو شریک وزارت تھا، تنہا مختار کل بن گیا۔

نظام الملک طوسی کا دور وزارت | نامور سلاطین اسلام نے جن اشخاص کے سہارے تاریخ عالم
میں اپنی شوکت و سطوت کے نقوش جاوداں ثبت کئے ہیں، انھیں میں نظام الملک بھی ہے
جس کے دور وزارت میں سلجوقی سلطنت نقطۂ عروج پر پہنچی، وہ الپ ارسلان کا دست
راست اور ملک شاہ کا وزیر مختار تھا، یہ پہلا وزیر ہے جس نے تعلیم گاہوں کو مساجد و زوایا سے
نکال کر پرشکوہ اور عالی شان عمارتوں میں منتقل کر دیا اور پوری مملکت اسلامیہ کو ان عمارتوں
سے مزین اور علم و دانش کے آوازہ سے پر شور کر دیا، اس کے تعمیر کردہ مدارس سے کوئی شہر
خالی نہیں رہا، یہاں تک کہ جزیرہ ابن عمرو جیسے دور دراز مقامات میں بھی ایک بڑا مدرسہ
قائم ہو گیا، کسی زمانہ میں یہ مدرسہ رضی الدین کہلاتا تھا۔[1] نظام الملک خود بھی عالم و فاضل، حافظ
قرآن اور عالم حدیث تھا، اس نے مرو، نیشاپور، اصفہان اور بغداد کے شیوخ سے حدیث کا
درس لیا اور جامع مہدی میں حلقۂ درس قائم کیا، اس کی علم دوستی کا بڑا مظہر نظامیہ بغداد ہے
جسے بجا طور پر دار العلوموں اور یونیورسٹیوں کا ابوالآباء کہا جا سکتا ہے، یہاں تین سو برس سے
زیادہ علوم و فنون کے چشمے رواں رہے، اور ایسے اہل علم پیدا ہوئے، جن میں سے ہر ایک
بجائے خود ایک دار العلوم تھا، نظام الملک نے قلمدان وزارت ہاتھ میں لیتے ہی ان
تمام بے اعتدالیوں اور زیادتیوں کا خاتمہ کیا، جو کندری کے زمانہ سے رائج تھیں، امام ابوالحسن
اشعری اور ان کے متبعین پر لعن طعن اور تکفیر کو جرم قرار دیا، علمائے حق کو نیشاپور آنے کی دعوت

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین ج ۱، ۲۵ [2] الکامل ابن اثیر ج ۱۰، ۱۱ - ۴۲

دی، اور ان سے اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا۔[1]

<u>امام الحرمین کی مراجعت وطن</u> سنہ ۴۵۵ھ کے موسم حج میں عالم اسلام سے آنے والے فرزندان توحید میں صرف عراق و خراسان کے چار سو مفتی، قاضی اور ائمۂ علم و ارشاد موجود تھے، ان میں قضاۃ کی تعداد زیادہ تھی، اسی لئے اس موسم حج کو تاریخ نے "سنۃ القضاۃ" کا نام دیا ہے، جو ائمۂ علم اس موقع پر موجود تھے، ان میں امام الحرمین، ابوالقاسم قشیری، ابوبکر احمد بن حسن بیہقی اور قاضی علی الدہقان مروذی جیسے نامور اصحاب علم کے نام صراحت کے ساتھ ملتے ہیں، صاحب طبقات الشافعیہ نے صراحت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔[2]

مناسک حج سے فراغت کے بعد یہ سب علمائے اسلام حرم میں جمع ہوئے اور ابوالقاسم قشیریؒ نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا:

یا اھل خراسان ان بلادکم ،	اے اہل خراسان اب تمہارا ملک تمہارا
ان الکندری غریمکم قطع اربا اربا	ملک ہے، کندری ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا،
وفرقت اعضاءہ وھا انا اشاھد	میں اس وقت اس کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔

الساعۃ۔

امام قشیریؒ نے اپنے نور بصیرت سے جو دیکھا تھا، واقعات نے اس کی تصدیق کی، صاحب طبقات کا بیان ہے کہ اسی روز کندری قتل ہوا، ابن خلکان اور ابوالحسن علی بن ابی الغوارس نے لکھا ہے کہ یکشنبہ ۱۶ ذی الحجہ کو یہ واقعہ پیش آیا،[3] اسی روز نظام الملک وزیر سلطنت بنا، "سنۃ القضاۃ" کا یہ دن بھی کیسا عجیب تھا کہ ایک ظالم وزیر کا نقش وجود صفحۂ ہستی سے مٹا، اور دوسرا وزیر عادل

---

[1] الکامل ابن اثیر ج ۱۰، ۱۱-۷۲ [2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳، ۲۴۶ [3] ابن خلکان ج ۲، ۳۹۱، اخبار الدولۃ السلجوقیۃ ۲۵۔

بساطِ سیاست پر جلوہ گر ہوا۔ اور پھر ان علماء حق اور فضلاء با کمال کو جو ابھی تک مختلف حصوں میں تھے اپنے وطن میں آنے کا موقع ملا، اس انقلاب کے بعد علماء کی مراجعت شروع ہو گئی، نظام الملک کی دلی خواہش تھی کہ خزاں رسیدہ چمن میں پھر بہار آئے، اس وقت مملکت سلجوقیہ کیا۔ پورے عالمِ اسلام میں جن بزرگوں کی شہرت وعظمت کا آوازہ بلند تھا، وہ امام الحرمین، شیخ ابو القاسم قشیری، شیخ ابو اسحٰق شیرازی اور ابو علی فارمدی تھے، علم کی یکتائی، فکر کی ہمہ گیری، نظر کی وسعت، عمل کی جامعیت اور دین وملت کی خدمت میں سبھی ممتاز تھے، مگر امام الحرمین کی شخصیت ان سب میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے، اس لئے مورخین نے ان کی تشریف آوری کا خاص طور سے ذکر کیا ہے[1]

یہ وہ مبارک ومسعود ساعت تھی کہ عبد الملک جوینی ایک طویل علمی سیاحت کے بعد امام الحرمین ہوکر اپنے محبوب وطن میں اس شان سے آئے کہ خاکِ وطن ہر قدم پر پاؤں ہو رہی تھی، اہلِ نیشاپور گلہائے عقیدت نثار کر رہے تھے، اور نیاز مندانِ قدیم کلماتِ مدح وتوصیف کے ساتھ ان کا استقبال کر رہے تھے۔

امام الحرمین اور نظام الملک کے تعلقات وروابط نظام الملک کے دربار میں ائمہ ومجتہدین، عرفاء وصوفیہ اور شعراء وادباء کا بڑا دلکش اجتماع ہوتا تھا، مورخین متفق اللفظ ہیں کہ

وکان مجلسه عامرًا بالفقهاء وأئمة المسلمين وأهل الدين

اور نظام الملک کی مجلس فقہا، ائمہ مسلمین اور مذہبی رہنماؤں سے بھری رہتی تھی۔

اس میں علوم وفنون کے دریا رواں رہتے تھے، فقہی واجتہادی مسائل اور ادب ولغت کے

[1] ابن خلکان ج ۱، ۵۱۵ ؁

دفتر میں بہت سے بیش بہا اضافے اس مجلس نظامی کی دین ہیں، بعض اوقات ان علمی صحبتوں کی وجہ سے سیاسی کاموں میں خلل ہوتا تھا، ایک مرتبہ نظام الملک کے حاجب نے اس سے کہا کہ آپ اوقات علماء کے ساتھ اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ دیگر امور سلطنت کے انجام پانے میں تعویق ہوتی ہے، اس لئے اوقات کی رعایت ملحوظ رکھئے، یہ سن کر نظام الملک نے کہا:

هذه الطائفة ارکان الاسلام	یہ گروہ ستون اسلام ہے، یہ لوگ دنیا
وهم جمال الدنیا والآخرة ولو	و آخرت کی زینت ہیں، اگر ان میں سے
اجلست کلا منهم علی رأسی لا استقللت	ہر ایک کو میں اپنے سر پر بٹھاؤں تو بھی
لهم ذلک.	ان کے لئے کم سمجھتا ہوں.

ان مدارس پر سالانہ تین لاکھ صرف ہوتے تھے، اس سے خزانہ عامرہ پر بڑا بار پڑتا تھا اس لئے ایک بار ملک شاہ نے کہا کہ اگر اتنی بڑی رقم فوج اور قلعۂ دفاع پر صرف کی جاتی، تو رقبۂ سلطنت قسطنطنیہ تک وسیع ہو جاتا، لیکن وزیر موصوف نے جواب دیا کہ فوج پر سلطان کی فیاضی اس سے مضاعف ہے، لیکن ان ناوک اندازوں کے تیر ایک میل سے آگے نہیں بڑھتے مگر میں اس رقم سے ایسی زبردست فوج تیار کر رہا ہوں، جس کی دعاؤں کے تیر عرش تک پہونچتے ہیں۔

کاشانۂ وزارت میں یوں تو اس برگزیدہ جماعت کے ہر ایک فرد کی پذیرائی ہوتی تھی لیکن چند نفوس قدسیہ کا احترام خاص طور پر کیا جاتا تھا، یعنی شیخ ابو علی فارمدی، شیخ ابو القاسم قشیری ابو اسحٰق شیرازی کہ ان کی آمد کے وقت نظام الملک اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا تھا، امام الحرمین اگر سن و سال کے لحاظ سے ان لوگوں کے برابر نہ تھے، لیکن ان کے مرتبۂ علمی کی وجہ سے ان کی تعظیم کے لئے وہ سر وقد کھڑا ہو جاتا تھا، شیخ ابو القاسم قشیری اور امام الحرمین کے درمیان تفاوت اس قدر تھا کہ شیخ کے دو لڑکے امام سے عمر میں بڑے تھے، ابن جوزی کا بیان ہے کہ شیخ ابو القاسم

نظام الملک اپنی جگہ پر بیٹھا تھا اور خود ان کے سامنے مودب ہو جاتا تھا اور ابوالقاسم قشیری اور امام الحرمین کے لئے صرف قیام تعظیمی پر اکتفا کرتا تھا، شیخ فارمدی کے ساتھ وزیر موصوف کا یہ امتیازی سلوک امام کو ناگوار ہوا اور انھوں نے نظام الملک کے حاجب سے اس کا اظہار بھی کیا نظام نے جواب دیا کہ امام الحرمین، ابوالقاسم اور دوسرے علما میرے سامنے میری تعریف کرتے ہیں، اور شیخ ابوعلی میری فروگذاشتوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور مجھ سے جو بے اعتدالیاں سرزد ہوتی ہیں ان پر تذکیر و موعظت کرتے ہیں، لیکن دوسرے اس بیان سے متفق نہیں ہیں ابن خلکان اور ابن العماد حنبلی نے تصریح کی ہے کہ وزیر موصوف امام الحرمین کی تعظیم و تکریم اس سے زیادہ کرتا تھا، اور ابن کثیر نے لکھا ہے کہ :

قام لھما واجلسھما معہ فی المقعد۔ وہ ان دونوں کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا اور انہیں اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر بٹھاتا تھا۔

نظام الملک کے آئینۂ دل میں امام الحرمین کی دل آویز شخصیت کا حسین عکس اور ان کے علم و کمال کا نقش مرتسم تھا، وہ ان کے ذہن کی تیزی، فکر کی بلندی، نظر کی وسعت اور اصابت رائے کا بیحد معترف تھا، اس بنا پر ذاتی اور ملکی مسائل میں ان سے مشورہ کرتا، بعض اوقات رازکی باتیں بھی ان کے سامنے پیش کرتا، امام الحرمین اور نظام الملک کے گہرے روابط پر اس واقعے سے بھی روشنی پڑتی ہے جسے دستورالوزراء کے حوالے سے بعض مورخین نے بیان کیا ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب نظام الملک ملک شاہ سلجوقی کی بدظنی کی وجہ سے سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوا، چونکہ ملک شاہ کا سوء ظن ظاہری سطح پر نہیں تھا، بلکہ اس کے طرز عمل سے اس کا دل بے چین رہتا تھا، یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ پورے ملک میں اس کو صرف

امام الحرمین کی شخصیت ایسی نظر آئی جس سے نہ صرف اس نے راز دارانہ گفتگو کی بلکہ اس گ
میں ان سے رہنمائی بھی چاہی، خدمت کے باوجود ملک شاہ کی بدظنی کی توجیہ سے اس کا ذ
تھا، لیکن امام الحرمین حالات سننے کے بعد معاملہ کی تہ تک پہونچ گئے، انھوں نے فرمایا کہ "
وزر کی محبت فطری چیز ہے، لیکن سلاطین و امراء خصوصیت کے ساتھ حب دنیا کے مرض
گرفتار رہتے ہیں اور انھیں جب یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی دولت و اقتدار پر کسی اور
ہورہا ہے، تو بے چین ہو جاتے ہیں، ملک کے اہم علاقوں میں اپنے حسن انتظام کی وجہ
جو مقبولیت تم کو حاصل ہوتی جارہی ہے، وہ اس خدشہ میں اضافہ کی موجب ہے، جو لوگ ا
اہلیت اور لیاقت سے ایسے انتظامات کرتے ہیں، ان کے بارہ میں سلاطین گوناگوں شکوک
وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ملک شاہ کی بدظنی کو اسی آئینہ میں دیکھنا چاہئے"۔

امام الحرمین اور نظام الملک کے باہمی روابط کی ترجمانی کرنے والے مذکورہ بالا وا
سے یہ اندازہ کر لینا مشکل نہیں ہے کہ ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت بڑی حد تک
ہو چکی تھی، اور یہ تاثر یک طرفہ نہیں تھا، بلکہ خود امام الحرمین بھی نظام الملک سے متاثر ت
اس تاثر کی بنیاد صرف وزیر موصوف کا امام کے ساتھ فیاضانہ سلوک، ان کی قدر و منزلت ا
ان کے شایان شان تعظیم و تکریم ہی نہ تھی، بلکہ اس نے جس طرح ملک سے ظلم و جور کا خاتمہ کیا
اہل حق کو مصائب سے نجات دلائی، باطل پرستوں کا زور توڑا اور علم و دین کی خدمت کی
وجہ سے اس سے دلی لگاؤ ہو گیا تھا، امام نے اپنے ذاتی و شخصی تاثرات جو نظام الملک
بارے میں ظاہر کئے ہیں، ان میں ممکن ہے کہیں کچھ مبالغہ محسوس ہو اور تعریف و توصیف کے
ضرورت سے زیادہ معلوم ہوں، لیکن یہ امام الحرمین کے دلی تاثرات تھے، اگر کندری کے زما
مظالم پیش نظر ہوں، پھر نظام الملک سلطان کو دور کر کے انصاف اور حسن سلوک کی جو فضا

تاثر کی وہ ہمارے سامنے ہو تو ان کلمات کے اندر مدح سرائی کے بجائے ہمیں اہل حق کی جانب سے اظہار تشکر کا احساس ہوگا، چند جملے سنئے:

"خلق خدا کے سردار، دینی و دنیاوی امور میں ان کے مددگار، قوموں کے پشت پناہ، سیف و قلم کے جامع، جس کی ساعیٔ جمیلہ سے حدود مملکت میں وسعت پیدا ہوئی اور نصرت اسلام کا پرچم بلند ہوا، اس کے ذریعہ گمراہی دور ہوئی اور اس کے عدل نے ظلم کی تیرگی کافور کر دی، اس کے ہاتھوں دولت اسلام کو استحکام ملا اور علمائے امن و چین کا سانس لیا۔"[1]

نظامیہ نیشاپور کی تعمیر | اس وقت دنیائے اسلام میں سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے دو مرکز تھے۔ عراق میں بغداد اور خراسان میں نیشاپور، بغداد دار الخلافت تھا اور نیشاپور دار السلطنت۔[2] ۴۵۹ھ میں بغداد میں نظامیہ کی بنیاد رکھی گئی اور ۴۶۴ھ میں مدرسہ نیشاپور کا افتتاح ہوا، یوں تو بغداد میں گھر گھر درس کے حلقے قائم تھے مگر اس درسگاہ کے قیام سے وہاں علم کو بڑی مرکزیت حاصل ہوئی، نیشاپور میں بھی ایک مدت سے حلقہ ہائے درس موجود تھے جن سے امام الحرمین اور ابوالقاسم قشیری جیسے یگانہ روزگار پیدا ہوئے لیکن اس شہر کی اہمیت کا اقتضا تھا کہ نظامیہ بغداد جیسا دار العلوم یہاں بھی قائم ہو، چنانچہ نظام الملک طوسی کی توجہ سے لوگوں کی یہ آرزو پوری ہوئی اور نیشاپور میں ایک عالی شان درسگاہ قائم ہوگئی، اور امام الحرمین اس کے صدر مدرس قرار پائے، دراصل یہ مدرسہ انھیں کے فیضان درس کو عام کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، امام کو جو شہرت و عظمت حاصل تھی، اس کی بنا پر یہ درسگاہ علماء و طلبہ کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ مدرسہ کی عمارت بڑی شاندار اور پر شکوہ تھی، اس سے سلجوقی قوت و عظمت اور حسن تعمیر کا اظہار

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳: ۱۳۷ [2] مقریزی ج ۴: ۱۹۲۔

بھا تھا، علامت کی بلندی اور خوش نمائی کے ساتھ امام الحرمین کا مدرسہ اس کی شان دوبالا کرتا تھا اور اطراف و اکنافِ عالم سے طالبانِ علم جوق در جوق اس کا رخ کرنے لگے، ایک صدی سے زیادہ اس چشمۂ علم کا فیض جاری رہا، اور امام کے بعد ان کے نامور تلامذہ نے اس کی عظمت قائم رکھی، ان میں امام غزالی، عبدالواحد قشیری، ابوالقاسم انصاری، مسعود بن احمد خوافی اور ابوالمعالی مسعود بن قطب الدین شیرازی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

افسوس ہے کہ اس وقت نیشاپور کی کوئی مفصل تاریخ موجود نہیں ہے، ورنہ دارالعلوم نظامیہ کے حالات بڑی وضاحت کے ساتھ لکھے جا سکتے تھے اور انھیں پڑھ کر آج بھی اہل علم محظوظ ہی نہیں بلکہ مستفید بھی ہوتے، چوتھی صدی میں امام ابو عبداللہ الحاکم نیشاپوری نے تاریخ نیشاپور لکھی تھی اور پانچویں صدی میں عبدالغافر فارسی نے بھی اس موضوع پر ایک اچھی کتاب تصنیف کی تھی، لیکن دونوں ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں، ورنہ ان کے ذریعہ بڑی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، اس وقت ہمارے پاس صرف ان کتابوں کے جستہ جستہ اقتباسات ہیں، انھیں کی مدد سے ہم اس درسگاہ عالی کا تعارف کرانے کی کوشش کریں گے، تاکہ کم از کم اس کی اجمالی تصویر ہی ذہن میں آ سکے، اور ہم قارئین کرام سے کہہ سکیں کہ

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

(باقی)

تخلیقِ آدم کے مراحل

از

جناب ریاض الدین احمد صاحب سابق پرنسپل مجیدیہ کالج الٰہ آباد

میں نہ مذہبی علوم کا عالم ہوں، نہ سائنس کا ماہر، لیکن مطالعہ اور غور و فکر کی شروع سے عادت رہی ہے، ایک دن سورۂ دہر کی تلاوت کر رہا تھا، مندرجۂ ذیل آیتوں کا ترجمہ دیکھا تو کچھ خیالات ذہن میں آئے، احتیاطاً اردو اور انگریزی کے دو، اور ترجمے دیکھے، اس کے بعد سائنسی تحقیقات کا جائزہ لیا، پھر جو کچھ سمجھ میں آیا اسے اہل قلم کے سامنے مزید رہنمائی کی غرض سے پیش کر رہا ہوں (ریاض)

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝

مندرجۂ بالا سورۂ دہر کی ابتدائی آیات ہیں، ان کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"بیشک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا، بلکہ نطفہ تھا)

ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا، اس طور پر کہ ہم اس کو مکلف بنائیں، تو (اس واسطے) ہم نے اس کو سنتا، دیکھتا (سمجھتا) بنایا۔

پھر یا تو وہ شکر گزار اور مومن ہو گیا یا نا شکرا اور کافر ہو گیا۔

مندرجہ بالا ترجمہ مولانا تھانوی کا ہے، مولانا مودودی نے ان آیتوں کا حسب ذیل ترجمہ کیا

کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے، جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟!

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پیدا کیا، تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

ہم نے اسے راستہ دکھایا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

(تفہیم القرآن)

انگریزی ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا یہ ہے:

Surely there hath Come upon man a Space of time When he was nothing worth.

Verily we: we Created man From a Sperm of mixtures that we might prove him wherefore we made him hearing. Seeing.

Verily we: showed him the way then he becometh either thankful or ingrate

اوپر کی سطور میں اردو اور انگریزی کے تین ترجمے درج کئے گئے ہیں، انھیں پڑھئے، آپ کے سامنے کچھ نئے پہلو آئیں گے۔

زندگی کے منازل اور مقاصد | ان آیاتِ کریمہ سے انسانی زندگی کے منازل اور مقاصد کا پتہ چلتا

پہلی منزل اول البشر حضرت آدمؑ کی پیدائش سے لے کر انسان کے رحم مادر میں ندود تک ہے، جب کہ اس کی ہستی ناقابل تذکرہ تھی۔

دوسری منزل قرار نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ سے لے کر ممات تک ہے، اس مدت میں انسان سننے والا، دیکھنے والا اور ایک صاحبِ اختیار کردار والا بن کر ابھرتا ہے۔

تیسری منزل جس کا ذکر براہ راست نہیں کیا گیا ہے، حیات بعد الممات تا یوم حساب ہے، کیونکہ یہ فیصلہ اُسی وقت ہوگا کہ انسان نے شکر کا راستہ اختیار کیا تھا یا کفر کا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے صرف زندگی ہی نہیں بخشی، بلکہ دیکھنے والا اور سننے والا بھی بنایا اور راہ راست کی طرف رہنمائی بھی فرمادی اور اسے عقل اور اختیار عنایت فرمایا کہ شکر کا صحیح راستہ اختیار کرے یا کفر کا غلط راستہ، اور قیامت کے دن اطاعت گذار اور شاکر بندہ بن کر اٹھے، یا روگردانی کرنے والا کافر اور ظالم، تو جس نے اطاعت اور شکر کا راستہ اختیار کیا، وہ امتحان میں کامیاب نکلا، اس کے لئے تو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے، اور جس نے انکار اور کفر کا راستہ اختیار کیا وہ ناکام ہوا، اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی دوزخ اور ہمیشہ ہمیشہ جلنے والی آگ ہے۔

حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ | مندرجہ بالا تراجم میں حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ کو حضرت مولانا تھانویؒ نے زمانہ قلیل لیا ہے جس میں انسان، انسان نہیں تھا بلکہ نطفہ تھا۔

مولانا مودودی نے اس زمانہ کو لا متناہی بتایا ہے، ان کے لحاظ سے یہ ایک ایسا طویل زمانہ ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

مولانا دریابادیؒ نے زمانۂ مذکورہ کو Space of time سے تعبیر کیا ہے، الیاس انطون الیاس کی تالیف عربی سے انگریزی لغت میں "حین" کے معنی (وقت) Time یا Period (زمانہ) دیئے ہوئے ہیں، اور "دھر" کے معنیٰ age لکھا ہے، ویسٹر کی

مشہور ڈکشنری میں Age کے حسب ذیل معنی درج ہیں: Ahistonel n geographical

(ایک تاریخی یا جغرافیائی زمانہ) Period

(2) An epoch (ایک قرن)

(3) A long Time (ایک لمبی مدت)

اسی ڈکشنری میں Space کے تراجم حسب ذیل ہیں:

(1) Distance extending without limit on all directions

(ایسا زمانہ جس کے حدود کسی سمت میں متعین نہیں ہو سکتے)

(2) That which is thought of as boundless

(ایسا زمانہ جو لا متناہی ہو)

پہلے ترجمہ کے لحاظ سے حین من الدھر وہ زمانہ ہے جس میں انسان رحم مادر میں پرورش پاتا ہے، یہ مدت زیادہ سے زیادہ نو ماہ کی ہے، یہی وہ زمانہ ہے جب کہ انسان کی ہستی ناقابل ذکر بتائی گئی ہے، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی بحالت نطفہ انسان ناقابل ذکر رہتا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ رحم مادر میں قیام پذیر ہوتے ہی نطفہ ایک قابل ذکر چیز ہو جاتا ہے، اور انسانی شکل میں ظہور سے پہلے ہی اسے سماجی اور طبی شہرت حاصل ہو جاتی ہے اور سائنسی دنیا اسی وقت سے اس میں شدید دلچسپی کا اظہار کرنے لگتی ہے، اس حقیقت کے پیش نظر "لم یکن شیئاً مذکوراً" کا اطلاق یہاں نہیں ہوتا۔

بقیہ دو ترجموں کے لحاظ سے جب کہ "حین من الدھر" کو زمانہ طویل مانا گیا ہے "لم یکن شیئاً مذکوراً" اس کے مطابق زمانۂ طویل کی حالت ہے۔

اس لئے رحم مادر میں قیام نطفہ کی مدت سے اس کا جوڑ نہیں ملتا کیونکہ یہ مدت قلیل کا ہے، طویل مدت کی کوئی تشریح قرآن پاک سے نہیں ملتی، مولانا عبدالماجد نے اپنے انگریزی کے ترجمے میں "دھر" کے معنی Time from the beginning of the world to its end بتایا ہے یعنی ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کا زمانہ۔

لغات القرآن میں مولانا عبدالرشید نعمانی نے بھی "دھر" کے معنی "عالم کے وجود میں آنے سے لے کر اس کے ختم تک کی مدت تک" کو مانا ہے۔

نسل آدم | بہر حال قرآن پاک کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج جو بھی انسانی نسلیں دنیا میں چل رہی ہیں، یا جو آئندہ وجود میں آنے والی ہیں، سب کی سب حضرت آدمؑ سے وابستہ ہیں، سورۂ اعراف میں فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ ۝	اے نبی لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا۔

اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ایک ہی جان سے تمام عورتیں اور مرد وجود میں آئے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ	لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے
خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ	تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی
وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ	جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان
مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً	دونوں سے بہت سے مرد اور عورت
(نساء: ۱)	دنیا میں پھیلائے۔

"ایک ہی جان" کے بارے میں بعض محققین نے حضرت آدمؑ سے مراد لیا ہے اور بعض نے

تسمیہ آدم سے، ہمارے خیال میں تسمیہ آدم کی ابتدا بھی حضرت آدم ہی سے ہے

پہلی منزل نشاۃ اولی | جب انسان چاہے وہ کسی زمانہ میں پیدا ہوا ہو یا پیدا ہونے والا ہو، حضرت ادل البشر سے نسبی تعلق ضروری اور یقینی ہے، تو یہ تعلق صرف مادی نہیں ہے، بلکہ روحانی بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ سوال پوری نسل انسانی سے ہے کہ

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط　(اعراف)　کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں

اور جواب بھی انفرادی نہیں، بلکہ اجتماعی ہے:

قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا.　(اعراف)　انھوں نے جواب دیا، ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں.

اس بیان قرآنی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی پہلی پیدائش یہی ہے، یہ نہیں معلوم کہ اس پیدائش کے وقت وہ کس شکل وصورت میں رکھا گیا تھا، مگر یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس میں صفات انسانی ضرور موجود تھے:

(۱) اس میں سننے کی صلاحیت تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوال کو ان کا سننا ثابت ہے.

(۲) اس میں بولنے کی صلاحیت تھی، کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب دیا.

(۳) اس میں سمجھنے کی صلاحیت تھی. کیونکہ اللہ نے خود ان کو اپنے اوپر گواہ بنایا؛ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ ؛ تاکہ وہ جواب سمجھ بوجھ کر دے.

سائنس کی روشنی میں | آئیے. اس علم قرآنی کا سائنس کی روشنی میں جائزہ لیں، مگر یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ہمارے بیچ میں سیکڑوں برس سے ہے اور اس کے اشارات کے سمجھنے کے لئے ہم نے سائنس کی ضرورت کبھی نہیں محسوس کی، پھر آج یہ راستہ کیوں اپنایا جارہا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ سائنس نے علوم کے جتنے دروازے کھولے ہیں، وہ اس سے پیشتر کبھی کھلے نہ تھے

مگر سائنس بغیر قرآن کے محرومی اور جہالت ہے، اس لئے ضروری ہے کہ سائنٹسٹ کو قرآن کے قریب لایا جائے اور ان نشانیوں سے روشناس کرایا جائے جو اس صحیفۂ الہامی میں موجود ہیں تاکہ نشۂ علمی اسے چیدہ نہ کر دے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ پچھلا زمانہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کا زمانہ تھا، اس لئے یقین لوگوں کے رگ و پے میں سمایا تھا، دلیل کی ضرورت نہیں تھی، حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے:

خیر القرون قرنی ثم الذین	بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو
یلونھم ثم الذین یلونھم۔	اس سے ملا ہوا ہے، پھر جو اس سے
	ملا ہوا ہے۔

آپؐ یقین کا سرچشمہ تھے، آپؐ کی ذات گرامی دلیل بھی تھی اور مشاہدہ بھی، مگر یہ زمانہ دلیل کا ہے، سائنس کے ذریعہ دلیل پیش فرما دی گئی، تاکہ اتمام حجت ہو جائے، اور صریح نشانیاں ان لوگوں کے سامنے آجائیں جو صاحب یقین نہیں ہیں، تاکہ یہی عذاب الٰہی کے لئے جواز بن جائیں۔

۲. نشانیوں کے باوجود | ویسے تو کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود وہ دل ایمان کی طرف راغب نہیں ہوتے

وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ	جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق
(صافات)	اڑاتے ہیں۔

الگزنڈر گگارن جب دنیا کے سامنے سب سے پہلے خلائی سفر سے واپس آیا تو نادان ڈھٹائی سے بول اٹھا: "میں آسمان کا سفر کر آیا مگر خدا کو کہیں نہیں دیکھا" ظالم یہ نہ دیکھ سکا کہ ایسا خطرناک سفر اللہ کی نگرانی کے بغیر ناممکن تھا، پس یہی ہوا کہ اللہ نے اپنی حفاظت کا ہاتھ اٹھا لیا وہ وہی جو ماہر فن ہونے کے غرور میں تھا، ایک نہایت گھٹیا ہوائی حادثہ میں اپنی جان کھو بیٹھا

۴۔ جینس کیا ہیں؟ توارثِ آدم اور انسان کی پہلی زندگی کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کی تائید جینس کی عالیہ دریافتوں سے بھی ہو رہی ہے۔ جینس کی سائنس (Genetic Science) نے ایسے وسیع حدود اختیار کرلئے ہیں کہ اس کے اثرات اور عوامل کو سمجھنا اور عام فہم زبان میں بیان کردینا امرِ محال کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھی ملکے پھلکے تصورات پیش کردینا زیرِ غور سائنسی فہم کیلئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا، اس لئے اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جینس (Genes) کیا ہیں؟

سائنس کی دنیا میں جینس انقلاب انگیز حیثیت رکھتے ہیں، اور خلیوں کے اجزائے ترکیبی میں اہم ترین مقام کے مالک ہیں، خلیوں سے جینس تک سائنسی دریافت کا ایک طویل سلسلہ ہے جو سترہویں صدی عیسوی میں رابرٹ ہکس (Robert Hooke) سے شروع ہوکر ڈاکٹر کھورانا، ڈاکٹر نیرن برگ اور ڈاکٹر ہولے تک پہونچا ہے، جنھوں نے ۱۹۶۸ء میں جینس کے طرزِ عمل کو دریافت کرنے کے سلسلہ میں مشترکہ طور پر نوبل انعام حاصل کیا، ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر کھورانا اور ان کی ٹیم نے جینس میں ننانوے ۹۹ نیوکلوٹائڈ اکائیاں تلاش کیں، ہمارا جسم خلیوں سے بنا ہوا ہے، خلیے ٹوٹ ٹوٹ کر اتنی مقدار میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، ہر خلیے میں ۴۶ کروموزوم (Chromosome) ہوتے ہیں، کروموزوم باریک ترین دھاگے کی طرح کا ایک کیمیاوی مادہ ہے، یہ اتنا باریک ہوتا ہے کہ صرف بڑے کروموزوم خوردبین سے دیکھے جاسکتے ہیں، ہر کروموزوم پر باریک ترین نقطوں کی شکل کے جینس لاکھوں کی تعداد میں لپٹے رہتے ہیں ہر جین "جین" نیوکلوٹائڈ اکائیوں پر مشتمل زنجیرا (Chains) ہوتا ہے، زنجیرے پر نیوکلوٹائڈ اکائیوں کی تعداد جین کی قامت کے لحاظ سے کم و بیش ہوتی ہیں، اس وقت تک جینس سے ننانوے ۹۹ اکائیاں تک دریافت کی جاچکی ہیں، اور ایک کروموزوم میں نیوکلوٹائڈ اکائیوں کی تعداد کم و بیش تخمینہ کردہ ہوتی ہے، یہ اکائیاں زندگی کے مختلف عوامل اور اعمال کو محیر العقول صحت مندی کے ساتھ انجام دیتی ہیں

اگر ان اکائیوں کی ترتیب میں ایک کا بھی فرق ہو جائے تو انسانی ساخت اور کردار میں عظیم انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

کچھ جینس آباو اجداد کے خاندانی خصائل و کردار، رنگ روپ، قدوقامت اور جسمانی درثوں کی نمایندگی کرتے ہیں، کچھ انسان کی اپنی نشوونما کے مختلف عوامل کو کنٹرول کرتے ہیں مثلاً بال، ناخون کا بڑھنا، کھال کا تبدیل ہونا، خون کی روانی اور ہاضمے کے عرقیات کی تیاری انھیں کا حصہ ہے، ان صلاحیتوں کے باوجود قدرت کا عجیب کرشمہ یہ ہے کہ یہ عدد درجہ ڈسپلن کے ماتحت کام کرتے ہیں، مثلاً وہی جینس جو سر پر بال اگانے کی خدمت انجام دیتے ہیں، ہاتھ کی ہتھیلی اور پیر کے تلووں پر ایک بال نہیں اگا سکتے۔

۴. یہ کردار "جینس" کا یہ کردار کسی انسان کی کاریگری کا مرہون منت نہیں ہے خلیوں کی دنیا پر سائنس کی فتح کا جھنڈا آج بھی نہیں لگ پایا ہے، اور خلیوں کے اندر کروموزوم اور جینس کی پیچیدہ ترین مشین کا خودکار طریقوں پر حیرت انگیز صحت مندی کے ساتھ مدت العمر چلتے رہنا سوائے خالق کردگار کے اور کسی کا کارنامہ نہیں ہو سکتا، پھر ایک ایسے خاندانی ورثے کا جس کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہوتی ہے، کمال احتیاط کے ساتھ پشت در پشت منتقل ہوتے رہنا کوئی اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ ایک مضبوط ترین خدائی منصوبہ ہے، وراثت کا خدائی ریکارڈ جینس (Genes) کے باریک ترین نقطوں کی شکل میں آج سائنس کی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، تو کیا یہ قرآن کے اس دعوے کی کھلی ہوئی تائید نہیں ہے کہ

كُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ	اور جو کچھ انھوں نے کیا، ان کے اعمال نامے
صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ ٥ (القمر)	میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی ہوئی ہے

انسانی اعمال کا نقطوں کی شکل میں محفوظ ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے بھی

ثابت ہے ، عجب کیا ہے کہ جینس پر لپٹے ہوئے ان نقطوں کے رموز جب قیامت کے دن کھولے جائیں تو انسان کا پورا اعمال نامہ ثابت ہوں ؟ بہتر جاننے والا اللہ ہی ہے ۔

کروموزوم اور جینس کی ان گذاریوں میں اللہ تعالیٰ کی تخلیقی صناعیوں کا عجیب و غریب مظاہرہ ہوتا ہے ، بیالوجیکل ٹائم بامب (Bialogical Time Bomb) کے مصنف جارج ریٹرے ٹائلر (George Rattray Taylor) کا خیال ہے کہ کروموزوم کے اندر معلومات کا جو خزانہ چھپا ہوا ہے ابھی اس کا عشر عشیر بھی ہم حاصل نہیں کر سکے ہیں ، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ راز کل کا کل افشا ہو جائے تو دنیا کو ایک زبردست چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے گا

۱۔ نتیجہ ان جینس کی دریافت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے جینس ہی بنیاد ہیں اولاد آدمؑ کے دنیا میں وجود اور ان کے کردار و خصائل کے ۔

(۲) انسان کی موجودہ شکل و صورت اور جسمانی ساخت اس کو حضرت آدمؑ سے ہی ورثہ میں ملی ہے ۔

(۳) لاتعداد نقطوں کی شکل میں کروموزوم پر لپٹے ہوئے جینس انسانی زندگی کی تدریجی حیثیت کی نگرانی بھی کرتے ہیں اور ان کے جسمانی نشوونما پر بھی کنٹرول رکھتے ہیں ۔

(۴) اس لحاظ سے جینس کی حیثیت ایک مضبوط ریکارڈ کیپر کی بھی ہے ، جو انسان کے ہر فعل کو خودکارانہ طریقے پر ضبط کرتا رہتا ہے ۔

(۵) اگرچہ جینس کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہے مگر دنیا میں پیدا ہونے والے انسانوں میں ان کی منتقلی کے اوقات الگ الگ ہیں ۔ اور وہ اس وقت تک غیر فعال رہتے ہیں جب تک کہ انسان حیات دنیا میں نمودار نہیں ہوتا ۔

(۶) اس لحاظ سے ایک لامتناہی مدت (حِینٌ من الدّھر) تک ناقابل تذکرہ (لم یکن شیئاً مذکوراً) ہونا بھی واضح ہو جاتا ہے۔

۷۔ یہاں ایک سائنسی خلا | اول البشر میں یہ جنس کہاں سے آئی؟ اس کے متعلق سائنس خاموش نظر آتی ہے، مگر قرآن پاک نے خمیر انسانی کی تیاری پر پوری روشنی ڈالی ہے، اسی خمیر سے جنس اور کروموزومس کا پیدا ہونا اغلب بلکہ یقینی ہے، مولانا مودودی نے اس ترتیب کو یوں قائم کیا ہے:

۱۔ تراب (مٹی یا خاک) | حضرت آدمؑ کے خمیر میں پہلی چیز مٹی تھی:

كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ — مثال آدم کی سی ہے کہ اسے مٹی سے
(آل عمران) — پیدا کیا۔

۲۔ طین | پھر مٹی میں پانی ملا کر گارے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔
(گارا یا تر مٹی) | بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ — اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا
(السجدہ) — گارے سے کی۔

۳۔ طِينٍ لَّازِبٍ | پھر گارے کو سڑا کر لیس دار بنا دیا گیا:
(لیس دار گارا) | اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ — ان کو ہم نے لیس دار گارے سے
مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (الصّٰفّٰت) — پیدا کیا۔

۴۔ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ | پھر سڑے ہوئے گارے میں تبدیل کر دیا:
(بدبو دار گارا) | حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر) — وہ گارا جس کے اندر بو پیدا ہو جائے

۵۔ کَالْفَخَّارِ | پھر سڑے ہوئے گارے کو سکھا کر ٹھیکری کی طرح کر دیا:
(ٹھیکرے جیسی) | صَلْصَالٍ..... — وہ سڑا ہوا گارا، وہ پکی ہوئی مٹی کے
كَالْفَخَّارِ (الرحمٰن) — ٹھیکرے جیسا ہو جائے۔

یہ مسلسل ترتیب شاہد ہے کہ قبل پیدائش آدم مٹی سے ایک کیمیاوی مادہ تیار کیا گیا، اسی مادہ سے اولین جنس کی پیدائش کا امکان معلوم ہوتا ہے۔

دوسری منزل "حیات دنیا" | "حیات دنیا" جسے ہم نے زندگی کی دوسری منزل قرار دیا ہے، دراصل نشأۃ او ہی تسلسل ہے، کیونکہ قرآن پاک میں نشأۃ اولیٰ اور نشأۃ اخریٰ کے درمیان کسی دوسری زندگی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، ایک طویل مدت تک ناقابل تذکرہ رہنے کے بعد زندگی شروع ہوتی ہے، اس کو یہاں دوسری منزل اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے ابتدائی دور سے انسانی زندگی ایک قابل تذکرہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔

مخلوط نطفہ | اس منزل میں زندگی نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ سے شروع ہوتی ہے، مفسرین کرام نے ترجمہ "مخلوط نطفہ" کیا ہے، اور انگریزی میں (Sperm of mixtures) یعنی اسپرم خلیوں مرکب کہا گیا ہے۔ سائنس کی روشنی میں اس مرکب کی تفصیل یوں ہے:

انسانی نطفہ میں کروڑوں کی تعداد میں اسپرم (Sperm) نامی خلیات ہوتے ہیں۔ ہر خلیے کے اندر تیئیس کروموزوم اور ہر کروموزوم پر لاتعداد جینس ہوتے ہیں، جینس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

(۱) نیوکلیوسائڈ (Nucleoside) جو چار مختلف اقسام پر مشتمل ہے۔

(۲) ڈی آکسی رائبوس (Deoxyribose) جو ایک قسم کی شکر ہے۔

(۳) فاسفورس (Phosphorus)

یہ مرکب حیات انسانی کی کس طرح تشکیل کرتا ہے، وہ بذات خود ایک داستان عجیب ہے جس کی تفصیل بہت پیچیدہ ہے، اس وقت اس کی صرف ایک جھلک پیش کر دینا کافی ہوگا۔

رحم مادر میں | رحم مادر میں انسانی تخلیق اس وقت شروع ہوتی ہے، جب مرد کے اسپرم خلیے عورت کے

جرثومہ خلیوں (Female germ cell) سے ملتے ہیں اور مرد کے تیئیس۲۳ کروموزوم کا عورت کے تیئیس۲۳ کروموزوم سے اتصال ہوتا ہے، پھر تیئیس ادھے کی ایک تھیلی کروموزوم اور جینس سے بھری ہوئی تیار ہو جاتی ہے، یہی خلیہ رحم مادر میں انسان کی خشت اول ہے، پھر یہ ٹوٹ کر نئے خلیے پیدا کرتا ہے اور نئے خلیے ٹوٹ ٹوٹ کر لاکھوں مزید خلیے تیار کرتے رہتے ہیں پھر ایک ہیولیٰ بلا اعضا کا بن جاتا ہے، پھر ایک نامعلوم طاقت اپنی کارفرمائی کرتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حاکم اعلیٰ خلیوں کو حکم دے رہا ہے "تم سر بن جاؤ، تم آنکھ بن جاؤ، تم دماغ بن جاؤ، تم دل بن جاؤ، تم ہاتھ بن جاؤ، تم پیر بن جاؤ" وغیرہ، اور خلیے حکم کی بجاآوری میں سرمو کوتاہی سے کام نہیں لیتے۔ پھر کس مرحلے پر اس میں زندگی کی شمع روشن ہو جاتی ہے یہ کسی کو نہیں معلوم تیئیس۲۳ سو برس سے محققین اس راز کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی۔

تخلیق آدم کے قرآنی مراحل | ہاں تخلیق آدم کے جو مراحل قرآن پاک نے پیش کئے ہیں، وہ آیندہ ماہرین سائنس کے لئے ضرور ایک شاہراہ تحقیق کھول سکتے ہیں، مراحل یہ ہیں:

(۱) پہلے مٹی سے پیدا کیا: خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ۔
(۲) پھر نطفے سے: ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ۔
(۳) پھر خون کے لوتھڑے سے: ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ۔
(۴) پھر گوشت کی بوٹی بنائی: ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ۔
(۵) پھر ان کو شکل والی اور بے شکل والی بوٹیوں میں تبدیل کیا: مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ
(۶) پھر جسے وقت مقررہ تک چاہا رحم مادر میں ٹھہرائے رکھا: وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى۔

(۶) پھر ایک بچے کی صورت میں باہر نکال دیا: ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا

نیویارک کی ایک محقق خاتون ڈاکٹر کرسٹن سین Dr. Christen Cen نے اس مرحلہ پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے اخباری نمایندوں سے کہا:

زندگی بڑے روحانی انداز سے شروع ہوتی ہے، مگر کسی کو نہیں معلوم کہ بچے میں روح کس وقت پھونک دی جاتی ہے۔ اگر آپ صاحب یقین ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ بچے میں جان پڑنا خدا ہی کی مشیت کا کارنامہ ہے:

یہ ہے زندگی کی اس منزل کی ابتدا جس کا دائرۂ عمل حیات دنیا ہے، اور جس کا وقت رحم مادر میں قیام نطفہ سے ممات تک ہے، انسانی زندگی کا یہ دور قابل تذکرہ ہے کیونکہ عمل کا میدان یہی دنیا ہے اور یہاں کے دوران قیام میں ہی شکر یا کفر کی محنت کرتا ہے، یہی امتحان کا دور ہے، اس کے بعد نہ عمل ہے نہ محنت، نہ امتحان۔

تیسری منزل النشأة الاخرىٰ — یہ وہ منزل ہے جس کے حدود میں سائنس کا داخل ہونا ناممکن ہے، یہ بعد الممات کی زندگی ہے جس میں انسان سڑی گلی ہڈیوں کے باوجود ایک بار پھر زندہ کر دیا جائے گا اور یہ کام سوائے خدا کے دوسرا کوئی نہیں کر سکے گا۔

وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى۔ (النجم) — اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اسی کے ذمہ ہے۔

اور اللہ جس نے پہلی بار زندگی بخشی تھی، دوسری بار بھی زندگی بخشنے پر قادر ہے:

ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (عنکبوت) — پھر اللہ دوبارہ بھی زندگی بخشے گا یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

موت کے بعد قیامت تک انسان پر پھر ایک ایسا وقت گذرے گا جس کی کیفیات کا کوئی صحیح
واس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا، مگر بالآخر ایک یوم حساب برپا ہوگا اور حیات دنیا کا چٹھا پورا
لیا جائے گا کہ آیا اس نے اللہ کی ودیعت کی ہوئی سننے کی طاقت کا صحیح استعمال کیا یا نہیں،
یکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت کا ٹھیک ٹھیک فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہا یا نہیں، اگر ان صلاحیتوں
ستعمال کے بعد اس نے اطاعت اور شکر گذاری کا راستہ اختیار کیا تو اس آخری زندگی میں اس کیلئے
بی اور کامرانی ہے اور اگر انکار اور کفر کا راستہ اختیار کیا تھا تو یہ زندگی بگڑ گئی، اور اب
کوئی طاقت سنبھالنے والی نہیں ہے، کیونکہ طاقت والا ہاتھ اس سے اٹھا لیا جائے گا.
اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جس خدا میں یہ طاقت تھی کہ انسان کو ایک لامتناہی مدت تک
ب ذکر حالت میں رکھا اور پھر یکایک اسے عقل وہوش اور گوشت وپوست والا انسان
بنا دے، اس کے لئے یہ کیا مشکل بات ہے کہ اسے پھر ایک طویل مدت تک ناقابل ذکر
ے میں رکھنے کے بعد زندہ کر دے، دراصل قرآن کا طرز استدلال یہ ہے کہ انسان کو صحیح
م کی طرف لے جاتا ہے، سائنس کے تمام مشاہدات اور دلائل کا مقصد یہی ہے کہ انسان اللہ
رنگی پر ایمان لائے، اس یقین کو حاصل کرنے کے بعد اللہ کے بتائے ہوئے آخرت
ے حالات، جزا اور سزا، جنت اور دوزخ پر یقین کر لینا عین مطابق عقل ہوگا.

حوالہ جات

(۱) بیان القرآن — مولانا اشرف علی تھانویؒ
(۲) تفہیم القرآن — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
(۳) تفسیر ماجدی — انگریزی ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ
(۴) قرآن مجید — مولانا فتح محمد خاں جالندھریؒ

(۱۵) فیوض القرآن ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی

(۱۶) لغات القرآن (جلد سوم) مولانا عبدالرشید نعمانی

1. Genes in Action. An UpJohn publication Kalamazoo, Michigan

2. The Track of life(From Gods From outer Space'

3. Are Scientists Creating dangerous New Bacteria- John Frod(Reader Digest March 76

4. The Gene World- Ratan Karaka (Illustrated weekly of India. Dec. 12. 1976

5. A Monograph on Cytology(The Scope publication) Upjohn Coy. Kalamazoo Michigan

6. Dr. Khorana makes a Genetic Works by T. M. Jacol (Science to-day Oct. 1976

7. Living Things (Science in Daily Life by Francis D. Curtis and George Greisch Mallinson

8. The Holy Quran(Translation) Maulana Abdul Majid Daryabadi

دیوان قبلان بیگ کا ایک اہم مخطوطہ

از

پروفیسر سید امیر حسن عابدی، دہلی یونیورسٹی

قبلان بیگ کا ذکر فارسی شعراء کے تذکروں میں نہیں ملتا۔ طاہر نصر آبادی نے اپنے تذکرہ میں قبلان بیگ کا ذکر کیا ہے جو چاوشلو قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور جو غالبؔ مرزا سعید وزیر کاشانی کے والد مرزا عبداللہ کے خالو تھے، ایران میں وہ شاہی قورچیوں میں سے تھے، اس تذکرہ نویس نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ہندوستان آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا، صاحب شمع انجمن نے بھی قبلان بیگ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ صفوی قورچیوں میں سے تھے، نیز جامی کے معاصر تھے، مگر یہ دونوں چیزیں بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں، اس لئے کہ جامی نے ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۹۲ء میں انتقال کیا، جبکہ صفوی خاندان ۹۰۶ھ مطابق ۱۵۰۰ء سے برسر اقتدار ہوا، بہرحال یہ قبلان بیگ مختلف ہیں۔

البتہ ملا عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی میں ان کے حالات نسبتاً تفصیل سے دیے ہیں، نیز صاحب ریاض الشعراء نے ان کا ذکر کیا ہے، فہرست مخطوطات مدراس اور فہرست مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی ان کے کچھ حالات درج ہیں جو شاید مآثر رحیمی وغیرہ پر مبنی ہیں، ان سے استفادہ کر کے یہاں ان کے متعلق لکھا جا رہا ہے۔

چنانچہ یہیں ترشکی قبیلہ سے وابستہ ملک بیلہ ... کے لئے اشتہار[1]، اور ابراہیم کے اس قبیلہ کے

1. مآثر رحیمی، جلد سوم (۳)، ص ۱۰۹۰، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۹۳۱ء۔

شیر بیگ، شہنشاہ اکبر[1] کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور ان کے قورچیوں میں داخل ہوئے، ان کے صاحبزادے قیلان بیگ یہیں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی طرح مرزا عبدالرحیم خانخاناں[2] کی فوج میں رہے، جہانگیر[3] بھی ان کی عزت کرتا تھا، سنہ ۱۰۳۰ھ مطابق سنہ ۱۶۲۱ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

انھوں نے اپنی مثنوی "ماہ ودستان" میں اپنا حسب نسب بتلایا ہے، اسی سے مآثر رحیمی میں یہ ابیات نقل کئے گئے ہیں:

بہر مجلس کہ باشم ارجمندم — کہ بستان سخن را نخل بندم
نسب پرسی ز ترکانم ز ترکان — حسب جوئی سخن دانم سخندان
در آئین اوس عالی نشانم — بداغ دودمان توشجیانم
دم آبا سے من بر من نیاز دو — چو تخم از رونق گلشن بنازو

ان کی شاعری کے متعلق مؤلف مآثر رحیمی نے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:

"قیلان بیگ ..... امروز از جملہ تازہ گویان وخوش طبعان ایں زمان ست، ...... روز بروز در میانہ ہمہ زمان بابداع معانی وسخنوری والا نژاد است، در لطف طبیعت وحسن قیافت درمیان ترقانام ممتاز است ودر سخن سنجی ونکتہ گذاری بے مثل ومانند است ...... ابیات وغزل رابغایت نیکو می گوید[4]"

فن سپہگری میں بھی وہ ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، دکن میں وہ سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں کی فوج میں منصبدار تھے اور خانخاناں ان پر کافی مہربان تھے ان کو کوئی جاگیر بھی ملی تھی،

---

[1] سنہ ۹۶۳ھ - سنہ ۱۰۱۴ھ ـ ۱۵۵۶ء - سنہ ۱۶۰۵ء [2] سنہ ۹۶۴ھ - سنہ ۱۰۳۶ھ ـ ۱۵۵۶ء - سنہ ۱۶۲۶ء

[3] سنہ ۱۰۱۴ھ - سنہ ۱۰۳۷ھ ـ ۱۶۰۵ء - سنہ ۱۶۲۷ء [4] مآثر رحیمی جلد سوم، ص ۱۰۸۹ ـ ۱۰۹۱.

قبلان بیگ نے خانخاناں کی مدح میں بہت سے اشعار لکھے تھے اور اس کا مسودہ خود مؤلف مآثر رحیمی کو بھیجا تھا جس کو انھوں نے نقل کیا ہے، ان کا ایک قصیدہ جو اس کتاب میں موجود ہے، اس طرح شروع ہوتا ہے:

باز ہنگام قدح پر کردن است — جشن فروردین و گشت گلشن است

آگے چل کر خانخاناں کی مدح میں لکھتے ہیں:

خانخاناں ابن بیرم خاں کہ او — عقل را بحر و ہنر را معدن است

دیوان قبلان بیگ کا ایک قلمی نسخہ[1] جو خوبصورت نستعلیق میں لکھا ہوا ہے مگر شروع میں ناقص ہے، گورنمنٹ کے کتب خانہ مخطوطات (مدراس) میں موجود ہے، یہ نسخہ شاعر کی زندگی میں، بلکہ شاید خود ان کے اہتمام سے آگرہ میں لکھا گیا تھا۔ اس کے کاتب زاہد ابن شیخ ابراہیم ہیں، جنھوں نے ۹ ربیع الثانی کو اس کی کتابت تمام کی تھی، اس نسخہ کے آخر میں یہ عبارت ہے:

"شرف اتمام و کمال یافت دیوان خورشید نشان، عطارد بیان، افصح زمانی، نفائل انتساب ... میرزا قبلان بیگ ادام اللہ عمرہٗ و دولتہٗ ... بتاریخ نہم ربیع الثانی در دار الخلافہ شہر آگرہ ...."

یعنی مرزا قبلان بیگ جیسے مجمع الصفات شخص کے اس دیوان کی کتابت ۹ ربیع الثانی کو دار السلطنت آگرہ میں مکمل ہوئی۔

یہ نسخہ اتنا خراب ہے کہ ٹھیک سے پڑھا نہیں جاتا، یہ ناقص نسخہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

خیر یزداں و لانستی مدحش — و دمش اژدہائے شیر شکار

اس میں حسب ذیل قصیدے جہانگیر بادشاہ کی مدح میں ہیں:

---

1. Ms no 41, Govt Oriental Mss. Library, Madras.

۱۔ باز بلبل در چمن دستاں زن است .

۲. شاہ خورشید مکاں شاہ جہانگیر جواد .

۳. باز وقت آمد کہ ہر سو گلعذاراں ؟ سیم کار .

۴. خوشا ابر بہشتی لالہ گستر .

۵. شبانہ شکوہ اے از بخت داشتم صد یک .

۶. بجز نگاہ مت آں دلفریب چابک تنگ .

اس کے علاوہ حسب ذیل قصیدہ میں شاہزادہ پرویز (م ۱۰۳۶ھ ـ ۱۶۲۶ء) کی مدح سرائی کی گئی ہے :

سحر شگفتہ نگارے رسید از رہ دور

اسی طرح یہ قصیدہ "سالار نامدار" کی مدح میں ہے، جس سے مراد غالباً عبدالرحیم خانخاناں ہیں:

نو بہار است و چمن سبز و ہوا نیسانی

نفس خاص ندارد یوسف پیسانی

ایک قصیدہ آگرہ کی تعریف میں بھی ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے :

لوحش اللہ آگرہ سرسبز چوں باغ ارم

قبلان بیگ نے اپنی شاعری پر فخر کیا ہے :

. قبلان دلت از فیض الٰہی شد فیاض ـــــ طبع تو بود چشمۂ دریائے فصاحت

نیز اپنے آپ کو حافظ شیرازی (م ۷۹۱ھ ـ ۱۳۸۹ء) کا پیرو بتلایا ہے :

ز صیت ما بجہنیست پر شور شیراز ـــــ کہ ہست حامی دیوان شعرا حافظ

منم در آگرہ با نام خود یگانۂ دہر ـــــ چنانچہ بود بشیراز و ملک حافظ

قبلان بیگ کا کلام عام طور سے متوسط درجہ کا ہوتا ہے، ان کی غزل کے کچھ منتخب اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کے طرز اور درجہ کا اندازہ ہو سکے گا :

نیست کس آگہ ز اسرار خدا دانی چرا ___ مسجد و بت خانہ را از ہم جدا دانی چرا

غم و شادی ز تقدیر خدا نیست ___ زگردوں شکوہ کافر ماجرا نیست

چہ ترسا و مسلمان و چہ کافر ___ بکیش ہر کسے را خانہ ای ہست

دوا کنید بدر دم کہ درد من باقیست ___ ہنوز نیدکہ ایں چاک پیرہن باقیست

بہ بہانے جہاں درخوئے او بدخو نہاں کردند ___ شکست روزگار ما دراں گیسو نہاں کردند

گاہ ماتم پیشہ وگاہے ز اہل سور باش ___ ہر چہ از گیتی نصیبت می شود مسرور باش

اس دیوان میں بہت سے قطعے بھی ہیں جن میں اونٹ، صراحی، شراب، تیغ، بادہ، انگوری کمان و تیر، امیر مظفر، رباب، انگور، زرہ، مروارید، شلوار، چھڑی، گھوڑے، زین وغیرہ کا ذکر ہے، اس قطعہ میں ایک گاؤں کے ملنے اور لوگوں کی اس سلسلہ میں ہیرا پھیری کی شکایت کرتے ہیں ،

بار اول دہی براتم شد ___ کہ زدید اریش گریزد مور

آنہم ارباب دفتر و توفیر ___ بستانند ہمچو خسروؔ طور

بار دیگر کہ منعیم افزود ___ تن و تنخواہ آں نشد معلوم

ایک قطعہ میں لٹو کا ذکر کرتے ہیں ،

چیست آں بیتے کہ چرخ زند ___ اگرش بر زمیں روی صد بار

رقص آید آں بے شرم ؟ ___ ہمچو دزداں نشستہ بر سر دار

اس نسخہ میں بہت سی رباعیاں بھی ہیں جن میں توحید، نعت، منقبت اصحاب، سپر، زرہ، بیاض، شعر وغیرہ جیسے مضامین ملائے گئے ہیں، ان میں سے بعض رباعیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں

باعشق تو مسجد و خرابات یکیست — باشوق تو طامات و کرامات یکیست

گر مومن و گر یہود و گر ترسایم — اینہا عرض اند جوہر ذات یکیست

قیلان اشرف ز کفر و اسلام مباد — در کار تو سامان و سرانجام مباد

طوفان زدہ بادکشتیٔ امید مت — یک دم ز ہجوم موجش آرام مباد

جز زلف تو ہندوے کج اندیشہ کہ دید — جز قامت تو نہال بے ریشہ کہ دید

حیرت زدہ بوالعجبہاے تو ام — جز چشم تو بیمار ستم پیشہ کہ دید

حسب ذیل رباعی میں کابل سے لے کر بنگال تک بادشاہ وقت کے عدل و انصاف کی تعریف کی گئی ہے:

نے کابل تنہا ز تو پر داد شدہ — تا صوبۂ بنگال جہاں شاد شدہ

از عدل تو آشتی دو اضداد شدہ — در کشور صبح شام آباد شدہ

اس نسخہ کے آخر میں ایک مثنوی ساقی نامہ ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

الا اے دل بیدل سر بجیب — چہ داری بدست از فتوحات غیب

اس میں جہانگیر کی مدح کی گئی ہے، اس سلسلہ کی ایک بیت یہ ہے:

جہاں پادشاہی جہانگیر نام — کہ تہر ش چو تیغ ست و لطفش چو جام

یہ ایک اخلاقی مثنوی ہے، جس میں قناعت، قدرت اہل دنیا، شرف عزلت وغیرہ جیسے مضامین بیان کئے گئے ہیں:

اس دیوان کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی موجود ہے، اس نسخہ میں ایک قطعہ تاریخ ہے جس سے ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱-۳۲ء) نکلتا ہے نیز اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سال تک بقید حیات تھے۔

---

۱ نمبر ۴۴۲،

شمائل النبیؐ

(عبدالمحمد تزین)

از سیدہ عزت النساء ایم اے، ریسرچ اسکالر (عثمانیہ یونیورسٹی)

عبدالمحمد نام، تزین تخلص، عہد مغلیہ کا ایک افغانی الاصل دکنی شاعر ہے، لیکن شاعر کے تعلق سے تفصیلی معلومات بہم دست نہ ہو سکے، "شمائل النبیؐ" کے علاوہ اس کی ایک اور مثنوی "نور نامہ" کا پتہ چلتا ہے، جو کتب خانہ سالار جنگ بہادر میں محفوظ ہے، جس میں تزین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپائے مبارک اور اخلاق و عادات کا تذکرہ خوبی سے کیا ہے، لیکن نقل روایات میں تحقیق و تنقیح سے کام نہیں لیا، بلکہ رطب و یابس سبھی جمع کر دیا ہے۔ زیر بحث مثنوی شمائل النبیؐ، اوائل ۱۱۰۰ھ میں ضبط تحریر میں لائی گئی، اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تزین نے اسے پشتو زبان سے دکنی میں ترجمہ کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پشتو زبان سے بھی واقف تھا، اس مختصر سی مثنوی میں بھی تزین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک اور اخلاق و عادات کو پیش کیا ہے، لیکن صحیح اور غیر صحیح روایات میں امتیاز نہیں کیا ہے، نصیر الدین ہاشمی رقمطراز ہیں:

> "عبدالمحمد تزین نے گیارہویں صدی کے اوائل میں ایک مثنوی "شمائل النبیؐ" کے عنوان سے لکھی ہے ..... اس مثنوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا اور اخلاق و عادات کو نہایت خوبی سے قلم بند کیا ہے"

اس مثنوی کے نسخے کتب خانۂ آصفیہ، کتب خانۂ سالار جنگ، اور کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو میں

محفوظ ہیں، شاعر پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے مثنوی کی ابتدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے خدا! تو سچا ہے، نیک ہے، رحیم ہے۔ تو نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم کردی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ سے میرا دل شاد کردے، پھر شاعر اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ اے خدا! تو میری زبان کھول تاکہ میں نبیؐ کے شمائل بیان کرسکوں، اس کے بعد شاعر زیر نظر مثنوی کے ماخذ کے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے اس کو پشتو سے دکنی زبان میں منتقل کیا ہے۔

اس کے بعد شاعر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپائے مبارک کا بیان اس طرح شروع کرتا ہے کہ میں نبیؐ کے شمائل بیان کرتا ہوں، اس کو کان جس قدر سن سکے سنے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر بارہ لاکھ تیرہ ہزار تین سو بال تھے اور ریش مبارک میں چھ لاکھ بیس ہزار دو سو بال تھے، جن کی خوشبو مشک و سنبل سے بڑھ کر تھی، مگر ان میں سترہ سو بال سفید ہوگئے تھے جو موتی کے مانند چمکتے تھے، مگر موئے مبارک کی تعداد کی تصریح کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں، اور سفید بالوں کی تعداد تو صریحاً غلط ہے، روایات صحیحہ میں بہت کم تعداد بیان کی گئی ہے۔

بعد ازاں شاعر معراج کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ترسٹھ برس کو پہونچے تو خدا نے حضورؐ کو ملاقات کا شرف بخشا، یہ بیان بھی صریح غلط ہے، کیونکہ ترسٹھ سال کی عمر میں حضورؐ کی وفات ہوگئی تھی، پھر کہتا ہے کہ اس رات حضورؐ کا دل سوزِ عشق سے لبریز اور خدا کی محبت سے آپ کا چہرہ زرد تھا، اور حضورؐ نے ایک من دو سیر خوراک تناول فرمائی تھی (یہ روایت بھی بالکل غلط ہے، نہ عقلاً درست ہے اور نہ عادۃً) یہاں شاعر معراج کے واقعہ کو مکمل کرنے کے بجائے پھر سراپائے مبارک کی طرف رجوع ہوجاتا ہے، اور کہتا ہے کہ حضورؐ کے ابرو میں دو ہزار بال تھے، جو بہت چمکتے تھے، پلکوں میں دو سو چار بال تھے جو چاند کے مانند چمکتے تھے، مونچھوں میں دو ہزار دو بال تھے، بالوں کی یہ تعداد بھی صحیح نہیں ہے، اس کے بعد شاعر جبریل علیہ السلام کے

بارہ میں کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم لاتے ہیں، حکم خداوندی کے مطابق جبریل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس وقت جب کہ نہ دنیا وجود میں آئی تھی اور نہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا جمال عطا کیا، جس کا ثانی کوئی نہیں، حضورؐ کا بدن مبارک سفیدی مائل گندمی تھا اور کشادہ پیشانی کی تابناکی چاند اور سورج کی روشنی سے بڑھ کر تھی، حضورؐ کی بھنویں بڑی باریک اور خوبصورت تھیں، بڑی بڑی آنکھوں میں سیاہ پتلیاں عجب سماں پیش کرتی تھیں، ناک بلند تھی، چاند سے رخساروں پر جنت کے موتیوں کی لالی تھی اور ان رخساروں کے گرد موتیوں کی زیادہ چمکتی ہوئی داڑھی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی، حضورؐ کے ہاتھ دراز تھے، آپ جہاں بھی تشریف لیجاتے ابر چھتری کے مانند سایہ فگن رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قد نہ تو دراز تھا اور نہ پست، بلکہ حضورؐ میانہ قد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وصورت یوسف علیہ السلام سے زیادہ خوبصورت تھی، جس کے آگے چاند کی روشنی بھی شرمندہ تھی، کمر پتلی اور نہایت خوبصورت تھی، کشادہ سینہ پر بالوں کی لکیر تھی۔

حدیث کے حوالہ سے شاعر کہتا ہے کہ سرور انبیاءؐ فرماتے ہیں کہ جو کوئی میرے شمائل پڑھے یا سنے، اس کو اللہ تعالیٰ کونین میں بے فکر رکھے گا، اس کو عذاب سے نجات مل جائے گی، اور اللہ تعالیٰ اس کو چاروں کتابوں (زبور، توریت، انجیل، قرآن) کا ثواب عطا فرمائے گا، اس کے علاوہ اسے حج اکبر کے ثواب سے بھی سرفراز کرے گا، جنت میں مقام دے گا اور جنگ احد کے شہیدوں کا درجہ ملے گا۔ مگر یہ روایات صحیح نہیں ہیں۔

شاعر اس کے بعد ایک غیر معتبر حکایت بیان کرتا ہے، کہتا ہے کہ بادشاہ محمود غزنوی نے جب شمائل النبیؐ کے فضائل اور برکتیں سنیں تو اسی وقت اس سے مسرور ہو کر اپنا خزانہ لٹا دیا، اس کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ اسی رات وہ خواب میں محبوبِ خدا کے دیدار اور ہم کلامی سے

مشرف ہوا، جیسے خدا نے اسے جنت کا مژدہ سنایا۔ محمود غزنوی خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ
جو سراپائے مبارک دیکھتا ہے اس کی تعریف شاعر نے اس طرح کی ہے کہ حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر
کا نور تھا حضورؐ کی کشادہ پیشانی پر ایسا نور تھا جیسے سورج طلوع ہوا ہو۔ ناک چمپا کی کلی کے مانند
اور سیدھی تھی، دندان مبارک جنت کے موتیوں کے مانند روشن اور چمکیلے تھے، اللہ تعالیٰ نے حضورؐ
دل خاص طور پر اخلاص سے بنایا تھا، حضورؐ کی آنکھیں شرم و حیا سے لبریز تھیں، دونوں ہاتھوں
میں سخاوت کی بڑی قوت تھی، حضورؐ کا دونوں جہان کو روشنی دینے والا سینہ جنت کے لعل و گہر
سے بنایا گیا تھا، آنحضرتؐ کو خدا نے خیر البشر کا درجہ عطا کیا، ان کے ہونٹ امرت کے چشمے کے
مانند تھے اور دانتوں میں ہیروں جیسی چمک دمک تھی اور آواز ایسی تھی جس کو سن کر ساری دنیا مست
ہو جاتی تھی، ابرو کمان دار اور پلکیں پر نور تھیں، خوبصورت اور منور گردن خدا کی عبادت میں جھکی
رہتی تھی، دونوں ہاتھ سخاوت اور شجاعت میں یکتا تھے، آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے صبر و شکر سے
شکم سیر رکھا تھا، وہ ہر وقت حق تعالیٰ کی عبادت میں کمربستہ رہتے تھے اور حضورؐ کے قدم مبارک ہمیشہ
خدا کی عبادت میں لگے رہنے سے اعلیٰ مقام حاصل کر چکے تھے۔

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ ان شمائل کو اچھی طرح سمجھو جس کو شاعر نے دکنی میں نظم کیا ہے،
آگے لکھتا ہے کہ اگر ان شمائل کو کوئی پڑھے یا سنے یا دیکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیگا،
شاعر اللہ تعالیٰ سے استدعا کرتا ہے کہ اے خدا تو میرے گناہوں کو بخش دے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ
علیہ وسلم بے شک تیرے رسول ہیں، مجھ بندے کی مناجات کو تو قبول فرما، آخر میں شاعر محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر ہزاروں درود اور سلام بھیج کر مثنوی کو ختم کرتا ہے۔

دکنی شعراء اور علماء نے جو تصوف پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں وہ نہ روایت کی صحت کو دیکھتے
ہیں اور نہ درایت سے کام لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر قدیم نظم و نثر میں ضعیف اور غیر صحیح

روایات نظم ہوگئی ہیں، اس مثنوی میں بھی ترین نے ضعیف روایتوں کا سہارا لیا ہے۔

زبان اور اسلوب بیان | عہد مغلیہ تک دکنی زبان ترقی کے کافی مدارج طے کر چکی تھی، چنانچہ دور ماسبق کی بہ نسبت اس عہد میں کلام صاف اور نکھرا ستھرا ہو گیا تھا، جس کا اندازہ عشرتی، ولی دیلوری، بحری، امین ضعیفی، وجدی اور ولی اورنگ آبادی کے کلام سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں ہمیں سلاست، متانت، لطف زبان، سادگی اور صفائی ملتی ہے، لیکن جہاں تک عبدالصمد ترین کی زبان اور اسلوب بیان کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے کہ اس کی زبان میں وہ خصوصیات نہیں ہیں، جو اس کے عہد کے نامور شعراء کے یہاں پائی جاتی ہیں، اگرچہ زبان صاف ہے، تشبیہات کا استعمال بھی برمحل ہوا ہے، جذبات عقیدت کی شدت بھی ملتی ہے، لیکن انداز بیان بالکل سپاٹ ہے، ترین بنیادی طور پر مذہبی شاعر ہے اور چونکہ مذہبی شاعر پر تنقید نگار کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی اور خود ایسے شاعر بھی فن کے بجائے موضوع کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم ترین کو ادبی تنقید کی کسوٹی پر رکھیں تو بڑے درجہ کا شاعر تسلیم نہیں دے سکتے۔

تلخیص و تبصرہ

جاپان میں اسلام

از

جناب محمد صدر الحسن صاحب متعلم دار العلوم ندوہ لکھنؤ

(مندرجہ ذیل مضمون مرکز اسلامی (جاپان) کی سالانہ رپورٹ سے ماخوذ ہے)

مرکز اسلامی | تقریباً ڈھائی سال پہلے مرکز اسلامی نے محض اللہ کے بھروسے پر جاپان کے پایۂ تخت ٹوکیو میں ایک مسجد کے قریب ایک چھوٹے سے دفتر سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا، تاکہ جاپانی باشندوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے وقتاً فوقتاً حالات کے مطابق مختلف طریقۂ کار استعمال کئے جاتے رہے، الحمد للہ آج کام بہت حد تک آگے بڑھ چکا ہے۔

مرکز اسلامی کی مجلس انتظامیہ گیارہ ارکان پر مشتمل ہے۔

مرکز نے ڈیڑھ سال کے لئے دو کمروں پر مشتمل ایک مکان کرایہ پر لیا تھا، لیکن حکومت سعودیہ کویت اور دوسرے ممالک کے اصحاب خیر کی مدد سے پہلے سے زیادہ وسیع مکان مسجد کے قریب ہی خرید لیا، لیکن کام کی رفتار اور عملی سرگرمیوں کی بنا پر اس کے قریب ایک مکان اور کرایہ پر لینا پڑا، لیکن اب یہ مکان بھی ہماری تبلیغی سرگرمیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔

بنیادی مقاصد | مرکز کے پیش نظر دو بنیادی مقاصد ہیں:

۱. اسلام کی وسیع اور اہم کتابوں کی جاپانی زبان میں اعلیٰ پیمانے پر نشر و اشاعت۔

۲. جاپانی باشندوں کے اندر شخصی اور اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ اسلام کا تعارف۔

دعوت و تبلیغ | مرکز کی سرگرمیوں کا ایک مقصد جاپانی باشندوں میں اسلام کی نشر و اشاعت اور اسلامی تعلیمات سے انھیں ہم آہنگ بنانا ہے، اس مقصد کے لئے جاپان کے مختلف علاقوں میں تبلیغی دورے ہوتے رہتے ہیں، جن کی مختصر سرگذشت حسب ذیل ہے:

۱. چند ماہ پہلے جزیرہ ہوکیڈو کا ایک سنجیدہ آدمی مرکز میں مجھ سے ملنے آیا (جزیرہ ہوکیڈو جاپان کے چار بڑے جزائر میں سے ایک ہے اور جاپان کے شمالی سمت میں واقع ہے) اور ہماری مطبوعات کی بلا معاوضہ نشر و اشاعت پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا، اس سے تھوڑی دیر گفتگو ہوئی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا، اس طرح جاپان کی شمالی سمت اسلامی تنظیم اور اس کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ایسی کڑی فراہم ہو گئی جس سے ہم اپنے مستقبل کی دعوتی جد و جہد میں بہت حد تک خود کفیل ہو سکیں گے، ان سے اخوت و ہمدردی کی بنا پر تعلقات بڑھتے رہے، اور آج وہاں ان کی کوششوں سے تیس آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور جمعیۃ ہوکایدو الاسلامیۃ کے نام سے ایک انجمن بھی قائم ہو چکی ہے، ہم لوگ ہر تبلیغی دورے پر وہاں عمائد شہر اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو جمع کرتے ہیں اور مقالات کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہیں اور انھیں اپنی مطبوعات فراہم کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں نے یہ بھی کوشش جاری کر رکھی ہے کہ جاپان کے جنوبی خطے جزیرہ اوکیاوہ تک اسلام کی دعوت پہونچائیں، اس طرح ہم پورے جاپان کو اپنی سرگرمیوں کا میدان بنا سکیں گے۔

۲. عمر اوشی، جنھوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے اور جمعیۃ الشباب کے سکریٹری ہیں اپنی قوم میں اسلام کی دعوت کو عام کرنے میں بہت دلچسپی اور سرگرمی سے کام کر رہے ہیں، یہ

جمعیۃ الشباب" جاپان کے مشہور شہر یاییزو میں ہے، یہ شہر جاپان کے مچھلی کا شکار کرنے والی کشتیوں کا مرکز اور بندرگاہ ہے، یہ ٹوکیو سے جنوب کی جانب دو سو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، انھوں نے دو مرتبہ ہمیں تبلیغی دورہ پر آنے کی دعوت بھی دی اور شہر کے ذمہ دار حضرات مچھلی کے شکاریوں جمعیۃ الشباب کے ارکان اور ثانوی مدارس کے اساتذہ سے ہماری ملاقات کرائی، ہم نے اسلامی تعلیمات اور اسلام کے بنیادی اصول سے ان لوگوں کو روشناس کرایا اور اپنی مطبوعات دیں۔

(۳) تبلیغی میدان میں کام کرنے والے حضرات کئی بار ناجویا بھی گئے، یہ شہر ٹوکیو سے جنوب کی جانب تین سو کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، اس کا شمار متمدن شہروں میں ہوتا ہے اور اس کی تیسری پوزیشن سمجھی جاتی ہے، وہاں ہم لوگوں نے کالج کے طلبہ اور دوسرے مسلمانوں سے بات چیت کی، عید کی نماز وہیں ادا کی اور اجتماعی شکل میں ان لوگوں سے گفت گو کا موقع ملا۔

(۴) سندای جو تمدنی اور ثقافتی اعتبار سے جاپان کے اہم شہروں میں شمار ہوتا ہے اور ٹوکیو کے شمالی جانب چار سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہاں اور وہاں کے مضافات میں تقریباً پچاس جاپانی مسلمان ہیں، ان میں سب سے زیادہ سرگرم عبد الرحمٰن ماکابی ہیں جنھوں نے آج سے بتیس سال پہلے جاپانی زبان میں پہلی بار نماز سے متعلق ایک مختصر رسالہ مرتب کیا تھا، ان لوگوں نے مصر، بنگلادیش اور پاکستان کے ان مسلم طلبہ سے جو توہاکو یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں، رابطہ قائم کر رکھا ہے (یہ یونیورسٹی جاپان کی پانچ اہم یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے) اور انھیں دینی اور تبلیغی میدان میں کام کرنے اور اس راہ میں صلاحیتوں کو صرف کرنے پر آمادہ کر لیا ہے، اور اس کے ساتھ مرکز اسلامی نے سندای کے وسط میں ایک تبلیغی مرکز بھی قائم کر رکھا ہے، اس طرح یہ مرکز اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں بڑا اہم رول ادا کر سکے گا، اسی مرکز میں اس خطہ کے مسلمان نماز ادا کرتے ہیں اور اس طرح ایک اجتماعی فضا ہموار ہو رہی ہے۔

(۵) جاپان میں ٹوکشیما اور ناراٹو کو اسلام کی دعوت و تبلیغ میں دوسری بنیادی حیثیت حاصل ہے، مرکز میں کام کرنے والے حضرات نے ان شہروں کا کئی بار دورہ کیا ہے، نیز اکاہ یوسف ناکاجیما نے بھی الهيئة التجارية الدولية کی دعوت پر کئی بار بھی دورے کئے ہیں، وہاں مرکز سے متعلق فلم کی نمائش بھی کی گئی اور کتابیں تقسیم کی گئیں۔

(۶) کیوٹو (جاپان کا قدیم دارالسلطنت) اسلام کے اہم دعوتی مراکز میں شمار ہوتا ہے، اس مرکز کا تعلق جاپان کے جنوبی اور جنوب مغربی حصوں سے ہے، اس کے ذمہ دار اکاج مصطفیٰ کودا ہیں، جو قرآن کریم کا جاپانی ترجمہ کرنے میں اکاج عمر میتا کے رفیق بھی ہیں۔

(۷) کانازاوہ جاپان کے ثقافتی نشر و اشاعت کے اہم مراکز میں سے ہے، یہ ٹوکیو سے جنوب مغرب کی جانب تقریباً چھ سو کیلو میٹر پر چینی بری حصے کے سامنے ساحل سمندر پر واقع ہے وہاں جاپانی مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم ہے، ہم نے ان سے ملاقاتیں بھی کی ہیں اور مستقبل میں ان سے ہماری بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔

(۸) مسلم نوجوانوں کی انجمن کی دعوت پر ہم لوگوں کا ٹوٹوری بھی جانا ہوا، یہ شہر ٹوکیو کے جنوب مغرب میں آٹھ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، یہاں اسلامی دعوت و تبلیغ کے متعلق مختلف موضوعات پر بات چیت ہوئی۔

(۹) مرکز نے "اوفونا" میں جو ٹوکیو سے متصل ایک شہر ہے، دوروزہ اجتماع کا انتظام کیا تھا، جس میں قرآن و حدیث کی دینی حیثیت اور اسلام کی حقانیت پر متعدد مقالے پڑھے گئے،

(۱۰) مرکز نے مجوزہ پروگرام کے تحت پچاس بدھ راہبوں کو ٹوکیو کی مسجد میں آنے کی دعوت دی اور ان کے سامنے اسلامی عقیدہ اور اس کی لازوال تعلیمات کا ایک واضح تصور پیش کیا، اس موقع پر جاپان کی بعض اہم شخصیتوں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی، جن میں اکاج عمر میتا،

ابوبکر موریموتو اور محمد ساوادا خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔

(۱۱) مرکز نے جاپان کے ثانوی مدارس کے اساتذہ کو بھی ٹوکیو کی مسجد میں آنے کی دعوت دی اور انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا ۔

(۱۲) مرکز، اسلامی جاپان میں موجود چودہ انجمنوں کے ساتھ مختلف میدانوں میں سرگرم تعاون کرتا ہے، جس کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے :

(الف) تمام انجمنوں میں باہمی ربط و تعلق اور خوش گواری کی فضا قائم رکھنا ۔

(ب) انجمنوں کو مرکز کی اسلامی مطبوعات فراہم کرنا ۔

(ج) اسلامی تعلیمات پر لکچر دینے کے لئے اساتذہ کی فراہمی ۔

(د) ایک مشترک دعوتی و تبلیغی چارٹ کا انتظام ۔

(ہ) مرکز آنے والے حضرات کے لئے تمام انجمنوں سے تعارف کا موقع فراہم کرنا

(و) حلقہ بگوش اسلام ہونے والے لوگوں کو ان کے قریب کی کسی انجمن کا پتہ دینا اور اس سے ان کا تعلق قائم کرانا ۔

(ی) طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں بعض انجمنوں کی مالی امداد ۔

(۱۳) ۱۳۹۶ھ میں جاپان کے چوبیس اشخاص نے حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا، جس میں ایک جاپانی مسلمان اور باقی وہ چینی، ترکی اور عرب مسلمان تھے، جنھوں نے جاپان میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے، مرکز اسلامی مزید مسلمانوں کو حج کے مواقع فراہم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

مطبوعات | ترجمہ کی صعوبتوں کے باوجود اللہ کے فضل سے بہت سی مفید مذہبی کتابیں شائع ہوئی ہیں، العد اسلام نام کا ایک چہار ماہی رسالہ بھی نکلتا ہے ۔

آئندہ تعلیم گاہوں اور نشر و اشاعت کے مزید مرکزوں کے قیام کا ارادہ ہے تاکہ کام زیادہ بہتر ہوسکے

ادبیات

غزل

ازجناب مصطفےٰ علی اثیر خلف منشی ممتاز علی صاحب آہ مرحوم تلمیذ رشید امیر مینائی

غم آگیں ترانے کو جی چاہتا ہے　　　یہ دل، دل بنانے کو جی چاہتا ہے
جنوں ہے کہ یہ جستجوئے سکوں ہے　　　نشیمن جلانے کو جی چاہتا ہے
ہے دنیا گرفتار قید تعین　　　کہیں اور جانے کو جی چاہتا ہے
بہار و خزاں سب فریب نظر ہیں　　　یہ پردہ ہٹانے کو جی چاہتا ہے
نہ ساحل کی حسرت نہ کچھ خوف طوفاں　　　بس اب ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے
اجل یوں ہی کہہ دے کہ وہ آرہے ہیں　　　ذرا مسکرانے کو جی چاہتا ہے
محبت کا آغاز تھا کس مزے کا　　　وہیں لوٹ جانے کو جی چاہتا ہے
ڈراتی ہے بجلی چمک کر جہاں سے　　　وہیں آشیانے کو جی چاہتا ہے
غم عشق کی انتہا حد کو پہونچی　　　قفس خود بنانے کو جی چاہتا ہے
اثیر آپ چپ چپ جو رہتے ہیں شاید　　　فسانہ بنانے کو جی چاہتا ہے

غزل

ازجناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

جواں رکھیں جو ہم راہِ طلب میں حوصلے دل کے　　　تو اک اک گام پر کھلنے لگیں اسرار منزل کے

نہ ہو مایوس اے امواجِ غم میں ڈوبنے والے
کبھی طوفاں میں بھی آثار مل جاتے ہیں ساحل کے

نہ کر ترکِ محبت پہ مجھے مجبور اے ناصح!
بہت محکم ہوا کرتے ہیں ناداں فیصلے دل کے

نگاہِ امتیازِ جلوہ و پردہ کریں پیدا
گدا اہلِ نشیں کا ہے جنہیں پردوں پہ محمل کے

جنہیں بینا ہوا اثرِ گل ولالہ سمجھتی ہے
یہ بکھرا بکھرے ہوئے ذرے ہیں سری خاکستر دل کے

سمجھتی ہے نظر ان کی جسے شایانِ غم جوہر
سمجھا دی ہے سب آداب اس کو عشقِ کامل کے

افکارِ اقبال

مترجمہ صالحہ عرشی

(ترجمہ از پیامِ مشرق)

مرا دل بیقرارِ آرزو ہے
مرے سینے میں شورِ ہاؤ ہو ہے
میں کیا بولوں کہ روز و شب مجھ تو
خود اپنے آپ ہی سے گفتگو ہے

پریشاں گلستاں میں مثلِ بو ہوں
نہ جانے کیوں میں محوِ جستجو ہوں
بر آئے آرزو یا بر نہ آئے
شہیدِ سوز و سازِ آرزو ہوں

زمیں کو رازدارِ آسماں کر
مکاں کو شرحِ رمزِ لامکاں کر
ہر اک ذرہ سوئے منزل رواں ہے
تو ہر اک راہ کو اپنا نشاں کر

خضر سے ایک دن بولا سکندر
شریکِ سوز و سازِ آرزو ہو
بس اب تو چھوڑ دے صحرا نشینی
ذرا طوفاں میں چل اور زندہ تر ہو

ضمیرِ کن فکاں تیرے سوا کیا
نشاں بے نشاں تیرے سوا کیا
ذرا بیباک تر ہو زندگی میں
یہ دنیا ہے یہاں تیرے سوا کیا

بابُ التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

نیا دور کا مسعود حسن رضوی نمبر | مرتبہ جناب خورشید احمد صاحب تحقیقی کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۰۴، قیمت ایک روپیہ، پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس ۱۴۶، لکھنؤ۔

مسعود حسن رضوی ادیب اردو کے ممتاز ادیب، محقق اور مصنف تھے، وہ اپنے متنوع اور گوناگوں علمی، تحقیقی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے اس کے مستحق تھے کہ ان کے شایان شان ایک یادگار نمبر شائع کیا جائے، نیا دور لکھنؤ نے اسی حیثیت سے یہ خاص نمبر نکالا ہے، اس میں ان کی زندگی اور خدمات کے مختلف پہلو واضح کئے گئے ہیں، اس نمبر میں مختلف اہل علم و قلم نے حصہ لیا ہے، علی جواد زیدی، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر تمکین، امیر حسن نورانی نے ان کے خاندانی حالات تعلیم و تربیت، علمی کمالات ادبی و تحقیقی خدمات، ملازمت، طرز تحریر، اخلاق و عادات اور انسان دوستی کا بڑا اچھا خاکہ ان کی اور دوسرے ارباب قلم کی تحریروں کی مدد سے پیش کیا ہے، مفتی رضا انصاری نے چند یادیں دلچسپ انداز میں لکھا ہے، شمس تبریز خاں نے ان کے ادبی ذوق اور ادبی خدمات اور اسلوب نگارش پر روشنی ڈالی ہے، دوسرے مضامین میں بھی ان کی زندگی کے خط و خال کی اچھی مصوری کی گئی ہے، آخر میں مسعود صاحب کی چند نادر تحریریں اور خطوط بھی درج ہیں، مشاہیر کے خطوط بنام مسعود حسن کے تحت آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی، عبد الماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، اثر لکھنوی، ڈاکٹر ذاکر حسین

خواجہ غلام السیدین، جوش ملیح آبادی، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور آل احمد خطوط شائع کیے گئے ہیں، جو مفید معلومات پر مشتمل ہیں۔ مشہور شاعر عمر انصاری کے بعض دوسرے شعرا نے بھی منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے، چند نایاب اور نادر تصو بھی اس نمبر کی زینت ہے، یہ نمبر ارباب ذوق کی قدر دانی کے لائق ہے۔

جامعہ کا اقبال نمبر | مرتبہ عبد اللطیف اعظمی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت اعلیٰ، صفحا: ۱۶۰، قیمت دو روپئے۔ ملنے کا پتہ: ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

گذشتہ سال اقبال صدی تقریبات کے سلسلہ میں علامہ اقبال کے شاعرانہ کمالات و تصورات اور احوال و سوانح پر سیکڑوں مضامین لکھے گئے، بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، سیمنار ہوئے اور رسائل نے ضخیم نمبر نکالے۔ اس سلسلہ میں رسالہ جامعہ نے بھی ایک خا نکالا ہے، علامہ اقبال کا جامعہ سے گہرا تعلق تھا، وہ کئی بار وہاں گئے، بعض جلسوں کی بھی کی، جن میں وہ جلسے خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جن میں ترکی کے سابق امیر البحر حسین اور خالدہ ادیب خانم نے ترکی پر اہم خطبے دئے تھے۔ اس نمبر میں رسالہ کے مرتب عبد اللطیف صا ایک مفصل مضمون لکھ کر اقبال اور جامعہ کے روابط کو واضح کیا ہے، اقبال اور اساتذہ جا سلسلہ میں سید نذیر نیازی کا بار بار ذکر آیا ہے، لیکن تعجب ہے کہ جامعہ کے ایک اور استاذ قا نظر انداز کر دیا گیا ہے، حالانکہ عرصہ ہوا "اقبال شاعر اور فلسفی" کے نام سے ان کی ایک شائع ہو چکی ہے، اسی طرح "طلبۂ قدیم اور اقبال" کے ذیل میں رئیس احمد جعفری کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جب کہ انھوں نے اقبال کے متعلق مقالات کے علاوہ "اقبال امام ادب" اور "عشق رسول"، "اقبال اپنے آئینہ میں" کے نام سے تین کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں، اس کا سبب یہ ہوکہ وہ جامعہ کے گریجویٹ نہ تھے، مگر ان کا تعلق جامعہ سے اسٹ ہے، انھو

نہ صرف یہاں کئی سال تعلیم حاصل کی، بلکہ زندگی بھر جامعہ کی محبت میں سرشار رہے۔

اس مضمون میں بعض باتیں بے محل اور بعض مضامین میں غیر ضروری طوالت محسوس ہوئی، مثلاً شیوخ، اساتذہ اور طلبۂ جامعہ کے طویل اقتباسات۔ صفحہ ۵، پر ڈاکٹر ظہیر الدین احمد جامعی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "کوشش کے باوجود معلوم نہ ہو سکا یہ کون صاحب ہیں!" یہ ایم، اے، پی، ایچ ڈی، ڈی لٹ (قاہرہ) اور جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبۂ مذہب و ثقافت تھے، فروری اور اپریل ۱۹۸۳ء کے برہان میں ان کے حالات شائع ہوئے ہیں۔

ضیاء الحسن فاروقی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "حافظ اور اقبال" پر انھوں نے ایک طویل مضمون لکھا جو جامعہ نومبر و دسمبر ۱۹۷۶ء کے شماروں میں شائع ہوا، مگر ص ۴۴ پر جو فہرست مضامین درج ہے اس میں ۱۹۷۶ء کے بجائے غلطی سے ۱۹۶۸ء درج ہوگیا ہے۔ ص ۱۳۲ پر فٹ نوٹ میں اقبال کی تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں نذیر صوفی کی دستاویز کا ذکر ہے جس سے تاریخ ولادت ۱۸۷۷ء ثابت ہوئی، مگر دستاویزی ثبوت درج نہیں کیا گیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا مضمون جو زیر تصنیف کتاب کا ایک حصہ ہے بہت دلچسپ ہے، اس سے عطیہ اور اقبال کے تعلقات پر خاصی روشنی پڑتی ہے، مگر اندیشہ ہے کہ کہیں یہ لوگ شبلی کی طرح اقبال کی داستان نہ شروع کردیں، عتیق صدیقی کا مضمون "اقبال ناشناسی" فکر انگیز ہے، لیکن بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے اس میں ایک جگہ ہے "پاکستان میں اقبال کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ علامہ کی مسند سے انھیں حکیم الامت ہی نہیں بلکہ علیہ رحمۃ بنا کر بزرگان دین کی صف میں لا کھڑا کیا:" ص ۱۳۴۔ علیہ رحمۃ کے بجائے علیہ الرحمۃ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھنا چاہئے تھا، یہ ظلم کی قسم ہماری سمجھ میں نہیں آئی، کون نہیں جانتا کہ مرنے والے کے نام کے آگے "رح" لکھا جاتا ہے، اور پھر بزرگان دین ہی کے لئے مخصوص نہیں، اقبال حکیم الامت بھی تھے، اور اسلام کے حدی خوان بھی

ان میں بڑی حمیت اور ایمانی غیرت تھی، وہ امت مسلمہ کو نیا ولولہ نیا پیام دیتے رہے، ان کے حکیمانہ پیام اور تعلیم سے انکار خود اقبال ناشناسی ہے۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ اور ڈاکٹر وزیر آغا کے مضامین بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ ان معمولی فروگذاشتوں کے باوجود یہ نمبر اقبالیات کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے۔

منادی کا خواجہ حسن نظامی نمبر | مرتبہ خواجہ حسن ثانی نظامی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت طباعت اچھی، صفحات ۹۶، قیمت تین روپیے، ملنے کا پتہ: درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، نئی دہلی۔

خواجہ حسن نظامی سوسائٹی کے تحت دسمبر ۱۹۸۰ء میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں خواجہ صاحب کے بارے میں مختلف اہل علم نے مضامین پڑھے تھے، رسالہ منادی نے ان مضامین کو سلیقہ کے ساتھ مرتب کر کے ایک نمبر شائع کر دیا ہے، اس میں مولانا سید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر بشیر الحق، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور مفتی شوکت فہمی نے خواجہ صاحب کی دلآویز شخصیت اور ان کی خدمات پر دلچسپ اور پر از معلومات مضامین لکھے ہیں، ان کے ساتھ شعرا کا نذرانۂ عقیدت بھی شامل ہے، خواجہ صاحب ایک صاحب اسلوب ادیب تھے، ان کی تحریر میں عجیب بے ساختگی اور البیلا پن پایا جاتا ہے، وہ صف اول کے ادیبوں میں شمار ہونے کے لائق تھے، لیکن افسوس ہے کہ اب اردو کی تاریخوں میں انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اردو ادب کے قدرشناس اس نمبر کی قدر کریں گے۔

غالب نامہ سالنامہ | مدیر جناب نثار احمد فاروقی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت اعلیٰ، صفحات حصہ اردو ۲۰۰، قیمت دس روپے، ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب صدی کی شاندار تقریبات عرصہ تک یاد رہیں گی، اس موقع پر بین الاقوامی سیمینار کے ساتھ ساتھ کتابوں کے صدی ایڈیشن بھی شائع ہوئے تھے، اس ادارہ نے "غالب نامہ" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری کیا ہے، جس کا پہلا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے جو جنوری ۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔

اس رسالہ کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ اس میں غالب کے بارہ میں مضامین ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ غالب پر تحقیقی و تنقیدی مضامین کے جلو میں اقبال اور میر انیس پر بھی قیمتی مضامین شامل ہیں، آخر میں غالب سے متعلق کتابوں پر مفصل تبصرہ ہے۔

غالب سے متعلق مضامین میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا مضمون "نگل رعنا ما ہو" قابل ذکر ہے اس میں انھوں نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ اسے اصل نسخۂ غالب ثابت کرنا سید وزیر الحسن عابدی کی زیادتی ہے، اسی طرح مطالعۂ غالب کے نئے امکانات پر نثار احمد فاروقی نے اچھی بحث کی ہے، اشاریہ سازی پر عبد القوی دسنوی کا مضمون مختصر اور تشنہ معلوم ہوا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے حافظ اور اقبال پر داد تحقیق دی ہے، نائب حسین نقوی نے میر انیس کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ پیش کیا ہے، اس کے شروع میں انھوں نے اس کے غیر مطبوعہ ہونے پر قوی دلائل پیش کئے ہیں، آخر میں غالب صدی تقریبات کی مکمل روئیداد بھی شامل کر دی گئی ہے جس میں سابق صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد کا خطبۂ استقبالیہ مسز اندرا گاندھی کی تقریر، ڈاکٹر ذاکر حسین کا خطبۂ افتتاحیہ اور فخر الدین علی احمد کی مفصل رپورٹ درج ہے، بین الاقوامی سیمینار کے ملکی و غیر ملکی مندوبین کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

غالب اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

<u>الفرقان کا تیسرا انتخاب نمبر</u> | ایڈیٹر مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع متوسط، کتابت طباعت اور کاغذ بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت ۵ روپئے، ملنے کا پتہ: دفتر الفرقان، ۳۱ نیا گاؤں مغربی

(نظیر آباد، لکھنؤ۔

الفرقان مولانا نعمانی کی ادارت میں چھیالیس سال سے دینی، اصلاحی اور علمی خدمات انجام دے رہا ہے، اس طویل عرصہ میں سیکڑوں مفید مضامین شائع ہوئے، لیکن ۴۶ ضخیم جلدوں کا پڑھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، اس لئے مولانا نے مناسب سمجھا کہ ان کا انتخاب شائع کیا جائے، زیر نظر شمارہ تیسرا انتخاب نمبر ہے جس میں ۱۹۶۰ء تک کے مضامین کا ایک خوشنما گلدستہ پیش کیا گیا ہے، امید ہے کہ اسے دینی اور اصلاحی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا اور شوق کے ہاتھوں لیا جائے گا۔

نشان منزل بھوپال کا خاص نمبر؛ مرتب حافظ محمد رضوان خان، کاغذ بہتر، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۱۵۲، تقطیع متوسط، قیمت ۴ روپے، پتہ: دارالعلوم، تاج المساجد، بھوپال (ایم، پی)

نشان منزل دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کا پندرہ روزہ ترجمان ہے، ہر سال اس کا ایک خاص نمبر نکلتا ہے، اس وقت ۱۹۷۱ء کا ضخیم نمبر ہمارے پیش نظر ہے، اس میں زیادہ تر دینی اور اصلاحی مضامین ہیں، بہت سے مضامین پرانے ہیں جو اپنے افادہ اور تاثیر کی بنا پر درج کئے گئے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر مسعود عرفان ندوی کے مضامین خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہیں۔

انتقال اعضاء پر عرب کے ایک عالم کے مضمون کا ترجمہ اس میں شامل ہے، جس میں جسم انسانی میں اعضاء کی تبدیلی کا جواز ثابت کیا گیا، لیکن دلائل بہت ہلکے دئے ہیں، لطف یہ کہ بحث کے دوران عدم جواز کے دلائل اس سے زیادہ قوی نقل کر دئے ہیں۔

افسوس ہے کہ طباعت خراب اور کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ "م، ن" (باقی)

مطبوعاتِ جدیدہ

حرکۃ الانطلاق الفکری وجہود الشاہ ولی اللہ فی التجدید مترجمہ مولانا مقتدی حسن ازہری، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا خوشنما ٹائپ، صفحات ۳۰۴، پتے: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی (۲) ابنا راکجامعۃ السلفیہ ص ب ۲۸۹، المدینۃ المنورۃ المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔

مولانا محمد اسمٰعیل سلفی گوجرانوالوی مرحوم جمعیۃ اہل حدیث کے ممتاز عالم تھے تقسیم کے بعد وہ پاکستانی جماعت کے امیر بھی رہے، اس کتاب میں انھوں نے تحریک اہل حدیث کے بارہ میں شکوک واعتراضات کا جواب دیا ہے، اس سلسلہ میں اہل حدیث کی گذشتہ تاریخ، فکری علمی و دینی خدمات اس کی کتاب وسنت سے وابستگی کی دعوت، ردبدعات اور جمود وتقلید کے خلاف جدوجہد کی تفصیل پیش کی ہے اور اس کے بارہ میں دوسرے مذاہب اور جماعتوں کے ردعمل کا ذکر کیا ہے، مولانا نے اہل حدیث کے معترضین کے جواب میں ان جزئی مسائل اور فقہی احکام پر بھی گفتگو کی ہے جو احناف واہل حدیث کے درمیان مابہ النزاع ہیں اور جن کے بارہ میں ہر ایک کو اپنے موقف کی صحت پر اصرار ہے، مولانا نے اہل حدیث واحناف کے علاوہ دوسرے ائمہ فقہ وحدیث کے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی کی ہے اور اپنے مسلک کی ترجیح وتصویب دلائل سے ثابت کی ہے اور بڑی حد تک مناظرانہ انداز اور طعن وتشنیع سے پرہیز کیا ہے، اسی سلسلہ میں تقلید کے مسئلہ پر بہت مبسوط بحث کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اس کی اشاعت اور اس میں شدت کب پیدا ہوئی، پھر جن لوگوں نے

اس کے خلاف آواز بلند کی، ان کی جد وجہد کا تذکرہ اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کے دوسرے بزرگوں کے کارناموں کا ذکر ہے، نیز تقلید کے متعلق دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر پر تنقید بھی ہے، مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اہل حدیث کی تحریک نئی نہیں ہے، بلکہ اس کا سلسلہ ان محدثین سے جڑا ہوا ہے جن کا متقدمین اور متوسطین ہر دور کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، یہ محض حفاظ حدیث نہیں تھے، بلکہ ایک مستقل مدرسہ فکر کے ترجمان تھے، کتاب پُر از معلومات ہے، مگر ظاہر ہے کہ دوسرے طبقہ و مسلک کے لوگوں کو اس سے اتفاق نہیں ہو سکتا، ہر ایک اپنے ہی مسلک کو قوی سمجھتا ہے، البتہ تقلید کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اصولی حیثیت سے راقم کو اس سے اتفاق ہے، مگر اس کی تائید و تردید میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اس میں حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا جاتا ہے، یہ کتاب پہلے اردو میں شائع ہوئی تھی، پھر جامعہ سلفیہ بنارس کے لائق استاذ اور صوت الجامعۃ کے مدیر مولانا مقتدیٰ حسن ازہری نے اسے عربی میں منتقل کیا، ترجمہ اچھا ہے۔

محاسن الشعر | مرتبہ مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ
الجزء الاول | چھاپ، صفحات ۵۲، قیمت للعہ، پتہ: مکتبہ اصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ،

عربی اشعار کا یہ منتخب مجموعہ عربی کے دوسرے درجہ کے طلبہ کے لئے شائع کیا گیا ہے، اس میں دور رسالت سے اب تک کے مختلف شعراء کا کلام درج ہے، یہ اشعار توحید و معاد، زہد و اتقاء، بے ثباتیٔ عالم اور مکارم اخلاق پر مشتمل ہیں، حواشی میں ہر شاعر کا مختصر تعارف بھی ہے، اس کی ترتیب میں زبان و بیان کی سلاست و روانی کا بھی خیال رکھا گیا ہے تاکہ طلبہ کی ذہنی و فکری اصلاح بھی ہو اور ادبی تربیت بھی، یہ انتخاب عربی مدارس کے نصاب میں شامل کئے جانے کے لائق ہے۔ "ض"

جلد ۱۲۲ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۸ء عدد ۴

مضامین

شذرات

گزشتہ ماہ ان اوراق میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، خوشی ہوئی کہ لوگوں نے انھیں بہت پسند کیا، اور اپنے اپنے حلقوں میں ان کی اشاعت کی، ان میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، ایک یہ کہ مسلمان اپنی سیرت کو بے داغ، اپنی زندگی کو پاکیزہ اور اپنے کردار کو بلند کریں، وہ خود غرضی سے پاک، نام و نمود سے بے نیاز، اور جاہ و منصب کی ہوس سے محفوظ ہوں، وہ اپنے مفاد پر قوم و ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں، اور اپنے فائدہ کے بجائے اپنے بھائیوں کے فائدہ کی فکر غالب ہو، اگر وہ خلوص کے ساتھ خدا کے بندوں کی خدمت کریں گے، تو نصرتِ خداوندی ان کی دستگیری کرے گی، اور واللہ فی عون العبد ما دام العبد فی عون اخیہ کا قدم قدم پر ظہور ہوگا، خدمت خلق کی راہ کھول دے گی، اور عزت و سرفرازی کا مقام بلند نصیب ہوگا،

دوسری بات یہ ہے کہ سیرت کی پاکیزگی، اور اخلاص کے ساتھ وہ اپنی استعداد و صلاحیت کا بھی اضافہ کریں، زندگی کے میدان میں آگے رہنے کی کوشش کریں، کسل و غفلت سے دور رہیں، اور سستی کاہلی اور پست ہمتی کے بجائے ہر راہ میں پیش قدمی کو اپنا شعار بنائیں، کسی معاملہ میں رعایت اور نظر عنایت کے طالب نہ ہوں، بلکہ اپنی لیاقت و کارکردگی کے سہارے آگے بڑھیں، اور رحم و کرم کی درخواست کے بجائے اپنے اندر ایسی قابلیت پیدا کریں کہ لوگوں کی نگاہیں خود ان کی طرف اٹھیں اور باصرار اہم مناصب ان کے سپرد کئے جائیں، رفیع احمد قدوائی مرحوم کو ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا، سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے کبھی کسی عہدہ کی درخواست نہیں کی، بلکہ ہمیشہ عہدے ان کے پیچھے دوڑتے رہے، جو کام مشکل نظر آیا، انہی کے سپرد کیا گیا، اور انھوں نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے انجام دیا کہ لوگ دنگ رہ گئے، اس زمانہ میں ملک میں غذا کی بڑی قلت

محسوس ہوتی تھی کہ کئی نامور وزیر اس معاملہ میں ناکام ہو چکے تھے، بالآخر شیخ صاحب کے سپرد یہ خدمت کی گئی، انھوں نے ایسی خوش تدبیری سے کام کیا کہ غلہ کے ذخیروں کے انبار لگ گئے اور وہ ارزانی ہوئی کہ آج تک لوگ یاد کرتے ہیں۔

دیانت کے بعد ملازمت کی سطح پر بھی آپ کو ایسے مسلمان نظر آئیں گے جو اپنی نیک دلی، ذہانت اور صلاحیتِ کار کی بنا پر طبقہ میں قدر و اعتماد کی نظر سے دیکھے گئے، یو پی کے آئی سی ایس افسر سید صدیق حسن مرحوم سے سب لوگ واقف ہیں، انگریزی عہد میں بھی ان کی حریت پسندی اور آزاد خیالی کی شہرت تھی، اور کانگریس کے دورِ حکومت میں بھی اُن کی آزادی و خودداری کی وہی شان رہی، انھوں نے کبھی اپنی عزت و خودداری پر آنچ نہیں آنے دی، نہ کبھی خوف و ہراس اُن کے پاس پھٹک سکا، مگر اس کے باوجود سب اُن کی قابلیت اور ایمانداری کے معترف تھے اور کسی متعصب سے متعصب وزیر نے بھی اُن کی تعریف و توصیف میں کوتاہی نہیں کی، جو کام اُن کے سپرد کیا گیا انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ لوگ عش عش کرنے لگے، اُن کے ایک ساتھی سابق ریونیو سکریٹری شیخ ظہور حسین کا بھی یہی حال تھا، اُن کی دیانت، قابلیت اور بے لوث خدمت کا سب کو آج بھی اعتراف ہے،

ملازمت کے علاوہ کاروباری زندگی میں بھی اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، ۱۹۴۷ء کا ہولناک خون آشام زمانہ ابھی بھولا نہ ہوگا، اس خطرناک دور میں دلّی کا ایک ایسا علاقہ ہے جو ہندو اور سکھ پناہ گزینوں سے پُر تھا، ڈاکٹر خادم حسین نے اپنا مطب جاری رکھا، اُن کی بے لوث زندگی اور بے غرض خدمت نے دشمنوں کے دل میں گھر کر لیا اور مخالف معتقد ہو گئے، وہ مریضوں کو توجہ سے دیکھتے، اور نسخہ لکھ دیتے، مگر کبھی دام نہ مانگتے، کسی کا جی چاہتا تو فرش پر پیسے ڈال دیتا، ورنہ دوا لے کر چلا جاتا، اور ڈاکٹر صاحب بے نیازی کے ساتھ مریضوں کو دیکھتے رہتے، ساری زندگی اُن کا یہی معمول رہا، اُن کی اس بے نیازی نے انھیں لوگوں کی محبت و عقیدت کا مرکز بنا دیا،

اب ایک ایماندار تاجر کا حال سنئے، فتحپوری میں حاجی محمد اسمٰعیل کی سامانِ عامہ کی ایک دکان تھی، اُن کے حسنِ معاملہ کی ایسی شہرت تھی کہ اُن کی دکان کے سامنے خریداروں کا ہجوم رہتا تھا، دس دس بارہ بارہ آدمی سامان دیتے، مگر اس کے باوجود ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی، ۱۹۴۷ء اور اس کے قریب کے پُرآشوب زمانہ میں بھی حاجی صاحب کی ساکھ میں کوئی فرق نہیں آیا، اور اس مسلم دشمنی کی فضا میں بھی اُن کی دکان کے سامنے غیر مسلموں کی

قطاریں لگی رہتی تھیں، بارہا میں نے خود دیکھا ہے، بازار میں قریب ہی اور دکانیں موجود تھیں مگر لوگ ان کا رُخ نہیں کرتے تھے، اُن لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ حاجی صاحب کے یہاں مال بھی اچھا ملے گا اور دام بھی واجبی ہوں گے،

اخلاص و حسنِ عمل سے سارے معاملات کس طرح سازگار ہو جاتے ہیں، عداوت محبت سے بدل جاتی ہے اور دشمن دوست بن جاتے ہیں، اس کا ایک نمونہ دیکھئے، پانی پت اسلامی علوم و فنون، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایات کا بڑا مرکز تھا، یہاں چپے چپے پر بزرگانِ سلف کے نقوش ثبت تھے، اور شجر و حجر عظمتِ ماضی کی داستانیں سنا رہے تھے، لیکن جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی، اور مغربی پنجاب سے پناہ گزینوں کے قافلے مشرق کی طرف بڑھے تو پانی پت بھی زد میں آ گیا، اور صدیوں کی جمی ہوئی مسلم آبادی آن کی آن میں تتر بتر ہو گئی، لیکن اس خوفناک زمانہ میں مولانا ثناء اللہ کے قدموں میں لغزش نہیں آئی، اور وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے، اُن کے اعزہ و اقربا، یہی نہیں، اہل و عیال تک پاکستان چلے گئے، مگر مولانا کی ثباتِ قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا، اور کچھ ہی عرصہ میں اپنے ایمان و اخلاص، اعتماد علی اللہ، بے غرض خدمت اور بہی خواہیِ خلق کی بنا پر سب کی آنکھ کا تارا بن گئے، اور ہندو، پناہ گزین دیوتا کی طرح اُن کی عزت کرنے لگے، اُن کی ہمت نے دوسروں کی ہمت بندھائی، اور آج بھی پانی پت میں اللہ کا نام لیا جا رہا ہے،

اوپر کی سطور میں تاریخی مثالوں کے بجائے قصداً اُن اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے تھے، یہ واقعات بتاتے ہیں کہ کس طرح اللہ کے مخلص بندوں نے بندگانِ خدا کی خدمت کر کے اللہ کی رضا بھی حاصل کی، اور اس کے بندوں کی خوشنودی بھی، اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنی قوم کے لئے بھی عزت کا مقام حاصل کیا، ہم اپنے استاد مولانا حمید حسن خاں کے یہاں دیکھا کرتے تھے کہ مختلف خیالات و عقائد کے لوگ اُن کے پاس آتے، اور اُن کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے گرویدہ ہو جاتے تھے، میں نے خود اپنے کانوں سے بعض نامور ہندوؤں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس قوم میں آپ کے جیسے برگزیدہ اصحاب موجود ہوں ہم اس کے مخالف کیسے ہو سکتے ہیں،

مقالات

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

(۲)

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بدل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے، اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں حمایت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بدل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے، خدا نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کرکے فرمایا:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا	اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری
وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ	کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے
وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَ	اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے
لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں)

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۔ (مائدہ : ۹)

ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں، ان کو قائم رکھتے، تو (ان پر رزق مینھ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انھوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی :

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔ (اعراف : ۱۲)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے مگر انھوں نے تو تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور : ۷)

جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا :

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا

تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ	کہ تم ان کو حاصل کروگے، سو اس نے غنیمت
(فتح : ۲)	کی تمھارے لئے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمھارے ہی لئے ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ	مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ	تمھیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ
عَذَابٍ اَلِيْمٍ . تُؤْمِنُوْنَ	یہ کہ) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ	اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ	سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمھارے حق
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	میں بہتر ہے، وہ تمھارے گناہ بخش دیگا
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ	اور تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا	بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو
الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً	بہشتہائے جاودانی میں (تیار) ہیں،
فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ . ذٰلِكَ	داخل کریگا، یہ بڑی کامیابی ہے اور
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ . وَاُخْرٰى	ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو،
تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ	(یعنی تمھیں) خدا کی طرف سے مدد نصیب
قَرِيْبٌ . وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ .	ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو
(الصف : ۲)	اس کی خوشخبری سنا دو۔

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ :

هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى	وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت
وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ	اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو
كُلِّهٖ ۔ (توبہ : ۵)	دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشینگوئی دو دفعہ اور سورۂ فتح و سورۂ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اور فتح والی پیشینگوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے، یہ پیشینگوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آئندہ پوری ہونا ہے، اور یہ مسلمانوں کی دلجمی اور اطمینان کا باعث ہے، لیکن اس کے پورے ہونے کے لئے مسلمانوں پر بھی کوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی، جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشینگوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ	اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک
وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ ۔	کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور
(انفال، ۵)	دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

سارا حکم خدا کے لئے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی و جسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے۔ جس کی بھی اطاعت ہو، وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ	(اے نبی!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے

إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا
فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ	اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا
عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا	وہ اس نے معلوم کر لیا، تو ان پر تسلی نازل
وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا	فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی،
وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا	بہت سی غنیمتیں جو انھوں نے حاصل کیں
وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً	اور خدا غالب حکمت والا ہے، خدا نے
تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ	تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا
..... وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا	کہ تم ان کو حاصل کروگے۔ تو اس نے
عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا	غنیمت کی تمھارے لیے جلدی فرمائی،
وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا	..... اور اور غنیمتیں بھی جن پر تم
(فتح : ۳)	قدرت نہیں رکھتے تھے اور وہ خدا ہی
	کی قدرت میں تھیں، اور خدا ہر چیز پر
	قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے، وہ خیبر کی فتح ہے جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی، اور دوسری فتح، اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اس سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا۔ (فتح : ۱) — (اے محمد) ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانۂ کعبہ کے ساتھ

سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہوچکا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فتح و نصرت کے وعدہ کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی مدد اور فتح آچکی اور تم نے
وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ	دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں گروہ در گروہ
فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ	داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی
رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (نصر: ۱)	حمد کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت چاہو

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت فرائض و حقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت بتدریج کے ساتھ تکمیل کو پہونچی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہونچ گیا، اس موقع پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا، اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع و حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور اسلامی حکومت عادلہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں، اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک
الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی	کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ	کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا

مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ (نور : ۵۵)

ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا، اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے، اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے[1] کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا، کیونکہ آپ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی بادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد برحق کی بادشاہی کا قیام تھا۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، وفد رؤسائے قریش کی گفتگو۔

اسی لئے اسلام دین و دنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کے مطالب کی دعوت کو لیکر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شاہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمراں ہے اور وہی زمین پر فرماں روا:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ إِلٰهٌ وَّ	اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور
فِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ. (زخرف ۱۰)	وہی زمین میں.

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور کسریٰ اور جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کا سورہ[1] ہے، مسلمانوں کو بشارت کیا جاتا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ،	(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے،
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ	جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی
يُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ.	کی تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے جو
(مزمل: ۲)	اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے.

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانہ میں سنائی جارہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے

---

[1] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل و بیہقی و حاکم وغیرہ

پیغام کو تیغ و سنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام ظاہر تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلے کے بغیر ہم کوئی کام نہ کریں گے، اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضورؐ نے سورہ فصلت کی آیتیں پڑھیں، جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آگیا، اور واپس آکر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ شاعری ہے نہ جادو ہے، اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لئے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے، تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کی:

"اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے، تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں

عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولتمند بن جاؤ، اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔

یہ سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہئے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے، مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ تم کو اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیرخواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لوگے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آجائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی . . . . شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہوسکتی تھی، اس کے لئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح، عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آجاتی تھی اور اسی لئے اس کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صلح ہو جائے۔ ابوطالب بھتیجے سے کہتے ہیں جان پدر! یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرطیں تم سے لینا چاہتے ہیں اور کچھ وہ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: "اے عم بزرگوار!

میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ ان لیں جس سے آپ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم آپ کے زیرِنگیں ہوگا، ابوجہل نے کہا ہم آپ کے باپ کی ایک بات نہیں، دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔[1]

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جاکر توحید کی دعوت دیتے ہیں، اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں: "اے لوگو! کہو خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمھاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمھارے تابع فرمان ہوں گے، اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے"[2]

بیعتِ عقبہ میں جب کہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول اللہ علیہ السلام کے دستِ مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو ان ہی میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے دستِ مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا۔ لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لئے لڑنے کو تیار ہو، سب نے کہا ہاں، انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا، اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے، اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لئے جھگڑا نہ کرو گے، اور جس سے تم اپنی اور اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی

---

[1] سیرت ابن ہشام [2] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۲۱۶ لائیڈن۔

کروگے، انصار نے یک آواز سے کہا: ہاں یا رسول اللہؐ! آپ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت اور فتح و نصرت[1]۔

اس لئے گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا، اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر ایسے زمانوں میں جب اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی، صحابہؓ کو شہروں اور ملکوں کے بڑے بڑے فتوحات کی خوشخبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انھیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا، اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں، دم بہ دم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈا چلا آ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جاں نثار صحابہ بھوکے اور پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں، ایک بھاری پتھر سامنے آ جاتا ہے، جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدال راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہے ہیں، حضورؐ آتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری سی نکلتی ہے، جس کی روشنی میں پہلی

---

[1] طبقات ابن سعد جز ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹، لائیڈن۔

کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں، اور حضور ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال کے بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر اور کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے، مدائن تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم لوٹے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چپٹے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔[1]

لیکن ان خوشخبریوں، بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہئے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت، شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش و عشرت، یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال، سوء مآل کا موجب ہو جائے گا، اسی لئے ضروری ہے کہ اس کو فرسے بھی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لئے ہے

[1] ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی جلد سوم میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لئے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی، اور اگر آخرت کیلئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لئے فوز و فلاح کا موجب ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ (شوریٰ: ۳)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے، اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (آل عمران: ۱۵)

اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دیں گے اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو، اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گذاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہوشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں:

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ (نحل: ۶)

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لئے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا :

أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۔ (توبہ : ٦)	کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہوگئے، تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت . . . میں بہت معمولی ہے ۔
وَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا ۚ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (قصص : ٦)	اور جو چیز تم کو دی گئی ہے، وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے ، اور جو خدا کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے کیا تم سمجھتے نہیں ۔
بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۔ (اعلیٰ : ١)	مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو ۔ حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے ۔
وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔ (اعراف : ٢١)	اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے ، کیا تم سمجھتے نہیں ۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں :

فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ	پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب تو بہت

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (زمر ، ۳) بتاہے ، کاش یہ سمجھ رکھتے ۔
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى اور آخرت کا عذاب بہت سخت
(طٰہٰ ، ۷) اور بہت دیر رہنے والا ہے ۔

اگر آخرت کا خیال کئے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کرے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھرے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود ۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب
وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ وزینت کے طالب ہوں ، ہم ان کے اعمال
فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ کا بدلہ انھیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی
الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش
صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انھوں نے
يَعْمَلُوْنَ . دنیا میں کئے ، سب برباد اور جو کچھ وہ
(ہود : ۲) کرتے ہیں سب ضائع ۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرکاہ سے بھی کمتر ہے ۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے
اِلَّا قَلِيْلٌ . (توبہ : ۶) مقابل بہت ہی کم ہیں ۔
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں
اِلَّا مَتَاعٌ (رعد : ۳) بہت تھوڑا فائدہ ہے ۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکا کے سوا کچھ نہیں ۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (آل عمران ۱۹، حدید ۲)

اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لئے برتنا چاہئے، جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے: اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لئے ہیں:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ: ۳)

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں، تمھارے لئے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ اور خود انسان کس لئے بنا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ۳)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے کہ دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (قصص، ۸، ۲)

اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے، اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول۔

انہیں معنوں میں الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیا کی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے

ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، فرمایا گیا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے
فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور
الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا، يَعْبُدُوْنَنِیْ	پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا، اور
لَا يُشْرِكُوْنَ بِیْ شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ	خوف کے بعد امن بخشے گا، وہ میری
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی
الْفٰسِقُوْنَ ۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	اور کو شریک نہ بنائیں گے، اور جو اس کے
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں،
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔	اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو
	اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ
(نور ۱ ۷)	تم پر رحمت کی جائے۔

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت، اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں، اور اگر اس امن و اطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہریگا، نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں
الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا	دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ	کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور
وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۔	برے کاموں سے منع کریں، اور سب
(حج : ۶)	کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو دنیا میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجاآوری کا سرعنوان ہے قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں، اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا زیب، نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجاآوری اور اس کے لئے جدوجہد اور محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

کریما سعدی

از

ڈاکٹر طہٰ رضوی برق، صدر شعبۂ فارسی و اردو جین کالج، آرہ۔

ہمہ سرمایۂ سعدی سخن شیریں بود ویں ازو ماند ندانم کہ چہ با او بردد

تقریباً بارہ سال قبل روس میں فارسی گو شعراء کی ایک کانفرنس بنام "کنگرہ ملی برائے شعرائے ایرانی" انعقاد پذیر ہوئی، اس کے تحت ایک عظیم الشان بین الملی فارسی مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں ایران، افغانستان، تاجیکستان، ہندوستان اور پاکستان کے فارسی گو شعراء شریک ہوئے تھے۔ سوینار کے طور پر ایک کتاب "جنگ" بھی بڑے اہتمام سے شائع ہوئی، جو شرکائے مشاعرہ کے کلام پر مشتمل تھی، جنگ میں ایک مشہور ایرانی ادیب و شاعر دکتر باستانی پاریزی استاد دانشگاہ طہران کسی اشتباہ کی بنا پر پاکستانی شاعر کی حیثیت سے چھپ گئے اور اس بنیاد پر پاکستان کے ایک دو شعری تذکروں میں بھی انھیں پاکستانی شاعر کی حیثیت سے شریک کر لیا گیا۔

ڈاکٹر باستانی پاریزی اس واقعہ کو اپنے ایک دلچسپ سفرنامے میں جو بالاقساط مجلۂ "یغما" (ایران) میں شائع ہوا لکھتے ہیں کہ

"تصدیق بفرمایید امروز کہ قرن چاپ و روزنامہ و تلگراف و آشنائی شرق و غرب با یکدیگر است، شعرے از دکتری چون مخلص بمرزہائے آہنیں و سیم ہائے خاردار عشق آباد

گذشتہ و تاجیکستان و مکو رسیدہ شاعر پاکستانی بوجود آوردہ ؟ آیا آن تذکرہ نویسان
پانصد ششصد سال پیش حق ندا شتند کہ می دانستند نظامی گنجوی است یا قمی ؟ و قبر
ابن سینا در ہمدان است یا اصفہان ؟ و چشمہا ے رودکی در خردسالی کور شدہ بود
یا در سنین جوانی و بالاتر از آن ؟ و نام سعدی مصلح الدین بودہ یا مشرف الدین ؟ "
(یغما، شمارہ ۲۶۱ صفحہ ۱۵۶)

اس تمہید سے مجھے یہ دکھانا مقصود ہے کہ مرور ایام کا دبیز پردہ اکثر صرف شاعر کے صحیح نام و نسبت پر ہی نہیں بلکہ اس کے کلام پر بھی پڑا رہتا ہے اور صدیوں بعد حقائق کی تلاش میں اس کی بازیافت ہوتی ہے، ایک عرصہ تک سعدی کے صحیح نام سے متعلق محققین کی رائے مختلف تھی، کچھ مصلح الدین لکھتے تھے، کچھ مشرف الدین بن مصلح الدین وغیرہ، سب سے پہلے مشہور مستشرق ڈاکٹر ایڈورڈ براؤن نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں کلیات سعدی کے ایک قدیم نسخہ کے حوالہ سے سعدی کا نام مشرف الدین بن مصلح الدین عبداللہ لکھا، کلیات سعدی کا یہ نسخہ ان کے انتقال کے صرف ۴۰ سال بعد یعنی ۷۳۲ھ میں رقم ہوا تھا، جو انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں نمبر ۸۷۶ کے تحت موجود ہے۔

اس وقت ادبیات ایران کی مختصر مگر جامع تاریخ مصنفہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق مشہور ہے اور مستند سمجھی جاتی ہے، اس میں بھی سعدی کا نام مشرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی لکھا ہے، مشہور و مستند مورخ ادبیات و فرہنگ ایران ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی گنج سخن جلد۲ میں شیخ مشرف بن مصلح شیرازی ہی لکھتے ہیں۔

یہ تو نام کی بات ہوئی، جہاں تک کلام کا تعلق ہے، شیخ سعدی شیرازی کی کریما ہندوستان میں عہد قدیم سے ہی ابتدائی نصاب کی اہم ترین اخلاق آموز کتاب سمجھی گئی ہے، نئی نسل تو کیا

تقریباً ہر خواندہ شخص اس کتاب سے واقف ہے اور کچھ نہ کچھ اشعار اس کے ضرور گوشۂ ذہن میں محفوظ رکھتا ہے، مثلاً مشہور ترین شعر:

کریما ببخشائے برحالِ ما کہ ہستم اسیر کمند ہوا

اس شعر کے پہلے لفظ سے ہی یہ کتاب موسوم ہوئی اور یہ شعر اس قدر زبان زد خاص و عام ہوا کہ مختلف شعراء نے تفنن طبع کے طور پر اس کی پیروڈی لکھی، مثلاً اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

کریما بہ بخشائے بر حال بندہ کہ ہستم اسیر کمیٹی وچندہ

علاوہ ازیں کریما کے مندرجۂ ذیل اشعار عوام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں:

چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت
بخیل ار بود زاہد بحر و بر بہشتی نہ باشد بہ حکم خبر
تکبر عزازیل را خوار کرد بزندانِ لعنت گرفتار کرد
سخاوت کند نیک بخت اختیار کہ مرد از سخاوت شود بختیار

میرے پیش نظر ۱۹۶۹ء کا نسخہ مترجم کریما جلی قلم مطبوعہ مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ ہے، جو چھ ہزار کی تعداد میں چھپا تھا، اس کے بعد بھی اس کے ایڈیشن آچکے ہیں۔ اس سے ہندوستان میں آج بھی جب کہ فارسی تو فارسی اردو کا مستقبل بھی معرض خطر میں ہے، کریما کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ موجودہ تحقیق کی روشنی میں سعدی سے متعلق جتنی تحریریں سامنے آرہی ہیں ان میں سعدی کی کریما کا کہیں کوئی ذکر نہیں، جس سے یہ شبہ تقویت پاتا ہے کہ آیا دو سو اشعار پند و نصائح پر مشتمل یہ مشہور و مقبول مہذب اخلاق کتاب کریما شیخ سعدی کی

تصنیف ہے بھی یا نہیں، کریما کا آخری شعر تو بھی کہتا ہے کہ اس کے مصنف سعدی ہیں،

منہ دل برین و بر نا پائیدار   ز سعدی ہمیں یک سخن یاددار

کریما کے اشعار کا نمایاں طرز و اسلوب و ادا و سبک مخصوص سعدی شیرازی کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے ؟

پھر کیا سبب ہے کہ ہندوستانی و ایرانی محققین ارجمند اپنے تحقیقی پاروں میں اس تصنیف لطیف کا ذکر تک نہیں فرماتے، مثلاً

"تصانیف سعدی" کے تحت ڈاکٹر محمد عبدالاحد خاں خلیل اپنے تفصیلی مقدمہ گلستان مترجم مطبوعہ ۱۹۶۸ء میں تحریر فرماتے ہیں :

"سعدی کی تصانیف کی تعداد ۲۳ بتائی جاتی ہے جن میں گلستان اور بوستان ان کی مقبول تر اور مشہور تر تصانیف ہیں، علاوہ ازیں مجالس پنجگانہ، نصیحت الملوک، رسالہ عقل و عشق اور تقریرات ثلاثہ بھی ان کی اہم تصانیف میں شامل ہیں..... انھوں نے شعر و سخن کے سلسلہ میں عربی و فارسی قصائد لکھے اور مراثی و قطعات، ترجیعات، رباعیات، مثلثات (جن میں تین زبانیں عربی، فارسی اور ترکی شامل ہیں) اور غزلیں لکھیں طیبات، مفردات، ملمعات، طیبات اور بدائع لکھے اور ہزلیات بھی :

(مقدمہ گلستاں مترجم مطبوعہ لکھنؤ، ص ۱۱، ۱۹۱۸ء)

فاضل محقق نے یقیناً کریما پڑھنے کی سعادت حاصل کر چکے ہوں گے، اس سے متعلق مثبت یا منفی کسی رائے کا تو اظہار فرماتے، انھوں نے کریما کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔

آقائے دکتر رضازادہ شفق رقم طراز ہیں،

ان دو تصانیف (گلستاں و بوستاں) کے سوا استاد (سعدی) کے قصائد غزلیات،

قطعات، ترجیع بند، رباعیات، مقالات اور عربی قصائد بھی ہیں جو ان کے کلیات میں جمع کردئے گئے ہیں:

(تاریخ ادبیات ایران، مترجمہ مبارزالدین رفعت ص ۳۳۲)

"کنگرۂ جہانی سعدی و حافظ" (ایران) کی طرف سے کوشش استاد دکتر منصور رستگار ایک ضخیم کتاب بعنوان "مقالاتے در بارۂ زندگی و شعر سعدی" مشتمل بر ۳۶ مقالہ بڑے حسن اہتمام کے شائع ہوئی ہے، ان مقالات میں ایرانی و افغانی اسانید اور محققین نے ہمہ جہتی انداز سے سعدی کی زندگی اور کارناموں پر واضح روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، بڑی تقطیع پر باریک ٹائپ میں چھپی ساڑھے چار سو صفحات کی اس کتاب میں سعدی کی کریما کا نام تک نہیں ہے۔

آقائے دکتر جاوید (افغانستان) اپنے مقالہ "یک نسخۂ کہن از کلیات سعدی" میں فرماتے ہیں: (واضح ہو کہ یہ نسخۂ کہن کلیات سعدی ڈاکٹر براؤن والے نسخۂ انڈیا آفس لائبریری لندن سے مختلف اور اس سے دو سال قبل کا ہے)

"در گنجینۂ گراں بہائے کتاب خانۂ سلطنتے افغانستان (قید شمارہ ۲۲۹۰) از کلیات حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ ہست کہ درست سی و پنج سال پس از وفات شیخ نوشتہ شدہ، و یکے از قدیم ترین نسخۂ کلیات موجود شیخ در جہان است"

(زندگی و شعر سعدی، ص ۴۹)

آگے چل کر اس نسخۂ کہن کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں:

"مقدار و تعداد غزلیات نسبت بہ نسخہائے دیگر و کلیات چاپی بسیار کم است، شاید در مقام تشخیص غزلہائے سلوک و منسوب بہ سعدی بتواں آں را ملاک اعتبار و اعتماد قرار داد"

نام و ترتیب کتابہا و رسائل شیخ در یں نسخہ بدیں گونہ است :

۱. گلستان
۲. سعدی نامہ (بوستاں)
۳. طیبات
۴. بدائع
۵. خواتیم
۶. غزلیاتِ قدیم
۷. قصائد فارسی
۸. کتاب المراثی
۹. قصائد عربی
۱۰. مثلثات
۱۱. ملمعات
۱۲. ترجیع
۱۳. سؤال صاحب دیوان
۱۴. رسالۂ انکیانو
۱۵. رسالۂ عقل و عشق
۱۶. نصیحۃ الملوک
۱۷. صاحبیہ
۱۸. مجلس الہزل
۱۹. خبثیات
۲۰. مقطعات
۲۱. رباعیات
۲۲. مفردات

(زندگی و شعر سعدی ص ۴۶ ، ۴۸)

کیا یہ بات تعجب خیز نہیں کہ اتنے قدیم نسخۂ کلیات سعدی میں جو شیخ کی وفات کے صرف پینتیس سال بعد ضبط تحریر میں آیا ہو، جہاں ہزل و خبثیات تک جمع ہوں، وہاں کریا کا کوئی نشان تک نہیں، وہ ہزل و خبثیات جنہیں شیخ کی طرف منسوب سمجھا جاتا رہا ہے، اس کہن ترین نسخہ میں موجود دیکھ کر ڈاکٹر جاوید یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

• علی الرغم بسا کلیات، قسمتہا سے ہزلیات و خبثیات دریں کلیات مندرج است و با چنیں ترتیب شائبۂ عدم انتساب آں را بشیخ ضعیف تر می سازد ؛ (کتاب نما، ۴۰)

اسی طرح محقق دانشمند ایران ڈاکٹر زہرای خانلری (کیا) اپنی تصنیف لطیف "فرہنگ ادبیات فارسی دری" میں احوال سعدی کے ضمن میں تحریر فرماتی ہیں،

"آثار سعدی عبارت است از دیوان غزلیات شامل طیبات، بدایع، خواتیم، غزلیات قدیمہ۔ دیگر، بوستان، گلستان، قصائد و ملمعات، رباعیات و ترجیعات است. مجموع آثار سعدی را کلیات سعدی گویند"

(فرہنگ، ص: ۲۶۹)

اور یہ کلیات سعدی بڑے حسن سلیقہ : ترتیب و تصحیح اور " ذکاء الملک" محمد علی فروغی مرحوم کے تفصیلی مقدمہ و شرح حال سعدی کے ساتھ " سازمان انتشارات جاویدان (ایران) سے بایک ٹائپ میں بڑی تقطیع کے نو سو پندرہ صفحات پر شائع کیا ہے، افسوس اس کلیات میں بھی کربلا کا کہیں کوئی ذکر نہیں، اس کتاب میں قدیم ترین مرتب و مدون دیوان (کلیات) آقائے ابوبکر بیستون کا مختصر مگر دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں موصوف رقمطراز ہیں،

"پس بداں اے عزیز من وفقک اللہ تعالیٰ مراضیہ (بیستون) کہ جمع آورندۂ دیوان شیخ رحمۃ اللہ علیہ دراصل وضع بنیاد بر بیت [۲۲] و دو کتاب کردہ بود، شانزدہ کتاب و شش [۱] رسالہ و بعض بہ ہفت رسالہ بنوشتند، چنانچہ بیت و سہ [۲۳] می شد، سبب آں کہ مجلس ہزل ہم دراول داخل رسالہ شش گانہ نوشتہ بودند، بندہ ایں رسالہ را از اول بآخر کتاب نقل کردم و داخل مطائبات کردم کہ دراول کتاب خوش آیند نمی نمود تا بیت [۲۲] و دو شد، و باقی را ہیچ تصرف نہ کرد، و ہم براں ترتیب گذاشت" (کلیات شیخ سعدی، چاپ ایران ص: ۴)

مشہور ایرانی دانشور وصاحب قلم جناب آقائے علی دشتی نے بھی ایک جامع و وقیع کتاب

نظم و سعدی لکھی ہے۔ پندرہ فصول میں چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب شیخ سعدی کی نگارشات کا ایک مبسوط ناقدانہ جائزہ ہے، اس کے ہر باب کو ہم مصنف کی بالغ نظری، دقیقہ رسی، اور محققانہ اندازِ فکر کا آئینہ کہہ سکتے ہیں، اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ میرے مطالعہ میں جو نسخہ ہے وہ چاپ چہارم ہے اور اس کی ہر اشاعت تین ہزار نسخوں پر مشتمل تھی۔ صد افسوس کہ مرحوم کریما سعدی کا کوئی ذکر اس کتاب میں بھی نہیں۔

۱۹۰۸ء میں صوبہ بہار کے شہر آرہ ضلع شاہ آباد کے باشندہ ٹاؤن اسکول آرہ کے ہیڈ ماسٹر بابو پرمانند صبر آروی نے کریما کے جواب میں منظوم "رحیما" لکھی اور اسے پانچ سو کی تعداد میں اشارت انڈیا پریس آرہ نے شائع کیا، اب یہ کتاب بظاہر نایاب ہے، جناب صبر آروی فارسی زبان و ادب کے ایک فاضل ادیب اور کہنہ مشق شاعر تھے، جیسا کہ رحیما کے جائزہ سے معلوم ہوگا، میں ذیل میں کریما اور رحیما کا ایک سرسری تقابلی جائزہ پیش کر رہا ہوں، اس سے ظاہر ہوگا کہ "سبک سعدی" میں اہل زبان و ادب کس طرح خامہ فرسائی کرتے آئے ہیں:

"کریما" از شیخ سعدی شیرازی			"رحیما" از پرمانند صبر آروی		
شمار	عنوان	تعداد اشعار	شمار	عنوان	تعداد اشعار
۱.	مناجات	۳	۱.	مناجات	۹
۲.	نعت	۳	۲.	در نعت	۹
۳.	خطاب بہ نفس	۳	۳.	اشارت بہ نفس	۹
۴.	در مدح کرم	۹	۴.	در مدح کرم	۹
۵.	در صفت سخاوت	۵	۵.	در صفت سخاوت	۶

	کریما			رحیما	
۶.	در مذمت بخل	۶	۶.	در مذمت بخل	۱۴
۷.	در صفت تواضع	۱۳	۷.	در صفت تواضع	۱۳
۸.	در مذمت تکبر	۶	۸.	در مذمت تکبر	۶
۹.	در فضیلت علم	۸	۹.	در فضیلت علم	۲۰
۱۰.	در امتناع از صحبت جاہلاں	۹	۱۰.	در امتناع از صحبت جاہلاں	۲۰
۱۱.	در صفت عدل	۱۰	۱۱.	در صفت عدل	۱۲
۱۲.	در مذمت ظلم	۸	۱۲.	در مذمت ظلم	۸
۱۳.	در صفت قناعت	۶	۱۳.	در صفت قناعت	۹
۱۴.	در مذمت حرص	۱۱	۱۴.	در مذمت حرص	۱۲
۱۵.	در صفت طاعت و عبادت	۱۳	۱۵.	در صفت عبادت و طاعت	۶
۱۶.	در مذمت شیطان	۹	۱۶.	در مذمت شیطان	۶
	در بیان شراب	۸	۱۷.	در بیان شراب محبت و عشق	۸
۱۸.	در صفت وفا	۹	۱۸.	در صفت وفا	۵
۱۹.	در فضیلت شکر	۷	۱۹.	در فضیلت شکر گوید	۵
۲۰.	در بیان صبر	۸	۲۰.	در بیان صبر	۹
۲۱.	در صفت راستی	۵	۲۱.	در صفت راستی	۵
۲۲.	در مذمت کذب	۹	۲۲.	در مذمت کذب	۵
۲۳.	در صفت حق تعالیٰ	۲۳	۲۳.	در انقلاب روزگار و تفاوت طبع	۲۳
۲۴.	در قطع امید از مخلوقات	۱۹	۲۴.	در قطع امید از مخلوقات	۱۰
		۲۰۰			

ریحا	کریما
	۲۵. غزل مشتمل بر صنایع لفظی ۹
کل اشعار ۲۲۹	کل اشعار ۲۰۹

ریحا کے آخر میں باب پہ مانند صبرؔ آروی کی فارسی غزلیں بھی شامل ہیں۔ میرے پاس ریحا کا جو نسخہ موجود ہے اس کے آخر کے صفحات غائب ہیں۔ صرف تین کمل غزلیں موجود ہیں اور چوتھی غزل کا صرف مطلع ہے۔ پہلی غزل آٹھ شعر کی، دوسری بھی آٹھ شعر کی، تیسری سات شعر کی اور چوتھی کا صرف مطلع، نہیں معلوم مزید اور کتنی غزلیں کتنے صفحات پر چھپی تھیں، اتنا کچھ تو سائز کے صرف چودہ[۱۴] صفحات پر ہی دستیاب ہے۔

فارسی زبان و اظہار بیان پر صبرؔ کی قدرت کا اندازہ ان کی غزلوں کے درج ذیل شعر سے ہوتا ہے، سادگیٔ زبان اور روانیٔ بیان ملاحظہ ہو:

ستائش کنم خالق دوسرا را — کہ تخلیق فرمود ما و شما را
ببیں سوئے عاصی ز چشم عنایت — کرم کن بریں خستہ پروردگارا
بپرہیز از عشوۂ زال دنیا — مدہ جا بدل دولتِ بے بقا را

بمنزل رسیدن اگر صبرؔ خواہی
بداں ہادیٔ گمرہاں مصطفیٰؐ را

ہیہات کہ در الفت آں زلف دوتا تو — اے صبرؔ قدم می نہی در دام بلا تو
تا چند تغافل ز مریضانِ محبت — از بہر خدا گیر خبر چارہ گرا تو
ہاں موسم گل آمدہ اینک بگلستاں — اے بلبلِ خوش لہجہ بشو نغمہ سرا تو

فنکار و جفا پیشہ حسینان جہاں اند
صد حیف کہ دل را بدہی اے صبرؔ گرا تو

رحیما	کریا
گر پیک اجل آمدہ پیغام وصالم	اے وائے من آں عاشق پر رنج و ملالم
زنہار نہ بہ غیر وصال تو سوالم	مقصود مرا نیست بجز مہر تو دیگر

اے صبر منم نوگل گلزار معانی

در گلشن ایجاد کجا ہست مثالم

ان اشعار سے صبر آروی کی زبان دانی، مشق شعری اور پختگی فن کا اندازہ ہوتا ہے، معمولی بساط کا آدمی کریا سعدی کا جواب اسی رنگ و انداز میں لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، میں قدرے اختصار کے ساتھ ذیل میں کریا اور رحیما سے بعنوان اشعار کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کرتا ہوں جسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ صبر آروی کی طرح بہت قبل کسی اور زیادہ کہنہ مشق، پرگو اور صاحب زبان و بیان شاعر نے سبک سعدی کی پیروی میں کریا لکھ کر سعدی سے منسوب کر دی ہے، یا سعدی تخلص کا کوئی دوسرا شاعر مشق سخن کا یہ نمونہ زیب قرطاس کر کے خود پردۂ گمنامی میں روپوش ہو گیا، ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

رحیما	کریا
رحیما بحالم ببخشو مہرباں	کریما ببخشائے بر حال ما
کہ تنگ آمدم از جفائے جہاں	کہ ہستم اسیر کمند ہوا
بلطف تو می باشم امیدوار	نداریم غیر از تو فریاد رس
کہ من جرم پیشہ تو آمرزگار	توئی عاصیاں را خطا بخش و بس
رقم چوں کنم نعت خیر الوری	زباں تا بود در دہاں جائے گیر
چو وصفش کند خالق دوسرا	ثنائے محمد بود دلپذیر
ولے نا تواں دم بوصفش زنم	حبیب خدا اشرف انبیاء

کریما	بچیا
کہ ہرش ہمیشہ نہ بود متکا	از دو تا بہ معراج رفعت دہم
چہل سال عمر عزیزت گذشت	بدام جہالت اسیری مدام
مزاج تو از حال طفلی نگشت	سرت پر غرور از ....
ہمہ با ہوا و ہوس ساختی	ازیں ہرزہ گردی چہ گردد حصول
دمے با مصالح نہ پرداختی	بنہ گام اے دل براہ رسولؐ
مکن تکیہ بر عمر ناپائیدار	گنجِ سرا دانِ گیتی مناز
مباش ایمن از بازی روزگار	کہ ناسازگار است ایں برگ ساز
کرم مایۂ شادمانی بود	کرم مرد را ارجمندی دہد
کرم حاصل زندگانی بود	رسائی بہ بام بلندی دہد
سخاوت کند نیکبخت اختیار	طریق سخا ہرکہ کرد اختیار
کہ مرد از سخاوت شود بختیار	بملک سعادت شدہ شہریار
بخیل ار بود زاہد بحر و بر	بخالت فرومی برد نیک نام
بہشتی نباشد بحکم خبر	بیند ازد از جنت لا کلام
تواضع کند مرد را سرفراز	بزرگ از تواضع ندارد دریغ
تواضع بود سروراں را طراز	فرو ریزد از آب پر شد چو میغ
تواضع کلید در جنت است	تواضع رساند بجنت ترا
سرافرازی و جاہ را زینت است	کزو خوش شود نیز از تو خدا
تکبر عزازیل را خوار کرد	چوں تا روں تکبر مکن زینہار
بزندانِ لعنت گرفتار کرد	مشو غافل از گردشِ روزگار

کریما	رحیما
تکبر بود عادتِ جاہلاں	باموال جاہل تکبر کند
تکبر نیاید ز صاحب دلاں	خرد از تکبر تنفر کند
چو شمع از پئے علم باید گداخت	ہر آں کو کہ از علم شد ہوشیار
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت	تواں یافت اورا ز پروردگار
ترا علم در دین و دنیا تمام	مددگار تو علم باشد مدام
کہ کار تو از علم گیرد نظام	بدست آید از غیب مقصد مدام
ترا از دہا گر بود یارِ غار	مزدم ترا صحبت کور و لنگ
ازاں بہ کہ جاہل بود غمگسار	ترا دوستی بہ ز گرگ و پلنگ
اگر خصم جان تو عاقل بود	یکے با خرد داری گر دوستدار
بہ از دوستدارے کہ جاہل بود	ازاں بہ کہ جاہل بود صد ہزار
رعایت دریغ از رعیت مدار	بدہ داد مظلوم لیل و نہار
مرادِ دلِ دادخواہاں برآر	ستم بر رعیت مکن زینہار
ستم بر ضعیفانِ مسکین مکن	مشو راغب ظلم اے ذی خرد
کہ ظالم بہ دوزخ رود بے سخن	کہ ظلمت ترا سوئے دوزخ برد
دلا گر قناعت بدست آوری	بہ قسمت کند گر قناعت کسے
در اقلیم راحت کنی سروری	بدست آیدش شادمانی بسے
مکن عمر ضایع بہ تحصیل مال	بود حرص در دہر وجہ ملال
کہ ہم نرخ گوہر نباشد سفال	مشو در جہاں بہر زر خستہ حال
بآب عبادت وضو تازہ دار	عبادت شود حسن افزائے تو

کریا	ریچا
کزروا ز آتش شوی رستگار	بود در بہشت بریں جائے تو
کسے را کہ شیطاں بود پیشوا	مکن گوش آواز ابلیس را
کجا باز گردد براہ خدا	کہ او می رساند بقہر خدا
بدہ ساقیا آب آتش لباس	بدہ ساقیا بادۂ مشکبو
کہ مستی کند اہل دل التماس	کہ سازم کزو ہمچو رنداں وضو
بیار آں شراب چو آب حیات	مئے عشق در دل سرورے دہد
کہ یابد ز بویش دل از غم نجات	برد رنج و در چشم نورے دہد
مگرداں ز کوئے وفا روئے دل	بچشم حقیقت شوی بس خجل
کہ در روئے جاناں نباشی خجل	نشان وفا گر نداری بدل
نفس جز بشکر خدا بر میار	زباں را سپاس خدا می سزد
کہ واجب بود شکر پروردگار	کہ جز ناسپاسی نہ کاریست بد
صبوری ترا کامگاری دہد	بمطلوب خود از صبوری رسی
ز رنج و بلا رستگاری دہد	صبوری دہد دست بر بیکسی
بہ از راستی در جہاں کار نیست	چہ خوش گفتہ اند ایں خردپروراں
کہ در گلبن راستی خار نیست	بہ از راستی کار دیگر مداں
دروغ اے برادر مگو زینہار	ز ناراستی نیست کارے بترہ
کہ کاذب بود خوار و بے اعتبار	ازو سے کنند اہل دانش حذر
ز ناراستی نیست کارے بتر	مگو کذب زنہار اے ہوشمند
ازو گم شود نام نیک اے پسر	کہ باشد رساند ترا صد گزند

نگہ کن بدیں گنبد زرنگار | سوئے چرخ از چشم عبرت نگر
کہ سقفش بود بے ستوں استوار | کہ چون ست تابندہ روے قمر
سرا پردۂ چرخ گردندہ بیں | گہرہائے انجم پریشاں درو
درو شمعہائے فروزندہ بیں | مہ و مہر و ناہید تاباں درو
یکے شادمان و یکے دردمند | یکے بے نوا و یکے مستمند
یکے کامران و یکے مستمند | یکے شادمان و یکے دردمند
یکے بر حصیر و یکے بر سریر | چو گل از طرب شاد و خنداں یکے
یکے در پلاس و یکے در حریر | چو شبنم دریں باغ گریاں یکے
یکے نیک کردار و نیک اعتقاد | یکے سالک جادۂ اتقا
یکے غرق در بحر فسق و فساد | یکے رہرو راہ کفر و ابا
ازیں پس مکن تکیہ بر روزگار | پس آنگہ مکن اعتبار زماں
کہ ناگہ ز جانت بر آرد دمار | کہ ہر دم دگرگوں شود ایں جہاں
مکن تکیہ بر لشکر بے عدد | مکن تکیہ بر دولت بے بقا
کہ شاید ز نصرت نیابی مدد | کہ مضمر شود در بقایش فنا
ثباتے ندارد جہاں اے پسر | دریغا کہ از دور گردوں دوں
بغفلت مبر عمر در دوے بسر | نشانے کزو شاں نہ بینی کنوں

ہر چند کریا کے اشعار میں سادگی و برجستگی، تازگی و شگفتگی، ایجاز و اختصار، لفظی آب و تاب اور پرکشش فکر و خیال کے عالم ہیں وہ رحیا میں اس حد تک نہیں، تاہم اگر رحیا کے اشعار کریا کے اشعار میں ملا کر پیش کئے جائیں تو ایک ناواقف کے لئے تمیز

مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوگی، نقل یک و پیروی اسلوب کی اتنی کامیاب مثال جو صبر آزری کی قلمی و شعری عبارت پر دال ہے، بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

بہرحال اب تک کریما شیخ سعدی شیرازی سے ہی منسوب رہی ہے اور ان اشعار گراں مایہ کا کوئی دوسرا مدعی کسی عہد میں نہ ہوا، لہذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بعض اوقات کسی شاعر کا کچھ کلام اگرچہ اس کے کہن ترین نسخوں میں نہیں ملتا مگر حقیقتاً اسی کے فکر وخیال کا ثمرہ ہوتا ہے اور کسی نہ کسی طرح عوام میں مقبول ہوکر محفوظ رہ جاتا ہے، مثلاً حضرت امیر خسروؒ کی یہ غزل "نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم" ان کے کسی دیوان میں نہیں ملتی مگر بجا طور پر انھیں سے منسوب ہے، یا پھر حضرت قدسی کی مشہور زمانہ نعت "مرحبا سید مکی مدنی العربی"، جسے آج تک قدسی کے علاوہ کسی دوسرے سے نسبت نہ دی جاسکی۔ اسی طرح کریما بھی سعدیؒ کے قدیم کلیات میں شامل نہ ہوسکی اور جداگانہ کتابی شکل میں محفوظ رہ گئی، شبہہ بہرحال شبہہ ہے تاآنکہ کوئی یقینی ثبوت فراہم نہ ہو اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

اگر مشک خالص نداری مگوئی ورت ہست خود فاش گردد بوئی

میرے اس خیال کو صاحب "قلمرو سعدی" کی درج ذیل تحریر سے مزید تقویت پہونچتی ہے، "قلمرو سعدی" میں آقائے علی دشتی "باب اول سخنی از سعدی" کے تحت باوجود اپنے تفحص و تحقیق و جستجو کے اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ

"متاسفانہ دربارۂ سعدی چنین تحقیقاتے صورت نگرفتہ واز زندگانی وے در آوان جوانی دپیش از آن در دورۂ اقامت بغداد و تحصیل در مدرسہ نظامیہ ومسافرتہائے وے در بلاد اسلامی وکیفیت زندگانی او طی سی سال کہ در کشورہائے عربی بسر بردہ است چیز قاطعے در دست نیست" (ص ۲۵)

کیا عجب کریما سعدی کے انہی ایام کی تصنیف ہو اور اہل ایران اس سے واقف نہ ہوسکے۔

سری نہند چو مثل خطت عارفان فارس بیتے مگر ز گفتۂ سعدی نوشتہ ای

حافظ سخاوی کی تصانیف

از

منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین

امام سخاوی کے حالات دو نمبروں میں پہلے چھپے تھے، اس نمبر میں ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے (م، ن)

حافظ سخاوی نے اپنی طویل علمی زندگی میں مختلف علوم و فنون پر کثرت کتابیں لکھیں، ان کی تصنیفات کا دائرہ یوں تو بڑا وسیع ہے، لیکن تاریخ و سیرت اور علوم حدیث میں ان کا قلم بڑا تیز رو ہے، مگر ان کی تصانیف کو ان کے استاذ ابن حجر کی سی شہرت نصیب نہ ہوئی، تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا، اس لئے کم ہی کتابوں کو رواج عام حاصل ہو سکا، باقی یا تو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں یا مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں کی زینت ہیں۔

زرکلی نے ان کی تصانیف کی تعداد دو سو سے متجاوز بتائی ہے[1]۔

فتح المغیث کے خاتمہ پر یہ الفاظ ملتے ہیں:

ولہ تصانیف تزید علی اربعة مائة مجلد[2]	ان کی چار سو سے زیادہ تصنیفات ہیں۔

صاحب النور السافر نے سخاوی کی کچھ کتابوں کے نام گنائے ہیں[3]۔

---

[1] الاعلام ج ۶، ۱۹۴ [2] فتح المغیث ۵۰۲ [3] النور السافر ۱۹۔

ممکن ہے الاعلام اور فتح المغیث کے بیان کو مبالغہ پر محمول کیا جائے لیکن سخاوی نے اپنے حالات کے ضمن میں جن کتابوں کی نشان دہی کی ہے، اُن میں ایک سو چوبیس نام ملتے ہیں[1]۔

الضوء اللامع | ان کی کتابوں میں الضوء اللامع کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس ضخیم کتاب میں انھوں نے نویں صدی کے حالات بیان کئے ہیں، معلومات کی کثرت اور مضامین کے تنوع کی بنا پر اسے قبولیت عام اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں اس عہد کی علمی کوششوں اور فنی ترقیوں کے ساتھ گیارہ ہزار سات سو تینتیس (۱۱۷۳۳) علماء کے سوانح حیات اور علمی کارنامے بیان کئے گئے ہیں، گیارہ جلدیں اساتذہ، شیوخ، ممتاز اشخاص، ادباء، شعراء اور معاصرین کے حالات پر مشتمل ہیں، اور بارھویں جلد میں ذی علم اور صاحب نظر خواتین کا تذکرہ ہے، ان میں بہت سی فن حدیث کی ماہر، سیر و سوانح کی عالم اور تعلیم و تدریس میں خاص امتیاز رکھتی ہیں، تذکرہ و تراجم کے باب میں سخاوی کی یہ ضخیم کتاب ماخذ و سند کا درجہ رکھتی ہے، یہی وجہ ہے اس کی بعض خامیوں کے باوجود علماء اور ارباب نظر نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے، اور سخاوی کی وسعت نظر، ژرف نگاہی کی دل کھول کر داد دی ہے۔

علامہ شوکانی نے لکھا ہے "اگر سخاوی کی الضوء اللامع کے سوا کوئی اور تصنیف یادگار نہ ہوتی تب بھی یہ کتاب ان کی جلالت شان اور امامت فن کا بیّن ثبوت ہوتی، اس کتاب میں انھوں نے اپنے دور کی دنیائے اسلام کے مایہ ناز اشخاص کے حالات، ان کے اساتذہ، تصانیف اور تواریخ مولد و وفات کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، جس سے ان کے علم، وسعت نظر اور لوگوں کے حالات سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے[2]"۔

امام لغت و ادب علامہ مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ

"سخاوی نے اپنی کتاب میں اپنے حالات بڑی خوبی کے ساتھ لکھے ہیں اور ان مایہ ناز شخصیتوں

---

[1] فوائد جامعہ: ۲۰۵ تا ۲۰۸ [2] البدر الطالع ۲: ۱۸۶۔

ہم سے ہیں، جن کی تصانیف سے ہم نے بہت استفادہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے[1]۔

البتہ سخاوی پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ معاصرین کے کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھے، اسی سبب سے انھوں نے اپنے اساتذہ اور تلامذہ کے علاوہ کسی معاصر کا اچھے انداز میں تذکرہ نہیں کیا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں نے اس کا شکوہ کیا ہے، صاحب بدائع الزہور کہتے ہیں:

"حافظ سخاوی بہت بڑے عالم تھے، وہ حدیث و تاریخ پر عبور کامل رکھتے تھے مگر انھوں نے ایک تاریخ کی کتاب لکھی جس میں لوگوں کی بڑی برائیاں کی ہیں[2]۔"

شوکانی رقمطراز ہیں:

"سخاوی اگرچہ بالاتفاق امامت کے درجہ پر فائز ہیں، لیکن وہ اکابر معاصرین سے تعصب رکھتے تھے، جو بھی ان کی کتاب "الضوء اللامع" کا مطالعہ کرے گا، اس کا اندازہ کرلے گا، اکثر معاصرین ان کی تنقید و تنقیص سے نہیں بچ سکے ہیں، البتہ اپنے اساتذہ و تلامذہ کا تذکرہ بڑے عمدہ انداز میں کرتے ہیں[3]:"

شیخ محمد بن خضیری کے حالات میں لکھا ہے:

"سخاوی نے ان کے حالات اگرچہ تفصیل سے لکھے ہیں مگر معاصرین کے معاملہ میں اپنی عادت کے مطابق سب و شتم سے کام لیا ہے[4]۔"

سخاوی کے تذکرہ میں شوکانی نے بڑے دلگیر انداز میں تحریر کیا ہے:

"کاش سخاوی نے اپنی کتاب کو اپنے ہمسروں و معاصروں کی عیب چینی سے محفوظ رکھا ہوتا[5]۔"

---

[1] تاریخ [illegible] ۱۰ ، ۱۸۲ [2] بدائع الزہور فی وقائع الدہور ۳ ، ۳۲۱ [3] البدر الطالع ۱ ، ۳۳۴
[4] ایضاً ، ۲۵۵ [5] ایضاً جلد ۱ ، ۱۸۱

مگر یہ اعتراض کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا ہے، کیونکہ سخاوی نے یگانۂ روزگار فضلاء سے کسب فیض کیا تھا، تحصیل علم کے لئے انھوں نے دور دراز مقامات کا سفر کیا تھا اور مدتوں قاہرہ و حرمین میں افادہ و استفادہ کی غرض سے مقیم رہے، اس سیاحت علمی سے ان کے ذہن و دماغ کے دریچے وا ہوئے، علم میں پختگی، فکر میں استحکام اور مشاہدہ میں گہرائی پیدا ہوئی، اس بنا پر وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے، جب انھوں نے سیر و سوانح پر قلم اٹھایا تو بڑی سے بڑی شخصیت کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا اور ہر ایک کے علم و عمل کے جائزہ میں تکلف نہیں کیا، مگر حتی الامکان جادۂ اعتدال سے انحراف نہیں کیا، رہا معاصرانہ اختلافات کا سوال تو افراط و تفریط کا دونوں فریق شکار ہوئے، وہ دور علوم و فنون کے ارتقاء کا تھا، اس لئے معاصرت بھی شباب پر تھی، شخصیت کا بے لاگ جائزہ لینا خوبی ہے، خامی نہیں، پھر سخاوی نے معاصرین پر جو رائے دی ہے اس میں تواریخ کو نظر انداز نہیں کیا ہے، معاصرین کی خدمات کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے، لیکن جو خامیاں نظر آئیں ان کو بے جھجک بیان کر دیا ہے۔

سخاوی پر جانبداری کا الزام اس لئے بھی زیب نہیں دیتا کہ انھوں نے اپنے محبوب استاد ابن حجر پر بھی گرفت کی ہے، انھوں نے عقیدت و محبت سے الگ ہو کر علمی انداز میں ان پر تنقید کی، علامہ زاہد کوثری کو شکایت ہے کہ ابن حجر نے الدرر الکامنہ میں احناف سے تعصب برتا، اور حافظ سخاوی کے حواشی کو شہادت میں پیش کیا۔[1]

شیخ حسام الدین حنفی (المتوفی سنہ [illegible]ھ) کا تذکرہ الدرر الکامنہ میں ابن حجر نے نظر انداز کر دیا تھا، سخاوی نے استاد کی اس روش پر ناپسندیدگی ظاہر کی اور حاشیہ میں اپنی طرف سے ان کے حالات لکھ دیئے۔[2]

---

[1] حاشیہ نصب الرایہ ۱: ۶۰ [2] بحوالہ انوار الباری: ۱۳۶۔

علامہ کوثری کے علاوہ دوسرے حنفی علماء نے بھی سخاوی کے اس رویہ کو پسند کیا ہے[1]۔

الضوء اللامع کے ناشر شیخ حسام الدین القدسی کی رائے ہے کہ

"یہ کتاب قرون وسطیٰ کے علمی کارناموں کی تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک بیش بہا خزانہ، اور مورخین کے لئے معلومات کا بڑا قابل اعتماد ذریعہ ہے، اس کتاب میں سخاوی نے پہلے آٹھویں صدی کے ان اشخاص کا ذکر کیا ہے جو ان کے استاد حافظ ابن حجر سے چھوٹ گئے تھے پھر خود نویں صدی کے قابل ذکر اشخاص و خواتین کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، ان میں وہ بھی ہیں جو نویں صدی میں وفات پا گئے اور وہ بھی ہیں جو دسویں صدی تک زندہ رہے، یہ تمام تراجم ایک غیر جانبدار ناقد کی نظر سے انھوں نے لکھے ہیں[2]۔"

ایک اشکال اور جواب نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے لکھا ہے کہ "امام شوکانی نے سخاوی کی کتاب الضوء اللامع کو ابن حجر کی کتاب الدرر الکامنہ پر ترجیح دی ہے[3]۔"

شوکانی نے خود لکھا ہے کہ "ان دونوں کتابوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے[4]۔" بعض اعتبارات سے بات صحیح ہے، مگر دونوں کے میدان الگ الگ ہیں، ابن حجر نے آٹھویں صدی کے علماء، اساتذہ اور سلاطین و امراء کے حالات لکھے ہیں، جن کی تعداد چار ہزار پانچ سو ہے[5] (۴۵۰۰)، انھوں نے ۸۳۰ھ میں اس کتاب کو پورا کر لیا تھا، پھر اس کے بعد ۸۳۲ھ تک اس میں اضافہ کرتے رہے لیکن آخر عمر تک اس کی تکمیل نہ کر سکے، بعد کو سخاوی نے نو سو (۹۰۰) ارباب کمال کے سوانح کا اضافہ کیا[5]، اس طرح ابن حجر کی کتاب آٹھویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی۔

<u>سخاوی کو طبقات و تراجم کی کتاب لکھنے کا خیال غالباً ابن حجر کی اس کتاب کو دیکھ کر آیا</u>

---

[1] بحوالہ انظار البیدی، ۱۵۹ [2] مقدمۃ الناشر الضوء اللامع اول [3] اتحاف النبلاء، ۳۰۳
[4] البدر الطالع ۲: ۱۸۹ [5] الدرر الکامنہ ۴: ۵۰۲

انھوں نے نویں صدی ہجری پر قلم اٹھایا تو بارہ جلدوں کی ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی، اس سے ابن حجر کے کارنامہ کی تنقیص نہیں ہوتی، وہ آٹھویں صدی سے متعلق سیر و سوانح کا مستند سرمایہ ہے، اور سخاوی کا کارنامہ نویں صدی سے متعلق ہے۔ ابن حجر کی کتاب نقش اول کا درجہ رکھتی ہے اور سخاوی کی کتاب نقش ثانی کا، ابن حجر کی کتاب کی اشاعت دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جانب سے ۱۳۴۸ھ اور سخاوی کی الضوء اللامع مکتبۃ القدسی کی طرف سے ۱۳۵۳ھ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔

مختصرات | الضوء اللامع کی ضخامت کی وجہ سے بہت سے اہل علم نے اس کا اختصار بھی کیا ہے، ان میں ابن عبد السلام (المتوفی سنہ ۹۳۱ھ) کی البدر الطالع، شیخ احمد قسطلانی کی "النور السافر" اور شیخ زین الدین عمر بن احمد الشماع الحلبی (المتوفی ۹۳۶ھ) کی "القبس الحاوی لغرر ضوء السخاوی" خاص طور سے قابل ذکر ہیں، البدر الطالع اور القبس الحاوی کے نسخے مدینہ منورہ کے کتب خانہ عارف حکمت بے میں موجود ہیں۔ (الاعلام جلد ۷ ص ۶۷، مقالات سلیمان ج ۳ ص ۳۰۴، کشف الظنون ۲/۵۰)

اس کے علاوہ سخاوی نے مالکی و شافعی علماء، اپنے معاصرین اور متعدد نامور اہل علم کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں، لیکن ابھی ان میں سے کوئی کتاب چھپی نہیں ہے، اس لئے سردست ہم انھیں نظر انداز کرکے صرف ان کتابوں کے متعلق لکھ رہے ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

۲۔ فتح المغیث | "الفیۃ مصطلح الحدیث" امام زین الدین العراقی کی اصول حدیث پر مشہور و مقبول کتاب ہے، اس کا سن تالیف ۷۶۸ھ ہے، الفیہ کے بارے میں صاحب معجم کا بیان ہے "طارت صیتھا فی الآفاق" اس کی مفصل شرح حافظ سخاوی نے "فتح المغیث لشرح الفیۃ الحدیث" کے نام سے لکھی، جو اصول و مصطلحات حدیث کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے، صاحب کشف الظنون نے سہو قلم سے اسے عراقی کی تصنیف قرار دیا ہے

۱۳۰۳ھ میں یہ لکھنؤ سے بڑے سائز پر ۵۰۲ صفحات پر شائع ہوئی، صاحب شذرات الذہب کی رائے ہے کہ اصول حدیث پر اس سے زیادہ جامع و مانع کوئی اور کتاب نہیں ہے[1]، خود سخاوی کو اپنی اس شرح پر بڑا ناز تھا، لکھتے ہیں:

"فتح المغیث ایک مختصر کتاب (الفیۃ الحدیث) کی شرح ہونے کے باوجود ایک ضخیم کتاب بن گئی، اس میں متن کتاب کو نہایت خوبی کے ساتھ جدید طرز پر حل کیا گیا ہے، جو بھی اس کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ اس فن میں اس سے زیادہ جامع اور محققانہ کتاب کوئی اور نہیں ہے[2]۔"

محدثین اور علمائے اصول نے اس شرح کے ساتھ خاص اعتنا کیا اور اس کی بنا پر حدیث اور اصول حدیث میں سخاوی کی وسعت نظر کا اعتراف کیا ہے، طباعت کی غلطی سے النور السافر میں اس کا نام فتح المغیث[3] غلط درج ہو گیا ہے۔

اس شرح کے علاوہ سخاوی نے حدیث و متعلقات حدیث پر اور تالیفات بھی کی ہیں، جن میں زیادہ مشہور شرح التقریب للنووی، بلوغ الامل تلخیص کتاب الدارقطنی فی العلل، اقرب الوسائل بشرح الشمائل للترمذی، الاحادیث المتباینۃ المتون والاسانید، القول المفید فی شرح العمدۃ لابن دقیق العید[4]، لیکن یہ سب ہمارے دسترس سے باہر ہیں۔

الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ: یہ کتاب بھی سخاوی کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس میں پہلے علم تاریخ کی تعریف اور اس کا موضوع بیان کیا ہے، پھر مختلف قسم کی تاریخی کتابوں کی فہرست گنائی ہے جس سے اس عہد تک کی تاریخی تصانیف سے واقفیت ہو جاتی ہے، اس کے مطالعہ

[1] شذرات الذہب ۸: ۱۶ [2] الضوء اللامع ۸: ۱۶ [3] النور السافر: ۱۹

[4] البدر الطالع ۲: ۱۸۵ و فوائد جامعہ: ۴۰۹۔

معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نویسی کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس پر مسلمان مورخین نے قلم نہ اٹھایا ہو، شذرات الذہب میں اس کتاب کا نام الاعلان بالتوبیخ علی من ذم علم التوریخ درج ہے[۱]، اس کتاب کے بارے میں صاحب شذرات الذہب نے لکھا ہے: "ھو نفیس جداً"[۲] مرحوم حاجی شیخ تیمور نے لکھا ہے "تاریخ اسلام کی تاریخ پر یہ کتاب لاجواب ہے"[۳] مکتبہ قدسی دمشق سے یہ کتاب ۱۳۴۹ھ میں شائع ہو کر ارباب فضل و کمال سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے، اس کا جدید اڈیشن نیز انگریزی ترجمہ از روزنتھال اور اردو ترجمہ از سید محمد یوسف مع حواشی مفیدہ طبع ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ سخاوی نے تاریخی موضوع پر "تاریخ المدنیتین" "التاریخ المحیط" اور "التذکرۃ" جیسی ضخیم کتابیں تالیف کیں، ان کے علاوہ بعض تاریخی کتابوں کی تلخیص بھی کی، جن میں زیادہ مشہور تلخیص تاریخ الیمن منتقی تاریخ کرلعابی اور تلخیص طبقات القراء لابن الجزری وغیرہ۔

المقاصد الحسنۃ | اس کا پورا نام المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنۃ ہے[۴]، یہ موضوع بڑا نازک تھا لیکن سخاوی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اس کا حق ادا کر دیا ہے، اس کتاب سے حدیث و رجال میں سخاوی کا کمال واضح ہوتا ہے، سیوطی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا لیکن مورخ ابن العماد حنبلی (المتوفی ۱۰۸۹ھ) کا فیصلہ ہے کہ

ھو اجمع واتقن من کتاب	مقاصد حسنہ علامہ سیوطی کی کتاب جواہر منثورہ
السیوطی المسمی بالجواھر	سے زیادہ جامع اور بہتر ہے، لیکن ہر ایک
المنتثرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ	میں معلومات ایک دوسرے سے
وفی کل منھما مالیس فی الآخر[۵]	جداگانہ ہیں۔

---

[۱] شذرات الذہب ۸: ۱۴ [۲] الاعلان بالتوبیخ ۱ [۳] دائرہ معارف اسلامیہ اردو جلد ۱۱ ص ۶۱ [۴] کے احادیث مشہورہ کی مراد وہ احادیث ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں، لیکن مستند اور قابل اعتماد نہیں ہیں [۵] شذرات الذہب ۸: ۱۶

صاحب الرسالۃ المستطرفۃ نے بھی اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے[1]

سخاوی کے شاگرد ابی الضیاء عبدالرحمن بن الربیع الشیبانی الشافعی (المتوفی ۹۴۴ھ) نے تمییز الطیب من الخبیث فی ما یدور علی الالسنۃ من الحدیث' کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام "الدرۃ اللامعۃ فی بیان کثیر من الاحادیث الشائعۃ" بیان کیا ہے[2]، اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ہے، اس کی کتابت دو کاتبوں نے کی ہے، صفحہ اول سے دو سو آٹھ (۲۰۸) تک خط بہت واضح اور عمدہ ہے، سنہ کتابت درج نہیں، لیکن نویں صدی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، صفحہ دو سو نو (۲۰۹) سے دو سو تیس (۲۳۰) تک معمولی خط ہے، سنہ کتابت ۱۰۰۸ھ مرقوم ہے[3]، مقاصد حسنہ حروف تہجی پر مرتب کی گئی ہے، یہ ۱۳۱۹ھ میں مصر، بغداد اور ہندوستان سے شائع ہو چکی ہے[4]

<u>القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع</u> | یہ کتاب بھی سخاوی کے علم و فضل پر شاہد عدل ہے، اپنے موضوع پر یہ منفرد کتاب ہے، اس میں درود کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اس کا حکم، محل، نبی و رسول کا فرق، اسماء النبی، ازواج النبی، اوقات درود وغیرہ عنوانات سے بحث کی گئی ہے، ایک مقدمہ پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، اس کی تالیف سے مصنف رمضان ۸۷۰ھ میں فارغ ہو گئے تھے مگر بعد میں اضافے کرتے رہے[5]، اس کتاب کی زبان بہت ہی شستہ و رواں ہے اور لفظ لفظ سے عقیدت نمایاں ہے، یہ کتاب مصر و حیدرآباد کے علاوہ الٰہ آباد سے بھی ۱۳۲۱ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

<u>التبر المسبوک</u> | سخاوی نے شاہیر اہل قلم کی شہرۂ آفاق کتابوں کو مکمل کرنے کی خاطر مفید ذیول

---

[1] الرسالۃ المستطرفۃ: ۱۵۵ [2] ایضاً: ۱۵۶ [3] نوادر خدا بخش لائبریری: ۹۲ [4] فن اسماء الرجال: ۱۰۶، [5] القول البدیع: ۲۰۱

لکھے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور مقریزی کی "السلوک بمعرفۃ دول الملوک" کا ذیل "التبر المسبوک" ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود تذکرہ وتراجم کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے، اس کو سخاوی نے سنہ وار ترتیب دیا ہے، ۸۴۵ھ سے شروع کیا ہے اور نویں صدی کے آخر تک کے واقعات و حوادث لکھے ہیں، اس میں ان اکابر و اعیان کے حالات بھی لکھ دئے ہیں جو اس اثنا میں وفات پا گئے تھے، اپنے استاد حافظ ابن حجر کے حالات کے بیان میں بڑی شرح و بسط سے کام لیا ہے، بولاق مصر سے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

الجواہر والدرر | سخاوی نے الضوء اللامع، التبر المسبوک میں اپنے استاد و محسن علامہ ابن حجر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن ان کے ساتھ ایسا جذباتی لگاؤ تھا کہ ان کے سوانح حیات کے لئے ایک الگ کتاب تصنیف کی[1]، یہ مخطوطہ کی شکل میں تھی، عرصہ ہوا ڈاکٹر مختار الدین آرزو اس کو ایڈٹ کرکے شائع کرنے والے تھے[2] لیکن اب تک مطبوعات میں ہماری نظر سے نہیں گذری۔

کچھ کتابوں کا معاملہ | الاسمار النبویۃ، الصلوٰۃ علی النبی، موت الانبیاء وغیرہ متعدد کتابیں جو علامہ سیوطی کے نام منسوب ہیں، ان کے بارہ میں حافظ سخاوی کا بیان ہے کہ یہ دراصل ان کی تصانیف ہیں، سیوطی نے ان میں کچھ حذف و اضافہ کیا ہے، مشہور ہے کہ قدماء کی متعدد کتابیں اسی طرح معمولی حذف و اضافہ سے ان کی طرف منسوب ہو گئی ہیں، اس سلسلہ میں مکتبہ محمودیہ[3] کی بعض کتابوں کا بھی

---

[1] النور السافر: ۱۹ [2] مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۶۳ء [3] یہ مشہور عالم و مورخ، حافظ حدیث برہان الدین بن جماعہ (المتوفی ۷۹۰ھ) کا ذاتی کتب خانہ تھا، اس کتب خانہ میں اس کا اہتمام تھا کہ مصنفین کے ہاتھ کی لکھی کتابیں اس میں موجود تھیں ان کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ وقف عام ہو گیا، یہ کتب خانہ ایک ہزار مجلدات پر مشتمل تھا، سخاوی نے الجواہر والدرر میں لکھا ہے کہ ۸۳۶ھ میں جب کتب خانہ کے ناظم فخر الدین ملاطی کو کتب خانہ سے چار سو مجلدات کے خرد برد کرنے کے الزام میں معزول کر دیا گیا تو اس کا ناظم ابن حجر کو بنایا گیا اور وہ زندگی بھر

ذکر کیا جاتا ہے، اس وقت ہمارے پاس وہ کتابیں موجود نہیں ہیں، ورنہ مقابلہ کے بعد پتہ چلتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، ویسے متاخر متقدم سے اخذ و استفادہ کرتا ہی رہتا ہے، جیسا کہ قاضی شوکانی نے لکھا ہے، ہر متاخر متقدم کی کتابوں سے اخذ و انتخاب کرتا ہے، ان کا اختصار بھی کرتا ہے اور توضیح بھی، کبھی ان کی غلطیوں پر اعتراض کرتا ہے، یہ اور اسی قسم کی دوسری اغراض اسے (متاخر) کو تصنیف و تالیف پر آمادہ کرتی ہے، بھلا ایسا کون مصنف ہے جو متقدمین کی کتابوں پر اعتماد کرتا ہو اور ان کی تصانیف سے اخذ و استفادہ نہ کرتا ہو[1] خود شوکانی نے بھی متقدمین کی کتابوں سے اس طرح کا فائدہ اٹھایا ہے، نیل الاوطار ان کی تصانیف میں شاہکار سمجھی جاتی ہے، نواب صدیق حسن خاں اس کی تعریف و توصیف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے، ان کے علاوہ اور بہت سے اہل علم اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن متقدمین کی کتابوں سے کافی مواد اس میں شامل ہے، مولانا انور شاہ کشمیری کا بیان ہے کہ :

اعلم ان نیل الاوطار	نیل الاوطار چار کتابوں'
ماخوذ من اربعۃ کتب فتح الباری	فتح الباری، تلخیص الحبیر'
وتلخیص الحبیر ومجمع الزوائد	مجمع الزوائد اور شرح ترمذی
وشرح الترمذی للعراقی[2]	عراقی سے ماخوذ ہے۔

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) اس کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے، مقریزی الخطط والآثار میں اس کتب خانہ کے بارے میں لکھتے ہیں دیار مصر و شام میں آج اس جیسا کوئی کتب خانہ نہیں ہے، ۹۲۳ھ میں جب سلطان سلیم عثمانی نے مصر فتح کیا تو اس کی اکثر کتابیں استنبول منتقل کر دی گئیں۔ [1] البدر الطالع ۱ : ۲۲۳،
[2] فیض الباری اول : ۲۶۱۔

مسجدِ قرطبہ
فکری و فنی حیثیت سے

از

(از جناب سید محمد ہاشم صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مسجد قرطبہ اقبال کی اعلیٰ ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ اُن کے فکر و فن کا مجموعہ ہے۔ جس کے آئینہ میں ہم ان کے احساسات اور خیالات کی تقریباً تمام پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں۔ شاعری میں اعجاز کی شان اُس وقت پیدا ہو جاتی ہے، جب فکر و فن ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ مسجد قرطبہ اس دور میں لکھی گئی تھی، جب اقبال کی فکر فن میں ڈھل گئی تھی، اور فن میں فکر کی روح سرایت کر چکی تھی، انھیں اب اپنی فکر کے اظہار کے لیے کسی صناعی یا مینا کاری کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ نظم اس زمانہ میں لکھی گئی تھی، جب اقبال نے کہا تھا، ع

میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا		حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا		مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

اس نظم کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اگر صرف یہی نظم لکھتے تو بھی اُن کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا، بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں:

"مسجد قرطبہ جدید اردو ادب کا شاہکار ہے، اس میں شاعر نے ایسا فنی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے، اس میں آرٹ، تاریخ اور فلسفہ ایسی خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا ہے، اور داد دیتا ہے۔"

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایشیا میں تڑپتے مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ سے اقبال کے دل و دماغ میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا تھا، اس وقت کوئی اسلامی سلطنت آزاد نہیں تھی، پھر جب انقلابات رونما ہونے شروع ہوئے، اور ایشیا کے سر پر ناامیدی و مایوسی کے منڈلاتے ہوئے بادلوں میں شگاف پیدا ہوا تو اقبال کے دل میں بھی امید کی ایک کرن پھوٹی ہے ع روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب

دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر اقبال نے مسجد قرطبہ کو دیکھا، اس سے بہت متاثر ہوئے، انھوں نے محسوس کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی عظمت کی عبرت انگیز کہانی ہے اس لئے کہ یہ اور اس کے بنانے والے عالمی تہذیب کے امام تھے، انھوں نے یورپ کی تاریک راتوں میں علم کی شعلیں روشن کیں، انھوں نے اپنی پاک بینی سے شرق و غرب کی تربیت کی، بادشاہت کو فقر کا ماتحت بنا کر ایک نئے انداز سے دل کی دنیا پر حکومت کرنا سکھایا، وغیرہ۔ اور آج یہ عالم ہے کہ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں، تقریباً سات سو سال سے مسجد قرطبہ اپنی عظمتِ رفتہ کی داستان زبانِ حال سے سنا رہی ہے، اور زمانے کے تمام نشیب و فراز کو ایک طویل عرصے سے دیکھ رہی ہے،

اقبال مسجد قوت الاسلام یا تاج محل وغیرہ پر کوئی نظم لکھ سکتے تھے، لیکن جن افکار و خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے اُن کے لئے یہ عمارتیں ناکافی تھیں، مسجد قرطبہ میں ان کے سب ہی بنیادی تصورات پوری جامعیت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، اس میں ان زمانی مکانی

ہمکنات مردِ مومن اور خودی کے تصورات کے ساتھ عشق، حسن، فن اور تاریخ کے نظریات موجود ہیں، اس میں "شکوہ" کا جذبہ شعر ماضی کی فکر، اور طلوعِ اسلام کا اضطراب بھی ملتا ہے،

مسجدِ قرطبہ اقبال کے سامنے فنِ تعمیر کے ایک بے مثال نمونے کی حیثیت میں ہی نہیں آتی بلکہ اس میں اسلامی تہذیب اور اس کی شان و شوکت کے ساتھ اس کے در و دیوار اور نقش و نگار میں ایک مثالی انسان کے اخلاقِ حسنہ، جلال، جمال، اخلاص، للّہیت، سادگی، بلند نظری، عالی ہمتی اور وسیع القلبی، وغیرہ کی تمام صفات، دکھائی دیں، "مسجدِ قرطبہ" آٹھ بندوں پر مشتمل نظم ہے، ہر بند میں آٹھ اشعار ہیں، ہر بند نئے تصور کے ساتھ شروع ہوتا ہے، ختم ہونے سے پہلے خیالات کے لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ جاتا ہے، جو آئندہ شروع ہونے والے بند کے لئے پس منظر کا کام دیتا ہے، اقبال کی بہترین نظموں میں یہ رجحان ملتا ہے کہ اصل بات کہنے سے پہلے ایک مختصر جامع اور پر تریب پس منظر تیار کرتے ہیں، اور ایسی فضا آفرینی کرتے ہیں، کہ اصل مقصد چشمہ کی طرح خود بخود پھوٹ پڑتا ہے،

مسجدِ قرطبہ تخیل کی نہایت بلندی سے شروع ہوتی ہے، وقت یا زمان کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ انتھک کوششوں کے باوجود اس کی اصلی نوعیت سمجھنے اور سمجھانے سے بڑے بڑے علماء قاصر رہے ہیں، افلاطون زمان کی حقیقت کا قائل نہ تھا، اشاعرہ نے زمان کو منفرد آنات کا ایک تواتر بتایا، نیوٹن کے نزدیک زمان ایسی شے ہے جو اپنے ہی اندر مساوی طور پر متحرک رہتی ہے، ملا باقر کا خیال ہے، کہ زمان عملِ تخلیق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جس کی بدولت الوہیت الٰہی اپنے تخلیقی امکانات کا شمار کراتی ہے، محی الدین ابن عربی نے دہر کو اسمائے حسنیٰ میں شامل کیا ہے، قرآن نے زمان کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور زندگی کی مسلسل حرکات کا ایک آلہ بتایا ہے، "اپنی رحمت سے دن اور رات بنایا تاکہ رات میں آرام کرو اور دن کی زندگی کو مرکی بنا"، ابن خلدون

نے . . . پہلی بار قرآن حکیم کے مطابق یہ نظریہ مرتب کیا کہ زمان میں مسلسل حرکت کے لحاظ سے تاریخ ایک ایسی حرکت نہیں ہے، جس کی راہ پہلے سے مقرر شدہ ہو بلکہ ایک ایسی حرکت ہے جو خالص تخلیقی ہو، برگساں زمان کو دو قسموں میں تقسیم کر دیتا ہے ایک وہ جو شب و روز یا ماضی حال مستقبل میں اسیر ہے، اور دوسرا اس سے بالاتر ہے، اس کے نزدیک موثر زمان وہ زمان ہے جس کا عموماً ہمیں احساس ہوتا ہے، اور جس پر طوالت و اختصار کا اطلاق ہو سکتا ہے، دراصل یہ زمان مکانی ہے۔

جن لوگوں نے بھی زمان کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ کسی نہ کسی حد تک نظریۂ قرآن سے ضرور متاثر ہیں، اقبال کے زمان کا سرچشمہ بھی قرآن ہے، انھوں نے فلسفہ اور سائنس کے جدید نظریات کی روشنی میں شاعرانہ انداز میں بڑے کمال کے ساتھ اس مسئلہ کو سلجھایا ہے۔ انھوں نے ابن خلدون کی طرح اس پر غور کیا، اور برگساں کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے آگے نکل گئے، ان کے پیغام کی کامیابی کا راز بڑی حد تک اس تصور میں مضمر ہے کہ زمان ایک حقیقت ہے، اور زندگی زمان میں مسلسل تغیر اور حرکت کا نام ہے، ان کا زمان بھی دو شکلوں میں ملتا ہے، ایک وہی جو مرد خدا کا عمل اسی سے منسلک ہے، عشق کی بدولت رنگ ثبات و دوام حاصل کر لیتا ہے، اور یہ ہے:

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اسے زمان ایزدی کے نام سے بھی یاد کیا ہے، جو شخص زمان ایزدی میں زندگی بسر کرتا ہے اس میں صفات الٰہیہ پیدا ہو جاتی ہیں، اس زمان کی صفات حسب ذیل ہیں۔

اے خوش آن روزے کہ از ایام نیست صبح او را نیمروز و شام نیست
روشن از نورش اگر گردد روان صوت را چون رنگ دیدن می توان

غیب و حضور را از آب راو گرد — نوبت اول یزداں دیے مرد ور

دوسرا زمان عارضی ہے، جو ماضی حال مستقبل میں محصور ہے، اسی میں شب و روز کا سلسلہ بنتا ہے یہی دراصل نقش گر حادثات ہے، اسی میں خدائے تعالی اپنی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی جھلک غالبؔ کے اس مطلع میں بھی ملتی ہے،

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

یہیں دنیا کے امتحان گاہ ہونے کا تصور ملتا ہے ؎

اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت بھی اسی زمانے میں آتی ہے، بے ثباتی و فنا کا تصور بھی اسی سے وابستہ ہے، پہلے بند کے سب ہی اشعار اس کی مثالیں ہیں،

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات

اس زمان کو جاوید نامہ میں "تسلسلی زماں" کہا ہے، اسے روز بے سوز سے تعبیر کیا ہے، جس پر غالب آکر اور اس سے نجات حاصل کرکے شاعر زمان ایزدی کا طلبگار ہوتا ہے،

زمانے کی حقیقت پر بڑے فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے، اس کی اہمیت عظمت اور تقدس کو تسلیم کیا ہے، اسی لئے انھوں نے حدیث کا ترجمہ بھی پیش کیا کہ "زمانے کو برا مت کہو، زمانہ میں خود ہوں"۔

پوری نظم پر زمانے کا تصور حاوی نظر آتا ہے، سلسلۂ روز و شب کی تکرار سے ترشح کرکے وقت کی کارفرمائیوں کا ایک تصور پیش کیا ہے نظم لکھتے وقت اقبال کے ذہن میں وقت کا تاثر شدت کے ساتھ موجود تھا، وقت کے آئینہ میں وہ پوری نظام تکوینی کا نظارہ کرتے ہیں وقت کا ایک مہیب اور خوفناک تصور بھی ہے، یہ محلات کو کھنڈروں میں اور بیابانوں

کو شہروں میں بدلتا رہتا ہے، اور تخریب و تعمیر کی منزلوں سے گزر کر ہمیشہ ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ اس سفاک اور ظالم وقت کے سامنے تمام تدابیر و افعال بے حقیقت ہیں، وقت کی اس تاریکی میں صرف ایک چراغ جلا ہوا ہے، جو اس ساری ظلمت کو قطع کر کے اسے منور کرتا جاتا ہے، وہ عشق کا چراغ ہے جو مرد مومن کے سینے میں جاگزیں ہے اس ناپیدی کے عالم میں جو چیزیں آنی و فانی نہ ہو کر باقی اور دائمی بن جاتی ہیں، ان کی بنیاد اقبال کے اس شعر پر ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

اللہ تعالیٰ نے اخلاق کی تعلیم بھی قرآن کے ذریعہ دی، جس کی کامل اطاعت رسول اکرمؐ نے کی، اسی لئے حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ کسی نے آپؐ سے معلوم کیا کہ حضورؐ کا اخلاق کیا تھا، ؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، قرآن ہی آپؐ کا اخلاق تھا، اقبال کا انسان کامل رسول اکرمؐ ہیں آپ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کر کے انسان کامل بن سکتا ہے، انسان اپنے اندر عشق رسول سے خدا کا اخلاق اور خدا کی صفات پیدا کرے، تو اس کے ہر کام میں غیبی مدد شامل ہو جائے گی، وہ کام اس کا ذاتی نہیں رہے گا، بلکہ خدا کا ہو جائے گا، اسی لئے

ع:- ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

مرد مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن کر لازوال ہو جاتا ہے، مرد مومن خود لافانی ہوتا ہے کیونکہ اسے جس چیز سے جلا ملتی ہے، وہ عشق ہے ع

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

اور یہ سرکش اور بیباک وقت جو سب کو اپنے پنجہ میں اسیر کئے ہوئے تھا، اپنی قہرمانی سے ہاتھ دھو کر خود عشق کا اسیر ہو جاتا ہے جو پوری کائنات پر محیط نظر آتا ہے، کیونکہ ع

عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

یہاں آکر قوت کی حیثیت خطۂ ارض میں پھیلی ہوئی آگ کی ہو جاتی ہے، اور عشق سمند بن کر اس پر غالب آجاتا ہے،

اقبال کے یہاں عشق کا جامع اور ہمہ گیر تصور ہے، یہ ایک شدید اور گہرا جذبہ ہے، جو حقیقت کے ادراک کی رسائی کا ایک موثر وسیلہ ہے، یہ ایک قوت حیات ہے، جو تمام صلاحیتوں کو بیدار کر، راہ میں حائل سب دشواریوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی مقصود تک پہنچ جاتی ہے، ذات کو علویت کے انتہائی مقامات تک پہنچانے، جوہر وجود یعنی خودی کو چمکانے اور استحکام بخشنے کے لئے جس شے کی ضرورت ہے، وہ عشق ہے، یہ وہ گرمی اور حرارت ہے جو اُسے بیدار رکھتی ہے، اور زندگی کا خیر مقدم کرتی ہے،

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　　عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

عشق ایسی فعال اور حیات آفریں ولولہ خیز قوت ہے، جو افراد اور قوموں میں زندگی کے تسلسل اور روانی کو قائم رکھتی ہے، زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے، اور زندگی کے امکانات کی امین و محافظ ہے، یہ عشق متصوفانہ عشق کی ضد ہے، یہ جوہتن "نہیں گسستنی" ہے، سُلاتا نہیں بیدار کرتا ہے، سکون نہیں تڑپ پیدا کرتا ہے، وصل سے گریز اور ہجر سے محبت کرتا ہے، یہی بے خطر ہو کر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے، یہی خودی کی تربیت کرتا ہے، اور مزاحم قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے، یہ عشق فقہ اسلامی کی تشریح و توضیح کرتا ہے، یہی قافلوں کا سالار بھی اور ابن السبیل ہے،

ابن السبیل مسافر، حرکت کی علامت ہے عشق بھی حرکت ہے، اور یہ عشق سب ہی کچھ ہے،

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق　　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق دمِ جبرئیل بھی ہے، دلِ مصطفےٰ بھی ہے، خدا کا رسول اور خدا کا کلام بھی ہے،

اس کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ع

عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

یہی وہ نور ہے جو حضرت آدمؑ کو دیا گیا اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا اپنی اصلی منزل پر آکر ٹھہر گیا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ وغیرہ کو اس نے امتحان میں کامیاب کرایا، اور خود فنا نہیں ہوا،

ایک اور نظم "عشق اور موت" میں موت دعویٰ کرتی ہے کہ میں سب پر غالب ہوں، سب کو نیست و نابود کر دیتی ہوں لیکن وہ نور جو نور مطلق کی آنکھ کا تارا ہے، اس کے سامنے موت کو بھی موت ہے، اور یہ نور عشق الٰہی ہے، جو مرد مومن کا سرمایۂ نشاط اور دائمی اثر کا حامل ہے

ع: عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

مرد مومن کے ذریعہ سے ایک کارنامہ دو وجوہ سے لازوال بن جاتا ہے، ایک تو وجہ خاص عشق کی ہے، دوسری وجہ وہ بے پناہ خلوص اور محبت ہوتی ہے جس فن کو عظیم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں خون جگر صرف کیا جائے، زندگی کی پوری دوڑ میں عموماً اور فنون لطیفہ میں خصوصاً اس کی ضرورت پڑتی ہے، اس کا اطلاق مصوری، سنگ تراشی تعمیر، شاعری اور موسیقی وغیرہ پر بھی ہوتا ہے، یہ فن کی تزئین اور استحکام کا سب سے بڑا وسیلہ ہے "مسجد قرطبہ" میں صرف دو اشعار ایسے ہیں جن سے اقبال کا نظریۂ فن سامنے آتا ہے لیکن یہ اس قدر جامع اور مبسوط ہیں کہ پورے نظریہ کی روح اُن کے اندر سمٹ آئی ہے،

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت ۔۔۔ معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

اور خون جگر کے بغیر ہر نقش ناتمام اور ہر نغمہ سودائے خام ہے،

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر ۔۔۔ نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

یہ قطرۂ خون جگر اگر پتھر جیسی سخت چیز پر بھی پڑ جائے تو وہ مضطرب ہو کر دل کی طرح دھڑکنے لگے۔

قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے ہے صدا سوز و سرور و سرود

اقبال کی شاعری کی نشو و نما بھی اسی خون جگر سے ہوتی ہے۔

خونِ دل و جگر سے مری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

یہ قطرۂ خونِ جگر ہے کیا ؟ اگر خونِ جگر اس سُرخی کی علامت تسلیم کر لی جائے جو مسجد قرطبہ کے رنگ کی شکل میں جلوہ گر ہے، تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن در اصل خونِ جگر خلوص اور حقیقی جذبے کا دوسرا نام ہے، دل میں اس کی صداقت، اس کا حسن اور یقین و ایمان اپنی جگہ مستحکم کر لیتا ہے، تو ہر نئی عمل کا محرک بھی یہی حقیقی جذبہ ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقی خلوص اور شدید جذبہ صرف مرد مومن کے دل میں ہوتا ہے، فن سے اس کے کارنامے لازوال بن جاتے ہیں، مسجد قرطبہ فن تعمیر کا بے نظیر نمونہ اسی لئے ہے کہ اس کے معماروں کا سوز و گداز اور خلوص اس میں شامل ہے، مرد مومن عشق کی بدولت اپنی خودی کو پہچان کر اور خدا کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر فطرت کو تسخیر کرتا ہے، ایک نئی کائنات بنا کر خدا کی کائنات کو تکمیل بخشتا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اقبال کے نزدیک جس میں جلال و جمال پورے طور پر موجود ہوں وہی صاحب کمال ہے۔ ان کے یہاں جمال کی دلبری ساحری بن جاتی ہے اور اگر دلبری یا قاہری ہو تو پیغمبری بن جاتی ہے، اقبال کے نزدیک مسلمان کے عناصر ترکیبی مندرجۂ ذیل ہیں۔

قہاری و جباری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال اپنے مردِ مومن میں بھی یہی اوصاف دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کا مردِ مومن ساقیِ ادبا ذوق، اور فارس میدانِ شوق ہوتا ہے۔ ایسے ہی صاحبانِ کمال کے ہاتھوں مسجد قرطبہ وجود میں آئی،

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
اے حرمِ قُرطبہ عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بُود

دوسرے اور تیسرے بند میں مندرجۂ بالا تصورات سمو دینے کے بعد چوتھے اور پانچویں بند میں مردِ مومن کی صفات کا شمار کراتے ہیں، وہ خلیفۃ اللہ ہے، اس کی زمیں بے حدود اور اُفق بے ثغور ہوتا ہے، اس کا سوز و گداز اسے فرشتوں سے بلند کر دیتا ہے، اس انسانِ کامل کو دیکھ کے فرشتے دنگ رہ جاتے ہیں، ع

نوریاں بہ تماشاے خاکیاں مستند

حضرت جبرئیل بھی سوزِ آدم کے طلب گار ہیں۔

مرا سوز و گداز آدمے دہ — مرا راز و نیاز آدمے دہ

مومن عشق کے پروں سے اُڑ کر عشق کی وسعتوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ مہ و پرویں اس کے نخچیر ہوتے ہیں، اور پکار اٹھتا ہے کہ ع یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

کائنات کی ساری توانائی اس کے دم سے ہے، لیکن اقبال کا مردِ مومن نطشے کے فوق البشر سے مختلف۔ فوق البشر خواہشات دنیاوی کا اسیر ہوتا ہے لیکن مومن کامل خواہشات سے پاک اور اغراض سے بلند ہوتا ہے، اقبال مسجد کو مخاطب کرکے کہتے ہیں، ؎

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

چھٹے بند میں اندلس کے عہدِ رفتہ (اُن کے شاندار دورِ اقتدار) کے ان مسلمانوں پر نظر جاتی ہے جنھوں نے ایمان و اخلاص کے ساتھ اس مسجد کو تعمیر کیا تھا، جسے اقبال حرم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ان حاملینِ خلقِ عظیم نے یورپ پر غیر معمولی اثر ڈالا آج بھی اندلس بلکہ سارے یورپ میں اسلامی اثرات نظر آتے ہیں جس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں نے قیصر و کسریٰ کی طرح شہنشاہی نہیں کی، بلکہ یہ ثابت کر دکھایا کہ ع

سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

آن مسلماناں کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

اقبال ایسے مردانِ مومن کی تلاش میں ہے، وہ کہتا ہے

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

ساتویں بند میں عالمی انقلابیت کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے، جرمنی، فرانس اور روم کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی روح تڑپ اٹھتی ہے، اور اس کی زبان سے نکلتا ہے،

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

پھر کہتا ہے:-

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

آخری بند میں بھی دریائے کبیر کو مخاطب کرکے اس انقلاب کی پیشین گوئی کی ہے، جو ابھی پردۂ خفا میں ہے؛:

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

پھر مسلمانوں کو ہر لحظہ سرگرم عمل رہنے کی تلقین کرنے کے بعد آخر میں اس شعر پر نظم تمام کر دی ہے؛

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

فنی اعتبار سے یہ نظم نہایت چست اور Compect ہے، آٹھوں بند فطری زیر و بم کے حامل اور ابتدا و انتہا سے منسلک ہیں، ابتدا سے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک پرشور دریا کے کنارے کھڑا ہوا سلسلۂ روز و شب کی تکرار سے موجوں کے تند تھپیڑوں کا مشاہدہ کر رہا ہے، اور یہ بہاؤ اور روانی ہر مصرعہ کے ساتھ تیز تر ہوتی جاتی ہے، اس میں بلا کا مد و جزر ہے، الفاظ کے در و بست سے اس میں رجز کی موسیقی پیدا کی گئی ہے، ان میں غنائیت کے ساتھ ساتھ ٹھہراؤ بھی ہے لیکن اس سے روانی مفقود نہیں ہوتی، یہ ٹھہراؤ مقصد کو زیادہ موثر اور دلنشیں کر دیتا ہے، مسجد قرطبہ کی بحر فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے، اس میں یہ ٹھہراؤ اپنے عروج پر ہے،

اس کی فنی صناعی اور فکری تعمیر کو اقبال نے خود مسجد قرطبہ کی صناعی اور حسن سے ہم آہنگ کر دیا ہے، الفاظ کا انتخاب اس طرح کا ہے جیسے کوئی کاریگر ہر ہر پتھر کو مناسب جگہ پر پیوست کرتا چلا جا رہا ہے،

وحدت تاثر اس کی بڑی خوبی ہے، افسانہ کی طرح نظم مختلف کلائمکس سے گذرتی اپنے منطقی منتہا کو پہنچتی معلوم ہوتی ہے، جس طرح افسانہ کے خاتمہ پر تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے، اسی طرح اس نظم کے خاتمہ پر اچانک پن کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے،

ندرت اسلوب کے اعتبار سے یہ اقبال کی منفرد نظم ہے، اقبال کی کسی دوسری نظم کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہے جو مسجد قرطبہ کو حاصل ہے؛

مولانا شبلیؒ کے ایک استاذ

مولانا محمد فیض اللہ مئوی

از مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مئوی مئو اعظم گڈھ

علامہ شبلی کے اساتذہ میں مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹیؒ، مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، اور مولانا ارشاد حسین رامپوری تو بہت مشہور ہیں، اور ان کے حالات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، لیکن علامہ مرحوم کے ایک اور باکمال استاد مولانا فیض اللہ پردۂ گمنامی میں مستور ہیں، ذیل کی سطور میں ان کے حالاتِ زندگی اور علمی و دینی مشاغل بیان کئے جارہے ہیں۔

پیدائش مولانا فیض اللہ صاحب اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو کے رہنے والے تھے، یہیں ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں ان کی پیدائش ہوئی، والد کا نام حکیم یار محمد تھا، جو قصبہ اور اطراف و جوانب میں لائق طبیب سمجھے جاتے تھے، طبابت کے ساتھ وہ چھوٹے موٹے آپریشن بھی کر لیتے تھے۔

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے جونپور مولانا سخاوت علی کے مدرسہ میں گئے، مولانا سخاوت علی حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ تھے سید صاحب کی شہادت کے بعد وہ جونپور میں مستقل طور پر جم کر تعلیم و تدریس اور وعظ و تبلیغ میں مصروف رہے، یوپی کے مشرقی اضلاع میں ان کی جد و جہد سے بڑی اصلاح ہوئی، دور دور تک علم کی

روشنی پھیلی اور بدعات و خرافات کے بجائے سنت کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا ہوا[1]

مولانا سخاوت علیؒ کی نگاہ جوہر شناس نے مولوی فیض اللہ کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا، اور ان کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ کی، مولانا سخاوت علی صاحب کی صحبت اور شفقت کا یہ حال تھا کہ ۱۲۶۲ھ جب آپ حج کو جانے لگے تو اپنے اس ہونہار شاگرد کو آپ نے مولانا عبدالحلیم لکھنوی متوفی ۱۲۸۵ھ کے سپرد کر دیا جو اس وقت باندہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، مولانا سخاوت علی صاحب جب حج سے واپس آئے تو مولانا فیض اللہ صاحب پھر ان کی خدمت میں چلے آئے اور یہیں آکر آپ نے درسیات کی بقیہ کتابوں کی تکمیل کی، مولانا سخاوت علی صاحب نے ۱۲۶۳ھ میں آپ کو سند دی اور ۱۲۷۲ھ میں سنن نسائی کے اطراف سنا کر ایک سند آپ نے مولانا عبدالرحمن معروف بنظیر اعلیٰ سے حاصل کی جو ابتک محفوظ ہے۔

درس و تدریس | جن اساتذہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی تھی، ان کے طریقۂ درس کے مطابق آپ پڑھتے بھی تھے اور نیچے درجہ کے طلبہ کو پڑھایا بھی کرتے تھے، اس لئے پڑھنے کے بعد درس و تدریس کے لیے آپ کو نہ کسی ٹریننگ کی ضرورت پیش آئی نہ تیاری کی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ پڑھنے کے بعد مولانا فیض اللہ صاحب علمائے صادق پور کی انجمن میں شامل ہوگئے، اور اسی انجمن کے تحت وہ تبلیغی دورے کرتے رہے، مگر ۱۸۶۳ء میں وہابیوں کو باغی قرار دیدیا گیا، اور علمائے صادق پور کی خانہ تلاشی ہونے لگی تو پٹنہ سے اپنی سسرال بہادر گنج ضلع غازیپور چلے آئے، یہاں بہت دن دنوں تک روپوش رہے، جب اطمینان ہوگیا کہ باغیوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ہے تو اپنے گھر مئو آئے[1] اور یہاں آپ نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور گھر ہی پر طلبہ کو پڑھانے لگے[2]، مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد طلبہ کے ہجوم کے باعث درس و تدریس کا یہ سلسلہ

---

[1] روایت عظیمہ خاتون متوفی ۱۹۲۰ء بہو مولانا فیض اللہ صاحب (بذریعہ عبدالہادی نواسہ عظیمہ خاتون)

[2] مخزن خوبی بیاض قلمی مولانا ابوالمعالی مئوی۔

شاہی مسجد کرہ میں بھی شروع کرنا پڑا۔[1] لوگوں کا بیان ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں وہ یکہ سے یا پیدل جونپور آتے جاتے تھے۔ ان کی پہلی منزل اعظم گڈھ ہوتی تھی، کیونکہ اس وقت ریل یا بڑی لائن کا وجود نہیں تھا، اعظم گڈھ میں علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ متوفی ۱۹…ء کے پاس یا دلی جان وکیل کے والد کے پاس ٹھہرا کرتے تھے، ان سے ان لوگوں کے گہرے مراسم تھے، چنانچہ اسی تعلق کی بنا پر ۱۸…ء میں جب اعظم گڈھ میں مدرسۂ اسلامیہ قائم ہوا تو آپ کو اس کا صدر مدرس بنایا گیا، اور اس طرح درس و تدریس کا یہ سلسلہ جس سے اب تک مئو کے لوگ فیض یاب ہو رہے تھے، یہاں سے منتقل ہو کر اعظم گڈھ چلا گیا، اور وہیں آپ اپنے دینی و علمی فیوض و برکات سے طلبہ کو مستفید کرنے لگے، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

مدرسۂ عربیہ اعظم گڈھ میں تھوڑے عرصہ تک . . .

. . . . مولانا سخاوت علی جونپوری مرحوم کے شاگرد مولانا فیض اللہ صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔[2] لیکن مولانا عبدالسلام مبارکپوری متوفی سنہ ۱۳…ھ نے لکھا ہے کہ ملا حسام الدین نے ابتدائی تعلیم تو مئو میں حاصل کی مگر درسیات کا زیادہ حصہ اعظم گڈھ میں . . . . اپنے شفیق استاد جناب مولانا الحاج محمد فیض اللہ صاحب سے پورا کیا۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیض اللہ صاحب نے اعظم گڈھ میں خاصی مدت گذاری ہے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ مدت کتنی تھی، مولانا فیض اللہ صاحب نے ملا حسام الدین کو ۱۳…ھ میں سند دی تھی، گمان غالب یہ ہے کہ اسی سے کچھ آگے پیچھے آپ اعظم گڈھ رہے، اسی دوران میں مولانا شبلی نے بھی آپ سے عربی کی چند کتابیں پڑھیں، اعظم گڈھ میں ملا . . . حسام الدین کے علاوہ مولانا ابو الحسنات عبدالغفور داناپوری، مولوی ابو الحسن محمد سعد اللہ

[1] اہلحدیث امرتسر ۳ فروری ۱۹۱۲ء [2] حیات شبلی ص ۱۰۰، [3] اہلحدیث امرتسر ۲ جنوری ۱۹۲۰ء

واعظ، مولانا عبد اللہ واعظ، حافظ عبد الرحیم مبارکپوری، مولوی سلیم اللہ مئوی اور مولوی خدا بخش اعظم گڈھی نے بھی آپ سے تحصیل علم کی۔

مولانا فیض اللہ صاحب دانا پور جانے سے پہلے علی گنج سیوان میں رہتے تھے، وہاں بھی طلبہ کو پڑھانے اور وعظ و تقریر کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح کیا کرتے تھے[۱]، بعد کو دانا پور گئے، وہاں بھی یہی مشغلہ تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ آخر میں مطب کرنے لگے تھے، اور اسی تعلق سے دانا پور میں رہتے تھے[۲]

بیعت | مولانا فیض اللہ صاحب نے جس دینی ماحول میں ہوش سنبھالا تھا، اس میں دینداروں کی بڑی قدر و منزلت اور ان کی آمد و رفت رہا کرتی، حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ کے ایک بزرگ خواجہ سید احمد نصیر آبادی[۳] اکثر آیا کرتے تھے، بہت سے لوگ ان سے مرید تھے، مولوی فیض اللہ صاحب کی نظر انتخاب بھی ان ہی پر پڑی، وہ ان کے مرید ہوگئے، اور مرشد کی توجہ سے خلافت سے سرفراز ہوئے، اور لوگوں کو راہ سلوک طے کرانے لگے، آپ غریبوں سے بہت انس رکھتے تھے،[۴]

سفر حج | ۱۳۲۳ھ میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے، ملا حسام الدین کی طالب علمی کا زمانہ تھا

ملہ ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۱۳۰،

[۱] اہلحدیث امرتسر ۱۳ فروری ۱۹۲۰ء۔ [۲] حیات شبلی ص ۲۰، [۳] آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، مشائخ کبار میں تھے، اودھ کے بیشتر مقامات کا آپ نے دورہ کیا اور دیہات و قصبات کے ہزاروں مسلمانوں نے شرک و بدعت سے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی، دیار پورب میں آپ کی اصلاحی سرگرمیوں سے بڑا فائدہ ہوا، ۱۳۲۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہتہ الخواطر ج ۸ ص ۳۶۹ نیز مضمون مولوی ابو الحسن علی ندوی مطبوعہ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ اپریل ۱۹۶۳ء تا ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء [۴] اہلحدیث امرتسر ۱۳ فروری ۱۹۲۰ء۔

انھوں نے اس موقع پر ایک دلچسپ اور پُر اثر نظم لکھی۔

وفات | آپ کی وفات ۱۰ ربیع الآخر بوقت عصر بروز دوشنبہ ۱۳۲۰ھ میں ہوئی،

داناپور سے دو روز کے لیے اپنے بڑے بھائی حکیم رکن الدین صاحب کی عیادت کے لیے مکان تشریف لائے، داناپور واپس پہونچنے کے چوتھے یا پانچویں دن پنجشنبہ کو حسب دستور آپنے وعظ فرمانا شروع کیا، اثنائے وعظ میں شدید تے ہوئی اور بے ہوش ہوگئے، تین چار روز تک اسی حالت میں مبتلا رہے، وہاں کے حکیموں نے بہت کچھ علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔

جنازہ میں وہ کثرت تھی کہ یہاں کے کسی رئیس کے جنازہ میں بھی نہیں ہوئی، بڑے بڑے رؤسا فضلا حکما آپ کے جنازہ میں شریک تھے اور راہ میں جنازے چلنے پر ہر شخص سبقت کرنے کی کوشش کرتا تھا اس کی وجہ سے کتنے لوگوں کے کپڑے پھٹ گئے۔[1]

تاریخ وفات | متعدد لوگوں نے آپ کی تاریخ وفات لکھی لیکن یہاں مولانا ابوالمعالی محمد علی کی قلمی بیاض سے مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کے یہ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو شاید اب تک طبع نہیں ہوئے، ؎

در بہشت آمد چوں آں رضواں مآب — آستیں بگرفت رضوان بہشت
حوریاں گفتند از ہر سو بیا — مرحبا اے تازہ مہمان بہشت
در جہاں چوں سیرتِ درویش داشت — نام او کردند سلطان بہشت
سالِ تاریخ وفاتش خواستم — نامہ زد کلکم چو مرغان بہشت

ہاتفے گوئے ندا از دکانے خلیل،
جائے وے باد اگلستانِ بہشت[2]

---

[1] الدر من الاخر ص ۲۰ [2] بیاض فیضی قلمی،

اولاد | آپ کے چار لڑکے تھے۔[1] تین تو آپ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے، صرف ایک لڑکے مولانا محمد علی ابوالکلام زندہ رہے جن کا ۱۳۵۲ھ میں انتقال ہوا، وہ مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردوں میں تھے، ریاست بھوپال سے وظیفہ ملتا تھا، مختلف مسائل پر بہت سے رسائل تصنیف کئے، حیات شبلی کے حاشیہ میں ایک جگہ موصوف کا ذکر آیا ہے، نزہۃ الخواطر اور تذکرہ علماء حال میں بھی آپ کا تذکرہ ہے۔

تصانیف اور تلامذہ | مولانا فیض اللہ صاحب کی کوئی اہم تصنیفی یادگار نہیں، انھوں نے صرف ایک رسالہ سورۃ الرحمٰن تالیف کیا، لیکن آپ کے تلامذہ میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں غیر معمولی شہرت حاصل کی، ان میں علامہ شبلی کے علاوہ مولانا عبدالغفار مئوی، مولانا ابوالحسنات عبدالغفور دانا پوری، مولانا ابوالمعالی مئوی، مولانا عبدالقادر ابوالفیاض، مولانا محمد شفیع بانی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، مولانا خلیل الرحمٰن، مولانا خدابخش وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتب خانہ | مولانا فیض اللہ کے پاس مختلف اسلامی علوم و فنون کی گرانقدر کتابوں پر مشتمل ایک عظیم ذاتی کتب خانہ بھی تھا، انھوں نے ملک کے دوسرے ممتاز کتب خانوں میں سے عربی کی نادر و کمیاب کتابیں نقل کراکے اپنے یہاں محفوظ کی تھیں، جن میں علامہ ہاشم سندھی کی دراہم الصرۃ فی وضع الیدین تحت السرۃ، علامہ سیوطی کی انتباہ الاذکیاء فی حیاۃ الانبیاء اور ان کے دوسرے متعدد رسائل، امام حازمی کی الناسخ والمنسوخ، حسین بن ہلال یمنی کی عدۃ المنسوخ من الحدیث اور ملا علی قاری کے متعدد رسائل اور احادیث کے کئی مجموعے خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

---

[1] اہل حدیث امرتسر سنہ ۱۹۶۰ء

اکابر کی نظر میں | صاحب نزہتہ الخواطر مولانا سید عبدالحی لکھتے ہیں،

وکان علی قدم شیوخہ	اپنے شیوخ کے طریقہ پر آپ نے سنت
فی اتباع السنۃ السنیہ	مبارکہ کی اتباع کی سلف کے طریقے
واقتفاء آثار السلف،	پر رہے اور درس وتدریس اور وعظ
ید رس ویفید[1]	وتبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہونچایا

مولانا حافظ عبد اللہ غازیپوری جو اکابر علمائے اہل حدیث میں ہیں، مولانا فیض اللہ کو "رئیس العلماء" اور "اسوۃ الفضلاء الکرام" جیسے بلند الفاظ سے ۔۔۔ یاد کرتے ہیں، اسی طرح حکیم عبدالحفیظ لکھنوی نے آپ کو "بحر المواج" اور "سراج الوہاج" لکھا، جس سے نہ صرف آپ کی عظمت اور بزرگی کا پتہ چلتا ہے، بلکہ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے، کہ آپ کا اپنے وقت کے علماء واکابر کی نظر میں کیا مقام تھا، اور اہل علم طبقہ میں کس قدر عزت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،

مسلک | آپ بے باک غیر مقلد تھے، جامد مقلد کتاب وسنت پر عمل کرتے تھے مگر گروہی عصبیت سے بری تھے ۔۔۔ فروعی مسائل میں تشدد کے قائل نہیں تھے، دین کی بنیادی باتوں پر زور دیتے اور تعلق مع اللہ، اتباع سنت تزکیۂ اخلاق اور درستی اعمال کی طرف زیادہ توجہ فرماتے۔ یہ شاید حسن اتفاق ہی تھا کہ اساتذہ بھی آپ کو ایسے ملے تھے، جن کے اندر تعصب اور گروہی عصبیت بالکل نہ تھی، علمی اور فقہی مسلک میں وہ وسیع النظر اور معتدل مزاج تھے اپنی استعداد کے مطابق مولانا فیض اللہ صاحب نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا، اور اپنے اساتذہ کی طرح خود بھی آپس کے اختلاف اور گروہی عصبیت سے ہمیشہ دامن کشاں رہے،

---

[1] نزہتہ الخواطر، ج ۸، ص ۳۶۹

آپ کے صاحبزادے مولانا محمد علی ابوالمکارم ایک پُرجوش اہل حدیث عالم تھے، جو اختلافی مسائل پر بحث ومناظرہ کے لئے ہر وقت تیار رہا کرتے تھے، لیکن خود مولانا فیض اللہ صاحب نے کبھی اپنے آپ کو اختلافی مسائل میں نہیں الجھایا کیونکہ ان کے نزدیک یہ غیر ضروری اور غیر مفید ہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے یہ طرز عمل مضر رساں تھا، ان کے نزدیک اصل کام یہ تھا، کہ قرآن وحدیث کی بنیادی تعلیم کو پھیلایا جائے، توحید کی دعوت کو عام کیا جائے، بدعتوں کو مٹایا جائے، اور مردہ سنتوں کو زندہ کیا جائے، یہی ان کے نزدیک سب سے بڑا کام تھا، اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت، چنانچہ ساری زندگی وہ اسی کام میں لگے رہے،

آپ کی رواداری اور اعتدال پسندی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ سنہ ۱۳۲۹ھ میں مئو کے حنفی اہل حدیث جھگڑے میں جو صلحنامہ لکھا گیا جس پر وہاں کے تقریباً سبھی قابل ذکر علماء کے دستخط ہیں، وہ سب کی متفقہ رائے سے آپ ہی کے پاس رکھا گیا،[1] مولانا فیض اللہ صاحب رفع یدین بھی نہیں کرتے تھے[2]۔ اور نہ بیعت کو خلاف شرع سمجھتے تھے، مولانا خواجہ احمد صاحب نصیرآبادی سے بیعت تھے، آپ کے استاد مولانا سخاوت علی صاحب بھی حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز تھے، ان کا ذہن غلو اور افراط سے پاک تھا، وہ توحید وسنت کے متبع اور سلف صالحین کے پیرو تھے، ان کے مسلک کو ہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مسلک کہہ سکتے ہیں جس میں ائمہ مجتہدین کی اتباع بھی ہے، اور تعظیم بھی، لیکن جمود نہیں، طبیعت کے اسی

---

[1] نزہۃ الاخیار مصنفہ ملا حسام الدین ص ۵۔ [2] اشتہار لیاقت انجمن۔ از عبد الرحمن ابوالنعمان مئو اعظم گڈھ ۱۰ شوال ۱۳۳۲ھ مطبوعہ مجتبائی پریس لکھنؤ

رجحان نے شاید آپ کو خواجہ احمد نصیر آبادی کی خدمت میں پہونچایا، اور اسی ذوق کی بنا پر خواجہ سید امین نصیر آبادیؒ سے آپ کے تعلقات استوار ہوئے چنانچہ موصوف یعنی خواجہ سید امین نصیر آبادی ایک بار مئو آئے، مولانا فیض اللہ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تو ایک خط لکھا ہے جس سے ان کے مابین خلوص و محبت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خط حسب ذیل ہے،

محبی مولوی فیض اللہ صاحب — بعد سلام

صبا بگلشن احباب من اگر بہ گذری — اذا لقیت حبیبی نقل لہ خبری

فراموش مکن کہ مارا بہ ہجر می سوزی — فان رضیت بہذا رضیت فی ضرری

مدرسہ عالیہ کا قیام | آپ کا ایک زندہ جاوید کارنامہ مئو میں مدرسہ عالیہ کا قیام ہے، اس سے پہلے مئو میں کوئی باقاعدہ عربی درسگاہ نہیں تھی، بلکہ طلبہ کے مختلف اہل علم کے مکانات پر جاکر تعلیم حاصل کرنے کا رواج تھا، مولانا فیض اللہ نے اس اہم ضرورت کو محسوس کیا، اور دوسرے علماء کے مشورے سے ۱۹۰۲ء میں ایک مسجد میں مدرسہ عالیہ کے نام سے باقاعدہ درسگاہ قائم کی، جس میں آپ کے تلمیذ رشید ملا حسام الدین پہلے مدرس مقرر ہوئے، آج یہ درسگاہ ملک و بیرون ملک کے تشنگان علم کا مرجع ہے،

اخلاق و کردار | مولانا صدر درجہ شریف نیک صلح پسند متواضع اور ملنسار تھے، اس لئے ہر طبقہ اور ہر مسلک کے لوگ ان کا احترام کرتے اور ان سے تعلق رکھتے، لوگوں کو معلوم ہوجاتا کہ مولانا گھر آرہے ہیں،

لہ بڑے جاہ و جلال کے بزرگ تھے، دیار پورب میں آپ کی دینی و اصلاحی سرگرمیوں سے بڑی اصلاح ہوئی، مئو اکثر آتے جمعہ کے دن جامع مسجد میں بیان ہوتا تقلید و عدم تقلید، آمین بالسر والجہر وغیرہ لاطائل مباحث جھگڑے اور جتھہ بندی جماعت میں تفریق ڈالنے کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے، اور زبان سے اس کا اظہار بھی فرماتے،

تو میلوں آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتے

مواعظ و نصائح | وعظ و نصیحت کے ذریعہ دین کی بات لوگوں تک پہونچانا انبیاء کرام کی سنت ہے، اور علماء و اہل اللہ نے ہمیشہ اس سنت پر عمل کیا ہے، مولانا فیض اللہ صاحب بھی اس سنت پر عمل کرتے اور جہاں رہتے جمعہ کو بالالتزام آپ کا بیان ہوتا، آواز بلند تھی زبان میں اثر تھا، لوگ دور دور سے آپ کا وعظ سننے آتے اور متأثر اور مستفید ہوتے، مولانا عبدالرحمٰن ابوالنعمان لکھتے ہیں۔

> خدا نے علاوہ اور کمالات و فضائل کے قوت بیانیہ اور جوہر تقریر بھی ایسا بخشا تھا کہ جس جلسہ میں آپ رہتے لوگ نہال ہو جاتے، ہمیشہ بعد نماز جمعہ وعظ بیان فرماتے اور اس طرز و ادا سے فرماتے کہ بند سامعین کی یہ حالت ہوتی کان علی رؤسہم الطیر۔ ایک سکتہ کا عالم رہتا، اور ایسے ایسے نکات قرآنیہ اور رموز فرقانیہ بیان کرتے کہ لوگوں پر ایک خاص اثر ہوتا اور اکثر لوگ روتے روتے بدحواس ہو جاتے۔[1]

زندگی بھر مولانا کا یہی مشغلہ تھا، کتابوں کا درس بھی دیتے، وعظ و تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیتے اور سلوک و تصوف کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح بھی کرتے، پوری زندگی اس طرح بسر کردی آپ کے ذریعہ مخلوق کو بہت فائدہ پہونچا اور اطراف وجوانب میں اتباع سنت کا جذبہ پیدا ہو گیا

---

[1] اہلحدیث امرتسر ۱۰ فروری ۱۹۲۲ء

حیات شبلی

مولفہ۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔

ادبیات

غزل

از جناب عبد الباری صاحب عشقؔ خلف منشی ممتاز علی آہ مرحوم تلمیذ امیر مینائی مرحوم

دل میں رہتے ہیں دل آزار یہ کیا
اتنے پیارے ہیں ستمگار یہ کیا

خود تو ہیں درپئے آزار مرے
یاد اُن کی مری غمخوار ہے کیا

تم مری جان مسیحائے زماں
اور پھر میں رہوں بیمار یہ کیا

تیری صورت تو بہت بھولی ہے
اور تو ایک ہی عیار یہ کیا

دل مرا جان مری دین مرا
سب کے وہ مالک و مختار یہ کیا

جس کا خواہاں وہ ہستی ہے مری
آپ اپنا ہوں طلبگار یہ کیا

دعوتِ عشق ابھی سے ہے یہاں
حشر پہ وعدۂ دیدار یہ کیا

چھینے لیتے ہیں مرا دل کیوں آپ
سنئے تو دیکھئے سرکار یہ کیا

عشقؔ کہتی ہے طبیعت اپنی
کہئے شعر ادر ابھی دوچار یہ کیا

غزل

از ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ ریڈر شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی

جن کا شعور خام ہے وہ نئی وضع میں ڈھلے
ذوق ہمارا پختہ ہے، اپنی ہی چال ہم چلے،

صحنِ چمن سے چرخ تک، جگنوؤں کی بہار ہے — پھرتے ہیں اپنے اشک ہم، بیٹھے ستاروں کے تلے
جن میں ہے شعلۂ حیات دیتے ہیں خود بخود ضیا — تاروں کے نقرئی چراغ، شام کے وقت خود جلے
تیز ہوا کے جھونکے نے، کانٹے بچھے ہیں راہ سے — گلشنِ کائنات میں، اب بھی ہیں لوگ کچھ بھلے
یہ بھی کوئی بہار ہے، چند شگوفے کھل گئے — آئی ہے فصلِ گل اگر، نخلِ حیات بھی پھلے
ایسا نہ ہو کہ پھونک دیں، برق کے آشیانے کو — شمعِ طلب کے آس پاس جمع ہوئے ہیں دل جلے
گلچیں کو گر نہیں ہے یاد، بادِ صبا بتائے گی — باغ کے لالہ و گلاب، اپنے ہی خون کو پلے
پھول ہوں چاہے خار ہوں، مری نظر میں ایک ہیں — ان کو بھی کر لیا سلام، اُن سے بھی مل لیے گلے
لے گئی آسمان تک ان کو شبابِ نو کی دھوپ — آبسے آشیانوں میں، سارے طیور دن ڈھلے
ان کو بچا سکے گا کون، گلچیں کے دستِ جور سے — نکلے ہیں کچھ حسین پھول، غازۂ صبح نو لئے

آئی ہے کیوں اجل سلام، جب ہے حیات ناتمام
چھوڑیں ہم اپنے کام کیوں، موت کا وقت خود ٹلے

کلامِ شبلی

مترجمہ جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ (رامپور)

کیا جانوں گبر ہوں کہ مسلماں نہیں ہوں میں؟ — کچھ بھی سہی پہ زاہدِ ناداں نہیں ہوں میں
میرے جنوں کو چرخِ ستم گر سے کیا خطر — دوں طبع وہ، تو مایۂ ارزاں نہیں ہوں میں
ہوں چارہ گر جو آپ کے جاں بخش لعلِ لب — پھر کیوں کہوں کہ لائقِ درماں نہیں ہوں میں
دلوائے عقل گرچہ نہیں ہے ولے مجھے، — ہاں یہ مثلِ ناصحِ ناداں نہیں ہوں میں
فرصت ملے تو رندی و مستی بھی کر دکھاؤں — رسمِ ریا کا صاحبِ میداں نہیں ہوں میں
چاہو نہ مجھ سے شعر و سخن ہی سے دور — شبلی ہوں اب وہ رندِ غزل خواں نہیں ہوں میں

مطبوعات جدیدہ

حیات خلیل مرتبہ مولانا محمد ثانی حسنی ندوی مظاہری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپے، پتہ (۱) مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ (۲) کتب خانہ یحیوی مظاہر علوم، سہارن پور۔

مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب بذل المجہود کے حالات و سوانح میں مولانا اشرف علی تھانوی کی تذکرۃ الخلیل اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی تذکرۃ الخلیل پہلے سے موجود تھیں، مگر اب جدید طرز کی ایک سوانح عمری کی ضرورت تھی اس لئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے ایما و تحریک سے مولانا محمد ثانی نے اس کام کو انجام دیا ہے جن کو شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف کی سوانح عمری مرتب کرنے کے سلسلہ میں دیوبند و سہارن پور کے قرب وجوار کے قصبات اور ان کے علمی و دینی خانوادوں سے پوری واقفیت تھی، یہ کتاب دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ دس اور دوسرا آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے میں صاحب ترجمہ کی ولادت سے وفات تک کے حالات و واقعات زندگی درج ہیں، اور دوسرے میں ان کے علمی، دینی اور روحانی کمالات بیان کئے گئے ہیں، پہلے باب میں مولانا کے خاندانی حالات بہت کدو کاوش سے لکھے گئے ہیں، اس میں ان کے ننہالی اور ددھیالی متعدد بزرگوں کا مختصر تذکرہ ہے، دوسرے باب میں مولانا کے عہد اور ماحول کا بیان ہے، اس میں دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور اور متعدد ممتاز اشخاص اور مشہور علمی و دینی خانوادوں کے علاوہ حضرت مجدد صاحب

شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ کی دینی تحریکوں اور ان سے مولانا اور ان کے اکابر کے تعلق کا ذکر ہے، اس کے بعد مولانا کی ولادت، تعلیم، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ان کی بیعت وارادت اور اجازت و خلافت، مختلف مدرسوں سے تعلق، مظاہر العلوم کی صدر مدرسی، تلامذ سرپرستی، طریقۂ تعلیم، درس و تدریس کے معمولات و خصوصیات، ساتھ و فہم کرنے اور بعض اہل بدعت و اہل تشیع سے مناظروں کی روداد، تحریک ندوۃ العلماء کی تائید اور اس کے پہلے جلسہ میں شرکت، مدینہ منورہ میں مستقل قیام اور وہاں کی مشغولیتوں، نیز علالت و وفات اور جنت البقیع میں تدفین اور اولاد وغیرہ کا مفصل ذکر ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے علم و فضل، ورع و تقویٰ، اتباع سنت، عبادت و ریاضت سے شغف، روز و شب کے معمولات، اوصاف و اخلاق، ارشادات و ملفوظات، بعض خاص افکار و خیالات، فقہی مسائل میں معتدل رویے اور تصنیفات وغیرہ کا تعارف کرایا گیا ہے، اس حصہ میں مصنف نے مولانا کے متعلق متعدد اکابر جیسے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا شاہ عبد الرحیمؒ رائے پوری، مولانا محمود الحسنؒ، مولانا تھانویؒ، مولانا مدنیؒ، حکیم سید عبد الحیؒ وغیرہ اور بعض علمائے مدینہ کی رائیں اور تاثرات بھی نقل کیے ہیں اور ایک باب میں ان کے اہم خلفاء، مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ، مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ اور ان کے برادر خورد و بانی تحریک تبلیغ مولانا محمد الیاسؒ اور فرزند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے مختصر حالات لکھے ہیں، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی قابل مطالعہ ہے، یہ کتاب بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے لکھی گئی ہے جو تنہا ایک شخص کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ گذشتہ صدی ہجری کے نصف آخر اور موجودہ صدی کے نصف اول کی علمی، تعلیمی اور دینی تاریخ ہے اور یہ مظاہر العلوم اور دار العلوم دیوبند اور ان کے متعدد اکابر و مشائخ کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ ہے لیکن

اس کی ضخامت سے ممکن ہے بعض قارئین کو اکتاہٹ ہو، اگر لائق مصنف واقعات کو سمیٹ کر لکھتے اور تکرار سے بچتے، نیز طویل اقتباسات کو جو عموماً فائدہ سے خالی نہیں ہیں حذف کر دیتے تو کتاب کا حجم کم ہو جاتا، مولانا کی تصنیفات کا تعارف مختصر ہے۔ بذل المجہود جو ان کا بڑا کارنامہ ہے تعارف بھی مختصر ہے۔

فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل } مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت [illegible] پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

یہ پانچ مضامین کا مجموعہ ہے (۱) فقہ اسلامی کا دائرہ کار (۲) فقہ اسلامی کے بنیادی مآخذ (۳) شریعت اسلامی کے ضمنی مآخذ (۴) اسلامی قانون اور عرف وعادت (۵) فساد زمانہ اور عموم بلوی۔ موخر الذکر چاروں مضامین کئی سال پہلے معارف میں چھپ چکے ہیں، پہلے مضمون میں فقہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے دائرہ کار کا ذکر کرکے اس کی جامعیت دکھائی گئی ہے اور اس کے بارہ میں پھیلی ہوئی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، دوسرا اور تیسرا مضمون جدید قوانین اور اسلامی قانون کے ماہر اور دمشق یونیورسٹی کے لا کالج کے پروفیسر مصطفیٰ احمد زرقا کی مشہور کتاب المدخل الفقہی کے دو ابواب کا اردو ترجمہ ہے، ان میں اسلامی فقہ کے بنیادی مآخذ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس و اجتہاد اور ضمنی مآخذ استحسان، مصالح مرسلہ اور عرف وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، چوتھے میں اسلامی قانون میں عرف وعادت کی حیثیت اس کے مفہوم، شرعی دلائل اور مختلف قسموں کا ذکر ہے، نیز اس میں اور بنیادی مآخذ میں اختلاف و تعارض کی صورت میں کسی ایک کے اخذ و ترک کے اصول و حدود بیان کئے گئے ہیں، پانچویں میں یہ بتایا گیا ہے کہ عموم بلوی اور فساد زمانہ کی وجہ سے کن احکام میں اور کب تبدیلی ہو سکتی

شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ کی دینی تحریکوں اور ان سے مولانا اور ان کے اکابر کے تعلق کا ذکر ہے، اس کے بعد مولانا کی ولادت، تعلیم، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ان کی بیعت وارادت اور اجازت وخلافت، مختلف مدرسوں سے تعلق، مظاہر العلوم کی صدر مدرسی، نظامت اور سرپرستی، طریقۂ تعلیم، درس وتدریس کے معمولات وخصوصیات، مباحث وفہجج کرنے اور بعض اہل بدعت واہل تشیع سے مناظروں کی روداد، تحریک ندوۃ العلماء کی تائید اور اس کے پہلے جلسہ میں شرکت، مدینہ منورہ میں مستقل قیام اور وہاں کی مشغولیتوں، نیز علالت ووفات اور جنت البقیع میں تدفین اور اولاد وغیرہ کا مفصل ذکر ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے علم وفضل، ورع وتقویٰ، اتباع سنت، عبادت وریاضت سے شغف، روز وشب کے معمولات، اوصاف واخلاق، ارشادات وملفوظات، بعض خاص افکار وخیالات، فقہی مسائل میں معتدل رویے اور تصنیفات وغیرہ کا تعارف کرایا گیا ہے، اس حصہ میں مصنف نے مولانا کے متعلق متعدد اکابر جیسے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا شاہ عبدالرحیمؒ رائے پوری، مولانا محمود الحسنؒ، مولانا تھانویؒ، مولانا مدنیؒ، حکیم سید عبدالحیؒ وغیرہ اور بعض علمائے مدینہ کی رائیں اور تاثرات بھی نقل کئے ہیں اور ایک باب میں ان کے اہم خلفا مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ، مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ اور ان کے برادر خورد وبانی تحریک تبلیغ محمد الیاسؒ اور فرزند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے مختصر حالات لکھے ہیں، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی قابل مطالعہ ہے، یہ کتاب بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے لکھی گئی ہے جو تنہا ایک شخص کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ گذشتہ صدی ہجری کے نصف آخر اور موجودہ صدی کے نصف اول کی علمی، تعلیمی اور دینی تاریخ ہے اور یہ مظاہر العلوم سہارنپور، دارالعلوم دیوبند اور ان کے متعدد اکابر ومشائخ کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ ہے۔

اس کی ضخامت سے ممکن ہے بعض قارئین کو اکتاہٹ ہو، اگر لائق مصنف واقعات کو سمیٹ کر لکھتے اور تکرار سے بچتے، نیز طویل اقتباسات کو جو عموماً فائدہ سے خالی نہیں ہیں حذف کر دیتے تو کتاب کا حجم کم ہو جاتا، مولانا کی تصنیفات کا تعارف مختصر ہے، بذل المجہود جو ان کا بڑا کارنامہ ہے تعارف بھی مختصر ہے۔

فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل | مرتبہ مولانا حبیب اللہ ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۰، مجلد، قیمت ۶۰ روپیہ، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

یہ پانچ مضامین کا مجموعہ ہے (۱) فقہ اسلامی کا دائرہ کار (۲) فقہ اسلامی کے بنیادی مآخذ (۳) شریعت اسلامی کے ضمنی مآخذ (۴) اسلامی قانون اور عرف و عادت (۵) فساد زمانہ اور عموم بلوی۔ موخرالذکر چاروں مضامین کئی سال پہلے معارف میں چھپ چکے ہیں، پہلے مضمون میں فقہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے دائرۂ کار کا ذکر کر کے اس کی جامعیت دکھائی گئی ہے اور اس کے بارہ میں پھیلی ہوئی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، دوسرا اور تیسرا مضمون جدید قوانین اور اسلامی قانون کے ماہر اور دمشق یونیورسٹی کے لا کالج کے پروفیسر مصطفےٰ احمد زرقا کی مشہور کتاب "المدخل الفقہی" کے دو ابواب کا اردو ترجمہ ہے، ان میں اسلامی فقہ کے بنیادی مآخذ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس و اجتہاد اور ضمنی مآخذ استحسان، مصالح مرسلہ اور عرف وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، چوتھے میں اسلامی قانون میں عرف و عادت کی حیثیت اس کے مفہوم، شرعی دلائل اور مختلف قسموں کا ذکر ہے، نیز اس میں اور بنیادی مآخذ میں اختلاف و تعارض کی صورت میں کسی ایک کے اخذ و ترک کے اصول و حدود بیان کئے گئے ہیں، پانچویں میں اس کا ذکر ہے کہ عموم بلوی اور فساد زمانہ کی وجہ سے کن احکام میں اور کب تبدیلی ہو سکتی

ہے، نیز منصوص احکام کی تخفیف، عدم تخصیص کیا اصول ہیں، یہ دونوں بحثیں بہت نازک ہیں لیکن مصنف نے ان کے متعلق محتاط اور متوازن گفتگو کی ہے، گو ان کی شدت پسندی نے کہیں کہیں اس لچک اور گنجایش کو بھی باقی نہیں رہنے دیا ہے، جو اسلامی قانون کی اہم خصوصیت ہے، مصنف کی نظر صرف احناف کے مسلک تک محدود نہیں رہی، بلکہ انھوں نے شافعی و مالکی فقہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور مسائل کی وضاحت اور مثالیں پیش کرنے میں ان سے بھی مدد لی ہے، وہ فقہ اسلامی کی جدید تشکیل و ترتیب کے قائل ہیں، یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، لیکن دو ایک مثالوں کے سوا سب ہی مثالیں قدیم ہیں، اور موجودہ دور کے فقہی مسائل سے کتاب میں اصلاً تعرض نہیں کیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ نام کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا، مشہور حدیث (لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق الخ) کو آیت (ص ۲۲۳ و ۲۴۴) اور حضرت علیؓ کے قول (لا تنقضی عجائبہ) کو حدیث (ص ۲۰) بتایا ہے، کتابت و طباعت کی غلطیاں بہت ہیں، آیات و احادیث تک کے اندراج میں صحت کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔

مشروع اور ممنوع وسیلہ کی حقیقت - مترجمہ مولانا مختار احمد سلفی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۳۰، قیمت تحریر نہیں، ناشر - الدار السلفیہ، محمد علی بلڈنگ، مومن پورہ، مولانا آزاد روڈ، بمبئی نمبر ۱۱۔

وسیلہ کا مسئلہ مسلمانوں میں عرصے سے اختلاف و نزاع کا باعث بنا ہوا ہے، اس پر شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے ایک نہایت مفید رسالہ لکھا تھا، جس کا اردو ترجمہ بہت پہلے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے کیا تھا، مگر اب وہ کمیاب اور کسی قدر دقیق بھی ہے، اس لئے مولانا مختار احمد ندوی نے اس موضوع پر یہ عام فہم کتاب شائع کی ہے، یہ دراصل ایک حلبی عالم شیخ محمد نسیب رفاعی کے ایک رسالہ "التوصل الی حقیقۃ التوسل" کا شگفتہ اردو ترجمہ ہے، اس کے شروع میں

اِدہ دور کے مشہور فاضل علامہ محمد ناصر الدین البانی کے اسی موضوع سے متعلق ایک
مالہ کے بعض مفید مباحث کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس کتاب میں وسیلہ کی حقیقت اسکے
م، اس کی جائز و ناجائز صورتوں پر کتاب و سنت اور ائمہ سلف کے اقوال کی
سنی میں مدلل گفتگو کی ہے، آخر میں ممنوع وسیلہ کے قائلین کے دلائل کا رد ہے لیکن
حصہ کے بعض مباحث زیادہ تشفی بخش نہیں، کہیں کہیں طوالت اور تکرار سے بھی
کیا گیا ہے، تاہم جو لوگ سنجیدگی سے اس مسئلہ کی صحیح نوعیت سمجھنا چاہتے ہوں ان کیلئے
کتاب کا مطالعہ ضروری ہے،

آشوبِ آگہی۔ از۔ جناب سید رفیع الدین احمد رعانی سالک تقطیع متوسط
کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۲ روپے
پتہ۔ شعبہ نشر و اشاعت سنی سنٹرل وقف بورڈ، لکھنؤ

جناب رفیع الدین سالک، ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج کو شعر و سخن کا اچھا ذوق ہے
کاری ملازمت کے باوجود انھوں نے اپنے اس ذوق کو برقرار رکھا، یہ ان کی غزلوں
جموعہ ہے، شروع میں چند نعتیں اور آخر میں کچھ قطعات ہیں، موجودہ دور میں علم
ہی کی زیادتی اور مادی ترقی کے باوجود انسانی معاشرہ جس ذہنی و اخلاقی پستی اور
شار و تعطل کا شکار ہے، اس سے مصنف کا وجدان و شعور پوری طرح متاثر ہے
زلیں اسی احساس و تاثر کا نتیجہ ہیں، سالک صاحب نے غزل کے رموز و علائم
پردہ میں اس دور کے حالات کی عکاسی کی ہے، اس حیثیت سے یہ مجموعہ اسم بامسمیٰ ہے

ذکر مجذوب۔ مرتبہ پروفیسر احمد سعید قادری، کاغذ کتابت و طباعت بہتر تقطیع متوسط صفحات
۱۸۲ مجلد مع گرد پوش قیمت ۷ روپیہ پتہ ادارہ الاشرف مطبوعات، عالمگیر روڈ۔ لاہور،

خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری مولانا اشرف علی تھانوی کے اجل خلفا میں تھے اس نسبت کے علاوہ وہ ایک ممتاز شاعر اور ادیب، باغ و بہار شخص بھی تھے، اس کتاب میں ان کی زندگی کے ان ہی مختلف دلآویز پہلوؤں کا ذکر ہے، اس سے مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے اہم خلفا کی تعداد میں خواجہ صاحب کی اہمیت و عظمت اور خود ان کی اپنے مرشد سے عشق اور والہانہ تعلق کا پتہ چلتا ہے، اس میں خواجہ صاحب کے کلام پر مفصل تبصرہ اور آخر میں اس کا مختصر انتخاب بھی دیا گیا ہے، "ذکر مجذوب" کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے،

اُردو طباعت و اشاعت کے مسائل۔ مرتبہ جناب انور کمال حسینی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت

و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۴، قیمت مندرج نہیں، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا مرکزی وزارت تعلیم کے ماتحت ایک خود مختار ادارہ ہے، اس کے پروگرام میں ہندوستان کی مختلف اہم زبانوں کی منتخب کتابوں کی اشاعت کے علاوہ طباعت و اشاعت کی دشواریاں حل کرنا بھی ہے، چنانچہ اس کے زیر اہتمام مختلف زبانوں کے اشاعتی مسائل کے سلسلہ میں متعدد سمینار ہو چکے ہیں، اردو طباعت کی مشکلات کا جائزہ لینے کیلئے جون ۱۹۸۱ء میں ایک سمینار سری نگر (کشمیر) میں ہوا تھا جس میں اردو کے مختلف اہل قلم اور طباعت و اشاعت کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شریک تھے، اس کتاب کے شروع میں سمینار کی رپورٹ، تجویزیں اور سفارشات درج ہیں اور آخر میں اس میں پڑھے جانے والے تمام مضامین دئے گئے ہیں، ان مضامین میں طباعت و اشاعت کی مختلف پیچیدگیوں سے بحث کی گئی ہے جیسے اردو کتابوں کی خرید و فروخت، کتبخانوں، ناشروں، مصنفوں، نئے اہل قلم، بچوں کے ادب، مذہبی و فنی کتابوں، ترجمہ، طبع زاد تصنیفات کے مسائل وغیرہ، اکثر مضامین میں گزشتہ تیس سال کے اندر اردو پر جو سخت وقت گزر رہا ہے اسکا دکھڑا اور اس ضمن میں آزادی سے پہلے اردو کتابوں کی طباعت کی بہتر اور موجودہ دور میں ابتر حالت کا ذکر آگیا ہے، دار المصنفین کے شریک ناظم مولانا عبد السلام قدوائی کو بھی سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، وہ اپنی علالت و مصروفیت کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکے لیکن انکا مقالہ پڑھا گیا اور وہ اس کتاب میں شامل بھی ہے، انھوں نے تقسیم سے پہلے اور بعد کے متعدد ایسے اہم اشاعتی اداروں کی خدمات بھی گنائی ہیں جو نہ صرف کتابیں شائع کرتے تھے بلکہ ان کی طباعت کی موجودہ حالت اور پریشانیوں کا ذکر بھی کیا ہے، رپورٹ میں مضامین پر اظہار خیال کرنے والوں کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، یہ سب چیزیں بہت مفید ہیں اور اس حیثیت سے سمینار کامیاب تھا لیکن یہ کہ آئندہ طباعت و اشاعت کی مشکلات دفع کرنے کیلئے کیا اقدام کیا جاتا ہے؟" ض"

جلد ۱۲۲ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۸ء عدد ۵

مضامین

مقالات

جلد کے نمبروں کی تصحیح

ماہ اگست ۱۹۷۵ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک معارف کی جلدوں کے نمبر غلط ہوگئے ہیں، اگست ۱۹۷۵ء کا جلد نمبر ۱۱۶ اور اکتوبر ۱۹۷۸ء کا ۱۲۲ ہے، ناظرین اگست ۱۹۷۵ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک جلد کے نمبروں کی تصحیح کرلیں،

"اڈیٹر"

شذرات

معارف کے ناظرین کو یاد ہوگا کہ دار المصنفین اور حکومت پاکستان میں اس ادارہ کی مطبوعات کے حق طباعت واشاعت کا ایک معاہدہ ۱۹۷۰ء میں ہوا تھا، وہاں کی وزارت تعلیم نے یہ حق اپنے نشر و اشاعت کے ایک ادارہ نیشنل بک فونڈیشن کے لئے پندرہ لاکھ پاکستانی روپے میں خرید لیا تھا، اس کی پہلی قسط ۱۹۷۱ء ہی میں مل گئی تھی، اس کی دوسری قسط وہاں کے بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ملی،

اس سلسلہ میں خاکسار کا قیام پاکستان میں ۱۹ جون سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء تک رہا، اس دوسری قسط کی منظوری پاکستان کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جناب جنرل ضیاء الحق نے دی جس کیلئے ہمارا ادارہ اُن کا بہت شکر گذار ہے، وہاں کے موجودہ وزیر تعلیم جناب محمد علی صاحب ہوتی کے سابق نواب کے خاندان سے ہیں، ان سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں کلام پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں، محکمۂ تعلیمات کے سکریٹری جناب ڈاکٹر اکرام الحق قاضی صاحب ہیں، جو سندھ یونیورسٹی کے بہت ہی مایۂ ناز استاذ رہ چکے ہیں، ان دونوں حضرات نے اس رقم کی ادائگی کی کارروائی میں اپنے کریمانہ اخلاق اور علم دوستی کا ثبوت دیا، اس محکمہ کے جوائنٹ سکریٹری جناب ڈاکٹر طاہر حسین صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دس سال تعلیم پائی ہے، انھوں نے از راہ کرم بقایا رقم کی ادائگی کی پر زور سفارش کی، اس کے ڈپٹی سکریٹری جناب حسن یعقوب صاحب نے اس کام کو آخری مرحلہ تک اس طرح پہنچایا جیسے یہ ان کا ذاتی کام تھا، اُن سے ملنے میں خوشی اور لذت محسوس ہوتی تھی، اس کے ڈپٹی فنانس ایڈوائزر جناب ممتاز احمد برنی صاحب بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں، وہ اس وجہ سے علی گڑھ کے اولڈ بوائے کی حیثیت سے چھوٹے بھائی ہی کی طرح ملتے رہے، کسی موقع پر بھی دفتری کارروائیوں کی تاخیر سے مجھکو پریشان ہوتے دیکھنا پسند نہیں کیا،

محکمۂ خزانہ کے جوائنٹ سکریٹری نے بہت ہی عاجلانہ طریقہ سے کاغذات کو آگے بڑھا کر حوصلہ افزائی کی، اس کے ڈپٹی سکریٹری جناب محمد اسحٰق فاروقی صاحب تو میرے سایہ بن کر ساتھ رہے، اُن کے مفید

مشوروں سے بہت سی دقتیں دور ہوئیں، اس کے سیکشن افیسر جناب نسیم احمد صاحب نے تو ہر قسم کی مدد دینے میں سبقت کی، جب ہمارے کاغذات جنرل ضیاء الحق کے سکریٹریٹ میں پہونچے تو وہاں کے جوائنٹ سکریٹری جناب ضیاء الرحمن صاحب اور ڈپٹی سکریٹری جناب سید جمالی علی نے کارروائی کو آگے بڑھا کر بڑی عنایت کی،

تمام سرکاری عہدہ دار جس ہمدردی، اخلاق اور محبت سے پیش آئے، اس کی یادیں ذہن میں ہمیشہ باقی رہیں گی، اسی اثنا میں جناب مولانا ابو الحسن علی ندوی رابطۂ اسلامیہ کی طرف سے ہونے والی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے، تو وہاں ان کی غیر معمولی محبوبیت اور بے پناہ پذیرائی سے بھی ہر طرح کے فوائد پہونچے، انھوں نے اپنی کرم گستری سے جنرل ضیاء الحق اور جناب اے۔ کے بروہی وزیر قانون و امور مذہبی سے گفتگو فرما کر اس بقایا رقم کی ادائیگی کے لئے زور دیا، کچھ تاخیر ہوئی تو میں نے بھی جناب اے۔ کے۔ بروہی سے کئی ملاقاتیں کیں، وہ اپنی علم نوازی اور معارف پروری کی بدولت ایک مخلص دوست ہی کی طرح ملے، میری بہت سی مشکلیں آسان کیں، ان کے بلند اخلاق اور شریفانہ طبیعت کا گہرا اثر دل پر ہے، ان کو تصوف اور تاریخ ہند کے مطالعہ کا بھی ذوق ہے، میری کتاب بزم صوفیہ کا ذکر آیا تو میں نے ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا، دار المصنفین واپس آیا تو یہاں کی مطبوعات میں سے ان کے مذاق کی کچھ اور کتابیں ارسال کیں،

اس کام کو انجام دینے میں جناب افضل چیمہ سے بھی مدد کا خواہاں ہوا، وہ لاہور ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہیں، اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے صدر ہیں، ان کو پاکیزہ اخلاق کا بہت اچھا نمونہ پایا، جب ان کو میرے قیام کی طویل مدت معلوم ہوئی تو افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ میں یہ کام ان کے ذمہ کر دیتا تو وہ خود اس کو انجام دینے میں خوشی محسوس کرتے، ان کی اس ہمدردی سے رہین منت ہونا ضروری تھا

ماہ جون کی جھلسی ہوئی لو اور گرمی میں اسلام آباد پہنچا تو سب سے پہلے جناب نبی احمد خاں بلوچ سے ملا جو پہلے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، اور آج کل وزارت تعلیم کے ثقافتی امور کے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی

ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے، دارالمصنفین کے علمی کارناموں کے بڑے مداح ہیں، میری حقیر تصنیفات سے بھی ان کو دلچسپی ہے، ۱۹۷۹ء میں دارالمصنفین سے جو معاہدہ ہوا تھا تو اس کا ایک ہیرو وہ بھی ہیں، وہ اس سفر میں بھی ایک شفیق عزیز کی طرح ملے، میری مشکلیں سن کر اپنے دفتر لے گئے، میری طرف سے ایک دستاویز لکھی، ٹائپ کرائی، اور خود ایک عرضی گذار بن کر وزارت تعلیم کے سکریٹری کے سامنے جا کھڑے ہوئے، اور جو کچھ مجھکو کہنا چاہئے تھا، وہ سب کچھ کہہ گئے، اس کے بعد خوبی سے اس کام کا انجام پانا یقینی ہوگیا، وہ ہر مرحلہ میں میری دست گیری کرتے رہے، ان سے مل کر باتیں کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ قرون اولیٰ میں ایسے ہی اخلاق اور صادق کے لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں کے معاشرہ میں ہر قسم کی ترقی ہوتی رہی ہوگی،

اس کام میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ بھی میرے لئے فرشتۂ رحمت بنے رہے، وہ اپنی من موہنی باتوں سے دل اور دماغ دونوں کی تسخیر کرتے رہے ان کی ضیافتوں سے محظوظ ہونے کے علاوہ اُن کی تواضع، کسر نفسی اور شرافت اخلاق کے بارے جھکا رہا، جب کبھی اُن سے کسی کام کے لئے کچھ عرض کیا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اپنے تمام اخلاق حسنہ کا سونا پگھلا کر ہی دم لیں گے، ایسے ہی افراد کے نمونہ سے ایک اچھی قوم کا خمیر تیار ہوا کرتا ہے،

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی اسلام آباد میں ترکی، ایران اور پاکستان کے علاقائی تعاون کے ثقافتی امور کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں، اُن کے نحیف جسم کے جس حصہ کو کھرچا جائے تو اس میں صرف علم ہی ملیگا، اُن کا دفتر میرے لئے گوشۂ عافیت بنا ہوا تھا، اُن کی مرنجاں مرنج علمی گفتگو سے طویل قیام کا تکدر دور ہوتا رہتا، اُن کے گھر والوں کے ساتھ بیٹھنے میں اپنے ہی گھر کی لذت ملتی، اُن کے دفتر کے ٹیلیفون سے میری بہت سی مشکلیں آسان ہوئیں، ان کے دست راست جناب امین احمد صاحب نے ہر قسم کی دلجوئی کی۔

اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو جناب محمود غازی اور اُن کے بھائی محمد غزالی نے اپنے عزیزانہ برتاؤ سے وہاں کے قیام کو خوشگوار بنائے رکھا، وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے قریبی عزیز ہیں، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اڈیٹر فکر و نظر خاندانی طور پر اعظم گڑھ کے ہیں، اب پاکستانی ہیں، انھوں نے وہ سارے حقوق ادا کئے جن کی توقع اُن سے ہو سکتی تھی، جناب حسان الٰہی صاحب سعودی عرب کے خاص نامہ نگار رہیں، وہ اپنی سیاسی معلومات سے محظوظ کرنے کے علاوہ کام و دہن کو بھی لذت آشنا کرتے رہے، اُن کے قہقہوں کی پرتپاکی برابر یاد آئیگی، جناب بشیر احمد صاحب پہلے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تھے، اب ایسوشی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے سب سے بڑے عہدیدار ہیں، اُن کے مفید مشوروں سے بڑی مدد ملی۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن سے جب معاہدہ ہوا تھا تو اس وقت کے منیجنگ ڈائرکٹر جناب یونس سعید صاحب تھے جن کی پوری ہمدردی شامل حال رہی، وہ شکر گذاری کے جذبہ کے ساتھ برابر یاد آتے رہیں گے، اب اُن کی جگہ پر جناب رضی الرحمن صاحب ہیں، جو پاکستان کے سول سروس کے بہت ہی لائق کارگذار اور دیانت دار افسر سمجھے جاتے ہیں، یہ تحریر لکھ رہا ہوں اور اُن کا حسن سلوک یاد آرہا ہے، جب معاہدہ کی دوسری قسط کی رقم وزارت تعلیم سے ملی تو انھوں نے اپنے دفتر میں ایک پر تکلف افطار پارٹی دی جس میں بہت سے معززین شریک ہوئے، ان سے آخری ملاقات اُن کے ایک قریبی عزیز کے ساتھ اسلام آباد کے ایک بہت ہی مشہور ہوٹل ہالی ڈے ان کے ایک ڈنر میں ختم ہوئی،

معاہدہ کی رقم کی ادائگی کے سارے مراحل اب ختم ہو گئے، اس نیک اور مفید کام میں مخلصانہ ابتدا کرنے کا سہرا جناب سید حسام الدین راشدی کے سر ہے، جو پاکستان کے بہت مشہور اہل علم ہونے کے ساتھ دار المصنفین کے علمی کارناموں کے بے حد قدردان ہیں، پاکستان کا شہر دار المصنفین کو جو نقصان

پہنچا رہے تھے، اس کے خلاف انھوں نے پاکستان کے سارے اخبارات میں ایک مہم چلائی، جس کی آواز حکومت پاکستان کے ایوان میں بھی گونجی، اس کام کو انجام تک پہنچانے میں مولانا کوثر نیازی نے پوری کوشش کی، جو اس وقت حکومت پاکستان میں مذہبی امور کے وزیر تھے، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے یہ مسئلہ سرکاری سطح پر پہنچ کر طے ہوا، وہ اب وزیر نہیں رہے لیکن احسان شناسی کا جذبہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے ادارہ کے لئے جو حسن خدمت انجام دیا، اس کی یاد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں برابر باقی رہے، اسی جذبہ سے اسلام آباد میں ان سے ملاقاتیں کیں، پہلی دفعہ جب میں اُن کے بنگلے پر پہنچا تو دیکھتے ہی ننگے پاؤں اپنے ڈرائنگ روم سے باہر نکلے، اور کہنے لگے کہ یہ فقیر وزیر نہیں رہا لیکن علم دوست برابر رہیگا، اُن کی علم دوستی ضرور یاد آتی رہیگی، جب وہ وزیر تھے، تو اُن کی وزارت کے جوائنٹ سکریٹری جناب زاہد ملک تھے، اب اسلام آباد میں نوائے وقت کے اڈیٹر ہیں، انھوں نے بھی معاہدہ کی تکمیل میں ہر طرح کی اعانت کی تھی، اُن سے ملا تو اپنی دیرینہ محبت کی لپک سے ملے، جس کے لئے اُن کا شکر گذار ہوں،

اسلام آباد میں مختلف اوقات میں قیام کی مدت تقریباً آٹھ مہینے رہی، وہاں اپنا ایک عزیز سید مصباح الہدیٰ بی ایس سی (علیگ) انفارمیشن افسر حکومت پاکستان کے ساتھ ٹھہرا، کسی کے یہاں طویل مدت تک مہمان ہونا سراسر زحمت ہی بنتا ہے لیکن برادرم سید مصباح الہدیٰ اور اُن کے اہل و عیال نے کسی موقع پر یہ محسوس ہونے نہیں دیا، کہ میرا قیام اُن کے لئے بار ہے، یہ اُن کی میزبانی کی فراخ دلی اور بلند حوصلگی کا ثبوت ہے، اُن کے لڑکے عزیزی سید ضیاء الہدیٰ میری خدمت میں اس طرح لگے رہتے جیسے اسی کی بدولت اُن کو سعادت دارین حاصل ہوگی۔ میں اس خاندان کا شکریہ دارالمصنفین کی طرف سے بھی ادا کرتا ہوں،

پاکستان کی حکومت سے جو رقم ملی اس کی باضابطہ اطلاع پاکستان میں اپنے سفارتخانہ میں بھی کی، اس سفر میں بہت سی علمی فتوحات بھی ہوئیں جن کا ذکر آئندہ آئے گا،

مقالات

سلطنت اور دین کا تعلق

از

مولانا سید سلیمان ندوی ؒ

دنیا میں اس وقت دو قسم کے مذہب نظر آتے ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہو وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو[1] گویا اس تعلیم میں قیصر اور خدا کی دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے یہی وہ اصول ہے جس کی سطح پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں، اور جس کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاص نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہیں،

سلطنتوں کی دوسری قسم وہ تھی، جس میں دین کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین جیسی مضبوط رسیوں میں جکڑ دیا گیا تھا، جس سے مذہب کی لطافت جاتی رہی تھی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی تھی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں،

لیکن اصل دین الٰہی ایک ہی ہے، اور ایک رہا ہے، اور جو ازل سے ابد تک یکساں رہے گا، وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت

کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ:

سلطنت اور دین کا مستقل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو سرتا سر دین ہی یا یوں کہئے کہ ایسا دین ہے جو سرتا پا سلطنت ہے، مگر سلطنت الٰہی اس اجمال کی سب سے پہلی تفصیل یہ ہے کہ اس دینی سلطنت میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اصلی حاکم و آمر مانا گیا ہے، جو حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق ہے جَلَّ شانہ وتعالیٰ اسمہ" بادشاہی اسی کی ہے حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے، دنیا کے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو، آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے، اور وہی اس کی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم، اور فرمانروا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری عین حکم خدا کی بجا آوری تھی،

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (نساء - ۱۱)	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جو جانشین ہوئے ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا امام اور مجتہد تھے، اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا و رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اور اب بھی اسی لئے مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا و رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ارشاد فرماتے ہیں

من اطاع امیری فقد اطاعنی	جس نے میرے امیر کا کہا مانا اس نے میرا کہا مانا
ومن عصیٰ امیری فقد عصانی	جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

لے صحیح بخاری کتاب الاحکام جلد ۲ ص ۱۰۵۷ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ جلد ۲ ص ۱۲۵ مصر

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکامِ الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے، وہ عینِ دین اور عینِ عبادت ہے، یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا، اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے، بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں، بلکہ کاموں کی غرض ونیت سے ہے، خدا کے لئے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست وسلطنت کے متعلق احکامِ الٰہی کا جو کام بھی کیا جائے، وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعایت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، دیانت قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، عامل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں میں سے جو کام بھی حسب احکام الٰہی اللہ کے لئے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور [illegible] سبب قربت ہے، سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسرے مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں ہی مصروف رہیں تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض ومؤکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص واخلاص کے ساتھ اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں، حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورۂ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس بات پر ہے کہ خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت فرائض کے بعد رعایا کی خدمت، ان کے معاملات کی دادرسی

اور اُن کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساس فرض ہے، جس پر حضرت داؤد علیہ السلام
متنبہ ہوئے،

وَظَنَّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ
فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا
وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ
عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ يٰدَاوُدُ
اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ
فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ
(ص-۲)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے)
اُن کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے
انھوں نے معافی چاہی، اور رکوع
میں گر گئے، اور رجوع کیا، تو ہم نے
ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے
اِس قرب کا درجہ اور پھر آنے کی
اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد!
ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا،
تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ
حکم کرو، اور خواہش نفس کی پیروی
نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ
سے ہٹا دے گا،

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم کا تناسب واضح کر رہا ہے کہ حضرت داؤدؑ سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں میں مشغولی کے بجائے، اپنے عبادت خانوں کے دروازے بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو اس پر تنبیہ کی گئی اور بتایا کہ خلافت کا فرض یہ ہے کہ احکام الٰہی کے تحت فرائض خلافت ہی میں مصروفیت رہے،

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے، جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مامن امام یغلق بابه دون ذوی الحاجة والخلة والمسکنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته ومسکنته (ترمذی، ابواب الاحکام)

جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کرے گا،

مَنْ وَلِیَ من امر المسلمین شیئًا فاحتجب دون خلتهم وحاجتهم وفقرهم وفاقتهم احتجب الله عز وجل یوم القیامة دون خلته وفاقته وفقره۔ (مستدرک حاکم کتاب الاحکام جلد ۴ ص ۹۳ حیدرآباد)

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد اُن کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائیگا۔

خلفاء راشدین نے ان احکام کی پیروی یہاں تک ..... کی کہ انھوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں بنائی، اور اپنے حق طلب رعایا کے بیچ میں طلب اجازت حاصل کرنیوالے غلاموں[1] کے سوا کوئی اوٹ بھی قائم نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کیلئے اذن کا حکم ہے اسلئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر اس کام کے لئے نوکر متعین کئے تھے مگر عام پبلک مقامات مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہوا اور نہ ایسے پہرہ داروں کی،

کہ زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا، اور اس میں پھاٹک لگایا، تو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہؓ کو اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے، اور پہونچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا اور زاد راہ دینا چاہا، تو اس کو بھی قبول نہیں کیا، اور سیدھے مدینہ واپس چلے آئے،

(ابن حنبل جلد ۱ ص ۳۵ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک قائم کی، اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ ایک خاص آدمی پھاٹک پر اس غرض سے مقرر کیا جو اہلِ حاجت کی ضرورت کو سن کر اس سے ان کو مطلع کرتا، (ترمذی ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کے مذہبی نقطۂ نظر کی پوری توضیح کرتی ہیں،

أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا	امانت والوں کی امانتیں اُن کو حوالے
وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ	کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ
تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ط إِنَّ اللَّهَ	کرنے لگو، تو انصاف سے فیصلہ کیا
نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ	کرو، خدا تمھیں بہت خوب نصیحت
سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	کرتا ہے، بیشک خدا سنتا اور

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (نساء-۸)	دیکھتا ہے، مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو لوگ تم میں صاحب حکومت ہیں، اُن کی بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے،

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے بیان میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے اطلاق کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کی بنا پر حکام تک وسیع ہے، اور یہ بات کہ ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے،

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (رحمٰن-۱)	اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو،

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانے سے تم دوسروں کے لئے تولتے ہو، اسی سے اپنے لئے بھی تولو،

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ ، (مطففین ۱۱)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں،

یہ انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی محبت سے محروم رہے گا، اس کے مستحق منصف ہی ہیں،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ (مائدہ، حجرات ۶)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

اس آیت کی وسعت میں انصاف کرنے والوں کا ہر طبقہ داخل ہے،

اس کے برخلاف ارشاد ہے،

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۔ (آل عمران ۶-۱۴)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا،

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (شوریٰ ۴)

بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا،

"ظلم" کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے محض خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے، اور محض خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے تحت ادا ہوں،

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (مائدہ ۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے،

الا أیُّها النّاس لا یقبل اللہ	ہاں اے لوگو! جو امام خدا نے قانون
صلوٰۃ امام حکم بغیر ما انزل	اتارا ہے، اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے
اللہ، (مستدرک جلد ۴ ص ۸۹ کتاب الاحکام)	اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریگا

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ ایک معنی میں منافق ہے، اور اس لئے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت بارگاہ الٰہی میں بے معنی ہے،

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے یہ ظاہر ہوگا، کہ حکومت و فرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لئے رحمت الٰہی کا سایہ ہے، اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں اُن کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مہیا ہیں، فرمایا،

الا الامام الذی علی الناس راع	وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگراں
ھو مسئول عن رعیتہ	کار ہے، اُس سے اس کے زیر نگرانی لوگوں
(دیکھو بخاری جلد ۲ ص ۱۰۵ کتاب الاحکام)	کے متعلق باز پرس ہوگی،

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، وہ جہاں تمام تر ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گذر گیا، اس کے لئے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسائش ہے، اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا، وہ اس دنیا میں بھی ناکام و بدنام اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا،

مامن عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں
یحطھا بنصیحۃ الالم یجد	بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری
رائحۃ الجنۃ،	پوری نہ کرے، تو وہ جنت کی بو بھی
(بخاری و مسلم حوالہ سابق)	نہ پائے گا،

حضرت معقل بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انھوں نے امیر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آج میں تمھیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے،

مامن عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا
یموت یوم یموت وھو	نگراں بنائے، وہ مرتے دم اس
غاش لرعیتہ الا حرم اللہ	حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت
علیہ الجنۃ،	کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ
(مسلم کتاب الامارۃ)	اس پر جنت کو حرام کر دے گا،

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے؟ ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمرو ہے رضی اللہ عنہ وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں، اور اس کو پیار سے خطاب کرکے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے،

ان شر الرعاء الحطمۃ،	سب سے بُرا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی
(مسلم کتاب الامارۃ)	رعیت کو توڑ ڈالے،

تو تو اُن میں سے نہ بن، اُس نے کہا آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب میں مجوسی ہیں، فوراً بولے کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں کوئی مجوسی بھی تھا، مجوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا اب میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفاء ہوں گے، اور بہت ہوں گے، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ تو آپ ہم کو کیا حکم دیتے ہیں، فرمایا، پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو، (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُم عَمَّا استرعاهم	کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن سے اُن کے متعلق
(صحیح بخاری)	بازپرس فرمائے گا، جنکی نگرانی اس نے انکے سپرد فرمائی ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے امرا کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے جو یقین ہے کہ قرین اجابت ہوئی ہوگی،

اللّٰهم من وَلِي من امر امتي	اے اللہ! جو کوئی میری امت کی
شيئًا فشق عليهم فاشقق	کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ
عليه ومن ولي من امر امتي	کا) بھی والی ہو اور وہ اُن پر سختی
شيئًا فرفق بهم فارفق به	کرے، تو تو بھی اس پر سختی کرنا، اور
(مسلم)	جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تُو تو
	بھی اس پر مہربانی فرمانا،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ اپنی وسعت کے لحاظ سے بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افراد تک کو محیط ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کے مطابق ذمہ داری عائد ہے، ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور بھی نمایاں ہے،

الا کلکم راع وکلکم مسئول	ہاں! تم سب نگران کار ہو، اور
عن رعیتہ والرجل راع علیٰ	تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص
اھل بیتہ وھو مسئول عنھم	در عایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں
والمرأۃ راعیۃ علیٰ بیت	کا امیر نگران کار ہے اس کے
بعلھا وولدہ وھی مسئولۃ	زیر نگراں کے متعلق پرسش ہوگی، اور
عنھم والعبد راع علیٰ مال	مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے
سیدہ وھو مسئول عنہ	اور اس سے اس کے گھر والوں کی
الا فکلکم راع وکلکم مسئول	پرسش کی جائے گی، اور عورت
عن رعیتہ	اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں
(مسلم وصحیح بخاری)	کی نگراں ہے، اس سے ان کے متعلق
	سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے
	مال کا نگراں ہے، اس سے اس کی بابت
	پوچھا جائے گا، تو ہاں! ہشیار رہو
	تم سب نگران کار ہو، اور تم سب سے
	اس کے زیر نگراں کے بابت باز پرس
	کی جائے گی،

لفظ رعیت اس موقع پر ایک خاص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہو گئی ہے، ان حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت اور اس کے اشتقاقات بار بار آئے ہیں یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا ہوا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے، اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس تمثیل سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش اور آسایش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو، تو امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا، اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، اور درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، اور ان کو بچاتا ہے؛ اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پر محبت معنوں میں تمثیلاً آیا ہے، اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں، حالانکہ تنہا اسی لفظ میں خود اُن کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے،

ان المقسطین عند اللہ علیٰ منابر من نور عن یمین الرحمٰن وکلتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمھم واھلیھم وما ولوا، (دیکھو مسلم کتاب الامارۃ)	بیشک انصاف کرنے والے (حکام و امرا) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، (و اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت لوگوں

(یعنی عدل پرور)

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ جامع ترمذی میں ہے،

ان احب الناس الی اللہ یوم	بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب
القیامۃ وادناھم مجلسا	اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا،
امام عادل وابغض الناس الی	اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض
اللہ وابعدھم منہ مجلسًا	اور خدا سے دور وہ امام ہوگا، جو
امام جائر (ترمذی ابواب الاحکام)	ظالم ہو،

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:-

ما من امیر یلی امر المسلمین	جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہوا
ثم لا یجھد لھم الا لم یدخل	پھر وہ ان کے لئے محنت نہیں کرتا اور
معھم الجنۃ،	اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ اُن کے
(صحیح مسلم کتاب الامارۃ)	ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا،
ما من وال یلی رعیۃ من	کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی نگرانی
المسلمین فیموت وھو	جماعت کا والی ہو وہ اس حال میں
غاش لھم الا حرم اللہ	مرے کہ وہ اُن مسلمانوں کے ساتھ
علیہ الجنۃ،	غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت
(صحیح بخاری کتاب الاحکام)	حرام ہے،

انما الامام جنۃ یقاتل	امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ
من ورائہ ویتقی بہ فان	میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے
امر بتقوی اللہ و عدل فان	تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے
لہ بذلک اجراً وان امر	تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا، اور
بغیرہ فان علیہ وزراً	اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے، یا بے انصافی
(نسائی کتاب البیعۃ)	کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے،

یہ حدیثیں اس بات کے ثبوت میں ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت وولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتے ہیں، اور وہ بھی ثواب و معصیت اور جزا و سزا سے اسی طرح متصف ہوتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے دوسرے اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولتے ہیں، اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اس سے ثابت ہوگا کہ اسلام کی شریعت میں یہ دین کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الٰہی ہیں، یا قوانین الٰہی ہیں، یہ احکام الٰہی اور قوانین الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت و ولایت و حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور انجام و اہتمام بھی دین ہی کا ایک گوشہ ہے اور اہم گوشہ،

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے جس سے اہل اللہ کو الگ رہنا چاہئے،

گدائے[1] گوشہ نشینی تو حافظا مخروش　　　رموز مملکت خویش خسرواں دانند

---

[1] حاشیہ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ ہو،

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء کا کام ہے، اور یہی دین ہے، اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت بر ملا دی گئی ہے، اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سراپا معمور ہیں کیا اس سے مقصود انہی احکام الٰہی کی تبلیغ و تنفیذ اور اجرا تھا، جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت بتصریح وارد ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (انفال - ٢)

اے اہل ایمان جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لئے کنارے کنارے چلے، (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیرے گا، تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا، اور اس کا

بقیہ ترجمہ صفحہ ۳۴۱ پر

(حاشیہ ص ۳۳۹) لہ حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اور اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہئے،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ-۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور معرکہ کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے اہمیت میں عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقامت دین کی راہ میں شہادت کا ایک قطرہ مومن کے اعمالنامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دے، اسی لئے حضرات صحابہؓ اس قتال دین کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (آل عمران-۲۰۰)

تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور ستائے گئے، اور لڑے اور قتل کئے گئے میں ان کے گناہ دور کر دوں گا، اور ان کو بہشتوں میں داخل کرونگا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے یہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے ان میں سے ایک معنی احکام الٰہی کی

اطاعت تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورۂ نور میں ہے،

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ — اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے

فِي دِينِ اللّٰهِ (نور-۱) — دین میں تم کو رحم نہ آئے،

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکام الٰہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے، اسی طرح

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں،

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ — اور ان سے اس وقت تک قتال

فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ (بقرہ-۲۴) — کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے،

ان حکم الٰہی کی اطاعت کو دین فرمایا گیا ہے، سورۂ انفال کی اس آیت میں،

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ — اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو یہاں تک

وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ — کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور

(انفال-۵) — دین سب خدا ہی کا ہو جائے،

بھی حکم و قانون الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے، اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے، جو آسمان سے زمین تک جاری ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام، یوسف) اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے،

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — اور اسی خدا کا ہے، جو کچھ آسمانوں

وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا — اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی

(نحل-۷) — اطاعت ہے،

یہاں بھی دین کے معنی احکام الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہے،

سلطنت وملکیت کی حقیقت | اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت وولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت وسلطنت کو عیش وتنعم کے ایوانوں، زرنگار تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمربند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہونگے، یا جلال وجبروت اور قہرو ہیبت کی تلواروں کے سایہ میں، لیکن اسلام نے حکومت کی جو تعلیم دی ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم الٰہی کی جو عملی مثال پیش کی ہے، وہ ان مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کردیئے | سلطنت وحکومت اور ولایت وریاست کا یہ رائج الوقت تخیل جس کی مثال سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی ہے، اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت وحکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے ان الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا، اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، اور ایران کے شہنشاہ کسریٰ، اور روم کے امپیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیم محمدیؐ نے ان سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم وستم کے ذہنی تلازم کو معمور ہو چکے تھے، پرہیز کیا، الملک کے ماخذ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے، جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اسلام کی تعلیم میں مالک حقیقی اور بادشاہ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں یہ وصف اللہ تعالیٰ کا بار بار بیان ہوا ہے،

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ ٥	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی
(النّاس - ۱)	بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی،
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ	بادشاہ حقیقی پاک ذات (ہر عیب سے) امن
(حشر، ۳)	

فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ — تو خدا جو سچا بادشاہ ہے،

(مومنون : ۶)

الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ (جمعہ : ۱) — بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا،

یہ آیت قرآن پاک میں چھ مرتبہ آئی ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ ہی کو اَلْمَلِکُ الحق یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، ان تمام آیتوں میں ایک خاص نکتہ کا ظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں ایک جگہ بھی اللہ تعالیٰ کو تنہا اَلْمَلِکْ یعنی بادشاہ نہیں کہا گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مزید صفت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو مَلِکِ النَّاسِ "لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رَبِّ النَّاسِ لوگوں کے پالن ہار" بھی کہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی رحمت وربوبیت کا اظہار ہو، دوسری آیت میں اَلْمَلِکُ (بادشاہ) کے ساتھ اوّل اَلْقُدُّوسُ (مقدس و پاک) اور پھر السَّلَامُ (امن وامان والا) کہا گیا تاکہ اس کی پاکی و یا امنی بھی ظاہر ہو جائے، چوتھی آیت میں بھی اسی طرح اَلْمَلِکُ کے ساتھ اَلْقُدُّوْسُ (مقدس پاک) کا وصف شریک ہے، اور تیسری آیت میں الملک کے ساتھ (اَلْحَقُّ) (برحق) کا وصف بھی اضافہ ہے، ان تمام احتیاطوں سے یہ ظاہر ہے کہ اَلْمَلِکُ کے لفظ کے اندر ایک تاریخی ظلم و سفاکی اور قہر و جبر بیرحمی اور دعوائے باطل کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں لازم ہو گیا تھا کہ کسی نئے وصف کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا اس کے ... مزید معنی کا استدراک ضرور فرما دیا،

لفظ ملک الملوک کی ممانعت | عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی

شاہ شاہاں بولا جاتا تھا، اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ یا واقعی دعوی کی صورت میں پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہ شاہاں یا شہنشاہ ملک الملوک صرف ایک ہی ہے، اور وہ اللہ تعالی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا،

ان اخنع الاسماء عند الله	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک
رجل تسمی ملک الاملاک	یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو
(صحیح بخاری کتاب الادب)	شہنشاہ کہے،

اسلام کا سیاسی نظام

اس کتاب میں کتاب وسنت اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، تمام مباحث اٹھارہ ابواب میں منقسم ہیں جن میں نظریہ خلافت مجلس تشریعی، طریقہ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال، احتساب، حرب ودفاع خارجی معاملات وغیرہ ترتیب قریب اسلامی دستور کے بہت سے اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، آخری یعنی اٹھارہواں باب سیاست کے غیر اسلامی وغیر دینی نظریات سے متعلق ہے، جس میں موجودہ سیاسی نظریات شخصیت، آمریت، اور جمہوریت پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے، سیرت جلد ہفتم، معاملات، اگر مکمل ہوتی تو اس میں یہی مباحث تفصیل سے آتے،

(مؤلفہ مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی، سابق استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

قیمت: ۱۳ روپیہ

"منیجر"

راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں[1]

از

جناب شبیر احمد خان غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

یہ نام ہے مشہور فاضل علم الہیت جی۔ آر۔ کے کی کتاب کا جو انھوں نے راجہ جے سنگھ سوائی کی قائم کردہ رصدگاہوں کے حالات پر لکھی ہے۔ اس سے پہلے اور فضلاء نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی، جس کا تذکرہ موجب تطویل ہوگا، مگر کے اسٹرونومیکل سوسائٹی لندن کا فیلو ہونے کی بنا پر علم الہیت کے نظری و عملی دونوں شعبوں میں دستگاہ عالی رکھتا تھا، نیز حکیمی رصدگاہوں کے ارصادی اعمال کی جزئیات اور ان میں استعمال ہونے والے آلات کی تیاری اور استعمال کے اصول اور تکنیک کا واقف کار تھا، اس لئے ان رصدگاہوں کی کیفیت قلمبند کرنے کے باب میں موزوں ترین فاضل تھا۔

کے نے یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں لکھی تھی، اور حکومت کے شعبۂ آثار قدیمہ نے اسے آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کی سیریز میں شامل کر لیا، مگر اپنی تحقیق اور افادیت کی بنا پر اس کا پہلا ایڈیشن

---

[1] Kaye, G.R.: The Astronomical Observatories of Jai Singh. میرے پیش نظر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے ۱۹۸۲ء میں انڈولوجیکل بک ہاؤس وارانسی نے شائع کیا ہے، آئندہ اس کتاب کا حوالہ صرف مصنف کے نام "Kaye, P" سے دیا جائے گا۔ G.R. Kaye: Archaeological Survey of India, New Imperial

جو گورنمنٹ پرنٹنگ آفس کلکتہ سے شائع ہوا تھا، جلد ہی ختم ہو گیا۔ دوسرا ایڈیشن انڈولوجیکل بک ہاؤس وارانسی نے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا ہے،

کتاب میں چودہ باب ہیں۔ پانچ باب (یعنی ساتواں، آٹھواں، نواں، دسواں اور گیارھواں)، راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہوں کے حالات پر ہیں، جو اس نے دہلی، جے پور، اُجین، بنارس اور متھرا میں قائم کی تھیں، چار باب (یعنی تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا) آلات رصدیہ پر ہیں، پہلے دو باب تمہیدی ہیں، اور آخری تین (یعنی بارھواں، تیرھواں اور چودھواں) اختتامی ہیں، جن میں راجہ کی ہیئتی سرگرمیوں کا پس منظر بیان کرنے کے علاوہ اُس کی کاوشوں پر تبصرہ بھی کیا ہے،

چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے، یہ سنت دیرینۂ روزگار ہے، اور راجہ جے سنگھ کا ہیئتی فضل وکمال بھی اپنے پیشروؤں کی علمی کاوشوں کی خوشہ چینی کا رہین منت تھا، لیکن ان ماخذ ومصادر کی نشاندہی میں احقاق حق سے زیادہ جذباتیت اور اس جذباتیت کو گرمانے کے لیے سیاسی مصلحت کوشی کارفرما ہے، جیسا کہ لکھتا ہے،

"ان عوامل ومؤثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے جنھوں نے اُسکی (راجہ جے سنگھ کی) ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے، مگر عوامی طور سے ابھی تک یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر پورے طور پر نہیں تو کم از کم اصولی طور پر اسکی کاوشیں ہندو اہل ہیئت سے ماخوذ ہیں، اور سابق مصنفین نے اس خیال کو مستحکم بنانے میں بہت زیادہ مدد دی ہے۔"[۱]

ان مصنفین سابقین میں اُس نے سرولیم جونز، ولیم ہنٹر اور گیرٹ کا خصوصیت سے

---

[۱] راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں، ص ۱۹

نام لیا ہے، (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

مگر فاضل مصنف نظری و عملی علم الہیئت کے علاوہ اُس کی تاریخ بالخصوص ہندو علم الہیئت کی تاریخ پر بھی بڑی گہری نظر رکھتا تھا، لہذا اُس نے ان مصنفین سابقین کی پیدا کی ہوئی خوش فہمیوں اور مبالغہ آرائیوں کے ساتھ خود کو متفق بنانے میں بڑی الجھن محسوس کی، جس کی وجہ سے اُس کی اس کاوش کے منظر عام پر آنے میں تاخیر ہوئی، اس کی معذرت میں وہ اس خوش فہمی کی تغلیط کرتا ہے،

"یہ مروجہ خیال غلط ہے، (جس کی وجہ سے مصنف کو اپنی تصنیف کے پہلے حصہ کو مرتب کرنے میں دقت پیش آئی) کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ ہندو علم الہیئت کی تاریخ کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتا ہے۔"[1]

اور اگرچہ اُس کی حتمی رائے تو یہی ہے کہ

"یہ مفروضہ کہ اُس نے (راجہ جے سنگھ نے) اپنے مخصوص ہیئتی تصورات ہندو روایات سے اخذ کئے تھے، مکمل طور پر ساقط الاعتبار ہو چکا ہے۔"[2]

پھر بھی اُس نے اتمام حجت کے لیے بہاں علم الہیئت میں راجہ کے ماخذ و مصادر، جائزہ مرتب کیا ہے، ہندو ہیئتی روایات کے ساتھ اُس کے ممکنہ تعلقات کا بھی بڑی دقت نظر سے تجزیہ کیا ہے، چنانچہ وہ اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے۔

"یہ انتہائی ضروری ہے کہ نہ صرف راجہ کے نظریات و اعمال کے صحیح ماخذوں کا

---

[1] کے دیباچہ ص اول [2] Kaye: p. 49.

he hypothesis that he received his main astronomical Inspirations from Hindu Tradition is completely eliminated."

پتہ چلایا جائے، بلکہ اُن کے ممکنہ تعلقات پر بھی ذرا تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی جائے جو اس کی کاوشوں اور روایتی ہندو نظریات و اعمال کے درمیان ہو سکتے ہیں۔"[1]

فاضل مصنف کے خیال میں یہ مآخذ و مصادر تین ہیں، چنانچہ وہ آگے چل کر لکھتا ہے۔

"مسئلہ کی توضیح کے لئے آسان طریقہ کار یہ ہوگا کہ علم الہیئت کے تین مکاتب یعنی (۱) ہندو (۲) مسلم اور (۳) یورپی مکاتب، کے اثرات پر کلام کیا جائے، ایک حد تک راجہ جے سنگھ کا ان سب سے تعلق رہا تھا، اور اس کی کاوشوں پر ان کے اثرات کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ لگانا بڑا دلچسپ مشغلہ ہوگا۔"[2]

ان تین ماخذوں میں سے ہندو ماخذ پر جس کی تاریخ کا وہ ماہر خصوصی ہے، اُس نے بڑی گہری نظر ڈالی ہے، اسلامی علم الہیئت کے باب میں اس کا اعتماد یا تو موسیو سدیو کی فاضلانہ تصانیف پر تھا، یا پروفیسر عبدالرحمٰن اور فضل الٰہی صاحبان کی رہنمائی پر، اس لئے اُس نے اس باب میں نتیجہ تو صحیح ہی نکالا ہے کہ

"اس باب میں ذرہ برابر شک و شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ جس مخصوص عامل نے اس کی ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، وہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کا تتبع تھا۔"[3]

---

[1] کے، صفحہ ۲ سے ۳، صفحہ ۳ سے ۴ Kaye: p. 69.

[3] There is not the sligest doubt as to the main influence that directed his activities. It was that of the Muslim astronomers of the type of Ulugh Beg.

مگر اسلامی علم الہیئت کے ارتقا کی تاریخ کے باب میں اُس کی معلومات ، بس واجبی ہی تھیں ، اس کے نتیجہ میں اُس سے بڑے بڑے مضحکہ خیز تسامحات ہوئے ہیں جنکی ذمہ داری خدا جانے اُس کے سمجھنے پر ہے ، یا اس کے رہنماؤں کے سمجھانے پر یا خود ان رہنماؤں کے اپنے سمجھنے پر۔

اور جہاں تک راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں پر یورپی کتب (جدید علم الہیئت) کے اثرات کا تعلق ہے ، فاضل مصنف اس کے اندر یقیناً تجر و تبحر رکھتا ہوگا ، مگر راجہ جے سنگھ کے یہاں ان اثرات کی نشاندہی کے باب میں اس موضوع پر لکھنے والے دوسرے محققین کی طرح وہ بھی قطعاً ناکام رہا ہے ، جس کی وجہ " زیج محمد شاہی " کے بالاستعصار مطالعہ کا فقدان ہے کیونکہ ان حضرات کی قیاس آرائیاں صرف دیباچہ ہی تک محدود رہی ہیں ، جس کا انگریزی ترجمہ موجود تھا ، اس کوتاہی مطالعہ کو سابق مصنفین نے مسئلہ کے اس پہلو سے کمل بے اعتنائی کے ذریعہ اور فاضل مصنف نے عجیب وغریب ترجیحات کے ذریعہ چھپانے کی کوشش کی ہے ،

ذیل میں اسی اجمال کی تفصیل پیش کی جارہی ہے ،

(الف) جے سنگھ کا ہندو ماخذ

جے سنگھ ہندو تھا اور جیسا کہ اُس کی سوانح حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ایک راسخ العقیدہ ہندو ، بلکہ سیاست میں احیائیت پسند ، اس لئے اس کی تعلیم و تربیت ہندوانہ انداز پر ہوئی ، اور اُس نے مختلف ہندو علوم کا مطالعہ کیا ، اور چونکہ مذہب پسندی اُس کے مزاج میں راسخ تھی ، اور وہ مختلف مذہبی مراسم کو اُن کے صحیح وقت پر ادا کرنے کی اہمیت کا قائل تھا ، اس لئے " وقت شناسی " کے بنیادی اُصول یعنی علم الہیئت کی طرف اُس نے ہندو نقطۂ نظر ہی سے توجہ کی ہوگی ، لہٰذا فطرتاً ہندو ریاضی و ہیئت جیوتش کا عالی حامل

کی ہوگی، اس مقصد سے اُس نے ان علوم کی متداول کتابوں کا جنھیں وہ دیباچہ میں کتاب ہائے ہندی کہتا ہے، مطالعہ کیا، مگر وہ ان کی افادیت سے مطمئن نہ ہوسکا، چنانچہ جی ۔ ایم مورلیس کا کہنا ہے:

> "ہیئتی معلومات کی تلاش و جستجو میں، روایتی ہندو نظامِ ہیئت (جس کے نمائندہ شاہکار سوریہ سدھانت کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بہت ہی قدیم زمانہ میں مرتب ہوا تھا) اُسکے وقت پسند معیار کو مطمئن نہ کرسکا، کیونکہ اُسے اس میں وہ صحیح مشاہداتی معطیات نہیں ملے جن کی اُسے تلاش تھی، لہٰذا اس کوتاہی کی تلافی کے لیے اُس نے مسلمانوں کی ہیئتی تصانیف کی طرف توجہ مبذول کی۔"[1]

اور جب اسلامی ریاضی و ہیئت کے شاہکاروں کا روایتی ہندو نجوم و جوتش کی متداول کتابوں ("کتاب ہائے ہندی") سے مقابلہ کیا ہوگا، تو احساسِ کمتری کے زیرِ اثر اول الذکر کے ساتھ جن کا اُس نے نام بنام ذکر کیا ہے، ان "کتاب ہائے ہندی" کا نام لینے میں شرم محسوس کی۔ ویسے ان "کتاب ہائے ہندی" کے نام سے یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہونچ ہی جاتی ہے کہ راجہ جے سنگھ نے ہندو علم الہیئت کی متداول کتابیں ضرور پڑھی تھیں، البتہ تحقیق طلب بات یہ ہے کہ اُس نے ان "کتاب ہائے ہندی" کو درخورِ اعتنا سمجھا یا نہیں، اگر نہیں سمجھا تو کیوں؟ کیا وہ درخورِ اعتنا ہی نہیں تھیں، یا اور کوئی امر مانع تھا؟ اور اگر درخورِ اعتنا سمجھا تو کہاں تک اور کس طرح؟ اس طرح تحقیق طلب مسئلے دو ہیں۔

(۱) ہندو ہیئتی ورثہ کی نوعیت، اور

---

[1] Moraes, G.M. Astronomical Missions to The Court of Jaipur. JBBRAS, 1951, 27. P. 63

(۲) راجہ جے سنگھ کی قدیم روایتی ہندو علم الہیئت سے اثر پذیری۔

دوسرے مسئلہ کے سلسلہ میں فاضل مصنف (جی۔ آر کے) نے سابق مصنفین کی کوششوں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے بقول اُس کے اس غلط فہمی کی اشاعت میں مدد دی ہے کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی کاوشیں ہندو اصل سے ماخوذ تھیں۔ لہٰذا مذکورالصدر مسائل کی تحقیق سے پہلے ان مصنفین سابقین کی تحقیقی مساعی پر ایک نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

مصنفین سابقین کی گلفشانیاں | انیسویں صدی عیسوی میں جب کہ اسلامی دنیا عام زوال و انحلال کا شکار تھی، مغربی استعمار اپنے مخصوص سیاسی مصالح کے پیش نظر اپنے مکروہ و مسموم پروپیگنڈے سے مزید مضمحل بنانے میں کوشاں تھا، اس مقصد کے حصول کے لیے اس خیر الامم کے

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں   اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

کے مصداق افراد کو اپنے ماضی سے متنفر بنانے کی کوشش شروع کی گئی، اس کیلئے انکے ماضی کی سیاسی عظمت کو کچھ جابر و روزگار کی سفاکی و بہیمیت اور کچھ دوسرے عیاش حکمرانوں کی عیش پرستی کے افسانوں میں بدل دیا گیا، اور اس کی تہذیبی سربلندی اور ثقافتی درخشانی و تابناکی کو کچھ "لال بجھکڑوں کی دقیانوسیت" بتایا گیا، اس طرح اس خیر الامم کا رشتہ اپنے ماضی سے منقطع ہونے لگا۔

ادھر ان میں مزید احساس کمتری پیدا کرنے کے لیے ان کے حریفوں کے ماضی کی عظمت و قدامت میں مبالغہ طرازی کے لیے بڑے دلچسپ افسانے گڑھے گئے، ان کے ثقافتی ماضی کو ہزاروں سے بڑھا کر لاکھوں سال پرانا بنا دیا اور دنیائے علم و حکمت کی عظیم ترین دریافتیں ان کے اسلاف کے کھاتے میں درج کر دیں۔

انیسویں صدی کے مستشرقین کی تحقیقات علمیہ کا محرک یہی جذبہ تھا، اس کی داستان اور اس کے ہیروؤں کی فہرست بڑی طویل ہے، مگر پیش نظر بحث کے نقطۂ نظر سے کچھ یورپی فضلاء کی یہ نام نہاد تحقیقی کاوشیں ہماری توجہ کی خصوصیت سے مستحق ہیں، فاضل مصنف نے لکھا ہے :-

"(اس عوامی خوش فہمی کو کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی مساعی ہندو اصل سے ماخوذ تھیں) مصنفین سابقین نے مستحکم بنانے میں بڑی مدد کی ہے"[1]

ان مصنفین سابقین میں اُس نے سر فہرست گیرٹ (Garrett) کا نام لیا ہے، جس نے پنڈت چندر دھر کے ساتھ مل کر رصد گاہ جے پور پر ایک کتاب بعنوان . . . .
"The Jaipur Observatory And its Builder
لکھی تھی، وہ اپنی تصنیف میں سمراٹ سدھانت نامی سنسکرت کتاب کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ کتاب جے سنگھ کے مخصوص ہیئتی افکار و آراء پر مشتمل ہے، وہ اس بات کو کچھ ایسے انداز میں بیان کرتا ہے، جس سے مترشح ہوتا ہے، کہ یہ یا تو خود راجہ جے سنگھ کی تصنیف ہے یا پھر اس شخص (جگناتھ پنڈت) کی طبعزاد ہے، جس نے اسے راجہ جے سنگھ کے لئے لکھا تھا،[2] گیرٹ کی یہ کتاب عملی طور پر جے سنگھ کو "المجسطی" کا مصنف بنا دیتی ہے، اور ہندوؤں کو اسطرلاب کا موجد، اس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جے سنگھ کا یہ مزعومہ شاہکار ("سمراٹ سدھانت") کلی طور پر ہندو اصل سے ماخوذ تھا، اس کا کہنا ہے کہ جے سنگھ نے ہندو علم الہیئت کی تجدید کی اور اپنے نفس گرم کی تاثیر سے اُس کے مطالعہ کو وہ اہمیت بخشی جو برہم گپتا کے زمانہ (ساتویں صدی) سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی،[3]

---

[1] ک، صفحہ ۹۹ ۔ [2] ک، صفحہ ۹۹ [3] ایضاً

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ "سمراٹھ سدھانت" بطلیموس کی "کتاب المجسطی" کا آزاد ترجمہ ہے جسے راجہ جے سنگھ کے دست راست جگناتھ پنڈت نے عربی سے سنسکرت میں منتقل کیا تھا۔ علم الہیئت کی تاریخ میں "المجسطی" کی اہمیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ مغل عہد بالخصوص سترہویں اٹھارویں صدی عیسوی میں یہ ہندوستان کے عربی مدارس میں ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں شامل تھی، چنانچہ عہد شاہجہانی میں ملا محمود جونپوری "شمس بازغہ" میں اس کا ذکر اس فن کی اہم اور مسلم الثبوت کتاب کی حیثیت سے کرتے ہیں[1]۔ خود جے سنگھ کے آقائے ولی نعمت محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کے درباری طبیب معتمد الملوک علوی خاں (میر محمد ہاشم) نے اسکی اہمیت اور مقبولیت فی المدرس کے پیش نظر اس کی ایک مبسوط شرح لکھی تھی، جس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہنوز موجود ہے۔ (فہرست کتب قدیم عربی فن ہیئت نمبر ۲۲) دوسری شرح (فارسی زبان میں) رصدگاہ محمد شاہی میں سوائی راجہ جے سنگھ کے معاون خصوصی مرزا خیر اللہ مہندس نے "تقریب التحریر" کے عنوان سے لکھی تھی، اس کا مخطوطہ بھی، رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ (فہرست کتب قدیم فارسی فن ہیئت نمبر ۵، ۱۱) مرزا خیر اللہ کو تو اس کتاب (المجسطی سے) اتنی عقیدت تھی کہ انھوں نے اسے اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا، مرزا خیر اللہ کا یہ خود نوشتہ نسخہ بھی رامپور لائبریری میں ہنوز موجود ہے۔ (فہرست عربی قدیم فن ہیئت نمبر ۱)

لہٰذا اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر راجہ جے سنگھ کے ایما سے جگناتھ پنڈت نے اس کا عربی سے سنسکرت میں ترجمہ کیا، اور اس باب کو غیر مبہم الفاظ میں دیباچہ کے اندر لکھ دیا، چنانچہ جی۔ آر۔ کے نے جگناتھ پنڈت کے ترجمہ کی اصل سنسکرت

---

[1] ملا محمود جونپوری، الشمس البازغہ صفحہ ۴۴۔

عبارت نقل کرنے کے بعد اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی دیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے،

" اس کتاب کا جگنا تھ پنڈت نے جو جے سنگھ کے معاونین میں سے تھا، عربی سے سنسکرت میں، ترجمہ کیا تھا جو اپنے اصل کی غیر مبہم الفاظ میں صراحت کرتا ہے ۔۔۔۔۔ اس کے بعد (اُن اشعار کے اندر جنھیں پورے طور پر اوپر نقل کیا گیا ہے) ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جگن ناتھ نے اس نفیس سمراٹ سدھانت کو جے سنگھ کی خوشنودی مزاج کے لئے مرتب کیا تھا، اور یہ کہ یہ کتاب ماہرین ریاضیات کے استفادے کے لئے ایک کتاب کا جو عربی زبان میں المجسطی کہلاتی ہے، سنسکرت ترجمہ ہے۔"[1]

اسی مصنف (گیرٹ) نے اسطرلاب کا شرف ایجاد بھی جسے "ینتر راجہ" کا غیرمانوس نام دیکر سنسکرت الاصل بنا دیا گیا تھا، قدیم ہندو مصنفین کو بخشدیا ہے، چنانچہ کے لکھتا ہے،

" اسطرلاب کے واسطے ہندو نام ینتر راج ہے، اور گیرٹ کہتا ہے کہ یہ ہندو اصل سے ماخوذ ایک بہت ہی قدیم آلہ (رصدی) ہے۔"[2]

مگر یہ ان ماہرین ہندوستانیات کی خوش فہمی ہے، چنانچہ کے اس غلط فہمی کی تردید کے ضمن میں لکھتا ہے۔

" واقعہ یہ ہے کہ اسطرلاب یا ینتر راج قطعاً کسی ہندو اصل سے ماخوذ نہیں ہے۔"[3]

اس کے بعد وہ اپنے اس دعوے کی تائید میں تاریخی شہادت پیش کرتا ہے۔

اس آلہ (کی ساخت اور طریق استعمال کے موضوع) پر قدیم ترین ہندو تصنیف

---

[1] کے: صفحہ ۲۰۲　[2] کے، صفحہ ۳　[3] Kaye. P. 3

As a matter of fact, the astrolabe or yantra raja is not of Hindu origin at all"

چودھویں صدی مسیحی میں ظہور میں آئی (حالانکہ) عربی و فارسی زبانوں میں ایسی متعدد تصانیف پائی جاتی ہیں، جن کا آغاز دسویں صدی مسیحی سے ہوتا ہے، جبکہ اس فن میں قدیم ترین ہندو تصنیف مہندر سوری کی ہے، جسے اس نے فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں سمبت ۱۴۲۹ مطابق ۱۳۷۰ء میں لکھا تھا"[1]

خود مہندر سوری اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے،

"بہت سے یاونوں (یونانیوں اور ان کے خوشہ چیں مسلمان افاضل) نے اپنی زبان (یونانی، عبرانی، عربی، فارسی وغیرہ) میں اپنی مخصوص فہم و دانش کے مطابق اس آلہ (کی ساخت اور طریق استعمال) پر علمی تصانیف مرتب کی ہیں"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

"میں نے ان تصانیف کو سمندر کی طرح پایا، اب میں اپنی کتاب میں سب کا جوہر نکال کر اسے آب حیات بنا کر پیش کر رہا ہوں"[2]

بہرحال اصطرلاب ایک بہت ہی قدیم آلۂ رصد یہ ہے، جس کا شرف ایجاد قدیم یونان کو پہونچتا ہے، ہندو ہیئت دان تو چودھویں صدی مسیحی سے پہلے اس سے واقف بھی نہیں تھے، مزید تفصیل حسب ذیل ہے،

اصطرلاب کی قدامت اصطرلاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یونانی الاصل ہے۔ یہ دو لفظوں ....

بمعنی ستارہ اور ... Astr ... بمعنی ترازو سے مرکب ہے، اس کے موجد کے

---

[1] ایضاً ... صفحہ ۳ ... ۵ کے صفحہ ۳

بارے میں ابن الندیم دو رائیں دیتا ہے، ایک یہ کہ یہ مشہور یونانی ہیئت داں بطلیوس (زمانہ دوسری صدی عیسوی) کی ایجاد ہے، اور دوسری رائے جسے وہ بصیغۂ تمریض لکھتا ہے، یہ ہے کہ یہ بطلیوس کے پیشروؤں کی ایجاد ہے۔[۱] عہد حاضر کے محققین کا میلان اسی دوسری رائے کی طرف ہے، چنانچہ جوزف نیڈہم کہتا ہے، کہ نیوگبر ڈاکٹین کے خیال میں اصطرلاب بطلیوس سے پہلے یا علی الاقل اس کے زمانہ میں ایجاد ہو ا تھا، حسب تصریح ٹی۔ ایل۔ ہیتھ بطلیوس کی کتاب المجسطی کے مقالہ پنجم میں اصطرلاب کی ساخت اور طریق استعمال کا ذکر ہے[۲] جوزف نیڈہم کہتا ہے کہ بطلیوس نے اپنی کتاب "اربعہ مقالات" میں اصلاحی اصطرلاب کا ذکر کیا ہے[۱] پانچویں صدی مسیحی کے سرے پر امونیوس بازنطینی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اصطرلاب کو استعمال کیا تھا، اس کے شاگرد یوحنا فیلوپونس (یوحنا صاحب الاجتہاد) نے ۵۲۵ء کے قریب اصطرلاب کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی، اگلی صدی میں شامی بشپ سویرس میں سیبوخت نے اور نویں صدی مسیحی میں ماشاءاللہ یہودی نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں[۳]۔ ابن الندیم نے ماشاءاللہ کی تصانیف میں اس موضوع پر دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ کتاب صنعۃ الاسطرلابات والعمل بھا۔[۱]

---

[۱] ابن الندیم، کتاب الفہرست صفحہ ۳۹۲ Needham, Joseph: Science and civilization in China: vol. 3 P. 376 foot note 'a'

Heath, T. L: Greek mathematics vol. II P. 276 [۲]

[۳] جوزف نیڈہم: "سائنس اور ثقافت چین میں" جلد سوم صفحہ ۳۷۹

۲ - کتاب ذات الحلق[1]

ماشاء اللہ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۷۵۴ - ۷۷۵ میسحی) کا درباری منجم تھا، منصور کا ایک دوسرا درباری منجم ابراہیم بن حبیب الفزاری تھا جس نے اسطرلاب کے موضوع پر عربی زبان میں سب سے پہلی کتاب لکھی اور بعد کے لوگوں نے اس باب میں اُسی کا تتبع کیا، چنانچہ ابن القفطی اس کے تذکرے میں لکھتا ہے۔

وھو اول من عمل فی الاسلام	وہ پہلا شخص ہے جس نے عہد اسلام
اسطرلابا وله کتاب فی تسطیح	میں اسطرلاب کو بنایا، اسکی تصانیف
الکرۃ منه اخذ کل	میں ایک کتاب بعنوان "کتاب
الاسلامیین[2]	تسطیح الکرہ" ہے، اسی سے اس فن
	کو سب مسلمانوں نے سیکھا،

اس کے بعد مسلمانوں میں اصطرلاب سازی کا کام ترقی کرنے لگا، یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری (نویں صدی مسیحی) کے آغاز میں خلیفہ مامون رشید نے بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں تعمیر کرائیں، آلات رصدیہ کی تیاری میں اس زمانہ میں سب سے چابک دست کاریگر ابن خلف المروزی تھا، جس نے مامون کے لئے ذات الحلق بنایا تھا[3] ابن الندیم کہتا ہے کہ مروزی نے اسطرلاب بھی بنایا تھا۔

وقد عمل المروزی	(ابن خلف) مروزی نے اسطرلاب
الاسطرلاب[4]	بھی بنایا تھا۔

۱؎ ابن الندیم، کتاب الفہرست ص ۳۷۳ ۲؎ ابن القفطی، تاریخ الحکماء ص ۵۷ ۳؎ کتاب الفہرست ص ۳۹۲ ۴؎ الفہرست ص ۳۹۳ اسطرلاب کے موضوع پر علم و فن کی اہم تصنیف کتاب [illegible] اسطرلاب [illegible] مسلمان ماہر فلکیات عبدالرحمٰن الصوفی (زمانہ دسویں صدی مسیحی کا وسط) کی ہے جسے [illegible] بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اس میں ۳۸۶ باب ہیں، خوش قسمتی سے [illegible]

ابن خلف المروزی کا شاگرد رشید علی بن عیسی الاسطرلابی تھا جس نے رصدگاہ مامونی میں بالخصوص محیط ارضی کی پیمائش میں حصہ لیا تھا۔ آلات رصدیہ کی تاریخ میں علی بن عیسی کی شخصیت بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کی خوش نصیبی ہے کہ اسطرلاب کے موضوع پر اس کا تصنیف کردہ رسالہ باوجود حوادث کے بچکر سہ کر باقی رہ گیا اور اس سے زیادہ خوش نصیبی یہ کہ شائع ہوگیا۔ یعنی عربی زبان میں اسطرلاب پر جو رسالہ ۸۲۵ء (ہند رسوری کے رسالہ سے کوئی ساڑھے پانچ سو سال قبل) تصنیف ہوا تھا، وہ عوامی دسترس میں ہوا۔ اسکے بعد اس موضوع پر جو کتب و رسائل تصنیف ہوئے ان کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے، اسطرلاب کا استعمال عام تھا اور یہ اہل علم و دانش کی ایک ہمہ وقتی ناگزیر ضرورت بن گیا تھا عوفی نے "جو امع الحکایات" میں لکھا ہے کہ مامون کے وزیر فضل بن سہل کا سامان سفر انتہائی ہلکا پھلکا ہونے کے باوجود ایک عدد اسطرلاب پر ضرور مشتمل ہوتا تھا، اہل علم ہی نہیں اہل حرفہ تک میں اس کا رواج عام تھا، اسی لیے یں ایک نائی کا قصہ لکھا ہے کہ اس کی کسبت میں دوسری چیزوں کے ... تو اسطرلاب بھی ہوا کرتا تھا جس کی مدد سے وہ حجامت وغیرہ سے پہلے طالع دریافت کیا کرتا تھا۔

بہرحال قدیم ترین اسطرلاب جس پر اس کی تاریخ ثبت ہے احمد و احمد پسران ابراہیم اصفہانی کا بنایا ہوا تھا، جسے انھوں نے ۲۹۲ھ مطابق ۹۰۵ء میں مکمل کیا تھا یعنی ہند رسوری کے رسالہ "یتنر راجہ" کی تصنیف سے تقریباً چار سو سال پہلے، پھر مسلمانوں کے یہاں اسطرلابوں کی کثرت تعداد کے ساتھ ان کی ساخت میں بھی تنوع بڑھتا گیا، ابوالعباس

[illegible] ابوریحان البیرونی۔ کتاب التفہیم (فارسی) مرتبہ جلال ہمائی ص ۱۹۱۔

[illegible] جوزف نیڈھم "سائنس اور ثقافت چین میں" جلد سوم ص ۳۰۲

فرغانی نے کتاب الکامل میں لکھا ہے، ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی نے (زمانہ نویں صدی مسیحی کی ابتدا یعنی صندر سوری سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے) ایسا اسطرلاب بنایا تھا، جس کے اندر مقنطرات اور منطقۃ البروج مدور ہونے کے بجائے خربوزہ کی پھانکوں کی طرح بیضی ہوتے تھے، اور اسی لئے اسے "اسطرلاب مبطح" کہتے تھے۔[1] دسویں صدی مسیحی کے وسط میں احمد بن عبدالجلیل السجزی نے ایک نیا اسطرلاب اختراع کیا، جو اس اصول پر بنایا گیا تھا کہ آسمان کے بجائے زمین حرکت کرتی ہے، اس نے اس کا نام "اسطرلاب زورقی" رکھا تھا۔[2] اس کے علاوہ دو اسطرلابوں کی دو اور قسموں کا بھی موجد ہوا اسطرلاب صلیبی" اور "اسطرلاب لولبی" اس کے معاصر عبداللہ المعروف بہ نیک مردفائی نے "اسطرلاب رصدی" بنایا تھا، البیرونی کے استاد ابونصر بن عراق نے اسطرلاب سرطانی مجنح کی تیاری اور استعمال پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا تھا۔[3] قصہ مختصر یہ کہ ابوریحان البیرونی کے زمانہ تک مسلمان فضلا کے ایجاد و اختراع سے اسطرلاب کی ساخت میں غیر معمولی تنوع پیدا ہو چکا تھا، مذکورالصدر اقسام کے علاوہ آسی، مسرطن، دغیرہ اور ابوریحان البیرونی نے ان مختلف اقسام کی تیاری اور طریق استعمال پر ۱۰۱۱ء کے قریب ایک مبسوط کتاب بعنوان "استیعاب الوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاسطرلاب" تصنیف کی تھی۔

البیرونی کے بعد بھی اسطرلابوں کی ساخت میں تنوع ہوتا رہا، ان میں سفرجلی اہلیلجی، مسطح، کری ذات العنکبوت، طوماری، ہلالی، قوسی، صدفی، جامعہ مغنی ذات الحلق عصای موسی، عقربی زیادہ مشہور رہیں۔[4]

---

[1] بحوالہ کتاب التفہیم (فارسی) مرتبہ جلال ہمائی ص ۲۰۰۰ حاشیہ، [2] استیعاب الوجوہ الممکنۃ مخطوطہ مولانا عبدالحی کلیکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، عربی نمبر ۔۔۔، [3] کتاب التفہیم (فارسی) صفحہ ۲۰۰ حاشیہ، [4] ایضاً ص ۲۰۰ حاشیہ

اسطرلاب پر سب سے زیادہ مقبول کتاب خواجہ نصیر الدین طوسی کی "بست باب" ہے، جو اس صدی کے نصف اول تک عربی مدارس کے اندر ریاضی وہیئت کے اعلیٰ نصاب میں پڑھائی جاتی تھی۔ نصیر الدین طوسی نے ۱۲۷۴ء میں وفات پائی تھی، یعنی انھوں نے رسالہ بست باب "ہند رسوری" سے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے تصنیف کیا تھا۔

اسطرلاب پر پہلی ہندو تصنیف :۔ غالباً اسلامی ہند اسطرلاب سے بہت قدیم زمانہ سے واقف تھا، علم ہیئت ونجوم کے باقاعدہ تعلیم وتعلم کا قدیم ترین حوالہ غزنوی عہد کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان (زمانہ پانچویں صدی ہجری یا گیارھویں صدی مسیحی کا وسط) کے درمیان ملتا ہے، وہ جب عتاب شاہی میں ماخوذ ہو کر قلعہ سو میں قید کیا گیا تو وہاں اُس نے ایک بوڑھے شخص بہرامی سے یہ علم حاصل کیا، چنانچہ علی خاص کی مدح میں اُس نے جو قصیدہ لکھا ہے، اُس میں کہتا ہے [۱]

اگر نبودے بیچارہ پیر بہرامی چگونہ بودے حال من اندریں زندان

گہے صفت کندم حالہائے گردش چرخ گہے بیاں دہدم رازہائے چرخ کیاں

مرا ز صحبت او شد درست علم نجوم حساب شد ہمہ ہیئت زمین ومکاں

چناں شدم کہ بگویم نہ بر گماں بیقین کہ چند باشد یک لحظہ چرخ را دوراں

بعد میں بھی ہیئت ونجوم کا رواج رہا، بلبن کے زمانہ میں مولانا حمید الدین مطرز وغیرہ اس فن کے ماہر تھے،[۲] آخری مملوک تاجدار کیقباد کے عہد میں حسب تصریح ضیاء الدین برنی کوتوال شہر دہلی دیگر فضلاء کے ساتھ منجمین کی بھی تربیت کرتا تھا۔[۳] علاء الدین خلجی کے

---

[۱] کلیات مسعود سعد سلمان مرتبہ رشید یاسمی ص ۴۰۲ [۲] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۲

[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۹۔

زمانہ میں شہر دہلی میں نجومیوں کی کثرت انتہا کو پہونچ گئی تھی،[2] جن میں اکثر رصد بندی کے کام کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔[3] محمد تغلق بقول فرشتہ دوسرے علوم میں تبحر کے ساتھ نجوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتا تھا،[4]

محمد تغلق کا جانشین فیروز تغلق، نجوم کے ساتھ اسطرلاب سازی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، چنانچہ "سیرت فیروز شاہی" کا مصنف لکھتا ہے۔

"وعلم نجوم ودقائق آں بشابہ درضبط آمدہ کہ چندیں مصنفات ومولفات وقواعد آں بتالیف وتصنیف خاص مخصوص گشتہ وبملاو ارشاد حضرت مسطور ومذکور است۔ واسطرلابہا با قواعد وقوانین ایں علم ساختہ ورسالہا در وضع آں پرداختہ

اے منور بتو نجوم جلال ومقرر بتو رسوم کمال"

آگے چل کر یہی مصنف فیروز تغلق کے بنائے ہوئے کئی اصطرلابوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

"واسطرلابات تصنیف خاص اسطرلابے از نقرہ بغرض ہفت اقلیم چہ اسطرلابات دیگر بشہرے می کنند کہ دراں کار آید وایں بہفت اقلیم کار آید،

واسطرلابے دیگر از نقرہ شمالی وجنوبی، دراں مقنطرہ کشیدہ اند ومنطقہ وعنکبوت آں شمالی وجنوبی کواکب ثبت کردہ، واسطرلابے دیگر برنجی شمالی وجنوبی بغرض ہفت اقلیم،

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۶۳-۳۶۲ [2] ایضاً ص ۳۶۳ [3] "منجمان عصر علائی کہ ہم در علم احکام نجوم وہم در رصد بندی ماہر وکامل بودند" [4] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۳۳،

"(محمد تغلق) بجمیع علوم معقول خصوص طب وحکمت ونجوم وریاضی ومنطق مہارتے تمام داشت"۔

واسطرلابے دیگر از زر و نقرہ شمالی، دراں حدود بروج دو وجوہ دارباب مثلثات
در آں وساعات و شرف کواکب و میوہا ایشاں مسطور،
دیگر میزان فیروز شاہی ایک طبقی در اسطرلابات دیگر بعض بسیار، مطالع و سائت
وانچہ بدو منسوب است پیدا تواں کرد، اما حد میں بجر و ارتفاع گرفتن ساعات
وطاس حاصل می شود۔"

صاحب سیرت فیروز شاہی نے لکھا ہے کہ فیروز تغلق کو بتایا گیا کہ سکندر کے زمانہ میں شہر اسکندریہ میں اسطرلاب بنایا گیا تھا، مگر وہ شمالی تھا، جنوبی نہ تھا، اس کی "کری" ایک وقت تک تو بحال خود برقرار رہی، بعد میں مختل ہوگئی، بہرحال بادشاہ فیروز تغلق نے بھی اپنی فہم و ذکاوت کی مدد سے ایک اسطرلاب جو شمالی و جنوبی دونوں پر مشتمل تھا، تیار کیا، مملکت کے ماہرین حکمت و نجوم اور محاسبین و مہندسین کو جمع کیا اور فرمایا۔

حکیماں کہ من دارم از پیش کم — بحکمت در آفاق گشتہ علم
مرا نیز دانند از خاص عام — کہ دارم دراین علم دستے تمام
چرا باید آخر کہ در روزگار — نشانے نماند زمن روزگار

اس اسطرلاب تام کو اُس نے اسطرلاب فیروز شاہی کا نام دیکر شہر فیروز آباد کے سب سے اونچے منارہ پر نصب کیا، صاحب سیرت فیروز شاہی نے لکھا ہے۔

"اسطرلابات تام کہ آں منسوب است باسطرلاب فیروز شاہی و بر بالاترین منار فیروز آباد نصب کردہ اند باختراع و تصنیف وارشاد و تالیف خاص حضرت سلطنت خلد اللہ ملکہ مرتب شدہ۔"

آگے چل کر وہ ان آلات کے اختراع کے بارے میں لکھتا ہے،

شہ الحق تصنیف آں آلات جدید محقق بادشاہ و تالیف را سے جا بولنت کردہ وضع آن بیچ حکیمے دصاحب صنعتے را دخل وعدے نبودہ آں اسطرلاب نام بسیقی محمیں پادشاہی اسلام شمالی وجنوبی مرتب شدہ ست

چو ہرکس شاے زہر باب ساخت خداوند عالم سطرلاب ساخت .....

مصنف سیرت فیروز شاہی نے اسطرلاب سازی میں بادشاہ کے اتقان وچابکدستی کی بڑی مبسوط تفصیل دی ہے، جس کا استقصاء موجب تطویل ہوگا۔

ظاہر ہے حکمران وقت کے اس شوق فراواں واندازطبیعت سے رعایا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کہ

الناس علی دین ملوکہم

اور مسلمان رعایا کے ساتھ ہندو رعایا بھی اس سے متاثر ہوئی۔ آگے ہندوؤں اور پالکر کی شہادت آرہی ہے کہ بارہویں صدی مسیحی کے بعد سے ہندو نجوم وہیئت پر عربی وفارسی زبانوں میں ان موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں کے اثرات پڑنے لگے تھے،

وقت کی اس عام روش سے مہندر سوری نے بھی تاثر قبول کیا، اور عربی وفارسی زبانوں میں "یادنوں" (مسلمانوں) کی متعدد تصانیف سے استفادہ کرنے کے بعد "یتنتر راجہ" کے عنوان سے اسطرلاب پر ایک کتاب لکھی جیسا کہ وہ خود معترف ہے۔

" بہت سے یادنوں (مسلمانوں) نے اپنی زبان میں اپنی فہم ودانش کے مطابق اس آلہ کے موضوع پر علمی تصانیف مرتب کی ہیں، . . . . . میں نے ان تصانیف کو سمندر کی طرح پایا، اب میں اپنی کتاب میں ان سب کا جوہر نکال کر بطور آبحیات پیش کر رہا ہوں "[1]

---

[1] کے: بیچ سنگھ کی رصدگاہیں۔ ص ۳

اس تفصیل کے بعد مسٹر کیرٹ اور ان کے انداز پر سوچنے والے مقامی اور بیرونی فضلا کا یہ دعویٰ کہ اسطرلاب ہندو الاصل سے ماخوذ ہے، اور قدیم ہندو علم الہیئت میں استعمال ہونے والا آلہ رصد ہے، کسی مزید تنقید کا محتاج نہیں رہتا۔

مگر ان سب سے زیادہ دلچسپ "چھیتر درس" کا قصہ ہے، جسے سر ولیم جونز ہندی عبقریت کا شاہکار رہتا ہے، جیسا کہ جی۔ آر کے نے اس سے نقل کیا ہے،

"وہ سنسکرت تصنیف جس سے ہم مکمل ترین اور اہم ترین معلومات کی اُمید کر سکتے ہیں "چھیتر درس" یا علم الہندسہ کا منظر ہے، اس کتاب کو ایک ضخیم جلد میں مشہور راجہ جے سنگھ کے حکم سے مدون کیا گیا تھا، اس کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے، جو اس علم کے اندر ہندوستان کی مقدس زبان (سنسکرت) میں باقی رہ گیا تھا"[۱]

اس "شاندار دریافت" کا احیائیت نواز حلقوں میں جس گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا ہوگا، اس کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت بمبئی سے اس کتاب کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کی بڑی شد و مد سے تحریک کی گئی، اور رقم کثیر اور اس سے زیادہ محنت شاقہ برداشت کرنے کے بعد یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بعد میں یہ پتہ چلا کہ یہ خواجہ نصیر الدین طوسی کی تحریر اصول اقلیدس کا سنسکرت ترجمہ ہے[۲]

۱۔ کے، صفحہ ۶۹، Kaye. G.R., P49 "At considerable trouble and expense this work was published by Bombay Government and it turned out to be a Sanskrit translation of Nasir al-Din

تحریر اُصول اقلیدس اُس زمانہ کے عربی مدارس کے اندر ریاضی کے اعلیٰ نصاب میں شامل تھی، چنانچہ خود بادشاہ محمد شاہ کے طبیب خصوصی معتمد الملک علوی خاں دبیر محمد ہاشم جن کی شرح تحریر المجسطی کا اوپر ذکر آچکا ہے) نے بھی اس کتاب و تحریر اُصول اقلیدس کی ایک مبسوط شرح لکھی تھی، جس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ (فہرست کتب عربی۔ قدیم۔ فن ریاضی نمبر ۱۲، ۲۲، ۳، ۲۰، ۲۲ صفحہ ۲۱۵)

جہاں "تحقیق انیق" کا معیار اس درجہ بلند ہو، ظاہر ہے وہاں احقاق حق کے امکانات کتنے روشن ہو سکتے ہیں۔

ہندو ہیئت و رثہ کی نوعیت اسی احیائیت پسندانہ جذباتیت اور استعمار پسندانہ سیاسی مصلحت کا نتیجہ ہے کہ جوتش کی عظمت و قدامت کے بارے میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا، ہندو روایات کے مطابق "سوریہ سدھانت" لاکھوں سال پہلے تصنیف ہوا تھا، یہ تو مقامی فضلاء کا خیال ہے، مستشرقین بھی اس معاملہ میں کچھ پیچھے نہیں رہے، بیلی کا اٹھارویں صدی کے خاتمہ پر خیال تھا کہ ہندو علم الہیئت کی اساس اُن صحیح مشاہدات پر رکھی گئی تھی، جو سنہ مسیح سے ہزاروں سال پہلے کئے گئے تھے، لاپلاس جس نے بیلی کے فراہم کردہ اعداد پر اعتماد کر لیا تھا، اس کا خیال تھا کہ قدیم ہندوستان میں [illegible] ق۔م میں مختلف اجرام فلکی کے مشاہدات کئے گئے تھے، جو ایک ثانیہ تک صحیح تھے، پلے فیر بھی بیلی کی رائے کا موید ہے، سر ولیم جونز نے بدلائل دعویٰ کیا ہے کہ جوتش کے صحیح مشاہدات [illegible] ق۔م میں کئے گئے تھے[1]

لیکن کچھ اور محققین بھی ہیں جنھیں اس اغراق و غلو سے اتفاق نہیں ہے، چنانچہ

---

[1] [illegible] صفحہ [illegible]

پنٹنی، کولبروک، وہیروحشنی، تھیبوٹ وغیرہ نے زیادہ صحیح رائیں پیش کیں جن سے معلوم ہوا کہ بیلی نے جو اعداد استعمال کئے ہیں، وہ نسبتاً حال کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں[1] رہی جوتش کی عظمت تو ایسے مقامی اور بیرونی علماء کی کمی نہیں ہے، جو اس کی افادیت سے قطعاً مایوس ہیں، چنانچہ Every Mans · Encyclopedia ـ کا ایک آرٹیکل نویس لکھتا ہے۔

"نہ تو ہندوؤں نے اور نہ ہی مصریوں نے علم الہیئت میں کسی نمایاں اہمیت کا اضافہ کیا"[2]

یہ یوروپین فضلاء ہی کا خیال نہیں ہے ہندو فضلاء کو بھی اس کا اعتراف ہے، چنانچہ پروفیسر Lunea .M. A جو ملکر کالج اندور میں شعبۂ تاریخ کے صدر رہے ہیں لکھتے ہیں

"ہندو، علم الہیئت پر یونانی اثرات کا پتہ (قدیم) ہندوستانی ماہرین فن کی کتابوں میں لگایا جاسکتا ہے، یہ لوگ یونانیوں اور یونانی اساتذہ کے اقوال کا بڑے احترام سے ذکر کرتے ہیں، اہل ہند نے ہیئت کا علم یونانیوں سے حاصل کیا، اور اس بات کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا جاتا ہے، یونانی غیر متمدن تھے، باینہمہ ہیئت کے علم کا آغاز انہیں سے ہوا، اور اس لحاظ سے ان کا ذیوتا (دیوتاؤں) کی طرح احترام کیا جانا چاہئے"[3]

پھر ہند دعلم الہیئت کا ماضی (ماضی بعید) کتنا ہی درخشاں وتابناک نہ رہا ہو گر بارہویں صدی مسیحی کے بعد سے یہ ایک بھولی بسری داستان بن گیا۔ بقول کے (G.R.Kaye)

---

[1] کے، صفحہ ۱۱ Vol. I P. 479 Astronomy

[3] Evolution of Indian Culture P. 296

یا کسی یورپین مستشرق کا خیال نہیں ہے، بلکہ محب وطن اور احیائیت نواز ہندو افاضل عصر کی رائے ہے، جو ہند وعلوم و فنون کے ارتقا کے ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں، چنانچہ ایم ۔ ایچ اے میہنڈیل (M. A. Mehendale) اے ۔ ڈی پسالکر (A. D. Pusalkar) نے بھارتیہ ودیا بھون کی شائع کردہ History and Culture of Indian People کی مختلف جلدوں میں ہندوں کے علمی کمالات پر ابواب لکھے ہیں، اس کتاب کی پانچویں جلد میں لکھتے ہیں۔

"ریاضیات کی طرح علم الہیئت میں بھی بھاسکر آچاریہ کے بعد کسی فاضل نے ان علوم کی فروغ میں کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں کیا ہے"[1]

یہی فضلاء اس کتاب کی چھٹی جلد میں لکھتے ہیں۔

"عظیم بھاسکر آچاریہ کے بعد کوئی ایسا فاضل دکھائی نہیں پڑتا جس نے واقعی طور پر علم الہیئت میں دلچسپی لی ہو"[2]

علمی ہیئت (Scientific Astronomy) کے بجائے پنڈتوں کی دلچسپی نجوم اور جوتش میں بڑھنے لگی، چنانچہ یہی فضلاء بھاسکر آچاریہ کے پوتے چنگدیو کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے اپنے دادا کی تصانیف کے تعلیم و تعلم کے لئے ۱۲۰۵ء میں ایک پاٹھشالہ قائم کی تھی، مگر اس کے ارکان کی بیشتر توجہ نجوم اور جوتش پر مرکوز رہی،[3]

بعد ازاں متاخر تاجیکاؤں پر مسلمانوں کی ہیئتی تصانیف کا (جو عربی و فارسی میں

---

[1] اہل ہند کی تاریخ اور ثقافت جلد پنجم ص ۳۰۹ [2] ایضاً جلد ششم ص ۲۰۹

[3] ایضاً جلد ششم ص ۲۰۹۔ اسی زمانہ میں امیر فتح اللہ شیرازی اور ابوالفضل کی مدد سے کشن جوتشی گنگادھر جیتش اور مہانند نے زیکاٹ الغ بیگ کا فارسی سے ہندی (یا سنسکرت) میں ترجمہ کیا (آئین اکبری جلد اول ص ۸۸)

لکھی گئی تھیں، اثر پڑنے لگا۔ جب کہ یہی فاضل علما لکھتے ہیں۔[1]

"Under The Arabic and persian influence however Were undertaken the later tajikas like The one by NilKantha (A.D. 1587) in Two parts."

[عربی و فارسی (ہیئتی تصانیف) کے زیر اثر متاخر تاجیکائیں ظہور میں آئیں جیسا کہ نیلکنٹھ (زمانہ ۱۵۸۷ء) کی تاجیکا جسے اُس نے دو حصوں میں لکھا تھا۔]

اسی اثر سے متاثر ہو کر مہندر سوری نے اسطرلاب سازی پر اپنا مشہور رسالہ لکھا جو سنسکرت ادب میں اپنے موضوع کی پہلی پیش کش ہے (تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے)

قدیم روایتی ہند: علم الہیئت سے راجہ جے سنگھ کی اثر پذیری کا مسئلہ

معلوم نہیں جی۔آر۔کے نے "زیج محمد شاہی" کا ہندو جوتش کی قدیم تصانیف اور مسلم علم الہیئت کے شاہکاروں کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا تھا، یا نہیں۔ ویسے ظاہری قرائن سے تو اس کا جواب نفی ہی میں معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے، وہ سنسکرت سے واقف ہو، لیکن غالباً وہ عربی فارسی سے آشنا نہیں تھا، اور شاید "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ (جس کا انگریزی ترجمہ اُس کے سامنے موجود تھا) سے زیادہ وہ اس کے محتویات سے واقف بھی نہیں تھا۔

بایںہمہ جے سنگھ کے ہندو اور مسلم ماخذوں کے بارے میں اُس نے جو رائے دی ہے

---

[1] اہل ہند کی تاریخ اور ثقافت: جلد ششم صفحہ ۴۸۹۔ اس زمانہ میں امیر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل کی مدد سے کشن جوتشی گنگادھر، مہیش اور مہانند نے "زیج الغ بیگ" کا فارسی سے ہندوی (؟ سنسکرت) میں ترجمہ کیا۔ (آئین اکبری جلد اول صفحہ ۸۲)

وہ بڑی حد تک اقرب الی الصحت ہے، بالخصوص ہندو مآخذ کے بارے میں، چنانچہ وہ قدیم روایتی ہندو علم الہیئت سے جے سنگھ کے اخذ و استفادے کے بارے میں کہتا ہے۔

" یہ مفروضہ کہ اس نے (راجہ جے سنگھ نے) اپنے مخصوص ہیئتی تصورات ہندو روایات سے اخذ کئے تھے قطعی طور پر ساقط الاعتبار ہو چکا ہے"[1]

غالباً یہ مفروضہ ابتداءً اُن لوگوں نے قائم کیا تھا جنھوں نے "سمراٹ جنتر" کو راجہ جے سنگھ کی تصنیف اور اُس کے محتویات کو اُس کے مخصوص ہیئتی تصورات سمجھ لیا تھا، اس لئے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ راجہ جے سنگھ نے اپنی ہیئتی معلومات قدیم سنسکرت ماخذوں سے اخذ کی ہیں۔

لیکن اب جب کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ "سمراٹ جنتر" المجسطی کا سنسکرت ترجمہ ہے، تو اس قسم کی خوش فہمیوں کا کوئی محل نہیں رہا۔

راجہ جے سنگھ کی تحصیل علم کے سلسلے میں یہ تفصیل نہیں ملتی کہ اُس نے قدیم ہندو جوتش ودیا کی کون کون سی کتابیں مطالعہ کی تھیں، بعض لوگوں نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ اُس نے "سوریہ سدھانت" کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور جب اسکے محتویات اُس کی تحقیق پسند طبیعت کو مطمئن نہ کر سکے، تو پھر اُس نے مسلم علم الہیئت کی طرف توجہ مبذول کی[2]

لیکن اول تو، جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے، وہ "سوریہ سدھانت" سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ اس لئے اس سے اخذ و استفادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[1] کے، پ، صفحہ ۹۰ (اُس کے اصل الفاظ اوپر نقل ہو چکے ہیں)۔ [2] جی۔ ایم مورلیس: "مہاراجہ جے پور میں پہونچنے والے ہیئتی وفود" (جرنل آف بمبئی برانچ آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۱۹۳۸ء صفحہ ۳

دوم یہ کہ "سوریہ سدھانت" اور "زیج محمد شاہی" کے محتویات میں کوئی مماثلت ہی نہیں ہے، جو ثانی الذکر کے اول الذکر سے اثر پذیری کا سوال پیدا ہو۔

البتہ کے (G.R Kaye) نے راجہ جے سنگھ کے مسلم ماخذ کے بارے میں جو رائے دی ہے اس میں ترمیم کی کافی گنجائش ہے، کیونکہ مسلمان ہیئت دانوں کی مرتب کردہ زیجوں، بالخصوص "زیج الغ بیگ" اور "زیج محمد شاہی" کے درمیان غیر معمولی مماثلت ہے، اور اس لئے بات محض اتنی ہی نہیں ہے کہ

"ان عوامل و موثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے، جنھوں نے جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے:

بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے، یعنی یہ کہ اگر "زیج محمد شاہی" کو "زیج الغ بیگ" کا سرقہ کہنا سوء ادب ہو تو کم از کم مقدم الذکر کو مؤخر الذکر کا چربہ یا (Revised Edition)۔ تو ضرور کہا جائے گا۔

لیکن یہ ایک علحدہ بحث ہے اور اپنی تفصیلی وضاحت کے لیے ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے۔

بہرحال اتنا متحقق ہے کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیاں (بالخصوص وہ جنھیں اس نے "زیج محمد شاہی" میں قلمبند کیا ہے،) ہندو ماخذ و مصادر کی رہین منت نہیں تھیں، اور فاضل مصنف (جی۔ آر کے) غیر مبہم اور موکد الفاظ میں اس حقیقت کے بار بار اعتراف کو اپنی تحقیقی ذمہ داری سمجھتا ہے، چنانچہ ایک اور جگہ کہتا ہے۔

"بے شک جے سنگھ ہندو ہیئت دانوں کی تصانیف سے اچھی طرح واقف تھا، مگر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ان سے بہت زیادہ براہِ راست استفادہ نہیں کیا۔[1]

راجہ جے سنگھ نے نظری علم الہیئت میں کوئی اضافہ نہیں کیا، لیکن آلاتِ رصدیہ کی اصلاح و اختراع میں مساعی علیہ کا بہت بڑا مقام ہے مگر آلاتِ رصدیہ کی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں بھی وہ اگر مرہونِ منت ہے تو اپنے مسلمان پیشروؤں کا، چنانچہ وہ خود زیج محمد شاہی کے دیباچہ میں اس کا معترف ہے،

"چندے از آلاتِ رصدی مانند آنکہ در سمرقند ساختہ بودند، از روے کتب اسلامیان درین جا ہم ساخت، ذات الحلق برنجی بقطر سہ گز زایچ ایں عصر کہ قریب نصف ذراع ایل شرع است و ذات الشقتین و ذات الشعبتین و سدس فخری و شاملہ۔"

بعد میں جب اسے ان برنجی آلات کی کارکردگی میں کچھ دقتوں کا احساس ہوا تو اُس نے چونے اور پتھر کے آلاتِ رصدیہ بنوائے، ان آلات کے اس نے ہندی نام رکھے (سمراٹ، رام جنتر جے پرکاش) مگر یہ نام ہی کی حد تک ہندی ہیں، ورنہ ہندو جوتش سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس ملک میں کبھی کوئی رصدگاہ (اپنے واقعی مصداق کی حیثیت) قائم ہی نہیں ہوئی، چنانچہ ایک اطالوی مورخ علم الہیئت جیو رجیو ابرٹی لکھتا ہے۔

"ہندوستان کے شہروں کے کھنڈروں میں بابل کی طرح کسی رصدگاہ کے نشان نہیں ملتے۔"

خود راجہ جے سنگھ نے "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے،

"مدت مدید شدہ کہ از راجہ ہائے ذوی الاقتدار کسے پیرامون آں کار (تعمیر رصدگاہ) نگردیدہ۔"

---

[1] جی۔ آر۔ کے، صفحہ ۸۸

فاضل مصنف نے پوری تحقیق ذمہ داری کے ساتھ اُن آلات کی تفصیل وہی ہے جو قدیم ہندو جوتش کے ماہرین کے زیر استعمال رہے ہونگے، مگر جے سنگھ کے تعمیر کردہ چونے پتھر کے آلات رصدیہ کا ان سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ وہ (جی۔ آر۔ کے) بڑے موکد الفاظ میں کہتا ہے۔

"اس (جے سنگھ) کے سنگی آلات رصدیہ اُن تصورات کے زیر اثر تیار کئے گئے تھے، جو اُس نے (سابق) مسلمان ہیئت دانوں سے اخذ کئے تھے۔ جن آلات رصدیہ کا ذکر (قدیم) ہندو تصانیف میں کیا گیا ہے، اُن میں جے سنگھ کے مخصوص آلات رصدیہ (سمراٹ جنتر، رام جنتر، جے پرکاش) اور قدیم ہندو جوتش کے آلات رصدیہ میں کوئی امر مشترک نہیں ہے۔[1]

البتہ اگر اُن کا کسی سے تعلق ہے، اور راجہ جے سنگھ نے کسی قدیم آلہ رصدیہ کو نمونہ عمل بنا کر اپنے مخصوص آلات رصدیہ تعمیر کئے تو وہ مسلمان ماہرین آلات رصدیہ کے آلات تھے، چنانچہ فاضل مصنف کہتا ہے۔

"عام طور پر جے سنگھ کے آلات (رصدیہ) اُن سابق آلات (رصدیہ) کی یا تو بعینہ نقل تھے، یا براہ راست اصلاح تھے، جنھیں الغ بیگ یا اُس کے پیشرووں اور بعد میں آنے والوں نے استعمال کیا تھا۔"[2]

---

[1] کے، صفحہ ۹۰۔ [2] کے، صفحہ ۸۶

خطیب بغدادی

اور ان کے بعض مخطوطات

از ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

"یہ مضمون آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے ۲۶ ویں اجلاس منعقدہ پونا میں پڑھا گیا، اور اب کسی قدر حک و اضافے کے بعد ناظرین "معارف" کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔"

ابو بکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی المعروف بہ خطیب بغدادی کی ولادت ۲۴ جمادی الاخریٰ سنہ ۳۹۲ھ جمعرات کو عراق کے ایک گاؤں درزیجان[1] میں ہوئی جہاں ان کے والد ابوالحسن علی خطیب تھے۔[2] بعض مصنفین نے ان کی ولادت بجائے سنہ ۳۹۲ھ کے سنہ ۳۹۱ھ[3] بیان کی ہے، اور یوسف العش نے اپنی تصنیف "الخطیب البغدادی مورخ بغداد و محدثہا" میں لکھا ہے کہ وہ "غزیۃ" کے مقام پر پیدا ہوئے تھے،[4] جو حجاز میں وادی[5] میں

---

[1] ابن خلکان: وفیات الاعیان ۱: ۷۶-۷۷ (المطبعۃ المیمنیۃ، قاہرہ، سنہ ۱۳۱۰ھ) [2] ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ ۵: ۸۷ (برکلے سنہ ۱۹۰۹ء) [3] ابن العماد الحنبلی۔ شذرات الذہب ۳: ۳۱۱ (مکتبۃ القدسی، مصر سنہ ۱۳۵۰ھ) الذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ۳: ۱۱۳۵ (دائرۃ المعارف، حیدرآباد سنہ ۱۳۳۴ھ) [4] ابن خلکان۔ وفیات الاعیان، ابن کثیر۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۲: ۱۰۱ (مطبعۃ السعادۃ، مصر) ابن تغری بردی۔ النجوم الزاہرۃ [5] یوسف العش۔ الخطیب البغدادی (المکتبۃ العربیۃ، دمشق، سنہ ۱۳۶۴ھ)

واقع ہے، معجم البلدان کی روایت کے مطابق غزیہ کا جاے وقوع فید سے ایک دن کی مسافت پر ہے،[1] زرکلی نے بھی الاعلام میں ان کی ولادت غزیہ ہی کی ہی بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ وہ کوفہ اور مکہ کے درمیان نصف مسافت پر واقع ہے،[2] اس کے برعکس عمر رضا کحالہ نے معجم المؤلفین میں پہلے خیال کی تائید کی ہے،[3] خطیب نے عمر کا ابتدائی حصہ بغداد میں گزارا،[4] ان کے والد کو علم سے لگاؤ تھا، ان ہی کی تحریک پر خطیب کو تحصیل علم کا شوق ہوا، گیارہ برس کی عمر میں والد نے انھیں حدیث سنوانی شروع کر دی تھی، ابتدا میں خود ان کا رجحان فقہ کی طرف تھا، چنانچہ انھوں نے ابوالحسن المحاملی،[5] قاضی ابوالطیب الطبری،[6] ابونصر بن الصباغ،[7] سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، شیخ ابواسحاق شیرازی کے درس میں بھی شریک ہوئے، اور ان سے بہت استفادہ کیا، اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے،[8] بعد میں حدیث اور تاریخ کی طرف میلان بڑھ گیا تھا، شیخ ابواسحاق شیرازی کا خیال تھا کہ علم حدیث میں ان کا پایہ دارقطنی سے مشابہ تھا،[9] حصول علم کے لیے متعدد مقامات کا سفر کیا اور جہاں گئے، نامور محدثین سے حدیث کی سماعت کی. بیس سال کی عمر میں بصرہ اور ۲۳ سال کی عمر میں …

---

1 یاقوت الحموی: معجم البلدان ۱۳ ۔ ۸۰ 2 الزرکلی: الاعلام ۱: ۱۷۲ (قاہرہ، ۱۳۷۳ھ)
3 عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفین ۲: ۳ ۔ ۴ (المکتبۃ العربیۃ۔ دمشق ۱۳۷۶ھ) 4 ابن الجوزی: المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۸: ۲۶۵ (دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۹ھ) 5 ابن العماد: شذرات الذہب ۳: ۳۱۱ 6 ابن تقی الدین السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ۳: ۱۳ (المطبعۃ الحسینیۃ مصر) 7 السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ 8 السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ 9 النووی: تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۲ ۔ ۲۴۷ (ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر)
10 ابن خلکان: وفیات الاعیان 11 السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ

نیشاپور، اور وہاں سے اصفہان گئے،[1] راستے میں ہمدان اور جبال سے گزر ہوا، پھر بغداد واپس آکر شام کے لئے روانہ ہوئے، اور وہاں تھوڑی مدت دمشق اور صور میں قیام کرکے مکہ چلے گئے، جہاں حج کیا، اسی سال قاضی ابو عبد اللہ محمد بن سلامہ القضاعی بھی حج کے لیے آئے ہوئے تھے، ان سے حدیث سنی اور کریمہ بنت احمد المروزی کے سامنے پانچ دن میں صحیح بخاری پڑھی، پھر بغداد واپس آئے، اور وزیر ابو القاسم بن مسلمہ سے تقرب حاصل کیا، ابن شافع کی روایت کے مطابق صور کے دوران قیام میں وہاں کے والی عز الدولہ سے بھی انھیں قرب حاصل رہ چکا تھا، اور بہت مالی منفعت پہنچی تھی،[2] بساسیری کے فتنے کے موقع پر خطیب بغدادی روپوش ہوگئے، اور بغداد سے نکل کر دوبارہ شام پہنچے جہاں دمشق میں قیام کیا، وہاں سے صور، پھر طرابلس اور پھر حلب گئے، صور کے دوران قیام میں بار بار بیت المقدس کی زیارت کے لیے جاتے رہے، ۴۶۲ھ کے آخر میں بغداد واپس آئے،[3] اور ۷ ذی الحجہ ۴۶۳ھ کو پیر کے دن وہیں وفات پائی،[4] سمعانی کی روایت ہے کہ ان کی وفات شوال میں ہوئی،[5] دوسرے دن حضرت بشر بن حارث حافی کے پہلو میں باب حرب میں دفن ہوئے،[6] ابن القلانسی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ان کی تدفین امام احمد بن حنبل کے مزار کے قریب ہوئی۔[7] چونکہ ان کا وارث کوئی نہیں تھا، اس لئے انھوں نے وصیت کی

۱؎ السبکی ۔ طبقات الشافعیۃ الکبری ۔ ۲؎ الذہبی ۔ تذکرۃ الحفاظ ۳: ۲۲۴

۳؎ ابن الجوزی ۔ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۸: ۲۶۵ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ۱: ۲۴۸ (مطبعہ ہندیہ قاہرہ ۱۹۲۳ء)۔ ۴؎ ابن خلکان ۔ وفیات الاعیان ۵؎ السمعانی ۔ کتاب الانساب ۲۰۳ (مجموعہ گب ۱۹۱۲ء) ۶؎ ابن خلکان ۔ وفیات الاعیان؛ ابن کثیر ۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۲: ۱۰۲

۷؎ ابو یعلی حمزۃ بن القلانسی، ذیل تاریخ دمشق ۔ ۹۴ (مطبعۃ الآباء الیسوعیین، بیروت ۱۹۰۸ء)

ان کا سب مال و اسباب صدقہ کر دیا جائے، اور اپنی سب کتابیں اور فقہا یعنی علماء کے لئے وقف کر دیں۔[۱]

خطیب بغدادی سے حدیث روایت کرنے والوں میں متعدد اہل علم شامل ہیں۔ ان کے شیوخ ابوبکر البرقانی اور ابو القاسم الازہری کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں عبد العزیز بن احمد الکتانی نے ان سے روایت کی ہے، اور ان کے شاگردوں میں ابن ماکولا، عبد اللہ بن احمد السمرقندی، محمد بن مرزوق الزعفرانی اور ابوبکر بن الخاضبہ کے نام قابل ذکر ہیں، علم کلام میں وہ ابوالحسن الاشعری کے مسلک کے پیرو تھے۔[۲] اور فقہی اعتبار سے شروع میں حنبلی تھے، لیکن حنبلی علماء کا خیال تھا کہ ان کا رجحان بدعتیوں کی طرف ہے، اس لئے حنبلیوں سے انھیں سخت تکلیفیں پہنچیں، چنانچہ بعد میں انھوں نے شافعی مذہب اختیار کیا، اور اپنی تصانیف میں حنبلیوں کے خلاف تعصب کا مظاہرہ کیا۔[۳] انھیں خطیب کا لقب اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ درب ریحان میں خطبہ دیتے تھے۔[۴]

ان کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے، کہ ابن کثیر کی روایت کے مطابق راستہ چلتے ہوئے کتاب پڑھتے رہتے تھے،[۵] انھوں نے خلیفہ قائم باللہ سے، جو ان کی علمیت کا قائل تھا، درخواست کی تھی کہ انھیں جامع منصور میں روایت حدیث کی اجازت دی جائے، چنانچہ اجازت دی گئی،[۶] ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابن عساکر کے حوالہ سے ابوالفضل بن خیرون کی روایت نقل کی ہے، کہ خطیب نے حج کے موقع پر آب زمزم کے تین گھونٹ

---

[۱] ابن خلکان، وفیات الاعیان، [۲] السبکی، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ابن عساکر تبیین کذب المفتری، ۲۶۸ - ۷۰ (مطبعۃ التوفیق دمشق ۱۳۴۷ھ) [۳] یاقوت الحموی، ارشاد الاریب، [۴] ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ [۵] ایضاً [۶] یاقوت الحموی، ارشاد الاریب،

پی کر میں رعاتیں کی تھیں، بغداد میں اپنی تاریخ کی روایت کریں، جامع منصور میں
حدیث کریں، حضرت بشر بن حارث کے پہلو میں دفن ہوں، اللہ تعالیٰ نے تینوں د
ہو گئیں[1]، اس کے ساتھ ہی ان کے کردار کے بعض پہلوؤں پر انگشت نمائی بھی کی گ
ابن الجوزی اور بعض دیگر مصنفین نے خطیب بغدادی کی تصانیف کی تعداد
بیان کی ہے[2]۔ لیکن سبکی اور ابن کثیر نے وہ کے لگ بھگ بتائی ہے، اور ابن خلکا
ابو الفداء، اور سمعانی نے ان کی سو کے قریب تصانیف کا ذکر کیا ہے، الذہبی
تذکرۃ الحفاظ میں سمعانی کے حوالے سے ان کی تصانیف کی خاصی طویل فہرست دی
اور پھر اس میں بعض تصانیف کا خود اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے،[3] یوسف العش
اپنی تصنیف میں ان کی تصانیف کی فہرست مع ان کے موضوعات اور ان کے
میں بعض ضروری معلومات کے درج کی ہے، سبکی نے لکھا ہے کہ ان کی بعض تصا
ان کی موت کے بعد ضائع ہو گئیں، اور لوگوں کی نظروں سے نہیں گزریں، ان کی جو تا
اب تک طبع ہوئی ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے، مولانا آزاد لائبریری اور لائبریری ادا
علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ان کی چار مطبوعہ کتابیں تاریخ بغداد، التطفیل وحکا
الطفیلین واخبارھم، الکفایۃ فی علم الروایۃ، اور تقیید العلم موجود ہیں، ان کے علاوہ ا
کتاب تاریخ مدینہ بغداد کے نام سے ہے، جو تاریخ بغداد کا ملخص ہے، اسے پیرس سے ۱۹۰۴ء
میں جارج سالمن نے مع فرانسیسی ترجمہ کے شائع کیا ہے، ایک اور اختصار علی طارق
نے شائع کیا ہے، یہ بغداد سے ۱۳۳۸ھ میں شائع ہوا ہے، اور مولانا آزاد لائبریری کے
حبیب گنج میں موجود ہے، جہاں تک میرا علم ہے، ان کے علاوہ ان کی کوئی اور کتا

---

[1] الذہبی تذکرۃ الحفاظ ۳۰۔ ۳۱۹ [2] یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب [3] الذہبی تذ

مطبوعہ صورت میں موجود نہیں ہے۔ یاقوت الحموی اور ابن الجوزی نے ابوالحسن ابن الطیوری کی روایت نقل کی کہ خطیب بغدادی کی اکثر تصانیف علاوہ تاریخ بغداد کے صوری (محمد بن علی بن حسین) کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، صوری نے ان کا آغاز کر دیا تھا لیکن انھیں مکمل نہیں کر سکے تھے، پس خطیب جب شام پہنچے تو ان کی کتابیں حاصل کیں اور ان سے استفادہ کر کے اپنی کتابیں تصنیف کیں۔[1] خطیب شاعر بھی تھے، یاقوت نے ارشاد الاریب میں اور یوسف العش نے اپنی تصنیف میں ان کے متعدد شعر نقل کیے ہیں۔

خطیب کی تصانیف میں تاریخ بغداد کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، یہ ۱۳۴۹ھ میں ۱۴ جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی، یہ اُن علماء کے حالات میں ہے، جو بقول خود خطیب کے "بغداد میں پیدا ہوئے، یا کہیں اور پیدا ہوئے، لیکن بغداد میں آبسے یا بغداد چھوڑ کر کہیں اور جا بسے اور وہیں وفات پائی یا بغداد کے قرب و جوار میں رہتے تھے، یا بغداد کے باشندے تو نہیں تھے، لیکن وہاں کچھ مدت کے لئے آئے تھے"[2] اس میں بغداد کے قیام (۱۴۵ھ) سے مصنف کے سال وفات (۴۶۳ھ) تک کے علمائے بغداد کا احاطہ کیا گیا ہے، کتاب کے آغاز میں بغداد کے تاریخی و جغرافیائی حالات اور اس سے متعلق بعض دوسری ضروری معلومات بیان کر دی گئی ہیں، شروع میں ایسے صحابۂ کرام کا ذکر ہے، جن کا عراق سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رہا ہے، سب سے پہلا نام حضرت علیؓ کا ہے، اس کے بعد اصل کتاب باعتبار حروف تہجی شروع ہوتی ہے، لیکن اس میں بھی ان لوگوں کا ذکر بغرض حصول برکت پہلے کیا ہے، جن کا نام "محمد" ہے، راقم الحروف کے جد امجد مولانا

۱؎ یاقوت الحموی: ارشاد الاریب، ابن الجوزی: المنتظم۔

۲؎ الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد ۱: ۲۱۲ (قاہرہ ۱۳۴۹ھ)

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم نے سنہ [illegible]ھ میں ایک خاص نقطۂ نظر سے تاریخ بغداد پر تفصیلی تبصرہ لکھا تھا جو رسالہ کی شکل میں شائع ہو گیا ہے، اس میں انھوں نے لکھا ہے "روش تاریخ مروجہ طریقہ سے علحدہ ہے، بجائے خلفاء و امراء کو مستقل موضوع قرار دیکر ان کے حالات بیان کرنے کے رجال تاریخ کا ذکر بترتیب حروف تہجی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اپنے اپنے موقع سے خلفاء و امراء بھی آجاتے ہیں، رجال کے سلسلہ میں ہر فن اور ہر گروہ کے ماہرین مذکور ہیں، مفسرین و محدثین و فقہاء سے لیکر شعراء و مصنفین و اہل صنعت تک سب ہی کا ذکر ہے، اس طرح ۷۸۳۱ مشاہیر رجال کا تذکرہ ملتا ہے۔" مولانا شروانی نے اس کتاب پر اس نقطۂ نظر سے تنقید کی تھی کہ اس میں امام ابو حنیفہ اور ان کے دو نامور شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد پر جو جرح کی گئی تھی، اس کا رد کیا جائے، اس کے باوجود انھوں نے خطیب کے اسلوب اور مورخانہ خوبیوں کی اس طرح داد دی ہے، "تاریخ خطیب جس طرح بہترین زمانے کی تاریخ ہے، اسی طرح طرز بیان کے اعتبار سے مسلمان مورخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معنی استعمال کئے ہیں، عبارت آرائی و مدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح و تعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکۃ الآراء مقامات میں قوت فیصلہ کی کمی نمایاں ہے، محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ اور منطقیانہ تذبذب پاس نہیں۔"[1]

مولانا شروانی نے اس رسالہ میں یہ اطلاع بھی دی ہے" اس تاریخ کا خلاصہ بھی کیا گیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ میرے یہاں ہے، یہ خلاصہ فل اسکیپ کے ۴۰۰ صفحات ختم ہوا ہے، خلاصہ نگار قاضی نجم الدین مسعود بن محمد بخاری حنفی المتوفی سنہ [illegible]ھ خطیب کے

---

[1] شروانی، حبیب الرحمن خان، تبصرہ بر تاریخ خطیب بغدادی - ۲ (علی گڑھ سنہ [illegible]ھ)

شاگرد ہیں، . . . . واضح ہو کہ کل رجال خلاصہ کی تعداد چند صد سے متجاوز نہ ہوگی، منتخب شعر وغیرہ مستقل عنوان میں"۔[1] یہ نسخہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے، اس میں ہر صفحہ پر ۲۲ سطریں ہیں، سائز ۸ × ۱۳ ش، ۱۳۰ ص، کے کاتب مولانا عبد اللہ سورتی ہیں، سنہ کتابت ۹۳۳ھ ہے، خط نستعلیق صاف ہے، مولانا سورتی نے چند حواشی بھی لکھے ہیں، سرورق پر ایک نوٹ دیا ہے جس میں لکھا ہے کہ کشف الظنون میں ابو الیمن کا سنہ وفات ۱۰۶۱ھ بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ان کی وفات ۹۱۰ھ میں ہوئی، ابو الیمن نے اپنے دیباچہ میں تاریخ خطیب کی تعریف لکھی ہے لیکن ساتھ ہی لکھا ہے کہ طویل زیادہ ہے اس لیے میں نے منتخب رجال کے (بہ ترتیب اصل کتاب) حالات مختصراً نقل کیے ہیں۔[2]

تاریخ بغداد کا ایک اختصار "مختار مختصر" کے نام سے آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں بھی موجود ہے، (فہرست جلد ۳، ص ۳۳۰، نمبر کتاب ۲۱۹ رجال) یہ اختصار یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلۃ الحکیم نے کیا ہے، یہ دو جلدوں میں ہے پہلی جلد ۱۰۰ صفحات اور دوسری جلد ۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، دوسری جلد کے آخر میں تاریخ کتابت ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۱ھ درج ہے، اور اس کے بعد یہ عبارت ہے،

وقد نقل من نسخة قديمة هي قومة سنة اثنتين وخمسين وسبع مائة

(۱۵۲)

کتاب کا سائز ۸ × ۱۳ ہے اور ہر صفحہ پر ۲۳ سطریں ہیں، خط نستعلیق صاف ہے لیکن دونوں نسخوں کے کاتبوں کا نام دیا ہوا نہیں ہے، اختصار کنندہ نے کتاب کے مقدمہ میں قاضی ابو الیمن کے اختصار کا ذکر کیا ہے کتاب کی تعریف کی ہے لیکن طوالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اختصرته وذكرت أسماء الرجال الذين ذكرهم على ترتيبه (باقی)

---

[1] مرجع سابق ۱/ ۲ [2] الخطيب البغدادي - كتاب الكفاية في علم الرواية، ۴۴ (دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۷ھ)

امام مزنی

حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی، رفیق دار المصنفین

امام شافعی کے ممتاز اصحاب اور ان کی فقہ کے نامور راویوں میں امام مزنی اور امام ربیع بن سلیمان مرادی کا نام سرفہرست ہے، فقہ شافعی میں ان حضرات کی وہی حیثیت ہے، جو فقہ حنفی میں امام ابو یوسف اور امام محمد کی ہے، لیکن اس کے باوجود ان دونوں کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے، سطور ذیل میں سوانح و طبقات کی کتابوں کی مدد سے امام مزنی کے حالات اور علمی کارناموں کو پیش کیا جارہا ہے، آئندہ امام ربیع کے سوانح حیات بھی پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ (ع - ص)

نام و نسب | اسمٰعیل، بن یحییٰ نام، ابو ابراہیم کنیت، عرب کے مردم خیز قبیلہ مزینہ تمیم سے نسبی تعلق رکھتے ہیں، یہ نامور قبیلہ عثمان اور اوس دو بھائیوں کی اولاد پر مشتمل ہے، مزینہ بنت کلب ان کی والدہ تھیں [1]

صحابہ کرامؓ میں حضرت عبداللہؓ بن مغفل، حضرت معقلؓ، حضرت نعمانؓ بن مقرن وغیرہ اسی قبیلہ کے نامور فرزند ہیں [2] صاحب تاج العروس نے مشہور شاعر کعب بن زہیر بن ابی سلمیٰ کو اسی قبیلہ میں شمار کیا ہے، تابعین میں معاویہ بن قرہ، بکر بن عبداللہ اور خالد بن عبداللہ

---

[1] الانساب - سمعانی ج ۱۲ ص ۵۲۰ [2] اللباب فی الانساب - ابن اثیر ج ۳ ص ۱۳۷

طحاوی جیسے جلیل القدر حضرات بھی قبیلہ مزنیہ کی طرف منسوب ہیں[۱] مزنی کے ذکر میں علامہ ذہبی نے اس نسبت کی ایک اور توجیہ بھی کی ہے، ان کا بیان ہے کہ سمرقند کا ایک قریہ مُزْن یا مُزْنہ کے نام سے مشہور ہے، محدث شہیر احمد بن ابراہیم مزنی اور دوسرے مشاہیر اسی قریہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس نسبت کے لوگ (بسکون زا) مزنی کہلاتے ہیں[۲] اور قبیلہ مزنیہ سے تعلق رکھنے والے (بفتح زا) مزنی کہلاتے ہیں لیکن یہ بیان ایک امکانی توجیہ سے زیادہ نہیں ہے، امام مزنی جن کے حالات ہم بیان کر رہے ہیں وہ قبیلہ مزنیہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور مزنی کہلاتے ہیں۔

پیدائش | امام مزنی ۱۷۵ھ میں مصر میں پیدا ہوئے، سارے سوانح نگار اس سنہ پر متفق ہیں[۳] لیکن علامہ سبکی نے ربیع مرادی (امام مزنی کے رضاعی بھائی) کے حالات میں امام طحاوی کی رائے کسی قدر مختلف نقل کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ بحر بن نصر، ربیع مرادی اور مزنی تینوں ایک ہی سنہ یعنی ۱۷۴ھ میں پیدا ہوئے، طحاوی، امام مزنی کے بھانجے ہیں، اس لئے ان کے بیان کو اہمیت دی جانی چاہئے، مگر دوسرے مورخین کا کیا ذکر خود سبکی نے بھی اس پر زور نہیں دیا، اور سرسری طور پر ذکر کر دیا، اس سے پتا ہوتا ہے کہ یہ روایت زیادہ قوی نہیں ہے، اور عام سوانح نگاروں ہی کا بیان [illegible] ہے۔

نشو و نما | امام مزنی کی نشو و نما اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی ہے، ان کے خاندانی حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں

۱ۓ المنتخب - بلنسی ص ۱۱، ۲ۓ تاریخ اسلام - ذہبی ج ۲ ص ۴۴ ۳ۓ طبقات، ابن ہدایہ ص ۵، سبکی - ج ۱ ص ۲۴۳، ابن شہبہ قلمی ص ۲۰۳ موجود خدابخش لائبریری پٹنہ، توالی التاسیس ص ۱۴ وغیرہ

والد کے مشاغل کا بھی کتابوں میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ و مصر کے رہنے والے تھے، مصر پہلے فسطاط کو بھی کہتے تھے، اور اس نام کا شہر بھی تھا، جو فسطاط کے قریب تھا، اسلامی فتوحات سے پہلے اسے بڑی مرکزیت حاصل تھی، فاطمیوں کے زما میں قاہرہ آباد ہوا تو وہ مصر کا دار السلطنت قرار پایا، اور ایسی ترقی کی کہ پھر کوئی د شہر اس کا ہمسر نہ رہا لیکن مصر و فسطاط اب بھی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، مزنی کے زما میں مصر بہت بارونق تھا، اور تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے بڑے بڑے ائمہ یہاں مقیم تھے، اور تعلیم و تدریس تصنیف و تالیف اور بحث و نظر کے مستقل حلقے قائم تھے لیکن حدیث کی طرف خاص توجہ تھی۔

امام لیث بن سعد، نعیم بن حماد، مفضل بن فضالہ، حیوہ بن شریح، یحییٰ بن ایوب اور عمرو بن حارث جیسے اکابر ائمہ حدیث یہاں موجود تھے، اور ان کی وجہ سے یہ علاقہ طلبا علوم حدیث کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا[1]، اس ماحول میں امام مزنی نے شعور کی آنکھیں کھولیں اللہ تعالیٰ نے حفظ و ذہانت سے خوب نوازا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے، یوں تو وہ سبھی ائمہ حدیث سے اکتساب فیض کرتے تھے لیکن نعیم بن حماد سے زیادہ مناسبت تھی، نعیم بن حماد کے علمی کمال اور جلالت شان کا اندازہ اس لگایا جاسکتا ہے کہ وہ امام ترمذی، دارمی اور امام بخاری کے راوی ہیں، وہ اصحاب الرائے کے طرز عمل کو پسند نہیں کرتے تھے، اور قیاس و رائے کے بجائے صرف حدیث کے الفاظ کو پیش نظر رکھتے تھے، اس بنا پر محدثین کے حلقہ میں ان کی بڑی عزت تھی، ان کی صحبت میں مزنی کو اصحاب حدیث سے بڑا تعلق پیدا ہوا،

---

[1] خطط۔ مقریزی، ص ۱۲۵،

نعیم بن حماد کے علاوہ امام مزنی نے علی بن معبد العبدی سے بھی سماعت کی۔ ان کا شمار بھی اہم محدثین میں ہوتا ہے، علی بن معبد کے اساتذہ میں مالک بن انس، خالد بن حبان، سفیان ابن عیینہ اور عبد اللہ ابن مبارک اور تلامذہ میں امام مزنی کے علاوہ اسحاق بن منصور، ابن معین اور محمد بن اسحاق بن شافعی کی سی عظیم المرتبت ہستیوں کے نام آتے ہیں۔ امام مزنی نے اپنی کتاب مختصر المزنی کے باب الاضحیۃ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن امام نووی کا خیال ہے کہ یہ ان کے ہم نام علی بن معبد الصغیر ہیں۔[1]

مصر میں امام شافعی کی آمد سماعت حدیث کا سلسلہ جاری تھا، اور امام مزنی کبار محدثین سے استفادہ کر رہے تھے، کہ امام شافعی کی مصر میں آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ مصر میں امام شافعی کی یہ تشریف آوری اس وقت ہوئی جب ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ چکا تھا، اور اس کی ضیا باری سے ایک عالم پُر نور تھا، وہ یمن، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور عراق سے گذر کر یہاں پہونچے تھے، وہ امام مالک کی خدمت میں بھی رہے تھے، امام محمد کے یہاں بھی انھوں نے ان بزرگوں سے استفادہ بھی کیا تھا، اور ان کے افکار و خیالات پر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالی تھی، وہ عراق و حجاز، اور دوسرے علمی مراکز کے نقطۂ نظر سے بخوبی آگاہ تھے، اور ان ائمہ کے مسلک ان کے اجتہاد اور طرز استدلال کو اچھی طرح سمجھے اور اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں ان پر نقد بھی کرتے تھے، ان خصوصیات کی بنا پر وہ سارے اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے، مصر میں ان کا بڑا خیر مقدم ہوا، اور ان کا کاشانہ شائقین علم کا مرکز عقیدت بن گیا، مزنی نے بھی ان کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیے باعث سعادت جانا اور علم کے اس بحر ذخار سے اپنی تشنگی کی سیرابی اور ذہنی آسودگی کی کوشش کی

---

[1] تہذیب الاسماء، نووی ج ۱ ص ۳۵۳، تہذیب ابن عسقلانی جلد ۷ ص ۳۸۲

امام شافعی کے فیض سے اب وہ محض حدیث کے سامع اور راوی نہ تھے بلکہ کتاب و سنت کے اسرار و رموز سے آگاہ ہو گئے، اجتہاد و استدلال کی نئی راہیں ان پر منکشف ہوئیں، انھوں نے امام شافعی کے علم و اجتہاد کو سارے عالم میں پھیلا دیا، اور نہ صرف مصر سارے بلاد اسلامیہ میں فقہ شافعی کی اشاعت و ترویج کا اہم ذریعہ بن گئے۔ ان کے میں بجا طور پر کہا جاتا ہے۔

اکبر اصحابنا علماً و اعلم	وہ ہمارے اصحاب میں علم کے لحاظ
غلمان الشافعی الذی	سے سب سے برتر اور امام شافعی کے
مهد مذهب ولین کلام	شاگردوں میں عالم ترین شخص تھے،
الشافعی۔[1]	جنھوں نے شافعی مسلک کی راہ ہموار
	کی اور کلام شافعی کو آسان بنایا،

امام شافعی | امام مزنی کی آیندہ فکری و فقہی ساخت و پرداخت کو سمجھنے کے لیے امام شافعی کے علمی منازل کا مختصر ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، مدینہ میں امام مالک سے کسب فیض کے بعد امام شافعی ۱۸۴ھ میں بغداد تشریف لائے جو اس وقت فقہ حنفی کا سب سے بڑا مرکز تھا، یہاں انھوں نے امام محمد سے فقہ حنفی کا درس لیا اُٹھائے۔ درس میں امام محمد سے خیالات اور علمی مباحث نے امام شافعی کے علمی و فکری رجحانات پر گہرے نقوش ثبت کیے اور بقول ابن حجر وہ اہل حدیث اور اہل رائے کے علوم کے جامع بن گئے۔ بغداد میں ان کے قیام کی مدت یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، لیکن شیخ ابو زہرہ کا خیال ہے کہ دو سال سے کم ان کا قیام بغداد میں نہیں رہا۔

---

[1] خطط مقریزی ج ۲ ص ۳۳۴

قیام مکہ | اس کے بعد وہ مکہ معظمہ تشریف لائے، یہاں امام احمد بن حنبل سے انکی ملاقات ہوئی ۹ برس یہاں ان کا قیام رہا، مسجد حرام میں باقاعدہ ان کا ایک حلقہ قائم تھا، اس طرح فکر شافعی کی ترویج کا پہلا دور شروع ہوا، ۹ برس کا یہ دور امام شافعی کی حیات علمی کا شاداب ترین دور تھا، ایک تو عمر کے لحاظ سے وہ عقلی پختگی کے حدود میں پہونچ گئے تھے، دوسرے وہ امام مالک اور امام محمد کے اجتہادات اور طرز استدلال سے آگاہ ہو چکے تھے، اور ان کی روشنی میں بحث ونظر کے ایک نئے رُخ کی تعیین میں کامیاب ہو چکے تھے، اپنے علمی اسفار کی بنا پر علماء کے مختلف آراء وافکار سے واقفیت کے علاوہ نہیں حدیث کے وسیع لیکن منتشر ذخیرہ کی فراہمی کا بڑا موقع ملا تھا، جس سے اصول کی تشکیل، مسائل کے تجزیہ وتحلیل، تفریع وتشریح اور استنباط واجتہاد میں اصابت رائے اور فیصلہ محکم کی صلاحیت پورے طور پر نمایاں ہو چکی تھی، امام احمد بن حنبل نے جو مکہ میں ہی مقیم تھے، اور ابن عیینہ کے حلقوں سے اٹھ کر امام شافعی کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے تھے، اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ "فقہ کا قفل بند تھا، اللہ تعالیٰ نے شافعی کے ذریعہ اسے کھلوا دیا"، مکہ معظمہ میں نو برس قیام کے بعد امام شافعی دوبارہ ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے، اس مرتبہ تقریباً ۲ برس قیام رہا، اس عرصہ میں ان کی علمی اور فقہی کسوٹی کے لیے وسیع تر مسائل پیش ہوئے، مثلاً امام ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کے اختلافات کا تجزیہ، واقدی، اور اوزاعی کا تعاقب، جن کو [illegible] اپنے اصولوں پر عرض ونقد کا عمل، اس طرح بغداد کے اس قیام کو بجا طور پر امام شافعی کے فقہی سفر کی دوسری منزل قرار دیا جاتا ہے،

مصر کا سفر | تکمیل وتاسیس کی تیسری اور آخری منزل کے لیے سرزمین مصر قدیم علم کی

بغداد سے مصر کی ہجرت کے اسباب میں کاتب تقدیر کی مصلحت بینی کے علاوہ خلیفہ وقت مامون کے عقائد معتزلہ کا روز افزوں اقتدار اور علوم اسلامیہ میں علمٰ کی تیزی کے ساتھ اثر پذیری کو بھی دخل ہے، یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان حقایق موجودگی میں امام شافعی کی دور رس نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ کسی بھی مکتب فکر کی تاسیس و تکمیل کے لیے جس قسم کی یکسوئی اور فراغ خاطر ہے، بغداد میں اس کی گنجایش دور دور نظر نہیں آتی، ان کے علوم و معارف ا تفقہ و اجتہاد کی راہ خطرات سے دوچار تھی، ایسے موقع پر امام شافعی کی فراست نے انھیں مصر کی طرف ہجرت کی صلاح دی، انھوں نے بغداد سے روانگی کے وقت جو اشعار کہے ہیں ان سے بھی اس تغیر کو تائید حاصل ہوتی ہے،

لقد اصبحت نفسی تتوق الی مصر ومن دونها قطع المهامة والقفر
فواللہ ما ادری الفوز والغنی اساق الیها ام اساق الی القبر

ترجمہ: میرا دل مصر کے لیے مشتاق ہے، حالانکہ اس کی راہ میں دشواریاں ہیں بخدا میں نہیں جانتا کامرانی و بے نیازی کے لیے لے جایا جا رہا ہے یا مصر کی خاک میں مدفون ہونے کے لیے،

قیام مصر کی اہمیت، جو لوگ امام شافعی کی فراست فہم اور تفقہ سے واقف ہیں ان کے لیے یہ بات باعث حیرت و استعجاب نہیں ہے کہ قیام مصر نے امام شافعی کے امید و اندیشہ دونوں کا جواب اثبات میں دیا، سرزمین مصر اس آفتاب عالمتاب کو اپنی آغوش میں لے کر جہاں برشک افلاک بن گئی، وہیں اسے علوم شافعیہ کے ایک نئے آفتاب کے طلوع کی سعادت بھی حاصل ہوگئی، فقہ شافعی کی ساری سطر بندی اسی چہار سالہ قیام مصر کا نتیجہ ہے، فقہ شافعی کی نو و تکمیل، اس کی تشکیل و تشریح

اشاعت و ترویج کے مراحل کی تعیین مصر ہی میں ہوئی، اور یہیں اس نے استحکام حاصل کیا۔

اصحاب مصر | امام شافعی کی فقہ کے فروغ میں ان کے مصری شاگردوں کی بڑی اہمیت ہے، امام شافعی اپنے تلامذہ و اصحاب کے باب میں بہت خوش قسمت ہیں کہ ہر دور میں بڑے باصلاحیت حوصلہ مند اور مخلص ترین رفقاء کی ایک جماعت کثیر ان کے دامن علم سے وابستہ رہی، مکہ معظمہ کے قیام کے دوران ابوبکر حمیدی، موسیٰ بن ابی الجارود ابوبکر محمد بن ادریس اور بغداد کی مجالس میں زعفرانی، کرابیسی، ابوثور کلبی اور مصر کے آخری دور میں حرملہ بن یحییٰ، بویطی، ابن عبدالحکم، ربیع جیزی، ربیع مرادی اور مزنی جیسے نادرۂ روزگار تلامذہ ان کے دامن فیض سے وابستہ رہے[1] مصری رفقاء کی حیثیت اس لیے اور اہم ہو جاتی ہے کہ فقہ شافعی کے سارے مستند مقبول اور متداول سرمایہ کے امین و پاسبان ان کے علم کے حامل اور ان کے تنقیح شدہ مسائل کے ترجمان یہی اصحاب مصر ہیں اور اس گنج گراں مایہ کا گوہر آبدار اور مصر کے بازار علم کی متاع بیش بہا۔ رزاں فات صد افتخار ہے۔

مزنی کی امام شافعی سے ملاقات | علامہ سبکی نے "کوہ علم مسلک شافعی کا ناصر و مددگار، اور آسمان شافعی کے ماہ کامل"[2] کے بظاہر مبالغہ آمیز الفاظ سے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن امام مزنی کی شخصیت کی جلوہ طرازی خود اعلان کرتی ہے کہ آسمان شافعی کے بدر کامل کی یہ تعبیر مبالغہ سے قطعاً پاک ہے، مصر میں امام شافعی کی آمد کے وقت امام مزنی کی عمر صرف ۲۲ برس کی تھی

---

[1] توالی التاسیس، عسقلانی، الانتقاء، ابن عبدالبر اور شافعی، ابوزہرہ وغیرہ سے ملخصاً
[2] طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۸

بغداد سے مصر کی ہجرت کے اسباب میں کاتب تقدیر کی مصلحت مبنی کے علاوہ خلیفہ
وقت مامون کے عقائد معتزلہ کا روز افزوں اقتدار اور علوم اسلامیہ میں عقل
کی تیزی کے ساتھ اثر پذیری کو بھی دخل ہے، یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان حقائق
موجودگی میں امام شافعی کی دوررس نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی
کہ کسی بھی مکتب فکر کی تاسیس و تکمیل کے لیے جس قسم کی یکسوئی اور فراغ خاطر
ہے، بغداد میں اس کی گنجائش دور دور نظر نہیں آتی۔ ان کے علوم و معارف ا
تفقہ و اجتہاد کی راہ خطرات سے دوچار تھی، ایسے موقع پر امام شافعی کی فراست
نے انھیں مصر کی طرف ہجرت کی صلاح دی، انھوں نے بغداد سے روانگی
وقت جو اشعار کہے ہیں ان سے بھی اس تعبیر کو تائید حاصل ہوتی ہے،

لقد اصبحت نفسی تتوق الی مصر ومن دونها قطع المهامه والقفر

فوالله ما ادری الفوز والغنی اساق الیها ام اساق الی القبر

ترجمہ: میرا دل مصر کے لیے مشتاق ہے، حالانکہ اس کی راہ میں دشواریاں ہیں بخدا میں نہیں جانتا
کامرانی و بے نیازی کے لیے لے جایا جارہا ہے یا مصر کی خاک میں مدفون ہونے کے لیے،

قیام مصر کی اہمیت: جو لوگ امام شافعی کی فراست فہم اور تفقہ سے واقف ہیں
ان کے لیے یہ بات باعث حیرت و استعجاب نہیں ہے کہ قیام مصر نے امام شافعی کے
امید و اندیشہ دونوں کا جواب اثبات میں دیا، سرزمین مصر اس آفتاب عالمتاب
کو اپنی آغوش میں لے کر جہاں برشک افلاک بن گئی، وہیں اسے علوم شافعیہ کے
ایک نئے آفتاب کے طلوع کی سعادت بھی حاصل ہوگئی، فقہ شافعی کی ساری عطر بیزی
اسی چہار سالہ قیام مصر کا نتیجہ ہے۔ فقہ شافعی کی نمود تکمیل، اس کی تشکیل و تشریح

اور اشاعت و ترویج کے مراحل کی تعیین مصر ہی میں ہوئی، اور یہیں اس نے استحکام حاصل کیا۔

اصحاب مصر امام شافعی کی فقہ کے فروغ میں ان کے مصری شاگردوں کی بڑی اہمیت ہے، امام شافعی اپنے تلامذہ و اصحاب کے باب میں بہت خوش قسمت ہیں کہ ہر دور میں بڑے باصلاحیت حوصلہ مند اور مخلص ترین رفقاء کی ایک جماعت کثیر ان کے دامن علم سے وابستہ رہی، مکہ معظمہ کے قیام کے دوران ابوبکر حمیدی، موسیٰ بن ابی الجارود، ابوبکر محمد بن ادریس اور بغداد کی مجالس میں زعفرانی، کرابیسی، ابوثور کلبی اور مصر کے آخری دور میں حرملہ بن یحییٰ، بویطی، ابن عبدالحکم، ربیع جیزی، ربیع مرادی اور مزنی جیسے نادرۂ روزگار تلامذہ ان کے دامن فیض سے وابستہ رہے[1] مصری رفقاء کی حیثیت اس لیے اور اہم ہو جاتی ہے کہ فقہ شافعی کے سارے مستند مقبول اور متداول سرمایہ کے امین و پاسبان ان کے علم کے حامل اور ان کے تنقیح شدہ مسائل کے ترجمان یہی اصحاب مصر ہیں اور اس گنج گرانمایہ کا گوہر آبدار اور مصر کے بازار علم کی متاع بیش بہا مزنی کی ذات صد افتخار ہے۔

مزنی کی امام شافعی سے ملاقات علامہ سبکی نے "کوہ علم مسلک شافعی کا ناصر و مددگار" اور "آسمان شافعی کے ماہ کامل"[2] کے بظاہر مبالغہ آمیز الفاظ سے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن امام مزنی کی شخصیت کی جلوہ طرازی خود اعلان کرتی ہے کہ آسمان شافعی کے بدر کامل کی یہ تعبیر مبالغہ سے قطعاً پاک ہے، مصر میں امام شافعی کی آمد کے وقت امام مزنی کی عمر صرف ۲۲ برس کی تھی

[1] توالی التاسیس، عسقلانی، الانتقاء، ابن عبدالبر، اور شافعی، ابوزہرہ وغیرہ سے ملخصاً

[2] طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۸

نوعمری میں وہ نعیم بن حماد، علی بن معبد جیسے کبار اساتذۂ حدیث سے اکتساب علم کر چکے تھے لیکن انھیں علمی سیرابی کے لیے کسی بحر زخار کی ضرورت تھی۔ امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انھیں اس بحر ناپیدا کنار میں شناوری کا ڈھنگ آیا۔

امام شافعی سے ان کی پہلی ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوئی؟ اس کا ذکر تصریح نہیں ملتا، لیکن اندازہ ہے کہ امام شافعی کی مصر میں تشریف آوری کے ساتھ ہی امام مزنی ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ابن حجر کے الفاظ "لزم الشافعی حین قدم مصر"[1] سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں وہ امام شافعی کی مجلسوں میں شاید ان کے کلام کے سننے کے شوق اور پیچیدہ علمی مسائل کے بارے میں استفسار کی غرض سے حاضر ہوتے گو وہ اس وقت حدیث کے طالب علم تھے، اور مصر میں اس وقت اسی کا دور دورہ تھا لیکن بغداد سے بُعد مسافت کے باوجود مصر، بغداد کے جدید علمی رجحانات سے بالکل غیر متاثر نہ تھا، علم کلام نئے ذہنوں کے لئے خاصا پرکشش تھا، امام مزنی کا کلامی طرز فکر و استدلال متاثر ہونا قرین قیاس ہے، چنانچہ امام شافعی سے مسائل کے استفسار میں ان کا انداز اہل کلام کا سا ہوا کرتا تھا۔ امام شافعی علم کلام اور متکلمین کے بارہ میں بہت سخت تھے اس موقع پر انکا یہ قول لائق ذکر ہے،

حکمی فی اهل الکلام ان	اہل کلام کے بارے میں میرا فیصلہ
یضربوا بالجرائد و	یہ ہے کہ انھیں چھڑیوں سے مارا جائے
یحملوا علی الابل ویطاف	اور اونٹوں پر بٹھا کر بستیوں اور
بهم فی العشائر والقبائل	قبیلوں میں پھرایا جائے، اور
وینادی علیهم هذا جزاء	پکار پکار کر کہا جائے کہ یہ سزا

[1] توالی التاسیس ص ۴۰۔

من ترك الكتاب و السنة[1]		کتاب و سنت کے ترک کی پاداش میں[1]

کچھ علم کلام سے ناپسندیدگی اور کچھ امام مزنی کی پوشیدہ فقہی صلاحیتوں سے آگاہی کے سبب امام شافعی کو مزنی کا یہ کلامی انداز پسند نہ آیا۔ اور ایک روز جب کہ مزنی نے چند کلامی مباحث چھیڑے تو امام شافعی نے ان کو مطمئن کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ایسا علم ہے کہ اگر تم جادۂ صواب پر رہے تو بھی اجر کا موجب نہیں اور اگر کسی غلطی اور لغزش کا ارتکاب ہوا تو بات کفر کی حد تک پہونچ سکتی ہے۔ آخر تم ایسا علم کیوں نہیں اختیار کرتے جو تمہارے لیے باعث خیر ہو کہ صحت و صواب ہر صورت میں مستحق ثواب ہو اور خطا و غلطی کی شکل میں وبال سے محفوظ رہو۔ "فهل لك فى علم ان اصبت فيه اجرت وان اخطأت لم تاثم؟" مزنی نے عرض کیا وہ کیا، فرمایا، علم فقہ، امام مزنی خود فرماتے ہیں کہ

فلزمته و تعلمت منه		پھر میں ان کی خدمت میں لگ گیا

الفقه و درست عليه[2]		ان سے فقہ کا علم حاصل کیا۔

اسی قسم کے ایک موقع پر امام شافعی نے فرمایا۔

سلنى عن شئى اذا اخطأت		مجھ سے ایسی چیز کے متعلق سوال

فيه قلت اخطأت ولا		کرو کہ اگر تم غلطی کرو تو میں کہوں

تسئلنى عن شئى اذا اخطأت		تم نے غلطی کی، ایسی چیز کے بارے

فيه قلت كفرت[3]		میں مت پوچھو کہ اگر تم سے خطا ہو

		تو میں کہوں تم کفر کے مرتکب ہوئے

اسی سیاق میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک روز امام شافعی کی نشست میں

---

[1] معجم المصنفین ص ۱۰۰ [2] طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۴۲ [3] معجم المصنفین ۱۰۰

حفص فرد موجود تھے، دونوں حضرات کے مابین دقیق قسم کے کلامی مباحث پر گفتگو ہو رہی تھی مزنی کا اعتراف ہے کہ ابہام اور پیچیدگی سے یہ باتیں میری فہم کی گرفت سے بالاتر تھیں کہ اچانک امام شافعی تیزی سے مزنی کی جانب متوجہ ہوئے، اور فرمایا۔

یا مزنی تدری ما قال	اے مزنی تم سمجھے کہ حفص نے کیا کہا
حفص قلت لا قال خیر[1]	میں نے کہا نہیں، فرمایا، تمہارے لیے
ان لا تدری[2]	نہ سمجھنا ہی بہتر ہے،

اس طرح امام شافعی نے مزنی کی قوت استدلال، صلاحیت استحضار اور دقیقہ سنجی، نکتہ رسی، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی فطری اور خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کے بعد اپنی ساری توجہ ان کی فقہی صلاحیتوں کی تربیت و ترقی پر مرکوز کر دی، چار برس کی محنت اور توجہ کے بعد امام شافعی کے جذبات کا ان کے حق میں اظہار ان الفاظ میں ہوا، جو کسی بھی شاگرد کے لیے باعث صد افتخار ہیں، فرمایا

هذا لو ناظر الشیطان	یہ اگر شیطان سے مناظرہ کریں
لغلبه وقطعه وهو ناصر	تو اس پر غالب آجائیں، اور اسے
مذهبی[2]	ختم کر دیں، یہ میرے مسلک کے ناصر
	و مددگار ہیں،

امام شافعی کی دوربیں اور دور رس نگاہوں نے اپنے اس نوجوان اور ہونہار شاگرد کی مستقبل میں کامیابی کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا، چنانچہ امام صاحب کی

---

[1] طبقات سبکی ج ۱، ص ۲۴۲، [2] وفیات الاعیان۔ ابن خلکان ص، طبقات شیرازی ص ۹۰، اسنوی قلمی موجود خدا بخش لائبریری ص ۸۔

وفات کے وقت جب ان کے چاروں مصری تلامذہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ایک لمحہ کے لیے امام شافعی اپنے لگائے ہوئے چمن کے ان سرسبز و شاداب پودوں کو جن کی آبیاری میں انھوں نے اپنا سارا سرمایۂ حیات اور خون جگر صرف کیا تھا دیکھتے رہے، پھر متوجہ ہو کر ہر ایک کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی، فرمایا

اما انت یا ابا یعقوب	اے ابو یعقوب (بویطی) تمھارا وقت
فتموت فی حدیدک	موعود آئے گا، اور تم بیڑیوں میں
واما انت یا محمد فسترجع	ہوگے۔ اور اے محمد (ابن عبد الحکم)
الی مذہب ابیک و	تم اپنے والد کے مسلک پر لوٹ جاؤگے
اما انت یا ربیع فانت	اور اے ربیع (مرادی) تم میرے
انفعہم لی فی نشر الکتب	لیے کتابوں کے نشر میں نافع ترین
واما انت یا مزنی فیکون	شخص ہوگے اور اے مزنی بہت جلد
لک بمصر ہنات وہنات	مصر میں تمھارے لیے خوب خوب
ولتدرکن زمانا تکون	خوشگواریاں ہوں گی اور وہ
اقیس ذلک الزمان	زمانہ ضرور پاؤگے، جس میں تم سب
قال الربیع فکان کما قال[1]	بڑے فقیہ ہوگے۔ ربیع کہتے ہیں جیسا
	فرمایا ویسا ہی ہوا،

ایک سعادت مند شاگرد کے لیے اس سے بڑھ کر اس کی عظمتوں اور کامیابیوں کی ضامن و شاہد سند اور کیا ہو سکتی ہے، ہو تاریخ شاہد ہے کہ مصر کے علاوہ عراق، شام

[1] طبقات سبکی ص ۲۳۹

خراساں اور اندلس وغیرہ دیار شرق وغرب میں فقہ شافعی کا فروغ امام مزنی اور ان کے تلامذہ کا رہین منت ہے۔[1]

امام شافعی کی حکیمانہ تربیت — اپنے اقوال وافعال سے شعوری وغیر شعوری طور پر شخصیت کی تعمیر میں امام شافعی کو جو ملکۂ خاص ودیعت ہوا تھا، اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ امام مزنی ان کی خلوت وجلوت کے شریک تھے، ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے، کہ امام شافعی اپنے تلامذہ کو اخلاق عالیہ کی تعلیم کتنے حکیمانہ انداز سے دیتے تھے، مثلاً ایک دن ایک خیاط امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوا، امام صاحب نے کسی لباس میں رفو کرایا، اور ایک دینار دیدیا، خیاط دینار دیکھکر ہنسا، امام صاحب نے فرمایا اسوقت یہی لے لو اگر اور دینار ہوتے تو میں ضرور دیتا، اس پر خیاط نے کہا میں تو صرف سلام کی غرض سے حاضر ہوا تھا، امام شافعی نے فرمایا تب تو زائر بھی ہو، اور دہان بھی اور ان دونوں سے خدمت لینا، شرافت نہیں، ایسے ہی ایک موقع پر امام شافعی چند تیراندازوں کے پاس سے گزرے، ایک تیرانداز بڑا ماہر اور کہنہ مشق تھا، اس کی بے خطا نشانہ بازی سے امام شافعی خوش ہوئے دعا دی اور مزنی سے فرمایا جیب میں کچھ ہے؟ امام مزنی کے پاس اتفاق سے تین ہی دینار تھے، امام شافعی نے وہ تینوں دینار بطور انعام اس تیرانداز کو مرحمت کر دیئے، امام مزنی ان واقعات کو لطف سے ذکر کر کے دہراتے تھے،[2] ان واقعات کی روشنی میں انھوں نے اپنی زندگی کو حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا،

امام مزنی کے شعری ذوق میں امام شافعی کا پرتو — امام مزنی کو شعر وادب سے جو ذوق تھا وہ

---

[1] طبقات ، ج ۱ ، ص ۲۳۹ [2] توالی التاسیس ص الانتقاء ص ۹۲ ، ۹۵ ،

تمامتر امام شافعی کا عطیہ ہے، ایک بار امام مزنی کی موجودگی میں امام شافعی کی خدمت میں کسی شخص نے غلط انداز اور خراب لے سے چند اشعار سنائے۔ امام شافعی کی طبیعت مکدر ہوگئی، اور فرمایا "امرضتنی" (تم نے مجھے کبیدہ خاطر کر دیا)، امام مزنی نے فرمایا ایک بار امام شافعی نے خاص طور سے مجھے یہ اشعار سنائے،

شھدت بان اللہ لا شئی غیرہ　　واشھد ان البعث حق وخلص
وان عری الایمان قول مبین　　وفعل زکی قد یزید و ینقص
وان ابابکر خلیفۃ ربہ　　وکان ابوحفص علی الخیر یحرص
واشھد ربی ان عثمان فاضل　　وان علیا فضلہ متخصص
ائمۃ قوم یھتدی بھداھم　　لحا اللہ من ایاھم تینقص[1]

ترجمہ:۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے، اور موت کے بعد دوبارہ زندگی حق ہے، ایمان قول مبین کا نام ہے، میرے افعال میں زیادتی و نقصان کا عمل، ہتا ہو ابوبکر اپنے رب کے خلیفہ ہیں، عمر خیر کے آرزومند ہیں، عثمان صاحب فضیلت ہیں اور علی کی فضیلت خاص ہے، یہ حضرات قوم کے امام ہیں، ان کے ذریعہ ہدایت حاصل کی جاتی ہے، خدا اسے غارت کرے، جو ان کی تنقیص کرے۔"

ایک بار فرمایا، مزنی جاہلوں کے نزدیک علم ویسا ناپسندیدہ ہے، جیسا اہل علم کے نزدیک جہل، پھر یہ اشعار سنائے،

ومنزلۃ الفقیہ من السفیہ　　کمنزلۃ السفیہ من الفقیہ
فھذا زاھد فی قرب ھذا　　وھذا فیہ ازھد منہ فیہ

---

[1] معجم المصنفین ۲، ۸ [2] طبقات اسبکی ص ۱۵۰ [3] ایضاً

ترجمہ:۔ سفیہ (بیوقوف) کے نزدیک فقیہ کی وہی حیثیت ہے جیسی اس کی فقیہ کے نزدیک حیثیت ہوتی ہے، یہ اس کے قرب میں بے رغبت ہے اور وہ اس سے بڑھ کر اس کی ذات سے بے نیاز ہو،

امام شافعی کے دم رخصت جب مزنی حاضر خدمت ہوئے اور مزاج پرسی کی تو فرمایا: دُنیا سے رخصت اور دوستوں سے جدا ہو رہا ہوں، اپنے اعمال کی برائیوں کا سامنا اور موت کا جام پینا ہے، مجھ نہیں جانتا کہ میری روح کا رخ جنت کی جانب ہے کہ اسے مبارکباد دوں یا جہنم اس کے سامنے ہے کہ تعزیت کروں، پھر یہ اشعار سنائے،

ولما قسی قلبی وضاقت مذاهبی جعلت رجائی نحو عفوک سلما

تعاظمنی ذنبی فلما قرنته بعفوک ربی کان عفوک اعظما

فمازلت ذا عفو عن الذنب لم تزل تجود و تعفو منة و تکرما[1]

ترجمہ:۔ جب میرا دل سخت ہو گیا، راہیں مسدود ہو گئیں تو تیرے عفو سے میں نے اپنی امید باندھی، میرے گناہ مجھے بڑے معلوم ہوتے تھے، لیکن جب میں نے اپنے رب کے عفو وکرم سے ان کا موازنہ کیا تو میرے رب کا کرم زیادہ نکلا، تو نے گناہوں سے ہمیشہ درگذر کیا اور تیرے احسان و انعام کی دولت ہمیشہ جاری رہتی ہے، (باقی)

---

[1] طبقات ابن ہدایۃ ص ۳ و سبکی ج ۱ ص ۱۵۶

مطبوعات جدیدہ

نقش دوام۔ مرتبہ مولانا انظر شاہ کشمیری، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت بہت عمدہ صفحات ۳۰۰ مجلد خوشنما دسٹ کور، قیمت تین روپیہ، ناشر شاہ بکڈپو دیوبند۔ یو۔پی۔

مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم پر اردو اور عربی میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، یہ نئی کتاب ان کے چھوٹے صاحبزادے مولانا انظر شاہ کشمیری استاذ دارالعلوم دیوبند کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے، گو وہ اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے، اس لیے ان کی واقفیت ذاتی کم سماعی زیادہ ہے تاہم انھوں نے صاحب سوانح کی سیرت وشخصیت کے خط وخال اور ان کے امتیازی اوصاف وکمالات کو نمایاں کرنے کی پوری کوشش کی ہے، پہلے شاہ صاحب کے وطن، خاندان، ولادت، تعلیم، وفات اور اولاد وغیرہ کا تذکرہ ہے، اس کے بعد ان کی سیرت واخلاق، جامعیت، علمی کمالات اور دینی خدمات کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں ان کی وسعت علم، دقت نظر، غیر معمولی حافظہ، درس وتدریس کی اہم خصوصیات، ردِّ قادیانیت کے ذکر کے ساتھ ان کے ذوق شعر وسخن، عربی، فارسی اور اردو کلام کے نمونے بھی دئے ہیں، اور ان کے معاصرین فضلاء کی رائیں بھی نقل کی ہیں، نیز تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، آخر میں ان کے تفردات وتحقیقات درج ہیں، جن سے تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام کے متعدد اہم مباحث کے متعلق ان کے افکار وخیالات کا علم ہوتا ہے، مصنف نے ان کی کئی مفید تحریروں کے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں، جیسے سنہ ۲۷ء میں پشاور میں ہونے والے جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس کا خطبۂ صدارت، دیوبند میں علامہ رشید رضا مصری کی

تشریف آوری کے وقت کا خطبہ اور مقدمہ بہاولپور میں رد قادیانیت کے متعلق بعض بیانات وغیرہ، جن لوگوں کا ذکر کسی تقریب سے کتاب میں آیا ہے، یا دار العلوم دیوبند یا خود شاہ صاحب سے کسی نوعیت کا تعلق رہا ہے، ان کے مختصر حالات بھی حواشی میں قلمبند کئے گئے ہیں، لیکن اکثر تذکرے سنین ولادت و وفات کے ذکر سے خالی ہیں، دار العلوم دیوبند کی اہمیت اور شاندار خدمات کے بیان میں شعوری یا غیر شعوری طور پر دوسری درسگاہوں اور مکاتب فکر کی تحقیر ہو گئی ہے، جمعیۃ اہلحدیث جماعت اسلامی اور ان کے اکابر کا ذکر بھی طعن و تشنیع کے ساتھ کیا گیا ہے جو نامناسب ہے، مولانا انور شاہ صاحب کی شخصیت علمی حیثیت سے بہت ممتاز تھی، اگر وہ دوسرے شعبوں میں اس قدر ممتاز نہ رہے ہوں تو اس سے ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی، مگر مصنف ان کو ہر حیثیت سے ممتاز اور عملی سیاست کا مرد میدان بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ خالص علمی آدمی تھے، مگر اپنے استاذ مولانا محمود الحسن اور دوسرے اکابر کی طرح قوم پرور تھے، ان کی تصنیف مشکلات القرآن کے تعارف کے شروع میں اس کو قلمی بتایا ہے، حالانکہ یہ چھپ گئی ہے آگے خود مصنف نے بھی لکھا ہے کہ دو بار شائع ہوئی ہے، ص[illegible] پر شاہ صاحب کی پیدائش کا سنہ ۱۲۹۰ھ اور ص[illegible] پر ۱۲۹۲ھ لکھا ہے، ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی وفات تیرھویں صدی میں ہوئی (ص۹۳) حالانکہ چودھویں صدی ہجری میں ہوئی، سیرت عمر بن عبد العزیز مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کی تصنیف ہے لیکن مصنف نے اس کو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصنیف بتایا ہے، (ص۲۹۴) مولانا ظفر احمد عثمانی بڑے ممتاز عالم تھے، دسمبر [illegible] میں ان کا انتقال ہوا، یہ خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی اور تمام اخباروں اور رسالوں میں چھپی مگر مصنف لکھتے ہیں "غالباً گذشتہ سال پاکستان میں داعی اجل کو لبیک کہا، (ص[illegible]) پتہ نہیں شک انتقال میں ہے، یا گذشتہ سال میں"

دونوں ہی صورتوں میں یہ بے خبری تعجب خیز ہے، مصنف کی تحریر میں شگفتگی ہے، لیکن بعض جگہ رنگین پیرایۂ بیان کی وجہ سے عبارت بے معنی یا غیر شگفتہ ہو گئی ہے، جیسے "اور جیسے علمی و ذہنی تشکیل میں صاحب سوانح کا فضل و کمال، اخلاص و للّٰہیت، خوبی صفات و حسن شمائل بڑے کارکن اور موثر تھے، (ص۲۲) حفظ و ذکا کا تابندہ ستارہ (ص۲) اصل میں تو صاحب سوانح کے متعلق ان کے اعترافات کو جمع کرنا تھا جن سے ان کے غیر معمولی تبحر اور جودت علمی کی تسلیمی لہراز ہند تا عرب پھیلی ہوئی ہے" (ص۲۹۳) "صبائے اجل نے گرد حیات سے دامن کو فارغ کیا" (ص۲۹) "تلمذ انہ نسبت رکھتے ہیں" (ص۲۹) وہ خود لکھتے ہیں کہ اب تحقیق کمال دقت پسندی میں نہیں بلکہ اہم اور دقیق مباحث کو بھی آسان اور سہل بنا دینا امتیاز ہے" (ص۲) مگر اس کے باوجود عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ اور جملوں کے استعمال سے پرہیز نہیں کیا ہے، مثلاً "ان تفاسیر کی قبولیت کا راز بذیل تفسیر احادیث کا انبار لگا دینا ہے" (ص۳۲۱) اس مسئلہ کے انفصال میں ضیق پیدا کر دی (ص۲۱۸) خراج بالضمان والی احادیث غیر متولدہ زیادتی کی صورت میں مفید ہو سکتی ہے، (ص۲۲۲) شفاہی ملاقات، (ص۳۰۲) آبی (ہچکچاہٹ کرنے والا) (ص) شبابی (ص۱۵) اخفائی، (ص۳۲) توصفات (ص۲۵) اطرا، مادح (ص۲۶۶) زوایا (ص۲۴) معسکر (ص۲۰۶) ادیم ارض (ص۳۰۱) خفی و خفی (ص۳) زلات (ص۳۰۲) تجمیل، ص۳۰۹، مشاغبہ، ص۳۳۹) متعدد الفاظ کی تذکیر و تانیث میں غلطیاں ہیں، جیسے وقار ص۲ تعارف ص۹۴ شغل ص۱۱۳ حکم ص۹۹ وضو ص۱۱ تعاقب ص۱۳۰ موصلوں، ص۱۲۰، اصرار ص۱۹۳، مشن ص۱۰۰، حصول ص۱۵۳ وغیرہ مذکر ہیں لیکن مصنف نے ان کو مونث لکھا ہے، اور دوپہر ص۲۲ تشکیل ص۲۳ جماعت ص۱۱۹، قوت ص۱۲۳ مومیت ص۱۳۵، زبانی ص۱۰۲، حد ص۱۱۰ تقریب ص۹۰ رسوائی ص۹، مادر علمی ص۹ قسم ص۱۹۳ صدارت

ص۱۶۶ اکثریت ص۲۰۰، برادری ص۲۰۲، تجارت ص۲۴۳، نظیر ص۲۸۱، تصنیفوں ص۲۴۳، جلا ص۲۹۳،
روشن ص۲۹۵ وغیرہ مونث ہیں لیکن ان کو مذکر لکھا ہے، موطا، مسند احمد اور ہدایہ کو بھی مذکر
لکھا گیا ہے، خصوصیات ص۱۵۵، علوم وفنون ص۱۵۰، اشعار ص۱۶۳، سوانح ص۲۵۴، عنوانات
ص۲۱۱، مشکلات ص۲۰۹، علل واسباب ص۳۰۳، تعوذات ونوادرات ص۴۳۵ وغیرہ جمع ہیں لیکن
مصنف کی تحریر میں واحد استعمال ہوئے ہیں، اور طبقہ ص۱۲۱ اور بیان ص۲۱۵ واحد ہیں، مگر
جمع استعمال کئے گئے ہیں، نوادرات، شروحات اور سندات وغیرہ بے تکلف لکھ گئے ہیں، قلع قمع،
طول طویل، عرف معروف اور حیص بیص وغیرہ بلا واو استعمال ہوتے ہیں، مگر مصنف نے
واؤ کے ساتھ استعمال کیا ہے، معطوف اور معطوف علیہ میں یکسانیت کا لحاظ نہیں کیا گیا،
ہے، جیسے محبت وسعادتوں ص۸، رد ابطا و تعلق ص۱۹ میں ایک مفرد اور دوسرا جمع ہے،
اسی طرح آفتاب وقمر میں ایک فارسی اور دوسرا عربی ہے، بعض جملوں میں الفاظ کی تقدیم
وتاخیر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، جیسے ایک سادات خاندان ص۳۹، دارالعلوم کے بعض
صدارت تدریس کے عہد (ص۱۶۶) بعض اس کی جزئیات (ص۲۲۲) مندرجہ ذیل جملوں میں
خط کشیدہ الفاظ زائد اور بلا ضرورت ہیں، جیسے ملاقات کے بعد میں فرمایا ص۲۳۳، صوفیاء سے
ایک غیر معمولی عقیدت تھی (ص۱۹۳) ایک جگہ لکھا ہے اشعار موضوع فرماتے ص۲۶۹، اشعار موزوں
کئے جاتے ہیں، شاہ صاحب نے اپنے پھوکے پھوکے انداز میں فرمایا ص۲۲۲ یہ علمی زبان نہیں ہے،
منھی جسیم نان بان بلکہ مرزا پھویا ص۲۹ نان بان کے بجائے دعان بان استعمال ہوتا ہے،
نذر قارئین کو ہر جگہ نظر قارئین، اور نقلی مکاتب کو نقلی مکاتیب لکھا ہے، شعاعوں کا املا شعاؤں
(ص۲۳۳) اور مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کو نظیر حسین ص۲۵ لکھا ہے، اس طرح کی غلطیاں
اور بھی ہیں، مصنف ایک مشاق اہل قلم ہیں، یہ بے احتیاطی کسی طرح انکے شایان شان نہیں،

جلد ۱۲۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

وفیات

شذرات

۹ر اور ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے جلسے بہت ہی خوشگوار فضا میں منعقد ہوئے، اس کے معزز ارکان نے اس کے علمی کاموں کا خاطر خواہ جائزہ لیا اور اس کی دیرینہ روایات کے مطابق اس کی آیندہ علمی سرگرمیوں کے لئے مفید اور حوصلہ افزا مشورے دیئے،

اس سال ان کے سامنے چار نئی مطبوعہ کتابیں غالب مدح و قدح کی روشنی میں جلد دوم، تذکرۃ المحدثین جلد دوم، مرزا مظہر جانجاناں، اور تبع تابعین جلد دوم پیش کی گئیں، خاکسار کی روداد پر ارکان نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی میں آیندہ پانچ سال میں حسب ذیل کتابوں کی ترتیب و تدوین کی منظوری دی،

(۱) اسلام کا نظریہ حکومت (۲-۳) تاریخ ہند جلد اول و دوم (۴) امیر خسرو بحیثیت صوفی (۵) عہد مغلیہ میں مذہبی رواداری (۶) سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں کا خلاصہ (۷) تذکرۃ المحدثین جلد سوم (۸) تذکرۃ الفقہاء (۹) فقہائے ہند (۱۰) مفکرین اسلام (۱۱) سیرۃ عائشہؓ کا عربی ترجمہ (۱۲) شیخ مصطفیٰ الزرقا کی المدخل الفقہی العام کا اردو ترجمہ،

"اسلام کا نظریہ حکومت" استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس نامکمل مسودہ پر مشتمل ہوگی جو سیرۃ النبی جلد ہفتم کے لئے تیار کیا جا رہا تھا، اب اس کا نام یہی ہوگا، کیونکہ سیرۃ النبی جلد ہفتم کے پورے مباحث مکمل نہیں ہو سکے، ہندوستان کے مسلمانوں کے دور حکومت کی تاریخ کو دو جلدوں میں اس طرح ترتیب دینے کا مشورہ دیا گیا ہے کہ اس میں ایسی معروضیت اور حقیقت پسندی ہو کہ یہ قارئین کے ذہن کی تشنگی کو دور کر سکے، بعض حلقوں میں یہ شکوک ظاہر کئے جا رہے ہیں، کہ حضرت امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے باضابطہ مرید تھے کہ نہیں، "امیر خسرو بحیثیت صوفی" میں اس مسئلہ پر مدلل بحث کر کے ان کا عارفانہ مقام دکھایا جائے گا، "عہد مغلیہ میں مذہبی رواداری" میں ان شکوک کا ازالہ کیا جائیگا، جو بعض مورخوں نے خواہ مخواہ پیدا کر دیئے ہیں،

سیرۃ النبی کی چند جلدوں کے خلاصہ کی طلب عرصہ سے کیجارہی تھی، اس کی اشاعت ہر لحاظ سے مفید ہوگی، تذکرۃ المحدثین جلد سوم میں ہندوستان کے محدثین کے حالات ہوں گے، تذکرۃ الفقہاء میں ایسے فقیہوں کا ذکر ہوگا جنہوں نے فقہی مسائل کے حل کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، فقہائے ہند میں ہندوستان میں فقہی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے گا، منکرین اسلام میں ان افکار و خیالات پر مباحث ہوں گے جن سے اسلامی ممالک کی مذہبی تحریکات متاثر ہوئیں، شیخ مصطفےٰ الزرقا کی کتاب کے ترجمہ کی ہدایت اور اس کی جلد از جلد اشاعت کی تاکید مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خاص طور پر کی ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور تصنیف سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ مولانا محمد ناظم ندوی نے کیا ہے، جو عربی زبان کے ممتاز ادیب سمجھے جاتے ہیں، اس کے عربی ترجمے سے اسلامی ممالک کے اہلِ علم بھی مستفید ہوں گے،

جلسہ کے بعد اس خاکسار کی گذارش پر جناب الحاج عبیدالرحمٰن خاں شروانی نے مزید چھ روز قیام کرنے کی زحمت گوارا کی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے خازن کی حیثیت سے اُن کی شہرت پورے ہندوستان میں ہے، انھوں نے مالیات کی اپنی دیدہ وری سے دارالمصنفین کے حساب کتاب کا بڑا تنقیدی جائزہ لیا، اس سے مطمئن ہوکر بہت سے مفید مشوروں سے نوازا، جس کے لئے ہم اُن کے بے حد ممنون ہوئے،

ان ہی دنوں علامہ شبلی نعمانیؒ میموریل لکچر کا ایک توسیعی خطبہ ڈاکٹر نذیر احمد ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں دیا، عنوان "مولانا شبلی اور فارسی زبان و ادب کی خدمت" تھا، ڈاکٹر صاحب موصوف فارسی زبان و ادب میں اپنی بالغ نظری کے لئے اس برصغیر سے باہر کے ممالک میں بھی مشہور ہیں، ان کا خطبہ ایک منتخب مجمع میں بہت ہی شوق اور توجہ سے سنا گیا، علامہ شبلی نے شعر العجم میں ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی، فارسی شاعری پر تفصیلی ریویو، قصیدہ گوئی، عشقیہ شاعری، غزل گوئی، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو ڈاکٹر صاحب نے فن تنقید نگاری کا ایک بلند پایہ نمونہ قرار دیا، اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ علامہ کی فارسی نظمیں ایران کے کسی بھی ممتاز شاعر کی نظموں کے

یادگار قرار دی جا سکتی ہیں، خطبہ طویل تھا، اس کا دلچسپ حصہ ایک گھنٹہ میں ختم ہوا، جس کے بعد مباحثہ میں یہ ظاہر کیا گیا کہ علامہ شبلی نے امیر خسرو، فیضی، نظیری، عرفی، کلیم اور صائب پر جو کچھ لکھ دیا ہے، اسی کے ایجاز کا اطناب موجودہ دور میں ہو رہا ہے، پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی تنقیدات شعر العجم بھی زیر بحث آئیں، آخر میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ بتایا کہ جناب محمود شیرانی مرحوم اپنی نجی صحبت میں علامہ شبلی کے علم و فضل کا ذکر احترام سے کرتے تھے،

روحِ اقبال اور اردو غزل کے مشہور مصنف ڈاکٹر یوسف حسین دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بہت ہی مخلص رکن ہیں، وہ اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اس کے جلسہ میں تو شریک نہیں ہوئے لیکن برابر اپنے مخلصانہ مشوروں سے مستفید فرماتے رہتے ہیں، انھوں نے اپنے ذاتی کتبخانہ سے کلام پاک کے دو بہت ہی قیمتی اور دیدہ زیب نسخے دارالمصنفین کو عطا کئے ہیں، ایک تو وہ نسخہ ہے جو شاہ ایران کی فرمائش پر چاپخانہ ملی ایران میں طبع ہوا، اور اس کا ایک نسخہ شاہ ایران نے ڈاکٹر صاحب کو نذر کیا تھا، دوسرا نسخہ وہ ہے جو اعلیٰ خطاطی کے ساتھ مصر میں چھپا، ان دونوں نسخوں سے دارالمصنفین کے ذخیروں میں بہت ہی مفید اضافہ ہو گیا ہے، ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے کچھ اور کتابیں بھی نذر کی ہیں، دارالمصنفین ان کی اس فراخدلانہ پیشکش پر اُن کا شکریہ ادا کرتا ہے،

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ ڈاکٹر عابد حسین کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی، وہ جامعہ ملیہ کے جاں نثار، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے رفیق قلبی، ایک بہت بڑے محب وطن، ایک قابلِ قدر فلسفی، اردو زبان کے ایک نامور ادیب، ایک ماہر مترجم، ایک بلند پایہ مصنف، ایک حق گو اہل قلم، اسلام اور عصر جدید، پھر انگریزی رسالہ موڈرن اسلام کے صاحبِ ایڈیٹر اور انسانی اخلاق کے بعض دلآویز اوصاف کے حامل کی حیثیت سے اپنے ہم وطنوں، معاصروں اور قدر دانوں میں برابر یاد کئے جائیں گے، دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں، معارف کی آئندہ اشاعت میں اُن کی خوبیوں پر ایک مفصل مضمون شائع ہوگا،

مقالات

اسلامی ریاست کی اولین بنیاد

نظریۂ خلافت

از مولانا سید سلیمان ندویؒ

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں، اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ ان الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اس کی اپنی طرز حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی اس طرز حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں بلکہ وہ اس حکومت اور فرمانروائی میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت اور قائم مقامی کرتا ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے مختلف ہیں، تورات میں یہ بیان صرف آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں انسان کا مکلّف ہونا،

اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اسی قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض اور احکام الٰہی کی بجاآوری کی صورت اور مخلوقات الٰہی کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے دینیات کے اساسی عقائد ہیں، اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہے[1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ادا ہوا ہے،

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں
جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً	سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ
(بقرہ-۴)	بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اسی لئے دوسرے موقعوں پر صرف آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم اس شرف سے مخاطب ہیں، چنانچہ فرمایا،

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰ	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو
هُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰ	عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری
هُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰ	میں ہم اٹھائے پھرے اور ان کو پاک چیزیں
هُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا	روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتری
تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل-۷)	مخلوقات پر بزرگی دی،

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خیالات ادھر رجوع ہوئے، خاکسار نے سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اسکی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے،

اور اسی لیے آدمؑ بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا ہے،

اِھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا فَاِمَّا	تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ اب اگر تم
یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ	لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی
تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ	پیغمبر اور رہنمائی آئے تو جو میری رہنمائی
وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ ۴)	کی پیروی کریں گے تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا
	اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشادِ الٰہی ہے۔

وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ	اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور
وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ	اس میں تمھارے زندگی بسر کرنے کے معاشی
قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ۔ وَلَقَدْ	طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان
خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ	کی قدر کرتے ہو، اور ہم نے تم کو وجود
ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا	بخشا، پھر تمھاری صورتیں بنائیں، پھر
لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ	فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ
لَمْ یَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ،	کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس
(اعراف ۲)	نے کہ وہ سجدہ کرنیوالوں میں نہ تھا،

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو سرفرازی ملی ذاتی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصّہ میں آئی، اس لئے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوعِ آدم کو نصیب ہوئی سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے،

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ	اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم
فِي الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ	(انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا
فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَ	اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے
كُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ	پر درجہ بڑھایا، تاکہ تمکو جو دیا اس میں
سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ	تمکو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد
لَغَفُورٌ رَحِيمٌ (انعام ۲۰)	سزا دینے والا ہے، اور وہ بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے

یہاں پہونچکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے، قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت کی جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح کی قوم کا جانشین، فرمایا۔

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ	اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوح کے
مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (اعراف ۹)	بعد جانشینی بخشی،

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا۔

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ	اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد
مِنْ بَعْدِ عَادٍ (اعراف ۱۰)	نیابت بخشی،

حضرت ہود اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ	تو میرا رب تمھارے علاوہ کسی اور
(ھود - ۵)	قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہے،

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ	اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائیگا۔

مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ (انعام-۱۶)

اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے، جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور-۷)

اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی،

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا،

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ۔ (انعام-۱۹)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنائے۔

سورہ یونس میں تصریح ہے،

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو جب انھوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے

بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (یونس-۲)

بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ (یونس-۸۰)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوحؑ) کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو (طوفان سے) بچا لیا اور انھیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ (۳)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں پہلوں کا جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے،

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص-۱۰)

اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

اس لفظ خلیفہ کا اشتقاق خَلْفٌ سے ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب ہو یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں اس کی طرف سے اس کے پیچھے میں جو کوئی نمایندہ ہو

جو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے، قرآن پاک میں ہے،

۱۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ　　تو ان کے بعد ان کے جانشین

(اعراف - ۲۱ و مریم ۷)　　آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا۔

۲۔ وَاخْلُفْنِي فِي قَوْمِي (اعراف ۱۶)　　میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو

۳۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً　　اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو

فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ (زخرف)　　بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

ان آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے دوسروں نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا، اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے،

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں،

الخلافة النيابة عن　　خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے

الغير اما لغيبة المنوب　　کے ہیں، اب یہ نیابت اصل کی عدم

عنه واما لموته واما لعجزه　　موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی

واما التشریف المستخلف موت کی سبب سے ہو یا اس کے اپنے
(ص ۱۵۵ مصر) منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے
جو یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کیلئے ہو

پھر متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں، ا
یہی معنی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زاد
صاحب روح المعانی تک ہر موقع پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنوں کے مختلف قول
لکھتے ہیں، اور کوئی ایسی فیصلہ کن بات نہیں کی ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں
کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ روزمرہ کا عام محاورہ یہی ہے کہ
جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو وہی فلاں کا جانشین ہو اور قائم مقام
ہو گا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قائم
مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح
ہے، اسی کی جانشینی مراد ہو گی، اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ
کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہو گی جیسے قرآن پاک میں ایک جگہ آیت ہے،

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ - (حدید ۱) اور خرچ کر و اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے،

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لئے مفسرین دونوں طرف
گئے ہیں، ایک نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا جیسے باپ کے بعد بیٹا
نائب ہوتا ہے، دوسرے نے یہ کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جیسے
حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے، اس کو امانۃً اپنا نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے

اموال خیر ہیں اس کو صرف کرنے میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے، کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے، کشاف میں ہے یعنی، ان الاموال التی فی ایدیکم انما ھی اموال اللہ بخلقہ وانشاءہ لھا وانما مولکم ایاھا وخولکم الاستمتاع بھا وجعلکم خلفاء فی التصرف فیھا، بیضاوی میں ہے، من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیھا۔

روح المعانی میں ہے۔

جعلکم سبحانہ خلفاء عنہ	اللہ تعالےٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس
عز وجل فی التصرف فیہ	(مال) کے تصرف میں جانشین بنایا
من غیران تملکوہ حقیقۃ	ہے نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں،

اب ہم اس اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب میں سرعنوان ہے یعنی

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ	اور جب تیرے رب نے فرشتوں
لِلْمَلَٰئِكَةِ إِنِّي	سے کہا کہ میں زمین میں ایک
جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ	خلیفہ بنانے والا ہوں
خَلِيفَةً۔ (بقرہ-۴)	

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے انہیں سابقہ دونوں معنوں کو تعمیم کے ساتھ کچھ بعد دیگرے

لکھ دیا ہے، اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، طبری میں بھی یہ دونوں قول ہیں ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرے یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کا حوالہ دیکر لکھا ہے،

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً	میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ
مِنِّي يَخْلُفُنِي فِي الْحُكْمِ بَيْنَ	بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا،
خَلْقِي.	میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا ایک مطلب یہ بیان کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہ تعالیٰ اخبر الملٰئکۃ	اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے
اَنَّہٗ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيفَةً	کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے
لَہٗ یَحْکُمُ فِیْھَا بَیْنَ خَلْقِہٖ	جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات
بِحُکْمِہٖ (ص ۱۲۴ مصر)	میں فیصلہ یا حکومت کریگا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے،

والمراد بہ آدم علیہ السلام	اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں،
لانہ کان خلیفۃ اللہ تعالےٰ	کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالےٰ
فی ارضہ وکذالک کل نبی	کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے
استخلفھم فی عمارۃ	ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی
الارض وسیاسۃ الناس	اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی
وتکمیل نفوسھم وتنفیذ	تکمیل اور اللہ تعالےٰ کے احکام نافذ

امر فیہم لاحاجۃ بہ	کرنے میں اللہ تعالٰے اس کا محتاج
تعالٰے الیٰ من ینوب بقبل المقصو	نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس
قبضہ وتلقی امرہ بغیرہ	وجہ سے کہ اللہ تعالٰی کے احکام کی تلقی
بغیر وسط	کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی

لیکن قرآن پاک کی دوسری آیتوں سے جو ابھی اوپر گذر چکیں اور جن میں اللہ تعالٰے نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان انبیاء کے توسط سے اس خلافت الٰہی کی سند انبیا علیہم السّلام کے متبوعین بلکہ کو عطا ہوئی ہے، اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں،

اس آیت خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہو رہی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں،

۱- تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو بھی لکھا ہے،

۲- روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالٰے ایک مخلوق کے بعد . . . دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش اور نیابت اور فرشتوں کے سجدہ اور جنت کے داخلہ اور پھر اس کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیا قائم کرنے وغیرہ کے فضائل وخصائص سے ان میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی تھی،

۳- اوپر مکمل تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھکر جو اصول معہد کیا گیا ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ اصول کلام یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی .س میں اسی مذکور کی

نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا، وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق وسباق سے مفہوم ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہو جائیگا،

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جن سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا،

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل ۔۷)	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں اٹھائے پھرے، اور ان کو پاک چیزیں روزی دیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (تین ۔ ۱)	ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر فضائے آسمانی سے زمین تک جو کچھ ہے اس کے لئے بنا ہے اور اس کے کام میں لگا ہے

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ	اپنی طرف سے مسخر بنا یا بیشک اس میں
یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (جاثیہ ۲)	ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور انسانوں کے لئے اُنکا بنایا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لیے چند آیتیں یہاں بھی لکھی جاتی ہیں،

خلق لکم ما فی الارض جمیعًا (بقرہ ۳)	اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا،
وھو الذی سخر البحر (نحل ۲-۱)	اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمھارے) اختیار میں کیا
اللہ الذی سخر لکم البحر (جاثیہ ۱)	اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو ... بجوم کر دیا
وسخر لکم الفلک (ابراھیم ۵)	اور کشتیوں (اور جہازوں) کو تمھارے زیر فرمان کر دیا
وسخر لکم الانھار (ابراھیم ۵)	اور نہروں کو بھی تمھارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے اور اس کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے، اور یہی خلافت الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے،

اِنَّا عَرَضْنَا الامانۃ علی السمٰوٰت	ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین
والارض والجبال فابین	اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اسکے
ان یحملنھا واشفقن منھا	اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے
وحملھا الانسان انہ کان	اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک
ظلومًا جھولًا (احزاب ۹)	وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت الٰہی کے بار کا اٹھانیوالا انسان ہی ہے، یہ امانت الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے،

نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے، اس کا علم و فضل و کمال اور دوسرے کمالات علمی و عملی اور محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں، اور اسی کے خزانے سے چند روز کے لئے عاریت ملے ہوئے ہیں، یہ حدیث کہ فان اللہ خلق آدم علی صورتہ (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول تخلقوا باخلاق اللہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے،

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جو انسانیت کے تخیل کو بلند سے بلند نقطہ تک پہونچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی خالص سیاسی اور اخلاقی بنیادی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں،

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے، وما خلقتُ الجنَّ والانس الا لیعبدونِ (میں نے انسان اور جن کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس گماشتہ کی ہے جس کا فرض اپنے نہیں صرف مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعت الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ اپنی نہیں بلکہ صرف مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

مرزا احسان احمد کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جناب مرزا احسان احمد کی وفات کو کچھ سال گذر گئے، ان کی وفات ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ہوئی مگر وہ یاد آتے ہیں، اور اکثر یاد آتے ہیں، دارالمصنفین کے قـــد ر دا ں، مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ کے معزز رکن کی حیثیت سے برابر یاد آئیں گے، اپنی رکنیت سے پہلے بھی ہر موقع پر اس سے اپنی محبت، یگانگت اور موافقت کا ثبوت دیتے رہے، اسی جذبہ کی وجہ سے وہ یہاں تقریباً ۵۰ سال تک برابر آتے رہے، اس کے پھاٹک میں داخل ہوتے تو اپنی شیروانی اور اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی پہنے اور ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے نمودار ہوتے، ۵۰ سال تک ایک ہی رفتار میں دیکھے گئے، جس میں سنجیدگی بھی ہوتی، اور وقار بھی پھاٹک میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف مڑکر مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے دفتر میں پہونچ جاتے تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے کمرے میں چلے آتے، وہاں سے ہٹ کر دارالمصنفین کے رفقائے ان کے علاوہ علحدہ کمروں میں جاکر ملتے اس طرح سب سے مل ملا کر خراماں خراماں رخصت ہوجاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ اپنی محبت اور محبلنساہت کی خوشبو دارالمصنفین کی فضا میں چھڑک کر، اور خود معطر ہوکر چلے گئے، وہ زیادہ گفتگو کرنے کے

عادی نہ تھے، بولتے کم اور رہتے زیادہ، کسی بات سے خوش ہو جاتے تو ایک خاص قسم کی ہنسی ہنستے، دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا کہ یہ ہنسی ان کی آنکھوں میں بھی منتقل ہو گئی ہے، جس سے ان کے چہرے پر رونق آجاتی، وہ بولتے کم تھے، اس لئے غیبت، دل آزاری اور دل شکنی کی باتیں ان کی زبان سے نہیں نکلتیں، نصف صدی سے زیادہ دارالمصنفین والوں سے ان کے تعلقات رہے، لیکن ان میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کسی موقع پر بھی کوئی ایسی بات کہی جو انکو نہ کہنا چاہئے تھی، انھوں نے جگر کی وفات پر ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "انھوں نے آئینۂ حیات کو بغض وعناد، رشک وحسد، غرور وتمکنت سے کبھی غبار آلود ہونے نہیں دیا، وہ کسی انسان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ نہیں سکتے تھے" یہی بات ان کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے، جس کی تردید نہیں ہو سکتی ہے۔

وہ اعظم گڈھ کے ممتاز اور مشہور وکیل تھے، لیکن ان کی وکالت میں بڑی وضعداری اور خودداری تھی، رات کے وقت موکل سے نہیں ملتے، کچہری جانے سے پہلے موکلوں کے کاغذات دیکھ لیتے، پھر عدالت کے قضیے کو عدالت کے کمرہ ہی میں چکا کر بے نیاز ہو جاتے، گھر آتے تو بھی کچہری کا کوئی ذکر ہی نہیں آنے دیتے، انھوں نے اپنی قابل قدر خودداری اور وضعداری سے اس پیشہ بلکہ اپنی زندگی کے مطمح نظر کو سود وزیاں سے بالاتر رکھا تھا، خود کہہ گئے ہیں،

جس کو ہو ہر گام پر اندیشۂ سود وزیاں ایسی عقل مصلحت بیں کو تو احساں پھونک دے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں۔

تیری خودداری پہ قربان دولتِ ارض وسما یہ رہے قائم تو پھر کیا تجھ کو احساں چاہئے

بڑے اچھے شاعر، بڑے اچھے نثر نگار اور بڑے اچھے نقاد تھے، ان تینوں فن میں ان کا شمار اصحاب کمال میں کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ خود کبھی اپنے فن کی مہارت کے دعویدار

ـتے اور نہ توقع رکھی کہ وہ ادبی اور علمی مقام ملنا چاہئے، جس کے وہ واقعی مستحق ہیں
ں اصرار اور تقاضا کے بعد کسی کو اپنا کلام سناتے، جوانی میں کچھ دنوں اپنے گھر پہ
شاعروں کو جمع کر کے طرحی مشاعرے سے لطف اٹھاتے رہے، لیکن بعد میں مشاعرے
یف ہوکر اپنے ذہنی سکون اور جسمانی راحت میں خلل ڈالنا پسند نہ کرتے، اعظم گڈھ
کی زندگی میں بڑے بڑے مشاعرے ہوئے، ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر
ہو جو یہاں کے مشاعرے میں نہ آیا ہو، لیکن وہ مشاعرے کی رونق ہونے کے بجائے
رکے کوٹھے کے ایک سادہ کمرہ میں جو عہد سلف کی یاد تازہ کرتا تھا، چارپائی پر بیٹھے
خاموشی سے اپنے ذہن میں شعر و ادب کی محفل سجائے رہتے، جب اصغرؔ، جگرؔ، روشؔ
، اور فراقؔ گورکھپوری جیسے شعرا خود ان کے پاس آکر اپنا کلام سناتے تو ان
کمال کو غیر شعوری طور پر محسوس ہوتا کہ وہ فن کمال، نظر، فکر اور بصیرت سے
ہیں، وہ خاموشی سے سب کا کلام سنتے اور روایتی طور پر نہیں دیتے، کسی شعر کو
خوش ہوتے تو ان کا چہرہ خوشی کی تمکنت، وقار اور نشاط سے اس طرح روشن
کہ کلام سنانے والے اسی کو اپنے کلام کی داد کا بڑا قیمتی سرمایہ سمجھ کر مخمور ہو جاتے،
ستان صاحب بھی اس کیفیت سے متاثر ہوکر اپنی زبان سے صرف یہ کہہ اٹھتے
ب، پھر تو پڑھئے، اتنی ہی مختصر داد پانے کے لیے باکمال شعرا ان کے برآمدے
ہوتے، اور خوش خوش واپس جاتے، جب خود ان سے ان کے کلام کی فرمائش
ی، تو بڑی مشکل سے سنانے پر راضی ہوتے، پہلے تحت اللفظ سناتے رہے، لیکن
ترنم سے سنانے لگے تھے، جس میں ان کا اپنا انداز تھا،

وہ زیادہ تر غزلیں کہتے جن میں ماتم سرایانِ لکھنؤ کی طرح نہ جنازہ بردوش

دکھائی دیتا ہے۔ نہ جلوہ فروشانِ لب بام کی عشوہ و ادا کا دام بچھا نظر آتا ہے، نہ لفظی بازیگری اور شعبدہ بازی ہے، بلکہ ان میں تغزل کے موضوعات حسن و عشق کی لطافت اور معانی بلندی ہے جس کا احساس اُن کو خود بھی رہا کرتے ہیں،

ہوں وہ حقیقت آشنا جس کی نگاہِ شوق میں　　حسن کی ہر ادا لطیف، عشق کی ہر ادا بلند

وہ غزل کو ہمیشہ حسن سمجھتے رہے، اسی لئے ان کے یہاں جلوہ گاہ بام، رقیب، عدو، ہجر و وصل کا نشان نہیں ملتا، ان کی غزل کی زبان ہجر کے شکووں سے آلودہ نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ہمیشہ صدائے آفریں سی نکلتی رہی، آئندہ جب کبھی ان کی غزل سرائی کا صحیح تجزیہ کیا جائیگا تو اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں حسن و عشق کا ایک بلند اور اعلیٰ تخیل ہے، وہ عشق کو بقائے سرور اور انوار روحانی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، ان کے یہاں عشق قلب انسانی کی ایک لطیف پُرسوز کیفیت ہے جو کبھی آنکھوں کو پُرنم ضرور بنا دیتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ روح میں اتنی استعداد پیدا کر دیتی ہے کہ زبان آہ و شیون سے آلودہ نہیں ہونے پاتی ہے، بلکہ چہرہ پر انتہائی اضطراب کے عالم میں بھی ایک لطیف موجِ تبسم رقص کرتی رہتی ہے، ان کے یہاں اشک غم کی موجوں میں حسن زندگی تابانیوں کا منظر دکھائی دیتا ہے، ان کے نزدیک عشق کوئی ایسی چیز نہیں جو ہجر، شبِ غم کی درازی، آہ و بکا، چاک دامنی، کوچہ گردی اور دار و رسن اور رہائی کی روشنی میں دیکھی جائے، بلکہ یہ مرض کے بجائے تمام روحانی علتوں کا علاج ہے، اس کو اپنے زخم جگر کے لئے مرہم کی ضرورت نہیں بلکہ یہ خود قلب و روح کی سیرابی اور تازگی کا سامان ہے، اسی طرح ان کے یہاں حسن کا تخیل بھی بڑا باعظمت اور پاکیزہ ہے، وہ قدرت کو جمال روحانی کا نظارہ گاہ، چہرۂ رنگیں کو صبح زندگی کا گہوارۂ انوار، اور نگاہ ناز کے ہر اشارہ کو ساز لاہوتی کا ایک نغمۂ بے صدا سمجھتے تھے، ان ہی پاکیزہ خیالات کے ساتھ وہ

غزلیں کہتے رہے، کچھ مثالوں سے آپ بھی لطف اٹھائیں۔

ہوش بھی آئے جھوم کر تیرے کنارِ شوق میں
مستیِ عشق میں ذرا دستِ طلب بڑھائے جا

بن کے شرارِ شوق بن کر پھونک دے ساری فضا
شیوۂ تمکیں طریقِ عشق میں زیبا نہیں

حریمِ حسن کا ہر ذرہ جگمگا اٹھے
مذاقِ عشق میں وہ آب و تاب پیدا کر

ماشاءاللہ! عشق کی یہ دولتِ افتادگی
دستِ خاک آلود میں شمس و قمر رکھتا ہوں میں

ہاں دکھا دے اے دلِ غمگیں وہ داغِ آتشیں
جگمگا اٹھے حریمِ حسنِ جاناں ذرا

فیضِ سوزِ عشق سے بن جا تجلی گاہ خود
یہ مذاقِ سیرِ گلگشتِ گلستاں پھونک دے

شعلۂ دل بن کے ہو برقِ ستم کو پھونک دے
موجِ شرارِ شوق اٹھ! وادیِ غم کو پھونک دے

یہ دردِ عشق ہے رہنے دے اس کو چارہ گر یونہی
کہ اس کی ہر تڑپ تسکینِ جاں معلوم ہوتی ہے

اللہ اللہ یہ جمالِ یار کی تابانیاں
عقل و جاں سب محو ہیں کچھ بھی نظر آتا نہیں

لیے ہوئے تجلیاں نظر ہے حسنِ یار کی
نہ کچھ خزاں کا خوف اب نہ فکر کچھ بہار کی

نظر نے گرائیں بجلیاں آئیں نظر تجلیاں
دیدہ و دل چمک اٹھے دیکھ رہا ہوں حسنِ یار

روئے جاناں جس کو کہتے ہیں وہ دل کا نور ہے
دیکھئے اور اس سے حاصل ذوقِ ایماں کیجئے

نگاہِ ناز کا ہو اک اشارۂ پنہاں
مرا مذاقِ محبت ذرا نکھر جائے

پھونک دے اے جمالِ یار خرمنِ آرزو مرا
اپنا مجھے دکھا مگر جلوۂ کیفِ مستقل

یہ وہ اشعار ہیں جو حسن و عشق کے صحیفۂ زبور اور کتاب توریت میں مقدس آیتیں ہو سکتی ہیں، ناممکن ہے کہ ان کو پڑھتے وقت آپ کے دل کے اندر تپش اور آپ کے احساس میں گرمی نہ پیدا ہو۔ اور آپ غزل گو کے تخیل کی طہارت کے قائل نہ ہوں، ان کے یہاں اقبال ہی کی طرح عقل و عشق کی کشمکش پائی جاتی ہے، اور اقبال ہی کی

طرح وہ عشق کو فاتح اور کامراں دکھاتے ہیں۔

اہلِ جنوں کے واسطے بس ہے یہ رازِ عشق
فرزانہ جو بنے وہ کہیں کے نہیں رہے

نکلا جنونِ عشق ہی رازِ حیاتِ قدس
گو لاکھ اہلِ ہوش و خرد نکتہ چیں رہے

آشنا اس راز سے کچھ ہیں تو بس اہلِ جنوں
مصلحت اندیش ہو محرومِ کیفِ زندگی

رائگاں سعی نظرہائے سود فکرِ عقل و ہوش
کار فرما گر محبت کی نہ ہو شوریدگی

جو ہلا دیتا ہے بامِ عرش کے بھی کنگرے
عشق کی فطرت میں ہے وہ مستی و آشفتگی

خرد کے سامنے اک اک قدم پہ مشکل ہے
جنوں کے واسطے کچھ بھی مگر محال نہیں

جلوۂ رازِ کائنات آئے گا ایک دن نظر
آتشِ شوق سے مگر قلب و جگر جلائے جا

نظر جب انبساطِ عشق سے سرشار ہوتی ہے
تو بڑھ کر فرشِ گل سے وادیٔ پرخار ہوتی ہے

وہ اچھے نظم گو بھی تھے، لیکن اس فن میں دادِ سخن اسی وقت دیتے جب ان کا وجدانی ذوق خود ابھر آتا، ایک موقع پر خاک حجاز پر نظم کہنے لگے تو ایک خاص قسم کا کیف و سرور میں کہتے چلے گئے، اس کو انبساطِ سرمدی کی ایک بہشت قرار دے کر اس کو شبستانِ معانی کی بہار، جلوۂ سینائی، روح الامین آتش طرب، ارباب نیاز، شعلہ اندوز حیات جاوداں وغیرہ بتایا، لیکن ان کا قلم رکا تو پھر ان پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوئی، اسی لیے ناکمل رہ گئی، انھوں نے حضرت امام حسینؓ کو بھی ہدیۂ اخلاص بھی پیش کیا ہے، ایک زمانہ میں ہندوستان میں ترکی کے نجات دہندہ مصطفےٰ کمال پاشا اور ریف کی آزادی کے مجاہد غازی امیر عبدالکریم کو بڑی مقبولیت رہی، ان کے متعلق بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا، ہندوستان کے مسلم رہنماؤں میں وہ مولانا محمد علیؒ سے بہت متاثر تھے، ان کی زندگی ہی میں ان پر ایک لمبی نظم کہی، جس کے ۲ شعر یہ ہیں۔

ہے مایۂ کیفِ روح تیرا — توحیدِ خلیل کا ترانہ
پھر یاد دلا دیا ہے تونے — سلمانؓ و صہیبؓ کا فسانہ

اور جب مولانا محمد علی کی وفات ہوئی تو باوجود کانگریسی ہونے کے بے اختیار کہہ اٹھے

ذات تھی تیری مدارِ قوتِ اسلامیاں — تو ہجومِ کفر میں تھا نورِ حق کا پاسباں

اور پھر ایک طویل مرثیہ میں مولانا مرحوم کے تمام محاسن کو بڑی خوبی سے احاطہ کیا وہ جو کچھ بات مولانا کی ایک ضخیم سوانح عمری میں لکھی جا سکتی تھی، انھوں نے اپنے اس مرثیہ میں قلم بند کردی ہے، آخر میں ان کے متعلق کہتے ہیں۔

تو علم بردار تھا توحیدِ ابراہیم کا — مستحق ہے تو یقیناً کوثر و تسنیم کا

اور جب کبھی اردو ادب میں مشاہیر پر اچھے قسم کے مراثی کی تلاش ہوگی تو اس مرثیہ کو اس فہرست میں شامل کرنا ناگزیر ہوگا۔

اصغر مرحوم سے ان کو بڑی محبت اور شیفتگی تھی، جب ان کی وفات ہوئی تو وہ بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کا قلم شدتِ احساس کا مقابلہ نہ کرسکا، پھر بھی بے تابی کے عالم میں اس کی ابتدا اس طرح کی،

مضطرب کچھ اس طرح احساسِ غم سے دل ہے آج — ضبط کرنا نالہ و فریاد کا مشکل ہے آج
ٹیس کچھ ایسی لگی ہے ہر بنِ مو وقفِ آہ — آنسوؤں کا روکنا اک سعیِ لاحاصل ہے آج
روح کو جس سے تعلق، دل کو جس سے ربط تھا — میری نظروں میں یہ دنیا تیرہ و باطل ہے آج

پھر ان کو اس مرثیہ میں لذت شناسِ ذوقِ عرفاں، نغمہ سرائے گلشنِ جاں، واقفِ اسرارِ پنہاں وغیرہ کہہ کر آخر میں کہتے ہیں۔

.. جو کہ تھا، اک امامِ گرمیٔ بزمِ ہری — حلقۂ اہلِ سخن سے وہ غزل خواں اٹھ گیا

شعر و ادب کی تاریخ میں یہ بات جلی حروف سے لکھی جائے گی کہ انھوں نے اپنے قلم سے اصغرؔ کی شاعری کی روح کو نشاط، اور ان کی غزل سرائی کے نغمہ و سرود کو زندگی عطا کی، اسی طرح داغِ جگرؔ کو اردو شاعری کا داغ لالہ بنا دیا، اور ان کی شاعری کے طور کو شعلہ بخشا، اسی طرح ولؔی شاہجہانپوری، یحیؔی اعظمی اور عارف عباسی کے کلام کو ان کے سفینوں سے نکال کر ارباب ذوق کے سینوں تک پہونچایا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہوگی کہ خود ان کے فکر و فن کو روشن کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، خلاص کو ہم اپنے نقادوں کی ناقابل معافی غفلت پر محمول کریں یا یہ کہ ہمارے نقادوں کی تنقید نگاری کا مرغ باد نما اپنے آشیانے میں تڑپ کر رہ گیا اور مرزا صاحب کے شاعرانہ تخیل کے سدرہ تک نہ پہونچ سکا۔

ان کی نثر نگاری کے کمالات ان کے مضامین کے مجموعہ مقالات احساؔن میں دیکھے جا سکتے ہیں جس میں اُن کے بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین ہیں، اُن کو پڑھ کر ارباب ذوق نے اُن کے ادبی ذوق کی بلندی کی داد دی ہے، اور اُن کی تر و تازگی میں بہت کچھ مولانا شبلی کا رنگ جھلکتا ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ شاعر اچھے تھے یا نثر نگار، وہ خود لکھتے ہیں کہ "بہ نسبت شاعری کے میری طبیعت کا رجحان زیادہ تر نثر نگاری کی طرف رہا ہے" اور اپنے فطری عجز و انکسار کے باوجود بھی کہہ گئے ہیں،

خاکِ اعظم گدا ہوں لیکن ہے جن کو ادّعا
آکے دیکھیں یہ مرا رنگِ ادیبانہ ذرا

لیکن ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے ہیں،

پوچھتا ہے مجھ سے کیا احساؔن کا رنگِ مزاج
تو نے کیا اشعار میں اُس کو کہیں دیکھا نہیں

یعنی وہ اپنے اصلی رنگ میں اپنے اشعار ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں، مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کو ان کے ادیبانہ رنگ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی انشاء پردازی کا تجزیہ خود ہی یہ لکھ کر کر دیا ہے کہ "میرے نزدیک اردو انشاء پردازی کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ علامہ شبلی مرحوم کا طرز تحریر ہے، میں نے اپنے مضامین میں اسی انداز انشاء کی تقلید کی ہے، اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔" ان کا یہ لکھنا بہت صحیح تھا۔ مولانا شبلی کی انشاء پردازی کی خصوصیات مختصر طریقہ پر اس طرح ادا کی جا سکتی ہیں کہ کبھی یہ بڑی باعظمت، باوقار، باسطوت ہوتی ہے، کبھی بہت ہی حسین و رنگین اور شیریں، کبھی بہت فصیح اور بلیغ، اور کبھی ذہن کو مرعوب اور تسخیر کرنے والی ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کی نثر نگاری مولانا شبلی کا مکمل نمونہ تو نہیں، لیکن وہ جب کبھی نثر میں کوئی مضمون لکھنے بیٹھتے تو مولانا کے باوقار، پرشکوہ فقرے، اور دل پذیر نثری شہ پارے ان کی ذہنی نظروں کے سامنے تیرتے نظر آتے، اور پھر وہ غیر شعوری طور پر ان کو اپنی تحریروں میں اس طرح لکھ جاتے کہ ان کے مضمون کے بعض ٹکڑے مولانا شبلی ہی کے معلوم ہوتے ہیں، اور پھر اپنی رائے کا اظہار بھی مولانا شبلی کی طرح کچھ ایسے بلیغ پیرایہ میں کرتے کہ ان کے ناظرین کا ذہن اس کو تسلیم کرنے میں زیادہ نہ ہچکچاتا، ان کی باوقار و باعظمت تحریر کا لطف ان کے مضمون "بادہ سہیل" سے کیا جا سکتا ہے، اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس انداز کی پُر از وقار ادیبانہ اور ناقدانہ تحریر لکھنے والا اس دور میں ملک میں شاید ہی کوئی ملے، ان کی جاندار اور شاندار تحریروں کے نمونے، فانی اور جگر کی شاعری پر تبصرے میں بھی مل سکتے ہیں، اُن کے یہاں رشحۂ انوار

جلوۂ جاں نواز، جمال سرمدی، فیضان لالۂ زار طور، لطافت سنبل و ریحان جبین نظم اور حریر قلب جیسی ترکیبوں اور نسیم مغفرت کے جھونکے، تسنیم و کوثر کی موجیں، وادی ایمن کی شرر باریاں، ایوان باطل کے بام و در، اسرار و حکم کے انمول موتی، دریائے کرم کی گہر ریز موجیں، زندہ روح کی آتش فشانیاں، برق سر طور کی شرر افشانیاں، فتنہ گران سوام کی عشوہ طرازیاں وغیرہ۔ جیسے فقروں میں مولانا شبلی کی تحریروں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

کچھ ان کی انشا پردازانہ تحریر کے اقتباسات سے بھی لطف اٹھا کر یہ فیصلہ کریں کہ مولانا شبلی کی روح ان کو کس طرح گھیرے رہتی تھی، اقبال سہیل نے اپنی ایک نظم میں مسلمانوں کی اسلامی غیرت کو اس طرح ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

فدیۂ جاں پیش کر اے پیرو دین حنیف	ذوق قربانی ہے پہلا امتحان زندگی
استقامت کا سبق لے اسوۂ صدیقؓ سے	پھر زمانے کو سنادے داستان زندگی
ہاں جنون شوق اٹھ پھر کے فاروقی علم	پھر دکھادے دیدۂ عالم کو شان زندگی
خرمن باطل کو خاکستر بنا کر چھوڑ دے	ہر نفس تیرا ہو اک برق تپان زندگی

ان اشعار کو مرزا صاحب نے اپنے قلم کے رشحۂ انوار سے یہ لکھ کر اور بھی منور کر دیا ہے۔

"مبارک ہے وہ دل جو ان پاکیزہ جذبات کا حامل ہو، آفریں ہے اس زبان پر جو اسوۂ صدیق و فاروق کی پیروی کی دعوت دے کہ بغیر اس پر عمل کئے ہوئے تہذیب مغرب کے پرفریب منظر کا تسلط ہماری نگاہوں سے زائل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہم کو وہ اخلاقی و روحانی قوت نصیب ہو سکتی ہے جس کے بل پر کبھی کچھ بے سر و سامان صحرا نشینوں نے اٹھ کر قیصر و کسریٰ کے شاہانہ غرور و تمکنت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ مسلمان اگر اب بھی اسلام کے جادۂ حق

پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر ان کے قلب و جگر کو ذلت و رسوائی کی ٹھوکروں سے ملول نہ ہونا چاہئے۔ وہ قطعی طور پر سمجھ لیں کہ ان کا ظلمت کدۂ حیات صرف اسی آفتاب ہدایت کے فیضانِ تجلی سے منور ہو سکتا ہے، جو ماہ و دتابانیوں کے ساتھ حجاز کے صحرائے ویران سے طلوع ہو کر جلوہ آرائے کائنات ہوا تھا، طلب صادق ہو تو آج بھی اس کی ضوفشانیاں آمادۂ کرم ہیں، خوف ماسوا دلوں سے دور ہو تو آج بھی ہمارا نعرۂ توحید قصر باطل کے کنگروں کو ہلا سکتا ہے، اور پھر کسی فتنۂ روزگار کو ہم سے الجھنے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔"

اور جب اقبال سہیل کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہیں، تو اپنے قلم کے جلوۂ جاں نواز کا رنگ بدل کر لکھتے ہیں۔

"ممکن ہے کہ ان کی غزلوں میں کسی شوریدہ مزاج کے پُرگداز عاشقانہ جذبات کی شرر باریاں نظر نہ آئیں، لیکن ہم کو مسرت ہے کہ وہ اس میکدہ میں ایک رسوائے سربازار کی مبتذل اداؤں کے ساتھ نہیں بلکہ ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف رند کی حیثیت سے داخل ہوئے ہیں جس کا ہر قدم عزت نفس اور خودداری کے احساس سے اٹھتا ہے، جو بندگی کی لعنت کے ہوتے ہوئے زندگی کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتا، جس کو خود اپنے دست و بازو کا تعمیر کردہ نشیمن دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہے، جس کی غیرت عشق کسی حال میں حسن سے سوال کرم پر آمادہ نہیں ہوتی، جس کے ذوق جستجو کی ہمت منزل کو ہر قدم پر گریزاں بنا دیتی ہے، جس کی موجِ زندگی کو شورشِ عمل کے لئے ہمیشہ پُرخطر راہوں کی تلاش رہتی ہے، جس کا غم کدۂ حیات جانِ غیر کے ہر وماہ سے نہیں بلکہ خود اپنے ہی سوزِ دل کی تراوش نور سے جگمگاتا رہتا ہے۔"

ذرا انکی تحریر کے کچھ چھوٹے چھوٹے شہ پاروں سے بھی لطف اٹھائیے۔

"اشک غم کی موجوں میں حسن یار کی تابانیوں کا منظر پیش کرنا مصوریا سیات کے بس کی چیز نہیں، یہ صلاحیت بزم محبت کے ان ہی محرمانِ خاص کو نصیب ہو سکتی ہے، جنھوں نے اہل ذوق کو زندگی کا یہ پُر اسرار پیام دیا ہے۔" (مقالات حسان ص ۱۵۹)

"اصغر نے جو ترانہ سرمدی چھیڑ دیا ہے، اس سے فضائے آسمانی گونجتی رہے گی، دنیائے ادب اسی وقت تک طلسم باطل کے سامنے سرنیاز خم کر سکتی تھی، جب تک جمال حقیقت اس کی نگاہوں سے مخفی تھا، لیکن اب اصغر کے ظہور نے ان تمام پردہ ہائے فریب کو دفعۃً الٹ دیا، اور تشنگانِ ذوق کو نظر آگیا کہ اب تک جو کچھ ان کے سامنے تھا، اس میں کوئی مستقل کیفیت یا لذت نہ تھی بلکہ محض تصنع اور تکلف کا ایک طلسم بے ثبات تھا۔"

ان کی ناقدانہ نظر میں بڑی بلندی رہی، ان کا ذوق لکھنؤ کے رنگ شاعری کو پسند نہ کرتا، وہ لکھنؤ کے غزل گو شعراء کو لفظی شعبدہ پرداز، لفظی بازیگر، کم نظر، پست خیال، سینہ کوب، نوحہ گر، ماتم گسار، سوز خوان، مریض بستر اور زلف و کمر کا پرستار سمجھتے تھے، انکی اس رائے سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اپنے اس ادعا کو ہر طرح ثابت کرنے کی فکر میں لگے رہے، اور پرزور طریقہ پر اسی کی وکالت کی، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"افسوس ہے لکھنؤ کی بدمذاقی نے درد عشق کو ایک مستقل مادی مرض بنا دیا جس کی تکلیف سے کبھی مریض بستر پر کروٹیں بدلتا ہے، کبھی نالۂ نیم شبی سے ہمسایوں کی نیند حرام کر دیتا ہے، کبھی اعضا میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے، کبھی رگیں کھینچنے اور ٹوٹنے لگتی ہیں، کبھی چہرہ زرد پڑ جاتا ہے، کبھی ہچکیاں آتے آتے دم گھٹنے لگتا ہے، بالآخر نزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے، بے وفا معشوق کا اب بھی پتہ نہیں، روح پرواز کر جاتی ہے، جنازہ نکلتا ہے، نوحہ خوانی ہوتی ہے، اور آزار محبت سے نجات مل جاتی ہے، حضرات لکھنؤ کے گداز محبت اور

درد و عشق کی یہی کل سرگذشت ہے، جس پر ان کو ادعا ہے کہ وہ تغزل کے رمز شناس ہیں، گریا گریہ و بکا آہ و زاری، اعضا شکنی، جنازہ و میت وغیرہ اسی مقدس درد محبت کے آثار و علائم ہیں،

دبستان لکھنو والے اس کا جواب ضرور دے سکتے ہیں، لیکن اوپر کے اقتباس میں جو طنز بلکہ استہزاء ہے، اس کی چبھن ضرور محسوس کریں گے، ایک دوسرے موقع پہ لب و لہجہ ذرا اور تیز ہو جاتا ہے جس کو اب بھی لکھنوی غزل گو شعراء پڑھ کر مضطرب ہو جائیں گے،

"وہ نگاہیں جن کو حسن نامحدود کی ادا اون کا رمز شناس ہونا چاہئے تھا محض شاہدان لب بام کی عشوہ طرازیوں کے دام فریب میں پھنسکر رہ گئیں، وہ ہاتھ جن کو جمال حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹنا چاہئے تھا، رقیب کے زدوکوب میں مصروف ہو گیا، وہ قلب جس کو اسرار و معارف کی تجلی گاہ ہونا چاہئے تھا، محض جلوہ گاہ ہوس بن کر رہ گیا، وہ آنکھ جس کے ہر قطرۂ آب سے انوار محبت کی بارش ہونی چاہیئے تھی، بستر غم پہ زہر فشانی کرنے لگی، وہ لب جسے نوائے حیات کی ترنم ریزیوں سے معمور رہنا چاہیئے تھا، صرف آہ و بکا کے لیے وقف ہو گیا، وہ دماغ جس کو نشاط امید سے مخمور ہونا چاہئے تھا، یاس و ملال کا دہشت کدہ بن کر رہ گیا، لیکن افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ دنیا کا مرقع الٹ گیا، افق حیات مختلف قسم کی رنگینیوں سے معمور نظر آتا ہے طبیعتیں آہ و بکا سنتے سنتے گھبرا اٹھی ہیں، حضرات لکھنو اسی ماتم کدے میں بیٹھے ہوئے اب تک مصروف ماتم ہیں" مقالات احسان ۳۵ - ۲۳۴)

لیکن یہ طنز و استہزاء تخریب کے لئے نہیں بلکہ اصلاح کی خاطر ہے لکھنؤ کی غزل گوئی میں خوبصورت اور چست الفاظ کی بازیگری سے معنوی حیثیت سے جو بے کیفی

پیدا ہو گئی تھی، اس سے حسن و عشق کی روحانی لطافتیں ختم ہو رہی تھیں، مرزا صاحب اس سے دلگیر تھے، اور وہ اس انداز تغزل میں اصلاح چاہتے تھے، اسی لئے انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ نالۂ ماتم کی انتہا ہو چکی، اب ضرورت ہے کہ مذاق شعری میں کچھ لطافت اور بلندی پیدا کی جائے، عشق و محبت کے ایسے جذبات ادا کئے جائیں جن سے روح کو خاص لذت حاصل ہو، اور شریفانہ اخلاق کے نشو و نما میں مدد ملے "حزن و افسردگی زندگی کا نام نہیں بلکہ رازِ حیات صرف اسی اضطراب پیہم میں پنہاں ہے جس سے عاشق کا قلب معمور ہو جاتا ہے" (مقالات ص ۲۲۵)

وہ اپنی زندگی میں خوش تھے کہ ان کو جس معیار کے تغزل کی تلاش تھی، وہ ان کو اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی کے یہاں مل گیا، بلکہ ان کو اس کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہوا کہ اصغر مرحوم کی ملاقات اور ان کے مطالعہ نے ان کے ذوق شاعری میں بہت کچھ بلندی اور وسعت پیدا کی (پیام کیف ص ۶) وہ اصغر کی شاعری کے کچھ ایسے دلدادہ ہوئے کہ ۱۹۲۵ء میں ان ہی نے اصغر کی منتشر غزلوں کا ایک مجموعہ نشاط روح کے نام سے مرتب کیا، اور پہلی دفعہ اربابِ ذوق کو بتایا کہ "اصغر ایک ایسے یگانۂ فن ہیں، جن کی نازک خیالیاں درد آشنا قلوب کو ہمیشہ تڑپاتی رہیں گی، وہ ایک نکتہ رس اور بلاغت شناس دماغ کے مالک تھے، اس لئے ان کی نظر عامیانہ جذبات کی سطح سے گذر کر روح انسانی کے ان لطیف حقایق و معارف تک پہونچتی ہے، جو در اصل عشقیہ شاعری کی جان ہیں، وہ عام شاہراہ سے الگ ہو کر اکثر حکیمانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس طرح کہ شعریت کو کہیں سے صدمہ پہونچنے نہیں پاتا، وہ اندازِ بیان کی لطافت اور جدت سے ہمیشہ ایسے بلند اور لطیف جذبات و احساسات کی مصوری کرتے ہیں، جہاں تک عام نگاہیں پہونچنے سے قاصر ہیں، وہ فارسی ترکیبوں کے خاص طور سے دلدادہ ہیں، لیکن چونکہ نکتہ سنج ہیں، اس لیے ویسی لطیف ترکیبیں استعمال کرتے ہیں،

جن سے شعر میں ایک خاص رعنائی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے، اور جہاں تک جوش، رقص اور مستی کا تعلق ہے ان کو بجا طور پر اردو کا حافظ کہا جا سکتا ہے، وہ اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں، جو سراپا نشاط حیات سے معمور ہے، اس لیے ان کی زبان سے جو حرف نکلتا ہے، کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے اسی کے ساتھ جس رنگینی کے ساتھ انھوں نے پرگداز جذبات ادا کیے ہیں، اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے"، اصغر کی ان خصوصیات کو مرزا صاحب نے نشاط روح کے مقدمے میں مثالیں دے کر بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے، اور ان کی کوئی تردید نہیں کر سکتا ہے، ۱۹۲۵ء سے اب تک اصغر کو جو کوئی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ مرزا صاحب ہی کے ذریعہ سمجھتا ہے، اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غالب نے اپنے سینہ کی امانت جو اپنی شاعری کے سفینہ میں منتقل کی تھی، اس کو حالی نے قوم تک پہونچایا، اسی طرح مرزا صاحب نے اصغر کے سفینہ کی امانت شاعری کو لوگوں کے سینے تک پہونچایا، مومن کے رموز و نکات کو جس طرح ضیا احمد بدایونی نے آشکارا کیا، اسی طرح مرزا صاحب نے اصغر کی شاعری سے لوگوں کے کام و دہن کو لذت آشنا بنایا،

اور جب جگر کو کوئی نہیں جانتا تھا تو اس وقت مرزا صاحب نے جگر کے متعلق یہ لکھ کر دعویٰ کیا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی قوت تخیل سے تغزل کو ایک پیکر اعجاز بنا دیا ہے، اور پھر بڑے وثوق کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ عزیز، جوش، حسرت، ثاقب وغیرہ کی زمزمہ سنجیاں بے شبہہ موجودہ غزلیہ شاعری کے لیے سرمایۂ ناز ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ حضرت جگر کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا ہے، ان کا یہ لکھنا بالکل صحیح تھا، کیونکہ اس کے چالیس برس کے بعد جب جگر کی وفات ہوئی تو وہ خوش تھے کہ وہ "داغ جگر" جو چالیس سال پہلے نمایاں ہوا تھا کسی شکستہ مزار کا ٹمٹماتا چراغ نہ تھا'

بلکہ اس میں شعلہ طور اور آتش گل کے تڑپتے ہوئے جلوے بھی پوشیدہ تھے جن کے پرتو سے عرصہ گاہ تغزل جس پر ایک مدت سے بد مذاقی کی تیرگی چھائی ہوئی تھی، ایک دفعہ پھر وادی ایمن بن گیا۔

جگر و اصغر کے معاصروں میں فانی بھی تھے جن کے کلام کو بھی بڑی شہرت ہوئی، لیکن مرزا احسان ان کے مداح ہونے کے بجائے ان کے ناقد رہے، وہ ان کی گریہ وزاری اور سینہ کوبی کو پسند نہیں کرتے، ان پر یہ لکھ کر ضرب کاری لگائی ہے کہ تغزل کی بزم کیف میں خانگی آلام ومصائب کا تذکرہ کسی لحاظ سے جائز اور مناسب نہیں، شاعر کو اگر محض اپنی ذاتی ناکامیوں کا ماتم کرنا ہے تو اس کے لیے مرثیہ کا میدان کھلا ہوا ہے جہاں وہ خوب جی کھول کر سینہ کوبی اور گریہ وزاری کر سکتا ہے، کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا، لیکن حسن وعشق کی بزم تجلی میں قدم رکھ کر اس کو مرثیہ خوانی کی اجازت نہیں مل سکتی، یہ وہ مقام ہے جہاں درد وغم ہی کی لذت سے قلب وروح کی پرورش ہوتی ہے، جہاں نزول مصائب پر مرحبا کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں، اور جہاں پہونچ کر حیات انسانی کی تمام دشواریاں آسان ہو جاتی ہیں، اس بنا پر یہ راہ نوحہ خوانوں کے لیے نہیں بلکہ شوریدہ مزاجوں کے لیے مخصوص ہے، جو اس نکتہ سے واقف ہیں"۔ ممکن ہے اس رائے سے ہمارے بعض ناظرین کو اتفاق نہ ہو، لیکن غزل گوئی سے متعلق یہ ژرف نگاہی کسی دیدہ ور غزل گو ہی کے یہاں پائی جا سکتی ہے، پہلے کہا جا چکا ہے، وہ لکھنؤ اہل لکھنؤ کی شاعری کے قائل نہ تھے، ان کا خیال تھا کہ اہل لکھنؤ کے ماتمی ذوق بدولت تغزل صرف ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا، ان کی رائے میں فانی لکھنویت کے شکار ہو کر غزل خواں ہونے کے بجائے صرف نوحہ خوان اور سوز خوان بن کر رہ گئے۔

احسان صاحب ان خوش نصیب نقادوں میں تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی تردید کی گئی نہ مخالفت کی گئی، میر جعفر علی اثر لکھنوی سے ان کی کچھ ادبی نوک جھونک ضرور

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے اثر لکھنوی جیسے استادِ فن کے سامنے سپر ڈال دی تھی یا ان ہی کے دل کہیں کہیں کھری ثابت ہوئے ہیں، دوسرے ارباب نظر کو ان کی رائے کے قبول کرنے میں گو تامل ہو ویسے پاکیزہ اور سنجیدہ ذوق رکھنے والے اُن کے قدرداں رہے مثلاً جگر نے کہا ہے،

میں جگر لاکھ ہوں آوارۂ دیر گشتۂ گمر

دل ہر اک حال میں ہے حضرتِ احساں کے بیچ

مولانا سید سلیمان ندوی ان کی تحریر کے زور، روانی، اور سلاست کے مداح تھے نامور کے مولانا تاجور نجیب آبادی ان کو بڑا سخن فہم اور سخن طراز سمجھتے ان کی نثری تحریر کو نتیجہ عرق ریزی اور عطر دماغ سوزی کہتے، لاہور کے رسالہ ہمایوں کے اڈیٹر میاں بشیر احمد بیرسٹرایٹ لا ان کے مضامین کے پُر مغز اور بلند پایہ ہونے کے معترف تھے، شیخ عبدالقادر اڈیٹر رسالہ مخزن کا خیال تھا کہ اردو زبان کا ذخیرہ ان کی ادب نوازیوں سے مرہون ہوا، مرزا یاس عظیم آبادی ثم لکھنوی اپنے غرور اور پندار میں کسی کو آنکھ نہیں لگاتے لیکن وہ بھی مرزا احسان صاحب کے علم و فضل اور ادبی ذوق کے غائبانہ معترف رہے، نیاز فتح پوری بھی ان کے زورِ قلم، حسن انشا، خوش ذوقی اور قوت استدلال کے قائل تھے، ان کی شاعری کے متعلق دیا نرائن نگم اڈیٹر زمانہ نے لکھا تھا کہ ان کا مجلی ریز کلام جلوہ زار ادب ہے، لکھنو کے ایک اہل نظر بزرگ جگ موہن نرائن مسرا نے ان کے مجموعۂ کلام پیام کیف کے ہر شعر کو جام کیف قرار دیا، اور پھر لکھا کہ اس کے فلسفیانہ اشعار اپنے رنگ میں بے عدیل اور صوفیانہ خیالات بھی خوب ہیں عشق کی بے خودی اور سرمستی کا ذکر جن اشعار میں ہے ان کے بیان نے مجسم کیف بنا دیا ہے،

وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، اپنی سنجیدگی، وضعداری محبت اور شرافت کی یادوں کا چراغ روشن کرکے چلے گئے، دعا ہے کہ کوثر و تسنیم کی شراب طہور سے مخمور اور سرشار رہیں، لیکن اُن کی بڑی خدمت اب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پیام کیف میں سرور کا جو پیام دیا ہے، اس کا صحیح مطالعہ اور تجزیہ کرکے ہم ارباب ذوق تک پہنچائیں، انھوں نے شاعری اور نثری تحریروں میں اپنے وجدان سلیم سے جو فکر و فن پیش کیا ہے، اس کو روشن اور واضح کرکے لوگوں کو اس سے محظوظ اور لطف اندوز کرائیں،

مقالات احسان

مرزا احسان احمد صاحب مرحوم جہاں ایک باکمال شاعر تھے، نکتہ سنج ادیب اور نقاد بھی تھے، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، اُن کی ادبی صلاحیت کے بڑے قدردان تھے، اُن کے کئی مضامین، انھوں نے بڑے فخر و انبساط کے ساتھ معارف میں شائع کئے، مرزا صاحب نے مشق سخن کے ساتھ بہت سے ادبی تنقیدی مضامین بھی لکھے، اُن کی شاعری کی طرح یہ مضامین بھی اُن کے بلند ادبی ذوق کا نمونہ ہیں، یہ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں، مثلاً علامہ شبلی بحیثیت شاعر، ہماری سہیل نشاط روح پر ایک نظر، اردو شاعری وغیرہ،

ضخامت ۴۸۴ صفحے

قیمت ۱۵-۶۵ روپے

"منیجر"

خطیب بغدادی

اور

ان کے بعض مخطوطات

از ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۲) آخر

مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرۂ حبیب گنج میں خطیب بغدادی کے دو اور مخطوطے بھی محفوظ ہیں، ایک الکفایۃ فی علم الروایۃ ہے، جس کے بارے میں عرض کیا گیا کہ طبع ہو چکی ہے، اس کا موضوع اصول حدیث ہے، یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے پہلی دفعہ ۱۳۵۷ھ میں شایع ہوئی تھی، دوسرا ایڈیشن ۱۳۹۰ھ میں شایع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں مصنف کے حالات کا اضافہ ہے جس کی کمی پہلے ایڈیشن میں نمایاں تھی، آخر میں فہرست عنوانات شامل ہے، اس کے مصححین کے سامنے دو مخطوطے تھے، ایک مکتبۂ آصفیہ کا اور دوسرا استنبول کا، پہلی تصحیح و تہذیب کا کام پہلے مولانا عبد اللہ سورتی نے شروع کیا تھا، اس وقت تک استنبول کا نسخہ دستیاب نہیں ہوا تھا، بعد میں مولانا سید ہاشم ندوی اور ان کے رفقا نے اس کی تکمیل کی، اسی زمانہ میں استنبول کے نسخہ کی نقل حاصل کر لی گئی تھی، مصححین نے اعتراف کیا ہے کہ استنبول کا نسخہ بہت عمدہ ہے، دوران تصحیح اتفاق سے شیخ ابراہیم حمدی المدنی (مدیر مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ) کا حیدرآباد میں ورود ہوا، اس کام میں انھوں نے مصححین کی مدد کی، ظاہر ہے کہ حبیب گنج کے نسخے کا ان حضرات کو علم نہیں تھا، تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حبیب گنج کا نسخہ مکتبۂ

آصفیہ کے نسخے سے مختلف نہیں ہے، جس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً دونوں ایک ہی نسخے سے نقل کئے گئے ہیں۔ حبیب گنج کے نسخے کے اوراق ۲۰۰ ہیں، اور ہر صفحہ پر ۲۱ سطریں ہیں، سائز ۲۰ × ۱۳ ہے۔ خط نسخ میں لکھا گیا ہے، عنوانات خط شنجرف میں ہیں، کتاب کے آخر میں فہرست ابواب کا اضافہ ناظم کتاب خانہ مولوی معین الدین نے کر دیا ہے، اور اس کے آخر میں ۲۰ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۲ھ تاریخ درج ہے۔ نسخے کے کاتب کا نام اور سنہ کتابت مرقوم نہیں ہے، اس کے بخلاف کتب آصفیہ کے نسخے کے آخر میں کاتب کا نام عبدالرحمن بن علی بن اسماعیل الملقب بزین التبریزی اور تاریخ کتابت "العشر الاخیر من شہر شعبان المعظم سنۃ ثمان واربعین وثمانمائۃ من الہجرۃ النبویۃ علی صاحبہا افضل الصلاۃ والسلام واتم التحیۃ" مرقوم ہے، دونوں نسخوں کا آغاز ایک ہی طرح ہوتا ہے یعنی "نا" (حبیب گنج کے نسخہ میں اس کی جگہ ثنا ہے) ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ"

اس کے برعکس استنبول کے نسخہ میں حسب ذیل عبارت کا شروع میں اضافہ ہے۔

"اخبرنا الشیخ ابو عبداللہ محمد بن علی بن ابی العلاء المصیصی بدمشق

بیچ بیچ میں اس طرح کے اور اختلافات بھی ہیں، حبیب گنج اور حیدر آباد کے نسخوں کا اختتام بھی ایک جیسا ہی ہے، یعنی دونوں نسخے اس عبارت پر ختم ہوتے ہیں۔

"ھذا آخر کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ، والحمد للہ رب العالمین والسلام علی رسولہ محمد وآلہ وصحبہ (حبیب گنج کے نسخے میں "اصحابہ" ہے) اجمعین" الآیہ کہ جیسا کہ مرقوم ہوا حیدر آباد کے نسخے میں کاتب کا نام اور سنہ کتابت بھی درج ہے، جو حبیب گنج کے نسخے میں نہیں ہے اس کے بخلاف نسخہ استنبول کے آخر میں

یہ عبارت ملتی ہے،

"ھذا آخر کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ، والحمد للہ رب العالمین والسلام علی رسولہ محمد وآلہ وصحبہ وسلم تسلیماً کثیراً، فی الأصل الذی نسخت منہ کتبہ لنفسہ عبد العظیم بن عبد القوی ابن عبد اللہ المنذری"

اس کے بعد کتاب کی سند بیان کی گئی ہے، جو خطیب بغدادی تک پہنچتی ہے، اس نے مطبوعہ کتاب کے دو صفحوں کا احاطہ کیا ہے، پھر کاتب کا نام "عبد الرحمٰن بن محمد بن حسن الریحاوی مولداً، الحلبی منشأ" دیا ہوا ہے، اور کتابت کی تاریخ اس طرح درج ہے۔

"وذلک غرۃ شہر رجب المبارک ثلاث ومائۃ والف من الہجرۃ النبویۃ علی صاحبہا افضل الصلاۃ والتسلیم خاتم النسخۃ" کل آخر میں حسب ذیل عبارت ہے۔

ھذا وقف سلطان الزمان الغازی سلطان سلیم خان ابن السلطان مصطفیٰ خان عفی عنہما الرحمٰن

بروکلمان نے مختلف مقامات پر اس کے ۳ نسخوں کی نشاندہی کی ہے لیکن قدرتی طور پر حبیب گنج کے نسخہ کا اس میں بھی ذکر نہیں ہے۔

دوسرا مخطوطہ "کتاب غنیۃ الملتمس (فی) ایضاح الملتبس" ہے کتاب کے نام میں سرورق پر کاتب سے "فی" چھوٹ گیا ہے، یہ کتاب اسماء الرجال میں ہے، نسخہ کے آخر میں کاتب کا نام بدرالدین احمد العراقی اور تاریخ کتابت ۲۱-۹-۱۳۳۵ھ درج ہے، ظاہر ہے یہ نسخہ حال کا لکھا ہوا ہے، یہ ۵۶ اوراق پر مشتمل ہے، اور ہر صفحہ پر

۱۵ سطریں ہیں، سائز ۸ × ۱۳ ہے، خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے، خطیب بغدادی کی اس تصنیف کا ذکر ان کے کئی سوانح نگاروں نے کیا ہے لیکن اس کے نام میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے، مثلاً ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں سمعانی کی روایت کے بموجب اس کا نام "غنیۃ المقتبس فی تمییز الملتبس" بیان کیا ہے[۱]

یوسف العش نے اپنی تصنیف میں جہاں حروف تہجی کے اعتبار سے خطیب کی تصانیف کی فہرست درج کی ہے، وہاں اس کا مختصر نام "غنیۃ المقتبس" اور "غنیۃ الملتمس" دونوں طرح درج کیا ہے، اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف کتابوں میں یہ نام مختلف طریقہ سے آیا ہے، البتہ جہاں ان کی کتابوں کا تفصیلی تذکرہ ہے، وہاں پورا نام "غنیۃ الملتمس فی ایضاح الملتبس" ہی لکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک زیادہ صحیح یہی نام ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ اس کتاب کا ذکر السلفی، ابن الجوزی، یاقوت، الذہبی اور شہبہ نے اپنی کتابوں میں کیا ہے، لیکن اول الذکر تین مصنفوں نے اس کا نام "غنیۃ الملتمس فی تمییز الملتبس" لکھا ہے[۲] بروکلمان نے اس کتاب کا نام وہی بتایا ہے، جو ہمارے پیش نظر مخطوطے پر درج ہے، اس نے اس کے دو قلمی نسخوں کی نشاندہی کی ہے، جن میں سے ایک برلن میں ہے اور دوسرا مکتبہ آصفیہ حیدرآباد میں[۳] یوسف العش نے بھی اپنی تصنیف میں بروکلمان ہی کے حوالہ سے اس کے دو مخطوطوں کا ذکر کیا ہے لیکن تفصیل بیان نہیں کی ہے۔

۱۔ الذہبی: تذکرۃ الحفاظ　　۲۔ یوسف العش: الخطیب البغدادی

۳۔ Brockelmann S. I. 564 (Leiden, 1943)

حدیث ایک ایسا علم ہے جس کا خاص تعلق مسلمانوں سے ہے، مسلمانوں نے اس کی بڑی خدمت کی ہے، اور اس سے مختلف علوم وفنون وجود میں آئے ہیں، ان میں سے ایک اسماء الرجال بھی ہے، حدیث کی صحت کا دار و مدار علمائے اسلام کے نزدیک اسناد پر ہے، اور اسناد کے قابل اعتماد ہونے کے لیے راویوں کے حالات سے واقفیت ضروری ہے، یہی ضرورت اس فن کی ایجاد کا سبب بنی، اور اس میدان میں مختلف علماء نے اہم کارنامے انجام دیئے جیسا کہ عرض کیا گیا، خطیب بغدادی کو حدیث وتاریخ سے خاص دلچسپی تھی یوسف العش کی روایت کے مطابق ان کی تصانیف میں ایک تہائی کا تعلق تاریخ سے ہے لیکن جب ہم زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان میں سے بھی زیادہ تر محدثین کی تاریخ اور رجال حدیث کی تنقید کے دائرے میں آتی ہیں، انھوں نے بتایا ہے کہ خطیب کی تالیف کردہ ۹۶ کتابیں رواۃ اور محدثین سے بحث کرتی ہیں[1] پیش نظر کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس کا موضوع بہت دلچسپ ہے کسی شخص نے (جس کا نام مذکور نہیں ہے) خطیب سے اپنے اور ایک دوسرے شخص کے مابین اس بحث کا ذکر کیا ہے کہ سلیمان بن المغیرۃ اور سلیمان بن ابی المغیرۃ ایک ہی آدمی ہیں، یا دو مختلف آدمی، فریق مخالف کا خیال تھا کہ وہ ایک ہی آدمی ہیں، جس طرح معدان بن طلحہ ہی ابن ابی طلحہ اور یوسف بن سلیمان ہی ابن ابی سلیمان ہیں، پھر اس بارے میں اس نے خطیب کی رائے دریافت کی، خطیب نے جواب دیا کہ جہاں تک معدان بن طلحہ اور یوسف بن سلیمان کا تعلق ہے تم سے بحث کرنے والے کا خیال صحیح ہے، کیونکہ جب ابو عمرو الاوزاعی، معدان کی حدیث روایت کرتے ہیں، تو ان کا نام ابن طلحہ بتاتے ہیں، اور ان کے علاوہ بعض

---

[1] یوسف العش: الخطیب البغدادی۔ ۱۲۵ — ۱۴۶

دوسرے لوگ ابن ابی علیہ کہتے ہیں، اسی طرح سفیان الثوری اور عبد اللہ بن مبارک بھی ابن ابی سلیمان کہتے تھے، اور ان کے علاوہ بعض دوسرے لوگ ابن سلیمان کہہ کر ان کا ذ کرتے تھے، لیکن تم سے بحث کرنے والے نے اس پر قیاس کر کے سلیمان بن مغیرہ کے بار میں جو رائے قائم کی ہے، وہ درست نہیں ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ سلیمان بن المغیرہ اور سلیمان بن ابی المغیرہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، پھر وہ ایک کلیہ بیان کر۔ ہیں، اور وہ یہ کہ رواۃ کے ناموں کا تعلق سماع سے ہے نہ کہ قیاس سے، اگر وہی ر صحیح ہوتا جو تم سے بحث کرنے والے نے اختیار کیا ہے تو معاملہ بہت آسان ہو جا اور اصحاب حدیث کو اس بارے میں اس قدر تگ و دو نہ کرنی پڑتی، پھر انھوں نے ا رواۃ کی ایک فہرست دی ہے، جن کے ناموں میں اس طرح کی مشابہت ہے، ا بتایا ہے کہ وہ الگ الگ لوگ ہیں، سلیمان بن المغیرۃ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ن کے اعتبار سے قیسی اور بصرہ کے رہنے والے تھے، انھوں نے جن لوگوں سے روایت ہے، اور جنھوں نے ان سے روایت کی ہے، ان کے نام بھی دیئے ہیں، جہاں تک سلیہ ابن ابی المغیرۃ کا تعلق ہے وہ نسب کے اعتبار سے عبسی تھے، اور کوفہ کے رہنے وا تھے، انھوں نے جن لوگوں سے روایت کی ہے، اور جنھوں نے ان سے روایت کی ان کے نام بھی نقل کر دیئے ہیں، اس کے بعد ایسے رواۃ کے حالات لکھے ہیں، جن کے نام اور سیعت کے مانند دونوں طرح لئے جاتے ہیں، یعنی جب ان کی ولدیت بیان کی ا ہے تو اس میں بعض لوگ "ابی" کا اضافہ کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے ہیں، اس انھوں نے رواۃ کے زمانے کے تقدم اور تاخر کا لحاظ رکھا ہے اور لکھا ہے "وبدا بالأقدم فالأقدم منهم" عام طور سے ان کے حالات میں صرف

اکتفا کیا ہے کہ جن لوگوں سے انھوں نے روایت کی ہے، اور جنھوں نے ان سے روایت کی ہے، ان کے نام لکھ دیئے ہیں، لیکن بعض صورتوں میں بعض دوسری باتوں کی طرف بھی توجہ کی ہے مثلاً الحسن بن زید المعروف بالقوی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا لقب "قوی" اس وجہ سے پڑ گیا تھا کہ انھیں عبادت پر قوت حاصل تھی، ایسے رواۃ کے حالات مکمل کرنے کے بعد اُن رواۃ کے حالات لکھے ہیں، جو سلیمان بن المغیرۃ اور سلیمان بن ابی المغیرۃ کی مانند مختلف اشخاص ہیں، ایسے رواۃ کی فہرست زیادہ طویل ہے، اور ان کے حالات خطیب نے حروف تہجی کے اعتبار سے لکھے ہیں انکے حالات لکھنے کا انداز بھی وہی ہے، جو پہلی قسم کے رواۃ کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے، کتاب کے آخر میں ایک عنوان قائم کیا ہے "ومن ذکر من غلبت کنیتہ علی اسمہ" اس عنوان کے تحت صرف ابوبکر بن شیبۃ اور ابوبکر بن ابی شیبہ کے حالات ملتے ہیں، حال میں مکتبہ آصفیہ کے نسخہ کی زیارت کا موقع بھی ملا اسکی ضخامت ۲۹۳ صفحات ہے، اور ہر صفحے پر ۹ سطریں ہیں سائز ۷×۸ ہے خط نستعلیق صاف ہے، کتاب کے آخر میں لکھا ہے۔

ورق ۵۲

آخر الکتاب .... ناقلاً عن النسخۃ المنقولۃ عن نسخۃ مدینۃ مکتوبۃ فی البلد حیدر آباد الجنوبی یوم الأحد ثالث رمضان المعظم سنہ ۱۳۲۵ھ الہجریۃ علی صاحبھا الف صلوٰۃ وتحیۃ وأنا المذنب الراجی رحمۃ اللہ القوی زین العابدین الآروی البہاری غفر اللہ لہ۔

نسخے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

الحمد للہ الذی أوضح سبیل الرشاد برحمتہ ووفق لاتباع الہدی من شاء من خلیقتہ وصلاۃ اللہ وسلامہ علی عبادہ الذین اصطفی وخص بافضل ذلک نبینا محمد سید الوری۔

//

امام مزنی

از

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

مزنی سے التفات خاص، گفتگو میں مزاح کا رنگ

امام مزنی، امام شافعی کے اس قدر قریب، مزاج شناس، اور چہیتے شاگرد تھے، کہ وہ اپنی ثقاہت ومتانت اور تمکین و وقار کے باوجود کبھی کبھی ان سے گفتگو میں غایت محبت و فرط التفات کی بنا پر مزاح کی چاشنی بھی شامل کر دیتے تھے، ایک بار مزنی سے فرمایا میں نے مدینہ میں چار عجیب وغریب چیزیں دیکھیں، ایک تو اکیس برس کی دادی دوسری ایک ایسا شخص جسے قاضی نے دو مد کھجور کی گٹھلیوں کے بارے میں مفلس قرار دیا، تیسری نوے برس کا ایک پیر فرتوت جو دن بھر ننگے پاؤں کنیزوں کے پاس گانے کی تعلیم دینے کے لیے آتا جاتا رہتا تھا، لیکن جب نماز پڑھتا تو بیٹھ کر، چوتھی چیز کے بارے میں میں بھول گیا، ایک مرتبہ مزنی سے فرمایا، میں چالیس برس تک شادی شدہ مردوں سے

ازدواجی زندگی کے بارے میں اُن کا رتو عمل معلوم کرتا رہا، لیکن کسی ایک نے بھی اس تجربہ کے بارے میں کلمۂ خیر نہ کہا،

ایک بار مزنی کے سامنے

انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله

ماتقدم من ذنبك وما تاخر۔

کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا کہ

ماتقدم من ذنبك سے مراد ذنب آدم اور ماتاخر سے مراد ذنوب امت ہیں، بیہقی نے احکام القرآن میں اس قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ھذا قول مستظرف[1] (یہ قول لطیف ہے) امام شافعی کے اس التفات خاص اور فرط محبت کے باب میں کوئی بھی امام مزنی کا ہمسر نہیں ہے۔

استاد کے بارے میں مزنی کے تاثرات	امام شافعی کی دل آویز شخصیت اور ان کے اندازدلنوازی و دلداری کا یہ اثر تھا کہ امام مزنی عمر بھر اپنے محبوب مرشد

استاذ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے، فرماتے تھے،

لووزن عقل الشافعی	اگر امام شافعی کی عقل کو زمین
بعقل نصف اهل الارض	کے آدھے لوگوں کی عقل سے وزن
لرجح[2]	کیا جائے، تو امام صاحب کی عقل
	زیادہ وزنی ثابت ہوگی

---

[1] طبقات السبکی ج ۱ ص ۲۴۲ [2] مرآۃ الجنان ا۔ یافعی مالکی ج ۲ ص ۱۹

ایک بار فرمایا، اگر تم لوگ امام شافعی کو دیکھتے تو ان کی کتابوں کے بارے میں کہتے کہ ان کی تصانیف نہیں، خدا کی قسم ان کی زبان ان کی کتابوں سے بڑھ کر تھی، [1] وہ اپنے استاد کی شان میں کسی قسم کی تنقید یا تنقیص گوارا نہیں کر سکتے تھے، ایک موقع پر فرمایا، خدا کی مخلوق میں میں کسی سے بھی اس بات پر بحث کر سکتا ہوں کہ امام شافعی کی کتابوں میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں وہ ناقل کی ہیں امام شافعی کی نہیں، [2]

تقوی و عبادت | امام شافعی سے اس عقیدت اور ذہنی وابستگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے عبادات و معاملات، زہد و ورع، جود و سخا، صبر و توکل اور قناعت و بے نیازی ہر چیز میں ان کی جھلک نظر آتی ہے، وہ خود فرماتے ہیں، انا خلق من اخلاق الشافعی اس جھلک کا کچھ اندازہ عمرو بن عثمان مکی کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہو سکتا ہے،

ما رایت احداً فی المتعبدین	میں بہت سے عابدوں اور زاہدوں سے
فی کثرۃ من لقیت منھم	ملا لیکن کسی کو بھی قوت اجتہاد، عبادت
اشد اجتھادا على المزنی	کی مواظبت، علم اور اہل علم کی تعظیم
ولا ادوم على العبادۃ	میں مزنی سے بڑھ کر نہیں پایا
منه وما رایت احداً اشد	وہ تقوی کے اعتبار سے اپنے نفس پر
تعظیما للعلم و اھله منه	سب سے زیادہ سخت تھے، لیکن اور
وکان من اشد الناس	دوسرے لوگوں کے معاملہ میں بڑے
تضیقا على نفسه فی الورع	وسیع النفس تھے،
واوسعه فی ذلک على الناس [3]	

---

[1] مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۷۸ [2] ایضاً الانتقاء ص ۱۱۰ [3] طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۸

علامہ سبکی نے انھیں "زاھداً ورعاً متقللاً من الدنیا، مجاب الدعوۃ" (زاہد، متقی، دنیا سے کم لینے والے اور مقبول ومستجاب) کے الفاظ سے یاد کیا ہے، تقریباً سارے اصحاب طبقات ومورخین ان کی ان صفات پر متفق ہیں، تقوی کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی ایک وقت کی نماز جماعت سے نہ ادا ہو پاتی۔ تو اسے علحدہ پچیس بار ادا کرتے اور آنحضرت کا یہ ارشاد گرامی پیش کرتے، صلاۃ الجماعۃ افضل من صلوٰۃ احدکم وحدہ بخمس وعشرین درجۃ (جماعت سے نماز کی ادائی تمہاری تنہا نماز سے پچیس گنا افضل ہے)

احتیاط اس قدر ملحوظ رکھتے کہ سال کے ہر موسم میں تانبہ کی کٹوریوں میں پانی پیتے، مٹی کے کوزوں میں اس لیے نہ پیتے کہ ان کو پکانے میں گوبر کا استعمال ہوتا تھا، اور ان کے مسلک کے لحاظ سے آگ اسے پاک نہیں کر سکتی۔[۳]

مُردوں کو خالص ثواب کی نیت سے غسل دیتے اور فرماتے ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ دل سوز ورقت سے خالی نہ ہو، امام شافعی کو غسل دینے کی قابل رشک سعادت بھی انھیں کے حصہ میں آئی۔[۳]

قضاعی نے لکھا ہے،

لم یکن احد من اصحاب	اصحاب شافعی میں سے کوئی بھی
الشافعی یحدث نفسہ	کسی معاملہ میں ان پر سبقت کا
بالتقدم علیہ فی شی	دعوی نہیں کر سکتا تھا،
من الاشیاء[۴]	

۱؎ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۲۵ ۲؎ طبقات السبکی ج ۱ ص ۲۲۹ ۳؎ مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۰۰ ۴؎ العقد المذہب ابن ملقن قلمی، خدابخش لائبریری پٹنہ

ابن یونس نے انھیں احد الزھاد فی الدنیا و من خیر خلق اللہ سے تعبیر کیا ہے،

زہد، گوشہ نشینی استغنا

ان کے زمانہ میں مصر کے فرمان روا احمد بن طولون تھے، جو اپنی شجاعت، اولوالعزمی، عدل اور سخاوت کے علاوہ علم شناسی اور علماء کی قدر دانی میں بہت نیک نام تھے، ان کے دربار میں اہل فضل و کمال کی کثرت و تابانی سے کہکشاں کا سماں نظر آتا تھا، لیکن اس دربار میں امام مزنی شاذ و نادر ہی جلوہ گر ہوتے، اس کی وجہ ان کی طبعی زہد پسندی اور گوشہ نشینی تھی، صرف ایک بار مسئلہ قضاء علی الغائب کے سلسلہ میں وہ ابن طولون کی مجلس میں تشریف لائے تھے،

قاضی بکار بن قتیبہ جو اپنے منصب کے علاوہ ایک بڑے عالم اور حنفی فقیہ تھے،

جب بغداد سے مصر عہدۂ قضا کے لیے آئے تو امام مزنی سے ملاقات و گفتگو کی خواہش بھی انکے دل میں تھی، لیکن عرصۂ دراز تک یکجائی کا موقع نہ ملا، ایک شہادت کے سلسلہ میں جب امام مزنی قاضی بکار کی مجلس میں تشریف لائے اور اپنا نام بتایا تو قاضی بکار نے حیرت سے پوچھا کہ وہی مزنی جو صاحب الشافعی ہیں؟ فرمایا، ہاں تو قاضی بکار کو بمشکل یقین آیا، ابوعمر کندی نے اس واقعہ کے ضمن میں صراحت کر دی ہو کہ لم یکن رآہ قبلھا لاشتغال المزنی بنفسہ[1]

لم یکن رآہ قبلھا لاشتغال المزنی بنفسہ،	اس سے پہلے نہ دیکھ سکنے کی وجہ مزنی کا ذاتی اشتغال تھا،

ایک بار پھر اتفاق سے ایک جنازہ میں ان دونوں حضرات کا اجتماع ہوا، قاضی بکار نے اپنے ایک رفیق ابوجعفر الشں سے کہا، مزنی سے کچھ سوال کرو کہ ان کی گفتگو سے بہرہ ور ہو سکوں، ابوجعفر نے نبیذ کے مختلف فیہ مسئلہ کو چھیڑ دیا، اور پوچھا کہ

---

[1] کتاب الولاۃ والقضاۃ، ابوعمرو کندی ص ۵۰۵،

نبیذ کی تحریم و تحلیل دونوں سے متعلق احادیث موجود ہیں، تو پھر آپ تحریم کو تحلیل پر کیوں مقدم کرتے ہیں، امام مزنی نے فرمایا کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ دور جاہلیت میں نبیذ حرام تھی، اور ہمارے لیے حلال ہوئی، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جاہلیت میں وہ حلال تھی، اس سے خود تحریم کی احادیث کی تائید ہوتی ہے، اس معاملہ میں انھوں نے اسی بعد الاباحۃ (ممانعت اباحت کے بعد ہوتی ہے) کے اصول سے استدلال کیا، بر مردا وہ بے ساختہ ذہانت اور قوت استدلال کے اس مظاہرہ سے قاضی بکار متاثر و مسرور ہوئے اور کہا کہ دلیل قاطع کی یہ بہترین مثال ہے[1]

امام مزنی کی قناعت پسند اور مستغنی طبیعت سے واقف ہونے کے بعد یہ بات باعث حیرت نہیں رہتی کہ وہ دور معتصم سے عہد متوکل تک کسی بھی خلیفہ وزیر امیر یا کسی بھی اہل منصب سے وابستہ نہیں تھے، اور مصر میں اپنے گوشۂ علم سے جدا ہوکر وہ کسی دوسرے دربار یا دیار کے سفر حتی کہ سفر حج کے کاروانوں میں بھی تلاش بسیار کے باوجود نہیں نظر آتے،

امام مزنی اور فتنۂ خلق قرآن

ان کی خاموش اور گوشہ گیر طبیعت نے تمام مشاغل سے علاحدہ رہ کر صرف فقہ کی تعلیم و تدریس اور اشاعت و ترویج تک اپنے کو محدود رکھا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کا دامن فتنۂ خلق قرآن کی لپٹ سے محفوظ نہ رہ سکا ان کے مصری رفیق درس امام ابویعقوب بویطی نے جن کے بارے میں امام شافعی کی پیشین گوئی کا ذکر ہو چکا ہے، اس فتنہ کا شکار ہوکر، امام احمد بن حنبل کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور بالآخر اسی قید کے عالم میں کی زحمتِ قفس عنصری سے

---

[1] مراۃ الجنان، یافعی مالکی ج ۲ ص ۱۷۰

آزاد ہو گئی، ایسے پُر آشوب زمانہ میں امام مزنی کے درس و تدریس میں انہماک اور ان کی احتیاط اور خاموشی سے ایک طرف ان کے دوست بویطی کو شکایت رہی کہ اس سے معتزلہ کی ہمت افزائی ہوئی اور ان کے ہاتھوں اہل حق کو مصائب میں مبتلا ہونا پڑا، دوسری طرف بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ وہ خلق قرآن کے قائل تھے،

وکان من یعادیہ و ینافسہ	ان کے بعض بعض معاندین و منافسین ان
من اھل مصر یشھد	پر الزام لگاتے تھے، کہ وہ کہتے ہیں
بانہ کان یقول	قرآن مخلوق ہے حالانکہ ان کے بارے
القرآن مخلوق وھذا	میں یہ خیال صحیح نہیں،
لا یصح عنہ [1]	

لیکن یہ سب حاسدین و معاندین کی کارستانی ہے، مشہور ہے، کل ذی مال محسود، امام مزنی معتزلہ کی موافقت کیسے کر سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو اس میدان کا مرد نہیں سمجھتے تھے، لیکن صاحبان ہمت و عزیمت کے مداح تھے، امام احمد بن حنبل کے بارے میں ان کا یہ قول ضرب المثل کی حد تک مشہور ہو چکا ہے،

ابوبکر یوم الردۃ وعمر	حضرت ابو بکر مرتدین (کے بارے میں
یوم السقیفۃ وعثمان یوم	فیصلہ) کے دن، حضرت عمر سقیفہ کے
الدار وعلی یوم الصفین	دن، حضرت عثمان شہادت کے دن
و احمد بن حنبل یوم المحنۃ [2]	اور حضرت علی جنگ صفین کے دن اور
	احمد بن حنبل (فتنۂ خلق قرآن کے سبب)

[3] ...

---

[1] انتقاء، ص ۱۱۱ [2] طبقات السبکی ص ۲۰۰

کسی بھی ابتلاء و آزمائش کے زمانہ میں لوگوں کو غلط فہمیاں ہو ہی جاتی ہیں جن سے غلط بیانیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اس معاملہ میں بھی یہی ہوا، امام مزنی کی مجالس میں شرکت بہت کم ہوگئی، جعفر بن جدار کاتب نے اسی موقع پر کہا تھا،

والمزنی الذی الیہ فشر اذا دھرنا ادلھما

جب سارا زمانہ ہمارے لیے تاریک تھا، تو ہم مزنی کی پناہ ڈھونڈتے تھے،

اس نازک موقع پر تائید غیبی ان کے کام آئی، ایک مرد صالح جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ابدال میں سے ہیں، ایک صبح جامع مصر میں کھڑے ہوئے لوگوں کو جمع کیا، اور فرمایا، تم سب غلطی پر ہو، توبہ استغفار سے کام لو، میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہاری اسی مسجد میں ہوں، مسجد کی ساری قندیلیں سوائے ایک قندیل کے گل ہیں، اور یہ قندیل وہیں ہے، جہاں امام مزنی کی نشست ہے، علامہ ابن عبدالبر اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

فتوافی الناس الیہ — لوگ ان کی خدمت میں پھر حاضر
واستحبوہ وعظمت حلقتہ — ہوئے ان سے محبت کا معاملہ کیا
حتی اخذت اکثر الجامع — ان کا حلقہ درس بہت وسیع ہوگیا،
وزال ما فی قلوب الناس — یہاں تک کہ جامع مصر کا بیشتر حصہ
من التہمۃ لہ[1] — اس کی وسعت میں آگیا، لوگوں کے
دلوں سے ان پر لگی ہوئی تہمت [illegible]

وفات ۲۴ [2] رمضان المبارک ۲۶۴ھ میں امام شافعی کا یہ مایۂ ناز شاگرد، دار

---

[1] انتقاء، ص ۱۱۱ [2] ابن عبدالبر کی روایت کے مطابق ۲۴ ربیع الاول ۲۶۴ھ میں رحلت

فقہ شافعی کا رکن رکین ۶۰ برس تک، ایک عالم کو فیضیاب کرنے کے بعد اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگیا، ان کے رفیق اور رضاعی بھائی، امام ربیع بن سلیمان مرادی نے نماز جنازہ پڑھائی، اور مصر کے مشہور قبرستان قرافۂ صغری[۱] میں امام شافعی کے مزار کے قریب تدفین عمل میں آئی، امام شافعی کا مزار قرافہ کے مشہور ترین مزارات میں ہے، ایک بار، امام مزنی جب وہاں سے گزرے تھے، تو یہ اشعار ان کی زبان پر آگئے تھے[۲]

سقی اللہ ھذا القبر من ذی مزنۃ ۔۔۔ من العفو ما یغنیہ عن طل المزن

لقد کان کنفو للعهد احد و معقلا ۔۔۔ و رکنا لھذا الدین بل ایما رکن

ترجمہ

اللہ تعالے اس قبر کو اپنے ابر عفو و کرم سے اتنا سیراب کرے کہ شبنم افشانی کا شکوہ نہ رہے، وہ (صاحب قبر) بلندیوں اور عظمتوں کے ہمسر اور اس دین کے ستون تھے،

مقریزی کا بیان ہے کہ امام مزنی کی تدفین کے بعد جب ایک شخص کا گزران کی قبر کے پاس سے ہوا تو اس نے سنا کہ کوئی غیبی آواز یہی اشعار پڑھ رہی تھی۔

---

[۱] قرافہ مصر کا مشہور قبرستان تھا، یہ آب و ہوا کے لحاظ سے بہت خوشگوار تھا، جامع قرافہ میں ۔۔۔ شہر جمعہ کی راتوں میں شب گزاری اور چاندنی راتوں سے لطف اندوزی کے لیے یہاں برابر آیا کرتے تھے، اسی وجہ سے کھانے پینے کی دوکانیں بھی کثرت سے موجود تھیں، ایک صاحب موسیٰ بن محمد نے اپنی خب بیداریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، چاندنی راتوں میں قرافہ کی طرب انگیزی قابل دید ہوا کرتی تھی، ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ان القرافۃ قد حوت من ضدین ۔۔۔ دنیا و اخری فھی نعم المنزل

---

[۲] خطط مقریزی ص ۳۴۴

تلامذہ امام مزنی کے سرچشمۂ علم و فضل سے یوں تو ایک مخلوق نے تشنگی بجھائی۔ لیکن چند خوش نصیب ایسے بھی ہیں جنھیں دل بھر کر سیرابی کا موقع ملا، یہ اصحاب بعد میں بجائے خود علم و ارشاد کے بحر بیکراں بن گئے، انماطی، عبداللہ بن محمد، ابوبکر فارسی، ابراہیم بلدی، ابن خزیمہ اور طحاوی، زکریا ساجی، ابن حوصا، ابن ابی حاتم اسی خرمنِ علم و کمال کے خوشہ چین ہیں۔

عثمان بن سعید انماطی، (م ۲۸۸ھ) اسی طرح صاحب المزنی کہلاتے ہیں جس طرح امام مزنی کا خطاب صاحب الشافعی ہے، خطیب بغدادی نے انھیں شوافع کے ممتاز ترین فقہا میں شمار کیا ہے، ابو عاصم کا قول ہے کہ اہل بغداد کے لیے انماطی کی وہی حیثیت ہے جو اہل نیشاپور کے لیے ابوبکر بن اسحاق کی ہے، کیونکہ یہ ان اولین لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے مزنی کا علم اپنے اپنے علاقوں میں عام کیا۔[۱]

ابویحییٰ زکریا ساجی، بصرہ میں امام مزنی کے علم کے امین تھے، ان کی کتابوں اختلاف الفقہا، اور علل الحدیث کا ذکر اہمیت کے ساتھ ہوتا ہے۔[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲)

کم لیلۃ تبنا بھا وندیمنا | لحن لکادیذوب منہ الجندل
والبدر قد ملأ البسیطۃ نورہ | فکانما قد فاض منہ جدول

قرافہ دنیا و آخرت کا جامع ہے اور بہترین منزل ہے، کتنی ہی راتیں ہم نے وہاں ایسی گزاری ہیں کہ ہمارے ہم مشرب کی نغمہ سرائی سے پہاڑ پگھلتے معلوم ہو رہے تھے۔ چاند کی کرنوں سے پورا ماحول منور تھا، محسوس ہو رہا تھا کہ چاندی کے آبشار رواں ہیں۔

مقریزی کا قول ہے کہ قرافہ سے بڑھکر شاندار عالیشان اور صاف ستھرا قبرستان دنیا میں کہیں نہیں،

[۱] وفیات الاعیان۔ ابن خلکان ج ۱ ص ۸۰ و طبقات السبکی ج ۲ ص ۵۲ [۲] طبقات سبکی ج ۲ ص ۲۲۶

محمد بن خزیمہ نیشاپوری، انھیں امام الائمہ بھی کہا جاتا ہے، امام مزنی کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں، امام مزنی کے متعلق وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، جس سے امام مزنی کی شخصیت کی صداقت، سادگی اور علمی انکساری کے ساتھ شاگردوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی عزت نفس کا اظہار ہوتا ہے، ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار امام مزنی کی خدمت میں حاضر ہوا، مجلس میں ایک شخص نے قتل شبہ عمد کے بارے میں استفسار کیا اور کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قتل کی دو قسموں قتل عمد اور قتل خطا کا ذکر کیا ہے، تو آپ ایک تیسری قسم قتل شبہ عمد کا اضافہ کیوں کرتے ہیں، جواب میں امام مزنی نے حدیث بیان کی تو سائل نے دریافت کیا کیا آپ علی بن زید بن جدعان کی روایت سے استدلال کر رہے ہیں، اس پر امام مزنی خاموش رہے تو میں نے کہا کہ اس روایت کو علی بن زید کے علاوہ ایوب سختیانی اور خالد الحذاء نے روایت کیا ہے، سائل نے پھر پوچھا عقبہ بن اوس کون ہیں تو میں نے کہا عقبہ بن اوس بصرہ کے رہنے والے ہیں، اور امام محمد بن سیرینؒ نے باوجود اپنی جلالت شان کے ان سے روایت کی ہے، میرے ان جوابات پر سائل نے امام مزنی سے کہا آپ مناظرہ کر رہے ہیں یا یہ؟ امام مزنی نے فرمایا جب حدیث کی بات آئے گی تو یہی مناظرہ کریں گے، کیونکہ وہ مجھ سے بہتر علم حدیث سے واقف ہیں۔

امام طحاوی، امام مزنی کے شاگرد اور خواہرزادہ ہیں، ابتدا میں فقہ کی تحصیل اپنے ماموں امام مزنی سے کی، امام طحاوی نے امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا، اس لیے طبعاً فقہ حنفی کی جانب میلان تھا، امام مزنی کی نشستوں میں بھی وہ فقہ حنفی اور فقہ شافعی کی کشمکش میں مبتلا رہتے، کبھی کبھی انھیں اپنے اعتراضات اور

اشکالات کے جواب سے تشفی نہ ہوتی، اسی سلسلہ میں یہ روایت بہت مشہور ہے کہ ایک روز امام مزنی نے ان سے کہا واللہ لاجاء منک شئی، خدا کی قسم تم سے کچھ نہ ہو گا طحاوی نے اس پر ناراض ہوکر ان کے یہاں کی نشست کو ترک کر دیا، اور اس کے بعد جب اپنی کتاب مختصر طحاوی تصنیف کی اور ان کے علم وفضل کا شہرہ ہوا، تو فرمایا۔ رحم اللہ ابا ابراھیم لوکان حیاً ورانی لکفر عن یمینہ (اللہ ابو ابراہیم (مزنی) پر رحم فرمائے، اگر زندہ ہوتے اور مجھے دیکھتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے۔[1] امام طحاوی علمی کمال کے ساتھ غیر معمولی ذہین بھی تھے، اور ان کی کتابیں ان کی فطری ذہانت کی غماز ہیں مطالعہ کے دوران ان کے سامنے امام ابوحنیفہ اور ان کے نامور شاگردوں کے خیالات ..... اور دلائل آتے تھے، اس بنا پر وہ احناف کی قوت استدلال سے بہت متاثر تھے، اور دوران درس اس کا تذکرہ کرتے تھے، امام مزنی نے انھیں بہتیرا سمجھایا مگر وہ اس سے متاثر نہ ہوئے اور احناف کی طرف ان کا رجحان بڑھتا گیا، بالآخر وہ نامور علمائے احناف میں شمار ہوئے۔

تصانیف کسی علمی شخص کی اہمیت وافادیت کا صحیح اندازہ اس کے شاگردوں اور تصانیف سے کیا جا سکتا ہے، امام مزنی کو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں ممتاز کیا تھا، ان کی تصانیف میں جامع کبیر، جامع صغیر، مختصر المختصر، المنثور، المسائل المعتبرة الترغیب فی العلم، کتاب الوثائق، کتاب العقارب، نہایۃ الاختصار وغیرہ کا ذکر ملتا ہے،[2] لیکن ان ساری کتابوں میں مختصر المزنی کو جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی، وہ

---

[1] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۲، [2] ایضاً ص ۲۱۲، طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۸، کشف الظنون ص ۱۶۳۵، ۲۶۸۰

الفہرست ابن ندیم ص ۲۹۹

بے مثال ہے، فقہ شافعی کی ترویج میں اس کتاب سے بڑھ کر کسی کتاب کا بھی حصہ نہیں رہا، علامہ ابن سبکی نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا ہے۔

انه زينة مذهبكم	یہ (کتاب) تمہارے مسلک کی
وعمدة اصحابكم وقاعدة	زینت، تمہارا بنیادی ستون اور
طريقكم ومؤئلكم حين	سنگ میل ہے، تمہارے اختلافی مسائل
تختلفون ومرجعكم	میں تاویل گاہ اور تمہارے پیچیدہ
حين تضطرب دون مغز علمكم	مسائل میں مرجع ہے، جب مختلف
حين تضطرب امواج	رایوں کا ہجوم اور فقہا کی محفلوں
الآراء وتتناقض في	میں منازعہ ہو تو وہ تمہارے لیے
محافل الفقهاء[1]	جائے پناہ ہے

ابو العباس بن سریج نے ایک موقع پر مختصر المزنی کی تعریف میں یہ اشعار پڑھے[2]

لضيق فؤادي منذ عشرين حجة　　وصيقل ذهني والمفرج عن همي
عزيز على مثلي اعارة مثله　　لما فيه من علم لطيف ومن نظم
جموع لأصناف العلوم بأسرها　　فأخلق به أن لا يفارق كمي

تقریباً بیس سال سے میرے دل کی تنگی دور کرنے کے لیے اور ذہن کو جلا بخشنے کے لیے اور میری فکروں کو دور کرنے کے لیے (یہ کتاب کام آرہی ہے) اس کے علم لطیف اور دلکش ترتیب کی وجہ سے اسے کسی دوسرے کو دینا مجھ پر شاق ہے، یہ تمام علوم کی جامع ہے، اور اس لائق ہے کہ میرے ہاتھوں سے جدا نہ ہو۔

---

[1] طبقات سبکی ج ۱ ص ۱۱، [2] ایضاً ج ۲ ص ۲۸،

امام ذہبی کی روایت ہے کہ قاضی ابوزرعہ نے ہر اس شخص کے لئے جو مختصر المزنی کو حفظ کرے، ایک سو دینار کا انعام مقرر کیا تھا[1]

مختصر کی قبولیت کا اندازہ اس کی شرحوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ آنے والے دور میں بہت سے ممتاز شافعی فقہاء نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں ابوالعباس ابن سریج کی شرح زیادہ مستند ہے، اور مقبول ہے، اس کے علاوہ ابوالطیب طبری، ابواسحق مروزی، ابوحامد مروزی، ابوعبداللہ مسعودی، ابوبکر الشاشی، ابوعلی سنجی، ابن علان کتانی، قاضی زکریا بن محمد انصاری وغیرہ کی شروح و تعلیقات بھی نمایاں ہیں، صاحب کشف الظنون نے ایک طویل فہرست ان شارحین کی بیان کی ہے[2]

اس کتاب کی اہمیت ایک الگ مضمون کا تقاضا کرتی ہے، بہت سے مسائل و مباحث ایسے ہیں جن میں امام مزنی نے امام شافعی سے اختلاف بھی کیا ہے، اسی بنا پر بعض شوافع نے انھیں خود ایک الگ مسلک کا حامل قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اصول شافعی سے اختلاف نہیں کرتے۔

---

[1] کتاب الرواة والثقات ص ۲۲۰ [2] کشف الظنون ص ۲۰۱

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین اور تحقیقاتِ اسلامی

مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی کا ایک کتابچہ مستشرقین اور ان کے کاموں اور اداروں کے بارے میں کراچی سے شایع ہوا ہے۔ جس میں مولانا نے بڑی خوش اسلوبی سے مستشرقین اور ان کے کارناموں کی حقیقت کا پردہ فاش کیا ہے، ذیل کی سطور میں اس کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔

(ع ۔ ص)

مستشرقین یورپ کی اسلامی تحقیقات کو ہم سہولت مطالعہ کے لیے چار ادوار پر تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ پہلا دور ابتداے تاریخ اسلامی یعنی ساتویں صدی مسیحی یا گریگوری سے لیکر پندرھویں صدی مسیحی یعنی بیداری یورپ تک

۲۔ دوسرا دور۔ پندرھویں صدی کی ابتدا سے اٹھارویں صدی کے اختتام تک

۳۔ تیسرا دور، انیسویں صدی کی ابتدا سے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے ختم یعنی ۱۹۲۵ء تک ۔

۴۔ چوتھا دور، ۱۹۲۶ء سے آج تک

دور اول، یہ دور تقریباً آٹھ سو برس کے طویل زمانہ پر مشتمل ہے، اس دور میں یورپ کی ساری علمی زندگی پر ارباب کلیسا کا قبضہ تھا، پاپائے اعظم اور ان کے نائبین مسلمانوں سے مختلف علوم حاصل کرنے کی سعی کرتے تھے، عربی کتب و رسائل جمع کرتے تھے، اسلامی قوانین کا تھوڑا بہت مطالعہ اس دور کے آخری حصہ میں کیا گیا، طب، فلسفہ، فلکیات، زراعت اور قانون پر مسلمانوں کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ زبانوں میں ہوا، ابن رشد اور جابر بن اسحاق اور ابن سینا کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے، یہ کام عموماً ایطالیہ میں اور کسی قدر فرانس میں ہوا، لیکن نہایت دانائی کے ساتھ فارابی کو "فارس" ابن رشد کو "ایوی روس" جابر کو "جیبر" اور ابن سینا کو "اوی سینا" بنا دیا گیا، اور طلبہ کو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ یہ لوگ یورپین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ اس دور میں مسلمانوں اور دین اسلامی سے متعلق بڑے عجیب عجیب ہیبتناک قصے ارباب کلیسا کی طرف سے پھیلائے گئے، مسلمانوں کی سفاکی اور قرآن مجید اور رسول اللہؐ کے متعلق بے سروپا افسانے خوب خوب گھڑے گئے، اور اسی زمانہ میں یورپ والوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مسلمان مکہ میں رسول اللہؐ کے برنجی بت کو سجدہ کرنے کے لیے جایا کرتے ہیں۔

اس زمانہ کے اجلۂ مستشرقین میں سب سے اول نام ہربرٹ دی اورلیاک "ایک فرانسیسی راہب" کا ملتا ہے، یہ فرانس میں ۹۳۰ء میں پیدا ہوا، ۱۰۰۳ء میں بمقام ویٹیکن وفات پائی، اس نے اندلس کے مدارس میں برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت کی وجہ سے واپس آکر فرانس و ایطالیہ میں بڑا نام پیدا کیا، واپسی پر وہ ایطالیہ میں مستقل اقامت گزیں رہا حتیٰ کہ ۹۹۹ء میں وہ پاپائے اعظم کے جلیل القدر عہدہ پر

فائز ہوا، اس نے دو عربی مدرسے قائم کئے، اور فلکیات و ریاضیات کی بعض کتابوں کے عربی سے ترجمے بھی شائع کئے، اس کے تراجم و تصانیف کا مجموعہ ۱۸۹۹ء میں برلن سے شائع ہوا (نجیب العقیقی، المستشرقون، ج ۱، ص ۱۲۰، طبع مصر ۱۹۶۴ء)

اس دور کے مستشرقین میں " اور لیاک" کے علاوہ قسطنطین الافریقی المتوفی ۱۰۸۷ء او جودی سانتا، ڈی کویل، ایڈیلارڈ، پیطرس، یوحنا رابرٹ، ہرمان، ڈینیل مورلے میکل اسکاٹ، لیونارڈ، تھامس ڈی اکوین، روجر بیکن اور ریمنڈ لیو وغیرہ کے نام ملتے ہیں، یہ سب اندلس، صقلیہ اور دیگر اسلامی ممالک کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور بہت سی عربی کتابوں کے فرنچ اور لاطینی زبانوں میں ترجمے کئے ہیں، تقریباً یہ سب راہب یا کلیسا کے خدام ہیں، اسی دور کا ایک بڑا فاضل اے تورمیدا ہے جس نے ایطالیہ میں تعلیم حاصل کی، بہت دنوں تک عیسائی خانقاہ کا مرشد اعلیٰ رہا، اس کے بعد تونس چلا گیا، وہاں صدق دل سے مسلمان ہو گیا، اور عبداللہ کے نام سے مشہور ہوا وہیں تقریباً اسی سال کی عمر میں ۱۴۳۲ء میں وفات پائی، اس کی قبر تونس میں باب المنارہ میں ہے۔ (حوالہ سابق ۱۳۲)

عبداللہ تورمیدا کے علاوہ اور بہت سے اطالوی اور فرنچ مستشرقین نے مطالعہ کے ذریعہ دین حق کو پا لیا اور مسلمان ہو گئے، ان میں سے بعض نے اسلام پر لاطینی اور فرنچ میں کچھ رسالے بھی لکھے تھے، خدا جانے یہ رسالے اب کہیں موجود ہیں یا ضائع کر دیے گئے۔

دوسرا دور جو یورپ کی بیداری پندرھویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی کے ختم تک تقریباً ۳۰۰ سال پر مشتمل ہے، دولت عثمانیہ ترکیہ کی اقبال مندی کا زمانہ ۱۴۵۳ء میں

قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، اور بہت سے ممالک یورپ عثمانیوں کے زیر نگیں آ گئے، دوسری طرف یورپ میں عام بیداری پیدا ہوئی، کلیسا کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا، ہر طرح کی سیاسی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات شروع ہوئیں، ان سب کا لب ولہجہ اسلام کے خلاف تلخ ہی تھا، یہ تلخی عثمانی فتوحات کے خلاف جذبات نفرت کی پیداوار ہے، اس دور میں علماء یورپ نے ڈھونڈ کر عربی کتابوں کے قلمی نسخے نکالے اور ان کو طبع کر کے شائع کیا، ان کے ترجمے کیے، اور اس کے لیے بادشاہوں نے خزانوں کے در کھول دیئے، عالموں نے عمریں وقف کیں، خود یورپین زبانوں میں اسلام پر بہ کثرت کتابیں لکھی گئیں اور مطبع کی ایجاد نے ان کتابوں کی بہ کثرت اشاعت کو آسان کر دیا، اسی دور میں یورپین اقوام نے مشرق کی سرزمین ایشیا و افریقہ پر قبضہ جمایا، جن علاقوں پر ان استعمار پسندوں نے قبضہ کیا تھا، ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت کی آبادیاں تھیں، قبضہ اور تسلط قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کی زبانیں سیکھی جائیں، ان کے عقائد و روایات سے واقفیت حاصل کی جائے، ان کو آپس کے اختلافات میں الجھایا جائے ان میں مذہبی تقشف کو کم کرنے کے لیے ان کے یقین کو شک سے بدل دیا جائے، ان کے ایمان و عقیدہ کو وہم اور غیر ثابت شدہ حقیقت قرار دیا جائے، ان مقاصد کے لیے یورپین ممالک خصوصاً فرانس و جرمنی نے بڑی جدوجہد کی، اس وقت ان کے سامنے اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ دولت عثمانیہ کی قوت کو کس طرح توڑا جائے، اس کام کے لیے یہ ضروری تھا کہ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت اور دشمنی پیدا کر دی جائے، اور اس منافرت کو دوامی صورت دیدی جائے، اس مقصد کے لیے فرانس کے بادشاہ لوئیس چہاردہم نے بے دریغ

دولت صرف کی، مستشرقین اور مشرق شناسوں کو بڑی بڑی رقمیں دیکر ان سے عربی قومیت، عربی تمدن، عربی رسم و رواج اور عربوں سے متعلق دوسرے امور پر کتابیں لکھوائی گئیں، عربوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے گئے، مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ یہ باور کرا رہا تھا کہ اسلام سے پہلے ہی عرب بڑی عزت و شان کے مالک تھے، اسلامی تاریخ عربوں کے عہد و شرف کی تاریخ کا محض ایک باب ہے، اب تک جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہوتی تھی، عربوں کی الگ تاریخ کوئی نہیں لکھتا تھا، اب عربی ممالک میں تحقیقاتی وفود کی ابتداء ہوئی، آثار قدیمہ نکالے جانے لگے اور عربوں کو وطنی قومیت کے لیے تیار کیا جانے لگا جس کا نتیجہ تقریباً سو سال بعد بیسویں صدی کے اوائل میں خاطر خواہ نکلا۔

اس دور کی آخری دو صدیوں میں اسلام کے خلاف کتابوں اور رسالوں کی تالیف و اشاعت کا کام اٹلی اور فرانس سے آگے بڑھکر جرمنی اور نیدر لینڈ تک پھیل گیا آخر میں انگلستان میں تعلیمی اور اشاعتی ادارے قائم ہوئے۔ اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں اولین نام مسٹر پی۔ پوشل کا ہے، یہ نارمنڈی کے ایک قصبہ باوفرن میں ۱۵۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۸۱ء میں وفات پائی، انھوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر کیے، بہت سی قلمی کتابیں خریدیں اور عربی و عبرانی زبان دانی اور مسلمانوں کے عقائد و رسوم پر متعدد کتابیں لکھیں، یہ ایک مذہبی پیشوا تھے۔ ان کے علاوہ اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں بی ڈیبلیر (۱۶۱۳-۱۶۹۶) بی ڈی ہربلو (۱۶۲۵، ۱۶۹۵) انطون گالان (۱۶۴۶، ۱۷۱۵) پادری ریناوڈو (۱۶۴۶-۱۷۲۰) اور پادری مارتیلی (۱۶۱۲-۱۶۹۵) وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں اسلام پر کتابیں لکھیں، یہاں وہ زمانہ ہے جب کہ کلیسا کا طلسم ٹوٹا اور کچھ ایسے مستشرقین سامنے آئے جنھوں نے پیشرو مستشرقین

دد دی کی لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیئے۔

تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتدا سے ۱۹۲۵ء تک ہے، اس دور میں عربی کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کا کام زیادہ وسعت کے ساتھ ہوا، اسلامی کتابوں کے ترجمے بکثرت شائع ہوئے، اسلامی تحقیقات کے نام سے مسلمانوں کے اندرونی اختلافات اور جدید فرقِ اسلامیہ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، عربی قلمی کتابوں کی تشریحی فہرستیں شائع ہوئیں، تقریباً ہر ملک میں ایشیائی سوسائٹیاں وجود میں آئیں، اس دور کے مستشرقین عربی متنوں کی تصحیح اور علوم ریاضیہ و تجربیہ کے تراجم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دو مقاصد کے لیے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اول عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے لیے عربوں کی تعریف و توصیف اور غیر عرب مسلمانوں پر الزامات عائد کرنے کا التزام اور دوم مسلمانوں کی روایات اور ان کی تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی مساعی، اس دور میں قرآن مجید کے متعدد ترجمے ہوئے، قرآن مجید کے الفاظ کی فہرستیں اور لغات القرآن بکثرت تیار کیے گئے، مسٹر جی فلوگل (۱۸۰۲-۱۸۷۰) اور مسٹر ہیلٹن (م ۱۸۲۳ء) مترجم ہدایہ اسی دور کے علما میں ہیں، اس دور کے مستشرقین میں سے ایڈورڈ ربیاٹک (۱۸۱۹-۱۸۹۱) مسٹر ہیوز مصنف ڈکشنری آف اسلام، تھامس کارلائل، ولیم موک مارلے، ایڈورڈ ہیلر، ایل اسمنٹ پادری ڈرم، سی، ای، ولسن، گرلڈ زیہر، پادری کموشکو، لازیوں بلاشیر اور نالینو وغیرہم ہیں، مشہور پروفیسر بامر اور ان کے نامی گرامی شاگرد کرنل لارنس آف عریبیا بھی اسی دور کے بزرگ ہیں۔

چوتھا دور جو ۱۹۲۶ء میں امیر کاتبانی کی وفات سے اب تک ہے، اس دور میں

تحقیقات اسلامی کا کام جن مستشرقین نے کیا ان میں نولدکی اور ان کے شاگرد علامہ بروکلمان اور پروفیسر سخاؤ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسی طرح تھامس آرنلڈ مسٹر جبکین، مونٹ گمری واٹ، مسٹر لیمب، مسٹر انڈرسن، پروفیسر مارگولیتھ، مسٹر لوکارٹ، مسٹر براؤن مسٹر لنڈاؤ اور مسٹر لوئیس وغیرہ ہیں، پادری زویمر م ۱۹۵۲ء بانی رسالہ مسلم ورلڈ بھی اسی دور کے ہیں، جن کے متعلق خود مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ ان کے تعصب نے ان کی تصنیفات کا علمی مرتبہ ہی ختم کر دیا اس دور میں تحقیقات اسلامی کا دائرہ فقہ اور اصول فقہ تک وسیع ہوگیا، فرق اسلا کے حالات اور تصوف اسلامی کی جانب بھی توجہ زیادہ ہوئی، اس دور میں بڑی بڑی حکومتیں خدا بیزاری اور مذہب سے نفرت کے جذبہ پر قائم ہوئیں، ۱۹۴۵ء کے بعد تو خدا بیزار مملکتوں کا مسلسل پروپیگنڈا خود عیسائیت بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا، اس لیے یورپ کا لب ولہجہ اسلام کے خلاف یاوہ گوئی میں نسبتۃً نرم ہوگیا، اگرچہ پادری سموئیل زویمر اور ان کے ہمنوا پوری قوت کے ساتھ اسلام، قرآن اور رسول اللہ کے خلاف لکھتے رہے۔

مقاصد | کسی ذی ہوش آدمی کا ارادی عمل بغیر مقصد کے ممکن نہیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ مستشرقین کا عمل تحقیقات اسلامی کسی مقصد کے بغیر ہوتا رہا ہے، یقیناً یہ ساری محنت اور اتنے بڑے پیمانہ پر کام کوئی مقصد رکھتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف تلاش علم ہو سکتا ہے، لیکن یہ خیال اس لیے باطل ہو جاتا ہے کہ ہم قدیم زمانہ سے اس کام میں زیادہ تر ان ہی حضرات کو منہمک پاتے ہیں جو عیسائیت کے پُر جوش مبلغ ہیں، ان ناموں پر غور کیجئے یہ سب مسیحی پادری ہیں اور وہ توں مرتاض

راہب رہ کر انھوں نے تربیت پائی ہے۔ پادری البانو ۱۸۹۹ء پادری ریوف ۱۹۰۳ء پادری ملڈن ۱۸۸۱ء پادری بلن ۱۸۹۱ء پادری ابوجی ۱۸۹۰ء پادری کوش ۱۸۹۵ء پادری ژی کورپر ۱۹۰۰ء پادری جولیان ۱۹۱۱ء پادری بردبر ۱۹۱۹ء پادری میکارتھی المولود ۱۹۱۳ء پادری برلوموائے ۱۹۲۳ء پادری زیوفین ۱۹۲۳ء پادری مونٹوڈے المولود ۱۸۸۰ء پادری نہری چارلس المولود ۱۹۱۵ء پادری نلیش المولود ۱۹۰۷ء یہ سب کلیسا کے مذہبی عہدہ دار ہیں انھیں بیش قرار تنخواہیں کلیسا اور اوقاف کلیسا سے ملتی رہی ہیں، ظاہر ہے کہ ایک مسیحی راہب اور کلیسا کا عہدہ دار، کلیسا کی تنخواہ لے کر اسلام پر تحقیقات کس مقصد اور جذبہ کے ماتحت کر سکتا ہے، عربی زبان سے ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طب، نباتات اور حیوانیات کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں کو شاید یہ کہا جائے کہ محض تلاش علم کے لیے یہ سب کر رہے ہیں، لیکن اسلامی عقائد، اسلامی تاریخ، قرآن حکیم، سیرۃ رسول اور اسلامی تصوف پر تحقیقات کرنے والے ان مسیحی خانقاہ نشینوں اور مبلغوں کا مقصد صرف تلاش علم و ہنر کیسے ہو سکتا ہے۔ مستشرقین کی تحریروں کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا، استعمار کے لیے راستہ کی ہمواری اور مسلمانوں میں تفریق پھیلانے کی جد وجہد کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ وہ تحقیق کے نام سے منافقوں اور اسلام دشمن اشخاص کے قدیم اقوال ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور چونکہ عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اکثر نام مسلمانوں کے سے ہوتے ہیں اس لیے بڑی آسانی کے ساتھ وہ دھوکے دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، مسلمان حکومتوں میں ہمیشہ سے آزادی رائے دی گئی ہے، اس لیے ہزاروں یہودیوں اور عیسائیوں نے

طرح طرح کی فضول اور مضر تحریریں لکھی ہیں، آج یہ تحریریں اس طرح پیش کی جاتی ہیں جیسے کسی مسلمان عالم دین کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، بعض بالکلیہ جعلی کتابیں جو کسی قدیم مصنف کی طرف منسوب کردی گئی ہیں، مثلاً عبداللہ بن داؤد کی طرف منسوب کتاب المصنف، زبیر بن بکار سے منسوب "کتاب نسب قریش" ابوعلی سینا کی طرف منسوب "رسالہ حشر الاجساد" وغیرہ ان کے مقاصد کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں، بلاشبہ متدن کتب کی طباعت، اشاعت، فہرست سازی اور اشاریہ نویسی میں جو محنتیں انھوں نے کی ہیں وہ لائق صد آفریں ہیں، ان کی مساعی سے بہت سی نایاب قیمتی کتابیں ہمارے لیے قابل حصول ہوگئیں، لیکن ترجمہ وتحشیہ میں کبھی بالارادہ اپنے جذبۂ عداوت کے تحت اور کبھی محض اپنی جہالت سے عجب گل کھلائے ہیں، مثلاً مشہور مستشرق فلوگل نے ۱۸۴۲ء میں ایک وسیع لغت الفاظ قرآن مجید کا شائع کیا، اس لغت میں ۳۹......الفاظ کے غلط عربی مادے لکھ دیئے اور نتیجۃً معانی بدل ڈالے، مثال کے لیے ان پانچ الفاظ کو دیکھیے۔

۱۔ اثرن کا مادہ "ث، ر" قرار دیا ہے، حالانکہ اسکا صحیح مادہ فعل ث، و، ر ہے۔

۲۔ المخاص کا مادہ "خ۔ و۔ ص" قرار دیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل م۔ خ۔ ص ہے،

۳۔ استبقوا کا مادہ "ب۔ ق۔ ی" قرار دیا ہے، حالانکہ صحیح مادہ فعل س۔ ب۔ ق ہے۔

۴۔ وقرن کا مادہ "ق۔ ر۔ ن" قرار دیا جب کہ صحیح مادہ فعل ق۔ ر۔ ر ہے۔

۵۔ مقیلا کا مادہ "ق۔ و۔ ل" قرار دیا جب کہ صحیح مادہ فعل ق۔ ی۔ ل ہے۔

اس تبدیلی سے معانی بالکل بدل گئے، یہ وہ مسز فلوگل ہیں جن کو مستشرقین کے نزدیک سند مستند کا مقام حاصل ہے۔

چونکہ ہمیشہ سے مسیحیت پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ انجیل مقدس کے نام سے جو کتاب پیش کی جاتی ہے، وہ غلط اور فرضی ہے، اس میں ایک لفظ بھی وحی الٰہی کا نہیں، اس لیے مستشرقین نے اپنی تحقیقات کا سارا زور اس پر لگا دیا کہ قرآن مجید بھی اصلی اور قابل اعتماد نہیں، مثلاً گولڈ زیہر مذاہب التفسیر الاسلامی میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید ابتداً جو لکھا گیا تو حروف پر نقطے نہیں تھے، اس لیے لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا اور کیا پڑھا، ان فاضل مستشرق نے کیا بات پیدا کی ہے، جس قوم میں مادر زاد اندھے حافظ رہے ہوں اور جس میں آج تک استاد سے شاگرد کی طرف علم کی منتقلی بذریعہ صوت ہو، اس میں نقطے کی کیا اہمیت ہے، بھلا صحابہؓ رسول اللہ ﷺ کی زبان اقدس سے آواز سنتے تھے، یا لکھی ہوئی تحریروں سے قرآن مجید یاد کرتے تھے، اور کیا آج تک کسی مسجد اور کسی مدرسہ میں قرآن مجید بغیر معلم کی آواز کے بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھا جاتا ہے، قرآن مجید کی آواز، مد، سکون، وقف، سکتہ، یہ سب کچھ بذریعہ روایت محفوظ ہے، اس وقت نوشت و خواند اتنی عام کہاں تھی، یہی وجہ تو حضرت ابن ام مکتوم نابینا صحابی نے قرآن مجید کیسے یاد کیا، اور ناحرف شناس تو بہت سے حافظ قرآن صحابہ میں موجود تھے، اسی طرح کی اصل دلیلوں اور مغالطوں کے ذریعہ مستشرقین حضرات یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ توراۃ شریف اور انجیل مقدس کی طرح قرآن مجید بھی دنیا سے ناپید ہو گیا، اسی طرح وہ سیرۃ طیبہ اسلامی تاریخ اور فقہ اسلامی میں طرح طرح کے شک پیدا کرنے کی بھی بالارادہ کوشش کرتے ہیں

اور کبھی نقص مطالعہ اور خود علم وفضل کی آمیزش سے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں ایک مستشرق لوئی دنڈر مین نے ایک علمی مجلس میں یہ اعتراض کیا کہ ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ کے گھر حضرت زبیرؓ اکثر جاتے تھے، اور کبھی کبھی وہیں سو بھی جاتے تھے، ام المومنین ان کے سر میں کنگھی بھی کر دیتی تھیں، حالانکہ اسلام میں کسی عورت کا غیر مرد سے اس طرح خلط ملط جائز نہیں ہے۔ اس اعتراض کے بعد جب انھیں بتایا گیا کہ حضرت ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ حضرت زبیرؓ کی حقیقی پھوپھی تھیں، اور ان کو انہوں نے بچپن سے ان کو پالا تھا تو بنایت معصومیت سے فرمایا "اچھا یہ بات ہوگی"۔

خلاصہ یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو ہمیشہ ہی سے اسکا صدمہ رہا ہے کہ اسلام نے شام و عراق، مصر و مراکش وغیرہ میں کیوں قدم جما لیے اس کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی کام لیا، اور کام لے رہے ہیں اور ہمیشہ کام لیتے رہیں گے، مسلمانوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، عیسائی مبلغین جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں کبھی وہ استعماری حکومتوں کے ہراول دستے تھے، اور اب یورپی تہذیب و تمدن کے نقارچی ہیں جنھیں ہنگفی قرار تنخواہیں سیاسی مصالح اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے دی جاتی ہیں، یہ مبلغ بھی ہوتے ہیں اور مخبر بھی اور کبھی کوئی اور روپ دھار لیتے ہیں۔

تذکرۃ المحدثین حصہ دوم

ساتویں صدی ہجری کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات سوانح اور ان کی خدمات، مولفہ ضیاء الدین اصلاحی، قیمت ۱۳-۵۰ "منیجر"

وفیات

مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی

عربی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مولانا عبدالعزیز میمنی کی وفات بڑی افسوسناک ہے، انھوں نے خاصی طویل عمر پائی، انتقال کے وقت ۹۰ برس کے تھے لیکن عربی علم و ادب اور تاریخ و تحقیق کے میدان میں ان کا جو مرتبہ تھا، اس کی بنا پر درازیٔ عمر کے باوجود ان کا انتقال بہت محسوس ہوگا، اور عرصۂ دراز تک انھیں یاد کیا جاتا رہیگا۔

وہ ۱۸۸۸ء میں راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) میں پیدا ہوئے، عنفوان شباب میں تحصیل علم کے لیے دہلی کا سفر کیا، اور وہاں ایک عرصہ تک تحصیل علم میں مشغول رہے، انھوں نے باقاعدہ کسی درس گاہ سے سند فراغ نہ لی تھی، لیکن اہل کمال کی خدمت میں رہ کر عربی ادب میں کمال پیدا کیا، شیخ طیب عرب سے مدتوں کتساب فیض کیا، ڈپٹی نذیر احمد سے بھی کافی استفادہ کیا، مطالعۂ کتب کا خاص اہتمام تھا، اس طرح کامل دستگاہ حاصل کرلی اور اقران و اماثل میں ممتاز سمجھے جانے لگے، تلاش معاش کے لیے پہلے اسلامیہ کالج پشاور پہونچے، وہاں عربی کے استاد کی حیثیت سے کچھ عرصہ تک درس و تدریس کی خدمت

انجام دی، اپریل سنہ ۱۹۲۱ء میں اورنٹیل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے ایک سو روپیہ ماہوار پر تقرر ہوا، یہاں کی علمی و ادبی فضا نے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا، چنانچہ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تحقیق کا ذوق پروان چڑھا، چار سال بعد آخر سنہ ۱۹۲۵ء میں یہاں سے علی گڑھ چلے آئے، پہلے شعبۂ عربی میں استاد ہوئے، پھر صدر شعبہ ہو گئے، سنہ ۱۹۴۲ء میں یہاں سے ریٹائرڈ ہو کر کراچی چلے گئے، وہاں کراچی یونیورسٹی کے قیام پر شعبۂ عربی کے صدر منتخب ہوئے، یہاں سے سبکدوشی کے بعد اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء میں مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی کے پہلے اعزازی ڈائرکٹر مقرر ہوئے، یہاں مولانا کے فرائض میں ایک اعلیٰ درجہ کے کتب خانہ . . . کا انتظام تھا، اس غرض سے پاکستان کی وزارت تعلیمات نے ان کے لئے مختلف ممالک کے سفر کا انتظام کیا، تاکہ نادر و نایاب کتابیں فراہم ہو سکیں، مولانا نے اس علمی سفر میں مصر، شام، تونس، الجزائر، سعودی عرب، عراق، ترکی، اور ہندوستان کا دورہ کیا، ان کی نظر انتخاب نے اس ادارہ کے کتب خانہ کو قیمتی کتابوں سے مالا مال کر دیا،

مولانا کا اوڑھنا بچھونا عربی زبان و ادب کی خدمت تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے ایسے نقوش جاوداں ثبت کیے ہیں، جو عرصہ تک ان کی یاد دلاتے رہیں گے، ان کا پہلا علمی و تحقیقی کارنامہ "ابوالعلاء و ما الیہ" ہے، اس کتاب میں انھوں نے ادبائے شرق و غرب کے افکار و خیالات کا جائزہ لیا، اس کی اشاعت کے بعد ادبائے عرب اور مستشرقین یورپ نے ان کی دیدہ وری، شان تحقیق اور وسعت نظر کی دل کھول کر داد دی، علامہ سید سلیمان ندوی علمی و تحقیقی کاموں کے بڑے قدرشناس تھے، انھوں نے اس تحقیقی شاہکار کو دارالمصنفین کے سلسلۂ تصنیفات میں شامل کیا، اور سنہ ۱۳۴۴ھ میں بڑے اہتمام کے ساتھ اسے قاہرہ

میں طبع کرایا۔ اس کے شروع میں میمن صاحب نے دارالمصنفین کی خدمات، سید صاحبؒ کے علمی شغف اور علامہ شبلی کا ذکر خیر کیا ہے، اور اس کتاب کو دارالمصنفین کے سلسلۃ الذہب میں شامل کئے جانے پر شکر و امتنان کا اظہار کیا ہے، اس سے عالم اسلام میں دارالمصنفین کی خدمات کا بھی تعارف ہوا، اس کتاب کی اشاعت پر سید صاحب بہت خوش ہوئے اور قارئین معارف کو اس علمی تحفہ کی خبر شذرات میں اس طرح دی۔

" دارالمصنفین کی طرف سے ایک نئی عربی کتاب ابوالعلاء معری، جو عربی زبان کا خیام ہے، مصر کے مطبعہ سلفیہ سے چھپوا کر منگوائی گئی ہے، یہ ہندوستان کے مشہور فاضل و ادیب مولانا عبدالعزیز صاحب میمن استاد عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی تصنیف ہے، اب تک بلاد عربیہ میں اس شاعر پر جو کچھ لکھا گیا تھا، اس سے بہت زیادہ بڑھکر اور اس سے زیادہ صحت اور استیعاب کے ساتھ اس کتاب میں معلومات فراہم کی گئی ہیں، لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وسعت معلومات ایک طرف ایک ہندی نژاد کے عربی قلم نے خود اہل زبان سے خراج تحسین وصول کیا ہے"۔ (معارف جنوری ۱۹۲۵ء)

سید صاحب ان کے علمی و تحقیقی کام کے بڑے قدر داں تھے، ان سے مضامین طلب کرتے، سید صاحب کی فرمائش پر انھوں نے معارف میں متعدد مضامین لکھے، جنھوں نے اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا، پہلا مضمون جولائی ۱۹۲۵ء میں کتب خانہ جامع القرویین فاس کے بارہ میں شایع ہوا، اس کے بعد اسی سال ابن رشیق اور المعز بن بادیس پر ایک مضمون نکلا، جس کے شروع میں سید صاحب کا ایک نوٹ بھی تھا۔

" مولانا نہ صرف عربی زبان و ادب پر کامل عبور رکھتے ہیں بلکہ علم کا خالص سنجیدہ اور ٹھوس مذاق رکھتے ہیں، جنکے قلم سے عربی ادبیات کی وسعت اطلاع کی متعدد

مثالیں ملک کے سامنے آچکی ہیں، ذیل کا مضمون تلاش کامل مطالعۂ عمیق اور سخت کاوش و محنت کا نتیجہ ہے (معارف ۱۹۲۲ء)

اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں "ابو العلاء اور معارضۂ قرآن"، "ابو تمام کی نقائض جریر و اخطل کا ایک واحد نسخہ" کے عنوان سے دو اور مضامین شایع ہوئے، "ابو العلاء معری اور گاندھی جی کا چرخہ" ایک مضمون لکھا . . . . . تو سید صاحب نے تحریر فرمایا کہ

"ہمارے دوست مولانا عبدالعزیز کو آجکل ایسی ہی دھن ہے جیسی گاندھی جی کو چرخہ کی، چنانچہ ابو العلاء معری کا چرخہ آج وہ نکال کر لائے ہیں"

سید صاحب نے ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم کی حیثیت سے ندوہ میں توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع کرنے کا عزم کیا تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا عبدالعزیز میمن نے جون ۱۹۲۵ء میں طلبائے ندوہ کے سامنے ایک خطبہ دیا جو سید صاحب کے ایک طویل نوٹ کے ساتھ "ایک خطبۂ علمی، ابو العلاء معری کے متعلق مستشرقین یورپ کی غلطیاں" کے عنوان سے ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء میں معارف میں شایع ہوا،

ان کے علاوہ قابل ذکر مضامین میں: "علامہ ابن الجوزی کے افکار یا ان کا روزنامچہ" ۱۹۲۶ء میں، "ابن رشیق صقلیہ" میں جولائی ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا،

میمن صاحب کا دوسرا اہم علمی کارنامہ امالی کی شرح سمط اللآلی کو ایڈٹ کرنا ہے، دو جلدوں میں قاہرہ سے شایع ہوئی، ایک جلد فہرست کی اس کے علاوہ تھی جس میں اماکن و امصار، اعلام و اشخاص کو حروف تہجی کے اعتبار سے تحریر کیا ہے، یہ فہرست بھی اس تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی کارآمد ہے،

ابو علی القالی (متوفی ۳۵۶ھ) کی الامالی عربی ادب کی امہات کتب میں شمار

ہوتی ہے، مورخ ابن خلدون کا مقولہ ہے "جسے ادب عربی حاصل کرنا ہو، اسے اس فن کی ان چار اصول کتابوں کو یاد رکھنا چاہیے، (۱) البیان والتبیین للجاحظ (۲) الکامل للمبرد (۳) الامالی لابی علی القالی۔ (۴) ادب الکاتب لابن قتیبہ۔

ابو عبید البکری (متوفی ۴۸۷ھ) نے امالی کی ایک بلند پایہ شرح اللآلی کے نام سے لکھی، مولانا میمن نے سات سال کی تلاش و تحقیق کے بعد اسے مرتب کیا، سمط اللآلی کے نام سے اس پر بیش قیمت حاشیہ لکھا... ۱۹۳۶ء میں یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی تو میمن صاحب کا نام ساری دنیا میں پھیل گیا۔

مولانا محمد عبداللہ سورتی نے معارف ۱۹۳۶ء میں تین قسطوں میں اس پر تبصرہ کیا، اور غلطیوں کی نشان دہی کی، میمن صاحب نے برہان ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء کے سات شماروں میں اس کا پرزور جواب لکھا، افسوس ہے کہ اس جواب میں شدت جذبات کی بنا پر علمی مباحث کے ساتھ نامناسب الفاظ میں سورتی صاحب کی ذات کو بھی ہدف طنز و تعریض بنایا ہے۔

الندوہ کے دور جدید میں "میری محسن کتابیں" ایک مفید سلسلہ شروع کیا گیا تھا، جس میں مشاہیر اہل علم نے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا تھا، اس میں مولانا میمن نے بھی اپنی محسن کتابوں کا ایک جائزہ پیش کیا تھا، یہ سلسلہ کے مجموعہ "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" مرتبہ مولانا محمد عمران خان ندوی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا کو جاہلی اور اسلامی شعراء کے ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں اشعار ازبر تھے، قدیم ادب پر بھی ان کی نظر بہت عمیق تھی، الفاظ کی تحقیق میں ان کو خاص درک تھا، انساب بھی ان کا خاص موضوع رہا ہے، ہندوستان میں جب تک آپ کا قیام رہا علی گڑھ سے

آئینۂ وطن: از جناب ضیا باری صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت [illegible] بہتر، صفحات ۱۱۲ مجلد مع گرد پوش قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے، پتہ: جو سویلیٹ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ نقش کوکن پبلیکیشنز ٹرسٹ ۲۰۴ ویل روڈ ڈونگری (جدید دو) بمبئی ۹۔

یہ جناب ضیا باری (بھیونڈی، بمبئی) کی قومی و وطنی نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں ملک کی شان و شوکت، یہاں کی قدیم پرشکوہ عمارتوں کے حسن و دلفریبی، مختلف مذہبوں کے بزرگوں اور سنتوں کی عظمت و برتری، مشہور قومی رہنماؤں اور اردو کے نامور شاعروں اور ادیبوں کے فضل و کمال کا ذکر ہے، شاعر نے اتحاد و یکجہتی، اور میل جول کا درس بھی دیا ہے اور فسادات، فرقہ واریت اور اخلاقی پستی کی مذمت بھی کی ہے، ضیاء صاحب کا کلام فنی حیثیت سے چاہے زیادہ بلند نہ ہو، لیکن ان کے خیالات اور جذبات قابل قدر ہیں۔

الفرقان وفیات نمبر: ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ۳۶ سال سے مولانا محمد منظور نعمانی کی ادارت میں دین و ادب کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے، اس طویل مدت میں اکابر ملت کے حادثۂ ارتحال پر بہت مضامین شائع ہوئے، زیر نظر نمبر میں ان میں کچھ کو یکجا کر دیا گیا ہے، اس میں علماء میں مفتی کفایت اللہ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اعزاز علی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالشکور فاروقی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا بدر عالم، مولانا محمد یوسف، مولانا احتشام الحسن، مولانا ابراہیم بلیاوی وغیرہ کی خدمات بیان کی گئی ہیں، ارباب طریقت میں مولانا اشرف علی، شاہ وصی اللہ، شاہ محمد یعقوب مجددی، حضرت رائے پوری، مولانا محمد الیاس کے کمالات و امتیازات کو مولانا نعمانی کے قلم نے نمایاں کیا ہے، اطبا میں ڈاکٹر عبد العلی، حکیم عبد السعید، حکیم عبد اللطیف کے سوانح حیات اور ذاتی تاثرات قلمبند کیے گئے ہیں، یہ نمبر کتب خانہ الفرقان لکھنؤ سے پانچ روپے میں مل سکے گا۔ (ض)

میز کر سکتے ہیں، مذہب کی حقیقت صفر کے برابر رہ جاتی ہے اگر اس میں سے وہ پہلو نکال دیا جائے جس سے انسان اس حقیقت سے وابستہ ہو جاتا ہے جو اس کی زندگی کا منبع ہے، اس پہلو کو دعا کہا جاتا ہے، دعا سے روح کی وسعتیں بڑھ جاتی ہیں، اس لئے کہ محدود اور لامحدود میں تعاون یا ملاپ ہو جاتا ہے، اس لئے بیک وقت ایگو کی اثبات اور نفی ہو جاتی ہے، اقبال نے انا اور شعور کی بحث کو خودی کی اصطلاح سے ظاہر کر کے اس کا تعلق انسانوں کی روزمرہ کی زندگی اور اجتماعی سیاست، معیشت اور عملی سرگرمیوں سے وابستہ کر دیا جو اس سے پہلے کسی سے ممکن نہ ہوا تھا۔ اسی وجہ سے اقبال فلسفہ کی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل کر گئے، اقبال زمانۂ حال کی جدید تہذیبی اور سیاسی موشگافیوں کی چھان پھٹک بھی ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک زندگی بھی ایک وحدت، انسانیت بھی اور زمانہ بھی، نتیجہ یہ کہ قصۂ قدیم و جدید کم نظری کی دلیل ہے، عہدِ حاضر کی نجات اس میں ہے کہ انسانی تاریخ کے روشن ترین عہد یعنی زمانہ مصطفیٰ سے بصیرت افروز ہو کر ایک نئی معاشرت کی داغ بیل ڈالی جائے، اقبال کا تصور انقلاب اشتراکی تصور انقلاب سے ظاہری مماثلت رکھنے کے باوجود اپنی بنیاد میں اس سے مختلف ہے، مارکس کا تصور انقلاب مادی تاریخی اور عقلی بنیادوں پر استوار ہے، جب کہ اقبال اسے مذہب اسلام کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور اشتراکی انقلاب کو اسلامی انقلاب میں منقلب کرنے کے خواہشمند ہیں، ان کے اسلامی انقلاب کو مارکس کے معاشی انقلاب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ایک فکری مغالطہ کے سوا کچھ نہ ہوگی، اقبال نے اپنے انگریزی خطبے (تشکیل جدید) میں اسلامی مفکروں، تاریخ دانوں اور سائنس دانوں کے مفصل ذکر سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یورپ کی جدیدیت دراصل مسلمان سائنس دانوں اور مفکروں کی تحقیق کی مرہون منت ہے، اور مسلمان علماء یہ سب کچھ اس لئے کر پائے کہ وہ قبائلی عقیدوں کے پیروکار نہیں تھے، بلکہ ایک متحرک، تخلیقی اور رواں دواں دین کے

خیالات سب کو معلوم ہیں، انھوں نے اپنی نظم و نثر میں اس تصور کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک وحدۃ الوجود کا عقیدہ درست نہیں (نقوش ص ۱۱۲، ۱۲۰۳)
بانگ درا میں ایسی کئی نظمیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اقبال پر وحدت الوجود کا اثر رہا، ان کا کچھ دور ایسا ضرور گذرا جب اس عقیدہ سے منحرف ہوتے نظر آتے ہیں، لیکن ان کے آخری دور کی نظموں میں یہ اثر پھر قائم ہو گیا، جیسا کہ اوپر کے اشعار سے معلوم ہوگا، خود ڈاکٹر سید عبداللہ نے اعتراف کیا ہے کہ اقبال کے اپنے افکار میں فنا ہی کا لا متناہی تک پہونچ جانا ممکن ہے، کیونکہ خودی کی غایت بھی یہی ہے (نقوش ص ۱۲۵) یہ کیا ہے۔ وحدت الوجود ہی تو ہے، علامہ اقبال کے کلام میں عشق کی سرشاریوں کی بڑی فراوانی ہے یہ عشق کسی لیلیٰ، کسی عذرا، کسی شیریں، کسی قلوپطرا کے لئے تو نہیں، یہ عشق الٰہی ہی کی سرشاریاں ہیں، جس کا دوسرا نام وحدت الوجود ہے۔ اسی کے ساتھ میری ذاتی رائے ہے کہ اقبال نے جس طرح اسلام کو سمجھنے کے لئے ایک نیا طرز فکر دیا، علم کلام کی ایک نئی تعبیر کی، تصوف کے لئے ایک نئی روح پھونکی اسی طرح بگڑی ہوئی وحدت الوجود کو سنوار کر کے ایک نئی وحدت الوجود کا درس دیا ہے، جس کو ان کی اپنی وحدت الوجود کہنا صحیح ہے، پرانے وحدت الوجودی اپنے کو خدا میں جذب کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اقبال نے خدا کو اپنے میں جذب کرنے کی تعلیم دی ہے، پرانے وحدت الوجودی خدا کی تلاش کرتے ہیں، اقبال کا خیال ہے کہ خدا خود آدمی کی تلاش میں ہے، پرانے وحدت الوجودی خدا کی رضا کے طالب ہوتے ہیں، اقبال آدمی کی خودی کو اتنا بلند کرنا چاہتے ہیں کہ خود خدا اس سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے، اقبال کا خیال ہے کہ خود خدا نے آدمی کو کھو دیا ہے

از خدا گم شدہ ایم او بہ جستجو است — چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو است